آئینہ حقیقت نما

جلد اوّل و دوم

مُصنّفہ

مورّخِ اسلام مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی

ہندو اور مغربی مورخین گذشتہ دوسو سال سے ہندوستان پر مُسلم فاتحین کے حالات کو تعصب کے زہر میں بجھے ہوئے قلم سے لکھ کر پیش کر رہے تھے۔ اور مسلمان حکمرانوں کی ساری خوبیاں خرابیاں ہو کر رہ گئی تھیں۔ ایسے میں مورخِ اسلام نے محققانہ قلم اٹھایا اور تمام الزامات کا مدلّل اور دندان شکن جواب تاریخ کی روشنی میں لکھا جو "آئینۂ حقیقت نما" کے نام سے پیش کیا۔ یہ کتاب حیرت انگیز تاریخی معلومات کا خزانہ ہے۔

نفیس اکیڈمی

بلاسس اسٹریٹ ———— کراچی (پاکستان)

قیمت [redacted]

آئینۂ حقیقت نما۔ حصہ اوّل و دوم کے

جملہ دائمی حقوق طباعت و اشاعت قانونی طریق پر

محترمہ **فاروقہ بیگم** صاحبہ بنت مولانا اکبر شاہ خاں صاحب نجیب آبادی مرحوم

سے بتوسط جناب مولوی **ایوّب خاں** صاحب ہمشیرزادہ مولانا مرحوم حاصل کر کے

چوہدری محمد اقبال سلیم گاہندری مالک نفیس اکیڈیمی و مسعود پبلشنگ ہاؤس

کراچی نے شائع کیا

پہلا ایڈیشن غالباً سنہ ۱۹۲۰ء میں باہتمام مولوی ایوب خاں صاحب نجیب آباد سے شائع ہوا۔

دُوسرا ایڈیشن: ——— اکتوبر سنہ ۱۹۵۸ء

تیسرا ایڈیشن ——— جون سنہ ۱۹۶۶ء

باہتمام ——— خالد اقبال گاہندری

طباعت: ——— جاوید پریس۔ کراچی

ہندوستان پر

مسلمان حکمرانوں کا دورِ حکومت

از: محمد اقبال سلیم گاہندری

کسی قوم کو ذلیل و رسوا کرنے اور اُس کو قومی جذبات سے محروم کرنے کا ایک مشہور طریقہ یہ بھی ہے کہ اُس قوم کو اپنے ماضی سے بدظن کر دیا جائے۔ اور اس کی تاریخ کو اس قدر مسخ کر کے پیش کیا جائے۔ کہ جدید نسل اپنے اسلاف سے بدظن بلکہ متنفر ہو جائے۔ اس طرح قوم جب اپنے تابناک ماضی کو فراموش کر دے گی اور اسے اپنے اسلاف سے نفرت ہو جائے گی تو آسانی کے ساتھ وہ قعرِ مذلت میں گر جائے گی۔

یہ استعماری و استحصالی مقاصد رکھنے والی اقوام کا قدیم ہتھکنڈہ ہے۔ اور انگریزوں نے برصغیر پاک و ہند پر جب حاکمانہ قبضہ کرنا چاہا تو اسی قاعدہ کے بموجب اس ذیلی براعظم میں مسلمانوں کی تاریخ کو تباہ کرنے کی کوشش کی، جھوٹے سچے قصے اور کہانیوں کے آمیزے سے یہ زہر تیار کیا گیا اور لازمی خوراک کے طور پر اسکولوں اور کالجوں میں ہمارے بچوں کو دیا جانے لگا پھر کیا تھا اس آمیزے کی تاثیر سے چشم و نظر نے خفیقت بینی چھوڑ دی

اور تمام مسلمان فرماں روایان ہند ایسی گھناونی شکل میں نظر آنے لگے کہ درندے اور جنگلی جانور بھی اُن شکلوں سے شرماجائیں۔
انگریزوں کو اس مہم میں متعصب اور کذب وافترا کے مشاق ہندوؤں اور خصوصًا مرہٹہ درباروں کے داستاں گویوں نے بڑی امداد دی یہ طبعًا احسان فراموش اور دون فطرت لوگ تھے۔ انھیں توشہ مل جانے کی دیر تھی، مسلمانوں کو ہندو کش اور ظالم ثابت کرنے کے لئے ہزاروں کتابیں شائع کردیں۔ اور وہ منافرت پھیلائی کہ خدا کی پناہ؟
۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۱ء تک جو اتحاد ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین قائم کرنے کی کوششیں ہوئیں۔ ان کی کشتیاں ان ہی تاریخی حقائق کی چٹانوں سے ٹکرا کر ٹوٹتی رہیں، یہاں تک کہ ہندوؤں نے فسادات اور ارتداد کے فتنے پیدا کردیئے۔ جو بالآخر تقسیمِ ہند کا باعث ہوئے۔
ٹھیک اسی وقت اللہ کے ایک بندے نے جسے خدا نے مطالعہ کی وسعت بھی دی تھی اور دھڑکتا ہوا دل بھی۔ سیکڑوں کتابوں کے وسیع سمندر کو کھنگالا اور بے مثال محنت و مشقت کے بعد حقیقت کے موتی نکالے، اور دنیا کے سامنے ماضی کی سچی تصویر اور اسلامی تاریخ ہند کے صحیح ترین خدوخال "آئینۂ حقیقت نما" کے نام سے پیش کردیئے۔
"آئینۂ حقیقت نما" کیا ہے ایک کتاب، اور حقیقتًا ایک چمکتا ہوا آئینہ جس میں ابتدا سے لے کر انگریزوں کے حاکمانہ اقتدار تک کی تاریخ اپنے صحیح خدوخال کے ساتھ نمایاں نظر آتی ہے۔ جس میں تاریخ ہند کے ابتدائی مصادر پر عالمانہ مفکرانہ تبصرہ بھی ہے، اسلامی اُصول

اجتماع، ہندوؤں کے معاشرتی حقایق، اور محمد بن قاسم فاتح سندھ سے لے کر انیسویں صدی تک کے حالات پر محققانہ بیانات بھی ہیں۔
پہلی جلد میں مولانا مرحوم نے سب سے پہلے تاریخی روایات پر تبصرہ کیا ہے، اسلامی اصول اجتماع کی تشریح فرمائی ہے ہندوؤں کے صحیح حالات بیان کئے ہیں اور ہندوستان میں مسلمانوں کی ابتدائی آمد سے لے کر آٹھویں صدی ہجری تک کے سیاسی اور معاشرتی حالات، اور ذہنی و فکری کیفیات کو پوری تشریح و تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ اور دوسری جلد میں آٹھویں صدی ہجری اور اس کے بعد کے حالات پر سیر حاصل بحث کر کے یہ بتایا ہے کہ "کون کیا تھے" اور کیا واقعہ کس وجہ سے وقوع میں آیا، اور اس کے کیا اثرات مرتب ہوئے۔"

یہ کتاب نہ صرف تاریخ کے طالب علموں کے لئے، پروفیسروں اور محققوں کے لئے ایک لازمی کتاب ہے بلکہ عام ناظرین تاریخ کے لئے بھی اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے تاکہ تاریخ سے سیاہ پردے اُٹھ جائیں اور محمد بن قاسم محمود غزنوی اور تغلق کے چہرے صاف نظر آئیں۔

آئینہ حقیقت نما کا پہلا ایڈیشن ۱۹۲۰ء میں شائع ہوا تھا۔ اور اب یہ کتاب بالکل نایاب تھی۔ ہم اس کی اشاعت کے دائمی حقوق مصنف مرحوم کی صاحبزادی سے حاصل کر کے پیش کر رہے ہیں۔
نفیس اکیڈیمی نے اعلیٰ درجہ کی علمی کتابوں کی اشاعت کا جو پروگرام مرتب کیا ہے۔ اس سلسلہ میں اس سے پہلے بھی متعدد اہم ترین کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ جن میں مورخ اسلام مولانا اکبر شاہ خاں صاحب نجیب آبادی کی تاریخ اسلام تین ضخیم جلدوں میں شائع

ہو چکی ہے ، یقیناً یہ ضروری تھا کہ مولانا موصوف کی یہ بے مثال کتاب آئینۂ حقیقت نما بھی نفیس اکیڈیمی کی طرف سے شائع کی جائے، اس لئے ہم نے اس سلسلہ میں سعی وکوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ اور الحمد للہ کہ خدائے بزرگ و برتر نے ہمیں کامیابی عطا فرمائی۔

اس عظیم کتاب کی اشاعت کے سلسلہ میں مولوی ایوب خاں صاحب ہمشیرزادہ مولانا مرحوم نے جو میری اعانت فرمائی اس کے لئے میں اُن کا ممنون ہوں اگر ایوب خاں صاحب میری مدد نہ کرتے تو یہ اہم تاریخی کتاب میں کسی طرح بھی شائع نہ کرسکتا۔

سفرنامہ ابن بطوطہ | اس کے بعد ہی بہت جلد ہم سفرنامۂ ابن بطوطہ کا جدید اور صحیح ترین ترجمہ معہ اعلام والمکنہ کی تشریح وتوضیح کے شائع کر رہے ہیں۔ تاریخ ہند کے علماء جانتے ہیں کہ اس برِاعظم کی تاریخ کا سب سے اہم ماخذ چار سیاحوں کے سفرنامے ہیں۔ اور ان چاروں سفرناموں میں سے ابن بطوطہ کو سب سے زیادہ وسیع، پراز معلومات اور وقیع ہونے کا مقام حاصل ہے۔ اگرچہ بہت دنوں پہلے اس کا اُردو ترجمہ شائع ہوچکا ہے جو اب نایاب ہے۔ مگر وہ ترجمہ زبان، بیان میں قدیم اور غیر مانوس ہونے کے علاوہ اس میں ایک نقص یہ بھی ہے کہ اعلام اور امکنہ کی تشریح اس کے ساتھ نہیں، زمانے کے انقلابات کے باعث مقامات کے نام بدل گئے ہیں، اس لئے مطالعہ کرنے والوں کو اُلجھن ہوتی ہے، ہم نے ان دونوں قسم کی اُلجھنوں کو رفع کرادیا ہے، اور فاضلانہ تشریحی فٹ نوٹ کے ذریعہ کتاب کی افادیت کئی گنا بڑھ گئی ہے جو انشاءاللہ عنقریب شائع ہوگی۔

فہرست مضامین آئینہ حقیقت نما حصہ اول

دیباچہ طبع دوم

نکتہ چینی

دیباچہ طبع اول

باب دوم

باب سوم

فہرست مضامین آئینہ حقیقت نما

حصہ دوم

باب ہفتم
محمد تغلق کا آخر عہدِ حیات

کتب حوالہ جات مقدمہ آئینہ حقیقت نما

فرقان مجید و فرقان حمید
حجۃ الاسلام
مروج الذہب (مصنفہ ابوالحسن علی المسعودی)
چچ نامہ
تاریخ ابن خلدون
تاریخ فرشتہ
سفرنامہ ابن بطوطہ
رسالہ عبرت
رسالہ معارف
تاریخ تبت
تاریخ مولوی ذکاء اللہ
سفرنامہ سلیمان سیرافی
سفرنامہ ابوزید سیرافی
عجائب الاسفار
تحفۃ المجاہدین
تمدن عرب (مصنفہ ڈاکٹر گستاولی بان فرانسیسی)
پریچنگ آف اسلام (مصنفہ ڈاکٹر ڈبلیو ٹی آرنلڈ)
لائف آف محمد (مصنفہ سر ولیم میور)

سفر مشرق (مصنفہ میشو رہبان)
چیمبرز انسائیکلو پیڈیا
تاریخ چارلس پنجم (مصنفہ رابرٹس)
تاریخ جنگ صلیبی (مصنفہ میشو رہبان)
میزان الحق (مصنفہ پادری فنڈر)
لیکچرز آن ہیروز (مصنفہ طامس کارلائل
منوسمرتی یا منوشاستر
چینی سیاح ہیونگ تسانگ کا سفرنامہ
مصر کا اخبار موسومہ اکچیپ
بیروت کا مسیحی اخبار الوطن
تاریخ ہند مصنفہ ڈاکٹر ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر صاحب
کیرل اتپتی
اشوک کی لاٹھوں کے کتبے
جینوا یونیورسٹی کے پروفیسر ایڈورڈ مونٹٹ
لڈولف کریہل
موسیو لیبلی
ای بلفورٹ فلاسفر
مارگولیتھ ترجمۂ قرآن انگریزی راڈویل کا دیباچہ نگار
ڈاکٹر سموئیل جانس

(۳۸) ریورینڈ۔ ڈبلو اسٹیفن
(۳۹) جی ایم راڈویل مترجم انگریزی ترجمہ قرآن
(۴۰) جرمن مستشرق عمانوئیل ڈیوش
(۴۱) طالسطائی روسی فلاسفر
(۴۲) مشہور مورخ گبن
(۴۳) جیون ڈیون پورٹ صاحب
(۴۴) مختصر تاریخ چرچ

کتب حوالہ جات آئینۂ حقیقت نما حصہ اول و حصہ دوم

(۱) تاریخ طبری ترجمہ فارسی مترجم ابوعلی محمد وزیر ابوصالح بن منصور سامانی بادشاہ بخارا
(۲) چچ نامہ
(۳) تاریخ سندھ معصومی
(۴) تذکرۃ الحفاظ
(۵) مروج الذہب (از مسعودی)
(۶) عجائب الہند (مصنفہ بزرگ بن شہریار)
(۷) تاریخ اسلام
(۸) تاریخ ذکاء اللہ
(۹) جامع التواریخ (مصنفہ قاضی فقیر محمد صاحب)
(۱۰) زین الاخبار بحوالہ فرشتہ
(۱۱) تاریخ ابن خلدون
(۱۲) ناسخ التواریخ
(۱۳) روضۃ الاصفیا (مصنفہ مفتی غلام سرور لاہوری)
(۱۴) تاج المآثر (مصنفہ خواجہ صدر نظامی)
(۱۵) تاریخ فرشتہ
(۱۶) پریچنگ آف اسلام (مصنفہ ڈاکٹر ڈبلیو ٹی ارنلڈ)
(۱۷) تاریخ نظامی (مصنفہ نظام الدین ہروی)
(۱۸) تاریخ یمینی
(۱۹) روضۃ الصفا (مصنفہ خاوند شاہ یا خوند شاہ)
(۲۰) طبقات ناصری (مصنفہ ابوعمر منہاج سراج)
(۲۱) طبقات اکبری (مصنفہ خواجہ نظام الدین احمد ہروی)
(۲۲) غزا نامہ مسعود (مصنفہ عنایت حسین بلگرامی)
(۲۳) تاریخ بیہقی (مصنفہ ابوالفضل بیہقی)
(۲۴) مفتاح التواریخ
(۲۵) سفرنامہ حکیم ناصر خسرو ایرانی (مترجمہ حکیم موصوف)
(۲۶) تاریخ ہند (مصنفہ ڈاکٹر ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر صاحب)
(۲۷) ملکم صاحب کی تاریخ
(۲۸) امیر نامہ (مصنفہ سید سعید احمد صاحب)
(۲۹) منتخب التواریخ (مصنفہ ملا عبدالقادر بدایونی)
(۳۰) تاریخ ہند (مصنفہ الفنسٹن صاحب)
(۳۱) سوانح عمری حکیم ناصر خسرو ایرانی (مترجمہ مولانا حالی)

(۳۲) تاریخ زین المآثر
(۳۳) تاریخ مالوہ (مصنفہ منشی کرم علی میر منشی ریذیڈنسی اندور)
(۳۴) ٹاڈ راجستان
(۳۵) سفرنامہ مظہری (مصنفہ محمد حلیم انصاری)
(۳۶) تاریخ فیروز شاہی (مصنفہ ضیا برنی)
(۳۷) سفرنامہ ابن بطوطہ
(۳۸) ہندوستان پر حملے (مصنفہ روسی میجر جنرل ایل این سیولیوف)
(۳۹) جواہر فریدیہ
(۴۰) تاریخ روس (مصنفہ سرڈی میکنزی والس)
(۴۱) ہندوستان کی تاریخی کہانیاں (مصنفہ جی سی ایلن صاحب)
(۴۲) لیتھبرج کی تاریخ ہند
(۴۳) ابن حوقل
(۴۴) بشاری مقدسی
(۴۵) تاریخی سلسلہ حکایات (مصنفہ ای مارسڈن)
(۴۶) آئینہ تاریخ نما (مصنفہ راجہ شیو پرشاد ستارۂ ہند)
(۴۷) مختصر سیر گلشن ہند (مصنفہ لالہ بابو رام)
(۴۸) خلاصۃ التواریخ (مصنفہ منشی سجان رائے بھنڈاری بٹالوی)
(۴۹) لنگ پوران
(۵۰) تاریخ ہند قدیم (مصنفہ کے ایم پانیکار)
(۵۱) وقائع راجپوتانہ (مصنفہ بابو جوالہ سہائے)
(۵۲) جغرافیہ اقلیم ہند (منشی سجان رائے بٹالوی)
(۵۳) تاریخ ہند (مصنفہ لالہ لاجپت رائے)
(۵۴) تاریخ حالات ہند (مصنفہ رام چند صاحب)
(۵۵) جامع التواریخ (مصنفہ محمد حسین سندیلوی)
(۵۶) تاریخ ابوالفدا۔

حامداً و مصلیاً

دیباچہ طبع دوم

خدائے تعالیٰ نے اس کتاب کے پہلے ایڈیشن کو جو قبولیت عطا فرمائی وہ میری توقعات سے بہت زیادہ ہے۔ ملک کے باثر کثیر الاشاعت اور معزز ترین روزناموں، سہ روزہ اور ہفتہ وار اخباروں نیز پندرہ روزہ اور ماہانہ علمی رسالوں نے جیسے شاندار ریویو لکھے اُن سے میری بڑی ہی ہمت افزائی ہوئی۔ سنہ ۶۶ء کے آخری حصہ میں پہلا ایڈیشن شائع ہوا تھا اور سنہ ۶۷ء کے آخری مہینوں میں یہ کتاب نایاب اور غیر موجود تھی۔ کئی سال سے اس کے دوسرے ایڈیشن کی طباعت کے لئے تقاضے ہو رہے تھے لیکن میں اپنی دوسری مصروفیتوں کے سبب اس وقت سے پہلے اس کتاب کو دوسری مرتبہ نہ چھپوا سکا۔ خدا کا شکر ہے کہ آج دوبارہ چھپنے کے لئے پریس میں بھجوا رہا ہوں۔ میرے جن دوستوں اور بزرگوں نے اس کتاب کی تالیف و تصنیف پر میری ہمت افزائی فرمائی ہیں اُن کے لئے حسنات دارین کی دعا اور خدائے تعالیٰ سے التجا کرتا ہوں کہ وہ مجھکو اس سے بھی زیادہ مفید کاموں کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

نکتہ چینی میں اُن لوگوں کی ہمیشہ عزت کرتا ہوں جو بغرض اصلاح میرے کاموں پر نکتہ چینی کرتے اور میرے عیوب سے مجھ کو واقف بناتے ہیں لیکن جو لوگ ازراہ شرارت اور اپنے جذبہ حسد سے مجبور ہو کر نامعقول اور بیہودہ طور پر معترض ہوں اُن کو جواب دینا یا اُن کی طرف متوجہ ہونا میں اپنی توہین سمجھا کرتا ہوں۔ میرے بعض دوستوں نے ازراہ شرارت نہیں بلکہ اس زمانہ کی ایک تصنیفی بدعت سے متاثر ہو کر نہایت نیک نیتی کے ساتھ یہ اعتراض کیا کہ آئینہ حقیقت نما میں جو سیکڑوں کتابوں کے حوالجات دیئے گئے ہیں ان کے ساتھ صفحات کے ہندسے بھی کیوں درج نہیں کئے گئے اور بعض باتوں کو مجمل اور بلا تفصیل کیوں رکھا

گیا۔ یہ اعتراض چونکہ نہایت سادگی اور غلط فہمی کی بنا پر کیا گیا ہے لہٰذا دوسرے ایڈیشن
کے اس دیباچہ میں میں اس کا جواب دینا ضروری سمجھتا ہوں۔

میری طرف سے مذکورہ اعتراض کا جواب یہ ہے کہ میں نے اس زمانہ کے دوسرے
مصنفین کی طرح یہ نہیں کیا کہ کتاب کا مسودہ لکھ لینے کے بعد درج شدہ مطالب کو دوسری
کتابوں میں تلاش کر کے اُن کتابوں کے نام اور صفحات کے ہندسے حاشیہ میں درج کر دیئے
ہوں اور اپنی لکھی ہوئی ایک ایک سطر کے لئے تین تین حاشیے درج کئے ہوں۔ یہ اس قدر
آسان کام تھا کہ اس سے زیادہ آسان میرے لئے دوسرا کام نہیں ہو سکتا تھا۔ میں خود دوسرے
مصنفین کے اس التزام کو غیر مفید بلکہ گمراہ کن ہونا محسوس کر چکا ہوں اور میرا تجربہ اس کے
متعلق نہایت تلخ ہے۔ میں نے جس مقصد کو پیش نظر رکھ کر یہ کتاب لکھی ہے اُس کا واضح
تذکرہ دیباچہ نسخۂ اوّل میں موجود ہے۔ اُس محدود و متعین مقصد کو حاصل کرنے اور یقین کو
عین الیقین کے مرتبہ تک پہنچانے کے لئے جہاں جہاں حوالہ کی ضرورت محسوس ہوئی وہاں میں
نے محولہ کتب اور محولہ مصنفین کے اصل الفاظ نقل کر دیئے ہیں تاکہ ہر شخص اُن الفاظ پر
غور کر سکے اور اُن سے خود نتائج اخذ کر کے تسکین پا سکے۔ یہ نہیں کیا کہ دوسروں کے الفاظ
کا مطلب اپنی عبارت میں درج کر کے حاشیہ پر صفحہ کا نمبر لکھ دیا ہو۔ جہاں مطالب
اپنی شہرت کے سبب معلوم عوام تھے اور اصل الفاظ کا نقل کرنا ضروری نہ تھا وہاں صرف
کتاب یا مصنف کا نام لے کر اُس کی عبارت کا خلاصہ یا محض اشارہ ہی کافی سمجھا گیا۔
میں نے ہر جگہ اپنے اُس مقصد کو جو دیباچہ میں بیان ہو چکا تھا پیش نظر رکھا اور اُسی کے
تقاضے سے کسی کو زیادہ ضروری کسی کو کم ضروری اور کسی کو غیر ضروری قرار دیا۔ لیکن پڑھنے
والوں میں ایسے حضرات بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ اس کتاب کے اصل مقصد کے سوا اپنے
دوسرے مقاصد بھی اسی کتاب سے حاصل کرنا چاہتے ہوں اور اُن دوسرے مقاصد
سے تعلق رکھنے والی کسی بات کے متعلق اجمال یا سرسری بیان دیکھ کر اور مکمل تحقیق نہ پا کر
معترض ہونے ہوں۔ مثلاً اس کتاب میں سبکتگین اور محمود غزنوی کا تذکرہ آیا ہے ایک
شخص جو محمود غزنوی پر کوئی مضمون یا رسالہ لکھنا چاہتا ہے وہ محمود کے حملوں کے متعلق تو
ایک طویل باب اس کتاب میں پاتا ہے لیکن اُس کو محمود غزنوی کا شجرہ نسب اور اُس کی
اولاد کے تفصیلی حالات نظر نہیں آتے تو وہ اپنی کم فہمی کے سبب ناراض ہوتا ہے اور

اس بات کو بھول جاتا ہے کہ اس کتاب کا مقصد سلطان محمود اور غزنوی سلطنت کی مکمل تاریخ بیان کرنا نہیں ہے بلکہ اس کتاب کی تصنیف کا جو اصل مقصد ہے وہ بحمد اللہ تعالیٰ اس میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ جن چیزوں کو وہ تلاش کرنا چاہتا ہے اُن کو اس کتاب میں ارادتاً غیر ضروری سمجھ کر ترک کر دیا گیا ہے۔ اسی سلسلہ میں کہا جا سکتا ہے کہ اس کتاب میں حوالہ اور ثبوت کے لئے جو سیکڑوں عبارتیں جا بجا دوسری کتابوں سے نقل کی گئی ہیں اُن کے ساتھ اگر صفحہ کا نمبر بھی درج کر دیا جاتا تو کیا حرج تھا حالانکہ میں نے جن کتابوں سے اصل عبارتیں نقل کی ہیں اُن میں سے زیادہ ایسی ہیں جو قلمی ہیں اور قلمی کتابوں پر صفحات کے نمبر عموماً نہیں ہوتے اگر ان قلمی کتابوں کے صفحات پر نمبر اب لکھ دیئے جاتے اور وہی حوالوں کے ساتھ درج کئے جاتے تو اس سے پڑھنے والوں کو کیا فائدہ پہنچتا، لیکن میں صفحات کے ہندسے درج کرنے کو ہر حالت میں فضول اور لغو کام سمجھتا ہوں اس لئے کہ کسی بادشاہ یا کسی جنگ یا کسی اہم واقعہ سے تعلق رکھنے والی جو عبارت کسی کتاب سے نقل کی گئی ہے اُس کتاب میں اُس بادشاہ یا اُس لڑائی یا اُس واقعہ کا تذکرہ تلاش کر لینا کوئی دشوار کام نہیں۔ جس شخص نے حوالہ کی جانچ پڑتال کے لئے اس اصل کتاب کو تلاش کر کے بہم پہنچا لیا ہو اُس کے لئے کتاب میں سے وہ مقام جہاں کی عبارت نقل کی گئی ہے تلاش کر لینا کیا مشکل کام ہے۔ لیکن رواج کچھ ایسا ہو گیا ہے کہ لوگ حوالوں کے ساتھ صفحات کے ہندسے دیکھ کر مرعوب ہو جاتے اور اصل کتابوں کے ساتھ مقابلہ کرنے کی بہت ہی کم توفیق پاتے ہیں۔

میں اسی ہفتہ سے تاریخ ہند کی جلد اول کے کام یعنی اُس کی تالیف و ترتیب و تہذیب کے کام میں ہمہ تن مصروف ہوتا ہوں لہٰذا اس دوسرے اڈیشن کی کاپیاں پڑھنے اور کتابت کی اغلاط کے رفع کرنے نیز اس کتاب کے شائع کرنے کا کام میری طرف سے اور میری اجازت سے برخوردار محمد ایوب خاں منیجر مکتبۂ عبرت انجام دیں گے۔ میں نے یہ چند سطور نہایت عجلت میں قلم برداشتہ لکھی ہیں جب کہ دوسرے اڈیشن کی کتابت کے لئے مسودہ کاتب صاحب کے پاس بھیجا جا رہا ہے۔ والسّلام

۱۵ اپریل ۱۹۳۱ء { اکبر شاہ خاں
نجیب آباد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ طبع اوّل

اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم

اللہ یعنی وہ ہستی جو کامل معبود خالص محبوب اور غایت مقصود ہے اگر ہماری حفاظت نہ کرے اگر وہ ہمارے لئے جائے پناہ نہ ہو اگر وہ ہم کو صراط مستقیم نہ دکھائے تو ہم اُس گمراہ کرنے اور قعر ضلالت وہلاکت میں گرا دینے والی ہستی سے جو ہمارے بڑے باپ آدم علیہ السّلام اور اُن کی تمام اولاد کی دشمن ہے کہاں محفوظ رہ سکتے اور ایک اُنگلی کسی بے ضرر مقام پر رکھ سکتے ہیں۔ لہٰذا ہم مجبور ہیں کہ کسی کام کے کرنے اور کسی قدم کے آگے اُٹھانے کا ارادہ کرنے سے پہلے اُس قدیمی اور یقینی دشمن سے جس کا نام شیطان رجیم ہے اپنے آپ کو بچانے اور محفوظ رکھنے کے لئے تمام طاقتوں کے مصدر تمام خوبیوں کے منبع اور تمام صفات حسنہ کاملہ کے جامع یعنی اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آجائیں۔ اسی لئے آج کا کام شروع کرنے سے پہلے اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم کا زبان پر بے ساختہ آجانا فطرت انسانی کا تقاضا تھا نہ تکلف و تصنع۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اگر کسی کام کے شروع کرتے وقت اُس اللہ تعالیٰ کے نام کو، جو رحمٰن و رحیم ہے یعنی بلا مبادلہ اور بلا معاوضہ انعام دیتا اور کوششوں کے نیک نتائج پیدا کرتا ہے اپنے کام کا دیباچہ نہ بنائیں تو ممکن ہے کہ پہلی ہی اینٹ کے بے موقع نصب ہونے سے دیوار کی کجی اُس کو دو گز بھی اونچا نہ اُبھرنے دے ؎

خشت اوّل چوں نہد معمار کج
تا ثریا میرود دیوار کج

لہٰذا یہ کیسے ممکن تھا کہ آج کا کام شروع کرتے ہوئے اُس رحمٰن و رحیم خدا کے نام

عنوان کار نہ بنایا جاتا اور زبان پر بے اختیار بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا روح پرور کلمہ نہ آجاتا۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

وہ اللہ وہ معبود وہ محبوب وہ مقصود جو ہر ایک صفتِ حسنۂ کاملہ سے متصف اور ہر ایک عیب ونقص سے مبّرا ہے نہ صرف مسلمانوں کا بلکہ ہندوؤں، سکھوں، بدھوں، یہودیوں مجوسیوں، عیسائیوں، بت پرستوں، زر پرستوں، جاہ پرستوں، مسیح پرستوں، پیر پرستوں اور گور پرستوں کا بھی پرورش کنندہ ہے اور نہ صرف انسان ہی اُس کی ربوبیت سے فیض یافتہ ہیں بلکہ جمادات، نباتات، حیوانات سب اُس کے فیض تربیت میں ڈوبے ہوئے نظر آتے ہیں جس طرح جنگل کا ہاتھی اُس کے الغامات کا مورد بن کر مست ہے اسی طرح زمین پر چلنے والی چیونٹی اُس کے زیر پرورش مگن اور آزاد ہے۔ ہوا میں اُڑنے والا بھنگا اور سمندر میں رہنے والی وہیل مچھلی سب اُسی کے گُن گاتے اور اُسی کے سہارے چین اُڑاتے ہیں اُس سے نہ صرف انسان و ملائکہ فیض پاتے بلکہ شیاطین الانس اور طواغیت الجن بھی اُس کی دی ہوئی مہلت کو اپنی خواہش کے موافق کام میں لاتے اور سانپ بچھو بھی اُس کی پیدا کی ہوئی مٹی چاٹ چاٹ کر بے تامل زہر کے ذخیرے جمع کر رہے ہیں۔ غرض کہ ہمارے وہم وخیال کے وسیع احاطہ میں جو کچھ بھی سما سکتا ہے خدائے تعالیٰ کی ربوبیت پر اُس کی بنیاد اور اُسی کے فیض پر اُس کے وجود کی اُستوار ہے۔ اسی لیے اُس کا نام ربّ العالمین ہے اور اسی لئے وہ ہر ایک قسم کی تعریف وتحمید کا مستحق ہے اور اسی لیے غفلت سوز جوش اور الفت ساز خروش کے ساتھ بیتابانہ اور عاشقانہ انداز میں یکایک زبان پر آگیا کہ الحمد للہ رب العالمین۔

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَعَلٰى اٰلِ سیدنا محمد و اصحاب سیدنا محمد و بارک وسلم علیہم ا

خدائے تعالیٰ کے احسانات اور اُس کی رحمتوں کا شمار سمندر کے قطروں ، ریگستان کے ذرّوں کے ذریعہ بھی ممکن نہیں وان تعدوا نعمت اللہ لاتحصوھا مگر ان نعمتوں اور احسانوں کی اگر کوئی فہرست بنانی شروع کرے گا تو اس فہرست میں جس احسان اور جس نعمت کو سب سے اعلیٰ اور سب سے زیادہ گراں سنگ ہونے کے سبب سب سے پہلے لکھے گا وہ اُس باعث تکوین موجودات۔ رحمۃٌ للعالمین

سید البشر خاتم الانبیاء۔ شافع روز جزا حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وجود باوجود ہوگا جس نے مبعوث ہو کر انسان کو با اخلاق انسان اور باخدا انسان بنایا مخلوق کو خالق سے آشنا کیا۔ تاریکی سے نکال کر روشنی میں لایا دوزخ سے بچا کر جنت کا راستہ دکھایا۔ دنیا کی بہیمیت و سبعیت کو مٹا کر رافت و رحمت کا دریا بہایا۔ وہی جامع جمیع کمالات انسانیہ ہستی ہے جس نے انسان کو اُس کی سعادت کا راستہ بتا کر سمجھایا کہ ہر ایک قوم اور ہر ایک ملت کے پیشواؤں کی تکریم کرنا باخدا انسانوں کا فرض اولین ہے اُس کا احسان نہ صرف مسلمانوں پر ہے بلکہ یہودیوں اور عیسائیوں پر بھی کیونکہ اُس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نبی ہونے کی تصدیق کی۔ اس محبوب رب العالمین کے احسانات نہ صرف عیسائیوں اور یہودیوں تک ہی محدود ہیں بلکہ اُس نے وان من امة الاخلا فیھا نذیر اور ولکل قوم ھاد کے ارشادات الٰہی ہم تک پہنچا کر ہر مسلمان کو سمجھایا کہ ایرانیوں تورانیوں، چینیوں اور ہندوؤں وغیرہ سب کے بزرگوں میں خدائے تعالیٰ کے فرستادے آتے رہے۔ لہٰذا تم دوسری قوموں اور دوسرے مذہبوں کے پیشواؤں کی عزت تو کر سکتے ہو لیکن گالی کسی کو نہیں دے سکتے۔ اُس نے ہمارے اخلاق کو یہاں تک وسیع و دل رُبا بنایا کہ ایک مسلمان کی زبان کسی بُت پرست کے معبود باطل کی دشنام دہی کے لئے بھی وا نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا کوئی قوم اور کوئی ملک اور کوئی ملت ایسی نہیں پائی جا سکتی جس پر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا احسان ثابت نہ ہوا

اللھم صل علیٰ محمد و علیٰ آل محمد وصحبہ دائماً ابداً بعدد کل ذرۃ الف الف مرۃ وبارک و سلم

خلاصہ کلام یہ کہ ؎

خدا در انتظار حمد ما نیست ۔۔۔ محمد چشم بر راہ ثنا نیست
محمد حامد حمد خدا بس ۔۔۔ خدا مداح شان مصطفےٰ بس

عرض مدعا

ہندوستان کی تیس بتیس کروڑ یا اس سے بھی زیادہ انسانوں کی آبادی میں ہندو اور مسلمان دو ہی قومیں تعداد نفوس اور اثر و اقتدار کے اعتبار سے قابل تذکرہ اور ایک دوسرے کی مد مقابل سمجھی جاتی ہیں۔

مسلمانوں کا ہندوستان میں دورِ حکومت

مسلمان ہندوستان میں آٹھویں صدی عیسوی کے ابتدا میں داخل ہوئے اور اُنیسویں صدی کے درمیانی حصہ یعنی ۱۸۵۸ء تک قریبًا ساڑھے گیارہ سو سال اُنھوں نے اس ملک میں ہندوؤں پر حکومت کی۔ اس طویل مدت کا ابتدائی اور آخری حصہ ایسا بھی ہے جس میں مسلمان ہندوستان کے پورے رقبہ پر قابض نہ تھے تاہم اس بات کے ماننے سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمانوں کی شہنشاہی ابھی ماضی قریب میں معدوم ہو کر اُس کی جگہ انگریزوں کی حکومت اس ملک میں قائم ہوئی ہے اور مسلمانوں کی شہنشاہی کے زمانے میں ہندوستان کے اندر نسل انسانی کی سیکڑوں نہیں تو بیسیوں پُشتیں ضرور گذر چکی ہیں۔ اس طویل مدت میں مسلمان حکمرانوں کا ہندو حکم برداروں کے ساتھ کیسا سلوک رہا؟ یہ کوئی ایسی باریک اور پوشیدہ بات نہ تھی جس کی تلاش میں ہم کو سرگردانی و پریشانی لاحق ہوتی مگر چونکہ ہندوستان پر ایک ایسی قوم کی حکومت ہے جس نے اس وقت تک اس ملک کو اپنا وطن بنانا نہیں چاہا لہٰذا ایسے سامان پیدا ہوتے گئے کہ دیسی مدارس و مکاتب نہایت تیز رفتاری کے ساتھ فنا ہونے لگے اور چند ہی روز کے بعد ہندوستان بھر کے قریبًا تمام طلبا سرکاری مدارس کے کمروں میں نظر آنے لگے چند دیسی مکاتب جو اپنی سخت جانی کے سبب باقی رہے وہ کسی قطار شمار میں نہیں آ سکتے۔

گمراہ کُن تاریخیں

سرکاری مدارس کے لئے تاریخ کی حد سے زیادہ مجمل و مختصر کتابیں تالیف کرنے والوں، خود غرض سیاحوں اور غیر ملکی تاریخ نویسوں کے ہاتھوں تاریخ ہند کی جس طرح مٹی پلید ہوئی ہے اور سرکاری درس گاہوں میں تعلیم پاتے ہوئے لوگوں کو گمراہ ہونے کا جو موقعہ ملا ہے اُس کی نظیر غالبًا دنیا کا کوئی ملک پیش نہیں کر سکتا۔ یہی سبب ہے کہ آج برّاعظم ہندوستان میں کسی شخص سے بمشکل یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے بزرگوں کے حالات کا تھوڑا بہت صحیح اندازہ کر سکے گا۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی شخص کہتا ہے کہ مسلمان ہندوؤں کے ہمدرد رہے ہیں اور ہندوؤں کو مسلمانوں سے حمایت۔ محبت۔ انصاف اور مروّت کی توقع رکھنی چاہیئے تو لوگوں کو جھٹ محمود غزنوی کے حملے۔ شہاب الدین غوری کی یورشیں۔ اورنگ زیب کی زیادتیاں جن کا حال اُنھوں نے تاریخ نما گمراہ کُن کتابوں اور جھوٹے افسانوں میں پڑھا ہے یاد آجاتی

ہیں اور وہ دل ہی دل میں اُس شخص کی باتوں پر ہنستے اور اس کے قول کو ناقابل التفات سمجھتے ہیں۔ سچ ہے۔ کہ جھوٹے کے آگے سچے کو رونا پڑتا ہے۔ ہندوستان میں جب سے ہندو مسلمانوں کو ایک دوسرے سے واسطہ پڑا اُس وقت سے لے کر غدر ۱۸۵۷ء تک ہندوستان کی تمام تاریخیں جو ہم عہد مورخوں نے اپنے چشم دید حالات پر لکھیں سب فارسی زبان میں ہیں۔ اپنی آنکھوں دیکھے ایک واقعہ کو کئی مورخوں نے جُدا جُدا اپنے اپنے رنگ میں اس طرح لکھا ہے کہ ہر شخص کسی ایک زمانے کے حالات یا کسی ایک واقعہ کی کیفیت معلوم کرنے کے لئے کئی کئی تاریخوں کا مابہ الاشتراک پیش نظر رکھکر حقیقت و اصلیت سے بخوبی آگاہ ہوسکتا ہے مگر گمراہ کن تاریخوں کے رواج اور فارسی زبان کا دفتر گاؤخورد ہو جانے کے سبب کسی کو اتنا دماغ اور اس قدر فراغ میسر نہیں کہ جہل و گمراہی کے پردے کو چاک کرکے حقیقت آشنا بنے اور دوسروں کو غلط فہمیوں سے نکالے۔

مروجہ گمراہ کن تاریخوں تک ہی ہم ہندوستانیوں کی مصیبت کا خاتمہ نہیں ہو جاتا بلکہ سب سے بڑی مصیبت کا تذکرہ ابھی باقی ہے وہ یہ کہ ہندوستان کی موجودہ آب و ہوا نے بہت سے نئے نئے فرقے اور نئے نئے لیڈر پیدا کردیئے ہیں۔ اس نئی پیداوار میں ایک ایسا فرقہ بھی پیدا ہوا جس نے اپنی تمام تر ہمت و طاقت اس کوشش میں صرف کردی کہ جہاں تک ممکن ہو مسلمانوں کو گالیاں دی جائیں اور ناسزا کہکر اُن کا دل دُکھایا جائے اس سلسلہ میں سب سے زیادہ پلید کوشش یہ ہوئی کہ ہندوستان کے مسلمان فرماں رواؤں کو ظلم و نالائقی سے بے جا طور پر متہم کرنے اور اُن پر انواع و اقسام کے عیوب تھوپنے کے لئے جھوٹے افسانوں اور فرضی ناولوں کا سلسلہ جاری کرکے عوام کو گمراہ اور ہندو مسلمانوں کے درمیانی خلیج کو اور بھی وسیع کیا گیا۔ سخت تعجب اور حیرت کا مقام ہے کہ اس قسم کی شرانگیز کارروائیوں اور دروغ بافیوں کے مرتکب مطلق نہیں شرماتے اور یہ یقین رکھتے ہیں کہ صدق و راستی پر کذب و دروغ غالب آجائے گا اور حقیقت و اصلیت ہمیشہ کے لئے روپوش و مدفون ہو جائے گی۔ حالانکہ ع

ایں خیال است و محال است و جنوں

ان ناشدنی کارروائیوں کا یہ افسوسناک نتیجہ ہے کہ ہندو مسلمانوں کے قدیمی خوشگوار تعلقات کا واپس ہونا ظاہر بیں نگاہوں کو غیر ممکن معلوم ہونے لگا ہے۔

آئینۂ حقیقت نما کی خصوصیت

میں نے ہندو مسلمانوں کے گیارہ سو سال (۷۱۲ء سے ۱۸۱۲ء تک) کے تعلقات پر تاریخی واقعات کے ذریعہ روشنی ڈالی ہے اور ایسا مواد فراہم کر دیا ہے جس سے مطالعہ کرنے والے کے دل میں کوئی شک و شبہ انشاء اللہ تعالیٰ باقی نہیں رہ سکے گا غلط فہمیوں کے بادل پھٹ جائیں گے اور اس حقیقت کا چہرہ کہ مسلمانوں نے اپنے عہدِ حکومت میں ہندوؤں کے ساتھ کیسا سلوک کیا؟ صاف نظر آجائے گا اسی لئے اس کتاب کا نام میں نے "آئینۂ حقیقت نما" تجویز کیا ہے۔ اس کتاب کو ہندوستان کی وہ تاریخ نہ سمجھا جائے جس کے شائع کرنے کا میں پہلے اعلان کر چکا ہوں اور جو اس کے بعد انشاء اللہ تعالیٰ شائع ہونے والی ہے۔ اس کتاب میں صرف وہی واقعات درج کئے گئے ہیں جن سے ہندو مسلمانوں کے قدیمی تعلقات کا صحیح اندازہ کیا جا سکے۔ اس مختصر کے پڑھنے سے یہ بھی اندازہ ہو سکے گا کہ آج کل موجودہ ضرورتوں کو مدِ نظر رکھ کر ہندوستان کی صحیح اور مکمل تاریخ کا مرتب کرنا کس قدر ضروری اور اہم کام ہے مورخین کا دستور ہے کہ وہ کتاب کے دیباچہ میں ان تاریخی کتابوں کی ایک فہرست درج کر دیا کرتے ہیں جن سے انھوں نے اس تصنیف میں مدد لی ہے۔ لیکن میں اگر ایسی کتابوں کی فہرست درج کرنا چاہوں تو اس فہرست کا نمبر شمار شاید سیکڑوں سے گزر کر ہزاروں تک پہنچ جائے لہٰذا میں یہ کام قارئین کرام کے سپرد کرتا ہوں وہ اگر کوئی مختصر سی فہرست مرتب کرنا چاہیں تو اس کتاب کو مطالعہ فرماتے ہوئے خود ہی مرتب فرمالیں کیونکہ میں نے مشہور تاریخوں بالخصوص ہندو اور ہندو پرست مصنفوں کی کتابوں سے جا بجا اقتباسات نقل کر دیئے ہیں جو مطالعہ کرنے والے کے علم کو عین الیقین تک پہنچا دینے کے لئے کافی ہیں۔ تاہم اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ میرے اس کام میں بہت سے اسقام اور نقائص رہ گئے ہوں گے۔ میں انسان ہوں اور عام انسانی کمزوریوں سے بالاتر نہیں ہوں، میں نے یہ کام کسی قدر عجلت اور پریشانی کے عالم میں کیا ہے اور نظر ثانی و تہذیب کا موقعہ بھی نہیں مل سکا ہے۔ ؎

خاطر مسلسل است و پریشاں چو زلفِ یار
علیم مکن کہ در شبِ ہجراں نوشتہ ام

مگر چونکہ میری نیت نیک ہے اور ثواب سمجھ کر یہ کام کیا ہے لہذا خدائے تعالےٰ سے اجر کی توقع رکھتا ہوں اور وہی اگر اس ناچیز کوشش کو قبول فرمائے تو میرا بیڑا پار ہے۔

رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَیْرُ الرَّاحِمِیْنَ۔

اکبر شاہ خاں
نجیب آبادی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدّمہ

اس مقدمہ کو چند چھوٹے چھوٹے مقدمات کا مجموعہ کہنا چاہیئے ذیل میں چند نہایت ضروری باتیں اس لئے درج کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ کتاب کی تصنیف و تالیف کا مقصد جو بہ احسن پورا ہو اور مطالعہ کرنے والے کے دماغ میں ایسی صلاحیت پیدا ہو جائے کہ وہ سکون قلب کے ساتھ ابواب کتاب کو مطالعہ کر سکے اور ان کے علم اور واقفیت میں اضافہ ہو۔

(۱) اسلام اور احکام جنگ

غلط فہمیاں پھیلانے اور جھوٹ بولنے والوں نے ایک یہ تہمت بھی تراشی ہے کہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو لوگوں کو خون ریزی و سفاکی کی تعلیم دیتا اور خود غرضی و نفس پرستی سکھاتا ہے۔ حالانکہ اسلام کا نام ہی خود بتا رہا ہے کہ یہ مذہب ضرور سلامتی و سلامت روی و مسالمت و رواداری کی تعلیم دیتا ہوگا۔ اسلام اور اس کی تعلیم سے واقف ہونے کے لئے قرآن مجید اور آنحضرت محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسوۂ حسنہ سے واقف ہونے کی ضرورت ہے۔ جن لوگوں کو مطالعہ کی وسیع فرصت میسر نہیں ہے ان کے لئے میری کتاب حجۃ الاسلام کا مطالعہ کافی ہے۔ اس جگہ صرف اشارے کے طور پر عرض کیا جاتا ہے کہ تمام مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ چھٹی صدی عیسوی کے آخر میں تمام دنیا پر انتہائی جہالت و ظلمت چھا گئی تھی۔ ایران، روم، مصر، عرب، ہندوستان، چین۔ غرضکہ ہر ملک اور ہر قوم انسانیت، تہذیب اور روحانیت سے بالکل معرا ہو کر ذلالت و پستی کے انتہائی مقام پر پہنچ چکی تھی۔ ایران میں زردشتی مذہب اور مجوسی اخلاق

منو کی بداخلاقی کا جامہ پہن چکا تھا۔ وہاں نفس پرستی اور بدچلنی نے شاہی درباروں اور شرفا کے گھروں کی چار دیواریوں میں بھی اپنا عمل دخل بٹھا لیا تھا۔ نوع انسان کی شرافت چند صاحب طبل و علم اور طاقتور لوگوں کا حصہ بن کر باقی تمام انسانوں کو چوپاؤں کی صف میں کھڑا کر دیا گیا تھا۔ ہندوستان میں منو کی مذہب کا شنتی بام مارگی مذہب کے نام سے موجود تھا۔ بام مارگیوں کا صرف نام ہی لے دینا کافی ہے جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس زمانے کی اخلاقی زمین میں کیسے کیسے تخم نشوونما پا سکتے تھے۔

ایک چینی سیاح کا بیان

اسی زمانے میں ایک چینی سیاح ہیونگ شیانگ ہندوستان میں آیا تھا وہ اپنے سفرنامے میں ہندوستان کے کسی ایک گھر کو بھی بتوں سے خالی نہیں بتاتا اور جو جو اعمال ان بتوں کی پوجا میں بجا لائے جاتے تھے اُن کے سننے سے حیرت ہوتی ہے کہ انسان جس کو اشرف المخلوقات کا مرتبہ حاصل ہے کس قدر پستی و رذالت میں پہنچ چکا تھا۔ پتھروں، درختوں، دریاؤں، پہاڑوں، چوپایوں اور سانپوں سے گذر کر عورت و مرد کی شرمگاہوں تک کو اس انسان نے اپنا معبود و مسجود بنا لیا تھا۔ یونان و روم کی بت پرستی ہندوستان کی بت پرستی سے کسی طرح کم نہ تھی وہاں بھی چند طاقتور اور صاحب اقتدار ہستیوں یعنی بادشاہوں، سپہ سالاروں اور امیروں کو خدائی کے دعوے تھے۔ یہ لوگ اپنے ہم جنس انسانوں کو اس قدر ذلیل سمجھتے اور ایسے مظالم اُن پر روا رکھتے تھے کہ آج اگر اُن کا عشر عشیر ظلم بھی کوئی شخص کسی بیل یا گھوڑے پر روا رکھے تو اُس پر فوراً مقدمہ قائم ہو جائے اور قید و جرمانہ کی سزا پائے۔ وہاں عورتوں کو ترغیب دی جاتی تھی کہ وہ خودکشی کریں اور اونچے اونچے پہاڑوں کی چوٹیوں سے گر کر تماشائیوں کے لئے سامان تفریح بنیں۔ خدائے واحد کا نام لینے والا اور بتوں کو چھوڑ کر خدا کی عبادت کرنے والا اُن ملکوں میں تلاش نہیں کیا جا سکتا تھا یہی حال مصر و چین کا تھا۔

ساری کی ساری دنیا بدچلنی، ظلم، بے حیائی، سفاکی اور جہالت میں مبتلا ہو کر تیرہ و تار ہو چکی تھی۔ ملک عرب ان تمام رذالتوں اور جہالتوں کا مرکز بنا ہوا تھا کیونکہ یہ نالائقیاں اس ملک میں حد سے زیادہ ترقی کر چکی تھیں۔ ایسے زمانے اور ایسے ملک میں آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے دنیا کی اس رذالت اور پلیدی کو دور کرنے کے لئے توحید کا علم بلند کیا اور پچیس سال سے کم عرصہ میں ملک عرب کے باشندوں کو تمام دنیا کا معلم اور رہبر بنا دیا۔

ابھی پہلی صدی ہجری ختم نہ ہونے پائی تھی کہ چین کے ساحل سے مراقش و اسپین کے ساحل تک تمام تمدن دنیا مسلمانوں کے زیر سایہ ہر قسم کے اخلاق فاضلہ میں ترقی کر رہی تھی۔ اسلام کی اس حیرت انگیز کامیابی پر غور کرنے کے بعد ہر اہلِ عقل اس بے بنیاد فریب میں مبتلا نہیں ہو سکتا کہ اسلام کی کامیابی کا سبب ظلم و تشدد و قتل و غارت۔ اور نفس پرستی وغیرہ میں مضمر ہے۔ معمولی سے معمولی اور ادنیٰ درجہ کی قابلیت کا انسان بھی اس حقیقت کو سمجھ سکتا ہے کہ کوئی مذہب، کوئی قوم اور کوئی ملک قتل و غارت، ظلم و تشدد اور نفس پرستی کے ذریعہ کامیابی و کامرانی کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا اور ہلاکت و ناکامی سے نہیں بچ سکتا۔ مگر اسلام اور مسلمانوں کے دشمنوں نے آج تک بھی اس صاف سیدھی اور پیش پا افتادہ بات کی طرف متوجہ ہونا نہیں چاہا اور مرغے کی ایک ہی ٹانگ بتانے پر اصرار کیا۔ بہر حال اگر کوئی شخص اس خاص معاملہ میں اسلام کی تعلیم سے صحیح واقفیت حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کو قرآنِ کریم کی مندرجہ ذیل آیات پر غور کرنا چاہیئے۔

شرع لکم من الدین ما وصیٰ به نوحاً والذی اوحینا الیک وما وصینا به ابراهیم وموسیٰ وعیسیٰ ان اقیموا الدین ولا تتفرقوا (شوریٰ رکوع ۲)	خدا نے تمھارے لئے دین کا وہ راستہ بنایا ہے جس کا حکم نوح کو دیا گیا اور پھر محمد صلعم پر اُس کی وحی بھیجی اور ابراہیم و موسیٰ و عیسیٰ کو بھی اُسی کا حکم دیا تھا کہ دین پر سیدھے چلو اور اُس میں تفرقہ نہ ڈالو۔
وامرهم شوریٰ بینهم (شوریٰ ۴)	اور مومن اپنے کاموں کو مشورے سے طے کیا کرتے ہیں
لا یجرمنکم شنان قوم علیٰ ان لا تعدلوا اعدلوا (سورۂ مائدہ ۲)	کسی قوم کی عداوت کے سبب اُس قوم سے بے انصافی مت کرو بلکہ انصاف کرو۔
کونوا قوامین بالقسط شهداء لله ولو علیٰ انفسکم او الوالدین والاقربین (سورۂ نساء رکوع ۲۰)	انصاف پر قائم ہو جانے والے ہو جاؤ اللہ کے لئے گواہی دو چاہے اپنے یا اپنے والدین اور رشتہ داروں کے برخلاف گواہی دینی پڑے۔
فاجتنبوا الرجس من الاوثان واجتنبوا قول الزور (سورۂ حج رکوع ۴)	بتوں کی ناپاکی سے بچو اور جھوٹی باتوں سے بچو۔
وعباد الرحمٰن الذین یمشون علی الارض هوناً واذا خاطبهم الجاهلون قالوا	اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر صلح کاری سے چلتے ہیں اور جب جاہل اُن سے خطاب کریں تو سلامتی کی

سلامًا (سورہ فرقان رکوع ۶)

باتیں کرتے ہیں۔

وان جنحوا للسلم فاجنح لھا (سورۃ الانفال رکوع ۸)

اور اگر لوگ صلح کرنے پر مائل ہوں تو تو بھی صلح کی طرف جھک جا۔

الصلح خیر (سورہ النساء رکوع ۱۹)

صلح خیر و برکت ہے۔

ولا تبخسوا الناس اشیاءھم ولا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحھا (سورۃ اعراف رکوع ۱۱)

اور لوگوں کو اُن کی چیزیں کم نہ دو اور زمین میں اصلاح کے بعد فساد نہ مچاؤ۔

لا ینھٰکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم ان تبروھم وتقسطوا الیھم ان اللہ لا یحب المقسطین (سورہ ممتحنہ رکوع ۲)

جن لوگوں نے تم سے دین کے بارے میں جنگ نہیں کی اور تم کو تمھارے گھروں سے نہیں نکالا اللہ تم کو اس بات سے نہیں روکتا کہ تم اُن سے نیک سلوک کرو اور اُن سے انصاف کا برتاؤ کرو بے شک اللہ پسند کرتا ہے انصاف کرنے والوں کو۔

وتعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان (سورہ مائدہ رکوع ۱)

اور ایک دوسرے کی خدا ترسی اور نیکی کے کاموں میں مدد کرو اور بغاوت و بدکاری کے کاموں میں مدد نہ کرو۔

ادفع بالتی ھی احسن فاذا الذی بینک وبینہ عداوۃ کانہ ولی حمیم وما یلقٰھا الا الذین صبروا وما یلقٰھا الا ذو حظ عظیم (حم سجدہ رکوع ۵)

تو بُری بات کو نیک بات کے عوض میں ٹال دے تب جلد تیرا دشمن بھی دلی دوست ہو جائے گا اس کام کا ذمہ اُٹھانا بڑی برداشت والوں کا کام ہے اور اسے بڑے نصیب والے اختیار کرتے ہیں۔

ولا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ فیسبوا اللہ عدوًا بغیر علم (سورۃ انعام رکوع ۱۳)

مشرکوں کے ساتھ بدزبانی کا برتاؤ مت کرو ورنہ پھر وہ ضد اور نادانی سے اللہ کو بُرا کہیں گے۔

ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ وجادلھم بالتی ھی احسن۔ ان ربک ھو اعلم بمن ضل عن سبیلہ وھو اعلم بالمھتدین وان

لوگوں کو اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعہ بلاؤ اور اُن سے مباحثہ کرو تو بہت پسندیدہ طور پر کرو تیرا رب اُن لوگوں کو بھی خوب جانتا ہے جو اس کے راستے سے بہک گئے اور وہ راہ پانے والوں سے بخوبی واقف

عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم به ولئن صبرتم لهو خير للصابرين (سورہ نحل رکوع ۱۶) ہے مخالفین کے ساتھ انتقاماً سختی بھی کرو تو ویسی ہی کرو جیسی سختی تمہارے ساتھ کی گئی ہو اور اگر ایذاؤں پر صبر کرو تو بہرحال صبر کرنے والوں کے حق میں صبر کرنا ہی بہتر ہے۔

ان آیات پر غور کرنے سے ایک خالی الذہن منصف مزاج شخص پر ثابت ہو سکتا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں پر لوگوں نے قتل و غارت اور ظلم و ستم کی تہمتیں لگانے میں بڑی بے انصافی سے کام لیا ہے۔ اس جگہ یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ قرآن مجید میں ایک بھی آیت ایسی نہیں جس میں مال و دولت حاصل کرنے یا ملک گیری کے لئے لوگوں پر زیادتی اور اعتدا کی اجازت دی گئی ہو ہدایت اور ترغیب کا تو ذکر ہی کیا۔

قرآن مجید میں احکام جنگ کی حکمت

ہاں قرآن مجید میں احکام جنگ ہیں لیکن وہ تمام احکام جنگ محض دفاعی اور خود حفاظتی ہیں۔ قرآن کریم نے مسلمانوں کو اس لئے جنگ کی اجازت دی ہے کہ وہ فتنہ و فساد اور بدامنی کو مٹا کر دنیا میں امن و امان قائم کردیں۔ اسلام چونکہ عین فطرت انسانی کے مناسب مذہب ہے لہٰذا اسلام کو سمجھنے اور اُس پر آزادانہ غور کرنے کے لئے ضرورت ہے کہ دُنیا میں امن وامان قائم اور ہر انسان کو اُس کی جائز آزادی حاصل ہو، تاکہ مذہب کے سمجھنے اور اُس کے اختیار کرنے میں کوئی بے جا رکاوٹ حائل نہ رہے۔ بنابریں اسلام سب سے زیادہ امن وامان اور صلح و آشتی کا خواہاں ہے اور اسی لئے وہ فساد کے مٹانے اور امن و امان قائم کرنے کی غرض سے اگر ضرورت ہو تو جنگ کرنا بھی ضروری سمجھتا ہے۔ دنیا میں کون سمجھ دار شخص ایسا ہے جو اسلام کی اس تعلیم کو قابلِ اعتراض اور مذموم قرار دے سکے۔

غیر مسلموں کی جنگ اور اسلامی جہاد میں فرق

عیسائیوں، مجوسیوں، یہودیوں اور ہندوؤں وغیرہ کے مذاہب میں جس قسم کی لڑائیوں کے احکام ہیں اُن کو اگر اسلامی احکام جنگ کے مقابل رکھا جائے اور عدل وانصاف کی عینک لگا کر پرکھا جائے تو یقیناً کسی عیسائی، مجوسی، یہودی آریہ اور ہندو کو اسلام کے متعلق ایک لفظ بھی معترضانہ لہجہ میں زبان تک لانے کی جرأت نہیں ہو سکتی ان مذاہب میں کوئی بھی مذہب ایسا نہیں ہے جس نے جنگ کے لئے

ترغیب نہ دی ہو یا اُس مذہب کی جائز قرار دادہ جنگ اسلامی جہاد سے زیادہ یا اسلامی جہاد کی برابر معقول اور مناسب قرار دی جاسکے۔ قرآن مجید صاف صاف فرماتا ہے۔

لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی (بقر رکوع ۳۴)

دین میں کوئی جبر نہیں ہے۔ ہدایت اور گمراہی میں یقیناً کھلا کھلا فرق ظاہر ہو گیا ہے۔ جبر اور زبردستی کی کیا ضرورت ہے۔

قرآن مجید نے کن حالات میں جنگ کی اجازت دی ہے ذیل کی آیات سے ظاہر ہے۔

وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا ان اللہ لا یحب المعتدین (بقرہ رکوع ۲۴)

مسلمانو! جو لوگ تم سے لڑیں تم بھی اللہ کے رستے یعنی دین کی حمایت میں اُن سے لڑو اور زیادتی نہ کرو۔ اللہ کسی طرح زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

اذن للذین یقاتلون بانہم ظلموا وان اللہ علی نصرہم لقدیر۔ (سورۂ حج رکوع ۶)

اجازت دی جاتی ہے اُن لوگوں کو جن سے جنگ کی جا رہی ہے کہ وہ بھی جنگ کریں اس لئے کہ وہ مظلوم ہیں اور یاد رکھیں کہ اللہ اُن کی نصرت پر قادر ہے۔

الا تقاتلون قوما نکثوا ایمانہم وھموا باخراج الرسول وھم بدؤکم اول مرۃ (سورہ توبہ رکوع ۲)

تم کیوں جنگ نہیں کرتے اُن لوگوں سے جنہوں نے توڑ دیا اپنی قسموں کو عہد کرنے کے بعد اور پختہ ارادہ کر لیا رسول کے نکال دینے کا اور انہیں لوگوں نے پہلی دفعہ تم سے جنگ کرنے میں ابتدا کی۔

قرآن مجید نے مسلمانوں کو صرف اُنہیں لوگوں کا مقابلہ کرنے کی اجازت دی ہے جو بلا وجہ حملہ آور ہوں اور قسموں اور عہدناموں کو توڑ کر فتنہ و فساد برپا کرنے لگیں اور مسلمانوں کو چین سے نہ بیٹھنے دیں اور مسلمانوں کے قتل کرنے میں ابتدا کر چکے ہیں۔

وان احد من المشرکین استجارک فاجرہ حتی یسمع کلام اللہ ثم ابلغہ مامنہ ذلک بانہم قوم لا یعلمون (سورہ توبہ رکوع ۱)

اگر تجھ سے کوئی شخص مشرکوں میں سے پناہ کا خواستگار ہو تو اُس کو پناہ دے اور اُس وقت تک اُس کو اپنی پناہ میں رکھ کر وہ اطمینان سے خدا کے کلام کو سن سمجھ لے اور پھر اُس کو اُس کے امن کی جگہ پر واپس پہنچا دے یہ رعایت اُن لوگوں کے حق میں اس لئے ضروری ہے کہ یہ لوگ اسلام کی حقیقت سے واقف نہیں ہیں۔

ظاہر ہے کہ اگر قرآن مجید میں جبر و تعدی کی تعلیم ہوتی تو یہ حکم نہ ہوتا کہ جو کافر قرآن مجید کو سننا چاہے اور سننے کے بعد مسلمان نہ ہو تو اس کو اُس کے امن کی جگہ پر پہنچا دو بلکہ یہ

حکم ہوتا کہ جب ایسا کافر قابو میں آجائے تو اُس کو فوراً زبردستی مسلمان بنالو۔

قرآن مجید کی ایک آیت کے متعلق معترضین کا جواب

ہاں! قرآن مجید میں یہ حکم بھی موجود ہے کہ:-

قاتلوا الذین لا یؤمنون باللہ ولا بالیوم الآخر ولا یحرمون ما حرم اللہ ورسولہ ولا یدینون دین الحق من الذین اوتوا الکتاب حتی یعطوا الجزیۃ عن ید وھم صاغرون (سورۃ توبہ رکوع ۴)	وہ اہل کتاب جو نہ خدا کو مانتے ہیں اور نہ آخرت پر ایمان لاتے ہیں اور نہ خدا اور اس کے رسول کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حرام سمجھتے اور نہ دیانت اور سچائی کی راہ کو اختیار کرتے ہیں اُن سے تم لڑو۔ یہاں تک کہ ذلیل ہوکر اپنے ہاتھوں سے جزیہ دیں۔

بس یہی ایک آیت ہے جس سے بعض نادان معترضوں کو دھوکہ لگا ہے کہ قرآن شریف میں لوگوں کو مسلمان بنانے کے لئے لڑائی کا حکم دیا گیا ہے لیکن اس آیت میں اور اس سے آگے کی آیات میں بھی مسلمان بنانے کا کوئی حکم یا ذکر نہیں ہے۔ اگلے رکوع کے پڑھنے سے صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ اُن اہلِ کتاب کا ذکر ہے جو علانیہ طور پر جرائم پیشہ ہوگئے تھے جیسا کہ خدائے تعالیٰ فرماتا ہے۔

وتریٰ کثیرا منھم یسارعون فی الاثم والعدوان واکلھم السحت لبئس ما کانوا یعملون ۝ لولا ینھاھم الربانیون والاحبار عن قولھم الاثم واکلھم السحت لبئس ما کانوا یصنعون۔ سورۃ مائدہ رکوع ۹)	اور اے پیغمبر تم ان میں سے بہتیروں کو دیکھوگے کہ گناہ کی بات یعنی جھوٹ اور ظلم اور مال حرام کے کھانے پر گرے پڑتے ہیں بہت ہی بُرے ہیں وہ کام جو یہ لوگ کرتے ہیں ان کو ان کے ربی یعنی مشائخ اور علماء جھوٹ بولنے اور مال حرام کے کھانے سے کیوں منع نہیں کرتے۔ بہت ہی بری ہے وہ درگذر جو ان کے مشائخ اور علما کرتے رہے ہیں۔

پھر ان کی بدزبانیوں۔ گستاخیوں اور اوباشانہ طرزِ عمل کا ذکر کرکے فرمایا کہ۔

کلما اوقدوا نارا للحرب اطفاھا اللہ ویسعون فی الارض فسادا واللہ لا یحب المفسدین۔ (مائدہ رکوع ۹)	جب کبھی یہ لڑائی کی آگ بھڑکاتے ہیں خدا اُس کو بجھا دیتا ہے اور ملک میں فساد پھیلاتے پڑے پھرتے ہیں اور اللہ فسادیوں کو دوست نہیں رکھتا۔

پادری فنڈر کا اعتراف پادری فنڈر اپنی کتاب میزان الحق میں اس امر کی تصدیق کرتا ہوا

کہتا ہے کہ درحقیقت ملک عرب میں جو عیسائی اور یہودی تھے وہ سخت بدچلن ہو گئے تھے اور ملک کے لئے اُن کا وجود خطرناک تھا۔ قرآنِ کریم میں ان ہی لوگوں کے متعلق ایک جگہ ارشاد ہے کہ۔

ان کثیرًا من الاحبار والرهبان لیأکلون اموال الناس بالباطل و یصدون عن سبیل الله والذین یکنزون الذهب والفضة ولا ینفقونها فی سبیل الله فبشرهم بعذاب الیم
(سورۃ توبہ رکوع ۵)

اہل کتاب کے اکثر عالم اور مشائخ لوگوں کے مال ناحق ناروا ہڑپ کرتے اور راہ خدا سے لوگوں کو روکتے ہیں اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے رہتے اور اُس کو خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو اے پیغمبر ان کو روز قیامت کے عذابِ دردناک کی خوش خبری سُنادو۔

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے۔

ومن اهل الکتاب من ان تامنه بقنطار یؤده الیک ومنهم من ان تامنه بدینار لا یؤده الیک الا ما دمت علیه قائما ذلك بانهم قالوا لیس علینا فی الامیین سبیل ویقولون علی الکذب وهم یعلمون۔
(آل عمران ع ۸)

اور اہلِ کتاب میں سے بعض ایسے ہیں کہ اگر اُن کے پاس زر نقد کا ڈھیر بھی امانت رکھوا دو تو جب مانگو اُٹھا تمھارے حوالے کریں اور اُن میں سے بعض ایسے ہیں کہ زیادہ نہیں ایک بہت چھوٹی سی اشرفی بھی اُن کے پاس امانت رکھو تو وہ تم کو بدون اس کے واپس نہ دیں کہ ہر وقت تقاضے کے لئے اُن کے سر پہ کھڑے رہو ان لوگوں میں یہ بدمعاملگی اس وجہ سے آئی کہ وہ پکارے گئے کہتے ہیں کہ عرب کے جاہلوں کا حق مار لینے میں ہم سے باز پُرس نہیں ہوگی اور جان بوجھ کر اللہ پر جھوٹ بولتے ہیں۔

عرب کے مشرکوں کی طرح یہود و نصاریٰ بھی سخت بدچلن اور جرائم پیشہ ہو چکے تھے۔ تمام ملک مطلق العنان تھا عرب میں نہ کوئی باقاعدہ سلطنت تھی نہ کوئی ملکی قانون تھا جس کی پابندی سب پر لازم ہوتی ایسی حالت میں جرائم پیشہ لوگوں کو سزا دینا۔ ان سے اقرار اطاعت لینا ان کو فساد اور جرائم سے باز رکھ کر امن و امان قائم رکھنے والے قانون کے ماتحت بنانا قابل اعتراض کیسے ہو سکتا ہے۔ ہاں اگر اس معاملہ میں آنحضرت صلعم سے غفلت اور کم التفاتی سرزد ہوتی تو موجبِ الزام تھا اسی لئے خدائے تعالیٰ نے فرمایا کہ۔

وقاتلوا فی سبیل الله الذین یقاتلونکم

تم خدا کی راہ میں اُن لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں۔

ولا تعتدوا۔ ان اللہ لا یحب المعتدین (دوسروں سے کچھ غرض نہ رکھو) اور زیادتی مت کرو۔
(بقرہ رکوع ۲۴) خدائے تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا

اس حکم کو تبلیغ دین اور اشاعت اسلام سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ اسلام کی اشاعت اور دین کی تبلیغ کے متعلق تو صاف حکم قرآن مجید میں موجود ہے۔

وقل للذین اوتوا الکتاب والامیین ءاسلمتم فان اسلموا فقد اھتدوا وان تولوا فانما علیک البلاغ۔
(آل عمران رکوع ۲)

اے پیغمبر اہل کتاب اور عرب کے جاہلوں سے کہو کہ کیا تم دین اسلام میں داخل ہوتے ہو پس اگر اسلام قبول کرلیں تو ہدایت پا گئے اور اگر منہ موڑیں تو تمہارا تو صرف اتنا ہی کام ہے کہ حکم الٰہی پہنچا دو۔

اس آیت میں یہ نہیں لکھا کہ تمہارا یہ بھی کام ہے کہ تم ان سے جنگ کرو پس ظاہر ہے کہ جنگ اُن جرائم پیشہ لوگوں سے کی جاتی تھی جو مسلمانوں کو قتل کرتے تھے یا امن عامہ میں خلل ڈالتے تھے۔ پھر ایک جگہ حکم ہوتا ہے کہ

اُذن للذین یقاتلون بانھم ظلموا وان اللہ علیٰ نصرھم لقدیر الذین اخرجوا من دیارھم بغیر حق الا ان یقولوا ربنا اللہ ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لھدمت صوامع وبیع وصلوات ومساجد یذکر فیھا اسم اللہ کثیراً ط ولینصرن اللہ من ینصرہ ط ان اللہ لقوی عزیز۔
(حج رکوع ۶)

جن مسلمانوں سے کافر لڑتے ہیں اب اُن کو بھی اُن کافروں سے لڑنے کی اجازت ہے اس واسطے کہ اُن پر ظلم ہو رہا ہے اور کچھ شک وشبہ نہیں کہ اللہ اُن کی مدد کرنے پر قادر ہے یہ وہ مظلوم لوگ ہیں جو بیچارے صرف اتنی بات کے کہنے پر کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے ناحق ناروا اپنے گھروں سے نکال دیئے گئے اور اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ہاتھ سے نہ ہٹواتا رہتا تو نصاریٰ کے صومعے اور گرجے اور یہودیوں کے عبادت خانے اور مسلمانوں کی مسجدیں جن میں کثرت سے خدا کا نام لیا جاتا ہے کبھی کے ڈھائے جا چکے ہوتے اور جو اللہ کے کام میں مدد کرے گا اللہ بھی ضرور اُس کی مدد کرے گا کچھ شک وشبہ نہیں کہ اللہ زبردست اور سب پر غالب ہے۔

قرآن مجید نہ صرف مسجدوں کی حفاظت کو ضروری سمجھتا ہے بلکہ وہ دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کو بھی ظالموں کے ہاتھ سے بچانا چاہتا ہے اور ظاہر ہے کہ قرآن مجید نے عبادت گاہوں کے منہدم کرنے والوں اور مذہبی آزادی کے دشمنوں سے جنگ کرنے کی

اجازت محض اس لئے دی ہے کہ مذہب کے سمجھنے اور قبول کرنے میں کسی قسم کے جبر واکراہ اور جور و تعدی کو دخل نہ رہے اسلام چونکہ عین فطرتِ انسانی کے موافق اور دلائل حقہ و براہین نیرّہ سے موئید مذہب ہے لہٰذا اُس کی اشاعت اُسی وقت زیادہ ہوسکتی ہے جب کہ ہر قسم کا امن امان دنیا میں قائم ہو اور اسلام کے سمجھنے اور اُس سے واقف ہونے کا موقع لوگوں کو میسر ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام سب سے زیادہ فتنہ وفساد اور بدامنی کا دشمن اور امن وامان کا خواہاں ہے لاتفسدو فی الارض بعد اصلاحھا۔ اور اسی لئے اگر ضرورت ہو تو وہ امن و امان کے قائم کرنے کی غرض سے جنگ کرنے اور تلوار سے کام لینے کو بھی جائز بلکہ ضروری سمجھتا ہے۔

(۲) اخوت و مساوات و رواداری

ہم کو اس بات کا اقرار کرنا چاہیئے کہ ایک مرتبہ ہندوستان قدیم میں بھی اخوت ومساوات کا آوازہ بلند ہو چکا ہے یعنی گوتم بدھ نے سیاسی وقومی و مذہبی حقوق میں مساوات پیدا کرنے کی نہایت موثر کوشش کی اور اسی لئے ہم گوتم بدھ کو قدیم ہندوستان کا مصلحِ اعظم کہہ سکتے ہیں گوتم بدھ کے قائم کئے ہوئے مذہب کو مہاراجہ اشوک کے زمانہ میں سب سے زیادہ عروج حاصل ہوا اور ہندوستان میں مہاراجہ اشوک اور چندر گپت کے زمانے ہی میں شہنشاہی قائم ہوسکی نہ اخوت انسانی اور مساوات و رواداری کی کوئی مثال قائم ہوتی۔

ہندو مذہب کی تعلیمات ویدوں کے زمانے کے عام ہندو اخلاق اور اُس کی خوبی یا بُرائی کے بیان کرنے کا یہ موقعہ نہیں ہے اس وقت اسی قدر بیان کر دینا کافی ہے کہ ہندو مذہب کے روشن پہلو اور ہندو قوم کے قابلِ تعریف اخلاق کا خلاصہ اور منتہائے ترقی یہ ہے کہ انسان تارک الدنیا اور تمام علائق سے منقطع ہو کر جنگلوں، پہاڑوں اور غاروں میں تنہائی کی زندگی بسر کرے۔ یہی وجہ ہے کہ مدنیت اور جمہوریت کی قابل تذکرہ مثالیں ہندوستان کی قدیم تاریخ میں موجود نہیں ہیں ہندوؤں کی چھوت چھات اور برہمن، چھتری، ویش، شودر کی تقسیم ہندوؤں کے سیاسی، اخلاقی اور روحانی تنزل کا سب سے بڑا سبب ہے۔ منو مہاراج نے جن کو ہندوستان کا مقننِ اعظم کہا جاتا ہے اپنے شاستر میں برہمنوں کا اقتدار بڑھانے اور شودروں کے حقوق کو بالکل برباد اور فنا کرنے کے لئے ایسے سخت قوانین وآئین بنائے کہ اس سے بڑھ کر نسلِ انسانی پر شاید

ہی کوئی ظلم کہیں ہوا ہو۔

قانونِ منو کی رو سے شودر جنمی غلام ہیں۔ غلامی ان کا طبعی خاصہ ہے مالک کے آزاد کر دینے کے باوجود بھی وہ آزاد نہیں کہلا سکتے۔ اعلیٰ ذات کے ہندوں کے ستان کا مس کرنا تو کجا سایہ بھی باعثِ ناپاکی ہے۔ یہ شودر، وہ لوگ تھے جو ایران کی طرف سے آریوں کے ہندوستان میں آنے سے پیشتر اس ملک میں آزادانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ آریوں نے جب اُن کو مغلوب کرکے اپنا محکوم بنا لیا تو اُن کو اپنی تہذیب اپنے علوم اور اپنے اخلاق سکھانے نہ چاہے بلکہ ہر اعتبار سے اُن کو پست و ذلیل ہی رکھنا چاہا۔ اور شودر کا خطاب دے کر اُن سے اس طرح خدمات لینی شروع کیں جس طرح چوپایوں سے انسان خدمت لیتا ہے چنانچہ اس کے ثبوت میں منو شاستر کے وہ ابواب پیش کئے جا سکتے ہیں جو برہمنوں اور شودروں کے حقوق کو واضح اور متعین کرتے ہیں۔ منو شاستر کی رو سے برہمن کا کام شاستر پڑھنا پڑھانا۔ یگ کرنا یگ کرانا، اعلیٰ ذاتوں کی پروہتی کرنا اور تحائف لینا تھا۔ برہمنوں کی عورتیں دیویاں اور برہمن دیو کہلاتے تھے۔ شودر اگر پکی ہوئی روٹی کو چھو دے تو وہ روٹی پلید ہو جاتی تھی۔ عورتیں خواہ کسی ذات کی ہوں مردوں کے مقابلہ میں ذلیل تھیں۔ شودر، وید کو سُن بھی نہیں سکتا تھا اور اگر بلا ارادہ اُس کے کان میں وید کے الفاظ پڑ جائیں تو اُس کو نہایت اذیت کے ساتھ بہرا بنا دینا ضروری تھا برہمن اگر کوئی عظیم الشان جرم کرے تب بھی اُس کو قتل نہیں کیا جاتا تھا۔ دنیا میں کوئی چیز شودر کی ملکیت نہیں تھی۔

منو شاستر کے پانچویں باب میں صاف مذکور ہے کہ شودر کو جھوٹی خوراک کھانا، پُرانے کپڑے پہننا اور نکما اسباب خانہ داری رکھنا چاہیے اور کوئی شودر برہمن یا چھتری کی نسبت کوئی بُرا لفظ زبان سے نکالے تو اُس کی زبان کاٹ لینی چاہیے کیونکہ وہ نیچی ذات کا آدمی ہے۔ آٹھویں باب میں ہے کہ اگر کوئی نیچی ذات کا آدمی اعلیٰ ذات کے آدمی کے ساتھ اُس کی برابر بیٹھے تو اُس کی پیشانی پر داغ لگا کر جلا وطن کر دینا چاہیے یا راجہ اُس کی پیٹھ میں سے ایک حصہ گوشت کا کاٹ ڈالے شودر کو اگر کوئی برہمن بلا وجہ قتل کر دے تو اُس کے قصاص میں برہمن کو ہرگز قتل نہیں کیا جا سکتا۔ زیادہ سے زیادہ اُس کو جرمانہ ادا کرنا پڑتا تھا۔ شودروں کے لئے لازمی تھا کہ وہ جب کسی راستے یا کوچے سے گذریں تو خاص قسم

کی آواز دیتے جائیں تاکہ اعلیٰ ذات کے آدمی خبردار ہو جائیں اور اُن پر اُس شودر کا سایہ نہ پڑنے پائے۔

غرض اس قسم کے صدہا قوانین تھے جن کا کچھ کچھ مٹا ہوا اثر آج تک بھی ہندوؤں میں موجود ہے کہ وہ نیچ ذات کے لوگوں سے ہمسرانہ سلوک روا نہیں رکھتے منوشاستر کی رو سے مشترکہ خاندان میں عورتیں وراثت سے محروم ہیں۔ یعنی باپ کے تمام ترکہ کے مالک بیٹے ہوتے ہیں۔ بیٹیاں محروم الارث قرار دی گئی ہیں۔ غرض منو کے قانون کی رو سے ہندوستان کی آبادی کا ایک بڑا حصہ حکماً مجبور رہے کہ وحشیانہ زندگی بسر کرے اور اُس کے ساتھ نہایت ظالمانہ برتاؤ کیا جائے۔ خلاصۂ کلام یہ کہ ہندوؤں میں اخوت انسانی کی مذہباً کوئی گنجایش نظر نہیں آتی۔ اور غالباً اسی ناقابلِ قبول مجموعۂ احکام کو دیکھکر ہندوؤں میں نئے نئے مذہبی فرقے ایسے پیدا ہو رہے ہیں جو شودروں کے ساتھ رعایت کرنے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔ مگر ہندوؤں کے مذہبی علماء یعنی برہمن لوگ ان کے مخالف ہیں

اسلام سے قبل عیسائی مذہب کی حالت

ظہورِ اسلام سے پہلے عیسائی مذہب کی جو حالت تھی اور عیسائیوں نے اخوت و مساوات کو جس طرح پامال کیا تھا اُس کے تصور سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔

قیصر قسطنطنیہ نے چھٹی صدی عیسوی کے درمیانی حصہ میں یہ حکم نافذ کر دیا تھا کہ جو لوگ کیتھلک مذہب کی پیروی نہ کریں اُن کو کوئی سرکاری عہدہ نہ دیا جائے قیصر جسٹنین نے تیس ہزار یہودیوں کو ملک شام سے جلاوطن اور ملک بدر کر دیا۔ یہودی یا غیر کیتھلک عیسائی بھی اپنی کوئی مذہبی رسم قیصر روم کی عملداری میں ادا نہیں کر سکتے تھے اُن کی مذہبی کتابیں چھین کر زبردستی جلا دی جاتی تھیں۔ ۵۸۶ء میں تمام دنیا کے عیسائی علماء اس بات کا فیصلہ کرنے کے لئے جمع ہوئے کہ عورت میں روح ہے یا نہیں آخر بڑے بحث و مباحثہ کے بعد کثرت رائے سے یہ بات طے ہوئی کہ عورت میں روح ہے۔ بڑے بڑے پادری بشپ اور پوپ جنت کے مالک سمجھے جاتے تھے اور ان کے خلاف زبان تک ایک حرف لانا بھی موت کے مترادف تھا۔ مذہبی سرداروں اور امیروں کی تفریح کے لئے عوام کو ہلاکت میں ڈالنا۔ شیروں سے لڑانا معمولی باتیں تھیں۔ مغلوب و محکوم لوگوں کو

چوپایوں سے زیادہ مرتبہ حاصل نہ تھا، عیسائی، یہودی، مجوسی وغیرہ مذاہب اور ایرانی، یونانی، رومی وغیرہ اقوام پر نظر کی جائے تو اخوت و مساوات اور رواداری کی ہندوؤں سے بھی بدتر حالت اُن میں نظر آتی ہے۔ تمام ملکوں اور قوموں کا مفصل تذکرہ اس مختصر کتاب میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اس وقت تو صرف یہ بیان کرنا ہے کہ اسلام اس معاملہ میں کیا تعلیم دیتا ہے۔

اسلامی تعلیمات

اسلام نسبی و قومی امتیاز کو بالکل مٹاتا اور تمام بنی نوع انسان کو مساوی درجہ عطا فرماتا ہے اسی طرح قانونی حقوق سب کے مساوی ٹھیراتا ہے۔ ہاں! اسلام اس بات کا قائل ہے کہ جو شخص زیادہ با اخلاق اور باخدا ہو اس کی زیادہ عزت کی جائے اور جو زیادہ محنت کرے اور زیادہ کمائے وہ آرام طلب نکمے اور نکھٹو آدمیوں کے مقابلے میں اگر زیادہ دولت اور زیادہ سامانِ معیشت کا مالک ہو تو کچھ حرج نہیں ہے۔

انما المومنون اخوۃ (سورہ حجرات)	مسلمان سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔
یاایھا الناس انا خلقنٰکم من ذکرٍ و انثٰی وجعلنٰکم شعوبًا و قبائل لتعارفوا ان اکرمکم عنداللہ اتقاکم (حجرات)	لوگو ہم نے تم کو ایک نر و مادہ سے پیدا کیا اور تم کو مختلف اقوام و قبائل بنا دیا تاکہ آپس میں ایک دوسرے کو پہچانو خدا کے نزدیک تم میں سب سے بزرگ اور مکرم وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار رہو۔

آنحضرت محمد صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے صاف الفاظ میں فرما دیا ہے کہ عرب کے لوگوں کو عجم کے لوگوں پر اور عجم کے لوگوں کو عرب کے لوگوں پر محض عربی یا عجمی ہونے کی وجہ سے کوئی فضیلت نہیں ہے حضرت بلال رضی اللہ عنہ حبشی غلام تھے جن کو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے خرید کر آزاد کر دیا تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ حضرت بلالؓ کو اپنا آقا کہا کرتے تھے۔ حضرت سلمانؓ۔ حضرت صہیبؓ بھی غلام ہی تھے اور صحابہ کرامؓ کے اعلیٰ ترین طبقہ میں اُن کا شمار ہے۔

یاایھا الذین امنوا کونوا قوامین للہ شھداء بالقسط ولا یجرمنکم شنان قوم علیٰ ان لا تعدلوا اعدلوا	ایمان والو خدا کے واسطے قائم اور انصاف کے گواہ رہو کسی قوم کی دشمنی اس بات کا باعث نہ ہو کہ تم انصاف نہ کرو۔ انصاف کرو کہ یہ بات تقویٰ سے قریب تر ہے۔

ھو اقرب للتقویٰ۔ (آل عمران)	
واذا قلتم فاعدلوا ولو کان ذا قربیٰ (سورۂ انعام)	جب کہو انصاف کی بات کہو چاہے کسی قرابت دار ہی کو نقصان کیوں نہ پہنچے۔

مذکورہ دونوں آیتوں سے صاف ظاہر ہے کہ دوست دشمن اور رشتہ دار غیر رشتہ دار سب کے ساتھ عدل و مساوات کے برتاؤ کا حکم ہے کسی کے ساتھ بے انصافی یا بے جا طرف داری کی مطلق اجازت نہیں۔ اُدھر منو شاستر میں شودر اور برہمن کی جان میں کوئی مساوات نہیں اِدھر قرآن مجید میں النفس بالنفس (جان کے بدلے جان) کہکر سب میں مساوات قائم کردی۔ دوسری جگہ کتب علیکم القصاص فی القتلیٰ (تم پر مقتولین کا قصاص فرض کیا گیا) فرما کر کسی قاتل کے لئے کوئی جائے پناہ باقی نہیں رکھی اگر کوئی فاطمی یا کوئی برہمن کسی غلام یا شودر کو ناحق قتل کرے گا تو اس فاطمی یا اُس برہمن سے ضرور قصاص لیا جائے گا۔ یہی نہیں کہ یہ احکام قرآن مجید میں لکھے رہنے کے لئے ہوں اور مسلمانوں نے ان پر عمل نہ کیا ہو بلکہ قرآن مجید کا ایک ایک حرف مسلمانوں کے لئے اُن کی زندگی کا دستور العمل رہا ہے ایک مرتبہ سفر میں لوگوں نے کھانا پکانے کے لئے کام تقسیم کر لئے آنحضرت صلعم بھی اُس قافلہ میں موجود اور اُن سب لوگوں کے آقا و شہنشاہ و سپہ سالار تھے آپ نے لکڑیاں لانے کا کام اپنے ذمہ لے لیا۔

حضرت فاروق اعظمؓ نے اپنے عہد خلافت میں مدینہ منورہ سے بیت المقدس تک ایک اونٹ پر سفر کیا ایک غلام بھی ہمراہ تھا۔ اُس اونٹ پر فاروق اعظمؓ اور اُن کا غلام باری باری سے سوار ہوتے تھے۔ شہر قریب آیا تو آخری باری غلام کی تھی اور فاروق اعظمؓ اونٹ کی مہار پکڑے ہوئے آگے آگے پیدل چل رہے تھے غلام نے عرض کیا کہ شہر قریب آگیا ہے اب آپ سوار ہو جائیں اور میں اونٹ کی مہار پکڑ کر آگے چلوں فاروق اعظمؓ نے کہا کہ نہیں سوار ہونے کی باری تمہاری ہی ہے۔ چنانچہ اسی حالت میں جب کہ خلیفۂ اسلام کی شان و عظمت دیکھنے کے لئے لوگ جوق جوق گھروں سے نکل آئے تھے داخل ہوئے ایک مرتبہ ایک نومسلم پادشاہ یعنی جبلہ غسانی کو ایک معمولی غریب آدمی کے ناجائز طور پر تھپڑ مار دینے کے جرم میں مجرم قرار دے کر حکم سزا صادر ہوا جس کی وجہ سے وہ مرتد ہو کر بھاگ گیا۔ ایک مرتبہ خلیفۂ چہارم حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو مدعا علیہ

بن کر عدالت کے کمرہ میں مدعی کے برابر کھڑا ہونا پڑا۔
اسلام میں اکثر سلاطین ایسے گذرے ہیں کہ کسی معمولی آدمی نے نالش کر دی تو قاضی کی عدالت میں اُن کو مدعی کی برابر کھڑے ہو کر اپنی صفائی پیش کرنی پڑی۔ قیصر روم کے دربار میں جب آنحضرت صلعم کے مشہور صحابی حضرت معاذ بن جبلؓ سفارت پر تشریف لے گئے تو اُنھوں نے اپنے خلیفۂ وقت کی نسبت ایک موقعہ پہ فرمایا کہ

"ہمارا سردار ہم میں کا ایک فرد ہے اگر ہمارے مذہب کی کتاب اور ہمارے پیغمبر صلعم کے طریقہ کی پیروی کرے تو ہم اُس کو اپنا سردار باقی رکھیں اور اگر ان کے سوا (؟) کسی اور چیز پر عمل کرے تو ہم اُس کو معزول کر دیں اگر وہ چوری کرے تو ہاتھ کاٹیں اور اگر زنا کرے تو سنگسار کریں اور اگر وہ کسی کو گالی دے تو وہ بھی اُس کو اُسی طرح گالی دے اگر وہ کسی کو زخمی کرے تو اس کا بدلہ دینا پڑے وہ ہم سے چھپ کر پردہ میں نہیں بیٹھتا وہ ہم سے غرور نہیں کرتا۔ مالِ غنیمت میں اپنے آپ کو ہم پر ترجیح نہیں دے سکتا وہ ہم میں ایک معمولی آدمی کا رتبہ رکھتا ہے۔"

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر ایک معمولی سی بدگمانی کی وجہ سے ایک شخص نے مجمع عام میں اعتراض کیا اور صاف الفاظ میں کہا کہ جب تک میرے اعتراض کا جواب نہ ملے گا۔ ہم آپ کی تقریر نہیں سُنیں گے۔ فاروق اعظمؓ نے جب بیت المقدس پر قبضہ کیا تو وہاں کے عیسائی رؤسا کو اپنے سامنے بُلا کر یہ امان نامہ لکھوایا اور اُن کے حوالے کیا کہ

"یہ وہ امان نامہ ہے جو امیر المومنین عمرؓ نے ایلیا والوں کو دیا ہے۔ (ایلیا والوں کی جان مال، گرجے، صلیب، بیمار، تندرست سب کو امان دی جاتی ہے۔ اُن کے گرجاؤں میں سکونت نہ کی جائے گی اور نہ وہ ڈھائے جائیں گے۔ یہاں تک کہ اُن کے احاطوں کو بھی نقصان نہ پہنچایا جائے گا نہ اُن کی صلیبوں اور مالوں میں کسی قسم کی کمی کی جائے گی نہ مذہب کے بارے میں کسی قسم کا کوئی تشدد کیا جائے گا اور نہ اُن میں سے کسی کو کوئی ضرر پہنچایا جائے گا یونانیوں یعنی رومیوں میں سے رومانی یعنی جنگجو فوج میں سے) جو شخص شہر سے نکل جائے گا اُس کے جان و مال کو امن دی جاتی ہے جب تک کہ وہ محفوظ مقام تک نہ پہنچ جائے اور اگر کوئی رومی ایلیا ہی میں رہنا پسند کرتا ہے تو اس کو اطاعت کا اظہار و اقرار کرنا پڑے گا اور اگر

ایلیا (بیت المقدس) کے باشندوں میں سے کوئی شخص رومیوں کے ساتھ جانا چاہے تو اُس کو بھی امن ہے یہاں تک کہ وہ محفوظ مقام تک پہنچ جائے۔"

اس عہد نامہ پر آپ نے سردارانِ لشکر کے بھی دستخط کرادیئے تھے تاکہ وہ سب بھی اس کے گواہ رہیں اور کسی قسم کی خلاف ورزی نہ ہونے پائے۔ اس کے بعد شام و فلسطین کے اور بھی کئی شہروں نے اسی قسم کے امان نامے حاصل کرکے اپنے آپ کو بغیر مقابلہ کئے خوشی خوشی مسلمانوں کی حفاظت میں دے دیا۔ فاروق اعظمؓ کی حکومت و سلطنت تقریباً تیس لاکھ میل مربع رقبہ پر تھی اس قدر وسیع سلطنت کے فرماں روا اور اپنے زمانے میں دنیا کے سب سے زیادہ طاقتور شہنشاہ کو کسی مرض کی وجہ سے کسی نے شہد کھانے کو بتایا آپ کے یہاں شہد نہ تھا اور کسی جگہ سے بھی شہد نہیں مل سکتا تھا البتہ بیت المال یعنی سرکاری خزانے میں تھوڑا سا شہد موجود تھا لوگوں نے کہا کہ آپ اس شہد کو استعمال کریں۔ فاروق اعظمؓ نے جواب دیا کہ یہ تو تمام لوگوں کا مال ہے جب تک عام لوگ مجھ کو اجازت نہ دیں میں استعمال نہیں کر سکتا۔ آپ نے خلیفہ ہونے کے بعد ابتداءً مدتوں بیت المال سے ایک حبہ بھی نہیں لیا رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ آپ پر افلاس مستولی ہونے لگا اور فقر و فاقہ کی نوبت پہنچنے لگی تب آپ نے صحابہ کرامؓ کو مسجد نبوی میں جمع کرکے فرمایا کہ میں کاروبار خلافت میں اس قدر مصروف رہتا ہوں کہ اپنے نفقہ کا کوئی اہتمام نہیں کر سکتا آپ سب مل کر میرے لئے کچھ مقرر کر دیجئے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ صبح و شام کا کھانا آپ کو بیت المال سے ملا کرے گا۔ فاروق اعظمؓ نے اسی کو منظور کر لیا۔ اس کھانے کا اندازہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ دور دراز کے صوبوں اور عاملوں کے سفیر مدینہ منورہ میں پیغام لے کر حاضر ہوتے تو وہ فاروق اعظم ہی کے ساتھ دسترخوان پر کھانا کھاتے۔ ان سفیروں کو عموماً اس بات کی شکایت ہوتی کہ مدینہ میں ہم کو کھانا بہت ہی معمولی اور ادنےٰ درجہ کا ملتا ہے۔

(۳) اسلامی نظام سلطنت

فکر عمیق اور کافی غور و تدقیق سے کام لیا جائے تو یہ حقیقت ضرور بے پردہ ہو جائے گی کہ دنیا کی سب سے بڑی مصیبت اور نوع انسان کی سب سے بڑی ہلاکت لعنت

یہ ہے کہ طاقتور انسان کمزور انسان کو دبانے ڈرانے، اُس کے حقوق چھیننے اور غصب کرنے پر آمادہ ہوجاتا ہے دوسرے لفظوں میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ دنیا میں عام طور پر عدل وانصاف کے قیام میں مشکلات حائل رہی ہیں، آریوں نے طاقت پاکر غیرآریوں کو۔ برہمنوں اور چھتریوں نے شودروں کو جس طرح دبایا، ٹورایا اور اُن کے حقوق سے محروم کیا عالم آشکارا ہے۔ رومیوں نے افریقیوں پر غلبہ پایا تو کسی درگذر اور رعایت کو جائز نہ رکھا۔ مصریوں نے شامیوں کو اور یونانیوں نے ایرانیوں کو اپنے آپ سے کمزور پاکر خون کے دریا بہائے اور کمزوروں کو انسانی حقوق سے محروم کرنے میں کوئی کوتاہی روا نہ رکھی۔ گاتھا مدکال نے طاقت پاکر کمزوروں کو چوپایوں سے بدتر سمجھا اور منغول نے چیرہ دست ہوکر مغلوبوں کے لوٹنے، قتل کرنے میں جنگل کے درندوں اور بھیڑیوں کو مات کردیا۔ نوع انسان میں عورت مرد کے مقابلہ میں کمزور تھی لہٰذا ہر ملک اور ہر قوم نے عورت کو اس قدر ذلیل بنایا کہ وہ چوپایوں اور جمادی جائدادوں کی طرح مرد کی بے زبان ملکیت سمجھی گئی۔ قانون منو نے عورت کا جو مرتبہ قائم کیا ہے اُس کے تصور سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں عربوں نے دخترکشی کو جیسا قابل فخر کام سمجھا تھا اُس کی روئداد پڑھ کر بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہوجاتے ہیں۔

غرض دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں بتایا جاسکتا جہاں طاقتوروں نے کمزوروں کو مظالم کا تختۂ مشق نہ بنایا ہو اور ضعیفوں کو طاقتوروں کے آگے اپنے شرف انسانیت سے دست بردار نہ ہونا پڑا ہو۔ فرعون مصر نے اگر خدائی کا دعویٰ کرکے لوگوں سے اپنے روبرو سجدہ کرایا تھا تو اس تہذیب وشائستگی کے زمانے میں آج بھی اکثر عمالِ سلطنت کے متعلق سنا جاتا ہے کہ کسی کے جھک کر سلام نہ کرنے اور تعظیم کے لئے کھڑے نہ ہونے پر اُس کو پٹواتے اور بعض اوقات تو تھوک کر چٹواتے اور کبھی زمین پر پیٹ کے بل بھی چلوا لیتے ہیں۔ دنیا میں طاقتوروں کے ظلم وغرور کی جس قدر لمبی عمر ہے اُسی قدر کمزوروں کی بزدلی اور بے جا خوشامد طویل العمر ہے۔ دنیا کے یہ دونوں مرض سب سے زیادہ پھیلنے اور سب سے زیادہ انسانی شرف کو برباد کرنے والے ہیں۔ انھیں دونوں پلید بیماریوں نے انسان کو خدائے تعالیٰ کی معرفت وعبادت سے باز رکھکر یا تو خود خدائی کا مدعی اور دہریہ بنایا یا مشرک اور بُت پرست بناکر پتھروں اور زہریلے کیڑوں کے آگے اُس کا سر جھکایا۔

انبیاء کی بعثت کی غرض ان دونوں مذکورہ بیماریوں کے دور کرنے اور انسان کو

اُس کی شرافت پر قائم رکھنے کے لئے خدائے تعالےٰ نے ہر زمانے میں ہادی۔ رہبر، پیغمبر اوتار، وخشور، پرافٹ، نبی اور رسول بھیجے جنھوں نے طاقتوروں کو ظلم وستم سے روکنے اور کمزوروں کو ظالموں کے مقابلے میں اپنے حقوق کی حفاظت پر آمادہ کرنے یعنی تمام طاقتوں کے مالک اور معبود حقیقی کی عبادت وفرماں برداری بجا لانے پر مستعد کیا۔ جب سے اس ربع مسکون پر نسل انسانی آباد ہے اُسی وقت سے مذکورہ دونوں بیماریاں انسانوں میں موجود ہیں اور اُسی وقت سے ان دونوں بیماریوں کے معالج یعنی پیغمبروں کی تعلیمات کا سلسلہ جاری ہے وان من امۃ الا خلا فیھا نذیر۔ ان پیغمبروں اور ہادیوں نے ہمیشہ انسان کو انسانیت پر قائم رکھنے کی کوشش کی اور انسان کے باہمی تعلقات کو خوش گوار رکھکر معبود حقیقی کی عبادت بجا لانے کی فراغت اُن کے لئے مہیا کی۔ اس کوشش میں اُن کو کبھی وعظ وپند سے کام لینا پڑا۔ کبھی ضعیفوں کو بہادر بنا کر کج فہم اور سرکش ظالموں کا سر توڑنے اور اُن کے کبر وغرور کو خاک میں ملانے کی ضرورت پیش آئی۔ دنیا کے ہادیوں اور پیغمبروں کی تاریخ اس قسم کے واقعات سے لبریز ہے۔ انھیں ہادیوں اور رہبروں کی لائی ہوئی تعلیمات کا نتیجہ تھا کہ دنیا میں بار بار ظلم وعصیان اور جور وطغیان کے طوفان برپا ہونے کے بعد فرو ہو گئے۔ سب سے بڑا اور عظیم الشان طوفان جس نے تمام ربع مسکون کا احاطہ کر لیا تھا اُس وقت آیا جب کہ رہبر کامل عالم انسانیت کو اُس کا حق واپس دلانے کے لئے مبعوث ہونے والا تھا۔ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

مندرجۂ بالا تمہید سے غالباً یہ بات بخوبی سمجھ میں آگئی ہو گی کہ انسانی آبادی کے لئے نظام سلطنت جس چیز کا نام ہے وہ اگر دنیا میں عدل وانصاف قائم کرنے اور حقوق انسانی کی حفاظت کا ذریعہ ہے تو وہ ہادیانِ برحق کی تعلیمات کا نتیجہ ہو سکتا ہے اور اسی لئے کہا جا سکتا ہے کہ نسل انسانی کی بہبود وفلاح کے لئے سلطنت وحکومت کے جس قدر نظام قائم ہوئے وہ سب کے سب پیغمبروں، رسولوں، اور ہادیوں کے قایم کئے ہوئے یا اُن کی تعلیمات سے ماخوذ تھے۔ آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چونکہ دنیا کے آخری اور سب سے بڑے ہادی تھے۔ اس لئے نوع انسان کی بہبود وفلاح کے لئے آپ کی لائی ہوئی شریعت یعنی اسلام سے ہم کو سب سے بڑی یہی توقع ہو سکتی تھی کہ وہ سب سے بہتر نظامِ سلطنت پیش کرے گا۔ آؤ ہم اپنی فکر وتمیز اور فہم وعقل کی کسوٹی

پر بھی اس کو پرکھ کر دیکھ لیں۔

اسلامی نظام سلطنت کی برتری پُرانے مذہبوں نے نسل انسانی کے حقوق کی حفاظت کے لئے جو نظام سلطنت قائم کئے تھے وہ ہمیشہ نوع انسان کی مذکورہ پشتینی بیماریوں کے بار بار عود کر آنے کے سبب درہم برہم ہو ہوگئے اور نئے ہادیوں اور نئے رسولوں کے آنے کی ضرورت پیش آتی رہی۔ آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک ایسی شریعت لے کر آئے جو آج تک من کل الوجوہ محفوظ اور ہر قسم کی تحریف و تبدیل سے پاک موجود ہے اور آئندہ بھی اُس کے تغیر و تبدیل ہونے کا کوئی امکان نہیں لہٰذا اسلامی نظام سلطنت میں اگر انسان کی قدیمی بیماریوں کے عود کر آنے کی وجہ سے کوئی اختلال پیدا ہو تو اُس کی اصلاح کے لئے ہم کو صرف شریعت اسلامی کی طرف متوجہ ہونا پڑے گا، جو محفوظ و موجود ہے کسی دوسری شریعت اور دوسرے ہادی کے انتظار کی ضرورت نہیں جس طرح ہر شریعت ایک ہادی اور پیغمبر کی اطاعت انسان سے چاہتی ہے اسی طرح اسلام بھی نوع انسان کی فلاح و بہبود کے لئے انسان سے پیغمبر اسلام کی اطاعت اور نظام اسلام یعنی قرآن کریم کی دی ہوئی تعلیم کی تعمیل چاہتا ہے جس طرح ہر ایک مذہب انسان کو غلامی اور خواری سے نکال کر آزادی و حریت عطا کرنے کے لئے احکام خداوندی یعنی مذہب اور احکام مذہب کی اطاعت چاہتا ہے اسی طرح اسلام بھی انسان کو غلامی کے طوق سے آزاد کرنے کے لئے فرماں برداری کا خواہاں ہے۔ تمام مذاہب کے احکام دو حصوں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں ایک کو تعظیم لامر اللہ اور دوسرے کو شفقت علیٰ خلق اللہ یا ایک کو عبادات اور دوسرے کو معاملات کہہ سکتے ہیں اسی دوسرے حصے کو سلطنت سمجھنا چاہیئے۔

اسلامی نظام سلطنت کی توضیح اسلام تجویز کرتا ہے کہ تمام انسان یکساں حقوق رکھتے ہیں۔ پیدائشی طور پر کسی انسان کو دوسرے انسان پر محض خاندان یا قوم کی وجہ سے کوئی فضیلت و برتری حاصل نہیں ہے۔ ہاں اپنے اعمال سے ہر شخص اپنے مرتبہ اور استحقاق کو بڑھا یا گھٹا سکتا ہے۔ تمام سمجھ دار لوگ اپنے اندر سے کسی ایک شخص کو منتخب کر کے اپنا امیر اور قانون کے نافذ کرنے کا مہتمم بنا لیں۔ اس امیر کو منتخب ہونے کے بعد شاہانہ اختیارات حاصل ہو جاتے ہیں۔

لیکن ایسے اختیارات حاصل نہیں ہو سکتے کہ وہ مسئول نہ ہو سکے بلکہ وہ قانون یعنی شریعت کے قائم کئے ہوئے اصولوں اور حکموں کے ماتحت ملک و قوم میں امن و انتظام قائم رکھنے کا ذمہ وار ہوتا ہے اور ہر ایک شخص اُس کو کوئی خلاف قانون کام کرتے ہوئے دیکھکر روک ٹوک کر سکتا اور ہر معاملہ میں اُس سے جواب طلب کرنے کا آزادانہ حق رکھتا ہے اس امیر یا شہنشاہ کو خلیفہ کہتے ہیں ۔ خلیفہ کو بیت المال کا بھی انتظام کرنا پڑتا ہے ۔ بیت المال میں جو روپیہ یا مال جمع ہوتا ہے وہ رعایا کا مشترکہ خزانہ ہے خلیفہ کو اپنی ذات یا اپنی ذاتی خواہشات کے لئے بیت المال سے کچھ بھی خرچ کرنے کا اختیار نہیں اُس کی حیثیت محض ایک امین یا مہتمم کی ہوتی ہے وہ رفاہِ رعایا اور مخلوقِ خدا کے فائدے کے لئے اس خزانے کو خرچ کرتا ہے ۔ یتیموں ، بیواؤں ، محتاجوں ، مسافروں کی امداد اور فوج و پولیس وغیرہ کے مصارف میں بیت المال کا روپیہ خرچ ہوتا ہے۔ اگر ملک میں بغاوت ہو تو اُس کے فرو کرنے اور بدامنی کو امن و امان سے تبدیل کرنے کی تدابیر عمل میں لاتا ہے ۔ مظلوموں کے حقوق ظالموں سے دلاتا اور ہر ایک بدمعاش کو تکلے کی طرح سیدھا بنا دیتا ہے ۔ چوروں ڈاکوؤں اور رہزنوں کو سزائیں دیتا اور رعایا کی جان و مال و آبرو کی حفاظت و نگرانی کرتا ہے ۔ انفصالِ خصومات میں عدل و انصاف کو مدنظر رکھتا اور مسلم و غیر مسلم کا اس عدل کے معاملے میں مطلق لحاظ نہیں رکھتا ہے ۔ تمام بے حیائی کے کاموں کو روکتا ہے اور لوگوں کو پُرامن اور سنجیدہ زندگی بسر کرنے کی ترغیب دیتا ہے ۔ ملک کی حفاظت کے لئے فوج کی ضرورت ہو تو مسلمانوں کی فوجی بھرتی کرتا ہے ۔ لیکن غیر مسلموں کو فوج میں بھرتی ہونے کے لئے مجبور نہیں کرتا ۔ بیرونی حملات اندرونی فسادات اور ہر قسم کی بے راہ روی کے مٹانے اور دور کرنے نیز رفاہ رعایا کے اہتمام کے لئے بیت المال میں خزانہ فراہم ہونے کے ذرائع یہ ہیں کہ مسلمانوں سے زکوٰۃ وعشر کے ذریعہ روپیہ وصول ہوتا ہے جس کی تشریح خود احکام شرع میں موجود ہے ۔

اسی طرح غیر مسلموں سے ایک نہایت خفیف اور معمولی ٹیکس جزیہ کے نام سے وصول کیا جاتا ہے غیر مسلموں کو سوائے اس جزیہ کے اور کوئی ٹیکس ادا کرنا نہیں پڑتا ۔ لیکن مسلمانوں کو زکوٰۃ کے علاوہ صدقات اور ضرورت کے وقت بڑے بڑے چندے ادا کرنے پڑتے ہیں مسلمان فوجی خدمات ادا کرنے پر بھی مجبور ہیں اور زکوٰۃ وغیرہ سے کبھی کسی حالت

ہیں معاف نہیں کئے جا سکتے غیر مسلم اگر اپنی خوشی سے فوجی خدمات ادا کرنے پر آمادہ ہوں تو جزیہ سے معاف ہو جاتے ہیں۔ غیر مسلموں کے مقابلہ میں مسلمانوں کے جان و مال کو اس لئے زیادہ خرچ کیا جاتا ہے کہ یہ نوع انسان کی فلاح و بہبودی کے زیادہ خواہاں اور امن وامان کی قدر و قیمت کو پہچاننے کے سبب اُس کے قیام کے زیادہ ذمہ دار ہیں۔ خلیفہ مسلمانوں کو نماز و روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ عبادات پر قائم رکھنا اور ان چیزوں کے ادا کرانے کا اہتمام کرتا ہے۔ غیر مسلم رعایا کے عبادت خانوں کی حفاظت کا بھی خلیفہ اسی طرح ذمہ دار ہے جس طرح غیر مسلموں کی جان و مال کی حفاظت اُس کا فرض ہے۔ راستوں کی حفاظت اور تجارت وصنعت وزراعت کی ترقی کی تدابیر عمل میں لانا بھی خلیفہ کے فرائض میں داخل ہے۔ خود رو پیداوار یعنی جنگلوں، پہاڑوں اور دریاؤں سے حاصل ہونے والی چیزیں تمام لوگوں کی مشترکہ ملکیت ہیں ان پر کوئی ٹیکس حکومت کی طرف سے عائد نہیں کیا جا سکتا۔ اسلامی نظام سلطنت کا کامل نمونہ خلفائے راشدین کی حکومت و سلطنت ہے۔ جو شخص پورے اور مکمل اسلامی نظام سلطنت سے واقف ہونا چاہے وہ خلفائے راشدین کے حالات کا مطالعہ کرے۔

اسلامی نظام سلطنت کی خوبیاں

اسلام نے اپنے سکھائے ہوئے اخلاق پر چونکہ مدارِ حکومت رکھا ہے لہٰذا اُس نے دوسری قوموں یعنی دوسرے مذاہب کے ماننے والوں پر حکومت کرنے میں کسی بے اعتمادی کے دخل کو مطلق ضروری نہیں سمجھا اور اس بات کی بھی اجازت دے دی کہ تم دوسری قوموں یعنی دوسرے مذہب والوں کو بھی عاملانہ عہدے دے سکتے ہو کیونکہ مسلمان اگر سچے پکے مسلمان ہوں تو کبھی اس قدر کمزور ہو ہی نہیں سکتے کہ دوسروں سے مغلوب ہو جائیں۔ بخلاف دوسرے مذاہب اور دوسری قوموں کے کہ اُنھوں نے دوسروں پر مطلق اعتماد نہیں کیا۔ خلیفہ اگر بے راہ روی اختیار کرے تو اُس کو مسلمانوں کی جماعت فوراً معزول کر سکتی اور دوسرے موزوں شخص کو انتخاب کر لینے کا حق رکھتی ہے۔ لیکن بلاوجہ خلیفہ کے حکم سے سرتابی اور اُس کی نافرمانی جرم عظیم اور بغاوت ٹھیرائی گئی ہے۔ خلیفہ کے انتخاب میں کسی وراثت کسی خاندانی یا قومی استحقاق کو رتّی برابر بھی دخل نہیں ہے۔ آنحضرت صلعم کے بعد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ استحقاقِ قابلیت کی بناء

مسلمانوں کے خلیفہ منتخب ہوئے اُن کے بعد باوجود اس کے کہ اُن کے جوان، بہادر، عقلمند اور لائق بیٹے موجود تھے حضرت عمر فاروق اعظمؓ خلیفہ منتخب ہوئے جو حضرت ابو بکرؓ سے کوئی قریبی رشتہ داری نہیں رکھتے تھے۔ فاروق اعظمؓ کے بعد حضرت عثمان غنیؓ خلیفہ ہوئے حالانکہ فاروق اعظمؓ کے نہایت لائق و فائق بیٹے حضرت عبداللہ بن عمرؓ موجود تھے حضرت عثمان غنیؓ کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ خلیفہ منتخب ہوئے حالانکہ حضرت عثمان غنیؓ کے بیٹے اور قریبی رشتہ دار موجود تھے خلافتِ راشدہ نے صاف طور پر بتا دیا ہے کہ سلطنت اور حکومت کسی خاص خاندان اور کسی مخصوص قبیلہ کا حق نہیں ہے۔ اسلام اگر اس خاندانی حق اور امر سلطنت میں وراثت کو تسلیم کرتا تو صدر اسلام میں ایسی بے عنوانی ہرگز نہیں ہو سکتی تھی۔

اسلامی جمہوریت کا تصور

حقیقت یہ ہے کہ اسلام ہی نے سب سے پہلے وراثتی شخصی سلطنت کی لعنت کو دنیا سے مٹایا اور بتایا کہ حکومت و سلطنت ایک امانت ہے جو تمام لوگوں کی طرف سے کسی ایک شخص کو سپرد کی جاتی ہے۔

جب وہ شخص فوت ہو یا معزول کیا جائے تو اس کی جگہ پھر تمام سمجھ دار لوگ کسی دوسرے شخص کو منتخب کر کے قائم کر دیں اس طرح دنیا میں نہ کوئی شاہی خاندان موجود ہو سکتا ہے نہ کوئی فرماں روا اپنے بیٹے کو اپنا ولیعہد بنانے کا خیال دل میں لا سکتا ہے۔ ساتھ ہی اس بات کو بھی لازمی قرار دیا کہ ہر خلیفہ تمام اعاظم امور میں اقدام سے پیشتر لوگوں سے مشورہ ضرور کرے اور ایک مجلس شوریٰ ہمیشہ امور سلطنت میں خلیفہ کو امداد پہنچاتی رہے۔ خلفائے راشدین کو جب کوئی اہم معاملہ پیش آتا تو وہ منادی کو حکم دیتے کہ الصلوٰۃ جامعۃ کی آواز بلند کرتا ہوا گلی کوچوں میں سے گذر جاتے۔ اس اعلان کو سنتے ہی تمام لوگ مسجد نبوی میں جمع ہو جاتے خلیفہ ممبر پر چڑھ کر حمد و نعت کے بعد حاضرین کے سامنے ایک مختصر اور جامع تقریر میں وہ مسئلہ پیش کر دیتا۔ صاحب الرائے اور سمجھدار لوگ باری باری سے تقریریں اس مسئلے کے متعلق کرتے اور آخر میں کثرتِ رائے سے فیصلہ ہو جاتا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ

عنہ نے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد اپنی سب سے پہلی تقریر میں فرمایا کہ

"لوگو میں تمہارا خلیفہ مقرر ہوا ہوں حالانکہ میں تم سے بہتر نہیں ہوں ......
اگر میں ٹھیک کام کروں تو مجھے مدد دو اور اگر میں غلط روی اختیار کروں
تو مجھ کو سیدھا کر دو۔"

حضرت فاروق اعظمؓ کے عہد خلافت میں ایک مرتبہ مجلس شوریٰ منعقد ہوئی اور اختلاف آراء ہوا تو فاروق اعظمؓ نے اس موقعہ پہ ایک تقریر کی جس میں فرمایا کہ

"میں بھی تم میں سے ایک کے برابر ہوں ...... میرا یہ منشا نہیں کہ میں جو
چاہتا ہوں اُس کو آپ لوگ بھی مان لیں۔"

بہرحال اسلام نے سب سے پہلے باقاعدہ اور موثر طریقے سے شخصی وراثتی سلطنت کے سلسلے کو مٹانے کی کوشش کی۔ اگرچہ کچھ دنوں کے بعد مسلمانوں کی غفلت اور بدنصیبی سے خود مسلمانوں کے اندر موروثی سلطنت کا سلسلہ جاری ہو گیا مگر پھر بھی مسلمانوں میں اسلامی نظام سلطنت کے اصول نمایاں رہے۔ مسلمانوں ہی کی تعلیم کا اثر تھا کہ ہسپانیہ کے ہمسایہ ملک فرانس میں جمہوری سلطنت کی بنیاد رکھی گئی اُس کے بعد امریکہ میں بھی جمہوریت قائم ہوئی اور آج تو دنیا کے بہت سے ملکوں میں جمہوری سلطنتیں قائم ہو چکی ہیں۔ فرانس و امریکہ کی جمہوریت درحقیقت اسلامی تعلیمات سے متاثر ہونے کا ایک نتیجہ ہے۔

اسلامی جمہوریت اور دوسرے ملکوں کی جمہوریت میں فرق

لیکن اس جمہوریت اور اسلامی نظام سلطنت میں زمین و آسمان کا فرق ہے اس مروجہ جمہوریت میں جو جو خرابیاں شخصی سلطنت کے حامیوں نے بیان کی ہیں اسلام کی مجوزہ سلطنت میں اُس قسم کی خرابیوں میں سے ایک بھی ثابت نہیں کی جا سکتی۔ مسلمان اپنے حکمراں کو اگر وہ خدا و رسول کے حکم کی مخالفت میں کوئی حرکت کرے تو فوراً روکنے اور ٹوکنے کا قانونی حق رکھتے ہیں لیکن اُس کے ہر ایک حکم کی تعمیل کو جو قرآن و سنت کے خلاف نہ ہو ضروری سمجھتے اور اُس سے بغاوت و سرکشی کے خیال تک کو دل میں نہیں آنے دیتے۔

جب کہ مسلمانوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ خدا و رسول کے احکام کی خلاف ورزی

پر اپنے خلیفہ کو معزول کر سکتے ہیں تو پھر اس سے بڑھ کر اور کیا حماقت ہو سکتی ہے کہ ایک تجربہ کار مفید ملک و قوم، نیک طینت، نیک نیت اور قیمتی شخص کو جو اپنے فرائض عمدگی سے بجا لا رہا ہے محض اس لئے کہ اُس کو تین یا پانچ سال کی مدت گذر چکی ہے معزول کر کے نئے انتخاب کی زحمت گوارا کریں اور کسی نئے تجربہ کی مصیبت میں اپنے آپ کو مبتلا کریں۔

عیسائیت نے مال و دولت کا مرتبہ مذہبًا اس قدر ذلیل ٹھیرایا ہے کہ دولت مندوں کو آسمانی بادشاہت میں داخل ہونے سے روک دیا ہے۔ بودھ مذہب نے پیشوایانِ مذہب کو گداگر بننے کی اجازت دی ہے مگر اسلام نے مال کو سامانِ معیشت قرار دے کر اُس کا اصلی مرتبہ ظاہر فرما دیا ہے۔ ملک کے تمام باشندوں یا تمام بنی نوع انسان کے اندر مالی مساوات محال اور عقلاً اشتراکیت و بولشویت کے اصول ناقابلِ عمل ہیں مگر ملک و قوم کی فلاح و بہبود کے لئے یہ ماننا ضروری ہے کہ جس قدر مال و دولت افراد کے قبضہ میں ہے وہ تمام مجموعی طور پر ملک و قوم کی دولت ہے اور اسی لئے قوم کے ہر فرد کا فرض ہے کہ وہ دوسرے شخص کی دولت کو برباد او تلف ہونے سے بچائے تاکہ ملک و قوم کی دولت تلف کی واقع نہ ہو اور اگر کوئی شخص اپنی دولت خود اپنے ہاتھ سے برباد کر رہا ہو تو دوسرے کا فرض ہو کہ وہ اُس کو اس غلطی سے روک دے۔ اسلام نے اس حقیقت کو مدنظر رکھ کر حکم دیا ہے کہ لا تؤتوا السفہاء اموالکم (اپنے اموال بے وقوفوں کے سپرد نہ کرو) اسی طرح لیس للانسان الا ما سعیٰ (انسان جو کچھ کوشش کرتا ہے وہی اُس کے لئے ہے) فرما کر ہر شخص کو کسب معاش کی طرف متوجہ کر دیا ہے۔ رشوت کو جو انسان کے لئے بلا استحقاق آمدنی ہے اسلام نے ناجائز قرار دیا ہے۔ تجارت کی تو اسلام نے ترغیب دی ہے لیکن سود خوری کو اس لئے ممنوع قرار دیا کہ اس میں بہت سی اخلاقی اور اقتصادی مضرتیں مضمر ہیں۔ سود خوری سے انسان کی باہمی محبت و مہربانی و ہمدردی کی صفتِ حسنہ معدوم ہو جاتی ہے۔ بے محنت دولت کمانے سے انسان آرام طلب اور بزدل ہو جاتا ہے۔ سود خوری کے رواج سے ملک کی تمام دولت بتدریج سمٹ کر ایک محدود گروہ کے قبضہ میں آ جاتی ہے اور باقی لوگوں کو مظلومانہ طور پر افلاس میں مبتلا ہونا پڑتا ہے۔ غلّہ یا دوسری ضروریات زندگی کی چیزوں کو گرانی کے

انتظار میں فروخت نہ کرنے اور روکے رکھنے کو بھی اسلام نے منع کیا ہے کیونکہ اس سے اگرچہ ایک شخص کو فائدہ پہنچتا ہے لیکن باقی تمام لوگوں کو اس سے اذیت ہوتی ہے قمار بازی اور شرابِ خواری کو بھی اسلام نے ممنوع قرار دیا ہے۔ کیونکہ ان چیزوں سے فتنے اور فسادات پیدا ہوتے ہیں۔

آج کل کے یورپی ملکوں کو اپنی تہذیب اور ترقی یافتہ حالت پر بڑا غرور اور گھمنڈ ہے لیکن انھیں ملکوں میں آئے دن اُن کے نظام سلطنت کو ظالمانہ قرار دینے والے گروہ پیدا ہو رہے ہیں **اے بلفورٹ** ایک فلاسفر کا قول ہے۔

"وہ وقت قریب ہے جب کہ کسی انسان کو محبِ وطن یا وطن پرست کہدینا اُس کی انتہائی توہین ہوگی کیونکہ ہم اتفاق سے ایک ایسے زمانے میں پیدا ہوئے ہیں جس میں مخصوص نظامِ حکومت اور ممتاز طبقہ کے افراد کے مفاد کی خاطر غارت گری کا بازار گرم ہے۔ اسی غارت گری کو حب الوطنی کہا جاتا ہے"

اس قول کے قائل اے بلفورٹ نے آج کل کی مہذب عیسائی سلطنتوں اور جمہوریتوں کی بد اعمالیوں سے تنگ آکر مندرجہ بالا الفاظ کہے ہیں۔

روس کا سب سے بڑا مدبر طالسطائی کہتا ہے کہ نوعِ انسان میں سے ہر قسم کے ملکی و قومی و خاندانی امتیازات بکلی مٹا دینے چاہئیں۔ ان لوگوں نے یورپی اور عیسائی جمہوریتوں کے مفاسد و مظالم کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد یہ باتیں زبان سے نکالی ہیں لیکن اسلام ملکی و قومی امتیازات کو تسلیم کرتا ہوا وہ نظام سلطنت اور وہ اخلاقی تعلیم پیش کرتا ہے کہ اے بلفورٹ اور طالسطائی کو اس قسم کی خلافِ فطرتِ انسانی تجاویز پیش کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی اور ہر قسم کے مفاسد و مظالم کا پورے طور پر سدباب ہو جاتا ہے اور انسان نہایت آسانی سے سعادتِ انسانی تک پہنچنے کی سہولت پا جاتا ہے منطقۂ حارّہ کو جس طرح منطقۂ بارِدہ نہیں بنایا جا سکتا اسی طرح اقوامِ عالم کے خصوصی امتیازات اور انسان کی حب الوطنی کو فنا نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا اسلام نے قبائل و شعب کے امتیازات اور انسان کے جذبۂ حب الوطنی کی بخوبی تکریم کی ہے مگر اس امتیاز قومی اور حب الوطنی کو کہیں کبھی ایسا ناجائز موقعہ نہیں دیا کہ وہ نوعِ انسانی پر مظالم روا رکھنے کا ذریعہ بن سکے۔

(۴) غیر مسلموں کی ضروری شہادتیں

(۱) امریکہ کے مشہور عالم ڈریپر کا قول ہے۔

"دنیا کی تاریخ میں کوئی مذہب اتنی جلدی اور اس قدر وسعت کے ساتھ نہیں پھیلا جتنا کہ مذہب اسلام تھوڑے ہی عرصہ میں کوہ الٹائی سے لے کر بحر اٹلانٹک تک اور ایشیا کے مرکز سے افریقہ کے مغربی کناروں تک جا پہنچا"۔

اس قول کو پڑھکر سوچنا چاہیے کہ اسلام کی یہ حیرت انگیز اشاعت تلوار یعنی جبر تشدد کے ذریعہ ہوئی تھی یا اپنے اعلیٰ اصول اور مفید تعلیمات کے ذریعہ۔

(۲) سر ولیم میور (لائف آف محمد کا مصنف) جو اسلام کی مخالفت میں شہرت حاصل کر چکا ہے ایک جگہ مندرجہ ذیل الفاظ لکھنے پر مجبور ہو گیا ہے۔

"اسلام نے ہمیشہ کے واسطے توہمات باطلہ کو جن کی تاریکی مدتوں سے چھا رہی تھی کالعدم کر دیا۔ بت پرستی موقوف ہو گئی اور خدا کی وحدانیت اور غیر محدود کمالات اور ہر ایک جگہ محیط قدرت کا مسئلہ حضرت محمد (صلعم) کے معتقدوں کے دلوں اور جانوں میں ایسا ہی زندہ اصول ہو گیا ہے جیسا کہ حضرت محمد (صلعم) کے دل میں تھا مذہب اسلام میں سب سے پہلی بات جو خاص اسلام کا مفہوم ہے یہ ہے کہ خدا کی مرضی پر کامل بھروسہ اور توکل کرنا چاہیئے بلحاظ معاشرت کے بھی اسلام میں کچھ خوبیاں نہیں ہیں چنانچہ مذہب اسلام میں یہ ہدایت ہے کہ سب مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ برادرانہ محبت رکھیں۔ یتیموں کے ساتھ نیک سلوک کرنا چاہیئے غلاموں کے ساتھ نہایت شفقت سے پیش آنا چاہیئے۔ نشہ کی چیزوں کی ممانعت ہے۔ مذہب اسلام اس بات پر فخر کر سکتا ہے کہ اس میں پرہیزگاری کا ایک ایسا درجہ موجود ہے جو کسی اور مذہب میں نہیں پایا جاتا"۔

(۳) چیمبرز ان سائیکلو پیڈیا میں ایک آرٹکل لکھنے والا اسلام اور اسلامی تعلیم کی نسبت لکھتا ہے کہ

"مذہب اسلام کے نہایت کامل اور روشن حصے یعنی قرآن مجید کی اخلاقی تعلیم میں ناانصافی۔ کذب۔ غرور۔ انتقام۔ غیبت۔ استہزا۔ طمع۔ اسراف۔ عیاشی۔ بدگمانی نہایت

قابلِ ملامت قرار دی گئی ہے۔ نیک نیتی، فیاضی، حیا، تحمل، صبر، بردباری، کفایت شعاری۔ سچائی، راست بازی، ادب، صلح، اچھی محبت اور سب سے پہلے خدا پر ایمان لانا اور اُس کی مرضی پر توکل کرنا یہی ایمان داری کا رکن اور سچے مسلمان کی نشانی خیال کی گئی ہے ......۔ یورپ میں علوم و فنون کی ترقی کا اصل سبب بھی اسلام ہی ہوا ہے۔"

(۴) ڈاکٹر گستاولی بان فرانسیسی لکھتا ہے کہ

"جس وقت ہم فتوحاتِ عرب پر نظر ڈالیں گے اور اُن کی کامیابی کے اسباب کو اُبھار کر دکھائیں گے تو معلوم ہوگا کہ اشاعت مذہب میں تلوار سے مطلق کام نہیں لیا گیا کیونکہ مسلمان ہمیشہ مفتوح اقوام کو اپنے مذاہب کی پابندی میں آزاد چھوڑ دیتے تھے اگر اقوام عیسوی نے اپنے فاتحین کے دین کو قبول کر لیا اور بالآخر اُن کی زبان کو بھی اختیار کر لیا تو یہ محض اس وجہ سے تھا کہ اُنھوں نے اپنے جدید حاکموں کو اُن قدیم حاکموں سے جن کی حکومت میں اُس وقت تک تھے بہت زیادہ منصف پایا اُن کے مذہب کو اپنے مذہب سے بہت زیادہ سچا اور سادہ پایا۔ یہ امر تاریخ سے ثابت ہو چکا ہے کہ کوئی مذہب بزورِ شمشیر نہیں پھیل سکتا۔ جس وقت عیسویوں نے اندلس کو عربوں سے فتح کر لیا اس وقت اس مفتوح قوم نے جان دینا قبول کیا لیکن مذہب کا بدلنا قبول نہیں کیا۔ فی الواقع دینِ اسلام بعوض اس کے کہ بزور شمشیر پھیلایا گیا ہو محض بہ ترغیب اور بزور تقریر شائع کیا گیا ہے اور یہی ترغیب تھی جس نے اقوام ترک و مغل کو بھی جنھوں نے آگے چل کر عربوں کو مغلوب کیا دینِ اسلام قبول کرنے پر آمادہ کر دیا۔ چین میں بھی اشاعت اسلام کچھ کم نہیں ہوئی ہماری کتاب کے ایک دوسرے حصے میں معلوم ہوگا کہ اُس ملک میں بھی اسلام کس قدر جلد پھیلا اگرچہ عربوں نے چین میں گز بھر زمین پر بھی قبضہ نہیں کیا تاہم اس وقت چین میں کروڑوں مسلمان ہیں۔" (منقول از تمدن عرب)

(۵) رابرٹس اپنی تاریخ چارلس پنجم میں لکھتا ہے کہ

"وہ مسلمان ہی تھے جن میں اشاعت مذہب کے جوش کے ساتھ رواداری ملی ہوئی تھی ایک طرف تو وہ اپنے پیغمبر کے دین کو پھیلاتے تھے دوسری طرف اُن اشخاص

کو جوا سے قبول نہیں کرتے اپنے اصلی ادیان پر قائم رہنے دیتے تھے "

(۶) میشو رہبان اپنی کتاب سفرِ مشرق میں لکھتا ہے کہ

"عیسائیوں کے لئے نہایت افسوس کی بات ہے کہ مذہبی رواداری جو مختلف اقوام میں ایک بڑا قانون مروت ہے عیسائیوں کو مسلمانوں نے سکھایا۔ یہ بھی ایک ثواب کا کام ہے کہ انسان دوسرے کے مذہب کی عزت کرے اور کسی کو مذہب کے قبول کرنے پر مجبور نہ کرے"

(۷) تاریخ جنگ صلیبی میں مذکورہ مصنف میشو لکھتا ہے کہ

"جس وقت حضرت عمرؓ نے بیت المقدس کو فتح کیا تو انھوں نے عیسائیوں کو مطلق نہیں ستایا برخلاف اس کے جب صلیبوں نے اسی شہر مقدس کو لیا تو انھوں نے نہایت بے رحمی سے مسلمانوں کا قتل عام کیا اور یہودیوں کو جلا دیا"

(۸) فتح بیت المقدس کے متعلق ڈاکٹر گستاولی بان لکھتا ہے کہ

"بیت المقدس کی فتح کے وقت حضرت عمرؓ کا اخلاق ہم پر ثابت کرتا ہے کہ ملک گیرانِ اسلام مفتوح اقوام کے ساتھ کیسا نرم سلوک کرتے تھے اور یہ سلوک اس مدارات کے مقابل جو صلیبوں نے اسی شہر کے باشندوں سے کئی صدی بعد کیا نہایت حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے حضرت عمرؓ اس شہر مقدس میں بہت تھوڑے اشخاص کے ساتھ داخل ہوئے تھے اور آپ نے سفرونیس بطریق سے درخواست کی کہ مقامات مقدسہ کی زیارت میں آپ کے ہمراہ چلے۔ اسی وقت حضرت عمرؓ نے منادی کرادی کہ میں ذمہ دار ہوں کہ باشندگانِ شہر کے مال اور ان کی عبادت گاہوں کی حرمت کی جائے گی اور مسلمان عیسائی گرجوں میں نماز پڑھنے کے مجاز نہ ہوں گے۔ جو سلوک عمرو بن عاصؓ نے مصریوں کے ساتھ کیا وہ اس سے کم نہ تھا اس نے باشندگان مصر سے وعدہ کیا کہ انھیں پوری مذہبی آزادی۔ پورا انصاف بلا رو رعایت اور جائداد کی ملکیت کے پورے حقوق دیئے جائیں گے اور ان ظالمانہ اور غیر محدود مطالبوں کے عوض میں جو یونانی شہنشاہ ان سے وصول کیا کرتے تھے صرف ایک جزیہ لیا جائے گا جس کی تعداد دس روپیہ سالانہ تھی رعایائے سو بجات نے ان شرائط کو اس قدر غنیمت سمجھا کہ وہ فوراً عہد و پیمان میں شریک ہو گئے اور جزیہ کی رقم انھوں نے پیشگی ادا کردی۔ عمالِ اسلام اپنے عہد پر اس درجہ مستحکم

رہے اور انھوں نے اُن لوگوں کے ساتھ جو ہر روز شاہنشاہِ قسطنطنیہ کے عاملوں کے ہاتھ سے انواع و اقسام کے مظالم سہا کرتے تھے اس طرح کا عمدہ برتاؤ کیا کہ سارے ملک نے کشادہ پیشانی دین اسلام اور عربی زبان کو قبول کر لیا۔ میں بار بار کہوں گا کہ یہ وہ نتیجہ ہے جو ہرگز بزور شمشیر نہیں حاصل ہو سکتا۔"

(۹) مصر کے مشہور اخبار ایجپٹ میں ایک مسیحی نے لکھا تھا کہ

"ہم عیسائیت اور اسلام کا مقابلہ کرتے ہیں تو ایک نمایاں فرق یہ نظر آتا ہے کہ عیسائی مذہب کے راستے میں جب علوم و فنون آ گئے تو اُس نے نہایت بیدردی سے اُن کو پامال کیا لیکن اسلام نے خود علوم و فنون کی بنیادیں قائم کیں اور عیسائیت و مجوسیت نے جن شائقین علوم کو شوق علم کے جرم میں جلا وطن کیا اسلام نے اُن کو اپنے دامن میں پناہ دی۔" ...... "جس طرح عیسائیت علم اور تمدن کے میدان میں اسلام کے دوش بدوش نہیں چل سکتی اسی طرح اخلاقی حیثیت سے بھی اسلام کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔"

(۱۰) بیروت کے ایک مسیحی اخبار الوطن میں ایک مسیحی نامہ نگار نے آنحضرت صلعم کے متعلق ایک مضمون لکھا اُس میں وہ لکھتا ہے کہ

"پیغمبر اسلام نے مسلمانوں کی قوم کے پھیلنے اور باقی رہنے کے تمام سامان فراہم کر دیئے کیونکہ مسلمان جب قرآن و حدیث میں غور کریں گے تو وہ اپنی ہر دینی و دنیوی ضرورت کا علاج اُس میں پائیں گے انھوں نے اپنے پیروؤں کے لئے ایک عالمگیر کانفرنس کی بنیاد ڈالی یعنی حج کے ذریعہ تمام دُنیا کے صاحب ثروت اور با اثر لوگ ایک جگہ جمع ہو کر آپس میں ربط و اتحاد بڑھا سکتے ہیں۔ اُنھوں نے زکوٰۃ فرض کر کے فقرائے قوم کا کافی بندوبست کر دیا کہ قوم میں کوئی فقیر باقی نہ رہے انھوں نے ایک زندہ جاوید زبان مسلمانوں کے لئے قائم کر دی کیونکہ قرآن عربی زبان میں ہے جس کا سمجھنا ہر مسلمان پر فرض ہے تمام افراد قوم کے لئے اُبھرنا اور ترقی کرنا آسان کر دیا کیونکہ ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان پر سوائے تقوی کے اور کسی چیز کے سبب ترجیح نہیں دی۔ مسلمان اپنے پریسیڈنٹ کا جس کو وہ خلیفہ کہتے ہیں خود انتخاب کرتے تھے۔ غیر مسلم یعنی ذمیوں کے لئے اسلامی ممالک میں عیش و راحت کے ساتھ رہنا آسان کر دیا کیونکہ حکم دیا کہ تمام مخلوق خدا کی اولاد ہے اور سب سے پسندیدہ خدا کے نزدیک وہ

ہے جو اُس کی اولاد کو نفع پہنچاتے۔ انھوں نے عورت کے مرتبہ کو بلند کر دیا۔ بیت المال کے لئے قواعد مرتب کئے اور حکمت و دانائی کو مسلمانوں کا گم شدہ مال قرار دیا اور اُس کے حاصل کرنے کی تاکید کی"۔

(۱۱) جون ڈیون پورٹ صاحب لکھتے ہیں کہ

"یہ خیال کہ قرآنی مذہب تلوار کے ذریعہ سے شائع ہوا تھا بالکل غلط ہے کیونکہ ہر ایک غیر متعصب آدمی ادنیٰ فکر سے معلوم کر سکتا ہے کہ آنحضرت (صلعم) کا مذہب ایسا تھا کہ جس میں انسان کی قربانی اور خوں ریزی کی جگہ نماز اور زکوٰۃ قائم کی گئی تھی اور ہمیشہ کے جھگڑوں اور تصفیوں کی جگہ باہمی اخلاص و محبت کی بنیاد ڈالی گئی تھی اور یہی باعث ترقی کا ہوا تھا۔ حقیقت میں یہ مذہب اہل مشرق کے واسطے سراپا برکت تھا اور آنحضرت (صلعم) نے ہرگز اس قدر خوں ریزی نہیں کی جس قدر موسیٰ علیہ السلام نے بت پرستی کی بیخ کنی کے لئے کی تھی۔

(۱۲) مشہور مورخ ایڈورڈ گبن لکھتا ہے کہ

"قدرت کے قانون میں ہر شخص اسلحہ کے ذریعہ اپنی ذات و ملکیت کی حفاظت کا حق رکھتا ہے وہ اپنے دشمنوں کو دفع کر سکتا یا اُن سے زیادتی کا بدلہ لے سکتا ہے اور اپنے انتقام و معاوضہ کو ایک مناسب حد تک وسیع کر سکتا ہے۔ محمد صاحب (صلعم) کو اُن کے ہم وطنوں کی ناانصافی نے اُس وقت محروم و جلا وطن کیا جب کہ وہ اپنے خیراندیش مذہب اور صلح آمیز رسالت پر عامل تھے۔

(۱۳) مسٹر طامس کارلائل اپنی کتاب "لیکچرز آن ہیروز" میں لکھتا ہے کہ

"اسلام کا آنا عرب کی قوم کے حق میں گویا تاریکی میں روشنی کا آنا تھا عرب پہلے ہی پہل اُس کے ذریعہ زندہ ہوا۔ اہل عرب گلہ بانوں کی غریب قوم تھی اور جب سے دنیا بنی تھی عرب کے چٹیل میدانوں میں پھرا کرتی تھی اور کسی شخص کو ان کا کوئی خیال کبھی نہ تھا۔ اس قوم میں ایک اولوالعزم پیغمبر ایسے کلام کے ساتھ جس پر وہ یقین کرتے تھے بھیجا گیا۔ اب دیکھو کہ جس چیز سے کوئی واقف ہی نہ تھا وہ تمام دنیا میں مشہور و معروف ہو گئی اور چھوٹی چیز نہایت بڑی بن گئی اس کے بعد ایک صدی کے اندر ایک جانب غرناطہ اور ایک طرف دہلی ہو گئی ...... ایک چنگاری ایسے ملک میں پڑی۔

جو ظلمت میں چھپا ہوا ریگستان تھا مگر دیکھو اس نے زور شور سے اُڑ جانے والی بارود کی طرح نیلے آسمان تک اُٹھتے ہوئے شعلوں کے ذریعہ دہلی سے تا بہ غرناطہ روشن کر دیا۔

(۱۴) جی ایم۔ راڈویل کہتا ہے کہ

"دلیلوں سے ثابت ہے کہ آنحضرت (صلعم) کے سب کام اس نیک نیتی کی تحریک سے ہوتے تھے کہ لوگوں کو جہالت اور بُت پرستی سے چھڑائیں اور یہ کہ اُن کی زیادہ سے زیادہ خواہش یہ تھی کہ امرِ حق یعنی توحید الٰہی کا جوش جو اُن کی روح پر غایت درجہ مستولی ہو رہا تھا اُس کا خوب اشتہار و اظہار کریں اُن کی ذات کریم اور سیرت صداقت مشحون کی نسبت اُن لوگوں کا تصور کرنا چاہیئے جن کے اخلاق اور ایمان کو ابنارِ جنس کے تمام امور دنیوی پر کامل اختیار حاصل ہے .... قرآن میں ایک نہایت گہری حقانیت ہے جو اُن لفظوں میں بیان کی گئی ہے جو باوجود مختصر ہونے کے قوی اور صحیح رہنمائی اور الہامی حکمتوں سے مملو ہیں۔"

(۱۵) جرمن مستشرق عمانویل ڈیوش لکھتا ہے کہ

"قرآن مجید کی مدد سے عربوں نے سکندر اعظم اور رومیوں کی سلطنت سے بڑی دنیا فتح کر لی۔ فتوحات کا جو کام رومیوں سے سیکڑوں برس میں ہوا تھا عربوں نے اُسے اُس کے دسویں حصہ وقت میں انجام پر پہنچایا۔ اسی قرآن کی مدد سے تمام سامی اقوام میں صرف عرب ہی یورپ میں شاہانہ حیثیت سے داخل ہوئے جہاں اہل فینشیا بطور تاجروں کے اور یہودی لوگ پناہ گزینوں اور اسیروں کی حالت میں پہنچے۔ ان عربوں نے بنی نوع انسان کو روشنی دکھائی جب کہ چاروں طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی ان عربوں نے یونان کی عقل و دانش کو زندہ کیا اور مغرب و مشرق کو فلسفہ، طب اور علم ہیئت کی تعلیم دی اور موجودہ سائنس کے جنم لینے میں اُنھوں نے حصہ لیا۔ ہم ہمیشہ اُس روز کا ماتم کریں گے جس دن غرناطہ عربوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔"

(۱۶) ڈاکٹر سموئیل جانسن لکھتا ہے کہ

"قرآن کے مطالب ایسے ہمہ گیر ہیں اور ہر زمانہ کے لئے اس قدر موزوں ہیں کہ زمانہ کی تمام صدائیں خواہ مخواہ اُس کو قبول کر لیتی ہیں اور وہ محلوں، ریگستانوں، شہروں اور سلطنتوں میں گونجتا ہے ..... وہ ایسی کارگن قوت بن گیا جس کے ذریعہ سے

جس وقت عیسائیت تاریکی کی ملکہ بنی ہوئی تھی یونان اور ایشیا کی تمام روشنی عیسائی یورپ کے گہرے اندھیرے میں پہنچی "

(۱۷) مارگولیتھ انگریزی ترجمہ قرآن (مترجمہ راڈویل) کے دیباچہ میں لکھتا ہے کہ

"تحقیقات سے یہ ظاہر ہو گیا ہے کہ یورپ میں علم کے دور جدید سے کئی صدیوں پیشتر یورپ کے علما فلسفہ، ریاضی، ہیئت اور دیگر علوم کے متعلق جو کچھ جانتے تھے وہ تقریباً سب کا سب اصلی عربی کتابوں کے لاطینی ترجموں کے ذریعہ سے انھیں حاصل ہوا تھا۔ قرآن ہی نے شروع میں کنایۃً ان علوم کے حاصل کرنے کا ذوق شوق عربوں اور اُن کے دوستوں میں پیدا کیا تھا"

(۱۸) لڈولف کریہل۔ جس نے ۱۸۸۴ء میں آنحضرت صلعم کے حالات شائع کئے تھے لکھتا ہے کہ

"قرآن میں عقائد۔ اخلاق اور ان کی بناپر قانون کا مکمل مجموعہ موجود ہے اس میں ایک وسیع جمہوری سلطنت کے ہر شعبہ کی بنیادیں بھی رکھدی گئی ہیں عدالت، حربی انتظامات، مالیات اور نہایت محتاط قانون غربا وغیرہ کی بنیادیں خدائے واحد کے یقین پر رکھی گئی ہیں"

(۱۹) ریورینڈ آر ڈبلیو اسٹیفن لکھتا ہے کہ

"آنحضرتؐ نے بُت پرستی کے ایک منتشر انبار کے عوض میں خالص توحید کا عقیدہ قائم کیا۔ آپ نے لوگوں کے اخلاقی معیار کو بلند کیا اور ان کی تمدنی حالت کو ترقی دی اور ایک سنجیدہ اور معقول طریق عبادت جاری کیا آخرکار آپ نے اس ذریعہ سے بہت سے وحشی اور آزاد قبیلوں کو جو محض ذرّوں کی طرح اِدھر اُدھر اُڑتے پھرتے تھے باہم ملا کر ایک ٹھوس ملکی جماعت کی شکل میں منتقل کردیا آپ ایک ایسے ملک میں پیدا ہوئے تھے جہاں ملکی نظام معقول اعتقاد اور خالص اخلاق سے لوگ ناواقف تھے آپ نے ان تینوں باتوں کو وہاں رواج دیا۔ ملکی حالت، مذہبی اعتقاد اور اخلاقی حالت کی اصلاح کردی بہت سے آزاد قبیلوں کی جگہ آپ نے ایک قوم چھوڑی۔ بہت سے معبودوں اور بہت سے خداوندوں کے باطل عقیدے کی جگہ آپ نے ایک قادر مطلق مگر رحمٰن و رحیم خدا کا معقول عقیدہ قائم کیا لوگوں کو تعلیم دی کہ وہ اس خیال کے ساتھ

زندگی بسر کریں کہ وہ وجودِ مطلق ہر دم ہمارا محافظ و نگہبان ہے۔ اسی کو نیکیوں کا جزا دینے والا سمجھیں اور اسی کو بدوں کا سزا دینے والا سمجھکر اُس سے ڈریں۔ بہت سی قابلِ نفرت اور وحشت انگیز رسمیں جو آپ کے زمانہ تک عرب میں رائج تھیں ان پر آپ نے زبردست حملہ کیا۔ اوباشانہ بدکاری کی بجائے تعددِ زوجات کا ایک بااحتیاط اور باضابطہ اصول منضبط کیا گیا۔ دختر کشی کی رسم کا پورا پورا انسداد کیا۔ ترک ہندوستانی حبشی اور بربری اس بات پر مجبور ہوگئے کہ اپنے بتوں کو اٹھا کر پھینک دیں اپنے رندانہ رسم و رواج کو خیرباد کہدیں اور خدائے واحد کی پرستش میں شایستہ طرز عبادت اور ایک باقاعدہ طرزِ معاشرت کی طرف رجوع کریں۔ اہلِ فارس کا عقیدہ بھی صاف اور خالص ہوگیا اور انھوں نے اسلام سے یہ بات سیکھ لی کہ نیکی و بدی کی دو ہمسر قوتیں یزدان واہرمن، نہیں ہیں بلکہ نیکی و بدی دونوں اُسی حکیم اور قدوس کے زیرِ فرمان ہیں جو آسمان و زمین کی تمام چیزوں پر حکمرانی کرتا ہے۔"

(۲۰) ڈاکٹر ڈبلیو ٹی آرنلڈ کی کتاب پریچنگ آف اسلام اسی موضوع پر لکھی گئی ہے کہ "اسلام کی اشاعت بزورِ شمشیر نہیں بلکہ صلح و آشتی کے ساتھ ہوئی ہے" جو قابلِ مطالعہ ہے۔ اور اُس کا اُردو ترجمہ دعوتِ اسلام کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

(۲۱) موسیو لیبلی جنھوں نے ایک بے نظیر کتاب مشرق پر لکھی ہے اور جو ایک نہایت محقق اور مذہبی مصنف ہیں اُن کا قول ڈاکٹر گستاولی بان نے اپنی کتاب تمدنِ عرب میں اس طرح نقل کیا ہے۔

"مسلمان اُن نظامات میں جو اقوام مزدوری پیشہ کی بہبودی سے متعلق ہیں اس وقت تک اُن سخت غلطیوں سے بچے ہوئے ہیں جو مغرب میں واقع ہوئی ہیں۔ ان میں اب تک وہ عمدہ نظامات کامل طور سے باقی ہیں جن کے ذریعہ سے انھوں نے امیر و غریب و غلام و مالک میں صلح قائم رکھی ہے اسی قدر کہنا کافی ہے کہ وہ قوم جس کو تعلیم دینے کا دعویٰ یورپ کر رہا ہے فی الواقع وہ قوم ہے جس سے خود اسے سبق لینا چاہیئے۔

(۲۲) پروفیسر ایڈورڈ مونٹ پروفیسر السنہ مشرقیہ جنیوا یونیورسٹی کہتے ہیں کہ

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اصلاحِ اخلاق اور سوسائٹی کے متعلق جو کامیابی ہوئی اُس کے اعتبار سے آپ کو انسانیت کا محسنِ اعظم یقین کرنا پڑتا ہے۔

(۵) ایک غلط فہمی کا ازالہ

ہمارے زمانہ کی پیدا شدہ شرارتوں میں خصوصیت سے ایک یہ بات بھی قابل تذکرہ ہے کہ اسلام کو موردِ الزام بنانے کے لئے بعض نام کے مسلمان سلاطین کی بداعمالیوں کا تذکرہ نہایت بلند آہنگی کے ساتھ بطور ثبوت پیش کیا جاتا ہے۔ حالانکہ دنیا میں کوئی مذہب ایسا نہیں بتایا جا سکتا جس سے منسوب ہونے والا ہر ایک شخص اُس مذہب کی خلاف ورزی پر قادر نہ ہو سکے مجوسیوں، بودھوں، ہندوؤں، یہودیوں اور عیسائیوں کی تعداد آج بھی دنیا میں لاکھوں سے گذر کر کروڑوں تک پہنچتی ہے کیا کوئی شخص مردِ میدان بن کر اس بات کے ثابت کرنے پر آمادہ ہو سکتا ہے کہ ان مذکورہ مذاہب کے ماننے والوں میں فی صدی پانچ آدمی ...... بھی ایسے مل سکتے ہیں جو ہمہ وجوہ اپنے احکامِ مذہبی کے پابند ہوں اور اُن کی عملی زندگی اپنے اپنے مذاہب کا ایسا کامل نمونہ ہو کہ جس میں خلاف ورزی مذہب کا کوئی شائبہ تلاش نہ کیا جا سکے۔ انسانی کمزوری، انسانی غفلت، انسانی سہوونسیان، اور انسانی سرکشی ونادانی کا یہ نتیجہ ہے کہ دنیا میں ہمیشہ سے انسان کے قدم بہکتے رہے ہیں۔ ہاں یہ سچ ہے کہ کسی مذہب کی تعلیمات کے اچھے یا بُرے نتائج کا فیصلہ کرنے کے لئے ہم اُس مذہب کے ماننے والوں کی عملی واخلاقی حالت پر ضرور نظر ڈالیں گے۔ لیکن ہماری نظر زمین پر رینگنے والے ایسے کیڑے کی نظر کے مشابہ نہ ہونی چاہیئے جو دو انچ سے زیادہ فاصلہ کی کوئی چیز نہیں دیکھ سکتا۔ ہر مذہب کے ماننے والوں میں ایک تعداد نافرمانوں اور بداحتیاطوں کی بھی شامل رہا کرتی ہے لیکن اُس مذہبی جماعت کا مجموعی مزاج ہمیشہ اس مذہب کی تعلیمات کا نتیجہ ہوا کرتا ہے کسی قوم یا ملک کے مزاج اور مجموعی اخلاق کا اندازہ اُس قوم یا ملک کے صرف قلیل ترین حصہ کے مطالعہ سے نہیں بلکہ کثیر حصہ کے مطالعہ سے کیا جاتا ہے اور اس اصول سے انکار کی کسی عقل وفراست کو جراءت نہیں ہو سکتی جو لوگ اسلام کو عیاشی کا محرک ثابت کرنے کے لئے تاریخ ہند میں سے محمد شاہ عدلی

جہاں دار شاہ اور واجد علی شاہ کے حالات جوش و خروش کے ساتھ پیش کرتے ہیں وہ اسی تاریخ ہند میں ناصر الدین محمود۔ شمس الدین التمش۔ غیاث الدین بلبن، خان شہید۔ جلال الدین خلجی۔ فیروز تغلق۔ بہلول لودی۔ سکندر لودی۔ شیر شاہ اعظم، اکبر، شاہجہاں۔ عالمگیر وغیرہ کے حالات کیوں ملاحظہ نہیں فرماتے اور جو لوگ تیمور کی خوں ریزی کے افسانے سنا کر نوع انسان کی ہمدردی کا ثبوت دینے کے لئے نوحہ خواں ہیں وہ تیمور کی اولاد میں اکبر و جہانگیر کی ہندو نوازیوں کی داد کیوں نہیں دیتے۔

احکام مذہبی کی پابندی میں سب سے زیادہ سست پادشاہوں اور امیروں کا گروہ ہوا کرتا ہے۔ دنیا کے تمام مذاہب میں صرف اسلام ہی کو یہ شرف حاصل ہے کہ اُس نے ان فرماں رواؤں کے طبقہ کی بھی اصلاح کر کے مطلق العنانی کا خاتمہ کیا اور شاہ و گدا دونوں کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیا۔ لیکن جو لوگ احکام اسلامی سے غفلت اور روگردانی کر کے مطلق العنان فرماں روائی کے مذہبی جرم میں گرفتار رہوں اُن کو مذہب اسلام کے ناقص ہونے کی دلیل میں کیسے پیش کیا جا سکتا ہے قرآن مجید نے خود الھٰکم التکاثر اور اکابر مجرمیھا فرما کر بتا دیا کہ سب سے زیادہ ناقص اور مورد الزام لوگ امیروں اور وزیروں کے طبقہ میں تلاش کئے جا سکتے ہیں۔ آج بھی یورپ کی عیسائی قومیں اور عیسائی سلاطین انجیل کی تعلیمات کے خلاف عمل درآمد کر رہے ہیں اور ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسرا گال سامنے نہیں کرتے بلکہ رات دن نوعِ انسان کے قتل اور سفک دم کے نئے انواع و اقسام کے آلات و اسلحہ ایجاد کرنے میں مصروف ہیں لیکن عیسائی پادریوں نے یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے عیسائی مذہب کا ناقص و نادرست ہونا تسلیم نہیں کیا۔ مہابھارت اور رامائن کے افسانوں میں کنس وجراسند و راون وغیرہ راجاؤں کے نتیجے پڑھنے والوں کو یہ استحقاق کیسے حاصل ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کو جو پابندی احکام اسلامی میں زیادہ چست اور مستعد نہ تھے نمونہ قرار دے کر اسلامی تعلیمات اور مسلمانوں کے عام اخلاق کا مطالعہ غیر ضروری قرار دیں۔

معاندانہ حملے اور ان کا جواب اسی سلسلے میں ایک اور بھی نہایت اہم اور ضروری بات کی طرف توجہ دلانا باقی ہے وہ یہ کہ مسلمانوں اور ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں پر احمقانہ و معاندانہ حملے کرنے والے محمد بن قاسم

محمود غزنوی ۔ شہاب الدین غوری ۔ علاء الدین خلجی ۔ عالمگیر اورنگ زیب کو مورد الزام بناتے وقت اور اس زمانے کے مسلمانوں کا ذکر کرتے ہوئے بُعدِ زمانی اور اُس کے متعلقات کو بالکل فراموش کردیتے ہیں وہ جب محمود و شہاب الدین کا ذکر کرتے ہیں تو اُس زمانے کے ہندوستان کو آج کا ہندوستان ۔ اُس زمانے کی دنیا کو آج کی دُنیا اور اُس زمانے کے تمدن و معاشرت کو آج کا تمدن و معاشرت فرض کرلیتے اور اسی مفروضہ کی بنا پر لوگوں کو یقین دلاتے اور اس حقیقت کو بالکل نظر انداز کردیتے ہیں کہ مسلمانوں کی آمد سے پیشتر اس ملک کے باشندوں کی معاشرت کس قدر کثیف ۔ ان کے اخلاق کس قدر پست اور ان کا تمدن کس قدر ادنیٰ درجہ کا تھا ۔ یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ اُس زمانے میں ہندوستان کے سوا باقی تمام دُنیا کی کیا حالت تھی اور مسلمانوں نے اس ملک میں داخل ہوکر ہندوؤں کو کس قدر فوائد پہنچائے اور اُن میں کیسی روشن خیالی پیدا کی ۔ آج کل اہلِ ہند کی آنکھیں یورپ کی تہذیب و ترقی کے آگے خیرہ ہو رہی ہیں لیکن اُن کو اس بات کے تحقیق کرنے کی فرصت میسر نہیں کہ یورپ کی یہ تمام ترقیات اسلامی تعلیمات اور مسلمانوں کے اخلاق و ترقی کا نتیجہ ہیں ۔ اُن کو شاید یہ بھی کبھی بھولے سے خیال نہیں آتا کہ مسلمانوں کی آمد سے پیشتر ہندوؤں کا لباس کیسا تھا ۔ اُن کی خوراک برتن ، اُن کی بستیاں ، مکانات صحن و دروازے کیسے ہوتے تھے ۔ اُن کے میلوں ٹھیلوں اور آدابِ مجلس کی کیا حالت تھی ۔ اُن کے علوم و فنون کیا اور کس حیثیت کے تھے اُن کی سواریاں اور اسلحۂ جنگ اور فنونِ حرب کا کیا مرتبہ تھا ۔ اُن کے خیالات و جذبات میں کس قدر سنجیدگی اور متانت تھی اور اُن کی حمیت و غیرت کا اعلیٰ معیار کیا تھا ۔ یہ تمام باتیں ایک مستقل تصنیف کی خواہاں ہیں ۔

غیر مسلم فرمانرواؤں کا طرزِ عمل

کم از کم اتنا تو ضرور یاد رکھنا چاہیئے کہ جس زمانے میں مسلمان ہندوستان کو فتح کرکے اس پر حکومت کر رہے تھے اور ہندو مفتوح نہایت آزادی کے ساتھ اپنے مندروں کے اندر پوجا پاٹ میں مصروف تھے اُس زمانے میں دوسرے غیر مسلم فرماں رواؤں کا طرزِ عمل اپنی رعایا کے ساتھ کیا تھا ۔ روم کے پوپ انوسنٹ نے حکم دیا تھا کہ "منکرین عقائد کیتھولک کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے" اندلس کی اسلامی یونیورسٹیوں میں تعلیم پائے ہوئے

عیسائیوں نے جب یورپ کے عیسائی ملکوں میں جا کر علم اور عقل کی باتوں کا اظہار کیا تو وہ ہر جگہ ستائے اور تنگ کیے گئے کیونکہ اُس زمانے کا تاریک یورپ کسی علم و تہذیب کی شعاع کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ انھیں مذکورہ عیسائیوں میں سے ایک نے جب قوسِ قزح کی نسبت کہا کہ یہ خدا کی انتقام لینے والی کمان نہیں ہے بلکہ پانی کے قطرات پر آفتاب کی روشنی پڑنے سے نمایاں ہوتی ہے تو اُس کو قید کر دیا گیا اور جب وہ قید خانہ میں مر گیا اور اُس کو دفن کر دیا گیا تو بعد میں مذہبی فتوے کے موافق اُس کی لاش قبر سے نکال کر آگ میں جلائی گئی۔ علم و عقل کی باتیں جو اندلس کی اسلامی درس گاہوں کے ذریعہ یورپ میں شائع ہو رہی تھیں اُن کے روکنے اور تاریکی کو باقی رکھنے کے لئے ایک جاسوسی کا محکمہ قائم کیا گیا کہ کوئی کتاب پوپ کی اجازت کے بغیر شائع نہ ہو سکے چنانچہ اس محکمہ کے ذریعہ ۱۴۸۱ء سے ۱۴۹۱ء تک ایک لاکھ چودہ ہزار نو سو چھ آدمی محض اس لئے مجرم قرار دیئے گئے کہ وہ علم و حکمت اور فلسفہ کی باتیں زبان یا زبانِ قلم تک لائے تھے۔ ان میں سے ایک ہزار تیئیس کو زندہ آگ میں ڈال کر جلایا گیا اور سولہ ہزار آٹھ سو ساٹھ (۱۶۸۶۰) کو پھانسی پر لٹکایا گیا۔ باقی کو دوسری سخت سزائیں دی گئیں۔

ہندوستان میں مسلم فاتحین کی رواداریاں

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ہندوستان میں سلطان بہلول لودی اور سکندر لودی فرماں روا تھے اور ہندوؤں کو فارسی زبان پڑھا پڑھا کر بڑے بڑے شاہی عہدے تفویض کر رہے تھے اور کبیر داس اپنے خیالات کی آزادانہ نشر و اشاعت میں مصروف اور اپنے کبیر پنتھی مذہب کی بنیاد رکھنے میں مشغول تھے۔ اُدھر اندلس میں عیسائیوں نے چیرہ دست ہو کر ۱۴۹۱ء میں تیرہ لاکھ بے ضرر اور امن پسند مسلمانوں کو معاہدہ کے خلاف صرف اس وجہ سے آگ میں زندہ ڈال کر جلایا کہ وہ عیسائی نہ تھے اور ادھر سلطان سکندر لودھی ہندوؤں کو حکومت کے عہدوں پر مامور کر رہا تھا۔ کیا کسی ہندوستان کے باشندے کی یہ خواہش ہو سکتی ہے کہ وہ یا اُس کے باپ دادا بہلول لودھی اور سکندر لودی کے زیرِ حکومت ہندوستان میں نہ ہوتے بلکہ اٹلی یا اسپین میں ہوتے جہاں اختلافِ عقائد کی وجہ سے زندہ آگ میں ڈال کر جلایا جا رہا تھا۔ ہندوستان کے اندر جس زمانہ میں مغلوں کی سلطنت قائم ہو رہی تھی اور شیر شاہ اعظم ایک ادنیٰ طبقہ کے

ہندو کی شکایت پر اپنے عزیز بیٹے اور ولی عہد سلطنت کو سخت سزا دینے کا حکم دے کر عدل و انصاف کی پوری پوری داد دے چکا تھا اُس زمانے میں تہذیب کے علمبردار اور عدل و انصاف کے دعوے دار یورپ کے بعض سپہ سالاروں نے یہ عزم کر لیا تھا کہ امریکہ کے ملک مکسیکو کو بالکل ویران کر کے وہاں اپنی ایک نوآبادی قائم کریں چنانچہ میکسیکو کے قدیم پادشاہ کو گرفتار کر کے اُلٹا لٹکایا گیا اور اُس کے سامنے اس کی رعایا کو جلتی ہوئی آگ میں ڈال ڈال کر جلانے کا دلچسپ کام شروع کیا گیا اور اس طرح ہزارہا بندگانِ خدا کو آگ میں جلانے کے علاوہ پہاڑوں اور جنگلوں میں پناہ لینے والوں کو کتوں سے پھڑوایا گیا اس انسانی تہذیب کا نمونہ دکھانے والے وہی مہذب و شائستہ ہسپانوی تھے جنھوں نے مسلمانوں کو اندلس سے یہ الزام دے کر تخم سوخت کیا تھا کہ یہ ظالم گنہگار اور بد دین قوم ہے۔ جنوبی امریکہ کے ملک پیرو میں اٹلی کے ایک مجہول النسب سپہ سالار نے جس طرح قتل و غارت کا بازار گرم کر کے وہاں کے قدیم باشندوں کو فنا کیا اُس کی روداد بھی جسم کے رونگٹے کھڑے کرنے میں ہسپانوی مظالم سے کسی طرح کم نہیں ہے۔

ملک کانگو میں بلجیموں نے وہاں کے باشندوں کو صرف چند تولہ ربڑ کی چوری کے الزام میں جس طرح ستایا اور قتل و غارت کئے جو ہنگامے برپا کئے اُس کی مثالیں چنگیز و ہلاکو کے کارناموں میں بھی تلاش نہیں کی جاسکتیں۔ آسٹریلیا اور تسمانیہ کے باشندوں کو جس طرح صفحۂ ہستی سے معدوم ہونا پڑا وہ بھی کچھ کم حسرت انگیز نہیں ہے۔ یہ سب اُس زمانے کی داستانیں ہیں جب کہ ہندوستان میں مسلمان فاتحین نے ہندو مفتوحین پر عدل و انصاف اور رعایت و مروت و دلدہی کی بارشیں برسا رکھی تھیں اور ہندوؤں کو وزارتِ عظمیٰ اور سپہ سالاری کے عہدے تفویض کئے تھے۔ جس زمانے میں عالمگیر اورنگ زیب ہندوستان میں تخت نشین ہو رہا تھا اُس زمانے میں انگلستان کے اندر یہ عجیب و غریب قانون جاری تھا کہ جس عورت پر کوئی شخص ساحرہ ہونے کا الزام لگائے اُس کو امتحان کی غرض سے کسی دریا یا تالاب یا سمندر میں ڈالا جاتا۔ اگر وہ عورت پانی میں ڈوب کر مر گئی تو ثابت ہوا کہ وہ ساحرہ نہ تھی اور اگر کسی طرح ڈوبنے سے بچ گئی تو اُس کا ساحرہ ہونا ثابت ہو گیا لہٰذا اُس کو قتل کر دیا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ جس عورت پر کوئی شخص ساحرہ ہونے کا شبہ ظاہر کر دیتا تھا اُس عورت کی موت یقینی تھی اس طرح ہزارہا بے گناہ عورتیں نذرِ اجل ہوئیں

کبھی ان بے گناہ عورتوں کے ناخنوں میں کیلیں ٹھونکی جاتی تھیں اور لوہا گرم کر کے داغ دیئے جاتے تھے۔ اس طرح اول اُن سے جرم کا اقرار کرایا جاتا تھا جب ان ناقابلِ برداشت اذیتوں کے مقابلہ میں وہ اقرارِ جرم کر لیتی تھیں تو فوراً اُن کو قتل کر دیا جاتا تھا۔ کیا اس عجیب و غریب طرزِ حکومت کے مقابل اُسی زمانے میں ہندوستان کے اندر عدل و انصاف کے دریا نہیں بہہ رہے تھے اور کیا عالمگیر کی سلطنت میں اس قسم کی کوئی مثال تلاش کی جا سکتی ہے؟

ہندوستان کے غیر مسلم فاتحین کا طرزِ عمل

آریوں نے ہندوستان میں داخل ہو کر غیر آریوں کے ساتھ کس قسم کا سلوک کیا تھا اور برہمنی مذہب کے ماننے والوں نے بودھوں کو کس طرح ہندوستان سے جلاوطن اور ناپید کرنے کی کوشش کی تھی۔ ان پُرانی داستانوں کے دوہرانے اور یاد دلانے کی ضرورت نہیں آؤ آخری زمانے میں جب کہ ہندو مفتوحوں اور مسلمان فاتحوں کو اس ملک میں ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہوئے سیکڑوں ہزاروں برس گذر چکے تھے اور ہمسائیگی و ہم وطنی کے سبب محبت و اخلاص کے تعلقات بہت قوی ہو گئے تھے دیکھیں اور تحقیق کریں کہ ہندوؤں نے چیرہ دست ہو کر مسلمانوں کے ساتھ کس قسم کا سلوک کیا تھا۔ پنجاب میں صرف چالیس پچاس سال تک سکھوں کی سلطنت قائم رہی لیکن ہم آج تک پنجاب کے مسلمانوں سے سکھوں کے ظلم و جور کی عجیب عجیب داستانیں سنتے ہیں اور حیرت زدہ ہوتے ہیں دکن میں مرہٹوں کی سلطنت بھی کچھ عرصہ کے لئے قائم ہو گئی تھی لیکن اس مرہٹہ سلطنت کی چند روزہ تاریخ میں قتل و غارت کے ہنگامے۔ مظلوموں کی آہ و بکا کا شور بستیوں کے جلنے کا دُھواں خون کے سیلاب۔ تڑپتی ہوئی لاشیں اور مسمار شدہ مکانات کے اینٹ پتھروں کے انبار ہر صفحہ پر پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بیچارے سکھوں اور مرہٹوں ہی کی کیا خطا ہے موجودہ مہذب یورپ کو دیکھو کہ مفتوحہ قوموں کے ساتھ ان فاتحین کا سلوک کس قسم کا ہے اور یہ تعلیم یافتہ فاتحین اپنے مفتوحین کو کہاں تک اُن کے انسانی حقوق عطا کرنے پر آمادہ ہیں۔

غرض دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں بتائی جا سکتی جس نے فتح ہند ہو کر مفتوحوں کے ساتھ اس مسالمت۔ رواداری، نرمی، رعایت مساوات اور عدل و انصاف کا سلوک

کیا ہو جیسا کہ مسلمانوں نے عام طور پر اپنے مفتوحین سے کیا۔ جن ملکوں پر سیکڑوں برس سے مسلمانوں کی حکومت قائم ہے اُن میں آج تک عیسائی اور یہودی نہایت امن وامان اور فارغ البالی کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں اور جائز طور پر کوئی وجہ شکایت بیان نہیں کی جا سکتی۔ خود ہندوستان میں مسلمانوں نے ہزار گیارہ سو سال حکومت کی لیکن ہندو نہایت آرام وآسائش اور فارغ البالی کے ساتھ رہے جس کا ثبوت یہ کتاب پیش کرے گی مگر اس کے خلاف ہم دیکھتے ہیں کہ اندلس اور صقلیہ میں جہاں مسلمانوں کی بہت آبادی تھی آج ایک بھی مسلمان نظر نہیں آتا اور اُن کے ساتھ جو سلوک فاتحین نے کیا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ترکوں کی سلطنت میں عیسائی کس امن وامان اور اطمینان کے ساتھ رہے لیکن ہرزیگونیا۔ بوسنیا۔ رومانیہ۔ بلغاریہ یونان۔ سرویہ وغیرہ ترکوں کے صوبے جب اُن کے قبضہ سے نکل کر دوسری قوم کے قبضہ میں پہنچے تو مسلمان وہاں نہ رہ سکے اور آج مسلم آبادی سے یہ علاقے خالی نظر آتے ہیں۔ اس تہذیب وروشن خیالی کے زمانے میں مسلمانان روس نے جس قسم کے مظالم سہے اُن کا تصور خون کے آنسو رلانے کے لئے کافی ہے۔ یہودیوں کے ساتھ روشن خیال یورپ نے جو ظالمانہ برتاؤ کیا کسی سے پوشیدہ نہیں۔ لیکن یہ بات بھی چھپی ہوئی نہیں ہے کہ مصر وترکی میں ان مظلوم وجلا وطن یہودیوں کو ہمیشہ پناہ ملتی رہی۔

اسی سلسلہ میں اس دجل وفریب کا بھی تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اکثر چالاک مورخین جب ہندوستان کے کسی مسلمان بادشاہ کا ذکر کرتے ہیں تو بڑی گرم جوشی اور ہمدردی کے ساتھ اُس کی خوبیوں اور تعریفوں کے بیان کرنے میں اپنی قابلیت کا اظہار کر کے پڑھنے والے کو اس بات کا یقین دلاتے ہیں کہ ہم بڑے بے تعصب اور منصف مزاج ہیں لیکن پھر اُس کے عیوب ونقائص کی تفصیل بیان کر کے آخر میں یہ مختصر جملہ لکھ دیتے ہیں کہ یہ تمام غلطیاں اس بادشاہ سے اس لئے سرزد ہوئیں کہ وہ مذہب اسلام کا زیادہ پابند تھا اس طرح وہ اپنی کتاب کے مطالعہ کرنے والوں کو اس بات کا یقین دلانا چاہتے ہیں کہ اسلام کی پابندی سے انسان ظلم وعصیان اور بے راہ روی پر مجبور ہو جاتا ہے حالانکہ اس سے بڑھ کر شرارت اور دروغ بیانی دوسری نہیں ہو سکتی۔ ایسے مورخین کوتاہ نظر اور کم فہم لوگوں کی نگاہ میں بڑے منصف مزاج اور صداقت شعار بھی

مشہور ہو جاتے ہیں ۔

(۶) ہندوستان میں اسلام کا پہلا قدم

عام طور پر یہی مشہور ہے کہ مسلمان سب سے پہلے سندھ میں داخل ہوئے اور تیرو شمشیر کے ذریعہ داخلِ ہند ہوئے۔ مگر اس بات کے تسلیم کرلینے سے پیشتر بعض ضروری حالات کا زیرِ مطالعہ آجانا ازبس ضروری ہے۔ سندھ کے ملک میں کبھی تیرو شمشیر کے سایہ سے آگے اسلام پہنچ چکا تھا یہ حقیقت آگے بیان ہونے والی ہے۔

ہندوستان میں اسلام کا سب سے پہلا مرکز (ملابار)

اس وقت صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ اسلام سندھ سے بھی پہلے ملابار (دکن) کے علاقے میں بلا تیغ و تبر داخل ہو چکا تھا اور وہاں مستقل طور پر محض اپنی خوبیوں کے سبب نشوونما پاتا رہا۔ سندھ اور پنجاب میں محمد بن قاسم اور محمود بن سبکتگین جب مصروفِ جنگ تھے اُس وقت جنوبی ہند میں مسلمان نہایت پُرامن طریقہ سے تبلیغِ اسلام میں مصروف تھے۔ چونکہ ملابار میں مسلمان فاتحانہ حیثیت سے تیغ و علم لے کر نہیں آئے تھے لہٰذا ملابار میں اسلام کے داخل ہونے کا مختصر حال اس مقدمہ میں بیان کردینا مناسب ہے تاکہ ابوابِ کتاب میں حکومتِ اسلامیہ کے حالات پڑھتے ہوئے ملابار کے تصور سے ہم بالکل بیگانہ نہ ہوں۔ میں اس سے پیشتر مارچ ۱۹۲۲ء کے عبرت میں ملابار کی ایک مختصر مگر جامع تاریخ لکھ چکا ہوں۔ جنوری ۱۹۲۴ء کے معارف میں مولانا سید سلیمان صاحب ندوی 'ہندوستان میں اسلام کی اشاعت' پر ایک دلچسپ اور مفید مضمون لکھ چکے ہیں جو اسلام کے ملابار میں شائع ہونے سے متعلق ہے اس وقت عبرت اور معارف کے دونوں مذکورہ پرچے بھی میرے سامنے موجود ہیں۔

جنوبی ہند بالخصوص ملابار میں آنحضرت صلعم کی بعثت کے وقت بدھ مذہب، برہمنی مذہب، یہودی، عیسائی، جینی، مجوسی، ہندوستان کے قدیم غیر آریہ سب موجود تھے۔ انھیں میں عرب کے مشرکین اور صابی لوگوں کو بھی شامل کرلینا چاہیے جو سیکڑوں برس پیشتر سے ملابار کے ساتھ تجارتی تعلقات رکھتے اور اس ملک میں بعض رہ بھی پڑے تھے اُس زمانے میں ملابار چند چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم تھا اور یہ چھوٹی چھوٹی

حکومتیں حجاز و یمن و مسقط و فارس کے تاجروں کے ساتھ اپنے منافع کی وجہ سے نہایت نرمی اور رواداری کا سلوک روا رکھنے پر مجبور تھیں۔ ایک چھوٹے سے خطۂ ملک میں اس قدر کثیر التعداد مذاہب کا موجود ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ شمالی ہند کی طرح ملا بار میں مذہبی تعصب کا دور دورہ نہ تھا۔ اور حکومت کا مذہب بھی غالباً بدھ، برہمنی، غیر آریہ کا مرکب مذہب تھا مگر اس کو بدھ مذہب کے سوا دوسرا نام نہیں دیا جا سکتا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری سینٹ طوما نے جنوبی ہند میں آکر میلا پور کے راجہ ساگا موس نامی کو عیسوی مذہب کا پیرو بنا لیا تھا جس کی وجہ سے یہ راجہ اپنی رعایا کے ہاتھ سے مقتول ہوا (دیکھو مختصر تاریخ چرچ) یہ بھی دلیل اس بات کی ہے کہ جنوبی ہند میں پہلے ہی سے ہر قسم کے لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ عرب لوگ بعثتِ نبوی سے پہلے شمال کی جانب بحر اسود کے ساحل اور روس تک اور جنوب و مشرق میں ملا بار، کارومنڈل، سراندیپ، جاوا، سماٹرا اور چین کے ساحل تک بادبانی کشتیوں میں بیٹھ کر بغرض تجارت جاتے تھے یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلعم کے ایک صحابی کا مزار چین کے بندرگاہ کانٹن میں بیان کیا جاتا ہے جن کا نام وہبؓ ہے اور دوسرے صحابی عکاشہؓ کا مزار محمود بندر میں اور تیسرے صحابی تمیم انصاریؓ کا مزار مدراس سے ۱۲ میل جنوب کی جانب ساحل کولم (میلا پور) میں بتایا جاتا ہے۔ اگر عرب لوگ پہلے ہی سے ان دور دراز مقامات پر آمد و رفت نہ رکھتے ہوتے تو آنحضرت صلعم کے صحابہؓ ان مقامات پر جہاں اسلامی حکومت سیکڑوں برس بعد تک بھی نہیں پہنچی جا کر فوت نہ ہوتے۔ فرشتہ لکھتا ہے کہ

> "پیش از ظہور اسلام و بعد از ظہور اسلام طائفہ یہود و نصاریٰ برسم تجارت از راہ دریا بداں دیار آمد و شد می کردند و در آخر الامر میان ملیباریاں و ایشاں بواسطہ منافع دنیوی الفتے بہم رسیدہ از بازرگاناں یہود و نصاریٰ در شہرہائے ملیبار ساکن شدہ منازل و بساطین ساختند۔"

مشہور مورخ لی بان فرانسیسی اپنی کتاب تمدن عرب میں لکھتا ہے کہ شروع اسلام میں

> "عربوں نے تجارتی تعلقات کو بہت بڑی وسعت اور ترقی دی وہ بہت جلد ساحل کارومنڈل ملا بار۔ سماٹرا۔ جزائر بحر ہند کو طے کرتے ہوئے جنوبی چین تک پہنچ گئے۔"

عہدِ رسالت میں ملا بار کے راجہ کا قبولِ اسلام

چونکہ عربوں کی آمد و رفت پہلے ہی سے ملا بار میں تھی لہٰذا آنحضرت صلعم کی بعثت کا حال ملابار میں آنحضرت صلعم ہی کے زمانے میں لوگوں کو معلوم ہو چکا تھا اُس زمانے میں ملا بار کا راجہ زموَرن یا سامرؔی کے نام سے مشہور تھا جو خاندان پلوؔیا یا پالویا پلاوؔا سے تعلق رکھتا تھا۔ اس راجہ نے معجزۂ شق القمر کو دیکھکر اس عجیب واقعہ کے متعلق تحقیق و تفتیش شروع کی اور اس واقعہ کو بطور یادداشت سرکاری روزنامچہ میں درج کرایا۔ بالآخر اُس کو معلوم ہوا کہ عرب کے ملک میں ایک پیغمبر پیدا ہوئے ہیں اُنھوں نے یہ معجزہ دکھایا ہے۔ یہ سُن کر راجہ نے اسلام قبول کر لیا اور تختِ سلطنت اپنے ولی عہد کو سپرد کر کے خود کشتی میں سوار ہو کر ملکِ عرب کی جانب روانہ ہوا لیکن راستے ہی میں فوت ہو کر ساحلِ ملک یمن میں مدفون ہوا۔ راجہ کا یہ سفر چونکہ عام اطلاع کے بغیر پوشیدہ طور پر عمل میں آیا تھا لہٰذا لوگوں نے راجہ کے اس طرح غائب ہو جانے کی حقیقت کو نہ سمجھا۔ انھیں ایام میں کچھ مسلمان تاجر سراندیپ میں آئے اور اسلام کا پیغام ساتھ لائے جن عربوں نے اس جزیرہ میں تجارتی ضرورتوں کے سبب بود و باش اختیار کر لی تھی اول وہ مسلمان ہوئے اور پھر بہت جلد جزیرہ میں اسلام پھیلنے لگا تھی کہ سراندیپ کا راجہ بھی مسلمان ہو گیا اور اپنے آپ کو خلافتِ اسلامیہ سے وابستہ کر لیا۔ یہ بات تحقیق طلب ہے کہ سراندیپ کا راجہ خلافتِ راشدہ کے زمانے میں مسلمان ہو چکا تھا یا خلافتِ بنوامیہ کے ابتدائی زمانے میں مسلمان ہوا۔ بہرحال خلافت بنوامیہ کے ابتدائی زمانے میں سراندیپ کا راجہ مسلمان تھا۔ فرشتہ کے الفاظ یہ ہیں۔

"ہر آئینہ حاکم سراندیپ پیشتر از رایان دیگر مواضع ہندوستان بر حقیقتِ اسلام مطلع شدہ در عہد صحابۂ کرامؓ مقلد قلادۂ شریعت مصطفوی گردیدہ بود۔"

ابن بطوطہ جب سراندیپ میں گیا ہے تو اُس نے وہاں شیخ عبداللہ بن حنیف۔ شیخ عثمان اور بابا طاہر وغیرہ بہت سے اولیاء اللہ کے مزارات دیکھے۔ سراندیپ کے بعد ہی لنکا مالدیپ اور ملا بار میں اسلام پھیل چکا تھا۔ ملا بار میں اسلام نے اس لئے اور بھی جلد جلد ترقی کی کہ اسلام کی مساوات و رواداری ذات پات کی قیود کو دور کر کے مظلوم و مغلوب لوگوں کے لئے ابرِ رحمت اور سامان ترقی تھی۔ جس زمانے میں محمدؐ بن قاسم اپنی فوج لے کر

سندھ میں داخل ہوا ہے اُس سے بہت پہلے ملابار میں مسلمانوں کی آبادی موجود تھی اور خود محمد بن قاسم کے حملے کا سبب تلاش کرنے میں یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ سراندیپ و ملابار میں مسلمان پہلے سے آباد تھے کیونکہ جن جہازوں کو راجہ داہر کے آدمیوں نے لوٹا تھا یہ جہاز سراندیپ کے راجہ کے تحائف اور اُس علاقے کے عازمانِ حج کی ایک تعداد لئے ہوئے خلیجِ عمان کی طرف آ رہے تھے اور انھیں جہازوں کا واقعہ محمد بن قاسم کے سندھ میں آنے کا سبب ہوا تھا۔ محمد بن قاسم کی حملہ آوری کے بعد صوبۂ سندھ ممالکِ اسلامیہ میں داخل ہو چکا تھا اور سندھ سے آگے مسلمانوں کی فوجی پیش قدمی رُک گئی تھی مگر ملابار اور جنوبی ہند میں مسلمان تاجروں، مناد وں، درویشوں اور سیاحوں کے ذریعہ اسلام برابر ترقی کر رہا تھا اُدھر وسط ہند یعنی ملک مالوہ میں سندھ کے مسلمانوں کی ہمسائیگی کا یہ اثر تھا کہ مالوہ کا راجہ مسلمانوں کی بڑی عزت کرتا اور مسلمان سیاحوں کے لئے ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچاتا تھا جیسا کہ سلیمان سیرافی نے تیسری صدی ہجری کے ابتدا اور ابو زید سیرافی نے تیسری صدی ہجری کے وسط میں بالتصریح بیان کیا ہے کہ مالوہ اور ملیبار کے راجہ مسلمانوں کے ساتھ اخلاق و مروت سے پیش آتے ہیں۔

دوسری صدی ہجری میں چند مسلمان عراق عرب کے رہنے والے کشتی میں سوار ہو کر خلیج فارس سے اس لئے روانہ ہوئے کہ جزیرہ سراندیپ میں جا کر اُس مقام کو دیکھیں جہاں آدم علیہ السلام کے قدم کا نشان بتایا جاتا ہے نیز سراندیپ کے راجہ سے ملاقات کریں جو مسلمان سیاحوں کی خوب خاطر مدارات بجا لاتا ہے اتفاق سے یہ کشتی راستے میں طوفان سے دو چار ہو کر ملابار کے بندرگاہ کالی کٹ میں پہنچی کالی کٹ ملابار کا حاکم نشین شہر تھا۔ ان طوفان زدہ مسافروں کا حال سُن کر ملابار کے راجہ نے اپنے پاس بلایا اور مذہب اسلام کے متعلق بہت سے سوالات کر کے دل جمعی حاصل کی نیز انھیں سیاحوں کے ہاتھ پر اسلام قبول کر کے اپنے اسلام کو مصلحتاً پوشیدہ رکھا اور ان سیاحوں سے باصرار اقرار لیا کہ سراندیپ کی سیر سے فارغ ہو کر اسی طرف کو آئیں گے اور مل کر جائیں گے۔ عجائب الاسفار کی روایت کے موافق اُس زمانے میں جو راجہ ملابار میں حکمراں تھا اُس کا نام چیرامن پیرومل تھا اُس نے ان مسلمان سیاحوں کے ساتھ حسنِ اخلاق اور تکریم و تعظیم کا برتاؤ کیا۔ امیر قافلہ نے راجہ کو معجزۂ شق القمر یاد دلایا جس کی شہادت خود اسی کے ایک بزرگ کی تحریری

یادداشت میں موجود تھی پھر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت اور حالات بیان کرنے کے بعد اسلام کی حقیقت اس کو سمجھائی۔ راجہ پر اس تقریر و تبلیغ کا یہ اثر ہوا کہ وہ فوراً مسلمان ہوگیا اور خانۂ کعبہ کی زیارت کے شوق نے اپنے بزرگ راجہ رمورن یا سامری کی تقلید میں اس کو مجبور کیا کہ سفر حجاز کے تہیہ میں مصروف ہو۔ چنانچہ اس نے ملک کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرکے اپنے معتمد سرداروں کو تقسیم کر دیئے۔ جو سردار سب سے زیادہ معتبر اور راجہ کا رازدار تھا اس کو دارالسلطنت کا مہتمم اور باقی سرداروں کا سرپرست و نگران مقرر کیا اور خود گوشہ نشین ہوکر تہیہ سفر میں مصروف ہوا۔ سامان سفر کی درستی کے بعد پوشیدہ طور پر جہاز میں سوار ہوکر حجاز کی طرف روانہ ہوگیا اسی سفر میں اس کو سفر آخرت پیش آیا اور اپنے ملک میں واپس آنا میسر نہ ہوا۔ مرتے وقت اس نے اپنے رفیقوں کو وصیت کی کہ ملابار میں تبلیغ اسلام کے کام کو پوری مستعدی اور وسیع پیمانہ پر جاری کیا جائے۔ ساتھ ہی اس نے اپنے نائب السلطنت کے نام بھی اسی مضمون کا ایک خط لکھ دیا۔ چنانچہ شرف بن مالک۔ مالک بن دینار اور مالک بن حبیب وغیرہ راجہ کے اس خط کو لے کر ملابار واپس آئے اور راجہ مرحوم کے نائب کی خدمت میں جو دارالسلطنت کا والی تھا پیش کیا اس نے ان عربوں کے ساتھ نہایت عمدہ سلوک کیا اور ملک کے تمام سرداروں کو راجہ کے خط کا مضمون لکھکر بھیجا۔ اس راجہ کے متعلق اکثر ملاباریوں کا یہ خیال قائم ہوا کہ وہ زندہ آسمان پر چلا گیا ہے اور آسمان سے پھر واپس آکر ملابار میں حکومت کرے گا مسلمانوں کو ملابار میں ہر قسم کی امداد و حمایت میسر ہوئی اور راجہ کی قوم کے آدمی بکثرت اسلام میں داخل ہوئے۔

ہندوستان میں پہلی مسجد مالک بن دینار اور مالک بن حبیب نے کدنکلور (کالیکٹ) میں مسجد تعمیر کی اس کے بعد کل ملابار کا دورہ کیا جابجا لوگ اسلام میں داخل ہوئے اور مسجدیں تعمیر ہوئیں۔ ان اسلامی منادوں نے صرف ملابار ہی تک اپنی تبلیغ کو محدود نہیں رکھا بلکہ ساحل کارومنڈل میں بھی تبلیغی سلسلہ جاری کیا اور وہاں بھی بہت سی مسجدیں تعمیر کیں سفرنامہ ابن بطوطہ اور تحفۃ المجاہدین کی روایت کے بموجب ان عرب مبلغین کی بنائی ہوئی مسجدوں میں سے چھٹی صدی ہجری تک مندرجہ ذیل مقامات کی مسجدیں موجود تھیں (۱) کالیکٹ (۲) کولم یا کولن (۳) ہیلی (۴) سری کند

ایلورم (۵) درمہ پٹن (یہاں کا حکمراں بھی مسلمان ہو گیا تھا) (۶) فندرینہ یا پنداراتی (۷) چالیام یا پدپٹن (۸) چالیات (۹) فاکنور یا رکور (۱۰) منگلور (۱۱) کلنجر کوٹ (۱۲) کولم یہ مقام ساحل کارومنڈل پر واقع ہے۔ اسی مذکورہ واقعہ کو فرشتہ اس طرح بیان کرتا ہے۔

"کچھ عربی اور عجمی لوگ بابا آدم کے قدم گاہ کی زیارت کے لئے کشتی میں سوار ہو کر سراندیپ کی طرف روانہ ہوئے اتفاقاً کشتی بادِ مخالف کے تھپیڑوں سے ملیبار پہنچی اور یہ لوگ شہر کدنکلور میں اُترے اُس جگہ کا حاکم موسوم بہ سامری عقلِ کامل اور اخلاقِ ستودہ سے متصف تھا ان لوگوں سے ملا اور ہر قسم کی باتیں درمیان میں آئیں یہاں تک کہ اُن کا مذہب بھی دریافت کیا اُنھوں نے کہا ہم مسلمان ہیں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے رسول ہیں سامری نے کہا کہ میں نے یہود و نصارٰی اور ہندوؤں سے جو تمھارے مذہب کے مخالف ہیں سُنا ہے کہ عرب اور روم و ایران و ترکستان میں یہ مذہب رواج پا گیا ہے لیکن ابھی تک مسلمانوں سے میں نے مسلمانوں کے مذہب کی نسبت دریافت نہیں کیا میری خواہش ہے کہ آپ کچھ حالات مجھ کو اپنے رسول کے سُنائیں اور اُن کے معجزات کا کبھی حال بیان فرمائیں۔ اُن میں سے ایک نے آنحضرت صلعم کے حالات نہایت خوبی سے سُنائے اور سامری کے دل میں آنحضرت صلعم کی محبت پیدا ہو گئی اس کے بعد جب شق القمر کا تذکرہ کیا تو سامری نے کہا کہ یہ معجزہ تو بہت ہی قوی ہے۔ ہمارے ملک کا دستور ہے کہ جب کوئی عظیم الشان واقعہ ظہور پذیر ہوتا ہے تو اربابِ قلم اُس کو دفتر میں لکھ لیتے ہیں اور میرے بزرگوں کے تمام دفاتر موجود ہیں میں اُن دفتروں اور رجسٹروں کو ابھی معائنہ کرتا ہوں چنانچہ آنحضرت صلعم کے زمانے کے رجسٹر نکال کر مطالعہ کئے تو اُن میں لکھا ہوا تھا کہ فلاں تاریخ چاند دو ٹکڑے ہو کر پھر مل گیا۔ یہ دیکھکر سامری پر دین اسلام کی صداقت ظاہر ہو گئی اور وہ کلمۂ شہادت پڑھ کر مسلمان ہو گیا چونکہ اپنی قوم کے سرداروں سے ڈرتا تھا اس لئے اپنے اسلام کو مخفی رکھکر

مسلمانوں کو بھی اظہار سے منع کر دیا اور اُن لوگوں پر احسان و انعام کرکے درخواست کی کہ بعد زیارت قدم گاہ اِسی طرف کو آئیں جب وہ لوگ واپس آئے تو اُن سے کہا کہ زر و مال لے کر سامان سفر مہیّا کرو میں بھی تمھارے ہمراہ چلوں گا۔ پھر ایک روز تمام ارکانِ دولت کو جمع کرکے جلسہ کیا اور کہا کہ مجھکو عبادت الٰہی کا شوق ہے میں چاہتا ہوں کہ تنہا ایک گوشہ میں رہوں اور کوئی شخص میرے پاس نہ پھٹک سکے لہذا میں انتظام کے لئے ایک دستور العمل بنائے دیتا ہوں تم کو چاہیئے کہ اسی پر عامل رہو ....."

ان تمام باتوں کے ساتھ ہی یہ تصور بھی ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ جنوبی ہند کی طرح بحر الکاہل کے جزیروں جاوا و سماٹرا و سنگاپور و ملایا وغیرہ میں بھی اسی طرح اسلام شائع ہوا تھا۔ اس واقعہ مذکور کے سو برس بعد تک اسلام اپنے اثر و رسوخ کو استوار و وسیع کرتا رہا۔ سندھ میں ملتان و منصورہ کی دو مسلمان ریاستیں قائم تھیں اور اُن کے اخلاقی اثر سے مالوہ کی ہندو ریاست یہاں تک متاثر ہو چکی تھی کہ وہاں کے راجہ مسلمانوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کو اپنی طویل العمری کا سبب جانتے تھے ملک ملابار کی مجموعی آبادی میں دسواں حصہ مسلمان آبادی تھی۔" ڈاکٹر ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر صاحب نے اپنی تاریخ ہند میں شنکر اچارج کی پیدائش کا زمانہ ۹۰۰ء کے قریب کا زمانہ بتایا ہے جو ۳۰۰ھ کے قریب کا زمانہ ہے یعنی یکم محرم ۳۰۰ھ مطابق ہے ستمبر ۹۱۲ء کے اسی زمانے میں مشہور مورخ اور سیاح مسعودی بغداد سے ہندوستان آیا۔ پس مسعودی کے ہندوستان میں آنے اور شنکر اچارج کے ملابار میں پیدا ہونے کا زمانہ قریب ہی قریب ہے۔

مسعودی اپنے سفرنامہ موسومہ مروج الذہب میں ملتان و منصورہ کی مسلم ریاستوں کا مفصل ذکر کرتا ہے اور یہ بھی بتاتا ہے کہ ملتان میں ہندوؤں کو اپنے مندروں میں پوجا پاٹ کی مراسم ادا کرنے کی عام اجازت اور آزادی حاصل ہے نیز راجہ بلہرا یعنی ملک مالوہ کے راجہ کی نسبت لکھتا ہے کہ "اس راجہ کی حکومت میں مسلمانوں کی بڑی عزت ہے یہاں کے پادشاہ چالیس چالیس اور پچاس پچاس سال حکومت

کرتے ہیں۔ یہاں کے لوگوں کا اعتقاد ہے کہ ہمارے راجاؤں کی عمریں اسی عدل وانصاف اور مسلمانوں کی عزت کرنے کی وجہ سے زیادہ ہوتی ہیں۔ گجرات کا راجہ مسلمانوں سے نفرت کرتا ہے دکن کا راجہ بھی مسلمانوں کی عزت کرتا ہے" مسعودی ۳۰۳ھ میں کالیکٹ ملک ملابار میں آیا ہے وہ کہتا ہے کہ یہاں سیراف عمان، بصرہ اور بغداد وغیرہ کے بہت سے مسلمان آباد ہیں جنھوں نے یہیں کے باشندوں میں شادی بیاہ کرکے سکونت اختیار کر لی ہے ان کی تعداد دس ہزار ہے۔ ان میں بعض مشہور تاجر ہیں۔ یہاں کے مسلمانوں کا رئیس ابوسعید معروف بن زکریا ہے۔

اب غور کرنے اور سوچنے کی بات یہ ہے کہ اسی ملک ملابار اور اسی زمانے میں شنکر اچارج پیدا ہوتا ہے۔ شنکراچارج کی نسبت لکھا ہے کہ وہ ملابار کے ایک برہمن کا بیٹا تھا شنکراچارج کی ماں شری مہادیوی کی نسبت مرقوم ہے کہ وہ کسی شرمناک گناہ کے سبب برادری اور ذات سے خارج کردی گئی تھی اور اسی لئے مہادیوی کی وفات پر اس کے جلانے کے لئے شنکراچارج کو کسی نے آگ بھی نہ دی (دیکھو کیرلی اتپتی) بدھ مذہب ابتداً اپنے اصولوں کی وجہ سے ذات پات کے قیود کو دور کرنا چاہتا تھا مگر یہ وہ زمانہ تھا کہ بدھ مذہب کی حالت بالکل بگڑ چکی تھی اور جس کا افسوس شنکراچارج سے تین چار سو برس پہلے ہیونی سیانگ اپنے سفرنامے میں کرچکا تھا ملابار میں یہ تغیر اور بھی زیادہ قوی تھا اور عام طور پر وہاں کے ہندو بدھ مذہب ہی کے زیادہ پیرو تھے اور بتوں کی تکریم و پرستش اُن کا عین مذہب بن چکا تھا شنکراچارج کے دل پر اس واقعہ کا کہ اُس کی ماں مہادیوی کے پھونکنے میں کسی نے آگ تک دینی گوارا نہ کی کس قدر قوی اثر ہوا ہوگا اس کا اندازہ بآسانی کیا جاسکتا ہے۔ اُس کے ہم وطن بہت سے مسلمان بھی تھے جیسا کہ ابھی اوپر ذکر ہوچکا ہے شنکراچارج کا اسلامی مساوات اور رواداری سے باخبر اور متاثر ہونا بالکل یقینی بات ہے ملابار میں مسلمانوں کا بُت پرستی کے خلاف دلائل بیان کرنا اور توحید کا وعظ کہنا سب سے پہلا اور ضروری کام تھا۔

شنکراچارج کا بدھوں اور بدھوں کی بُت پرستی کے خلاف جہاد پر آمادہ ہوجانا کوئی تعجب انگیز بات نہیں۔ ملابار یا دکن میں رہ کر بُت پرستی کے خلاف وعظ کہنا بدھ مذہب کو اس سے زیادہ نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا جو مسلمان واعظوں کے ذریعہ اُس کو پہنچ

رہا تھا یا پہنچ چکا تھا بدھ مذہب کی جو جگہ خالی ہوتی تھی وہ اسلام سے پُر ہوتی تھی یہ ممکن نہ تھا کہ کوئی شخص بدھ مذہب یعنی بُت پرستی کو چھوڑ دے اور پھر اسلام کے سوا اور کسی مذہب کو قبول کرے لہٰذا شنکراچارج نے ملابار سے شمالی ہند کی طرف توجہ کی۔ وہ نوجوانی کے عالم میں ملابار سے چل دیا کیونکہ وہاں اُس کے لئے میدانِ عمل بالکل تنگ تھا۔ اُس نے بنارس میں پہنچ کر پنڈتوں سے مباحثہ کیا اور بُت پرستی کے معاملہ میں اُن کو شکست فاش دی پھر وہ اکثر راجدھانیوں اور مشہور شہروں میں اپنے جدید اور نئے عقیدہ کی تلقین کرتا ہوا پھرا۔ شنکراچارج کے پاس بُت پرستی کی تردید میں سب سے زبردست دلائل وہی تھے جو اُس نے مسلمانوں سے سُنے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ بدھ مذہب اپنے عقائد اور حکومت وطاقت کے اعتبار سے بہت کمزور ہو چکا تھا لہٰذا چند راجے اُس کے مُرید ہوگئے اور بدھ مذہب کے خلاف علانیہ کامیاب تحریک شروع ہوئی۔ شنکراچارج ملابار میں پیدا ہوا تھا اور کوہِ ہمالیہ کی چوٹی پر فوت ہوا اُس کو شیو کا اوتار مانا گیا اور آج وہ موجودہ آریہ سماج فرقہ کا قابلِ تکریم بزرگ سمجھا جاتا ہے۔

شنکراچارج کے زمانے میں اسلام برابر ہندوستان کے اندر ترقی کر رہا تھا۔ محمد بن قاسم کے حملہ کو ڈیڑھ سو سال گذر چکے تھے محمود غزنوی کی حملہ آوری میں ابھی ڈیڑھ سو برس باقی تھے۔ سندھ میں مسلمانوں کی دو ریاستیں موجود تھیں۔ مالوہ میں مسلمان موجود تھے کنارا۔ ملابار۔ سراندیپ۔ میسور۔ مدراس وساحل کارومنڈل میں مسلمان موجود تھے۔ شنکراچارج کو ان حالات اور مسلمانوں کے اعمال وعقائد سے آگاہی حاصل تھی مگر اُس نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کچھ بھی کہنے کی جرأت نہیں کی اور بُت پرستی کے خلاف کوشش کرکے بظاہر اسلام کے لئے زمین تیار کرنے کی خدمت انجام دی۔ اگر شنکراچارج کا زمانہ نویں صدی عیسوی کا ابتدائی زمانہ فرض کیا جائے جیسا کہ بعض مورخین کا خیال ہے تب بھی مسلمان ان مذکورہ تمام مقامات میں موجود تھے اور شنکراچارج کو اسلامی تعلیمات سے واقف ہونے کا بخوبی موقع حاصل تھا۔ بہرحال اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ ہندوستان کی حدود میں اسلام مسلمانوں کے فوجی حملے سے پہلے پہنچ کر کامیاب اور مقبول ہو چکا تھا۔

محمد بن قاسم سے پہلے سندھ میں اسلام کی مقبولیت

اسلام کی اشاعت بذریعہ تبلیغ صرف ملا بار اور جنوبی ہند ہی میں نہیں ہوئی بلکہ سندھی قوموں میں بھی اسلام اُسی ابتدائی زمانے میں یعنی جنگی حملوں کے شروع ہونے سے پہلے مقبول ہو چکا تھا۔ جس زمانے میں مسلمانوں اور ایرانیوں کے درمیان سلسلۂ جنگ جاری تھا اُسی زمانے میں ہندوستان کے جاٹ اپنا آبائی مذہب اور آبائی وطن چھوڑ چھوڑ کر اسلام اختیار کرنے اور عراق میں جا جا کر آباد ہونے لگے تھے۔ اِن نومسلم جاٹوں کو عرب لوگ قوم زط کے نام سے تعبیر کرتے تھے۔
ایران کی سلطنت اور سندھ کی سلطنت کے درمیان کبھی لڑائی ہوتی تھی اور کبھی صلح کبھی ایرانی دریائے سندھ تک کا علاقہ اپنے قبضے میں لے آتے اور کبھی سندھ کے حکمران مکران کے پہاڑوں اور میدانوں تک پہنچ جاتے تھے۔ جس زمانے میں ایرانیوں اور مسلمانوں کی لڑائیاں شروع ہوئی ہیں اُس زمانے میں سندھ و ایران کے درمیان صلح تھی مگر اس سے پہلے ایرانی سلطنت کے صوبۂ حفیر کا گورنر ہرمز جنگی بیڑہ لے کر بار بار سندھ کے ساحل پر حملہ آور ہوتا رہا اور یہاں سے بہت سے آدمیوں کو پکڑ کر لے گیا تھا یہ لوگ سب جاٹ ہی تھے۔ یہ ہرمز حضرت خالد بن ولیدؓ کے ہاتھ سے مارا گیا تھا۔ ہرمز کے پاس ایک بہت بڑی فوج انھیں اسیرانِ جنگ جاٹوں کی فراہم ہو گئی تھی کیونکہ فوج میں بڑی تعداد جاٹوں ہی کی تھی جب مسلمانوں اور ایرانیوں میں جنگ شروع ہوئی تو سلطنتِ ایران نے سندھ کی سلطنت سے صلح کر لی اور ہرمز نے ان جاٹوں کو جو اسیرانِ جنگ کی حیثیت سے اُس کے قبضے میں تھے اُن کی دل دہی اور خاطر مدارات بجا لا کر اپنی فوج میں بھرتی ہونے پر رضامند کر لیا۔ ہرمز ایران کا سب سے بہادر اور لائق سردار سمجھا جاتا تھا اُس کی بہادری کی دھاک ایران و ہندوستان و عرب میں بیٹھی ہوئی تھی وہ بحری اور بری دونوں قسم کی لڑائیوں کا تجربہ کار اور اعلیٰ درجہ کا سیاست داں تھا۔ جاٹوں کی فوج ہرمز کی فوج کا وہ حصہ تھا جس کے ہر سپاہی کے پاؤں میں ایک زنجیر بندھی ہوئی تھی کہ میدانِ جنگ سے بھاگ نہ سکیں اسی لئے اس لڑائی کا نام جس میں ہرمز مارا گیا جنگ ذات السلاسل مشہور ہے۔ پاؤں میں زنجیر باندھ کر میدانِ جنگ میں معرکہ آرا ہونا۔ سندھ کے جاٹوں میں پہلے سے رائج تھا۔

ان جاٹوں میں سے بہت سے زنجیریں تڑا کر بھاگ نکلے اور بہت سے مسلمانوں کے ہاتھ میں گرفتار ہوئے۔ اس کے بعد زور شور سے ایرانیوں کے ساتھ سلسلۂ جنگ جاری ہوا۔ جنگ ذات السلاسل ۱۲ھ میں ہوئی اور پہلی مرتبہ ہندوستان کے جاٹ مسلمانوں کے قبضہ میں آئے اور پھر بخوشی مسلمان ہو کر بجائے قیدی کے آزاد مسلم کی زندگی بسر کرنے لگے۔ اس کے بعد حضرت خالد بن ولید تو شام کی طرف چلے گئے مگر ایرانیوں کے ساتھ سلسلہ جنگ جاری رہا جنگ ذات السلاسل عہد صدیقی کا واقعہ ہے۔

جنگ ذات السلاسل سے دو برس بعد ۱۴ھ میں جنگ قادسیہ ہوئی جس میں ایران کے بادشاہ نے پوری تیاری اور پوری طاقت کے ساتھ مسلمانوں کو کچل ڈالنا چاہا۔ اس دو سال کے عرصہ میں ایرانی بار بار مسلمانوں سے شکست کھا چکے تھے اس لئے یزد جرد شاہ ایران نے اپنے تمام صوبوں اور دوسرے بادشاہوں سے بھی مدد طلب کی اس نے ایک سفارت سندھ میں بھی دوبارہ بھیجی۔ سندھ کے راجہ نے یہاں سے فوج روانہ کی لیکن سب سے بڑی اور قابلِ قدر مدد یہ تھی کہ اس نے اپنے جنگی ہاتھی جس قدر بھیج سکتا تھا سب کے سب ایرانیوں کی مدد کے لئے معہ سامانِ حرب روانہ کئے اور اپنی خاص سواری کا ہاتھی بھی جو سفید تھا روانہ کر دیا۔ چچ نامہ میں لکھا ہے کہ سندھ کے راجہ کی سواری کا ہاتھی سفید رنگ کا ہوتا تھا۔ جنگ قادسیہ تین دن رات برابر جاری رہی اس لڑائی میں مسلمانوں کو سب سے زیادہ جنگی ہاتھیوں کی قطار نے پریشان کیا تیسرے دن فیل سفید جو تمام ہاتھیوں کا سردار سمجھا جاتا تھا مارا گیا اور مسلمانوں نے ہاتھیوں کو بھگایا۔ پھر رستم کے مارے جانے پر کامل فتح حاصل ہوئی۔ سندھ کے راجہ نے اپنی خاص سواری کا ہاتھی تو اسی مرتبہ دوسرے ہاتھیوں کے ساتھ بھیجا تھا لیکن وہ اس سے پہلے بھی اپنے ہاتھی ایرانیوں کے پاس بھیج چکا تھا جنھوں نے دریائے فرات کے کنارے اسلامی لشکر پر بڑی آفت نازل کی تھی حضرت ابوعبید ثقفی اسلامی سپہ سالار کو ایک ہاتھی ہی نے شہید کیا تھا۔

قوم زط کی تحقیق

جنگ قادسیہ اور جنگ نہاوند کے درمیانی زمانہ کا واقعہ ہے کہ اہواز کے ایرانی گورنر ہرمزان نے یزدجرد کے مداین کی جانب

فرار ہونے کے بعد اپنی ایک خود مختار حکومت قائم کرلی اور ایرانیوں سے علاوہ جاٹوں کو بھی اپنی فوج میں بھرتی کیا اور سندھ کے راجہ سے اعانت طلب کی اسلامی لشکر نے اُس طرف توجہ کی مقابلہ ہوا ہرمزان شکست کھا کر مقام تشتر میں پہنچا وہاں کے قلعہ کو مضبوط کرا کے دوبارہ مقابلہ کی تیاری کی تشتر کی جانب جو اسلامی فوج روانہ ہوئی اُس کے سپہ سالار حضرت ابو موسیٰ اشعری تھے انھوں نے تشتر کا محاصرہ کیا۔ اس محاصرہ کے دوران میں سندھی فوج یعنی جاٹوں کے سردار نے حضرت ابو موسیٰ اشعری کے پاس پیغام بھیجا کہ ہم تمھارے مذہب میں داخل ہونا چاہتے ہیں مگر شرط یہ ہے کہ ہم تمھارے ساتھ شامل ہو کر ایرانیوں سے تو لڑیں گے لیکن اگر تم کسی وقت آپس میں دو گروہ ہو کر لڑنے لگو تو ہم غیر جانب دار رہیں گے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ اگر عرب لوگ ہم پر حملہ کریں تو تم ہم کو اُن کے حملے سے بچاؤ گے اور ہماری حفاظت کروگے۔

تیسری شرط یہ ہے کہ ہم کو اختیار حاصل ہوگا کہ ہم جہاں چاہیں سکونت اختیار کریں اور عربوں کے جس قبیلے سے چاہیں اتحاد کریں چوتھی شرط یہ ہے کہ ہمارے وظائف اور تنخواہیں اعلیٰ درجہ کی ہوں یعنی ہم کو عربوں کے مانند ہر قسم کے حقوق میسر ہوں۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے اس کے جواب میں کہلا بھیجوایا کہ ہم تو نومسلموں کے معاملہ میں یہی جانتے ہیں کہ ہر ایک نومسلم کے حقوق باقی تمام مسلمانوں کی برابر ہوا کرتے ہیں۔ یہ مختصر اور مجمل جواب جاٹوں کے لیے موجب تسکین نہ ہوا اور وہ مسلمان ہونے سے باز رہے۔
اس کی اطلاع فوراً امیرالمومنین حضرت فاروق اعظمؓ کے پاس بھی بھیجی گئی تھی اُنھوں نے بلا تامل حکم بھیج دیا کہ ان لوگوں کے پیش کردہ شرائط قبول کرلیے جائیں۔ چنانچہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے جاٹوں کے پاس پیغام بھیجا کہ تمھاری تمام شرطیں ہم کو منظور ہیں دربار خلافت سے ہم نے منظوری منگالی ہے۔ یہ سنتے ہی تمام جاٹ اور تھوڑے سے راجپوت بھی جو اُن کے ہمراہ تھے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر مسلمان ہوگئے۔ ہرمزان بھی گرفتار ہوا اور حضرت ابو موسیٰؓ نے اس کو مدینہ منورہ میں فاروق اعظمؓ کے پاس بھیج دیا۔ جو وہاں جا کر اور فاروق اعظمؓ کا طرز عمل دیکھ کر بخوشی مسلمان ہوگیا ان جاٹوں نے مسلمان ہو کر اور اپنے اُن بھائیوں کے ساتھ مل کر جو ۱۲ھ میں مسلمان ہو چکے تھے ملک عراق میں سکونت اختیار کی اور عرب قبائل کے ساتھ دوستی و مواخاة

قائم کرلی - یہ لوگ قومِ زط کے نام سے مشہور ہوئے۔ مسلمانوں نے اپنے ان نومسلم بھائیوں کی بڑی عزت کی اور ان کو بڑے بڑے عہدے بھی دیئے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے عہدِ خلافت میں بصرہ کے خزانہ کا محافظ دستہ اسی قومِ زط (جاٹ) کے افراد پر مشتمل تھا۔ ان لوگوں میں بڑے بڑے علماء اور صلحا بھی پیدا ہوئے اس زط قوم کا تذکرہ تاریخوں میں بار بار آیا ہے حتیٰ کہ معتصم باللہ عباسی کے زمانے تک زط قوم کو عراق میں قابلِ تذکرہ اہمیت حاصل تھی۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جو امام اعظم کے نام سے عالمِ اسلام میں عام شہرت رکھتے ہیں اُن کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ اسی قوم زط سے تعلق رکھتے تھے۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ ۸۰ھ میں پیدا ہوئے۔ ....

....

....

.... جس وقت محمد بن قاسم نے سندھ پر حملہ کیا ہے اُس وقت امام اعظم کی عمر بارہ تیرہ سال کی تھی۔ مذکورہ بالا تصریحات سے ثابت ہوا کہ ہندوستانی قوموں میں اسلام محمد بن قاسم کے زمانے سے پہلے ہی داخل ہو کر نشوونما حاصل کر چکا تھا۔

(۷) اسلام کی آمد کے وقت ہندوستان میں کون سا مذہب رائج تھا

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ اسلام سب سے پہلے محض تبلیغ کے ذریعہ نہایت پُرامن طریقہ سے سراندیپ و مالابار میں داخل ہوا اور اسی زمانے میں سندھ کے جاٹ مسلمان ہو ہو کر عراق عرب میں سکونت اختیار کر چکے تھے ۱۲ھ کے بعد ہی سندھ کے جاٹ ترکِ وطن اختیار کرتے اور عراق میں مسلمان ہو ہو کر اپنے ہم قوم زطوں میں شامل ہوتے رہے کیونکہ اس زمانے میں سندھ کے راجہ ساہسی کی حکومت میں بھی ایرانیوں کی شکست اور سندھ کی افواج کے مقتول و دستگیر ہونے سے اختلال پیدا ہو گیا تھا۔ راجہ ساہسی کا خاندان قدیم سے بدھ مذہب کا پیرو تھا اور بدھ ہی تمام ملک کا مذہب تھا۔ ساہسی اپنے خاندان کا آخری راجہ تھا ۱۵ھ میں ساہسی کے بعد سندھ

کے تخت پر چچ نامی ایک شخص نے قبضہ کیا۔ اس کے زمانے میں مسلمانوں کی حملہ آوری کے بعض اسباب پیدا ہو گئے تھے جن کا ذکر ابواب کتاب میں موجود ہے۔ اسی راجہ چچ کا بیٹا راجہ داہر تھا۔ جس کے عہدِ حکومت میں محمد بن قاسم نے سندھ پر حملہ کیا اور راجہ مارا گیا۔

۹۳ھ ہجری تک ہندوستان کی حالت کا جائزہ

ہم کو اس وقت یہ دیکھنا ہے کہ ابتدائے سنہ ہجری سے ۹۳ھ تک ہندوستان کی مذہبی حالت کیا تھی کیونکہ ۹۳ھ تک اسلام محض تبلیغ کے ذریعہ ہندیوں میں رسوخ حاصل کرتا رہا اور ۹۳ھ میں محمد بن قاسم نے حملہ کیا جو مسلمانوں کی پہلی قابلِ تذکرہ چڑھائی سمجھی جاتی ہے اس بات کی تحقیق میں ہم کو سب سے پہلے چینی سیاح ہیونگ شیانگ کے سفرنامہ کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے یہ سیاح ۵۹۶ء میں ملک چین کے اندر پیدا ہوا۔ اُس کا خاندان بہت ذی عزت تھا وہ بچپن سے تحصیل علوم میں مصروف رہا اور چونتیس سال کی عمر میں علامۂ زماں اور چین کا سب سے بڑا عالم شمار ہونے لگا۔ اس کے بعد ۶۳۰ء مطابق ۹ھ میں وہ اپنے ملک سے ہندوستان کی طرف روانہ ہوا اُس نے یہ سفر ہندوستان کے بدھ علماء سے ملنے اور مذہبی کتابوں کا مطالعہ کرنے کے لئے اختیار کیا تھا وہ ہندوستان میں پندرہ سال یعنی ۶۴۵ء مطابق ۲۳ھ تک رہا وہ کابل ہوتا ہوا قندھار اور قندھار سے ہندوستان میں داخل ہوا اُس کے ہندوستان میں داخل ہونے کے وقت سندھ کا راجہ ساہسی حکمراں تھا اور ہندوستان سے روانگی کے وقت راجہ چچ سندھ کا فرماں روا بن چکا تھا۔ جس زمانے میں جاٹوں کی ایک جمعیت نے اسلام قبول کر کے عراق میں سکونت اختیار کی تھی اُس زمانے میں ہیونگ شیانگ ہندوستان میں دورہ کر رہا تھا اور جس زمانے میں سرانديپ کے راجہ نے اسلام قبول کیا ہے اُس زمانے میں بھی ہیونگ شیانگ ہندوستان میں موجود تھا اس چینی سیاح نے پندرہ سال کے عرصہ میں ہندوستان کا چپہ چپہ چھان مارا۔ ایک دوسری روایت کے موافق جس کو مولوی ذکاء اللہ صاحب نے اپنی تاریخ میں اختیار کیا ہے ہیونگ شیانگ بیس سال یعنی ۲۸ھ تک ہندوستان میں رہا۔ وہ پنجاب و گجرات سے بنگال واڑیسہ تک اور کوہ ہمالیہ سے میسور و مہاراشٹر تک پھرا اور بعض

مقامات پر اُس کو دو دو مرتبہ بھی جانے کا اتفاق ہوا۔ اُس کا مقصد سفر ہی مذہبی عالموں سے ملنا تھا اُس نے اپنے سفر نامے کو خوب شرح و بسط کے ساتھ لکھا ہے پس ہیونگ شیانگ کا سفر نامہ ہمارے پیش نظر مقصد کے پورا کرنے میں بہت کچھ مدد دے سکتا ہے۔

بُدھ مذہب قبل اس کے کہ ہیونگ شیانگ کی گواہی پیش کی جائے یہ بات بتا دینی ضروری ہے کہ بُدھ مذہب نے ہندوستان میں رائج ہو کر قدیم برہمنی مذہب کو درہم برہم کر ڈالا تھا اور ذات پات کی قیود بھی بہت کمزور اور ڈھیلی پڑ چکی تھیں اشوک کے زمانے میں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ۲۶۵ دو سو پینسٹھ سال پیشتر ہندوستان کا فرماں روا تھا بُدھ مذہب کو انتہائی عروج حاصل ہو چکا تھا۔ اشوک نے پتھر کے ستونوں پر جو بدھ مذہب کے احکام کندہ کرائے تھے اور جو آج تک بھی پتھر کی ان لاٹھوں پر موجود ہیں اُن میں علاوہ اور احکام کے تین احکام یہ ہیں (۱) پانچویں سال سب لوگ اپنے گناہوں کا کفارہ دیا کریں (۲) دوسرے مذہب والوں کو تکلیف نہ دی جائے (۳) صلح و آشتی اور محبت بڑھانے کی تاکید کی جائے اور سخت سزائیں نہ دی جائیں۔ مہاراجہ اشوک کے بعد بدھوں کی شہنشاہی چھوٹی چھوٹی سلطنتوں یا ریاستوں میں منقسم ہو گئی تھی اور بُدھ کی اصلی تعلیمات بگڑ کر دوسری صورت اختیار کر چکی تھیں بدھوں میں بہت سے مذہبی فرقے پیدا ہو چکے تھے۔ ہر ایک فرقہ کے عقائد اور عبادات دوسرے فرقے کے عبادات و عقائد سے مختلف تھے۔ جس زمانے میں ہیونگ شیانگ ہندوستان میں آیا ہے اُس زمانے میں تو سب سے زیادہ اعمال و عبادات و اخلاق بگڑ جانے لازمی تھے۔ کیونکہ اشوک کے زمانے کو نو سو برس اور بدھ کے زمانے کو قریباً بارہ سو برس گذر چکے تھے۔ بُدھ مذہب اپنی اصلی صورت سے اگرچہ بہت کچھ متغیر اور مسخ ہو چکا تھا لیکن اُس کا نام بدھ مذہب ہی تھا اور اُس کے ماننے والے گوتم بدھ اور دوسرے بدھ پیشواؤں کا نام عزت سے لیتے تھے اعمال و عبادات کے اعتبار سے چاہے اس زمانے کے مذہبی فرقوں میں برہمنی مذہب کی بھی بعض باتیں داخل ہو چکی ہوں مگر ان فرقوں کو برہمنی مذہب کے فرقے نہیں کہا جا سکتا اشوک کی لاٹھوں کے مذکورہ بالا دوسرے اور تیسرے حکم سے ثابت ہے کہ بُدھوں کے انتہائی عروج کے زمانے میں بھی ہندوستان کے اندر دوسرے مذہب کے لوگ موجود تھے اور بُدھ اُن پر کسی قسم کی زیادتی نہیں کرتے تھے چنانچہ برہمنوں اور

ہندوؤں کے دعوے کے موافق بنارس۔ الہ آباد۔ قنوج۔ اجمیر میں برہمنی مذہب کے پیرو ضرور مسلسل موجود رہے اور غالباً انھیں کی نسبت اشوک کو یہ حکم کندہ کرانا پڑا تھا کہ غیر مذہب والوں کو تکلیف نہ دی جائے۔ ظاہر ہے کہ ان برہمنی مذہب کے پیرووں کی مصاحبت و مقاربت نے بدھوں پر اور بدھوں کی صحبت نے ان پر ضرور اثر ڈالا ہوگا اور اس اثر کو بدھ مذہب کے نئے نئے فرقوں کے پیدا ہونے میں بھی ضرور داخل ہوگا۔ لیکن پھر بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہندوستان میں برہمنی مذہب رائج تھا اور بدھ مذہب رائج نہ تھا۔

انگریز مورخین نے بدھ مذہب کے اس آخری زمانے کو بدھ ہٹ یا بدھ ستا لوگوں کا زمانہ کہا ہے۔ اس سے بھی زیادہ اچھے الفاظ میں اس زمانے کو لا مذہبی کا زمانہ کہا جا سکتا ہے کیونکہ گوتم بدھ کی تعلیمات بہت کچھ مسخ ہو چکی تھیں۔ ویدوں کے مذہب کا زمانہ تو منوجی مہاراج ہی کے زمانے میں ختم ہو چکا تھا۔ کرشن مہاراج کی تعلیمات اور گیتا وغیرہ بھی مسخ ہو چکی تھیں۔ پوران ابھی تصنیف ہی نہیں ہوئے تھے۔ کیونکہ پورانوں کی تصنیف کا زمانہ آٹھویں صدی عیسوی کے بعد کا زمانہ ہے جب کہ سندھ پر اسلامی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ لہٰذا محمد بن قاسم کی حملہ آوری کے وقت ہندوستان کے مذہب کا اگر کوئی نام رکھا جا سکتا ہے تو وہ بدھ مذہب ہی ہو سکتا ہے۔

ہیونگ شیانگ کا بیان اب ہیونگ شیانگ کے سفرنامے پر غور کرو وہ کہتا ہے کہ بدخشاں و بلخ و کابل میں تو بدھوں کی حکومت اور بدھوں کا مذہب رائج ہے لیکن قندھار و بلوچستان میں آتش پرستی یعنی مجوسی مذہب پایا جاتا ہے پھر وہ کشمیر، پنجاب، سندھ، گجرات، مالوہ، متھرا، تھانیسر، قنوج، بنارس، پٹنہ، بہار، بنگال، کامروپ (آسام) اڑلیسہ، کلنگا (مدراس) اندھرا، مہاکوسلا (ممالک متوسط) مہاراشٹر، کوکن، مدورا (تراونکور) وغیرہ سب جگہ کا ذکر کرتا ہے ہر جگہ اس کو اپنے ہم مذہب راجا ملتے ہیں اور اس کو ایک جاتری سمجھ کر بڑی عزت اور خاطر مدارات سے پیش آتے ہیں نالندہ کی خانقاہ میں وہ سیکڑوں مدیارتھی اور پاٹھک دیکھتا ہے وہاں وہ بطور تبرک خود بھی طلبا کے ساتھ شامل ہو کر ایک دو سبق پڑھتا ہے اور کوئی بیدین مخالف (برہمنی مذہب کا پیرو) مباحثہ کرنے کے لئے چیلنج دیتا ہے تو ہیونگ شیانگ

اُس کے مقابلہ کو نکلتا اور اُس کی اس شرط کو قبول کر لیتا ہے کہ جو شخص مباحثہ میں ہار جائے وہ فتح مند فریق کے ہاتھ سے مارا جائے لیکن ہیونگ شیانگ اپنے حریف برہمن کو ہرا دیتا ہے اور پھر بجائے قتل کرنے کے اُس کو یہ کہکر چھوڑ دیتا ہے کہ ہم انسان کو قتل نہیں کیا کرتے تم آئندہ سوچ سمجھ کر کسی سے مباحثہ کرنا۔

ہیونگ شیانگ اپنے سفرنامے میں بار بار ڈاکوؤں کے پنجے میں گرفتار ہونے کا ذکر کرتا اور ایک شہر سے دوسرے شہر تک سفر کرنے میں کئی کئی مرتبہ ڈاکوؤں سے دوچار ہوتا ہے ان ڈاکوؤں کو وہ ہمیشہ کافر اور بے دین لوگ بتاتا ہے اُس نے اپنے سفرنامے میں کسی پہاڑی چھوٹی سی ریاست یا گاؤں کا ذکر کرتے ہوئے وہاں کے حاکم کو کافر بے دین کہا ہے حالانکہ وہ برہمنی مذہب کا پیرو اور بُدھ مذہب کا مخالف تھا ہیونگ شیانگ جیسے مذہبی شخص سے یہی توقع بھی ہو سکتی تھی کہ وہ غیر بُدھ لوگوں کو کافر کے نام سے یاد کرے چنانچہ اُس نے قندھار والوں کو بھی جو آتش پرست تھے اسی نام سے یاد کیا ہے۔

پس اس بات کے تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیئے کہ ہیونگ شیانگ کو جو ہر صوبے اور ہر علاقے میں ڈاکو ملے وہ سب کے سب برہمنی مذہب کے لوگ تھے اور انھوں نے بُدھوں کی ریاستوں میں یہ سمجھکر کہ یہ لوگ کسی شخص کو جان سے نہیں مارتے ڈکیتی اور رہزنی شروع کر دی تھی۔ یہ زمانہ ضرور ایسا تھا کہ ہندو یعنی برہمن لوگ بُدھوں کی سلطنت کو مٹا کر اپنی حکومتیں قائم کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ لیکن ابھی تک اُن کو کوئی نمایاں اور قابلِ تذکرہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ الہ آباد یعنی پریاگ کی چھوٹی سی ریاست کا حاکم بھی برہمن تھا لیکن وہ قنوج کے راجہ کا محکوم اور نوکر تھا اسی لئے ہیونگ شیانگ اُس کی نسبت وہ خطاب استعمال نہیں کرتا جو دوسرے ہندوؤں کی نسبت استعمال کرتا ہے۔ وہ قنوج۔ مہاراشٹر۔ مالوہ۔ گجرات۔ کشمیر۔ اودھ۔ بہار۔ بنگال، اڑیسہ، دکن، میسور وغیرہ سب ملکوں کے راجاؤں کو صاف الفاظ میں بُدھ مذہب کا پیرو بتاتا اور ہر جگہ بُدھ کے مندروں میں عبادت کرتا۔ اور گوتم بدھ کے تبرکات موجود پاتا ہے۔ ہندوستان کے ہر حصے اور ہر گوشے میں اُس نے بدھ کے بڑے بڑے عظیم الشان اور مرصع بُت دیکھے، جن کی مندروں میں خوب دھوم دھام سے پوجا ہوتی تھی اُس نے کوئی گھر ہندوستان میں بدھ کی مورتیوں سے خالی نہیں دیکھا جو اس بات

کی دلیل ہے کہ اُس زمانے میں بُدھ مذہب کے پیرو گوتم بدھ کی مورت کو پوجتے تھے اور بُدھوں میں بُت پرستی عام ہو گئی تھی اور غالباً اسی لئے ہر ایک پتھر یا لکڑی کے مجسمے کو بُت (بدھ) کہا جانے لگا۔ اُس زمانے میں قنوج کے راجہ سلادت دوم (راجہ ہرش) کو ہندوستان بھر کے تمام راجہ اپنا شہنشاہ مانتے اور اُس کے احکام کی تعمیل کو ضروری جانتے تھے۔ صرف مہاراشٹر (دکن) کا راجہ اُس کی شہنشاہی کو تسلیم نہیں کرتا اور اپنے آپ کو دکن کے راجاؤں کا سردار جانتا تھا۔ مگر مذہب اُس کا بھی بُدھ ہی تھا۔

جب ہیونگ شیانگ مہاراشٹر کے راجہ پلی کیسن کے پاس دکن میں پہنچا ہے تو وہ بڑی خاطر مدارات سے پیش آیا اور اُس کو اجنٹہ اور ایلورا کے مغارات کی سیر کرائی قنوج کے راجہ نے جس کو بعض مورخین نے راجہ ہرش کے نام سے بھی موسوم کیا ہے ہیونگ شیانگ کو لے کر گنگا جمنا کے مقام اتصال یعنی پریاگ کا سفر کیا اور وہاں ہندوستان کے بیئں راجے مہاراجے راجہ قنوج کے حکم سے آکر جمع ہوئے۔ یہاں ایک بڑا جلسہ منعقد ہوا۔ پانچ لاکھ آدمی اس میدان میں ہر صوبے سے آآکر شریک جلسہ ہوئے جن میں بڑے بڑے عالم۔ عابد بے دین، غریب، یتیم، محتاج سب شامل تھے۔ بدھ مذہب کے عالموں نے وعظ و پند کی تقریریں کیں اول روز بدھ کی ایک مورت بہت بڑے خیمے میں نصب کی گئی اُس کی سب نے عبادت کی۔ پھر زر و جواہر نفیس کھانے۔ کپڑے وغیرہ محتاجوں کو تقسیم کئے گئے۔ دوسرے روز ادت دیو (سورج دیوتا) کی مورت نصب کی گئی اور دوم درجہ کی چیزیں تقسیم کی گئیں۔ تیسرے روز ایشور دیو۔ کی مورت نصب ہوئی اور سوم درجہ کی چیزیں تقسیم ہوئیں۔ چوتھے دن ایک ہزار بُدھ مذہب کی انجمنوں یا جماعتوں کو ایک ایک ہزار اشرفیاں اور ایک ایک موتی دیا گیا۔ پانچویں دن برہمنوں کو خیرات تقسیم کی گئی۔

چھٹے دن جینیوں اور عام لوگوں کو خیرات و انعام تقسیم ہوا۔ ساتویں دن اُن لوگوں کو خیرات تقسیم ہوئی جو دور دراز یعنی بیرونِ ہند مقامات سے آئے تھے۔ آٹھویں دن عام غریبوں، لاچاروں اور یتیموں کو انعامات تقسیم ہوئے۔ اس خیرات میں راجہ سلادت نے اپنے گھوڑے۔ ہاتھی اور فوج و اسلحہ کے سوا تمام دولت اور خزانہ جو پانچ سال میں جمع ہوا

تھا، سب خرچ کر دیا۔ دوسرے راجاؤں نے بھی جن کی تعداد بیس تھی۔ قنوج کے راجہ کی تقلید میں اسی طرح خیرات کی۔ ان راجاؤں میں گجرات سے لے کر آسام تک کے راجہ شریک تھے۔ ہر پانچ سال کے بعد اسی طرح پریاگ میں راجہ جمع ہو کر خیرات کیا کرتے تھے۔

مؤرخین کے نتائج

ہیونگ شیانگ کے سفرنامے میں مذکورہ روئداد پڑھ کر بعض مؤرخین نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ راجہ سلادت اور اُس زمانے کے دوسرے راجے بدھ اور برہمنی دونوں مذہبوں کے پابند اور پیرو تھے اسی لئے ایشور دیو اور آدت دیو کی مورتیوں کو پریاگ کے میلے میں بدھ کی مورت کے ساتھ نصب کیا گیا لیکن انھوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ یہ میلہ یا جلسہ جو ہر پانچ سال کے بعد ہوتا تھا اشوک کے اُس فرمان کی تعمیل تھا جس کا اوپر ذکر آچکا ہے اور جس میں لکھا ہے کہ "پانچویں سال سب لوگ اپنے اپنے گناہوں کا کفارہ دیا کریں" بُدھ کی مورت کی پوجا کرنے کے بعد آخر میں دوسرے مذاہب کے لوگوں کو بھی جو اُس جگہ موجود ہوتے تھے اپنے اپنے مذہب کے موافق پوجا کرنے کا موقعہ دے دیا جاتا تھا اور یہ آشوک کے اُس فرمان کی تعمیل تھی جس میں دوسرے مذاہب کے ساتھ صلح و آشتی اور محبت بڑھانے کی ترغیب ہے اور جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ پس ہیونگ شیانگ کی آمد تک ہندوستان کے قریبًا تمام راجہ اشوک کے زمانے کے طے شدہ مذہبی احکام کو واجب التعمیل جانتے تھے اگرچہ بہت سی بدعات بھی رائج ہو کر داخل مذہب ہو چکی تھیں ہیونگ شیانگ جب ہندوستان میں وارد ہوا ہے تو سندھ کا راجہ ساہسی تھا جو بُدھ مذہب کا پیرو تھا اور سندھ میں قریبًا تمام آبادی بدھوں کی تھی۔ جس طرح بنارس الہ آباد وغیرہ میں برہمن اور برہمنی مذہب کے پیرو اور بُدھ مذہب کے مخالف بھی تھوڑی سی تعداد میں آباد تھے اسی طرح ملک سندھ میں بھی یہ لوگ موجود تھے۔ ان برہمنی مذہب کے لوگوں کو سرکاری ملازمتیں بھی سندھ کی بُدھ حکومت میں مل سکتی تھیں چنانچہ انھیں لوگوں کی سازش نے راجہ ساہسی کے بعد راجہ چچ کو تخت حکومت دلوایا۔ راجہ چچ کی نسبت یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ برہمنی مذہب کا پابند تھا مگر حکومت کا مذہب وہی بُدھ مذہب تھا کیونکہ راجہ چچ بدھوں ہی کے مندر میں جاکر اپنی پوجا پاٹ کے مراسم ادا کرتا تھا۔ چچ کے بعد راجہ چندر سندھ کا راجہ ہوا وہ بدھ مذہب کا بڑی سختی سے پابند اور برہمنی

مذہب کا دشمن تھا پس یہ خیال کرنا کہ مسلمانوں کی حملہ آوری کے وقت ہندوستان میں بدھ مذہب کے سوا کسی اور مذہب کی حکومت تھی غلط ہے اور اس کے غلط ہونے کی ایک یہ بھی دلیل ہے کہ محمد بن قاسم کی حملہ آوری کے عرصہ دراز بعد شنکراچارج نے جب بدھ مذہب کے خلاف جد و جہد شروع کی ہے تو ہندوستان کے راجاؤں میں سے بعض نے پہلی مرتبہ بدھ مذہب ترک کر کے شنکراچارج کا جدید مذہب اختیار کیا ہے اور اسی زمانے سے بدھ مذہب کی حکومت کا رقبہ تنگ ہونا شروع ہوا ہے اس سے پہلے تو کوئی راجہ بدھ مذہب کا مخالف ایسا موجود نہ تھا جو قابل تذکرہ ہو۔ شنکراچارج کے زمانے ہی سے پرانوں کی تصنیف شروع ہوئی اور پورے پانچ سو برس تک یعنی ہندوستان میں مسلمانوں کی سلطنت قائم و مستحکم ہو جانے کے وقت تک پرانوں کی تصنیف کا سلسلہ جاری رہا۔ انھیں پرانوں کے بتائے ہوئے عقائد کا مذہب ہندوستان کے تمام ہندوؤں کا مذہب سمجھا جاتا ہے اس پرانوں کے مذہب کو نہ ویدوں کے مذہب سے کوئی تعلق ہے نہ منو سمرتی کے مذہب سے نہ گیتا کے عقائد سے۔ لطف یہ کہ اٹھارہ پرانوں میں سے قریباً سب پرانوں ویدوں کی تکریم کا تو قائل ہے لیکن جو اعمال بتاتا ہے وہ اکثر ویدوں کے مخالف اور بالکل ہی جدید اور نئے عقائد پر مبنی ہیں جو برہمنوں کے من گھڑت معلوم ہوتے ہیں اس لئے اس جدید مذہب کو جو ہندو مذہب کہلاتا ہے اور جو ہندوستان میں مسلمانوں کی حملہ آوری کے بعد پیدا ہوا ہے اس مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے جو مسلمانوں کی آمد اور حملہ آوری کے وقت ہندوستان میں موجود تھا اور بدھ مذہب کہلاتا تھا۔

تاریخ تبت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۷۴۷ء میں پدما سمبھو نامی ایک شخص کو نالندہ کی خانقاہ سے تبت کے ایک راجہ نے بلایا اور اپنے ملک کا مذہبی افسر مقرر کیا جو دلیل اس بات کی ہے کہ دوسرے ملکوں میں بھی اس زمانے تک ہندوستان ہی کو بدھ مذہب کے عالموں کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا۔ سنہ ۹۰۰ء میں تبت کے ایک راجہ نے بدھ مذہب کے عقائد کو ترک کر کے دوسرا مسلک اختیار کیا تو وہاں کی رعایا نے اس راجہ کو قتل کر دیا۔ سنہ [illegible]ء میں تبت کے راجہ نے پنڈت کمالا شیلا کو ہندوستان سے بلایا اور اس کو اس عہدہ جلیلہ پر مامور کیا کہ عام لوگوں کو بدھ مذہب کے احکام سے واقف کرنے کے لئے ایک مذہبی محکمہ اپنی نگرانی میں قائم کرے اور تمام ملک

کو مذہب کا پورے طور پر پابند بنا دے۔ پھر ایک دوسرے پنڈت کو بلا کر بدھ مذہب کی کتابوں کے ترجمہ کرنے پر مامور و مقید کیا۔

جین مذہب

ہیونگ شیانگ کی آمد تک ہندوستان میں جین مذہب کا زیادہ چرچا نہ تھا اگرچہ جین مذہب کے اوتار پارسناتھ اور مہابیر کی نسبت یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ وہ گوتم بدھ کے ہم عصر تھے مگر بعض مورخین کو جنھوں نے مہابیر و پارسناتھ کو بدھ کا ہم عصر لکھا ہے اس لئے دھوکا لگا ہے کہ اُنھوں نے جین مذہب کی نسبت یہ بات کسی کی لکھی ہوئی دیکھ لی ہے کہ جین مذہب اور بدھ مذہب ایک دوسرے سے مشابہ اور بالکل قریبی مذہب ہیں۔ حالانکہ اس کو قرب زمانی سے کوئی تعلق نہیں ہیونگ شیانگ کی آمد کے وقت بدھ مذہب میں بہت سے فرقے پیدا ہو گئے تھے اور برہمنوں نے بھی بدھ مذہب کی مساوات سے تنگ آ کر اپنا اقتدار قائم کرنے کے لئے جدوجہد شروع کر دی تھی اور پھر قومی مدارج قائم کرنے کے خواب دیکھنے لگے تھے۔ اسی مذہبی کشمکش میں بدھ مذہب کے ایک فرقے نے مستقل طور پر اپنا ایک ایسا مسلک قائم کر لیا جو برہمنوں کی خواہشات اور بدھ مذہب دونوں کا مرکب مذہب تھا یعنی اُنھوں نے جان داروں کی حفاظت کو بھی ضروری قرار دیا۔ ویدوں کو بے حقیقت اور ناقابلِ تسلیم سمجھا آگ کی پوجا اور بلیدان کو بھی غیر ضروری ٹھہرایا۔ یہ سب باتیں بدھ مذہب کی تھیں دوسری طرف ذات پات کی قیود کو تسلیم کر لیا۔ برہمنوں کے اوتاروں کو بھی اپنے اوتاروں کے بعد دوم درجہ پر قابلِ تعظیم مان لیا۔ یہ باتیں برہمنوں کی خواہشات کو پورا کرنے والی تھیں۔ ہیونگ شیانگ کے زمانے میں تاریخ کے اندر پہلی مرتبہ جین مذہب کے لوگوں کا ذکر ایک الگ اور مخصوص فرقہ کی حیثیت سے آتا ہے۔ یہ فرقہ ملک گجرات میں پیدا ہوا پھر سندھ اور دکن کی جانب بھی پھیل گیا۔ وسط ہند اور بنگال تک اس فرقہ کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ برہمنوں کی خواہشات کے پورا کرنے اور ذات پات کی قیود دوبارہ قائم ہو جانے کو گجرات کے بدھوں نے تسلیم کر لینا اس لئے مناسب سمجھا ہو گا کہ ایک درمیانی حالت پیدا ہو جائے۔ بہرحال جو کچھ بھی صورت ہوئی ہو جین مذہب بھی اُسی زمانے کی پیداوار ہے جب کہ اسلام ہندوستان کے باشندوں میں داخل ہونے لگا تھا چونکہ بدھوں کا یہ فرقہ برہمنوں کے اقتدار کا مخالف نہ تھا لہٰذا برہمنوں نے

اس کی مخالفت ترک کردی اور اس کو برہمنوں کے ہاتھ سے کوئی نقصان نہیں پہنچا۔

محمد بن قاسم سے محمود غزنوی تک ہندوستان کی حالت

محمد بن قاسم کی حملہ آوری

اور سندھ میں اسلامی حکومت قائم ہو جانے کے بعد محمود غزنوی کے زمانے تک کئی سو سال ایسے گذرے کہ ہندوستان پر مسلمانوں نے کوئی حملہ نہیں کیا۔ سندھ کی اسلامی ریاستیں بھی اپنے قریبی ہندو راجاؤں سے مصالحت و آشتی کا برتاؤ رکھتی تھیں اور اُن کی ہندو رعایا امن و امان سے زندگی بسر کرتی تھی۔ اس حالت میں بُدھوں کی بُت پرستی کا خلافِ عقل ہونا مسلمانوں کی ہمسائیگی کے سبب ضرور ثابت ہونے لگا ہوگا۔ ایسی حالت میں جب کہ خود بخود بُدھوں کی بُت پرستی قابلِ مضحکہ ثابت ہو رہی تھی شنکراچارج کو موقعہ مل گیا کہ وہ برہمنوں کے پورانے مذہب اور منوسمرتی والے قوانین کو ایک بالکل نئے فلسفیانہ قالب میں ڈھال کر اور اسلامی عقائد سے توحید کے دلائل لے کر ایک نیا مذہب پیش کرے اور بُدھوں کے استیصال پر آمادہ ہو جائے۔ چنانچہ اُس نے ایک دو راجاؤں کو اپنا ہم خیال بنایا اور پھر ایک کڑھائی ہمراہ لے کر اس اعلان کے ساتھ سفر شروع کیا کہ جو شخص مجھ سے مباحثہ کرے گا اگر وہ ہار جائے گا تو کھولتے ہوئے تیل میں ڈال کر جلا دیا جائے گا۔ محمد بن قاسم سے محمود غزنوی تک کا زمانہ ہندوستان میں بالکل تاریک زمانہ ہے یعنی اس زمانہ کے متعلق ہندوؤں کے تاریخی حالات بہت ہی کم معلوم ہو سکتے ہیں۔ مگر یہ بات یقینی ہے کہ اسی زمانے میں موجودہ ہندو مذہب کے پوران تصنیف ہونے شروع ہوئے۔ ہندوؤں میں مذہبی فرقے نئے نئے سمپردائے اور پنتھ قائم ہوئے۔ ہندوستان میں اسلام کی پُر امن آمد اور محمد بن قاسم کے حملہ پر اس لئے کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمانوں نے ہندوستان کی قوموں کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا بلکہ دوسرے اسباب کی بنا پر ہندوستان کے مذاہب اور اقوام میں خود بخود شکستگی کا ایک طوفان برپا ہو گیا تھا اسی زمانے میں راجپوتوں کی قوم نے برہمنوں کی امداد سے ترقی پاکر حکومتیں حاصل کرنا شروع کیں یا یوں کہئے کہ برہمنوں نے اپنا اقتدار بڑھانے کے لئے راجپوتوں کو جنگی کاموں کے لئے آگے بڑھایا اور اُن کو سہارا دے کر تختِ سلطنت تک پہنچایا، اس طوفانی زمانے میں مسلمانوں نے ہندوستان پر کوئی حملہ نہیں

کیا یہاں تک کہ محمود غزنوی کے حملے تک ہندوستان کے بعض صوبوں میں راجپوتوں کی مضبوط ریاستیں قائم ہو گئیں اور برہمنوں کے قائم کیے ہوئے جدید فرقے اور جدید مذاہب ہندو مذاہب کے نام سے رواج پانے لگے اور جہاں موقع ملا بدھوں کو قتل اور جلا وطن کرنے کی کارروائیاں عمل میں آتی رہیں۔ وشنو کے پرستار۔ شیو کے پرستار شاکت یعنی شکتی کے پرستار۔ سورج کے پرستار۔ گنیش یعنی گنپتی کے پرستار۔ برہما کے پرستار۔ تیش۔ سوم۔ گندھرپ۔ بتیال۔ اور بھوتوں کے پرستار۔ غرض سیکڑوں فرقے بُدھ مذہب کی جگہ پیدا ہونے لگے۔ وشنو اور شیو کے پرستاروں کی بہت کثرت ہوئی ان فرقوں میں سے بھی ہر ایک فرقہ سیکڑوں شاخوں میں متفرع ہوا اور ان شاخوں میں نشو و نما سولھویں صدی عیسوی تک جاری رہی اور پوران تصنیف ہوتے رہے۔

حاصل کلام ایسی حالت اور اس مذہبی تشتت وانتشار کے زمانے میں اگر مسلمان ذرا بھی تبلیغ اسلام کی طرف متوجہ ہوتے اور ہندوستان والوں کو اسلام میں داخل کرنے کی کوشش کرتے تو صرف چند سال میں تمام ہندوستان کا دائرۂ اسلام میں داخل ہو جانا معمولی بات تھی لیکن مسلمان فرماں رواؤں نے اپنی مذہبی رواداری کو اس سختی کے ساتھ استعمال کیا کہ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے ہندوؤں کے مذہب کو باقی رکھنا اور ہندوؤں کو اسلام میں داخل ہونے سے روکنا اپنے مقاصد مہمہ میں داخل کر لیا تھا ورنہ آج ہندوستان میں ایک ہی مذہب یعنی اسلام ہوتا۔ بعض مسلمان درویشوں نے ہندوؤں کو جو مسلمان ہونا چاہتے تھے اسلام میں داخل کرنے سے پرہیز نہیں کیا اور اسی لئے ہندوستان کی جس قدر قومیں اسلام میں داخل ہوئیں وہ سب انھیں درویشوں اور زاہدوں کے ہاتھ پر مسلمان ہوئیں۔ حیرت ہے کہ آج مسلمانوں کی اس حد سے بڑھی ہوئی رواداری اور مسلمان بادشاہوں کی اس ہندو نوازی کو بالکل برعکس صورت میں پیش کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حامداً ومصلیاً

آئینہ حقیقت نما

باب اوّل

چند ضروری اشارات اس باب میں ہم کو مسلمانوں کی پہلی باقاعدہ فوج کشی کے اسباب اور مسلمانوں کی ملک سندھ پر حکمرانی کے حالات بیان کرتے ہیں قبل اس کے کہ مقصود اصلی کو شروع کیا جائے چند باتیں پہلے عرض کر دینی ضروری ہیں۔

(۱) آج کل ملک سندھ گورنمنٹ بمبئی کے تحت ایک کمشنری یا چھوٹا سا صوبہ ہے ہندوستان کے نقشہ میں علاقہ سندھ کے حدود ہم نے طالب علمی کے زمانے میں جو کچھ دیکھے تھے وہی ہمارے دماغ میں محفوظ ہیں اور ملک سندھ کا نام سن کر اسی چھوٹے سے ملک کا تصور ہمارے پیش نظر ہوتا ہے لیکن اب سے بارہ سو سال پہلے کا سندھ اس موجودہ سندھ سے بہت وسیع اور عریض وطویل تھا۔ اس زمانے کے مورخین جس ملک کو سندھ کے نام سے موسوم کرتے ہیں وہ مغرب میں کمران تک جنوب میں بحر عرب اور گجرات تک مشرق میں موجودہ ملک مالوہ کے وسط اور راجپوتانہ تک شمال میں ملتان سے اوپر گذر کر جنوبی پنجاب کے اندر تک پھیلا ہوا تھا۔ اس میں پنجاب کے جنوبی اضلاع بلوچستان کا اکثر حصہ

صوبہ سرحدی کا جنوبی حصہ راجپوتانہ کا اکثر حصہ گجرات کا شمالی حصہ معہ موجودہ ملک سندھ سب شامل تھا مؤرخین نے راجہ چچ اور اس کے پیش رو راجہ کے جو حدود حکومت بیان کئے ہیں وہ اس مذکورہ سندھ سے کہیں زیادہ وسیع ہیں لیکن عرب حملہ آوروں اور ان کے مورخوں نے جس ملک کو سندھ کے نام سے تعبیر کیا ہے اس کے وہی حدود ہیں جو اوپر مذکور ہوئے۔

(۲) اس باب میں اور آئندہ ابواب میں بھی جو کچھ بیان ہوگا وہ تاریخ ہند کا صرف ایک ہی پہلو ہوگا یعنی مسلمانوں نے ہندوستان میں ہندو محکوموں کے ساتھ کیسا سلوک کیا۔ عام اور مکمل حالات اور مفصل تاریخ سے واقف ہونے کے لئے ہندوستان کی جو تاریخ میں نے الگ مرتب کی ہے اس کے شائع ہونے کا انتظار کرنا چاہیئے۔ اس باب اور آئندہ ابواب میں بھی اگر واقعات کا تاریخی تسلسل اور ان کے توابعات موجود نہ ہیں تو اس کا سبب یہی سمجھا جاتے کہ صرف ایک ہی پیش نظر مقصد کو چونکہ پورا کرنا تھا لہذا غیر ضروری اور مقصد مذکور سے دور و مہجور باتوں کو ہاتھ نہیں لگایا گیا۔

(۳) **محمد بن قاسم کے حملے کے وقت سندھ کے تاریخی شہر** | محمد بن قاسم کی حملہ آوری کے وقت سندھ کا دارالسلطنت الور (اروڑ) تھا یہ شہر اب موجود نہیں ہے اس کا محل وقوع موجودہ شہر روہڑی سے آٹھ میل جنوب کی جانب ہے دیبل پرانے زمانے میں ایک شہر تھا اس کا محل وقوع شہر کراچی کے متصل یا شہر کراچی کا ایک جزو سمجھنا چاہیئے۔ موجودہ شہر کراچی ڈیڑھ سو سال سے زیادہ کی آبادی نہیں ہے۔ شہر دیبل اس زمانہ میں بندرگاہ بھی تھا اور اس کے وسط میں ایک مندر بودھوں کا تھا جس کو دیول کہتے ہیں اسی لئے شہر کا نام بھی دیول یا دیبل مشہور ہو گیا تھا۔ نرآین کوٹ بھی پرانے زمانے میں ایک شہر تھا جو موجودہ شہر حیدرآباد سندھ کے موجودہ قلعہ کی جگہ آباد تھا حیدرآباد سندھ کا موجودہ قلعہ ۱۷۶۸ء میں غلام شاہ قندھاری[1] نے بنایا تھا۔ قدیم زمانے میں ایک شہر برہمن آباد تھا جو

[1] غلام شاہ قندھاری مصنف کا اشتباہ ہے بلکہ یہ غلام شاہ کلہوڑا ہے جو خاندان کلہوڑا کا ایک فرمانروا تھا جس نے حیدرآباد کے قلعہ کو بنایا تھا۔

موجود نہیں ہے اس کا محل وقوع حیدرآباد سندھ سے شمال و مشرق کی جانب چالیس میل کے فاصلہ پر اور مقام ہالہ سے اکیس میل کے فاصلہ پر ہے۔ برہمن آباد کو سندھی لوگ بہیرا کا تھل اور دلورآئی جوگھاٹ بھی کہتے تھے یہ شہر چار میل کے اندر پھیلا ہوا تھا۔ برہمن آباد کے تباہ شدہ نشانات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی وقت دریا کی طغیانی نے اس کو تباہ کر دیا ہے۔ برہمن آباد سے پانچ چھ میل کے فاصلہ پر شہر منصورہ آباد تھا وہ بھی اب موجود نہیں ہے۔ منصورہ دریا کے ایک کنارہ پر آباد تھا اس کے بالمقابل دوسرے کنارے پر شہر محفوظہ تھا۔ عمرکوٹ جو اکبر بادشاہ کی جائے پیدائش ہے اس کے قریب جینیوں کے مندر کے خرابے پائے جاتے ہیں۔ سہوان اب بھی موجود ہے یہ ایک پہاڑی پر آباد ہے اور سکھر سے ۱۴۰ میل اور رکی سے گیارہ میل کے فاصلہ پر ہے یہاں کا قلعہ کافر قلعہ کے نام سے مشہور ہے یہ قلعہ راجہ ساہسی کے چھ قلعوں میں سے ایک تھا۔ بہران یا مہران یا باران ایک دریا کا نام ہے جو صرف سو میل لمبا اور کوٹری کے پاس دریائے سندھ میں شامل ہو جاتا ہے۔ شہر نیرون کا محل وقوع کراچی سے ستر میل کے فاصلہ پر شمال و مشرق کی جانب اور منصورہ سے جنوب و مغرب کی جانب پینتالیس میل کے فاصلہ پر ہے۔ اس سے زیادہ سندھ کے تاریخی مقامات کے محل وقوع کی تحقیق مجھکو نہیں ہو سکی۔ تاریخوں میں سندھ کے بہت زیادہ مقامات کے نام آتے ہیں جن کی نسبت نہیں کہا جا سکتا کہ آج کل وہ کن کن ناموں سے مشہور ہیں۔ یا صفحۂ ہستی سے معدوم ہو چکے ہیں تو اُن کے خرابے کہاں کہاں واقع ہیں۔

(۴) **محمد بن قاسم سے پہلے سندھ کی حکومتیں** | سندھ کے ملک پر قدیم سے بدھوں کی سلطنت قائم تھی۔ سندھ کے ایک راجہ نے جس کا نام سیہرس تھا ملک فارس پر حملہ کیا تھا چنانچہ وہ ایرانیوں یعنی مجوسیوں کے ہاتھ سے میدانِ جنگ میں مارا گیا۔ اُس کے بعد اُس کا بیٹا ساہسی تخت نشین ہوا اور ساہسی کے قبضہ سے بلوچستان و مکران کا علاقہ نکل کر ایرانیوں کے قبضہ میں چلا گیا۔ ساہسی کا وزیر بدھی من نامی ایک

شخص تھا بدھی من کا میر منشی یا نائب رام نامی ایک شخص تھا رام کے پاس ایک نوجوان پنڈت جس کا نام چچ بن سلائج تھا اور جس کو چاروں ویدپر عبور حاصل تھا آکر نوکر ہوا۔ چند روز کے بعد رام مرگیا اور اس کی جگہ چچ نائب وزیر یا میر منشی مقرر ہوا چچ نے بہت جلد راجہ ساہ سی کی خدمت میں رسوخ و اعتبار حاصل کر لیا۔ راجہ ساہ سی کی بیوی کا نام سبھ دیوی تھا رانی سبھ دیوی اور چچ کی خفیہ دوستی ہوگئی۔ اس چھپے یارانے کا یہ نتیجہ ہوا کہ راجہ ساہ سی اچانک مرگیا اور رانی نے راجہ کے رشتہ داروں اور سلطنت کے سرداروں کو جو راجہ کی عیادت کو آئے تھے ایک مکان میں بند کرکے سب کو ہلاک یا محبوس کر دیا اور اعلان کیا کہ راجہ کی وصیت کے موافق چچ کو تخت سلطنت سپرد کیا گیا ہے اور چونکہ میرے کوئی اولاد نہیں ہے لہٰذا میں چچ کے ساتھ شادی کرتی ہوں۔ اس طرح چچ سندھ کا راجہ ہوگیا اور رانی سبھ دیوی سے اُس کے دو بیٹے دھرسیہ اور داہر اور ایک بیٹی مسماۃ مائی پیدا ہوئی۔ چچ نے بدھی من وزیر کو بدستور وزارت پر قائم رکھا کیونکہ اُس نے رانی اور چچ کی کوئی مخالفت نہیں کی تھی۔ اس طرح سندھ کی حکومت قدیم خاندان کے قبضے سے نکل کر ایک برہمن کے قبضے میں پہنچی۔

چچ مذہب کے اعتبار سے بھی برہمنی مذہب کا پابند سمجھا جاتا تھا مگر چچ کا بھائی چندر بدھ مذہب کا پیرو تھا۔ چچ نے بلوچستان کا علاقہ مکران تک پھر ایرانیوں سے چھین لیا اور چند روز کے بعد ایرانیوں سے صلح ہوگئی کیونکہ ایرانیوں اور مسلمانوں کی لڑائیاں شروع ہوگئی تھیں اور ایرانی سندھ کے راجہ کی صلح و امداد کے خواہاں تھے اگر مسلمانوں سے ایرانیوں کی لڑائی شروع نہ ہوگئی ہوتی تو ایرانی خشکی اور سمندر دونوں جانب سے فوج کشی کرکے سندھ کا ملک ویران و برباد کر دیتے۔

چچ کے بعد اُس کا بھائی چندر تخت نشین ہوا یہ چونکہ بدھ مذہب کا پیرو تھا لہٰذا اس کی حکومت کو رعایا نے بہت پسند کیا۔ آٹھ سال حکومت کرنے کے بعد چندر فوت ہوا اُس کی جگہ چچ کا چھوٹا بیٹا داہر شہر الور میں تخت نشین ہوا اور چندر کا بیٹا راج برہمن آباد میں حکومت کرنے لگا۔ اس طرح ملک سندھ میں ایک ہی خاندان کی دو حکومتیں قائم ہوگئیں جن میں برہمن آباد کی حکومت کا مذہب خالص بدھ اور الور کی حکومت کا

مذہب برہمنی و بدھ یا نیم بدھ تھا۔ ایک سال کے بعد راج بن چندر فوت ہوا تو اُس کی جگہ چچ کے بڑے بیٹے دھرسیہ نے تخت حکومت پر قبضہ کیا۔ دھرسیہ بھی بدھ مذہب کا پیرو اور برہمنی عقائد سے متنفر تھا۔ دھرسیہ نے اردگرد کے علاقوں کو قبضے میں لاکر اپنی حکومت کو خوب مضبوط کرلیا مگر اپنے چھوٹے بھائی داہر سے جو اَلور میں فرماں روائی کر رہا تھا کوئی تعرض نہیں کیا۔

بھائی سے بہن کی شادی

دھرسیہ کے پاس اُس کی بہن مائی بھی رہتی تھی جس کی عمر تیس سال سے بھی زیادہ ہوگئی تھی مگر ابھی تک اُس کی شادی نہ ہوئی تھی دھرسیہ نے کوہ کیکانان کے ایک سرحدی فرماں روا سے اُس کی شادی کی تجویز پختہ کرکے اور بہت کچھ ساز و سامان جہیز کا فراہم کرکے داہر کے پاس بہن اور سامانِ جہیز کو روانہ کیا اور لکھا کہ جو کچھ تم سے ہو سکے تم بھی اس میں اپنا جہیز شامل کرو اور فلاں شخص کے ساتھ اس کی شادی کرکے رخصت کردو۔ داہر نے بدھمن وزیر کے مشورہ سے اپنی حقیقی بہن کے ساتھ خود شادی کرکے اُس کو اپنی بیوی بنالیا۔ دھرسیہ نے جب یہ حال سُنا تو برہمن آباد سے فوج لے کر اَلور پہ چڑھائی کی اور داہر کو محصور کرلیا مگر اسی محاصرہ کی حالت میں دھرسیہ چیچک کے مرض میں مبتلا ہوکر مرگیا اور داہر نے اس مصیبت سے چھوٹ کر برہمن آباد کی ریاست پر بھی قبضہ کرلیا۔ داہر ابھی برہمن آباد ہی میں مقیم تھا کہ کیکانان کے حاکم نے جس کے ساتھ دھرسیہ نے مائی کی شادی تجویز کی تھی۔ ایک عظیم الشان فوج لے کر اَلور پر چڑھائی کی۔ داہر اس فوج کشی کا حال سُن کر سخت پریشان اور حواس باختہ ہوا۔ بدھمن وزیر نے راجہ داہر کو توجہ دلائی کہ اس مہم کو علافیوں کے سپرد کرنا چاہئے چنانچہ داہر نے محمد بن حرث علافی کو بلوا کر اپنی پریشانی کا حال سنایا۔ محمد بن حرث علافی نے اپنے پانسو عربی سپاہیوں کو لے کر دشمن کے لشکر پہ شب خون مارا اور سخت کشت و خون کے بعد دشمن کو بھگا دیا۔ دشمن کے ہزارہا آدمی جو گرفتار ہوئے تھے داہر کے سامنے پیش کیے گئے داہر نے اُن کے قتل کا حکم دیا۔ مگر محمد علافی نے کہا کہ ان کو قتل کرنے کی بجائے ان پر احسان کیجئے اور جاں بخشی کرکے آزاد کردیجئے۔ داہر نے محمد بن حرث علافی کے اس عظیم الشان کارنامے سے خوش ہوکر اُس کو اپنا وزیر اعظم

بنایا اور سکہ پر ایک طرف اپنا اور ایک طرف محمد علافی کا نام مضروب کرایا۔ تیس سال حکومت کرنے کے بعد ٩٣ھ میں داہر مارا گیا۔ محمد علافی کا حال آگے آتا ہے۔ یہ تمام حالات چچ نامہ اور تاریخ سندھ معصومی سے ماخوذ ہیں۔

محمد بن قاسم کی حملہ آوری سے پہلے کے ہنگامے

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہدِ خلافت میں مکران تک مسلمانوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ مکران کو جب مسلمانوں نے فتح کیا ہے تو ایرانیوں کے ساتھ سندھیوں نے بھی اسلامی لشکر کا مقابلہ کیا تھا۔ مسلمانوں نے جب مجوسی شہنشاہ کا تخت چھین لیا تو اُس کی تمام حدود سلطنت تک مسلمانوں کا حق فرمانروائی ثابت ہو چکا تھا ایرانی شہنشاہی کے درہم برہم ہونے پر جن لوگوں نے اُس کے صوبوں کو اپنے قبضہ میں لے لیا تھا وہ سب کے سب مسلمانوں کو اُن کے قبضے سے واپس لینے ضروری تھے کیونکہ ایرانی شہنشاہی مسلمانوں کے ہاتھوں درہم برہم ہوئی تھی۔ مکران کے سرحدی صوبے پر ایک ایرانی سردار نے اپنا قبضہ جمایا تو مسلمانوں نے اُس کو چھین لیا۔ چونکہ سندھیوں نے نہاوند میں بھی جنگ ذات السلاسل میں بھی۔ جنگ قادسیہ میں بھی اور مکران میں بھی مسلمانوں کا مقابلہ کیا تھا لہٰذا مسلمانوں کو سندھ پر حملہ آوری کا حق حاصل ہو چکا تھا۔ مکران کے عامل نے مکران سے آگے بڑھ کر اُس حصۂ ملک پر بھی قبضہ کرنا ضروری سمجھا جو سندھ کے راجہ ساہسی کے زمانے میں ایرانیوں کے قبضہ میں تھا اور تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا کہ سندھ کے راجہ چچ نے اُس پر قبضہ کر لیا تھا۔ مگر حضرت فاروق اعظمؓ نے مناسب نہ سمجھا کہ انتقام یا ملک گیری کے لئے ایک نئی سلطنت سے جنگ و پیکار کا سلسلہ جاری کیا جائے چنانچہ فاروق اعظمؓ کے زمانہ میں مسلمانوں نے کوئی حملہ ہندوستان کے کسی حصہ پر نہیں کیا۔

حضرت عثمان کے زمانے میں ہندوستان پر پہلا حملہ

فاروق اعظمؓ کے بعد ٢٤ھ میں جب کہ حضرت عثمان غنیؓ تخت خلافت پر جلوہ افروز تھے بصرہ کے حاکم عبداللہ بن عامر نے عبدالرحمٰن بن سمرہ عامل کرمان کو اجازت دی کہ سندھی فوجوں کو جو راجہ چچ کی اولوالعزمی کے سبب سرحد مکران پر جمع ہو کر حملہ کی دھمکی دے رہی تھیں نکال دے چنانچہ عبدالرحمٰن بن سمرہ نے حملہ کر کے سندھی فوجوں کو بھگا دیا اور مکران سے سرحد کیکانان تک کا تمام علاقہ چھین لیا یہی وہ علاقہ تھا جو چچ کی حکومت میں صرف چند سال سے شامل ہوا تھا۔ اس حملہ آوری کی اس لئے بھی ضرورت تھی۔

کہ بہت سے مجوسی جو مسلمانوں کے دشمن تھے ایران سے بھاگ کر رخج کی حکومت میں چلے آئے تھے اور اس علاقہ کو مسلمانوں کے لئے موجب خطر بنا دیا تھا۔ عبدالرحمن بن سمرہ سرحد کیکانان سے آگے نہیں بڑھا اور فوراً اس کو کابل کی طرف جانا پڑا۔ جہاں ایک بغاوت کا فرو کرنا ضروری تھا۔ اس حملہ آوری کو بمشکل ہندوستان پر مسلمانوں کی پہلی حملہ آوری کہا جا سکتا ہے کیونکہ اصلی ملک سندھ میں اسلامی لشکر داخل نہیں ہوا تھا اسی مفروضہ علاقہ میں جس کی مشرقی سرحد بلوچستان کے مشرقی پہاڑوں پر ختم ہوتی تھی ایک بغاوت برپا ہوئی جس کو سندھ کے راجہ نے امداد پہنچائی۔ اس بغاوت کے فرو کرنے اور سندھی فوجوں کے پیچھے ہٹانے کے لئے سنہ ۳۸ھ میں حارث بن مرہ نامی ایک سردار نے عامل مکران کے حکم سے ایک ہزار سواروں کے ساتھ حملہ کیا اور بیس ہزار کے لشکر کو شکست دے کر امن و امان پھر بحال کر دیا۔ اس مرتبہ بھی اسلامی لشکر نے اپنی پہلی حد سے آگے قدم نہیں رکھا سنہ ۴۱ھ یا سنہ ۴۲ھ میں پھر اس علاقے کے اندر تمرد و سرکشی کے علامات نمودار ہوئے اور حضرت امیر معاویہؓ نے عبداللہ بن اسوار کو چار ہزار سپاہیوں کے ساتھ بطور سرحدی محافظ دستہ کے مشرقی سرحد پر قیام کرنے کا حکم دیا۔ یہاں موقع پاکر اور پہاڑ کے درے میں محصور کر کے باغیوں نے عبداللہ بن اسوار کو شہید کر دیا اس کے بعد سنان بن سلمہ مقرر ہوا۔ کچھ دنوں کے بعد سنان کی جگہ راشد بن عمر مقرر ہوا۔ راشد نے اس ملک کا خوب انتظام کیا اور سرکشوں سے مال گذاری وصول کی لیکن اس پر پچاس ہزار کے ایک لشکر نے جو باغیوں اور سندھیوں پر مشتمل تھا حملہ کیا۔ راشد اس معرکہ میں شہید اور اس کی جگہ پھر سنان بن سلمہ مامور ہوا۔

سندھ پر مسلمانوں کے حملے کی وجہ

سنہ ۴۴ھ میں امیر مہلب بن ابی صفرہ نے کابل کی بغاوت فرو کرنے کے بعد قندھار کی طرف توجہ کی۔ یہاں کے باغی مفرورین کابل کے ساتھ مل کر دریائے سندھ کے اس طرف چلے آئے۔ کابل میں عام طور پر لوگوں کا مذہب بودھ اور قندھار میں آتش پرستی تھا اس جگہ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ کابل و قندھار فتح کرنے کے بعد مسلمانوں نے وہاں کے باشندوں کو اپنا مذہب بدلنے اور اسلام قبول کرنے کے لئے مجبور نہیں کیا بلکہ وہ سیکڑوں برس بعد تک بھی اسلامی حکومت کے ماتحت اپنے اپنے مذہبوں پر عامل رہے

جیسا کہ تذکرۃ الحفاظ جلد اول میں مقاتل بن حیان خراسانی کی نسبت لکھا ہے کہ
ھرب فی ایام خروج ابی مسلم الخراسانی الی کابل ودعی خلقاً الی الاسلام فاسلموا
یعنی مقاتل بن حیان ابو مسلم خراسانی کے خروج کے زمانے میں کابل کی طرف بھاگ گئے
اور وہاں لوگوں کو اسلام کی طرف بلایا اور وہ مسلمان ہو گئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دوسری
صدی کا بھی ایک معقول حصہ گذر جانے کے بعد تک کابل میں غیر مسلم لوگ آباد تھے اور
وہ کسی پادشاہ یا سپہ سالار کے خوف سے نہیں بلکہ ایک عالم کے وعظ و پند سے مسلمان
ہوتے تھے۔ غرض کابل اور قندھار کے باغیوں اور سرکشوں نے جو مسلمانوں کی مخالفت
میں متحد ہو گئے تھے سندھ کے راجہ کی عملداری میں آکر پناہ لی اور یہاں اُن کو ہر قسم
کی امداد و اعانت ملی۔ مہلب بن ابی صفرہ نے اُن کے تعاقب کا سلسلہ جاری رکھا اور
دریائے سندھ کو عبور کر کے ملتان تک اُن کا تعاقب کیا۔ ملتان اس زمانے میں ملک
سندھ کے شمالی حصہ کا صدر مقام تھا جہاں راجہ چچ کا ایک وائسرائے قیام رکھتا تھا
مہلب نے ملتان کو فتح کر کے راجہ چچ کو ایک سبق دیا کہ سلطنت اسلامیہ کے باغیوں کو
پناہ دینی اور سرحدی علاقوں میں بغاوتیں برپا کرانی نہایت خطرناک کام ہے۔ امیر مہلب
ابھی قندھار سے ملتان تک کے نو مفتوحہ علاقہ کا کوئی بھی بند و بست کرنے نہ پایا تھا
کہ فوراً اُس کو حکم بن عمرو غفاری کی طلب پر یہاں سے واپس جانا اور بلخ و ماوراء النہر کی مہموں
میں شریک ہونا پڑا۔ مہلب جس مختصر سے دستۂ فوج کو یہاں چھوڑ گیا تھا وہ یہاں اپنے قدم
جما نہ سکا اور چچ کا علاقہ پھر مسلمانوں سے خالی ہو گیا۔ مہلب کا یہ حملہ جس کو ملک سندھ
پر پہلا اسلامی حملہ کہہ سکتے ہیں ایک بگولہ تھا کہ آیا اور گذر گیا۔ مسلمانوں نے بلوچستان
کے اس حصہ کو جو مکران سے کیکان تک وسیع تھا اپنے قبضہ میں رکھا اور چونکہ کچھ
دنوں یہ علاقہ سندھ کے راجہ چچ کی حکومت میں رہ چکا تھا۔ اس لئے وہ اس علاقہ
کو ملک سندھ کے نام سے تعبیر کرتے اور یہاں کے عاملوں کو ملک سندھ کا عامل کہتے
رہے۔ سندھ کا راجہ چچ ۵۵ھ میں فوت ہوا اُس کے بعد ۶۳ھ تک راجہ چندر نے
حکومت کی چندر کے عہدِ حکومت میں مسلمانوں نے سندھ کی طرف کوئی توجہ نہیں کی
چندر کا رویہ اپنے مسلمان ہمسایوں کے ساتھ بہت مصالحانہ تھا اسی لئے اس کے عہدِ
حکومت میں مسلمانوں نے کوئی حملہ سندھ کی سرحد پر نہیں کیا۔

راجہ داہر

۶۳ھ میں راجہ داہر سندھ کے تخت حکومت پر متمکن ہوا یہ وہ زمانہ تھا کہ مسلمانوں کی حکومت اندرونی جھگڑوں کی وجہ سے سخت خطرہ کی حالت میں تھی راجہ داہر کی تخت نشینی سے دو برس بعد یعنی ۶۵ھ میں خلیفہ عبدالملک اموی تخت نشین ہوا مگر شام و عراق و عرب و ایران و ترکستان و افغانستان وغیرہ میں جو جو گورنر مامور تھے وہ سب کے سب قریباً خود مختار تھے اور یہ فیصلہ ابھی تک نہیں ہوا تھا کہ آئندہ عالم اسلامی کا واحد فرماں روا یعنی خلیفۃ المسلمین کون ہوگا۔ اسی افراتفری اور آپا دھاپی کے عالم میں گورنر قندھار کو ۶۵ھ میں راجہ داہر کے نائب السلطنت یعنی حاکم ملتان کا حملہ روکنا پڑا، اور ہندو لشکر کو اسلامی لشکر کے مقابل ملتان کی دیواروں تک فرار کی عار گوارا کرنی پڑی۔ اس کے بعد بہت جلد خلیفہ عبدالملک نے تمام امیدوارانِ خلافت پر غلبہ پاکر اپنی خلافت کو خوب مضبوط و مستحکم بنا لیا اور آئندہ عرصۂ دراز تک کے لئے تمام عالم اسلامی میں عبدالملک اور اُس کی اولاد بلا شرکت غیرے فرماں روا رہی۔ عبدالملک بڑا ذی حوصلہ، بہادر اور اولوالعزم شخص تھا مگر اُس نے راجہ داہر اور ملک سندھ سے کسی قسم کا انتقام لینا اور حملہ آور ہونا مناسب نہیں سمجھا۔

عبدالملک بن مروان نے شوال ۸۶ھ میں وفات پائی اُس کی وفات سے ایک سال پہلے یعنی ۸۵ھ میں ایک زبردست موجب جنگ اور سبب حملہ آوری پیدا ہوا (جس کا ذکر آگے آتا ہے) مگر عبدالملک نے اپنے وائسرائے حجاج بن یوسف کو سندھ پر حملہ کرنے سے روکا، اور درگذر ہی سے کام لینا مناسب سمجھا۔ اس کا سبب یہ تو ہرگز نہ تھا کہ مسلمان راجہ داہر اور ملک سندھ کی فوج سے ڈرتے تھے کیونکہ مسلمان چند ہی روز ہوئے تھے کہ ایران۔ روم۔ مصر۔ ترکستان۔ افغانستان وغیرہ کو فتح کر چکے تھے اور اُن کے کسی معمولی سے سردار کو جب کبھی سندھ کے راجہ کی فوج سے لڑنا پڑا تو سندھیوں کو شکست ہوئی۔ اس درگذر اور چشم پوشی کا سبب بجز اس کے اور کچھ نہ تھا کہ وہ بلاوجہ اور معمولی اسباب کی بنا پر کسی سے لڑنا نہیں چاہتے تھے اور اپنی نہایت وسیع سلطنت میں اور اضافہ کے خواہاں نہ تھے یا یوں کہہ لیجئے کہ عراق و فارس کے سرسبز و شاداب صوبوں کے مقابلہ میں وہ سندھ کے ملک کو کچھ اچھا نہیں جانتے تھے۔ بہرحال مسلمانوں نے سندھ پر حملہ آور ہونے میں بہت ہی درگذر اور دیر کی۔

محمد بن قاسم کی حملہ آوری کے اسباب

عبد الملک بن مروان اموی خلیفہ دمشق نے اندرونی خطرات پر غالب آکر اپنے مشہور سپہ سالار حجاج بن یوسف ثقفی کو ممالک مشرقیہ کا وائسرائے مقرر کیا حجاج نے اول کوفہ میں آکر وہاں کا انتظام کیا پھر بصرہ میں پہنچ کر ۸۵ھ میں سعید بن اسلم کلابی کو مکران کا عامل مقرر کرکے بھیجا۔ اس سے چند روز پیشتر مکران میں بعض فوجی سردار حجاج سے ناراض ہوکر اُس کے احکام کی تعمیل سے انکار کرچکے تھے اور یہاں کی صورت معاملات بہت نازک ہورہی تھی۔ سعید بن اسلم نے مکران پہنچ کر سرکش و نافرمان لوگوں کے سردار کو گرفتار کرکے بڑی بے دردی سے قتل کیا اور اُس کا سر حجاج کے پاس بھیج دیا۔

اسلامی حکومت کے دو باغی

قبیلۂ بنی سامہ کے دو شخص جو آپس میں حقیقی بھائی اور حرث کلابی کے بیٹے تھے مکران کے علاقے میں فوجی افسر اور اچھا اثر و اقتدار رکھتے تھے۔ یہ دونوں ایک طرف سعید بن اسلم سے رشتہ داری رکھتے تھے تو دوسری طرف اُس سردار کے بھی رشتہ دار تھے جس کو سعید نے بے دردی سے قتل کیا تھا۔ ان دونوں پر اس واقعہ کا یہ اثر ہوا کہ انھوں نے اعلانِ بغاوت کرکے تمام سرکشوں کو اپنے گرد جمع کرلیا۔ ان دونوں کا نام محمد و معاویہ تھا ان کے بزرگوں میں کسی شخص کا نام علاف تھا اس لئے یہ علافی کہلاتے تھے۔ محمد بن حرث علافی اور معاویہ بن حرث علافی دونوں بھائیوں نے علاقہ مکران کے بعض شہروں پر قبضہ کرلیا۔ اور اُن کی جمعیت بڑھ گئی یہ رنگ دیکھکر سعید بن اسلم کلابی عامل مکران نے اُن کی سرکوبی کے لئے خود لشکر لے کر حملہ کیا مگر لڑائی میں گرفتار ہوگیا علافیوں نے سعید کو قتل کرکے اُس کے جسم کی کھال اُتروائی اور اُس کی لاش کو بے عزت کیا۔ پھر مکران پر قبضہ کرکے اپنی خودمختاری کا اعلان کیا۔ حجاج کو جب علافیوں کی اس شرارت و سنگدلی کا حال معلوم ہوا تو اُس نے علافیوں کے ایک رشتہ دار سلیمان علافی کو جو عراق میں موجود اور اپنے قبیلے کا سردار تھا گرفتار کراکر قتل کیا اور اُس کا سر سعید بن اسلم کے اہل و عیال کے پاس بھجوادیا کہ وہ اُس کو دیکھکر تسکین حاصل کرلیں۔ اس کے بعد حجاج نے عبدالرحمٰن بن عشا کو علافیوں کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا علافیوں نے عبدالرحمٰن بن عشا کو بھی شکست دے کر قتل کردیا۔ اس کے بعد حجاج نے مجاعہ بن سعید

تیمی کو خراسان کی سند گورنری دے کر بھیجا اور علافیوں کے فتنہ کو مٹانے کی تاکید کی۔ مجاعہ بن سعید کے آنے پر علافیوں یعنی محمد و معاویہ نے پہاڑوں میں پناہ لی...... ......اور کسی میدان میں جم کر مقابلہ کرنا مناسب نہ سمجھا مجاعہ بن سعید ایک سال کے بعد فوت ہو گیا۔

راجہ داہر اور باغیوں کی حمایت

مجاعہ کے بعد حجاج نے محمد بن ہارون کو مکران اور سرحد ہند کا حاکم اور مختار کل بنا کر بھیجا کہ جس طرح چاہے علافیوں کو گرفتار کر کے سعید بن اسلم کے خون کا انتقام لے۔ محمد بن ہارون نے آتے ہی علافیوں کا تعاقب شروع کیا اور پانچ سال تک پہاڑوں اور صحراؤں میں علافیوں کے متعاقب سرگرداں رہا آخر معاویہ بن حرث علافی گرفتار ہو کر قتل ہوا اور محمد بن ہارون نے اُس کا سر حجاج کے پاس بھیج کر خط لکھا کہ میں محمد بن حرث علافی کو بھی ضرور گرفتار و قتل کروں گا۔ مگر محمد بن حرث علافی پانچ سو آدمیوں کی جمعیت لئے ہوئے حدود سلطنت اسلامیہ سے نکل کر راجہ داہر کے پاس ۸۵ھ میں چلا آیا۔ راجہ داہر جو مسلمانوں کی اس خانہ جنگی کو بڑے اطمینان سے دیکھ رہا تھا محمد علافی کے آنے سے بہت خوش ہوا اور بڑے عزو احترام کے ساتھ اُس کو اور اُس کی جمعیت کو اپنے یہاں نوکر رکھ لیا۔ جس زمانے میں علافیوں نے جنوبی و مشرقی بلوچستان میں بدامنی پھیلا رکھی تھی اُسی زمانے میں افغانستان و شمالی بلوچستان میں عبدالرحمٰن بن محمد معہ ایک زبردست لشکر کے حجاج کی مخالفت پر آمادہ اور مصروف بغاوت تھا۔ حجاج کے لئے بہت پریشانی کے ایام تھے اور وہ کسی نئی جنگ کے چھیڑنے کو نامناسب سمجھتا تھا مگر اس نے جب محمد بن حرث علافی کے اس طرح بچ کر نکل جانے اور راجہ داہر کی گود میں جا کر بیٹھ جانے کا حال سنا تو خلیفہ عبدالملک بن مروان کی خدمت میں درخواست بھیجی کہ ملک سندھ پر حملہ کرنے کی اجازت دی جائے کیونکہ اس ملک میں سلطنت اسلامیہ کے باغیوں کو نہ صرف پناہ دی جاتی ہے بلکہ اُن کی خوب خاطر مدارات کی جاتی ہے خلیفہ عبدالملک نے اس درخواست کے منظور کرنے اور ایک نئی لڑائی کے شروع کرنے میں تامل کیا۔ ابھی یہ درخواست زیر غور ہی تھی کہ عبدالملک کا انتقال ہو گیا۔ ادھر جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے محمد بن حرث علافی نے اپنی شجاعت و بہادری دکھا کر راجہ داہر کے دارالسلطنت الور کو نہایت

قومی دشمن کے پنجے سے بچا کر وزارت کا عہدہ حاصل کیا اور اُس کا نام سلطنت سندھ کے سکوں میں مسکوک ہوا۔ علافیوں کے اس واقعہ کو اس لئے درج کیا گیا ہے کہ یہ واقعہ بھی سندھ پر مسلمانوں کی حملہ آوری کا ایک نہایت معقول سبب ہو سکتا تھا۔ مگر مسلمانوں کی طرف سے دانستہ یا مجبورانہ جو کچھ بھی سمجھو درگذر اور چشم پوشی ہی کا اظہار ہوا۔ نیز اس واقعہ سے یہ بھی ثبوت بہم پہنچتا ہے کہ محمد بن قاسم کی حملہ آوری سے آٹھ سال پہلے پانچ سو بہادر جنگجو مسلمان سندھ میں آکر آباد ہو چکے تھے اور وہ محمد بن قاسم کی حملہ آوری تک راجہ داہر کی حکومت کے لئے ایک زبردست پشتی بان تھے اور جب اس ملک پر محمد بن قاسم نے حملہ کیا تو اسی علافی لشکر نے اسلامی لشکر کا سب سے زیادہ بہادری کے ساتھ مقابلہ کیا۔

سندھ پر مسلمانوں کے حملے کا اصل سبب

جزیرہ سراندیپ اور علاقہ مالابار میں بکثرت مسلمان آباد تھے لکدیپ اور مالدیپ کے جزیرے بھی مسلمان ہو چکے تھے۔ سراندیپ کا راجہ اس سے پہلے مسلمان ہو چکا تھا۔ مسلمانوں کے ساتھ اُس کا برتاؤ بہت اچھا تھا۔ سلطنتِ اسلامیہ اب چونکہ دنیا کی سب سے بڑی طاقت تھی لہٰذا سراندیپ کے راجہ کو اپنی حفاظت و عافیت کے لئے بھی اس بات کی ضرورت تھی کہ وہ سلطنتِ اسلامیہ سے باقاعدہ تعلق پیدا کرے چنانچہ راجہ نے حجاج بن یوسف ثقفی کی عنایات کو اپنی طرف مبذول کرنے کے لئے آٹھ جہازوں کا ایک بیڑا تیار کیا۔ ان جہازوں میں سراندیپ کے قیمتی تحائف بار کئے گئے۔ سراندیپ کے رہنے والے مسلمانوں اور مسلمان سوداگروں میں سے بعض اشخاص ان جہازوں میں اس لئے سوار ہوئے کہ اپنے وطن پہنچیں اور حج بیت اللہ کی سعادت سے بھی بہرہ ور ہوں۔ بعض عرب سوداگر سراندیپ میں فوت ہو گئے تھے۔ اُن کی بیوہ عورتیں اور یتیم بچے ملک عرب میں واپس جانے کے خواہاں تھے اُن کو بھی ان جہازوں میں سوار کرا دیا گیا۔ حجاج کے لئے یہ بیڑا جو قیمتی ہدایا کے علاوہ حاجیوں، یتیموں اور بیواؤں کو بھی اُن کی منزلِ مقصود تک لا رہا تھا نہایت قیمتی چیز تھا۔ یہ جہاز جب بحرِ عمان میں داخل ہونے لگے تو بادِ مخالف نے ان کو سمندر میں آوارہ و بے قابو کر کے ساحلِ دیبل پر پہنچا دیا۔ دیبل سندھ کا بندرگاہ اور راجہ داہر کے مشہور شہروں میں سے ایک شہر تھا۔ یہاں راجہ کا ایک گورنر اور سپہ سالار

رہا کرتا تھا۔ ان جہازوں کو بندر گاہ میں خوب دھڑی دھڑی کرکے لوٹا گیا۔ مردوں، عورتوں اور بچوں کو گرفتار کرکے جہازوں کو سندھی بیڑے میں شامل کر لیا گیا ان مصیبت زدہ لوگوں میں سے کوئی ایک دو شخص کسی طرح بچ کر نکل بھاگا اور اس نے پہنچ کر جہازوں کے لٹنے۔ عورتوں بچوں اور عازمانِ حج کے گرفتار ہونے کی دل خراش داستان حجاج کو سنائی اور یہ بھی کہا کہ ایک بیوہ عورت پر جب تشدد ہوا تو وہ بے اختیار چلا اُٹھی کہ یا حجاج اغثنی (اے حجاج مجھے بچاؤ) یہ بھی کہا کہ راجہ سراندیپ کے کارندوں نے بھی ہر چند سمجھایا کہ ہمارے راجہ کے جہاز ہیں اور اس نے ہم کو بطریقِ سفارت بھیجا ہے تم درگذر کرو اور ہم کو جانے دو مگر انھوں نے کچھ نہیں سنا اور سب کو گرفتار کر لیا۔ حجاج کو اس حادثہ کی کیفیت سن کر سخت ملال ہوا اور اس نے فوراً راجہ داہر کو ایک خط لکھا کہ

"تمھارے سرداروں نے بے گناہ مردوں، عورتوں اور بچوں کو گرفتار اور جہازوں پر معہ تحائف واموال قبضہ کر لیا ہے۔ جہاز معہ سامان ہمارے پاس بھجوا دیجئے اور بے گناہوں کو آزاد کرکے اپنے سرداروں کو سزا دیجئے"

جب حجاج کے قاصد یہ خط لے کر داہر کے پاس پہنچے تو داہر نے اس معقول اور شرافت آموز خط کا جواب نہایت بے پروائی کے ساتھ یہ دیا کہ جہازوں کے لوٹنے والوں پر ہمارا بس نہیں چلتا تم خود اُن سے آکر اپنے قیدی چھڑالو اور اپنا مال و اسباب لے لو۔ راجہ داہر کے اس جواب کے ساتھ جب اس بات کو بھی ذہن میں رکھا جائے کہ جہازوں کے مسافر قیدی حجاج کا خط پہنچنے سے پہلے دارالسلطنت الور میں پہنچے ہوئے جیل خانہ میں موجود تھے تو راجہ کے اس جواب کی نامعقولیت اور بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ اب ہر شخص بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ مسلمانوں کے لئے حملہ آوری کا استحقاق پیدا ہو گیا تھا یا نہیں۔ اگر اب بھی اسلامی لشکر حملہ آور ہونے میں تامل کرتا اور اپنے قیدیوں کو چھڑانے اور راجہ داہر کو سزا دینے میں تساہل سے کام لیتا تو اس سے بڑھ کر سلطنتِ اسلامیہ کے وقار کو نقصان پہنچانے والی دوسری بات نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ کہنا کہ مسلمان ہندوؤں کو زبردستی مسلمان بنانے کے لئے بلا وجہ حملہ آور ہوئے تھے کس قدر غلط اور جھوٹ ہے۔ اسی جھوٹ اور کذب وافترا کا پردہ چاک کرنے کے لئے یہ تمام کیفیت سنانی پڑی ہے جو تاریخ سندھ معصومی چچ نامہ اور دوسری مختلف تاریخوں سے ماخوذ و ملخص ہے تاریخ فرشتہ کے مختصر الفاظ

یہ ہیں کہ

"حاکم سراندیپ چوں بسلاطین اسلام اعتقاد فراواں داشت از دریا کشتی مملو از تحف و ہدایا و غلامان و کنیزان جہت ولید روانۂ دارالخلافہ ساخت و چوں بحوالی باب عجم رسیدند مردم لوٹک کہ بحکم حاکم دیبل بر روئے دریا متردد بودند سر راہ براں کشتی گرفتہ باہفت کشتی دیگر بتصرف در آوردند و اموال و اشیائے کہ در آنہا بود از خود گرفتہ چند زن مسلمان کہ از سراندیپ روانہ حج بودند آنہارا اسیر ساختند و جمعیکہ از دست آں کفار را شرار توفیق گریختن یافتہ بودند نزد حجاج رفتہ دادخواہ شدند حجاج مکتوبے بحاکم سندھ داہر بن صعصہ نوشتہ نزد محمد ہارون فرستاد تا بدست معتمدان خود نزد داہر فرستد داہر بعد مطالعہ نامہ واطلاع بر مضمون آں در جواب نوشت کہ ایں عمل از قومے بوقوع آمدہ کہ در کمال شوکت و قوت اند بدستیاری سعی دفع آں گروہ پر شکوہ متصور نیست چوں ایں خبر بحجاج رسید از ولید بن عبدالملک رخصت نوا حاصل کردہ بدیل شخصے را باسی صد سوار نزد محمد ہارون فرستاد۔"

ایک تاریخی غلط فہمی کا ازالہ

فرشتہ کے ان الفاظ سے کہ داہر نے جواب میں لکھا کہ "یہ کام ایک ایسی قوم سے وقوع پذیر ہوا ہے جو بہت بڑی قوت و شوکت رکھتی ہے اور کسی کوشش کے ذریعہ اس گروہ کا دفع کرنا ممکن نہیں" لوگوں کو یہ دھوکا لگا ہے کہ داہر کا یہ مطلب تھا کہ بحری ڈاکوؤں نے جہازوں کو لوٹا ہے اور ہم اُن ڈاکوؤں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے حالانکہ فرشتہ کے الفاظ میں داہر کا جواب یہ ہے کہ حاکم دیبل کے حکم سے جن لوگوں نے جہازوں کو لوٹا وہ اس قدر شوکت و قوت رکھتے ہیں کہ تم اُن کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے مدعا یہ کہ ہاں! ہم نے تمہارے آدمیوں کو قید کیا اور تمہارے جہازوں کو لوٹا ہے اور تم ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اسی لئے حجاج کو ولید بن عبدالملک سے لڑائی کی اجازت لینی پڑی۔ فرشتہ سمندر کے طوفان اور باد مخالف کا ذکر نہیں کرتا اور اس لئے اُس نے بندر دیبل کے اندر جہازوں کے لٹنے اور گرفتار ہونے کا ذکر نہیں کیا حالانکہ دوسرے تمام مورخ جہازوں کا طوفان کے سبب بندر دیبل میں آنا بیان کرتے ہیں۔ چونکہ فرشتہ کو اختصار مد نظر تھا اور اُس کو یہ بھی خبر نہ تھی کہ کسی آئندہ زمانہ میں یہ واقعہ اس قدر غور و خوض کا مقام بنے گا

لہذا اس نے غیر ضروری سمجھکر تفصیلات کو ترک کر دیا۔ بحری ڈاکوؤں کو پرتگیزوں کے بحر ہند میں آنے سے پہلے کوئی جانتا ہی نہ تھا نہ بحر عرب میں پہلی صدی ہجری کے اندر کسی بحری ڈاکہ زنی کا کہیں ذکر آتا ہے۔ نہ اس زمانے میں یہ ممکن تھا کہ محض ڈاکو جو کسی سلطنت کے ملازم نہ ہوں اتنا بڑا اور طاقتور جہازوں کا بیڑا لئے ہوئے سمندر میں گھومتے پھریں کہ نہ صرف ایک جہاز بلکہ آٹھ جہازوں کے بیڑے کو بآسانی مغلوب کرسکیں یہ بحری ڈاکوؤں کی کہانی بارھویں صدی عیسوی سے بعد کی ایجاد ہے۔ اگر اس کہانی کو صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تو اس کا کیا جواب ہوسکتا ہے کہ جب محمد بن قاسم نے سندھ کو فتح کیا ہے تو وہ عورتیں اور بچے جو ان جہازوں پر سے قید کئے گئے تھے دارالسلطنت الور کے قیدخانے سے برآمد ہوئے۔

اصلیت یہ تھی کہ راجہ داہر کو سلطنت اسلامیہ کی بغاوتوں سے خصوصی دلچسپی تھی۔۔۔ افغانستان، بلوچستان کے علاقوں میں واقعہ کربلا کے بعد سے ۸۵ھ تک یعنی بیس پچیس سال تک سلطنت اسلامیہ کا رعب و اقتدار محض اس لئے معرض خطر میں رہا کہ خود مسلمان عامل مرکزی حکومت سے باغی ہوتے رہتے راجہ داہر مسلمانوں کی اس خانہ جنگی کو بہ نظر استحسان دیکھتا رہا۔ اگر بات یہیں تک ہوتی تب بھی راجہ داہر خطاوار نہ تھا۔ لیکن اُس نے پیہم باغیوں کو اپنے یہاں پناہ دی اور خارجیوں، زندیقوں اور شاہی مجرموں کو سندھ میں پناہ ملتی رہی چنانچہ ملتان اور الور میں محمد علافی کے آنے سے بھی پہلے بعض باغیانِ حکومت اسلامیہ کے موجود ہونے کا ذکر ابوالفدا و ابن خلدون وغیرہ تاریخوں میں موجود ہے۔ غالباً انھیں باغیوں کی موجودگی کا یہ اثر ہوگا کہ داہر سلطنت اسلامیہ کی طاقت کا صحیح اندازہ نہ کرسکا اور اُس نے خود مسلمانوں کو حملہ آور ہونے کی دعوت دی اور سلطنت ایران کے صوبے مسلمانوں کے قبضے میں نہ دیکھ سکا اور اُن کو خود اپنے قبضہ میں لانے کی کوشش میں مصروف رہا۔ اگر اُس کو مسلمانوں کی طاقت کا صحیح اندازہ ہوتا تو وہ حجاج کے خط کو ایک نہایت موزوں ذریعہ تعارف اور تحریک اتحاد قرار دے کر قیدیوں کو عزت کے ساتھ بھیج دیتا اور معذرت کرکے آئندہ کے لئے تعلقات دوستی قائم کرلیتا۔

سندھ پر حملہ

حجاج کے پاس جب راجہ داہر کا جواب پہنچا جس میں جہازوں کا مال واپس کرنے اور قیدیوں کے چھوڑنے سے انکار اور خود حجاج کو

مقابلہ پر بلانے کا چیلنج موجود تھا تو حجاج نے عبداللہ بن نابہان اسلمی کو ایک مختصر فوج دے کر روانہ کیا کہ جا کر دیبل پر قبضہ کرے۔

عبداللہ اسلمی ابھی دیبل تک نہیں پہنچا تھا کہ راستے ہی میں داہر کے بیٹے کیشب (بجے سیہ) نے جنوبی بلوچستان میں پیش قدمی کر کے اُس کا مقابلہ کیا اور عبداللہ اسلمی اس لڑائی میں شہید اور اُس کی فوج شکست یاب ہوئی۔ اس ناکامی کا حال جب حجاج کو معلوم ہوا تو اُس نے بُدیل بجلی کو چار ہزار فوج دے کر روانہ کیا اور محمد ہارون عامل مکران کو لکھا کہ حسب ضرورت بُدیل کی مدد کرے۔ بُدیل اپنا لشکر لئے ہوئے ابھی دیبل نہیں پہنچا تھا کہ کیشب ابن داہر ایک زبردست فوج اور جنگی ہاتھیوں کا بہت بڑا حلقہ لئے ہوئے سدراہ ہوا۔ طرفین نے خوب خوب دادِ مردانگی دی اور صبح سے شام تک معرکۂ کارزار گرم رہا آخر ہاتھیوں کے حملہ سے بدیل کا گھوڑا ایسا بھڑکا کہ بُدیل گھوڑے سے گرا مگر وہ پیدل ہی لڑتا رہا یہاں تک کہ دشمنوں کے نرغہ میں آکر شہید ہوا اور اسلامی لشکر کے اکثر حصے نے بُدیل کے ساتھ جامِ شہادت نوش کیا۔ چند بقیۃ السیف نے جا کر حجاج کو اس شکست اور اسلامی لشکر کی تباہی کا حال سُنایا۔ اب حجاج کی آنکھیں کھلیں اور اُس نے سمجھا کہ سندھ کا راجہ مقابلہ کی کافی تیاری کر چکا ہے اور اس کا تدارک خصوصی اہتمام اور خلیفہ کی دوبارہ منظوری کا محتاج ہے چنانچہ اُس نے ولید بن عبدالملک کی خدمت میں پھر ایک درخواست بھیجی اور ملک سندھ پر چڑھائی کر کے اُس کے فتح کر لینے کی اجازت چاہی خلیفہ نے اس درخواست کو بہت تامل کے بعد اُس وقت منظور کیا جب کہ حجاج نے اس مہم کے لئے اپنی ذات پر بہت سی ذمہ داریاں عاید کیں۔ عبداللہ اسلمی اور بدیل کے مقتول ہونے کا حال سُن کر شہر نیرون (ملک سندھ) کے امراء نے جو سب بدھ مذہب کے پیرو تھے آپس میں مشورہ کیا کہ راجہ داہر نے مسلمانوں سے جنگ چھیڑ کر بڑی غلطی کی ہے۔ اگرچہ ان ابتدائی معرکوں میں راجہ کی فوج کو فتح حاصل ہوئی ہے لیکن اب مسلمان اپنے مقتولوں کا عوض لئے بغیر ہرگز باز نہ آئیں گے اور وہ ضرور ملک سندھ پر حملہ آور ہو کر اس کو فتح کر لیں گے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم مسلمانوں کی اس حملہ آوری سے پہلے ہی اپنے لئے امان طلب کر لیں ورنہ اندیشہ ہے کہ کہیں چنوں کے ساتھ گھُن نہ پس جائے چنانچہ اہل نیرون نے خفیہ طور پر اپنا ایلچی حجاج کی خدمت میں روانہ کر کے درخواست

کی کہ ہم اپنے اوپر آپ کی مال گذاری تسلیم کرتے ہیں جو بلاچون وچرا ادا کی جائے گی آپ ہم کو امان نامہ لکھدیجئے۔ حجاج نے فوراً امان نامہ لکھکر ایلچی کے سپرد کیا اور اہل نیرون اس سے بہت مطمئن ہو گئے۔

محمد بن قاسم کی سندھ کی جانب روانگی

حجاج نے جب ملک سندھ پر حملہ کی تیاری کرنا چاہی تو سب سے پہلے عامر بن عبداللہ نے اپنے آپ کو پیش کیا کہ مجھے اس مہم کا سردار بنایا جائے مگر حجاج نے اپنے داماد محمد بن قاسم بن محمد بن حکم بن ابی عقیل ثقفی کو جو فارس کا گورنر اور صرف سترہ سال کی عمر کا نوجوان تھا انتخاب کیا۔ محمد بن قاسم شیراز میں مقیم اور فارس کی فرماں روائی میں بڑی قابلیت اور دانائی کا اظہار کرچکا تھا۔ حجاج نے محمد بن قاسم کو شیراز سے اپنے پاس طلب کرکے مناسب ہدایات کیں عراقیوں کے مقابلے میں چونکہ شامیوں پر زیادہ اعتماد تھا اس لئے ملک شام کے چھ ہزار شریف وتجربہ کار اور بہادر سپاہی جنھوں نے ملک حجاز سے آکر شام میں سکونت اختیار کرلی تھی محمد بن قاسم کے ساتھ کئے۔ یہ تمام وہ لوگ تھے جن کی نسبت حجاج کو یقین تھا کہ یہ ہمیشہ اپنے سردار کے وفادار وخیرخواہ رہیں گے اور کسی موقعہ پر بھی بزدلی یا پست ہمتی کا اظہار نہ کریں گے نہ کبھی اپنے سردار کی نافرمانی کا خیال دل میں لائیں گے۔ یہ چھ ہزار سوار بمنزلہ شاہی معتمد رسالہ کے تھے۔

حجاج نے محمد بن قاسم کو حکم دیا کہ تم ان چھ ہزار سواروں کو لے کر شیراز میں پہنچو اور میری ہدایات اور باقی فوج کا انتظار کرو چنانچہ محمد بن قاسم شیراز پہنچا حجاج نے چھ ہزار عراقی فوج جو شتر سوار تھی عقب سے بھیجی تین ہزار اونٹ باربرداری کے لئے الگ روانہ کئے اس طرح بارہ ہزار ایسی شتری سوار اور تین ہزار باربرداری کے اونٹ تھے یعنی ہر چار سپاہیوں کا سامان ایک ایک اونٹ پر لدا ہوا تھا۔ تمام سامان یہاں تک کہ سوئی تاگا تک بھی سپاہیوں کے لئے مہیا کر دیا گیا تھا تاکہ کسی چیز کی اُن کو سفر میں تکلیف نہ ہو۔ محمد بن قاسم کو حجاج نے حکم دیا تھا کہ روزانہ اپنے اور تمام لشکر کے حالات میرے پاس لکھکر بھیجتے رہو اور میرے احکام جو تمھارے پاس برابر پہنچتے رہیں گے اُن کی پوری پوری تعمیل کرو۔ یہ لشکر شیراز سے روانہ ہوکر مکران پہنچا تو محمد بن ہارون عامل مکران نے محمد بن قاسم کا استقبال کیا اور اپنی تین ہزار فوج لے کر محمد بن قاسم کے ہمراہ ہوگیا۔ مکران سے چل کر یہ لشکر جب ارمن بیلہ

میں پہنچا تو یہاں راجہ داہر کا لشکر موجود تھا جو شکست کھا کر فرار ہوا۔ اسی جگہ یعنی ارمن بیلہ یا ارمابیل میں محمد بن ہارون فوت ہو گیا۔ محمد بن قاسم اُدھر شیراز سے فوج لے کر روانہ ہوا ادھر حجاج نے بصرہ سے حزم بن مغیرہ کی سرکردگی میں جہازوں کا ایک بیڑا روانہ کیا جس میں سامان رسد کے علاوہ قلعہ کشائی کے آلات اور منجنیقیں بھی تھیں ان میں ایک منجنیق جس کا نام عروسک تھا سب سے بڑی تھی جس کو پانچ سو آدمی کھینچتے تھے اس منجنیق کو چلانے والا استاد جعونہ نامی ایک شامی تھا جو بڑا قادر انداز تھا۔ محمد بن قاسم جب دیبل پہنچا تو یہ بیڑا بھی دیبل پہنچ گیا اور اس سے لشکر اسلام کو بڑی قوت حاصل ہوئی۔

دیبل کی فتح

اسلامی لشکر نے آتے ہی دیبل کا محاصرہ کیا آٹھ دن تک میدانِ کارزار گرم رہا اور داہر کے بیٹے کیشب نے جس کو اسلامی تاریخوں میں جیسیہ کے نام سے یاد کیا گیا ہے محصور ہو کر بڑی بہادری سے مقابلہ کیا۔ دیبل شہر کے وسط میں ایک بہت بڑا مندر تھا اُس کے اندر بدھ کی مورت براجمان تھی مندر کا گنبد بہت بڑا اور بلند تھا جو دور دور سے نظر آتا تھا اس گنبد کی چوٹی پہ ایک بہت لمبے بانس میں پھریرا آویزاں تھا۔ اس عَلَم کی نسبت شہر والوں کا اعتقاد تھا کہ جب تک یہ ہوا میں لہرا رہا ہے شہر کو کوئی فوج فتح نہیں کر سکتی شہر والوں کے اس عقیدے کا حال محمد بن قاسم کو معلوم ہوا تو اُس نے جعونہ منجنیقی کو بلا کر حکم دیا کہ اس جھنڈے کو نشانہ بناؤ جعونہ نے منجنیق میں پتھر رکھکر اس خوبی کے ساتھ پھینکا کہ پہلے ہی پتھر میں وہ جھنڈا ٹوٹ کر نیچے گر پڑا۔ اس کا شہر والوں اور خود اُن کے سپہ سالار جے سیہ پر یہ اثر ہوا کہ سب نے ہمت ہار دی جے سیہ چار ہزار فوج لے کر راتوں رات شہر سے نکل بھاگا اور کچھ فوج شہر کی حفاظت اور مدافعت کے لئے چھوڑ گیا جو برابر مصروف مدافعت اور مشغول جنگ رہی۔ آخر مسلمانوں نے بزور شمشیر دیبل کو فتح کر لیا۔

سب سے پہلے جو شخص فصیل شہر پر چڑھا وہ خزیمہ کوفی اور اُس کے بعد دوسرا شخص عجل بن عبد الملک بصری تھا۔ جو شخص ہتھیار بند برسر مقابلہ تھے گرفتار کر کے محمد بن قاسم کے سامنے لائے گئے۔ عام باشندگان شہر کے لئے معافی اور امن و امان کا اعلان ہوا۔ دیبل کے جیل خانہ کا محافظ بھی گرفتار ہو کر محمد بن قاسم کے روبرو آیا اُس نے ترجمان کے ذریعہ اپنی بے گناہی اور مسلمانوں کی خیر خواہی کا ثبوت اس طرح پیش کیا کہ دیبل کی

فوج کے جو لوگ سندھی فوج نے گرفتار کیے تھے وہ دیبل کے جیل خانہ میں میرے زیر نگرانی رکھے گئے تھے میں نے ان مسلمان قیدیوں کے ساتھ بہت ہی اچھا سلوک کیا اور روزانہ اُن کو تمھاری فتوحات اور آمد کی خبریں سُنا سُنا کر مسرور کرتا رہا اور اب جب کہ جے سیہ یہاں سے چلا گیا اور آپ نے فصیل شہر پر قبضہ کیا تو میں نے اُن کو جیل خانہ سے رہا کر دیا جو سب کے سب وہاں سے نکلتے ہی آپ کے لشکر میں شامل ہو گئے آپ ان تمام باتوں کو اُن سے تصدیق فرما سکتے ہیں۔ محمد بن قاسم نے اُن کو بُلا کر تصدیق چاہی تو اُنھوں نے کہا کہ یہ ایک بہت بڑا پنڈت اور اپنے مذہب کا عالم فاضل شخص معلوم ہوتا ہے اُس نے ہمارے ساتھ بڑی مہربانی کا برتاؤ کیا ہے اور یہ اسلام کا دل سے معتقد ہو چکا ہے محمد بن قاسم نے اُس پنڈت کا بہت شکریہ ادا کیا اور اُس حسن سلوک کے عوض اُس کو شہر دیبل کا حاکم اعلیٰ مقرر کر کے حمید بن ذراع کو اُس کی ماتحتی میں دیبل کا شحنہ یا پولیس افسر مقرر کیا۔ غیر معافی لوگ اور اُن کی جائداد و اموال بالکل محفوظ رہے۔ سامانِ جنگ شاہی اموال و خزائن جو دیبل میں موجود تھے وہ فاتحین کے قبضے میں آئے۔

ان اموال کا پانچواں حصہ حجاج کے پاس روانہ کیا گیا باقی فوج میں تقسیم ہوئے۔ دیبل کے مفتوح ہونے کا حال سُن کر راجہ داہر نے محمد بن قاسم کو ایک خط لکھا جس میں اُس کو اپنی قوت وشوکت سے ڈرایا گیا تھا کہ تم اس فتح پہ مغرور نہ ہو جانا ہم تمھارا تسمہ بھی لگا نہ چھوڑیں گے اور اچھی طرح اس گستاخی کا مزا چکھائیں گے۔ محمد بن قاسم نے اس خط کے جواب میں لکھا کہ۔

"ہم نے آپ پر آپ کی اس بداعمالی کے سبب چڑھائی کی ہے کہ آپ نے سراندیپ کے جہازوں کا مال جو خلیفہ کے لیے جاتا تھا لوٹ لیا اور بے گناہ مسلمانوں کو پکڑ کر قید کیا۔ عورتوں بچوں کو لونڈی غلام بنایا ہمارے خلیفہ کے فرمان کا ادب ساری دنیا کرتی ہے مگر آپ نے اس کا کچھ بھی پاس نہ کیا مجھکو خلیفہ نے حکم دیا ہے کہ آپ کو اس گستاخی و بداعمالی کی سزا دوں۔ آپ نے جو اپنی شوکت و قوت کی نسبت لکھا ہے اُس سے اطلاع حاصل ہوئی مگر ہم لوگ خدا پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم"

محمد بن قاسم کے اس جواب میں حملہ آوری کی وجہ صاف طور پہ مذکور ہے اس لئے ہم کو اب زیادہ تلاش و جستجو میں رہنے کی ضرورت نہیں۔

مسلمانوں نے سندھ کو کس طرح فتح کیا

دیبل کی فتح اور انتظام سے فارغ ہو کر محمد بن قاسم نیرون کی جانب گیا اس شہر کے امراء نے پہلے ہی حجاج سے امان طلب کرلی تھی چنانچہ یہ لوگ مناسب تحف و ہدایا اور سامان رسد لے کر اپنے شہر سے چلے اور راستے میں لشکر اسلام سے مل کر محمد بن قاسم کی خدمت میں حاضر ہوئے سامان رسد اور تحف و ہدایا پیش کئے اور نہایت تعظیم و تکریم کے ساتھ محمد بن قاسم کو اپنے شہر میں لے گئے۔ محمد بن قاسم نے بھی ان لوگوں کے ساتھ نہایت محبت و اخلاق کا برتاؤ کیا اور کسی قسم کا نقصان اس شہر کو نہیں پہنچا۔

یہاں سے محمد بن قاسم بہروچ کی طرف روانہ ہوا وہاں راجہ داہر کے بھتیجے نے قلعہ بند ہو کر سات روز تک مقابلہ کیا۔ آخر ایک روز رات کو موقع پاکر فرار ہوا اور شہر کو مسلمانوں نے فتح کرلیا اس کے بعد جاٹوں کے ایک لشکر نے اسلامی فوج پر شبخون مارنے کی کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہ ہوئے بہت سے جاٹ گرفتار ہوکر آئے محمد بن قاسم نے اُن کو نصیحت کرکے رہا کردیا اور کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچایا۔ ان لوگوں نے جب مسلمانوں کو اس قدر رحم دل اور بُردبار دیکھا تو اُن کے دل پہ اسلامی اخلاق کا بہت ہی گہرا اثر ہوا اور یہی عفو و درگذر کا سلوک تھا جس نے جاٹوں کو اس بات پر آمادہ کردیا کہ وہ بخوشی دین اسلام قبول کرلیں۔

سیوستان پر قبضہ

سیوستان میں راجہ داہر کا بھتیجا بجھرا (بجے رائے) حکمراں تھا جب محمد بن قاسم نے اُس طرف کا عزم کیا تو وہ مقابلہ پر آمادہ ہوا لیکن باشندگان شہر نے جن میں بُدھ مذہب کے بڑے بڑے عالم بھی تھے ایک جلسہ کرکے یہ طے کیا کہ چونکہ مسلمانوں سے جو شخص امان طلب کرتا ہے وہ اُس کو امان دیتے اور اپنے وعدوں کو ضرور پورا کرتے ہیں اس لیے ان سے لڑنا اور جنگ کرنا مفید نہیں ہے چنانچہ اُنھوں نے بجے رائے کی خدمت میں عرض کیا کہ مسلمانوں کا مقابلہ نہ کیجئے اور صلح و آشتی سے کام لیجئے مسلمان درخواست صلح کو رد نہیں کرتے

اور کسی کے مذہب میں دخل نہیں دیتے لہٰذا کشت و خون کا ہنگامہ برپا کرنا فضول ہے مگر بجے رائے نے اُن کی بات کو نہ مانا اور فوج آراستہ کرکے مقابلہ پر آڈٹا کئی روز تک لڑائی جاری رہی ایک روز بجے رائے نے اپنا ایک جاسوس مسلمانوں کے لشکر میں بھیجا اس جاسوس نے مسلمانوں کو نماز باجماعت پڑھتے ہوئے دیکھا اور جاکر کہا کہ یہ لوگ اس قدر متحد و متفق ہیں کہ اُن کا مغلوب کرنا سخت دشوار ہے ۔ بجے رائے مرعوب ہو کر رات ہی کو سیوستان سے فرار ہو گیا اور مسلمانوں کا سیوستان پر قبضہ ہوا۔ محمد بن قاسم نے یہاں کے باشندوں کو بھی کوئی نقصان نہیں پہنچایا اور یہاں کے پنڈتوں کو انعام واکرام سے بہرہ ور کرکے ملک کے انتظامی عہدوں پر مامور کیا۔

فتح سیوستان کے بعد اسلامی لشکر مقام بدھیہ کی طرف بڑھا یہاں کا حاکم کاکا نامی بڑا بہادر اور سیاست داں تھا اس کے پاس جاٹوں کی ایک زبردست فوج تھی اس فوج کے سپہ سالار کا نام بہمن تھا۔ کاکا کو مسلمانوں کی فتوحات اور اُن کے اخلاق و عادات کا بخوبی علم تھا ۔ اُس نے ایک مجلس مشورت منعقد کرکے کہا کہ مسلمان ہندوستان کو ضرور فتح کرلیں گے جیسا کہ میں نے پرانے نوشتوں میں بزرگوں کی پیش گوئیاں دیکھی ہیں ۔ ان کا مقابلہ کرنا خطرات سے خالی نہیں تم کو معلوم ہے کہ میری بہادری اور جنگ جوئی مسلمہ ہے میں بہت سے بڑے بڑے معرکوں میں ناموری حاصل کر چکا ہوں میری رائے یہ ہے کہ ہم کھلے میدان اور دن کی روشنی میں اُن کا مقابلہ نہ کریں بلکہ اُن پر شبخون ماریں اسی طرح کامیابی کی اُمید کی جا سکتی ہے چنانچہ نہایت تجربہ کار اور بہادر جاٹ انتخاب کرکے ایک ہزار کا لشکر شبخون مارنے پر متعین کیا گیا یہ لشکر راستہ بھول جانے کی وجہ سے اسلامی لشکرگاہ تک نہ پہنچ سکا اور صبح تک ریگستان میں آوارہ رہا۔ اس ناکامی کو دیکھکر اگلے دن کاکا معہ اپنے سواروں اور امیروں کے لشکر اسلام کی طرف روانہ ہوا راستہ میں بنانہ بن خنظلہ سے جو اسلامی لشکر کے مقدمۃ الجیش کا سردار تھا ملاقات ہوئی کاکا کی خواہش پر بنانہ کاکا کو محمد بن قاسم کے پاس لے گیا محمد بن قاسم بڑی عزت کے ساتھ کاکا سے ملا۔ اُس نے شبخون کا حال سُنا کر کہا کہ اب میں آپ کی فرماں برداری کا اقرار کرتا ہوں ۔

کاکا کو امیر ہند کا خطاب

محمد بن قاسم نے کاکا کو "امیر ہند" کہکر مخاطب کیا اور کہا کہ تمھارے یہاں خلعت کا کیا دستور ہے اُس نے کہا کہ ہم لوگ قوم کے

جاٹ اور بُدھ مذہب کے پیرو ہیں ہمارے یہاں کا دستور ہے کہ جب راجہ کسی شخص کو معزز قرار دیتا ہے تو اُس کو سرِ دربار ریشمین لباس پہنا کر اور سر پر پگڑی باندھ کر کرسی پر بٹھایا جاتا ہے محمد بن قاسم نے اسی طرح کاکا کو خلعت پہنا کر کرسی پر بٹھایا اور اُس کی عزت کو بڑھایا اس کے بعد کاکا محمد بن قاسم کے ہمراہ بطورِ مشیر و مصاحب رہنے لگا۔ محمد بن قاسم نے انتظام ملک اور امورِ مہمہ میں کاکا کے مشورہ کو ضروری خیال کیا کاکا کو اسلامی لشکر کے ایک حصہ کی سپہ سالاری بھی عطا کی گئی کاکا کی تحریک سے بہت سے جاٹ اسلامی لشکر میں بھرتی ہو گئے کاکا کے بعد اور بھی چھوٹے چھوٹے رئیسوں نے اطاعت قبول کی اور محمد بن قاسم نے کاکا ہی کے مشورہ سے اُن پر زرِ خراج مقرر کیا۔ اس طرح محمد بن قاسم دریائے سندھ کے مغربی کنارے کا تمام ملک فتح کرتا ہوا شمال کی جانب دور تک چلا گیا۔

بجے راے نے قلعہ سیسم پر اپنی پوری طاقت کے ساتھ محمد بن قاسم کا مقابلہ کیا اور لڑائی میں مسلمانوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔ ابھی چونکہ راجہ داہر کا مقابلہ باقی تھا لہٰذا بجے راے سے فارغ ہو کر محمد بن قاسم جنوب کی جانب واپس ہوا اور مقام نیرون میں آ کر قیام کیا جس قدر علاقہ فتح کر چکا تھا اُس کا بخوبی بندوبست کر دیا۔

سندھ میں پہلی مسجد نیرون میں مسلمانوں کے لئے ایک مسجد بنوائی اور باشندگانِ سندھ نے اسلام سے واقف ہو کر بخوشی اسلام میں داخل ہونا شروع کیا۔ ان نو مسلموں میں جاٹوں کی تعداد سب سے زیادہ تھی محمد بن قاسم کے پاس حجاج کا خط پہنچا کہ اب دریا کو عبور کرو اور راجہ داہر سے فیصلہ کُن جنگ کرنے اور بے گناہ مظلوم مسلمانوں کا انتقام لینے میں پس و پیش اور تامل نہ کرو چنانچہ محمد بن قاسم نیرون سے لشکر لے کر چلا دریا کے کنارے ایک ہندو سپہ سالار موکا پسر بسایا اور اُس کے بھائی راسل پسر بسایا نے مقابلہ کیا۔ اسلامی لشکر کو فتح حاصل ہوئی۔

راسل تو دریا کو عبور کر کے داہر کے پاس چلا گیا مگر موکا معہ تین سرداروں کے محمد بن قاسم کے پاس چلا آیا۔ محمد بن قاسم نے اُس کی خوب خاطر مدارات کی اور جس حصہ ملک پر وہ حاکم تھا اُس کی سندِ حکومت لکھ کر اُس کو دے دی اور کاکا کی طرح موکا کو بھی خلعت عطا کر کے بہت سا نقد انعام بھی اپنے پاس سے دیا۔

مولانا اسلامی

اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ دیبل کو فتح کرنے کے بعد محمد بن قاسم نے وہاں کا حاکم اعلیٰ ایک پنڈت کو مقرر کیا تھا۔ اس پنڈت نے اگرچہ شروع ہی سے اپنے آپ کو مسلمانوں کا ہمدرد ثابت کیا تھا۔ اب اسلام سے کما حقہ واقف ہوئے اور مسلمانوں کی بلند حوصلگی کا معائنہ کرنے کے بعد اُس نے نیرون میں آکر محمد بن قاسم کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا اور مولائے اسلام یا مولانا اسلامی کا خطاب پایا محمد بن قاسم نے مولانا اسلامی کو سفارت کے لئے منتخب کیا اور اُن کے ہمراہ ایک شامی سردار کو بھی راجہ داہر کے پاس روانہ کیا۔ یہ سفارت جب راجہ داہر کے دربار میں پہنچی تو داہر نے شامی سے تو کچھ نہ کہا مگر مولانا اسلامی سے کہا کہ تو نے قدیمی دستور کے موافق مجھ کو سلام کیوں نہیں کیا مولانا اسلامی نے کہا کہ میں اب مسلمان ہو چکا ہوں ہم مسلمان نہ غیر اللہ کے سامنے جھکتے ہیں نہ کافروں کو سلام کرنا ضروری سمجھتے ہیں داہر نے کہا اگر تو ایلچی بن کر نہ آیا ہوتا تو میں تجھ کو ابھی قتل کرا دیتا مولانا اسلامی نے کہا کہ اگر تو مجھ کو قتل کرتا تو مسلمان تجھ سے ضرور میرے خون کا بدلہ لیتے آخر اس سفارت نے محمد بن قاسم کا پیغام سنایا کہ یا تو تم اپنا لشکر لے کر دریا کے اس طرف آجاؤ یا ہم کو اجازت دو کہ ہم دریا کے اُس طرف عبور کر آئیں اور تم سے نبرد آزما ہوں۔

اس پیغام کو سن کر راجہ داہر نے وزیر سی ساگر سے مشورہ کیا۔ سی ساگر نے کہا کہ مسلمانوں کو دریا کے اس طرف اُتر آنے دو اُن کی پشت پر دریا اور سامنے ہمارا لشکر ہوگا اس طرح سب کے سب مارے جائیں گے اور فرار ہو کر جان بچانے کا موقع نہ پاسکیں گے۔ راجہ داہر نے سی ساگر کے بعد محمد علافی سے مشورہ لیا تو اُس نے کہا کہ سی ساگر نے عربوں کی بہادری کا صحیح اندازہ نہیں کیا اور اس کو شاید یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ ملک سندھ کے تمام باشندے عربوں سے مرعوب و خائف ہو رہے ہیں ایسی حالت میں اگر یہ لوگ دریا کو عبور کر آئے تو تمام ملک میں بددلی پھیل جائے گی اور ان کا مقابلہ سخت دشوار ہوگا کیونکہ یہ لوگ میدانِ جنگ سے فرار ہونا جانتے ہی نہیں اور مرنے کے اس طرح خواہشمند ہیں جیسے کہ دوسرے لوگ زندگی کے باقی رکھنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ مناسب یہ ہے کہ دریا کے تمام گھاٹوں کا فوراً انتظام کر دیا جائے اور ان کو ہرگز دریا کے اس طرف نہ آنے دیا جائے۔ راجہ داہر نے ان دونوں مشوروں کو سننے کے بعد محمد بن قاسم

بے ایلچیوں کو جواب دیا کہ ہم ہر طرح تم سے لڑنے کو تیار ہیں، چاہے تم اس طرف آجاؤ، ہم اُس طرف آجائیں موکا بن بسایا کا علاقہ چونکہ دریا کے اُس طرف تھا اور وہ محمد بن قاسم کا شریک و ہمدرد بن چکا تھا لہذا راجہ داہر نے موکا کے بھائی راسل کو ایک زبردست فوج دے کر دریا کے اُس طرف فوراً بھیج دیا کہ دریا کے متصل قلعوں پر قابض رہ کر مسلمانوں کی فوج کو عبور دریا سے روکے اور اپنے بیٹے جے سیہ کو ایک دوسری زبردست فوج دے کر دریا کے اُس طرف مقرر کیا کہ تمام گھاٹوں پر فوجی دستے مقرر کرکے مسلمانوں کو اس طرف آنے کا موقع نہ دے۔ راسل نے دریا پار ہو کر مسلمانوں سے جنگ شروع کر دی اور داہر نے اپنے ایک اور سردار چندر بن بالا کو بھیج کر سیوستان کو مسلمانوں کے قبضہ سے نکال لیا ان تدبیروں سے راجہ داہر کا مدعا غالباً یہ ہوگا کہ محمد بن قاسم دریا پار ہی لڑائیوں میں مصروف رہے مگر محمد بن قاسم نے مصعب بن عبدالرحمٰن کو تین ہزار فوج دے کر سیوستان کی طرف روانہ کیا اور خود راسل سے مصروف جنگ ہوا۔ مصعب نے چندر کو مقابلہ کرکے قتل کیا اور سیوستان میں پھر اسلامی حکومت قائم کر دی۔ ادھر محمد بن قاسم کے مقابلے میں راسل کو بھی شکست ہوئی مگر وہ دریا کے اُسی کنارے کشتیوں کو تباہ اور عبور دریا کے تمام سامانوں کو برباد کرتا پھرا۔ محمد بن قاسم نے مصعب کو سیوستان سے بلوا لیا اور وہ اپنے ہمراہ نو مسلم جاٹوں کی بھی ایک فوج بھرتی کرکے لایا۔

عبور سندھ اور قتل داہر

محمد بن قاسم نے موکا بن بسایا کو کشتیوں کے فراہم کرنے پر مامور کیا موکا نے بڑی کوشش و تلاش سے کشتیوں کی ایک مناسب تعداد فراہم کی۔ مگر ان کشتیوں پر بیٹھ کر دوسرے کنارے پر پہنچنا کسی طرح ممکن نہ تھا کیونکہ اُس کنارے راجہ داہر کی فوج موجود تھی جو کشتیوں کو کنارے تک پہنچنے سے پہلے ہی غرق کر سکتی تھی۔ آخر یہ تدبیر عمل میں لائی گئی کہ دریا کے مغربی کنارے کے متصل پانی میں کشتیوں کو ایک دوسری سے باندھ کر ایک قطار بنا لی گئی کشتیوں کی یہ قطار اس قدر طویل تھی جس قدر اُس مقام پر دریا کی چوڑائی تھی۔ یہ وہ مقام تھا جہاں دریا کا پاٹ بہت کم اور پانی کی روانی بہت تیز تھی۔ ان کشتیوں کی قطار میں بہادر اور تجربہ کار تیر انداز بٹھا دیئے گئے کشتیوں کی قطار کا نیچے کا سرا یعنی پانی کے بہاؤ کی جانب کا سرا کنارے سے مضبوط باندھ دیا گیا اور اوپر کا سرا چھوڑ دیا گیا کشتی والوں

نے کشتیوں کو دریا کی دھار کی جانب متحرک کیا اور اوپر کا سرا کنارے سے کسی قدر جُدا ہوا پھر پانی کے بہاؤ نے خود بخود اس قطار کو پرکار کے متحرک سرے کی طرح دریا کی چوڑائی میں شرقاً غرباً سیدھا کر دیا اور ایک سرا مرکز کی طرح اپنی جگہ پر قائم رہا کیونکہ وہ بندھا ہوا تھا جوں ہی دوسرا سرا دریا کے مشرقی ساحل تک پہنچا اگلی کشتی کے سپاہیوں نے کنارے پر اُتر کر رسّوں اور میخوں کے ذریعہ اُس کو ساحل سے باندھ دیا اس طرح یکایک کشتیوں کا ایک پُل قائم ہو گیا کشتی نشین سپاہی بڑی تیزی اور چابک دستی کے ساتھ کنارے پر اُترے اُن کے پیچھے تمام فوج اس پُل کے ذریعہ اُترنا شروع ہو گئی۔

دوسرے کنارے پر جو تھوڑی سی فوج جے سیہ کی مقرر کی ہوئی موجود تھی اُس نے مقابلہ کیا مگر بہت جلد شکست کھا کر بھاگی اور تمام اسلامی لشکر معہ سامان دریا کے اُس طرف پہنچ گیا اس عبور میں صرف ایک مسلمان سپاہی دریا میں گر کر شہید ہوا۔ اس کے بعد ہی راجہ داہر کے بیٹے جے سیہ نے ایک زبردست فوج کے ساتھ حملہ کیا مگر شکست کھا کر اور بمشکل اپنے ہاتھی کو میدانِ جنگ سے نکال کر فرار ہوا۔ اور باپ کو جا کر اس لڑائی کا حال سُنایا۔

داہر سے آخری لڑائی

راجہ داہر یہ سنتے ہی تہیۂ جنگ میں مصروف ہوا اور محمد علافی کو بطریق مقدمۃ الجیش ایک مناسب فوج کے ساتھ آگے روانہ کیا۔ محمد علافی کو بھی سخت مقابلہ کے بعد شکست حاصل ہوئی اور اسلامی لشکر آگے بڑھ کر مقام جے واڑی میں مقیم ہوا۔ یہاں راجہ داہر بھی اسلامی لشکر کے سامنے پہنچ کر خیمہ زن ہوا۔ دونوں لشکروں کے درمیان ایک جھیل جس کا نام کولاب کنجری تاریخوں میں لکھا ہے حائل تھی۔ اسلامی لشکر کی تعداد پندرہ ہزار کے قریب تھی داہر کی فوج میں پچیس تیس ہزار زرہ پوش سپاہی دس ہزار نیزہ بردار ... اور ساٹھ جنگی ہاتھی تھے۔ اسلامی لشکر نے جھیل کو عبور کر کے دوسرے کنارے پہنچ کر ہنگامہ پیکار گرم کر دیا۔ محمد بن قاسم نے لڑائی شروع کرنے سے پیشتر کہہ دیا تھا کہ اگر میں مارا جاؤں تو محرز بن ثابت کو میری جگہ سردار لشکر تسلیم کیا جائے اور وہ بھی مارا جائے تو سعید کو سپہ سالار بنایا جائے مگر یہ دونوں بہادر اس لڑائی میں محمد بن قاسم کے سامنے شہید ہوئے تمام

تک لڑائی جاری رہی راجہ داہر کے ہاتھیوں نے اسلامی لشکر کو بہت نقصان پہنچایا۔ رات کی تاریکی نے لڑائی کو ملتوی کیا۔ اگلے دن صبح سے پھر میدان کارزار گرم رہا اور شام تک کوئی فیصلہ جنگ کا نہ ہو سکا۔ تیسرے روز بھی بڑے زور شور کی لڑائی شام تک جاری رہی، شام ہوتے ہوتے لشکر اسلام کو فتح حاصل ہوئی۔ داہر کی فوج بہت سی مقتول اور بقیہ فرار ہوئی مگر راجہ داہر ایک ہزار آدمیوں کے ساتھ میدان میں ڈٹا رہا آخر معرکہ دار و گیر میں ایک عرب سے اس کا مقابلہ ہوا عرب نے تلوار کا ایک ایسا بھرپور ہاتھ مارا کہ سر کے عین وسط میں پڑا اور سر کے دو ٹکڑے کرتا ہوا ناک تک اتر گیا اس طرح روز پنجشنبہ دہم رمضان ۹۳ھ وقت نماز مغرب داہر کے مارے جانے پر یہ ثابت ہو گیا کہ آئندہ سندھ کا ملک مسلمانوں کے زیر حکومت رہے گا۔

داہر کے مارے جانے پر بہت سے برہمنوں۔ ہندوؤں اور فوجی سرداروں نے آکر محمد بن قاسم کی خدمت میں درخواست کی کہ ہم مسلمان ہونا چاہتے ہیں چنانچہ اُن کو اُن کی خوشی کے موافق اسلام میں داخل کیا گیا۔ اگلے دن محمد بن قاسم نے اعلان کرا دیا کہ جو شخص چاہے اسلام قبول کرے اور جو چاہے اپنے آبائی مذہب پر قائم رہے ہماری طرف سے کوئی تعرض نہ ہوگا۔ جو اپنے آبائی مذہب پر قائم رہے گا۔ اُس سے بھی ایک معمولی ٹیکس وصول کیا جائے گا جس کا نام جزیہ ہے اور جو مسلمان ہو جائے گا اُس کو بھی زکوٰۃ ادا کرنی پڑے گی۔ راجہ داہر کا وزیر سی ساگر۔ محمد علافی۔ راجہ کا بیٹا جے سیہ راجہ کی بیوی مائی (جو راجہ کی حقیقی بہن بھی تھی)، راجہ کے عزیز و اقارب اور بقیۃ السیف سردار داہر سب قلعہ روہڑی یا اروڑ میں جمع ہوئے۔ جب راجہ کے مارے جانے کی خبر کی تصدیق ہو گئی تو راجہ کے بیٹے جے سیہ نے ارادہ کیا کہ اب ہم کو بھی میدان میں نکل کر اور لڑ کر مر رہنا چاہیے مگر وزیر سی ساگر نے کہا کہ آپ کی یہ رائے درست نہیں ہے ابھی ملک کا بڑا حصہ ہمارے زیر نگیں ہے قلعہ برہمن آباد میں ہر قسم کا سامان اور خزانہ موجود ہے ملک کے دوسرے قلعوں اور شہروں سے فوج فراہم ہو سکتی ہے ہم کو یہاں سے برہمن آباد کی طرف جا کر وہاں قیام اور مقابلہ کی تیاری کرنا چاہیے۔ وہاں ہم کو ہر قسم کی طاقت حاصل ہو سکے گی۔ جے سیہ نے محمد علافی سے مشورہ کیا تو اُس نے بھی سی ساگر کی رائے کو پسند کیا مگر رانی مائی نے برہمن آباد جانے سے

انکار کیا اور اپنی سہیلیوں کے ساتھ چتا میں بیٹھ کر ستی ہو گئی۔ جے سیہ معہ لشکر وسامان وخزانہ قلعہ راؤر سے برہمن آباد کی طرف روانہ ہوا۔ محمد بن قاسم نے قلعہ راور کو فتح کیا۔ چھ ہزار آدمی جو رانی مائی کے ساتھ اس قلعہ میں رہ گئے تھے انھوں نے مقابلہ کیا اور مقتول ہوئے۔

برہمن آباد کی فتح

برہمن آباد میں پہنچ کر اپنے رشتہ داروں اور سرداروں کو جو ملک کے مختلف شہروں میں برسرِ حکومت تھے داہر کے مارے جانے کی اطلاع دی اور سب کو اپنی مدد اور مقابلہ کی تیاری میں شریک ہونے کے لئے برہمن آباد میں بلا یا۔ ادھر محمد بن قاسم نے اپنے احکام و اعلانات برہمن آباد اور سندھ کے اُن تمام شہروں میں جو ابھی فتح نہیں ہوئے تھے بھجوا دیئے کہ جو شخص اطاعت قبول کرے گا اور پُر امن رہنے کا یقین دلائے گا اُس کی تمام خطائیں معاف کر دی جائیں گی اور کسی قسم کی باز پُرس اُس سے نہ ہوگی۔

وزیر سی ساگر کی ہوشیاری اور مآل اندیشی دیکھو کہ اُس نے اُن عورتوں اور بچوں کو جنھوں نے بندر دیبل پر گرفتار ہوتے وقت یاحجاج اغثنی کہکر پکارا تھا اور جو دارالسلطنت الور میں تھے اپنے زیرِ حفاظت رکھا اور جب قلعہ راور سے جے سیہ کے ہمراہ برہمن آباد آیا تو ان قیدیوں کو بھی اپنے ہمراہ لایا۔ سی ساگر کو اس بات کا یقین ہو چکا تھا کہ مسلمانوں کا مقابلہ اب دشوار ہے۔ اُس نے جب برہمن آباد میں محمد بن قاسم کے اعلان کا حال سُنا تو اپنے بعض معتمد خفیہ طور پر محمد بن قاسم کے پاس بھیجے اور لکھا کہ وہ عورتیں اور بچے جنھوں نے حجاج کی دہائی دیبل بندر پر دی تھی میرے قبضے میں اب تک موجود ہیں اُن کو آپ کی خدمت میں پیش کر دوں گا بشرطیکہ آپ مجھ کو جان کی امان دیں اور کسی قسم کا نقصان نہ پہنچائیں محمد بن قاسم نے فوراً سی ساگر کے نام کا امان نامہ لکھکر اُس کے معتمدوں کو سپرد کر دیا۔ اس کے بعد مسلمانوں نے مقام دہلیلہ کو فتح کیا اور نبہ پسرِ دہارن کو جو یہاں کا رئیس تھا اپنی طرف سے حاکم مقرر کیا پھر برہمن آباد کی طرف لشکرِ اسلام روانہ ہوا جب قریب پہنچا تو وزیر سی ساگر چپکے سے معہ مسلمان قیدیوں کے برہمن آباد سے نکل کر محمد بن قاسم کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ جے سیہ کو جب سی ساگر کے نکل جانے کا حال معلوم ہوا تو اُس نے دوسرے سرداروں

اور امیروں کو چالیس ہزار فوج کے ساتھ برہمن آباد کی حفاظت کا ذمہ دار بنایا اور خود تھوڑی سی فوج لے کر اس لئے شہر سے نکل گیا کہ مسلمانوں پر باہر سے حملہ کرنے کے لئے امدادی فوجیں لے کر آئے گا۔ محمد بن قاسم نے سی ساگر کی آمد کا حال سن کر اس کے استقبال کے لئے امراکو روانہ کیا اور جب وہ سامنے آیا تو اس کو نہایت عزت کے ساتھ اپنی برابر بٹھایا۔ اپنے تمام ارادوں اور رازوں سے اس کو مطلع کیا اور اپنی وزارت کا منصب جلیلہ اس کو عطا کیا اس وزیر باتدبیر نے محمد بن قاسم کے عدل و انصاف اور رحم و کرم کی بہت تعریف کی اور کہا کہ آپ نے باشندگان سندھ کے ساتھ ایسا اچھا سلوک کیا ہے اور مال گذاری و ٹیکس کے معاملے میں اس قدر نرمی اختیار کی ہے کہ تمام ملک آپ کا گرویدہ ہوگیا ہے لہٰذا بہت جلد ملک کے باقی حصے بھی آپ کے قبضے میں آجائیں گے۔

محمد بن قاسم نے برہمن آباد کے مشرق کی جانب نہر جلوالی کے کنارے قیام کیا اور لشکرگاہ کے گرد خندق کھدوا کر برہمن آباد کی تسخیر کے درپے ہوا اول اس نے اپنا ایلچی بھیج کر شہر والوں کو اطاعت قبول کر لینے کی ترغیب دی مگر شہر والوں نے مقابلہ کی تیاری کی یہاں راجہ داہر کی دوسری رانی جس کا نام لاڈی تھا موجود تھی اس نے سرداران لشکر کو معرکہ آرائی کی تاکید کی سلسلۂ جنگ شروع ہوا۔ شہر والے ڈھول بجاتے ہوئے شہر سے نکلتے اور شام تک معرکہ آرا رہ کر قلعہ میں واپس چلے جاتے اور مسلمان اپنی لشکرگاہ میں آکر آرام کرتے اس طرح چھ مہینے تک برہمن آباد نے مقابلہ کیا۔ برہمن آباد کا قلعہ ہندوستان کے قلعوں میں بہت زبردست اور ناقابل تسخیر قلعہ سمجھا جاتا تھا اسی لئے محاصرہ کو اس قدر طول ہوا۔ جے سیہ نے دوسرے شہروں سے امدادی فوجیں حاصل کر کے اسلامی لشکرگاہ پر چھاپے مارنے شروع کئے اور مسلمانوں کی رسد بالکل بند کر دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی لشکر محاصر ہونے کے باوجود محصور کی حالت میں تبدیل ہوگیا محمد بن قاسم نے بنانہ بن حنظلہ کلابی عطیہ ثعلبی صارم بن ابی صارم ہمدانی۔ عبدالملک مدنی سرداران لشکر کو مع اپنے متعلقہ سواروں کے الگ کر کے ایک مخصوص فوج بنائی اور موکا بن بسایا کو اس فوج کا افسر اعلیٰ بنا کر جے سیہ کے مقابلہ اور تعاقب پر مامور کیا۔ جے سیہ کے ساتھ محمد علافی بھی موجود تھا۔ موکا نے اس

شدت سے ان کا تعاقب کیا کہ جے سیہ اور محمد علافی دونوں ایک دوسرے سے جُدا ہو گئے اور دو مختلف سمتوں کو فرار ہونے پر مجبور ہوئے۔ جے سیہ نے راجپوتانہ کے کسی مقام میں جا کر پناہ لی پھر وہاں سے وہ کشمیر کے راجہ کے پاس چلا گیا (کشمیر سے مراد پنجاب کا شمالی حصہ ہے نہ کہ موجودہ ریاست کشمیر) جے سیہ و محمد علافی کو آوارہ کر کے موکا نے سامانِ رسد فراہم کیا اور اس طرح اسلامی لشکر کی مصیبت دور ہوئی۔

برہمن آباد کے باشندوں کی درخواست

چھ مہینے تک محصور رہنے کے بعد برہمن آباد کے باشندوں نے سامانِ رسد کی نایابی سے پریشان ہو کر محمد بن قاسم کے پاس درخواست بھیجی کہ اگر آپ ہم کو جان و مال کی امان دیں تو ہم شہر کا دروازہ کھول دیں۔ یہ درخواست باشندگانِ شہر کی جانب سے تھی فوج اور فوجی سرداروں کی طرف سے نہ تھی لہذا محمد بن قاسم نے کہلا بھجوایا کہ ہم ان تمام لوگوں کو جان و مال کی امان دیتے ہیں جو ہتھیار بند نہ ہوں جو شخص مسلح نظر آئے گا وہ گرفتار کر لیا جائے گا اور جو مقابلہ کرے گا وہ قتل ہو گا۔ شہر والوں نے موقع پا کر دروازہ کھول دیا اور مسلمانوں نے فصیلِ شہر پر چڑھ کر نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ اندرونی فوج نے دوسرا دروازہ کھول کر اُس طرف سے بھاگنا شروع کیا۔ اسلامی فوج نے چاہا کہ ان کا تعاقب کرے اور سب کو روک کر کیفرِ کردار کو پہنچائے مگر محمد بن قاسم نے منع کیا اور کہا کہ جو شخص اپنی جان بچانے کے لئے بھاگتا ہے اُس کو بھاگ جانے دو۔ رانی لادی (راجہ داہر کی دوسری بیوی) نے اپنے محل میں کچھ فوجی سرداروں کو جمع کر کے مقابلہ کیا بالآخر وہ بھی گرفتار ہو کر محمد بن قاسم کے پاس لائی گئی باشندگانِ شہر سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا۔ سوداگر، دکاندار، اور اہلِ حرفہ بدستور اپنے اپنے مشاغل میں مصروف رہے۔ امن و امان کا اعلان کر دیا گیا۔ رانی لادی نے اسلام قبول کر کے محمد بن قاسم سے نکاح کرنا قبول کیا۔

جنگی قیدی جب محمد بن قاسم کے سامنے پیش ہوئے تو اُس نے اُن کو رہا کر دیا اس کے بعد برہمن آباد کے برہمنوں کی ایک بڑی جماعت سر و ریش منڈوائے اور زرد کپڑے پہنے ہوئے محمد بن قاسم کے سامنے آئی۔ اُس نے دریافت کیا کہ تم کس فوج کے سپاہی ہو اور تم نے کیوں ایسی صورت بنائی ہے۔

برہمنوں نے عرض کیا کہ اے امیر عادل ہم سب برہمن اور راجہ داہر کے ہم قوم ہیں تو نے ہمارے راجہ کو قتل کر دیا ہے ہم نے اُس کے ماتم میں زرد لباس پہنا اور سر و ریش منڈوایا ہے ہمارے لئے تیرا کیا حکم ہے محمد بن قاسم نے کہا کہ میں تم سب کو امان دیتا ہوں۔ تم کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچے گا۔ اس کے بعد اعلان کیا گیا کہ جو لوگ امرا کے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اُن سے چودہ تولہ۔ جو دوم درجہ کے خوش حال لوگ ہیں اُن سے سات تولہ اور عوام سے پونے چار تولہ چاندی سالانہ بطور جزیہ وصول کی جائے گی جو اسلام قبول کرے گا وہ اس جزیہ سے معاف کیا جائے گا اُس سے اسلامی قانون کے موافق زکوٰۃ لی جائے گی۔ جو شخص اپنے باپ دادا کے مذہب پر چلے اُس سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا نہ اُن کے مندروں اور عبادت خانوں میں کسی قسم کی مداخلت کی جائے گی۔ نہ زمینیں چھینی جائیں گی نہ مکان و اموال کو کسی قسم کا نقصان پہنچایا جائے گا۔ مالکانِ اراضی بدستور اپنی اپنی زمینوں کے مالک رہیں گے اور زمینوں کی مال گذاری وغیرہ کی وصولی کا انتظام خود باشندگانِ سندھ ہی کے ہاتھوں میں رہے گا وغیرہ۔ اس کے بعد محمد بن قاسم نے شہر کے دروازوں پر اپنے سپاہی مقرر کر دیئے۔ شہر کے سمجھدار اور با اثر لوگوں کی ایک انجمن بنا کر انفصالِ خصومات کا انتظام اُس کے سپرد کیا اور وہاں سے لوہانہ کی طرف روانہ ہوا۔ اور اُس کو فتح کیا۔

الوُر کی فتح محرم ۹۴ھ میں محمد بن قاسم لوہانہ سے روانہ ہو کر مقام سَتھ کی جانب روانہ ہوا یہاں کے لوگوں نے آمد کی خبر سُن کر ننگے سر اور ننگے پاؤں شہر سے نکل کر استقبال کیا اور رحم و عفو کی التجا کی جو منظور ہوئی۔ یہاں سے رہبر ہمراہ لے کر محمد بن قاسم اُلور کی جانب روانہ ہوا۔ اس جگہ یہ بتا دینا ضروری ہے کہ دارالسلطنت الُور میں راجہ داہر نے اپنے چھوٹے بیٹے فیوفی نامی کو حاکم مقرر کر کے لڑائی کے لئے نکلا تھا فیوفی ابھی تک وہاں حکمراں تھا جے سیہ نے اپنے چھوٹے بھائی فیوفی کو برہمن آباد سے روانہ ہوتے وقت لکھا تھا کہ تم فوج کی فراہمی اور لڑائی کی تیاری میں مصروف رہو۔ چنانچہ الُور بھی اسلامی لشکر کا مقابلہ کرنے کے لئے پورے طور پر تیار ہو چکا تھا۔ الُور کے قریب پہنچ کر شہر سے ایک میل کے فاصلہ پر اسلامی لشکر نے قیام کیا۔ الور کے لوگوں کو ابھی تک راجہ داہر کے مارے جانے کا یقین نہ تھا وہ سمجھتے تھے کہ راجہ

داہر میدانِ جنگ سے ہندوستان کی طرف چلا گیا ہے۔ وہاں سے بہت بڑی فوج لے کر آئے گا اور مسلمانوں کا نام ونشان مٹا ڈالے گا۔ بہر حال اب اہلِ الور کو اس بات کا یقین ہوا کہ راجہ داہر ضرور مارا جا چکا ہے۔ شہر والوں نے آپس میں مشورے کرنے شروع کیے کہ مسلمان اپنے وعدے کے بڑے پکے ہیں۔ برہمن آباد والوں کی طرح اگر ہم بھی امان طلب کرلیں تو ہم کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچے گا اور اگر ہم نے لڑائی میں شرکت کی تو ممکن ہے کہ مسلمان پھر جان و مال کی اماں نہ دیں۔ ان چہ میگوئیوں کا حال فیوفی کو معلوم ہوا تو وہ مقابلہ اور معرکہ آرائی سے ہمت ہار بیٹھا۔ اس نے یہی مناسب سمجھا کہ اپنے ہمراہیوں کو لے کر شہر سے نکل جائے چنانچہ وہ راتوں رات شہر سے نکل گیا اور اپنے بھائی جے سیہ کے پاس جو راجپوتانہ کے کسی مقام میں ٹھیرا ہوا تھا پہنچ گیا۔ شہر والوں نے اپنا قاصد محمد بن قاسم کے پاس بھیجا اور عرض کیا کہ ہمارا راجہ داہر مارا جا چکا ہے۔ داہر کا بیٹا فیوفی بھی ہم کو چھوڑ کر شہر سے بھاگ گیا ہے۔ ہم نے آپ کے عدل و انصاف اور رحم دلی کی بڑی تعریف سنی ہے اسی امید پر ہم درخواست پیش کرتے ہیں کہ ہم کو جان و مال کی اماں دی جائے تاکہ ہم آپ کے لئے شہر کے دروازے کھول دیں۔ محمد بن قاسم نے کہا کہ میں نے ہر ایک مقام پر خود لوگوں کو اطاعت قبول کرنے کی ترغیب دے کر یہ وعدہ کیا کہ تم کو جان و مال کی اماں دی جائے گی مگر تم نے چونکہ میرے پیغام سے بھی پہلے اطاعت پر اپنی آمادگی ظاہر کی ہے لہٰذا میں تم کو ہرگز کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اس کے بعد دروازہ کھل گیا اور محمد بن قاسم شہر الور میں داخل ہوا۔

الور کا بت خانہ

شہر میں داخل ہو کر محمد بن قاسم نے دیکھا کہ شہر کے سب سے بڑے بت خانہ میں جس کا نام نَوذ بھار تھا۔ لوگ بت کے آگے سجدے میں پڑے ہوئے ہیں۔ اس نے تعجب کے ساتھ دریافت کیا کہ یہ مکان کس کا ہے۔ جہاں بہت سے آدمی سجدہ کر رہے ہیں۔ اس کو بتایا گیا کہ یہ ایک عظیم الشان بت خانہ ہے اور یہاں یہ لوگ بت کے آگے سجدہ کر رہے ہیں۔ محمد بن قاسم نے اس بت خانہ کے اندر جانے کی خواہش ظاہر کی۔ مندر کا پجاری برہمن بطور رہبر ساتھ ہوا۔ محمد بن قاسم نے اندر داخل ہو کر دیکھا کہ ایک پتھر کی مورت گھوڑے پر سوار ہے۔ اس

مورت کے ہاتھوں میں سونے کے کنگن یاقوت وجواہر سے مرصع پڑے ہوتے ہیں۔ اُس نے مورت کے قریب پہنچ کر ایک کنگن اُتار لیا اور پجاری کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ یہ تمہارا معبود ہے اُس نے کہا "ہاں"۔ محمد بن قاسم نے کہا کہ پہلے اُس کے دونوں ہاتھوں میں کنگن تھے۔ اب ایک ہی ہاتھ میں رہ گیا ہے۔ مگر یہ نہیں جانتا کہ دوسرا کنگن کون لے گیا۔ پجاری نے گردن نیچی کر لی اور محمد بن قاسم نے ہنس کر وہ کنگن پھر اُس کے ہاتھ میں ڈال دیا اور مندر سے نکل آیا۔ اس کے بعد شہر میں عام اعلان کر دیا گیا کہ اس شہر کے باشندے ہر قسم کے ٹیکس اور محصول سے معاف کئے جاتے ہیں۔ یہاں محمد بن قاسم نے رواح بن اسد کو حاکم مقرر کیا اور امورِ شرعی کے لئے موسیٰ بن یعقوب قاضی مقرر ہوا الور کے بہت سے باشندے آ آ کر محمد بن قاسم کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے باقی اپنے آبائی مذہب پر نہایت آزادی کے ساتھ قائم رہے۔

محمد بن قاسم رواح اور موسیٰ کو رعیت پروری کی تاکیدی ہدایات کر کے الور سے قلعہ بابیہ کی طرف روانہ ہوا جو دریائے بیاس کے جنوبی کنارے پر تھا۔ اس قلعہ میں کاکسا بن چندر بن سلائج یعنی راجہ داہر کا چچا زاد بھائی مقیم تھا کاکسا بن چندر میدانِ جنگ میں راجہ داہر کے ساتھ موجود تھا۔ داہر کے مقتول ہونے پر وہ اس قلعہ میں آکر پناہ گزیں ہوا تھا۔ یہ بہت بڑا عالم فاضل اور نہایت عقلمند شخص تھا۔ جب محمد بن قاسم اُس قلعہ کے قریب پہنچا تو کاکسا بلا تامل محمد بن قاسم کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ محمد بن قاسم بڑی عزت اور محبت کے ساتھ پیش آیا۔ اُس کے خاندان اور علم و فضل سے واقف ہو کر محمد بن قاسم نے اُس کو اپنا مصاحب و وزیر و سپہ سالار بنایا اور تمام فوجی سرداروں کو حکم دیا کہ میرے بعد کاکسا تم سب کا افسرِ اعلیٰ ہے۔ ساتھ ہی اُس کو اپنی مُہر اور خزانہ کا چارج بھی سپرد کر دیا اور دربار میں اُس کے لئے اپنے تخت کے برابر کرسی دی اور آئندہ اُس کے مشوروں کو تمام معاملات میں مقدم اور قابلِ عمل سمجھا۔

فتح ملتان سندھ کے مشہور مرکزی مقامات میں سے اب صرف ملتان فتح ہونے سے باقی رہ گیا تھا۔ یہاں سے محمد بن قاسم دریائے بیاس کے پار گیا اسکلندہ پر پہنچ کر لڑائی شروع ہوئی اس قلعہ کا حاکم ملتان کے حاکم کا بھتیجا تھا اُس نے نہایت سختی سے مقابلہ کیا۔ سات روز تک لڑائی کا ہنگامہ برپا رہا۔ آٹھویں روز

تھے تو وہ عرب سے آئے ہوئے تھی۔ پھر مسلمانوں کے اس قدر باوفا اور اپنے بھائیوں کے قتل میں اس قدر چست وچالاک کیسے ہوگئے تھے محمد بن قاسم نے جب ملتان کو فتح کرکے ملک سندھ کی فتوحات کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا ہے تو اُس وقت عراقی وشامی لوگ جو اُس کے ہمراہ تھے وہ یقیناً چار پانچ ہزار سے زیادہ ہرگز نہ ہوں گے کیونکہ ان دو ڈھائی سال کے پیہم معرکوں اور خوں ریز لڑائیوں میں یہ لوگ ضرور شہید ہوتے رہے ہوں گے۔

ابن خلدون کا بیان ہے کہ محمد بن قاسم نے جس قدر نقد وجنس وغیرہ مال سندھ سے خزانۂ خلافت میں روانہ کیا ہے وہ اُس روپیہ کا جو خزانۂ خلافت سے مہم سندھ کے لئے صرف ہوا نصف تھا یعنی اس مہم سے خزانۂ خلافت کو کوئی نفع نہیں پہنچا بلکہ نقصان ہی ہوا۔ دوسرے لفظوں میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ مسلمان جس قدر روپیہ اور مال سندھ میں لے کر آئے تھے وہ واپس نہیں بھیج سکے۔ اگر یہ کہا جائے کہ فوج کے سپاہی خوب مالا مال ہوگئے تھے اور اُن میں سے ہر ایک سپاہی نے خزانے جمع کرلئے تھے تو بھی سندھ سے عراق وشام میں روپیہ کا جانا ثابت نہیں کیا جا سکتا کیونکہ محمد بن قاسم کے ساتھ جو لوگ سندھ میں آئے تھے وہ سب کے سب محمد بن قاسم کے سامنے یا محمد بن قاسم کے بعد ملک سندھ ہی کی خاک میں مدفون ہوئے اُن کا واپس جانا کسی طرح ثابت نہیں۔ لہٰذا مال ودولت کے حصول اور لوٹ مار کے شوق کو بھی فتح سندھ کا سبب ہرگز قرار نہیں دیا جا سکتا۔

فتح سندھ کی تکمیل اور محمد بن قاسم کی معزولی

ملتان کی فتح کے بعد محمد بن قاسم نے پنجاب وکشمیر کی طرف رُخ کیا جہاں خاندان داہر کے کئی شہزادے راجہ کشمیر کے یہاں پناہ گزیں اور اُس راجہ کی مدد سے سندھ کو واپس لینے کی کوششوں میں معروف تھے۔ سندھ کے شمال کی جانب سلطنت کشمیر اور مشرق کی جانب سلطنت مالوہ وقنوج تھی ان سلطنتوں سے سندھ کی سلطنتِ اسلامیہ کے حدود کا تعین اور معاہدات کا ہو جانا ازبس ضروری تھا ورنہ ہر وقت لڑائی کا اندیشہ اور سندھ کی حکومتِ اسلامیہ کا خطرہ میں ہونا یقینی تھا۔ محمد بن قاسم بے حد عقلمند اور مآل اندیش شخص تھا اُس کے مشیر وصلاح کار ملک سندھ کے مسلمہ اہل الرائے

موکا وکاکسا وغیرہ تھے جن کے مشوروں کے بغیر وہ کوئی کام نہ کرتا تھا اُدھر حجاج بن یوسف ثقفی مشہور سیاست داں والسرائے عراق کی ہدایات اُس کے پاس مسلسل پہنچ رہی تھیں لہذا کشمیر و قنوج کی حکومتوں کے ساتھ حدود سلطنت کی تعین پر محمد بن قاسم کا فتح ملتان کے بعد فوراً آمادہ ہوجانا کوئی بعید از قیاس بات نہ تھی۔

محمد بن قاسم خود تو ملتان سے کشمیر[1] کی طرف روانہ ہوا اور ابوحکیم شیبانی کو قنوج کی طرف روانہ کیا۔ راجہ چچ نے اپنی شمالی سرحد پر صنوبر کے چند درخت لگا دیئے تھے اور ان درختوں ہی کو سندھ و کشمیر کی حد فاصل قرار دیا تھا محمد بن قاسم بھی صنوبر کے ان درختوں تک ہی گیا اور یہاں پہنچ کر زید بن عمرو کلابی کو بطور سفیر قنوج کے راجہ ہرچند پسر راجہ جے مل کے پاس بھیجا۔ قنوج کے راجہ نے اس سفارت کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا بلکہ مقابلہ اور مقاتلہ پر آمادگی ظاہر کی لہذا محمد بن قاسم نے کشمیر کی طرف سے واپس ہو کر اور قنوج کے راجہ کا ارادہ معلوم کر کے اتمام حجت کے طور پر پھر ایک خط اپنی طرف سے روانہ کیا۔ یہ سلسلہ خط و کتابت ابھی کوئی نتیجہ پیدا کرنے نہ پایا تھا کہ محمد بن قاسم کی معزولی کا فرمان دربار خلافت سے آگیا اور وہ یزید بن ابی کبشہ کو سندھ کی حکومت کا چارج دے کر عراق و شام کی طرف روانہ ہو گیا۔

حجاج کا انتقال

ملتان کی فتح کے وقت شوال ۹۵ھ میں حجاج کا عراق میں انتقال ہو گیا۔ حجاج نے فوت ہوتے وقت اپنے بیٹے عبداللہ بن حجاج کو اپنی جگہ وائسرائے مقرر کر کے یزید بن ابی کبشہ کو افواج کوفہ و بصرہ کا سپہ سالار اور یزید بن ابی مسلم کو صیغہ مال کا افسر مقرر کر دیا تھا۔ خلیفہ ولید بن عبدالملک کو جب حجاج کی وفات کا حال معلوم ہوا تو اُس نے حجاج کے مقرر کئے ہوئے عہدہ داروں کو بحال رکھا محمد بن قاسم کے پاس بھی ملک سندھ کی سند گورنری بھیج دی۔ محمد بن قاسم کے پاس حجاج کے فوت ہونے کی خبر اور خلیفہ کی طرف سے سندھ کی حکومت کا فرمان ملتان ہی میں پہنچ گیا تھا۔ حجاج کے فوت ہونے کی خبر نے محمد بن قاسم کی اولوالعزمیوں

[1] کشمیر سے مراد موجودہ ملک ... کا شمالی مقام کشمورہ بھی ہوسکتا ہے لیکن اُس زمانہ میں موجودہ مقام کشمورہ کا کسی ریاست یا سلطنت کا سرحدی مقام ہونا قطعاً ثابت نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کو ضرور صدمہ پہنچایا ہوگا۔

حجاج کی وفات کے بعد خلیفہ ولید بن عبدالملک نے ممالکِ مشرقیہ کے تمام گورنروں کے پاس احکام بھیج دیئے تھے کہ اب تم فتوحات اور پیش قدمیوں کو روک کر اپنے آپ کو کسی نئے خطرے میں ہرگز نہ ڈالو مشہور سپہ سالار قتیبہ بن مسلم کے پاس بھی جو چین کی طرف فتوحات حاصل کر رہا تھا اسی قسم کا حکم پہنچا تھا اور وہ آگے بڑھنے سے رُک گیا تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ولید بن عبدالملک اپنے بھائی سلیمان بن عبدالملک کو ولیعہدی سے معزول کر کے اپنے بیٹے کو ولیعہد بنانا چاہتا تھا۔ اس کام میں حجاج اور اُس کے گروہ کے تمام سردار ولید کے طرف دار اور سلیمان کی معزولی کے خواہاں تھے مگر سلیمان کے طرف دار بھی بہت سے سردار اور بااثر علماء تھے اس لئے ولید کو اپنے ارادے کے پورا کرنے میں حجاج کی وفات کے سبب خطرات نظر آنے لگے تھے اور وہ محمد بن قاسم اور قتیبہ وغیرہ ممالک مشرقیہ کے سرداروں کو ضرورت کے وقت کام میں لانے کے لئے فارغ رکھنا ضروری سمجھتا اور جب تک کہ اپنے بھائی سلیمان کو ولیعہدی سے معزول کر کے اپنے بیٹے کو ولیعہد نہ بنائے اُس وقت تک محمد بن قاسم اور حجاج کے گروہ کے تمام سرداروں کو کسی لڑائی میں مصروف ہونے سے باز رکھنا چاہتا تھا۔ مگر حجاج کی وفات سے سات مہینے بعد جمادی الاول ۹۶ھ میں ولید بن عبدالملک فوت ہو گیا اور اُس کی جگہ سلیمان بن عبدالملک تخت نشین ہوا۔

سلیمان بن عبدالملک خوب اچھی طرح جانتا تھا کہ حجاج میرا سب سے بڑا دشمن تھا کیونکہ وہ مجھ کو تخت سے محروم رکھنے کی تدبیروں میں ولید بن عبدالملک کا معاون اور ہم خیال تھا۔ لہٰذا سلیمان نے تخت نشین ہو کر تمام حجاجی سرداروں کو معزول کیا قتیبہ بن مسلم بھی اسی سلسلہ میں قتل ہوا۔ سندھ سے محمد بن قاسم کو بھی معزول کر کے بلوایا۔ عراق کی گورنری پر صالح بن عبدالرحمٰن کو مقرر کیا جو حجاج کا جانی دشمن تھا صالح بن عبدالرحمٰن نے محمد بن قاسم کو واسط کے جیل خانے میں قید کر کے قتل کرا دیا۔

محمد بن قاسم نے اپنی معزولی اور عراق کی جانب روانگی سے پہلے ملتان واپس آ کر مقام کیرج کو جو ابھی تک ملکِ سندھ میں مفتوح ہونے سے باقی رہ گیا تھا فتح کیا۔ یہاں کے راجہ کا نام دودھیر رائے تھا۔ کیرج کو محمد بن قاسم کی آخری فتح سمجھنا چاہئے۔

مسلمانوں نے سندھ پر کیسی حکومت کی

محمد بن قاسم کی بہادری، دانائی اور سلامت روی جس طرح مسلّم اور مشہور آفاق ہے اُسی طرح اُس کی یہ صفت خاص بھی معلوم عوام ہے کہ وہ اپنے محسن و مربّی حجّاج بن یوسف ثقفی کے کسی حکم، کسی مشورے اور کسی ہدایت کی رتی برابر بھی مخالفت نہیں کرتا تھا۔ اور اُس نے اس معاملہ میں حیرت انگیز طور پر احتیاط سے کام لیا تھا۔ اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے اُن ہدایات و نصائح پر نظر ڈالنی چاہیئے جو حجاج نے محمد بن قاسم کے پاس لکھ لکھ کر سندھ میں بھیجیں۔ فتح دیبل کی خوش خبری سُن کر حجاج نے محمد بن قاسم کو لکھا کہ

"جب ملک پر تم قابض ہو جاؤ تو قلعوں کی اُستواری اور لشکر کی رفع احتیاج کے بعد تمام اموال و خزائن کو بہبودِ رعایا اور رفاہِ خلق میں خرچ کرو۔ یاد رکھو کہ کاشتکاروں، کاریگروں، سوداگروں اور پیشہ وروں کی خوش حالی و فارغ البالی سے ملک آباد و سرسبز ہوتا ہے۔ رعایا کے ساتھ ہمیشہ رعایت کرو تاکہ وہ تمھاری طرف محبت کے ساتھ راغب ہوں۔"

محمد بن قاسم جب نیرون میں مقیم تھا تو اس کے پاس حجاج کا خط پہنچا کہ

"اہل نیرون کے ساتھ نہایت نرمی اور دلدہی کا سلوک کرو ان کی بہبودی کے لیے کوشش کرو۔ لڑنے والوں میں جو تم سے امان طلب کرے اُس کو ضرور امان دو۔ کسی مقام کے اکابر و سردار تمھاری ملاقات کو آئیں تو اُن کو قیمتی خلعت اور انعام و اکرام سے سرفراز کرو۔ عقل و دانائی کو اپنا رہبر بناؤ جو وعدہ کسی سے کرو اُس کو ضرور پورا کرو۔ تمھاری قول و فعل پر سندھ والوں کو پورا پورا اعتماد و اطمینان ہو۔"

فتح سیوستان کے بعد حجاج کا خط پہنچا کہ

"جو کوئی تم سے جاگیر و ریاست طلب کرے تم اُس کو نااُمید نہ کرو۔ التجاؤں کو قبول کرو امان و عفو سے رعایا کو مطمئن کرو سلطنت کے چار ارکان ہیں۔ اوّل مدارا اور درگذر و محبت، دوم سخاوت و انعام۔ سوم

دشمنوں کی مزاج شناسی اور اُن کی مخالفت میں عقل کو ہاتھ سے نہ دینا۔ چہارم قوت و شہامت۔ تم راجاؤں سے جو عہد کرو اُس پر قائم رہو۔ جب وہ مال گذاری دینے کا اقرار کریں تو ہر طرح اُن کی اعانت و امداد کرو۔ جب کسی کو سفیر بنا کر بھیجو تو اُس کی عقل و امانت کو جانچ لو اور جو شخص توحید الٰہی کا اقرار اور تمھاری اطاعت کرے اُس کے تمام مال و اسباب اور ننگ و ناموس کو برقرار رکھو لیکن جو اسلام قبول نہ کرے اُس کو صرف اس قدر مجبور کرو کہ وہ تمھارا مطیع ہو جائے۔ جو شخص بغاوت و سرکشی اختیار کرے اُس سے لڑنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ شریف اور رذیل میں امتیاز کرو۔ ایسا کبھی نہ ہو کہ تمھاری صلح جوئی کو دشمن تمھاری کمزوری محسوس کریں"

محمد بن قاسم نے جب دریا کو عبور کر لیا اور داہر کی فوجوں سے مقابلہ شروع ہو گیا تو اُس کے پاس حجاج بن یوسف ثقفی کا خط پہنچا کہ۔

"پنج وقتہ نماز پڑھنے میں سستی نہ ہو۔ تکبیر و تلاوت۔ قیام و قعود اور رکوع و سجود میں خدائے تعالیٰ کے روبرو تضرع و زاری کیا کرو۔ زبان پر ہر وقت ذکر الٰہی جاری رکھو کسی شخص کو شوکت و قوت خدائے تعالیٰ کی مہربانی کے بغیر میسر نہیں ہو سکتی۔ اگر تم خدائے تعالیٰ کے فضل و کرم پر بھروسہ رکھو گے تو یقیناً منظفر و منصور ہو گے"

راجہ داہر کے مارے جانے کا حال محمد بن قاسم نے حجاج کو لکھا تو قاصد حجاج کے پاس سے یہ خط لے کر آیا۔

"تمھارا اہتمام و انتظام اور ہر ایک کام شرع کے موافق ہے۔ مگر ہر خاص و عام کو امان دینے اور دوست و دشمن میں تمیز نہ کرنے سے ایسا نہ ہو کہ کام بگڑ جائے۔ جو رگ بزرگ اور ذی وقعت ہیں اُن کو ضرور امان دو لیکن شہر اور بہ اشخاص کو دیکھ بھال کر آزاد کیا کرو اپنے عہد و پیمان کا ہمیشہ لحاظ رکھو اور امن پسند رعایا کی استمالت کرو"

اس کے بعد برہمن آباد سے محمد بن قاسم نے جو عریضہ بھیجا اس کے جواب میں حجاج نے لکھا کہ

"اے ابن عم محمد بن قاسم تم نے رعیت نوازی اور رفاہِ عام میں جو کوشش کی ہے وہ نہایت تعریف کے قابل ہے۔"

مندروں کی مرمت

برہمن آباد کی فتح کے بعد محمد بن قاسم جب وہاں کا تمام انتظام کر چکا تو بہت سے مندروں کے پجاری اس نوجوان عرب سپہ سالار کے پاس آئے اور کہا کہ اے محمد بن قاسم ہندوؤں نے مسلمان سپاہیوں کے ڈر سے بتوں کی پوجا کے لئے مندروں میں آنا کم کر دیا ہے جس سے ہماری آمدنی میں فرق آ گیا ہے۔ مندروں کی مرمت بھی نہیں ہوئی لڑائی کے ہنگاموں اور محاصرے کے ایام میں منجنیقوں کے پتھروں سے ہمارے بعض مندر کہیں کہیں سے شکستہ ہو گئے ہیں تو اپنے اہتمام سے ہمارے مندروں کو درست کرا اور ہندوؤں کو مجبور کر کہ وہ مندروں میں آ کر بتوں کی پوجا کریں۔ تو نے کاشتکاروں، سوداگروں اور کاریگروں کے حال پر تو بڑی مہربانیاں کی ہیں۔ ہم لوگ جو مندروں کے متولی ہیں، تیری عنایات سے کیوں محروم رہیں۔

محمد بن قاسم نے کہا کہ تمہارے مندروں کا اہتمام تو شہر الور سے متعلق ہے۔ میں کیسے دخل دے سکتا ہوں (الور ابھی فتح نہیں ہوا تھا) برہمنوں نے کہا کہ ان مندروں کے مالک و مہتمم ہم خود ہیں اور اب ہم تیری رعایا بن چکے ہیں۔ تو نے مذہبی آزادی کا اعلان کیا ہے لہٰذا ہمارے مندروں کی تعمیر و مرمت اور ہماری آمدنی کے نقصان کی تلافی تجھ کو کرنی پڑے گی۔ محمد بن قاسم اس معاملے میں اپنی رائے سے کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ اس نے فوراً حجاج کے پاس ایلچی روانہ کیا اور برہمنوں کے مطالبہ کی تفصیل لکھ کر مشورہ طلب کیا کہ مجھ کو اس معاملے میں کیا کرنا چاہیئے؟ حجاج نے محمد بن قاسم کو لکھا کہ

"تمہارے خط سے معلوم ہوا کہ برہمن آباد کے ہندو اپنے مندروں کی عمارت درست کرنا چاہتے ہیں۔ چونکہ انھوں نے اطاعت قبول کر لی ہے۔ لہٰذا ان کو اپنے معبود کی عبادت میں آزادی حاصل ہونی چاہیئے اور کسی قسم کا جبر کسی پر مناسب نہیں ہے۔"

برہمنوں کے حقوق کی رعایت

یہ خط محمد بن قاسم کے پاس اُس وقت پہنچا جب کہ وہ برہمن آباد سے لوہانہ کی جانب روانہ ہوکر برہمن آباد سے ایک منزل کے فاصلہ پر مقیم تھا۔ اس خط کے پہنچنے پر محمد بن قاسم نے برہمن آباد واپس آکر وہاں کے تمام اکابر و امراء کو بُلایا اور برہمنوں یعنی پُجاری کے حقوق و مراسم کی تحقیق کی اور راجہ داہر کے زمانہ میں سلطنت کی طرف سے کیا کیا رعایتیں برہمنوں کو حاصل تھیں سب کو معلوم کیا۔ اس کے بعد اُس نے شہر میں اعلان کرا دیا کہ جو لوگ اپنے باپ دادا کی مراسم کے پابند ہیں اُن کو ہر قسم کی آزادی ان مراسم کے بجالانے میں حاصل ہے کوئی شخص معترض نہ ہو سکے گا۔ برہمنوں کو دان پُن۔ دکشنا۔ بھینٹ۔ جس طرح پہلے دیتے تھے اب بھی دیں اپنے مندروں میں آزادانہ پوجا پاٹ کریں۔ محاصلِ ملکی یعنی سرکاری مال گذاری میں سے تین روپیہ فی صدی برہمنوں کے لئے الگ خزانے میں جمع کیا جاتے گا۔ اس روپے کو برہمن جس وقت چاہیں اپنے مندروں کی مرمت اور ضروری سامان کے لئے خزانہ سے برآمد کرا سکتے ہیں۔ غرض محمد بن قاسم نے تین روپیہ فی صدی مندروں کے لئے خزانہ سرکاری میں حصہ مقرر کر دیا۔ اس کے بعد اُس نے برہمنوں کے سب سے بڑے پنڈت کو رآنا کا خطاب دے کر ان کے امور مذہبی کا مہتمم اور افسر مقرر کر دیا۔ محمد بن قاسم نے برہمنوں کو سمجھایا کہ شام و عراق و ایران میں مسلمانوں نے یہودیوں عیسائیوں اور آتش پرستوں کے معبدوں کو جس طرح کوئی نقصان نہیں پہنچایا اُسی طرح تمہارے عبادت خانوں کو بھی ہم کوئی نقصان پہنچانا نہیں چاہتے۔ اس کے بعد محمد بن قاسم کے پاس حجاج کا یہ خط آیا۔

"میں تمہارے ملکی انتظام سے بہت خوش ہوا ہوں۔ تم ایسے کام کرو کہ تمہارا نام روشن ہو اور تمہارے دشمن عاجز و پریشان ہوں تمہارا ہر ایک کام میں مجھ سے علاج پوچھنا تمہارے حزم و احتیاط کی دلیل ہے۔ مگر فاصلہ اس قدر دراز ہے کہ خط کا جواب پہنچنے میں دیر ہوتی ہے اور اس سے کاموں میں التوا ہوتا ہے لہٰذا تم اب بطورِ خود رعیت نوازی اور عدل گستری کے طریقوں پر آزادانہ عمل درآمد کرو۔"

اس کے بعد محمد بن قاسم نے ایک مقام کو فتح کر کے وہاں کے تمام حربی اور غیر حربی لوگوں کو امان دے دی اور ہر قسم کا محصول و لگان بھی ان کو معاف کر دیا اور تمام کیفیت حجاج کو لکھ کر بھیجی حجاج نے اس کے جواب میں لکھا کہ۔

"جو لوگ اہل حرب ہیں ان کو قتل کرو۔ جو مطیع ہوں اُن کو امان دو متّباع و تاجر پر کوئی محصول یا ٹیکس عائد نہ کرو۔ جو شخص زراعت میں زیادہ توجہ اور جاں فشانی سے کام لیتا ہے اُس کی مدد کرو اور اُس کو تقاوی دو جو لوگ اسلام سے مشرف ہوں ان سے زمین کی پیدا وار کا عُشر یعنی دسواں حصہ وصول کرو اور جو لوگ اپنے مذہب پر قائم ہیں۔ ان سے وہی مال گذاری وصول کرو جو وہ اپنے راجاؤں کو دیا کرتے تھے۔"

ایفائے عہد

الور کی فتح کے بعد محمد بن قاسم کے پاس کچھ لوگ ایسے پکڑے ہوئے آئے جو آخر وقت تک مسلمانوں سے لڑتے تھے اور ہر ایک اعتبار سے کشتنی و گردن زدنی تھے۔ محمد بن قاسم نے اُن کو جلادوں کے سپرد کر دیا کہ ان کو قتل کر دو۔ اُن کو جب مقتل میں لے گئے تو ان میں سے ایک شخص نے مسلمانوں کے ایفائے وعدہ کی صفت سے فائدہ اٹھانے کی عجیب تدبیر سوچی اُس نے اپنے محافظوں سے کہا کہ میرے پاس ایک ایسی عجیب چیز ہے جو کسی نے کبھی نہ دیکھی ہوگی، جلاد نے کہا دکھاؤ۔ اس نے کہا کہ میں تمہارے سردار محمد بن قاسم کو دکھا سکتا ہوں چنانچہ اس کی اطلاع محمد بن قاسم کو ہوئی۔ محمد بن قاسم نے اس کو اپنے سامنے طلب کیا اور کہا کہ تو کیا دکھاتا ہے۔ اُس نے کہا کہ وہ ایک عجیب و غریب چیز ہے جو کسی نے کبھی نہ دیکھی ہوگی۔ مگر میں اس کو اُس وقت دکھاؤں گا جب کہ مجھ کو اور میرے سارے کنبہ کو امان دی جائے۔ محمد بن قاسم نے کہا کہ میں نے امان دی۔ اُس نے کہا کہ اپنا تحریری اور دستخطی امان نامہ دو تو دکھاؤں۔ محمد بن قاسم نے سمجھا کہ کوئی بڑی ہی بیش قیمت چیز ہوگی۔ لہذا امان نامہ پر دستخط کر کے اس کے حوالے کیا۔ امان نامہ لے کر اس نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیا۔ سر کے بالوں کو بکھیر دیا۔ ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا اور پاؤں کی اُنگلیوں کو اپنے سر سے لگایا۔ پھر ناچنے لگا اور کہنے لگا کہ کسی شخص نے میرا یہ عجیب و غریب تماشا نہ دیکھا ہوگا۔ محمد بن قاسم اپنی غلطی پر حیران تھا۔ اور

لوگوں نے جو وہاں موجود تھے کہا کہ یہ کیا عجیب تماشا ہے جس کے لیے امان دی جائے اس نے ہم کو دھوکا دیا ہے اِسے قتل کرنا چاہیے۔

محمد بن قاسم نے کہا کہ "قولِ مرداں جاں دارد" میں چونکہ اس کو امان دے چکا ہوں اس لئے اپنے عہد سے نہیں پھر سکتا ہاں یہ مناسب ہے کہ اس کو قید رکھا جائے اور اس معاملے میں حجاج سے فتویٰ طلب کیا جائے جب حجاج کے پاس یہ تمام کیفیت لکھی ہوئی پہنچی تو اس نے خلیفہ ولید بن عبدالملک اور کوفہ و بصرہ کے علما کو لکھا اور اس معاملے میں فتویٰ طلب کیا۔ خلیفہ نے بھی اور علمائے کوفہ و بصرہ نے بھی حجاج کو لکھا کہ اس مجرم کے ساتھ جو وعدہ کیا گیا ہے وہ ضرور پورا ہونا چاہیے۔ چنانچہ حجاج کے پاس سے جواب آنے پر وہ شخص اور اس کے کنبے کے بائیس آدمی جو واجب القتل تھے رہا کر دیئے گئے (ماخوذ از تاریخ معصومی)

ملتان کا بت خانہ سندھ کے مرکزی بت خانوں میں شمار ہوتا تھا۔ یہاں سورج کا مندر تھا۔ جس میں ایک بت رکھا ہوا تھا جس کی آنکھوں میں لعل لگے ہوئے تھے، محمد بن قاسم نے اس بت خانے کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا اور برہمن آباد کی طرح یہاں بھی پجاریوں کو ہر قسم کی رعایت، و آزادی حاصل رہی۔

مندروں کے لئے جاگیریں

محمد بن قاسم اور اس کے بعد کے مسلمان گورنروں نے ملک سندھ میں ہندوؤں کے مندروں کے لیے بڑی بڑی جاگیریں وقف کیں جیسا کہ مسجدوں کے لیے کبھی انھوں نے اوقاف مقرر کئے مسلمان جو عراق و شام سے آئے تھے۔ مالِ غنیمت میں ان کا ایک حصہ مقرر تھا۔ مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ سلطنت کے مرکزی خزانہ کا حق تھا۔ پانچواں حصہ رفاہِ عام کے کاموں میں لازماً خرچ کیا جاتا تھا۔ اکثر اوقات مرکزی خزانہ کا حق بھی رفاہِ رعایا کے لیے خرچ کر دیا جاتا تھا۔ نومسلموں کو اُن کی زمینوں اور جائدادوں پر بدستور قابض رکھا گیا تھا۔ ان سے عشر وصول کیا جاتا تھا۔ ان نومسلموں میں سے جو لوگ فوج میں بھرتی ہو کر کام کرتے تھے ان کو اس خدمت کے عوض اور زمینیں دی جاتی تھیں۔ غیر مسلم جو مسلمانوں کی فوج میں بھرتی ہو کر کام کرتے تھے ان کو تنخواہیں دی جاتی تھیں نومسلموں کو بھی اگر وہ خواہش کرتے تھے

تو نقد تنخواہیں ملتی تھیں۔ غیر مسلم جو اسلامی لشکر میں شامل ہوتے تھے اس کے صلے میں، ان کا سرکاری لگان معاف کر دیا جاتا تھا۔ مسلمانوں نے جب کسی حصہ ملک کو فتح کیا تو عموماً وہاں کے پرانے حاکم ہی کو اقرار اطاعت لے کر اس ملک کا حاکم مقرر کر دیا۔ عام انتظام کی نگرانی اور عدل کے قائم رکھنے کے لئے مرکزی مقامات میں عرب سرداروں کو بھی مقرر کر دیا جاتا تھا۔ مگر اس انتظامی پولیس یا فوج میں زیادہ تر سندھ کے نومسلم ہوتے تھے۔ ہندو سرداروں کے علاوہ جن کا براہ راست سلطنت اسلامیہ کے انتظامی عہدوں سے تعلق تھا۔

ہندوؤں کی چھوٹی چھوٹی ریاست کا قیام

سندھ میں مسلمانوں نے جابجا ہندوؤں کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کر دی تھیں۔ اس طرح ملک کا قریباً تمام حصہ راجاؤں کے ماتحت تھا۔ ان راجاؤں سے جو مال گذاری یا خراج وصول کیا جاتا تھا۔ وہ بہت ہی قلیل بلکہ برائے نام لیا جاتا تھا۔ زمین کی پیداوار اور آمدنی کی باقاعدہ تشخیص نہیں کی گئی تھی۔ نذرانہ اور خراج کے لئے عام طور پر مراسم قدیم کو معلوم کر کے اس سے بھی کم روپیہ وصول کیا جاتا تھا۔ اس روپیہ کا بہت بڑا حصہ رفاہ رعایا کے لئے خرچ ہوتا تھا۔ ہندو راجاؤں کی حکومت میں سندھ کی رعایا کے اکثر طبقات بہت پست اور خراب حالت میں تھے۔ راجہ اور اس کے رشتہ داروں اور مصاحبوں کی گویا پرستش ہوتی تھی اور یہ اعلیٰ طبقہ مال و دولت اور معیشت وراحت کا حقیقی وارث و مالک سمجھا جاتا تھا۔ مسلمانوں کی حکومت کے شروع ہوتے ہی یہ طلسم ٹوٹ گیا۔ کیونکہ مسلمانوں کا اعلیٰ حاکم اور ایک ادنیٰ خادم دونوں ایک ہی حالت میں نظر آتے تھے۔ تہذیب و متانت اور عدل و انصاف کے ساتھ عام انسانی مساوات کا جو نقشہ مسلمانوں نے اہل سندھ کے آگے پیش کیا اس نے سب کو متاثر و مدہوش کر دیا۔ رعایا کے دل خوشی سے لبریز ہو گئے اور ہر طرف سے اسلامی سلطنت کی مدح وستائش کے ترانے بلند ہونے لگے۔ عربی وشامی سرداروں اور سپاہیوں کو بھی کہیں کہیں جاگیریں اور قطعات زمین دیئے گئے تھے۔ مگر وہ تمام زمینیں اور قطعات ان کے اصلی مالکوں کے پاس بدستور رہے جو زر مال گذاری سرکاری خزانے میں داخل ہوتا وہ ان جاگیرداروں کو مل جاتا گرچند

ہی روز کے بعد پرانے مالک خود جاگیردار بن گئے اور عرب سردار کہیں سے کہیں تبدیل ہو گئے اور انھوں نے ان جاگیروں کی کوئی پرواہ نہیں کی۔

مسلمانوں نے اس بات کا حد سے زیادہ خیال رکھا کہ ہماری حکومت سے ملکِ سندھ کے کسی طبقہ اور کسی قوم کو بھی اذیت نہ پہنچے۔ انھوں نے پست لوگوں کو ابھارا تو سہی لیکن بلند رتبہ لوگوں کو پست کرنا نہیں چاہا۔ محمد بن قاسم نے شہروں کو مفتوح کرنے کے بعد دیکھا کہ اہل حرفہ، صنّاعوں، سوداگروں اور کاشت کاروں کو جنگ کی وجہ سے نقصان پہنچا ہے تو اس نے حکم دیا کہ ان لوگوں میں سے ہر ایک کو بارہ درم وزن چاندی دی جائے۔ تاکہ اپنے کاموں کو جاری کر سکیں اور جس کا نقصان زیادہ ہوا ہے اس کو بعدِ تحقیق زیادہ امداد دی جائے۔

برہمنوں کا عہدوں پر تقرر

یہ سن کر کہ حکومت کی طرف سے یہ مہربانی عام لوگوں پر ہوئی ہے برہمنوں نے آکر درخواست کی کہ راجہ داہر ہمارا ہم قوم تھا اور ہم ہی سلطنت کے تمام معزز عہدوں پر مامور تھے سب ہماری حکومت کو مانتے اور ہم کو سب سے زیادہ معزز جانتے تھے۔ ہمارے لئے آپ نے کیا انتظام کیا ہے۔ محمد بن قاسم نے یہ تحقیق کرنے کے بعد کہ برہمن واقعی ایک معزز اور امورِ سلطنت سے واقف قوم ہے۔ حکم دیا کہ برہمنوں کو سلطنتِ اسلامیہ کے معزز عہدوں پر مامور کیا جائے۔ چنانچہ محکمۂ مال کا تمام انتظام برہمنوں کے سپرد کر دیا گیا۔ محمد بن قاسم نے ان کو یقین دلا دیا کہ مجھ کو تمھارے اوپر پورا پورا اعتماد ہے۔ اور امید ہے کہ تم بڑی قابلیت کے ساتھ اپنے فرائض کو انجام دو گے۔ زرِ مال گذاری کا وصول کرنا۔ اس کا حساب رکھنا۔ خزانہ کی حفاظت کرنا سب برہمنوں کے سپرد کر دیا گیا۔ چنانچہ محمد بن قاسم کے زمانے سے کر آئندہ ہر ایک زمانے میں ملکِ سندھ کا مالی محکمہ برہمنوں ہی کے ہاتھ میں رہا۔

اس محکمہ میں مسلمانوں کو خلافتِ عباسیہ کے زمانے میں بھی دخل و تصرف حاصل نہیں ہوا۔ برہمن، محمد بن قاسم سے جس شخص کی سفارش کرتے وہ اس کے مرتبے کو بلند کر دیتا تھا۔ محمد بن قاسم نے برہمنوں کو تاکید کر دی تھی کہ کاشت کاروں سے محصول یا بٹائی وصول کرنے میں ہرگز کوئی سختی نہ کی جائے اور جہاں تک ممکن ہو کاشت کاروں

کو سہولتیں دی جائیں جس کاشت کار کے یہاں پیداوار کم ہو اس کو سرکاری لگان معاف کر دیا جائے۔ اس طرزِ عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ برہمن لوگ خود مواضعات میں جا جا کر سلطنتِ اسلامیہ کی خوبیوں کا وعظ کرنے اور رعایا کو حکومتِ وقت کی وفاداری کی ترغیب دینے لگے۔ یہی وجہ تھی کہ سندھ میں عام طور پر اشاعتِ اسلام کا سلسلہ جاری ہوگیا۔ اور یہی سبب تھا کہ اردگرد کے ہندو راجاؤں نے مسلمانوں کے ساتھ محبت و ہمدردی کا برتاؤ کرنا ضروری سمجھا۔

اوپر کے تمام حالات پڑھنے کے بعد جب اس بات پر غور کیا جاتا ہے کہ محمد بن قاسم ہندوستان میں صرف ساڑھے تین سال رہا اور اسی قلیل مدت میں اس نے تمام ملکِ سندھ کو فتح بھی کیا اور ایسا اچھا نظامِ سلطنت قائم کیا تو حیرت ہوتی ہے اور یہ حیرت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب یہ تصور کیا جاتا ہے کہ محمد بن قاسم کی عمر سندھ میں داخل ہونے وقت سترہ سال کی تھی اور جب یہاں سے رخصت ہوا ہے تو بیس یا اکیس سال کی عمر رکھتا تھا۔ محمد بن قاسم کی قابلیت اور حقیقی کامیابی اور مقبولیت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ وہ جب ملکِ سندھ سے رخصت ہوا ہے تو عام طور پر تمام ملک میں رنج و ملال کا اظہار کیا گیا۔ شہر کیرج کے ہندوؤں اور بدھوں نے اپنے شہر میں محمد بن قاسم کا ایک بت بنا کر رکھا اور اس کی پرستش شروع کر دی۔

محمد بن قاسم کے ساتھ جو عراقی و شامی آئے تھے۔ ان میں سے کچھ شہید ہو چکے تھے جو باقی تھے انھوں نے محمد بن قاسم کے بعد اپنے وطن کو واپس جانا چاہا تو خلیفہ سلیمان بن عبدالملک کا امتناعی حکم آ گیا کہ تم کو سندھ سے واپس آنے کی اجازت نہیں ہے اگر آؤ گے تو بلا تامل قتل کر دیئے جاؤ گے۔ اس کا سبب غالباً یہ ہوگا کہ محمد بن قاسم کے ہمراہیوں سے خلیفہ کو یہ اندیشہ تھا کہ کہیں ملکِ شام میں واپس آ کر کوئی شورش و بغاوت برپا نہ کریں۔ غرض یہ لوگ یہیں رہ پڑے، محمد بن قاسم چونکہ ایک ہردلعزیز سپہ سالار تھا اس لئے اس کے ہمراہیوں نے سلطنت کے کاموں اور انتظاموں میں بھی حصہ لینا ترک یا کم کر دیا۔ ان نومسلموں اور ہندوؤں کو بھی محمد بن قاسم کے قتل کی خبر سے رنج ہوا۔ جن پر محمد بن قاسم نے احسانات کی بارشیں کی تھیں۔ نئے گورنر یزید

بن ابی کبشہ کا محمد بن قاسم سے چارج لینے کے بعد اٹھارھویں روز انتقال ہو گیا اور اس خبر کے دارالخلافہ جانے اور وہاں سے نئے عامل کے مقرر ہو کر آنے میں دیر ہوئی۔ لہٰذا راجہ داہر کے بیٹے جے سیہ نے اس فرصت کو غنیمت سمجھ کر حکومت کے حاصل کرنے اور اپنے آبائی ملک پر قابض ہونے کی کوشش کی اور یکایک پہنچ کر برہمن آباد پر قابض ہو گیا۔ شامی و عراقی مسلمان دربارِ خلافت کی طرف سے چونکہ مایوس ہو چکے تھے۔ لہٰذا انھوں نے کچھ زیادہ کوشش ملک کے بچانے کی نہ کی ادھر سردار کے نہ ہونے سے کافی مقابلہ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جے سیہ کی حکومت برہمن آباد میں قائم ہو گئی۔ مگر باقی ملک پر اسلامی قبضہ قائم رہا۔

محمد بن قاسم کے بعد عہد بنو امیہ میں سندھ کی حالت

یزید بن ابی کبشہ کے فوت ہونے پر عامر بن عبداللہ سندھ کا گورنر مقرر ہو کر آیا۔ اور تمام ملک کا بندوبست کیا لیکن جے سیہ برہمن آباد پر قابض و متصرف رہا۔ ابھی برہمن آباد کی فتح کا کوئی بندوبست نہ کرنے پایا تھا کہ عامر بن عبداللہ بھی فوت ہو گیا۔ اس کے بعد خلیفہ سلیمان بن عبدالملک نے حبیب بن مہلب کو سندھ کا گورنر بنا کر بھیجا۔ حبیب بن مہلب اپنے ساتھ کافی فوج لے کر آیا۔ اس عرصہ میں جے سیہ کو کامیاب دیکھ کر اور بھی چند راجہ خود مختار ہو چکے تھے۔ ان کو حبیب نے آ کر مطیع و منقاد بنایا۔ ابھی وہ جے سیہ کی طرف متوجہ نہ ہونے پایا تھا کہ کسی ضرورت سے واپس جانا پڑا۔ اس کے جاتے ہی وہ راجے جن کو اس نے ابھی مطیع کیا تھا پھر خود مختار ہو گئے اور برہمن آباد میں جے سیہ کی حکومت اور بھی زیادہ مستحکم ہو گئی۔ یہ راجے جو جا بجا سندھ کے شہروں پر قابض ہو کر اپنی چھوٹی چھوٹی ریاستیں بنا لینے میں کامیاب ہوئے۔ عموماً راجہ داہر کے بیٹے بھتیجے اور خاندان کے لوگ تھے۔ ان میں اکثر ایسے تھے جن کو محمد بن قاسم نے اقرارِ اطاعت لے کر حکومتوں پر قائم رکھا تھا۔ صرف ایک جے سیہ ایسا تھا جو باہر سے آ کر برہمن آباد پر قابض ہوا تھا۔

سب سے زیادہ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اسلام کا اخلاقی اثر اس قدر قوی ہو چکا تھا کہ اس بغاوت و سرکشی کے زمانے میں بھی مسلمانوں اور نومسلموں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا، نہ نومسلموں نے اسلام ترک کرنے اور مرتد ہونے کا ارادہ کیا۔

حضرت عمر بن عبد العزیز

۲۰ ربیع الاول ماہ صفر ۹۹ھ کو خلیفہ سلیمان بن عبدالملک کا انتقال ہو گیا اور اس کی جگہ حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ مقرر ہوئے۔ محمد بن قاسم کے بعد سے اب تک دو برس سے زیادہ مدت گذر چکی تھی۔ اس عرصہ میں سندھ کا نظام حکومت بہت ہی ابتر رہا یعنی جلد جلد گورنر آتے اور جاتے رہے کسی کو دیر تک رہنا نصیب نہ ہوا حضرت عمر بن عبد العزیزؓ نے تخت خلافت پہ متمکن ہو کر عمر بن مسلم باہلی کو سندھ کا گورنر مقرر کر کے بھیجا اور ان تمام ہندو راجاؤں کے نام اس مضمون کے خطوط روانہ کئے کہ

"تم اسلام قبول کر لو۔ بت پرستی کی تاریکی سے نکل آؤ۔ اگر تم مسلمان ہو جاؤ گے تو ہم تم کو تمہاری ریاستوں پر بدستور قائم رکھیں گے تمہاری خطائیں معاف کر دیں گے۔ تمہارے ساتھ مسلمانوں کی مانند سلوک کریں گے اور اپنا بھائی سمجھیں گے۔"

یہ خطوط جب رؤساء سندھ کے پاس پہنچے تو سب سے پہلے جے سیہ داہر نے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کیا۔ وہ اس عرصہ میں مسلمانوں کے اعمال وعبادات و اخلاق کو اچھی طرح دیکھ چکا تھا لہٰذا اس کو اسلام کے قبول کر لینے میں کوئی تامل نہ ہوا۔ اس کے ساتھ ہی باقی تمام راجاؤں نے بھی جو عموماً اس کے رشتہ دار تھے اسلام قبول کیا اور سب نے اپنے پرانے ناموں کو چھوڑ کر نئے اسلامی نام رکھے۔ ان راجاؤں کے مسلمان ہوتے ہی عام رعایا پر بھی بڑا اثر پڑا اور جوق در جوق لوگ اسلام میں داخل ہونے لگے۔ حضرت عمر بن عبد العزیز کی اس تحریک کا نتیجہ یہ ہوا کہ سندھ کے ملک کا ایک بڑا حصہ پھر مستقل طور پر پرانے حکمراں خاندان کی حکومت میں چلا گیا یہ مسلمان راجہ خلیفہ کی سیادت وحکومت کو تسلیم کرتے اور اسلامی شریعت کے پابند تھے اور ان کو اپنی حکومت وریاست میں ہر قسم کی آزادی وخودمختاری حاصل تھی۔ ایک حصہ ملک سندھ کا ایسا تھا جو براہ راست گورنر سندھ کے قبضہ میں تھا۔ اس علاقے میں بھی ہندو روسا رجا بجا سلطنت اسلامیہ کی طرف سے برسر حکومت تھے اور باقاعدہ خراج ادا کرتے تھے حضرت عمر بن عبد العزیز کا عہد خلافت سندھ میں نہایت امن وامان اور اشاعت اسلام کا زمانہ تھا۔ اس مبارک عہد میں ہزاروں نہیں بلکہ

اکھوں سندھیوں نے اسلام قبول کیا۔ ۱۰۱ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

یزید بن عبدالملک

ان کی جگہ یزید بن عبدالملک خلیفہ ہوا۔ یزید بن عبدالملک نے جنید بن عبدالرحمٰن بن حرث بن خارجہ بن سنان بن ابی حارثہ مزنی کو سندھ کا گورنر مقرر کرکے بھیجا۔

جنید ۱۰۷ھ تک سندھ کا گورنر رہا۔ یہ ایک اولوالعزم اور واقعہ پسند شخص تھا۔ اس نے ملک کے ہر حصے میں اپنا اقتدار قائم کرنے اور ماتحت راجاؤں کو مرعوب رکھنے کی کوشش کی۔ سندھ کے جنوب کی جانب کسی گورنر نے توجہ نہیں کی تھی۔ جنید نے گجرات کے راجہ کو بھی اطاعت قبول کرنے اور باج گزار بننے پر مجبور کیا۔ اُدھر اجین کے راجہ کو اپنا ماتحت اور خراج گذار بنایا۔ جنید کی ان کارروائیوں کو دیکھ کر جے سیہ اور دوسرے نومسلم فرماں روا کچھ تردد میں مبتلا ہوگئے تھے۔ اتفاق کی بات کہ جنید نے برہمن آباد کے متصل دریائے سندھ کو عبور کرکے دوسری طرف یعنی حدودِ ریاست برہمن آباد میں جانے کا قصد کیا۔ ممکن ہے کہ وہ گورنر سندھ ہونے کی حیثیت سے ریاست برہمن آباد کو بھی اپنا ماتحت علاقہ سمجھ کر بہ تقریب دورہ جاتا ہو لیکن جے سیہ نے دریا کے اس طرف آنے سے جنید کو روکا اور پیغام بھیجا کہ میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کی تحریک سے مسلمان ہوا ہوں۔ یہ ریاست اُنھوں نے مجھ کو دی ہے۔ تم کو میری ریاست میں قدم رکھنے اور بغیر میری اجازت کے یہاں آنے کا کوئی حق نہیں۔ جنید نے لکھا کہ میں تمھاری ریاست میں کوئی مداخلت کرنے نہیں آتا ہوں۔ جے سیہ نے کہا کہ مجھ کو تمھاری بات کا اعتبار نہیں اور اندیشہ ہے کہ کہیں تم مجھ کو حکومت سے معزول نہ کردو۔ جنید نے کہا کہ میں ضمانت دینے کو موجود ہوں کہ تم کو معزول نہ کروں گا۔ مگر ہاں تم سے بطور نشانِ اطاعت خراج ضرور وصول کیا جائے گا۔ غرض جنید کو دریا کے پار جانے اور جے سیہ کو اس کے روکنے پر اصرار رہا آخر دونوں طرف سے قوت کا استعمال ہوا۔ ادھر سے روکنے کے لئے اور ادھر سے دریا کو عبور کرنے کے لئے کشتیاں اُترھیں دریا کے بیچ میں جنگ ہوئی۔ اس بحری لڑائی میں جے سیہ کو شکست ہوئی اور جنید دریا کے پار پہنچ گیا۔ وہاں بَرّی لڑائی میں جے سیہ مقتول ہوا جے سیہ کا بھائی اس واقعہ کے بعد دمشق کی جانب روانہ ہوا کہ وہاں پہنچ کر خلیفہ سے جنید کی شکایت اور اپنے بھائی کا

قصاص طلب کرے۔ جنید کو جب یہ خبر لگی تو اس نے اپنے معتمد بھیج کر اسے دھوکا دے کر راستہ ہی سے جے سیہ کے بھائی کو واپس بلوایا۔ جب وہ جنید کے پاس واپس آیا تو جنید نے اس کو بھی قتل کردیا۔ یہ پہلی وعدہ خلافی اور ظالمانہ کارروائی تھی جو سندھ میں مسلمانوں سے سرزد ہوئی۔ اس حادثہ کا تمام ملک سندھ پر بہت ہی بُرا اثر پڑا۔ اگرچہ یہ صرف ایک شخص کی غلط کاری تھی۔ مگر سندھیوں کو یہ کہنے کا موقع مل گیا کہ مسلمانوں میں پاسِ عہد کے خلاف بھی عمل دیکھا جاسکتا ہے۔

ہشام بن عبدالملک

۱۰۵ھ میں خلیفہ یزید بن عبدالملک فوت ہوا تھا اس کی جگہ ہشام بن عبدالملک تخت نشین ہوا۔ ہشام نے جنید کو بدستور سندھ کی گورنری پر مامور رکھا تھا۔ ۱۱۰ھ میں جب جنید نے جے سیہ اور اس کے بھائی کو قتل کیا اور اس کا حال خلیفہ کو معلوم ہوا تو اس نے فوراً جنید کو سندھ کی حکومت سے معزول کرکے اس کی جگہ ایک نہایت رحم دل اور نرم مزاج شخص تمیم بن زیاد کو سندھ کا گورنر مقرر کرکے بھیجا۔ تمیم جس قدر رحم دل تھا اُسی قدر فیاض بھی تھا۔ تمیم کی نرمی و فیاضی کا سندھیوں پر اس لئے زیادہ اثر نہیں ہوا کہ وہ اپنے ساتھ کوئی فوج لے کر نہیں آیا تھا۔ اور اس نے آکر اس ملک میں طاقت کا کوئی مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ جے سیہ اور اس کا بھائی چونکہ مسلمان تھے اس لئے نومسلموں کو ان دونوں شہزادوں کے مقتول ہونے کا سخت صدمہ تھا۔ سوءِ اتفاق سے تمیم کا چند روز کے بعد انتقال ہوگیا اور کچھ دنوں یہ ملک بلاکسی گورنر کے خالی رہا۔ اس وقفہ میں سندھ کے اندر بدامنی اور شورش پیدا ہوگئی۔ اس شورش میں بہت سے نومسلم بھی حکومتِ اسلامیہ کے خلاف برہمنوں کے شریک ہوگئے۔ نومسلم رؤساء مرتد ہونے لگے اور برہمنوں نے ہندوستان کے دوسرے راجاؤں سے خط وکتابت شروع کی کہ سندھ پر آکر قبضہ کرلو۔ کاکسا بن چندر جس کا اوپر ذکر آچکا ہے ابھی تک زندہ اور حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانے میں مسلمان ہوکر ایک ریاست کا فرماں روا تھا۔ اس نے اس شورش کے زمانے میں بڑے استقلال اور وفاداری کا ثبوت پیش کیا وہ خود بھی صدقِ دل سے اسلام پر قائم رہا اور اُس نے دوسرے نومسلموں کو بھی مُرتد ہونے سے روکا۔

تمیم کی وفات کا حال سن کر عراق کے گورنر حاکم بن عبداللہ نے حکم بن عوانہ کلبی کو سنہ ۱۱۰ھ میں سندھ کا حاکم مقرر کر کے بھیجا۔ حکم بن عوانہ نے آکر دیکھا کہ سندھ کے اکثر علاقے میں بغاوت پھیلی ہوئی ہے اور تحریک ارتداد نے ان عراقی وشامی عربوں کو بھی جو یہیں سکونت پذیر ہوگئے تھے خطرے میں مبتلا کر دیا ہے۔ کیونکہ وہ تھوڑی تھوڑی تعداد میں مختلف شہروں اور قصبوں میں بکھرے ہوئے آباد تھے اور اپنے محبوب سپہ سالار محمد بن قاسم کے مقتول ہونے کے بعد نہایت افسردہ خاطر ہو کر اور اپنے ہتھیار کھول کر اپنی نومسلم بیویوں اور بچوں کی پرورش کے لیے نومسلموں کے ساتھ کھیتی باڑی کے کاموں میں مصروف ہوگئے تھے۔ ان لوگوں نے سلیمان بن عبدالملک کے اس انتقامی حکم کے بعد جس میں ان کو ملک شام میں واپس جانے سے روک دیا گیا تھا۔ یہ طرز زندگی اختیار کر لیا تھا۔ حکم بن عوانہ کلبی نے سندھ میں آتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ان تمام عربوں کو مختلف متفرق مقامات سے بلوا کر ایک جگہ فراہم کیا۔ اس سے اس کا مقصد یہ تھا کہ ایک زبردست اسلامی طاقت اس انتظام سے پیدا ہو جائے۔ اور یہ منتشر پراگندہ مسلمان خطرے سے بچ جائیں۔ یہی لوگ چونکہ سندھ کے اولین فاتح تھے۔ اس لیے حکم کو ان کی بہادری اور تجربہ کاری پر سب سے زیادہ اعتماد ہو سکتا تھا۔ اس جگہ یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ محمد بن قاسم چونکہ دربار خلافت کی فوری طلبی پر بلا توقف سندھ سے روانہ ہو گیا اور اس کو پہلے سے سلیمان بن عبدالملک کی مخالفت و عداوت کا حال معلوم تھا لہٰذا وہ روانگی کے وقت اپنی بیوی رانی لاڈی اور اپنے نوزائیدہ بچے کو جس کا نام اس نے عمرو رکھا تھا یہیں اپنے دوستوں کے پاس چھوڑ گیا تھا جو اپنی ماں اور اپنے باپ کے دوستوں کی نگرانی میں پرورش پا رہا تھا۔ حکم بن عوانہ کلبی کی طلب پر عمرو بن محمد بن قاسم بھی مع اپنے رفیقوں کے اس کے پاس آگیا۔ عمرو بن محمد کی عمر اس وقت سترہ اٹھارہ سال کی تھی۔

محفوظہ

حکم نے دریائے سندھ کے مشرقی کنارے پر ان عربوں کو جو مختلف مقامات سے آکر جمع ہوئے سنہ ۱۲۰ھ میں آباد کر کے اس جدید بستی کا نام محفوظہ رکھا اور اسی کو اپنا قیام گاہ بنا کر سندھ کا دارالصدر قرار دیا۔ اس کے بعد حکم بن عوانہ

نے عمر بن محمد کو سندھ کی اسلامی فوج کا سپہ سالار بنا کر باغیوں اور سرکشوں کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا۔ عمر نے جا بجا فتوحات حاصل کیں تمام سرکشوں کو مطیع و منقاد بنایا اور اپنے باپ کی روایات کو زندہ رکھنے کے لئے سب کو رضامند بھی کر لیا۔

منصورہ

ملک سندھ میں حکومت اسلامیہ کے مستحکم کرنے کے بعد عمر بن محمد نے دریا کے مغربی کنارے پر محفوظہ کے بالمقابل ایک دوسرا شہر آباد کیا جس کا نام منصورہ رکھا۔ ۱۲۲ھ میں حکم بن عوانہ کلبی فوت ہو گیا اور عمر بن محمد قاسم کے پاس دربار خلافت سے سندھ کی گورنری کا پروانہ آ گیا۔ اس کے بعد محفوظہ کی رونق گھٹنے اور منصورہ کی آبادی بڑھنے لگی۔ یہاں تک کہ آئندہ منصورہ ہی سندھ کا حاکم نشین شہر رہا۔ ۱۲۰ھ میں عمر بن محمد کا بھی انتقال ہو گیا اور اس کی جگہ منصور بن جمہور سندھ کا گورنر مقرر ہوا۔ ۱۳۲ھ میں خلافت بنی امیہ کا چراغ گل ہو گیا۔ اس کی جگہ خلافت عباسیہ قائم ہوئی۔ عباسی بنو امیہ کے دشمن تھے۔ سندھ کے گورنر منصور نے جو اموی خلیفہ کا مقرر کردہ حاکم تھا عباسی خلیفہ کی بیعت سے انکار کیا اور اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ یہاں چونکہ شامی لوگ موجود تھے اور وہ سب امویین کے طرف دار اور عباسیوں کے مخالف تھے۔ لہذا سب کے سب منصور کی حمایت و اعانت پر آمادہ ہو گئے۔ عباسیوں کے مشہور وائسرائے ابو مسلم خراسانی نے منصور کو معزول اور سندھ پر حکومت کرنے کے لئے عبدالرحمٰن نامی ایک سردار کو روانہ کیا۔ منصور نے مقابلہ کیا اور ایک خوں ریز جنگ کے بعد عبدالرحمٰن مارا گیا۔ اگر اس زمانے میں کوئی اموی شہزادہ عبدالرحمٰن الداخل کی طرح بچ کر سندھ کی طرف چلا آتا تو جس طرح عبدالرحمٰن الداخل نے اندلس میں ایک شاندار حکومت و خلافت قائم کی اسی طرح سندھ و ہند میں بھی ضرور ایسی ہی شاندار اموی سلطنت قائم ہو جاتی اور محمود غزنوی کو ہندوستان کی طرف آنے کی مطلق ضرورت پیش نہ آتی۔ مگر افسوس اس طرف کوئی بیدار اقبال متوجہ نہ ہوا۔ ابو مسلم خراسانی نے عبدالرحمٰن کے مقتول ہونے کی خبر سن کر موسیٰ بن کعب تمیمی کو جو محکمہ پولیس کا افسر اعلیٰ تھا ایک زبردست فوج دے کر بھیجا۔ منصور نے سندھ کی مغربی سرحد پر آگے بڑھ کر موسیٰ کو روکا اور معرکہ آرا ہو کر مقتول ہوا۔ اسی لڑائی میں منصور بن جمہور کا بھائی منظور بن جمہور بھی مارا گیا۔ منصور

جس شخص کو اپنا نائب بنا کر منصورہ میں چھوڑ آیا تھا۔ اس نے منصور کے مقتول ہونے کی خبر سنتے ہی اپنے اہل و عیال اور خاندان بنو امیہ کے ہمدرد شامیوں کو لے کر منصورہ سے کوچ کیا اور شہر کو ویران چھوڑ کر سندھ و بلوچستان کے درمیانی پہاڑوں میں جا کر پناہ گزیں ہوا۔ اس طرح ۱۳۲ھ میں ملکِ سندھ بھی خلافت عباسیہ کے حدودِ حکومت میں داخل ہوا۔

خلافت بنو امیہ کے زمانے میں جس طرح تمام دوسرے ملکوں پر حکومتِ اسلامیہ کا رنگ خالص اسلامی تھا۔ اسی طرح سندھ میں بھی وہی عربی اسلامی رنگ غالب رہا۔ چالیس سال تک خلفائے بنی امیہ کے ماتحت مسلمانوں نے سندھ میں حکومت کی۔

اس چالیس سال میں اسلام کا اثر و اقتدار برابر روبہ ترقی رہا۔ سندھ میں پہلے ہی سے ہندو اور بدھ مذہب کی مذہبی کشمکش جاری تھی۔ اسی مذہبی معرکہ میں اسلام بھی شریک ہو گیا اور شریک ہوتے ہی اس کو غلبہ حاصل ہوا۔ حکومت و طاقت نے اور بھی اس غلبہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچا کر ثابت کر دیا کہ آئندہ اس ملک کے ہر ایک باشندے کا مذہب اسلام ہو سکتا ہے۔ اسلام اس ملک میں اس طرح داخل ہوا کہ سندھ کے قدیم باشندوں کو اسلام سے کوئی رقابت یا عداوت پیدا نہیں ہوئی اگر رقابت یا عداوت تھی تو وہ محض قومی و نسلی اعتبار سے تھی کہ ہماری قوم سے نکل کر ایک عرب قوم میں حکومت کیوں چلی گئی۔ مذہب کی تبدیلی رقیبانہ جذبہ میں بہت ہی کم اثر انداز تھی کیونکہ اسلام کی مساوات و رواداری اور اسلام کا سادہ اور فطرت انسانی کے موافق ہونا ایک ایسی زبردست اور دل ربایانہ کشش رکھتا تھا جس کے آگے رقیبانہ و معاندانہ جذبات نشوونما ہی نہیں پا سکتے تھے۔ خلفائے بنو امیہ کے آخری عہد میں نظام سلطنت بہت ہی کمزور ہو گیا تھا اسی لئے بعض سردار تو یہ کوشش بھی کرنے لگے تھے کہ ہماری ماتحت رعایا اسلام قبول نہ کرے بلکہ غیر مسلم ہی رہے تاکہ اس کو تمام اسلامی حقوق حاصل ہو کر حکومتِ اسلامیہ میں ہماری ہمسری کا استحقاق حاصل نہ ہو سکے۔ خلافتِ عباسیہ کو خلافتِ بنو امیہ کے مقابلے میں جو جو امتیازات حاصل تھے وہ سب ملک سندھ میں بھی نمایاں اور اثر انداز ہوئے۔

سندھ خلافت عباسیہ میں

موسیٰ بن کعب نے سندھ پر قبضہ کر کے بہت جلد تمام ملک میں امن و امان اور انتظام قائم کر دیا اور سب سے پہلے دارالسلطنت منصورہ کی آبادی و رونقِ رفتہ کے بحال کرنے کی طرف متوجہ ہوا۔ چنانچہ چند روز میں منصورہ پھر آباد اور پُر رونق شہر بن گیا۔ موسیٰ نے سندھ کے نظامِ سلطنت میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں کی۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ اُس نے عبداللہ سفاح عباسی خلیفہ کی اطاعت کا اقرار تمام رؤسائے سندھ سے لیا امویوں کے طرف دار دور دراز کے ریگستانی مقاموں اور پہاڑوں میں روپوش ہو گئے۔ ۱۴۱ھ میں موسیٰ بن کعب کا سندھ میں انتقال ہو گیا۔ اس سے پہلے ذی الحجہ ۱۳۶ھ میں خلیفہ عبداللہ سفاح فوت ہو کر اس کی جگہ خلیفہ منصور عباسی تخت نشین ہو چکا تھا۔ موسیٰ کے بعد خلیفہ منصور نے موسیٰ کے بیٹے عیینہ بن موسیٰ کو سندھ کا گورنر مقرر کیا۔ سال بھر کے بعد عیینہ کو معزول کر کے عمر بن حفص بن عثمان بن قبیصہ بن ابی صفرہ ملقب بہ ہزار مرد کو ۱۴۲ھ میں سندھ کا گورنر مقرر کیا۔

اس جگہ یہ بتا دینا ضروری ہے کہ عباسیوں کی خلافت ایرانیوں کی مدد سے قائم ہوئی تھی۔ لہٰذا تمام ذمہ داری کے عہدوں پر ایرانی نومسلم ہی ہر جگہ نظر آنے لگے تھے خاندانِ خلافت تو عربی قریشی تھا۔ مگر اپنے اثر۔ اخلاق اور نظام کے اعتبار سے عباسی خلافت کو ایرانی خلافت کہا جا سکتا تھا۔ یہ تغیر کوئی معمولی تغیر نہ تھا۔ اس کو نظر انداز کر دینے سے بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی ہیں یہ بات بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہے کہ خلافتِ عباسیہ کو قائم ہوئے بارہ سال ہی گذرے تھے کہ علویوں یعنی سادات نے خروج کیا اور خلافتِ عباسیہ کے لئے موت اور زیست کا سوال پیدا ہو گیا۔ علویوں کی بغاوتوں کا سلسلہ آخر تک جاری رہا۔ اور علویوں کی اس رقابت نے عباسیوں کی خلافت کا خاتمہ کرنے میں بڑا کام کیا۔ ایرانیوں نے برسرِ اقتدار ہو کر عربوں کو پیچھے ہٹانے اور نیچا دکھانے کی مسلسل کوششیں کیں اور اس کام میں خلفائے عباسیہ کی امداد ان کو حاصل رہی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربوں کو خاندانِ خلافت سے ہمدردی نہ رہی اور سلطنتِ اسلامیہ عربوں کی انتظامی قابلیت اور حقیقی اسلامی سادگی اور مساوات سے محروم ہو گئی۔

ایرانی تکلفات اور شاہ پرستی نے دخل پایا۔ خلیفہ منصور عباسی علم کا شائق اور علماء کا قدردان تھا۔ اس کے زمانے میں تصنیف و تالیف کتب کا سلسلہ مسلمانوں میں جاری ہوا۔ دار الترجمے قائم ہوئے۔ یونانی علوم کو عباسی خلفاء نے عربی میں ترجمہ کرا کر شائع کیا۔ فلسفہ، منطق، علمِ کلام وغیرہ کی گرم بازاری ہوئی۔ حکومت کی طرف سے ہر شخص کو آزادانہ مذہبی عقائد و اعمال پر اعتراض کرنے کا حق تسلیم کیا گیا۔ اس مذہبی آزادی کو مجوسیوں نے بُری طرح استعمال کیا اور اپنی مجوسی سلطنت دوبارہ قائم کرنے اور سلطنت اسلامیہ کا تختہ اُلٹ دینے کی کوششوں میں مصروف ہو کر نئے نئے مذاہب ایجاد کرنے لگے۔ چنانچہ اسمٰعیلیں۔ ابن مقنع، بابک خرمی۔ قرامطہ وغیرہ کا ظہور اسی قبیل سے ہے۔ جنھوں نے سلطنتِ اسلامیہ کو سخت پریشان رکھا۔ خلافتِ عباسیہ میں صرف ہارون الرشید اور مامون الرشید کا زمانہ جو ۱۷۰ھ سے شروع ہو کر ۲۱۸ھ تک ختم ہوتا ہے۔ نسبتاً اچھا اور امن و امان کا زمانہ تھا۔ جس میں یہ مذکورہ فتنے سر نہیں اُبھار سکے اور سلطنتِ اسلامیہ کو زیادہ نقصان بھی نہیں پہنچا سکے اس کے بعد تو گویا فتنوں کا دروازہ کھل گیا تھا جس کے سبب سلطنت اسلامیہ پارہ پارہ ہو گئی۔ ان اشارات کو ذہن میں رکھ کر اب سندھ کی مختصر تاریخ ملاحظہ فرمایئے۔

سندھ کی مختصر تاریخ

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ ۱۴۲ھ میں خلیفہ منصور عباسی نے عمر بن حفص کو سندھ کا گورنر مقرر کیا تھا یہ عمر بن حفص بباطن شیعیت کی جانب زیادہ مائل تھا۔ یعنی اس کو سادات و علویین سے زیادہ ہمدردی تھی۔ ابھی تک سادات نے کوئی قابل تذکرہ جنگی اور اہم کارروائی خلافتِ عباسیہ کے خلاف نہیں کی تھی۔ وہ اب تک خفیہ تیاریوں میں مصروف تھے۔ آخر ۱۴۵ھ میں عبد اللہ بن حسن بن علی بن ابی طالب کے بیٹوں محمد و ابراہیم نے خروج کیا۔ حجاز و عراق میں ان کے ہزارہا طرفدار اُٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ ہنگامہ اس قدر قوی اور خطرناک تھا کہ خود خلیفہ منصور کے دل پر فکر و ناامیدی نے غلبہ پا لیا تھا۔ ۱۴ رمضان ۱۴۵ھ کو محمد بن عبد اللہ جو محمد المہدی کے نام سے مشہور ہیں مقتول ہوئے۔ مگر ابراہیم بن عبد اللہ ان کے بھائی کئی برس بعد تک منصور کو پریشان کرتے رہے۔ محمد المہدی نے اپنے بیٹے عبد اللہ بن محمد کو جو عبد اللہ اشتر کے نام سے مشہور تھا ۱۵۱ھ میں ملک سندھ کی طرف روانہ کر دیا تھا کہ وہاں جا کر خلافتِ عباسیہ کے خلاف

ہماری خلافت کی دعوت دو۔ عبداللہ اشتر بصرہ ہوتا ہوا ۱۴۵ھ میں جب عمر بن حفص کے پاس سندھ پہنچا تو عمر بن حفص نے فوراً اس کی دعوت کو قبول کر لیا۔ خود بھی محمد المہدی کی بیعت اختیار کی اور اپنے ماتحت ارکان سے بھی بیعت لی۔ عمر بن حفص نے دربار سے تمام عباسی علامات ونشانات دور کرکے محمد المہدی کی خلافت کے نئے جھنڈے بھی تیار کرلئے۔ اسی اثناء میں عمر بن حفص کے پاس محمد المہدی کے مقتول ہونے کی خبر پہنچی۔ عمر نے عبداللہ اشتر کو یہ خبر سنا کر تعزیت کی۔ عبداللہ اشتر نے کہا۔ اب مجھ کو اپنی جان کی فکر ہے۔ مجھے کسی طرح بچاؤ۔ عمر بن حفص نے کہا کہ سندھ کے سرحدی راجاؤں میں ایک راجہ جو سب سے زیادہ طاقتور ہے اور کافی فوج رکھتا ہے وہ آنحضرتؐ کے ساتھ بڑی محبت رکھتا ہے۔ تم اس سے معاہدہ کرکے اس کے پاس چلے جاؤ۔ عبداللہ اشتر نے اس سے خط وکتابت کی۔ اس نے فوراً اپنے یہاں بلالیا اور شہزادوں کی طرح تعظیم و توقیر کے ساتھ رکھا اپنی بیٹی کی شادی بھی عبداللہ اشتر سے کردی۔ رفتہ رفتہ چار سو آدمی ادھر اُدھر سے آکر عبداللہ کے پاس جمع ہوگئے۔ یہ سب کے سب عرب اور مسلمان تھے۔

منصور کو جب یہ حالات معلوم ہوئے تو اس نے عمر بن حفص کو معزول کرکے اس کی جگہ ہشام بن عمرو تغلبی کو ۱۴۶ھ میں سندھ حکومت دے کر روانہ کیا اور روانگی کے وقت تاکیدی طور پر ہدایت کی کہ عبداللہ اشتر کو گرفتار یا قتل کرنے کی ضرور کوشش کرنا اور اگر سندھ کا راجہ اس کے دینے سے انکار کرے تو اس پر حملہ کرکے اس کا ملک چھین لینا۔ ہشام نے سندھ پہنچ کر اس راجہ سے عبداللہ اشتر کو طلب کیا۔ اُس نے دینے سے انکار کیا۔ ہشام نے اپنے بھائی سفیح بن عمرو کو فوج دے کر راجہ سے جنگ کرنے کے لئے روانہ کیا۔ اتفاقاً عبداللہ اشتر معہ دس سواروں کے دریا کے کنارے سیر کرتا ہوا سفیح کی نظر پڑا اس نے حملہ کیا۔ عبداللہ اشتر اور اس کے ہمراہی مقتول ہوئے۔ راجہ کے ملک پر حملہ ہوا لڑائی میں راجہ مارا گیا اور اس کا ملک مقبوضات خلافت میں شامل ہوا۔ عبداللہ اشتر کی بیوی اور اس کا بیٹا جو بیرخوارہ بچہ تھا اوس کا نام بھی عبداللہ ہی تھا گرفتار کرکے خلیفہ منصور کے پاس دوسرے قیدیوں کے ساتھ بھیجے گئے۔ منصور نے اس لڑکے عبداللہ بن عبداللہ اشتر کو اس کی ماں کے

ساتھ مدینہ بھیج دیا کہ عبداللہ اشتر کے رشتہ داروں کے سپرد کر دیا جائے ۔
ابھی علویوں کا مذکورہ ہنگامہ پورے طور پر فرو نہ ہونے پایا تھا کہ ۱۵۰ھ میں استاجیس (افراسیاب) نے نبوت کا دعویٰ کر کے خروج کیا اور منصور کی تمام توجہات اس فتنہ کے فرو کرنے میں صرف ہونے لگی ۔ ۱۵۷ھ میں منصور نے ہشام بن عمرو کو سندھ کی حکومت سے معزول کر کے اس کی جگہ معبد بن خلیل کو سندھ کا گورنر مقرر کیا۔ ذالحجہ ۱۵۸ھ میں منصور کا انتقال ہوا ۔ اس کی جگہ مہدی خلیفہ ہوا۔ ۱۵۹ھ میں خراسان کے اندر ابن مقنع نے دعویٰ الوہیت کے ساتھ ظہور کیا ۔ یہ تناسخ کا بھی قائل تھا۔ اسی سال معبد بن خلیل گورنر سندھ کا انتقال ہوا۔ اور اس کی جگہ روح بن حاتم سندھ کا گورنر مقرر ہوا ۔ ۱۶۹ھ میں خلیفہ مہدی کا انتقال ہوا۔ اس کی جگہ ہادی خلیفہ مقرر ہوا۔
اسی سال حسین بن علی بن حسن مثلث بن حسن ۔ مثنیٰ بن حسن بن علی بن ابی طالب نے مدینہ میں خروج کیا ۔ اور مکہ میں آکر ماہ ذی قعدہ مقتول ہوئے ۔ مکہ میں جب حسین بن علی کا عباسی لشکر سے مقابلہ ہوا تو وہاں بعض ترکوں اور ہندی غلاموں نے حسین کا ساتھ دیا تھا۔ سندھ کی گذشتہ لڑائی میں عبداللہ اشتر کے مقتول ہونے پر اس کی بیوی (سندھ کے مذکورہ راجہ کی بیٹی) اور بیٹے کے ساتھ بعض برہمن بھی جو راجہ کے رشتہ دار تھے گرفتار ہو کر بطور جنگی قیدی کے منصور کے پاس پہنچے تھے ۔ منصور نے جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے ۔ ان کو مدینہ بھیج دیا تھا ۔ یہ جنگی قیدی جو ہندی غلام کہلاتے تھے حسین مذکور کے ساتھ ہو گئے تھے اور حسین بن علی بن مثلث مذکور کی کامیابی کو ہی اپنی کامیابی سمجھتے تھے ۔ حسین مذکور کے ساتھ ان میں سے بعض مقتول ہوئے اور بعض فرار ہو کر کسی نہ کسی طرح پھر سندھ میں واپس پہنچ گئے تھے ۔ انھیں لوگوں کی اولاد ہے جو اپنے آپ کو حسینی برہمن کہتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم نے کربلا کے میدان میں حضرت امام حسین علیہ السلام کا ساتھ دیا تھا ۔ کربلا کے میدان میں ان کا موجود ہونا تو سراسر غلط اور بے بنیاد ہے مگر ہاں حسین بن علی حسن مثلث کو حسین بن علی بن ابی طالب سمجھ لیا گیا ہے یہ لوگ راجہ داہر یا اس کے قریبی رشتہ داروں کی اولاد ہیں اور آج تک سندھ و پنجاب میں پائے جاتے ہیں اور ہندو مسلمانوں کے قدیمی ہمدردانہ تعلقات کا زندہ ثبوت ہیں ۔ ۱۷۰ھ

میں ہادی کا انتقال ہوا۔ اور اس کی جگہ ہارون الرشید خلیفہ ہوا۔ ابو تراب حاجی گورنر سندھ کے فوت ہو جانے پر ۱۷۱ھ میں ہارون الرشید نے ابو العاص کو سندھ حکومت دیکر بھیجا۔ ۱۸۰ھ میں ابو العاص کی جگہ اسحٰق بن سلیمان سندھ کا گورنر مقرر ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جس طرح عباسیوں کی خلافت اپنے معراج کمال کو پہنچی اسی طرح سندھ کا گورنر بھی ہندوستان کے تمام راجوں مہاراجوں میں سب سے بڑی طاقت سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ قنوج کے راجہ نے خود کوشش کرکے ابو العاص گورنر سندھ کی معرفت دار الخلافہ بغداد سے اپنے نیازمندانہ تعلقات قائم کئے۔ پنجاب و گجرات کے راجاؤں نے گورنر سندھ کے پاس خراج بھیجنا منظور کیا۔

سندھ کے علم و فضل و تہذیب کے اثرات

سندھ کا ملک علم و فضل و تہذیب میں یہاں تک ترقی کر چکا تھا کہ اس کی شعاعیں بنگال و تبت تک پڑنے لگیں اور علم و علماء کی قدردانی نے ہندوستان کے باکمالوں کو عزت کے ساتھ بغداد تک پہنچا دیا۔ اس زمانے میں قنوج کے راجا کو بغداد میں ملک الہند کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ ملک الہند کی طرف سے خلیفہ بغداد کے لئے سوغاتیں اور تحائف پہنچا کرتے تھے۔ قنوج کے اندر اسلام اور مسلمانوں کو بڑی عزت و تعظیم کے ساتھ دیکھا جاتا تھا۔ اسحٰق بن سلیمان دس سال تک سندھ کا گورنر رہا۔ ۱۸۴ھ میں اس کی جگہ داؤد بن یزید بن حاتم سندھ کا گورنر مقرر ہوا۔ یہ بڑا علم دوست اور عادل و عاقل شخص تھا۔ اس کے زمانہ میں صوبہ سندھ کی رونق و آبادی اور شان و شوکت نے بڑی ترقی کی ۱۹۲ھ میں خلیفہ ہارون الرشید نے مقام رقہ سے بغداد آکر خراسان کے دورے کا ارادہ کیا۔ اس زمانے میں ہارون الرشید کی طبیعت ناساز تھی۔ شاہی طبیب حکیم جبرئیل بن بختیشوع خلیفہ کے ہمراہ تھا۔ خلیفہ نے داؤد بن یزید گورنر سندھ کی معرفت قنوج کے راجہ کو خط لکھا کہ ہم ایک طویل سفر کے لئے دار الخلافہ سے روانہ ہو رہے ہیں۔ ہماری طبیعت ناساز ہے لہٰذا تم اپنے خاص طبیب مانک چند کو ہمارے پاس بھیج دو کہ وہ اس سفر میں ہمارے ساتھ رہے۔ ہم جس وقت بلخ پہنچ جائیں گے تو اُس کو تمھارے پاس بحفاظت روانہ کر دیں گے۔ اس واقعہ کو ابن جریر طبری نے جو صرف تینتیس سال

بعد ۲۲۵ھ میں پیدا ہوئے اپنی تاریخ میں درج کیا ہے۔ تاریخ طبری کا ترجمہ ابو صالح بن منصور بن نوح سامانی کے وزیر ابو علی محمد نے ۳۵۰ھ کے قریب فارسی زبان میں کیا تھا۔ اس کے الفاظ یہ ہیں۔

"وھارون از نہرواں بیرون کرد براہ عمان بسوئے ملک ہندوستان فرستاد با خواستہ بسیار وگفت مرا علت بسیار شدہ است وسفرے دراز دور پیش آمدہ است آں پرشک (حکیم) راکہ منکبہ (مانک چند) نام است بفرست تا بخراسان آمد چوں بلخ آئیم اورا بسوئے تو باز فرستیم و ملک ہندوستان منکبہ حکیم را نام است بفرست تا بخراسان و علاجش کرد پس ہارون راآں بیماری بگرگان زیادت شد اورا گفتند از ہوا ہا ہوائے طوس تندرست۔ ہارون از گرگان برفت بماہ صفر بسال نود وسہ بطوس شد و آں جا بمرد ومیاں بختیشوع (جبرئیل بن بختیشوع) و منکبہ خلافت (اختلاف) افتاد بدارو ہاکہ ہارون را بدادند...... ومنکبہ باز بنزد ملکان خود بہ ہندوستان آمد"

طوس میں پہنچ کر خلیفہ ہارون الرشید بماہ جمادی الثانی ۱۹۳ھ اسی مرض میں فوت ہو گیا مگر مرتے وقت یہ حکم دے گیا کہ ہندی طبیب کو حسب وعدہ قنوج ضرور پہنچا دیا جائے چنانچہ مانک چند کو طوس سے قنوج پہنچا دیا گیا۔ اس واقعہ سے کم از کم اس بات کا ثبوت ضرور بہم پہنچتا ہے کہ اس زمانے میں ہندو راجہ مسلمانوں کے خلیفہ کی فرمائشوں کا پورا کرنا اپنا فرض جانتے تھے چاہے اس فرض کا نام اخلاقی فرض ہی رکھ لیجئے یہ بھی ثبوت ملتا ہے کہ دربار خلافت کو ہندو درباروں کے طبیبوں تک کے نام بھی معلوم تھے جو تعلقات کے گہرے اور قوی ہونے کی ایک دلیل ہے۔ ہارون الرشید کے بعد اس کا بیٹا امین تخت نشین ہوا۔ مگر ایران وخراسان وغیرہ ممالک مشرقیہ دوسرے بیٹے مامون کی حکومت میں رہے۔ پانچ سال تک دو عملی اور دونوں بھائیوں کی مخالفت رہی۔ مگر داؤد بن یزید گورنر سندھ کی قابلیت نے سندھ میں کوئی مضر علامت پیدا نہ ہونے دی۔ داؤد بن یزید نے اس زمانے میں سندھ کا خراج بھی دربار خلافت کو روانہ نہیں کیا بلکہ تمام خزانہ اسی ملک کے انتظام اور رفاہ رعایا کے کاموں میں

خرچ کر کے اپنی قبولیت اور شوکت کو ترقی دی۔

۱۹۸ھ میں امین قتل ہوا۔ اور مامون الرشید خلیفہ بنا۔ مامون الرشید کے تخت نشین ہوتے ہی پھر ہارون الرشید کے زمانے کی شوکت خلافت عباسیہ میں واپس آگئی۔ داؤد بن یزید نے بھی مامون کے نام پر لوگوں سے بیعت لی اور اپنی اطاعت کا اقرار نامہ بھیج دیا۔ مامون نے اس تجربہ کار اور لائق گورنر کو اس کی جگہ پر قائم رکھا اور سندھ کے خراج کا بھی اس سے کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ ۲۰۵ھ میں داؤد کا انتقال ہوا۔ اس کی جگہ اس کے بیٹے بشر بن داؤد کو سندھ کی حکومت ملی اسی سال قوم زط نے عراق میں بغاوت کی۔ عیسیٰ بن یزید اس مہم پر مامور ہوا۔ یہ بغاوت ۲۱۹ھ تک تھوڑی بہت جاری رہی۔ بشر بن داؤد نے مقررہ رقم (جو دس ہزار درہم سالانہ تھی) دار الخلافہ کو نہیں بھیجی۔ لہٰذا ۲۱۱ھ میں حاجب بن صالح کو سندھ کا گورنر بنا کر بھیجا گیا۔ مگر بشر نے حاجب کو چارج دینے سے انکار کیا اور مقابلہ پر آمادہ ہو گیا۔ دو برس تک حاجب پریشان و ناکام رہ کر واپس ہوا تو خلیفہ مامون الرشید نے اپنے ایک قریبی رشتہ دار غسان بن عباد کوفی کو ۲۱۳ھ میں بشر کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا۔ بشر نے غسان کے پاس پیغام بھیجا کہ اگر مجھ کو کوئی نقصان نہ پہنچا تو اور خلیفہ کے پاس بغداد بھیج دو تو میں اپنے آپ کو تمہارے حوالے کرتا ہوں غسان نے اس شرط کو قبول کر لیا اور بشر کو خود ہمراہ لے کر بغداد گیا۔ خلیفہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ بشر نے تمام روپیہ رعایا کی فلاح و بہبود میں خرچ کیا ہے تو اس کا قصور معاف کر دیا۔ غسان اپنی طرف سے سندھ میں موسیٰ بن یحییٰ کو حاکم مقرر کر گیا تھا خلیفہ نے اس تقرر کو پسند کر کے موسیٰ بن یحییٰ کے پاس سند حکومت بھیج دی۔ ۲۱۶ھ میں موسیٰ نے ایک ماتحت راجہ کو جس نے بغاوت و سرکشی اختیار کر لی تھی قتل کیا۔ ۲۱۸ھ میں خلیفہ مامون الرشید عباسی کا انتقال ہوا۔ اس کی جگہ اس کا بھائی معتصم بن ہارون تخت نشین ہوا۔ اور موسیٰ بن یحییٰ کو بدستور سندھ کی حکومت پر مامور رکھا۔ ۲۲۱ھ میں موسیٰ بن یحییٰ کا انتقال ہوا۔ اور مرتے وقت اپنے بیٹے عمران کو سندھ کی حکومت سپرد کر گیا۔ خلیفہ معتصم نے بھی عمران بن موسیٰ کے پاس سند حکومت بھیج دی۔ عمران کے زمانہ میں سرحد بلوچستان کے قریب رہنے والے جاٹوں نے علم بغاوت بلند کیا۔ اس بغاوت کا سبب عراق عرب کے جاٹوں یعنی زطوں کی بغاوت

تھی جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ عمران نے اس بغاوت کو فرو کیا۔ اور اس علاقے میں ایک شہر البیضا کے نام سے آباد کیا۔ یہاں سے ملتان گیا۔ پھر وہاں سے قندابیل نامی شہر میں گیا جو پہاڑ پر آباد تھا۔ قندابیل میں خلیل بن محمد گورنر سندھ کے ماتحت حکومت کرتا تھا اس سے آثار سرکشی معائنہ کرکے عمران نے اس کو قتل کر دیا۔ عمران کا دو سال کے بعد انتقال ہوگیا۔ اس کی جگہ فضل بن یامان سندھ کا فرماں روا ہوا۔ چند ہی روز کے بعد وہ بھی فوت ہوا تو اس کا بیٹا محمد بن فضل سندھ کا حاکم ہوا۔ محمد بن فضل نے ایک بیڑہ جہازوں کا تیار کرکے مہاراشٹر و مالابار کے ساحل پر چڑھائی کی۔ اس کی غیر موجودگی میں اس کے بھائی ماہان نے سندھ پر قبضہ کرکے اپنی خود مختاری کا اعلان کیا اور خلیفہ معتصم کی خدمت میں درخواست بھیجی کہ مجھ کو سندھ کی حکومت عطا ہو۔ مگر ماتحت راجاؤں اور رئیسوں نے مل کر اس کو قتل کر دیا اور اپنی خود مختاری کا اعلان کیا۔ ۲۲۷ھ میں معتصم کا انتقال ہوا۔ اس کی جگہ واثق خلیفہ ہوا معتصم کے زمانے میں بابک خرمی کا فتنہ برپا ہوا اور خلیفہ کی تمام تر توجہ اسی طرف منعطف رہی اُدھر ماوراء النہر میں سرکشیوں اور بغاوتوں کا سلسلہ جاری ہوا۔ خاص بغداد میں عربوں اور ترکوں کی رقابت کے ہنگامے نے خطرناک صورت اختیار کی اور سندھ کے صوبے کی طرف متوجہ ہونے کی مہلت ہی دربارِ خلافت کو نہ مل سکی۔ سندھ کے صوبے کی یہ خود مختاری مرکزی حکومت یعنی دربار خلافت کے مصروف آلام ہونے کا لازمی نتیجہ تھا۔ نہ صرف سندھ بلکہ اور بھی صوبے جو بغداد سے زیادہ فاصلے پر تھے خود مختار رہنے لگے۔

سندھ کی خود مختاری سندھ کی خود مختاری کی نوعیت یہ تھی کہ اس ملک کے چھوٹے چھوٹے قطعات پر کہیں مسلمان اور کہیں ہندو گورنر سندھ کی ماتحتی میں حاکم تھے۔ ان تمام حاکموں نے خود مختار ہو کر خراج ادا کرنا بند کر دیا اور ہر ایک نے یہ کوشش کی کہ دربارِ خلافت سے میرا براہِ راست کچھ نہ کچھ تعلق قائم رہے اور گورنر سندھ کی ماتحتی سے آزادی حاصل ہو۔ چنانچہ ایک ملک سندھ میں کئی ریاستیں قائم ہوگئیں۔ خلافت میں دم بدم ضعف آتا گیا دربارِ خلافت پر جاہل ترکی غلاموں کا قبضہ ہوگیا۔ ایران و خراسان پر صفاریوں نے تسلط بٹھا لیا۔ بحرین و کوفہ میں زنگیوں پھر قرمطیوں کے ہنگامے شروع ہو گئے۔ سندھ

کے تعلقات حقیقتاً دربار خلافت سے منقطع ہو گئے۔ مگر بظاہر ۲۵۸ھ تک باقی رہے۔ ۲۶۵ھ تک سندھ پر باقاعدہ گورنروں نے حکومت کی ۲۲۵ھ سے ۲۵۸ھ تک یہ حالت رہی کہ سندھ کے رئیسوں نے خلفائے بغداد کی سیادت کو برابر تسلیم کیا۔ باقاعدہ خراج تو سندھ سے جانا بند ہو گیا۔ مگر اس خوف سے کہ کہیں دارالخلافہ کے جھگڑوں سے فارغ ہو کر خلیفہ اس طرف فوجیں روانہ نہ کر دے اور ہم کو ہماری خود مختاری کا مزا نہ چکھائے۔ رؤسائے سندھ معمولی ہدیئے اور تحفے روانہ کرتے خوشامد عرضیاں بھیجتے اور اپنی وفاداری واطاعت کا یقین دلاتے رہتے تھے۔ ایک دوسرے کی شکایت بھی کرتے اور اپنے آپ کو مصروف پریشانی ظاہر کرکے زرخراج کے نہ بھیجنے کا عذر بھی پیش کرتے رہتے تھے۔ خلیفہ چونکہ کوئی مؤثر کارروائی اس ملک میں نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے وہ اس زبانی اطاعت اور اقرار فرماں برداری ہی کو غنیمت سمجھ کر سندھ کو اپنا صوبہ سمجھتا تھا۔ چنانچہ ۲۳۵ھ میں جب خلیفہ متوکل نے اپنے تینوں بیٹوں محمد۔ طلحہ اور ابراہیم کی بیعت ولی عہدی لے کر تینوں میں اپنے مقبوضہ ملکوں اور صوبوں کو تقسیم کیا ہے تو اس تقسیم نامہ میں صوبہ سندھ کا نام بھی موجود ہے۔ خلیفہ معتمد علی اللہ کے زمانے میں یعقوب بن لیث صفار نے سندھ پر قبضہ کیا اور سندھ کے رئیسوں سے خراج وصول کرکے اقرار اطاعت بھی لیا۔ مگر چند ہی روز کے بعد ۲۶۵ھ میں یعقوب کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد ممالک مشرقیہ پر سامانیوں کا تسلط ہوا۔ وہ سندھ کی طرف متوجہ نہ ہو سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملتان اور منصورہ میں دو بڑی خود مختار اسلامی ریاستیں قائم ہو گئیں اور انھوں نے اپنی ہمسایہ ہندو ریاستوں کے ساتھ دوستانہ و ہمدردانہ تعلقات قائم کر لئے۔

عہدِ عباسیہ میں ہندو مسلم تعلقات

ملکِ سندھ پر پورے چالیس سال خلفائے بنو امیہ کی حکومت رہی۔ ان کے بعد پورے نوے سال تک سندھ خلفائے عباسیہ کی شہنشاہی میں شامل رہا۔ جس پر خلفائے عباسیہ کے مقرر کئے ہوئے گورنر حکومت کرتے تھے ۲۲۵ھ سے ۲۵۸ھ تک یعنی تینتیس سال سندھ میں چھوٹے چھوٹے رئیس خود مختار مگر خلیفۂ بغداد کو اپنا آقا تسلیم کرتے رہے۔ ۲۵۸ھ سے ۲۶۵ھ تک یعنی سات سال بجائے عباسی خلیفہ کے

یعقوب بن لیث صفار کی سیادت و شہنشاہی مسلم رہی اور اس نے غیر مقررہ طور پر کچھ خراج بھی وصول کیا۔ اس کے بعد سندھ کا ملک خلفاء یا کسی دوسری شہنشاہی کے اثر سے بالکل آزاد ہو گیا۔ جس میں ملتان و منصورہ کی دو وسیع اور طاقتور خود مختار اسلامی ریاستیں قائم ہو گئیں۔ خلفائے بنی امیہ کے چالیس سال ایسے تھے کہ مسلمانوں نے سندھ پر خالص اسلامی اصول کے موافق حکومت کی۔ انھوں نے سندھی رعایا کے مذہب میں قطعاً کوئی دخل نہیں دیا اور اس ملک کے پرانے مروجہ مذہب کے ساتھ اس قدر رواداری و مسالمت کا برتاؤ کیا کہ اس سے بڑھ کر رواداری کا تصور کبھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس عرصہ میں سندھی لوگ اسلام کی خوبیاں دیکھ دیکھ کر بخوشی اسلام میں داخل ہوتے رہے۔ یعنی اسلام کے محض نمونے نے لوگوں کو اپنی طرف کھینچا۔ خلفائے عباسیہ نے شروع ہی سے تصنیف و تالیف، علوم کی تدوین اور یونانی علوم کے تراجم کی طرف توجہ مبذول کی۔ حکمت و فلسفہ اور علم کلام کا زور شور ہوا۔ عقائد و اعمال مذہبی عقل کی کسوٹی پر کسے جانے لگے اور دلیل و برہان کے ذریعہ مذہبی عقائد و احکام کی خوبی ثابت کی جانے لگی۔ یہ علمی سرگرمی بجائے خود ایک اعلیٰ درجہ کی مذہبی رواداری تھی اور بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ مذہبی رواداری کو اس طرح عباسیوں نے پہلے سے دگنا کر دیا تھا۔ محمد بن قاسم جب سندھ میں داخل ہوا ہے تو یہاں برہمنی مذہب اور بدھ مذہب میں مقابلہ اور رقابت کا سلسلہ جاری تھا۔ دونوں مذہبوں کے پیرو ملک سندھ میں موجود تھے۔ اسلامی حکومت کے قائم ہوتے ہی چونکہ مذہبی آزادی کا اعلان ہو گیا تھا اور برہمنوں کی مرادیں اسلامی حکومت میں خاطر خواہ عہدے پا لینے سے پوری ہو چکی تھیں لہٰذا بدھوں اور برہمنی مذہب کے حامیوں کا آپس میں مباحثے کرنا اور ایک دوسرے کی تخریب کے لئے کوششیں کرنا بھی موقوف ہو گیا تھا۔ دونوں مذہبوں کے ماننے والے امن و امان اور صبر و سکون کے ساتھ اسلامی حکومت کے سایہ میں اپنے اپنے طریقوں پر قائم رہ کر زندگی بسر کرنے لگے۔

سندھ میں مذہبی مناظروں اور مباحثوں کا سلسلہ

عباسیوں کی خلافت میں چونکہ دلیل و برہان کی قوت سے مذہب کی صداقت ثابت کرنے کا رواج ہو گیا تھا لہٰذا سندھ میں بھی مذہبی مباحثوں اور مناظروں کا سلسلہ جاری ہوا۔ ہندوؤں اور بدھوں کو اپنی اپنی سمجھ

اور قابلیت کے موافق عقائد اسلامی پر آزادانہ اور علانیہ اعتراضات کرنے کی ترغیب حاصل ہوئی۔ مسلمانوں نے ہر طرح ان کی تسکین کی اور مباحثہ میں لاجواب ہو کر ان کو اسلام کی صداقت کا اقرار کرنا پڑا۔ یہ گویا ہندوؤں اور بُدھوں کے مسلمان ہونے کا ایک نیا باب تھا جو خلافتِ عباسیہ کے عہد میں کھلا۔ چنانچہ جہم بن صفوان سے جو علم کلام کے بانی واصل بن عطا کا شاگرد اور فرقہ جہمیہ کا بانی ہے۔ چند بدھ مذہب کے عالموں کا وجود باری تعالیٰ کے مسئلہ میں مباحثہ ہوا۔ بُدھ مذہب والے ہستی باری تعالیٰ کے قائل نہ تھے۔ اس مباحثہ میں جہم اپنے حریفوں کو خاموش نہ کر سکا۔ اس نے بُدھوں کے اعتراضات لکھ کر واصل کے پاس بصرے میں بھیجے وہاں سے واصل نے ان کے جوابات لکھ کر جہم کے پاس سندھ میں بھیج دیئے۔ جہم نے جب بُدھوں کو ان کے اعتراضوں کے جواب سُنائے تو انھوں نے کہا کہ جس شخص نے یہ جوابات لکھ کر بھیجے ہیں ہم کو اس کو پتہ بتاؤ۔ تاکہ ہم خود اس کے پاس پہنچ کر تسکین حاصل کریں۔ آخر یہ بدھ علمار بصرہ پہنچے۔ واصل سے گفتگو کی اور اسلام کی صداقت کے دلائل سُن کر مسلمان ہوئے۔ ہارون الرشید کے عہد خلافت میں اس ملک کے ایک بدھ راجہ نے اسلام کی حقانیت کے دلائل سُن سُن کر اپنا میلان طبع اسلام کی طرف ظاہر کیا۔ درباری پنڈتوں نے راجہ کے خیالات کو اسلام کی طرف سے پھیرنے کے لئے اسلام کے خلاف دلائل بیان کرنے شروع کئے۔ راجہ نے ہارون الرشید کو خط لکھا کہ آپ اپنے مذہب کے کسی عالم کو میرے پاس بھیج دیجئے تاکہ اس سے مباحثہ کیا جائے۔ اگر اس نے اپنے مذہب کی صداقت وحقانیت ثابت کر دی اور ہمارے پنڈت مباحثے میں ہار گئے تو میں اسلام قبول کرلوں گا۔ ہارون الرشید نے ایک محدث کو بھیج دیا۔ محدث صاحب چونکہ علم کلام سے ناواقف تھے اس لئے وہ بُدھ پنڈتوں کے سوالات کا مسکت جواب نہ دے سکے۔ راجہ نے ہارون الرشید کو لکھا کہ کوئی ایسا شخص بھیجئے جو دلائل عقلی سے بحث کر سکے۔ چنانچہ ہارون الرشید نے معمر یا ابو خلدہ نامی ایک متکلم کو روانہ کیا جب وہ حدود ہندوستان میں داخل ہوا تو پنڈتوں نے اپنا ایک آدمی بھیج کر راستہ ہی میں اس کی قابلیت کا اندازہ کیا اور جب ان کو معلوم ہوا کہ اس شخص سے مباحثے میں مقابلہ کرنا دشوار اور راجہ کا مسلمان ہوجانا یقینی ہے تو انھوں نے اس مسلمان عالم کو راجہ کے دربار تک پہنچنے سے پہلے ہی زہر دلوا کر مروا ڈالا۔

سندھ کے طبیب اور عالم بغداد میں

اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ ہارون الرشید نے قنوج کے دربار سے مانک چند کو طلب کیا تھا۔ اس سے پہلے بھی کئی ہندی اور سندھی طبیب بغداد میں جا چکے تھے جو اپنے اپنے آبائی مذہب کے پابند تھے سندھ کے بہت سے نومسلموں نے قبولِ اسلام کرنے کے بعد مکہ و مدینہ کا سفر اختیار کیا۔ بعض تحصیلِ علم کے شوق میں وہاں بہوں رہے۔ بعض وہیں رہ پڑے چنانچہ ابو معشر نجیح جو مدینہ میں سکونت پذیر ہوگئے تھے اور فن مغازی و سیر کے امام سمجھے جاتے تھے ایک سندھی نومسلم تھے۔ جو ۱۷۰ھ میں فوت ہوئے اور ہارون الرشید نے ان کے جنازے کی نماز پڑھائی۔ رجاء نامی ایک بزرگ جو رجاء السندھی اسفرائینی مشہور ہیں۔ علم حدیث کے استاد اور سندھی نژاد تھے۔ اوپر موسٰی بن یحییٰ اور اس کے بیٹے عمران بن موسٰی گورنران سندھ کا ذکر آ چکا ہے۔ جس زمانے میں عمران بن موسٰی سندھ کا حاکم تھا۔ دوایہ سندھ ساگر میں ایک راجہ بدھ مذہب کا پیرو حکمراں تھا اس کی راجدھانی میں بدھ کا ایک بہت بڑا مندر تھا۔ اتفاقاً راجہ کا بیٹا بیمار ہوا۔ اس نے مندر کے پجاریوں کو بلا کر التجا کی کہ میرے بیٹے کے تندرست ہونے کے لئے اپنے بت سے التجا کرو۔ پجاری مندر میں گئے اور پوجا پاٹ کے بعد واپس آکر راجہ سے کہا کہ بت نے ہماری دعا قبول کر لی ہے۔ اب آپ کا بیٹا تندرست ہو جائے گا لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد راجہ کا بیٹا مر گیا۔ راجہ اس واقعہ سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے بت خانہ کو مسمار کرا دیا اور بت کو توڑ کر ریزہ ریزہ کر دیا۔ اتفاقاً اس کی راجدھانی میں چند مسلمان سوداگر گئے ہوئے تھے۔ اس نے ان کو بلوا کر کہا کہ میں اپنے مذہب کو تو جھوٹا اور غلط سمجھنے لگا ہوں۔ تم اپنے مذہب کے اصول بیان کرو۔ مسلمان سوداگروں نے خدائے تعالیٰ کی وحدانیت اور رسالت محمدیہ کا حال سنایا راجہ نے فوراً اسلام قبول کر لیا۔ یہ واقعہ ۲۲۲ھ کے قریب کا ہے جبکہ چند ہی سال بعد خلفائے عباسیہ کی باقاعدہ حکومت سے سندھ کا ملک کا آزاد ہونے والا تھا۔

مذکورہ بالا واقعات سے کم از کم یہ ضرور ثابت ہو جاتا ہے کہ عہد عباسیہ کے ابتدائی نوے سال کی مدت میں اسلام کو سندھی اور ہندی لوگ اچھی طرح سمجھنے لگے تھے اور

اسلام کی طرف ہندی راجاؤں کی توجہ محض اس لئے نہیں تھی کہ مسلمانوں کی سلطنت دنیا میں سب سے بڑی سلطنت تھی، بلکہ وہ اسلام کی ذاتی خوبیوں سے واقف ہو کر مسلمانوں کو واجب التکریم اور مستحق رعایت سمجھتے تھے۔ اور اسی سے قنوج و پنجاب تک مسلمان سوداگر اور مسلمان سفر آمد و رفت رکھتے تھے۔ سندھ کا ملک اس عرصہ میں مسلمانوں کا وطن مالوف بن چکا تھا۔ سندھی نومسلم اسلام اور علوم اسلامیہ سے واقف ہو کر عربی مسلمانوں کیلئے واجب التعظیم اور امام فن بننے لگے تھے۔ برہمنی مذہب کوئی بااصول اور علمی میدان میں آنے کے قابل مذہب نہ تھا بلکہ اس وقت تک وہ برہمنوں کی ایک قومی تحریک تھی جو بدھوں کی جگہ اپنا اقتدار محض ذات پات کی قیود کے ذریعہ قائم کرنا چاہتے تھے اور اپنے مذہب کے محکم اصول پیش نہیں کر سکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ بدھ مذہب ہی ہر جگہ اسلام کا مقابلہ کرنے کے لئے میدان مناظرہ میں آیا جس کے پاس سب سے زبردست اور حقیقتاً سب سے زیادہ کمزور ایک ہی ہتھیار تھا یعنی انکار ہستی باری تعالیٰ۔ ہندوستان کے جس جس حصہ میں اسلام پہنچا۔ وہاں من حیث المذہب نہ اس کی قابل تذکرہ مخالفت ہوئی۔ نہ کوئی ہندوستانی مذہب اس کے مقابلہ میں ٹھیر سکا۔ مسلمانوں نے نہ اس ملک کے مندروں کو ڈھایا۔ نہ اس ملک کے رہنے والوں کو خوف یا لالچ کے ذریعہ مسلمان بنانا چاہا۔ جس قدر لڑائیاں ہندو اور مسلمانوں میں ہوئیں وہ ایسے اسباب کی بنا پر ہوئیں کہ ان اسباب کی بنا پر ہندو ہندوؤں اور مسلمان مسلمانوں سے لڑ سکتے تھے۔ لڑتے رہے تھے۔ لڑ سکتے ہیں اور لڑتے رہیں گے۔ غرض ان لڑائیوں کا سبب مذہبی اختلاف ہرگز نہ تھا۔ یا کم از کم مسلمانوں نے تو ہرگز کسی کو محض اس لئے نقصان نہیں پہنچایا کہ اس کا مذہب اسلام نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو سندھ میں غیر مسلموں کو مسلمانوں کے ماتحت وہ مذہبی آزادی اور ہر قسم کی مراعات کبھی حاصل نہ ہو سکتیں جن کا بالتفصیل اوپر ذکر ہو چکا ہے۔

سندھ کی خود مختار اسلامی ریاستیں

۲۶۵ھ سے ملتان و منصورہ کی دونوں اسلامی ریاستیں بالکل آزاد و خود مختار ہو گئیں۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ علویوں اور شیعوں کے طرف داروں نے عجیب عجیب چالاکیوں اور نئی نئی ترکیبوں سے تمام عالم اسلام میں ایک ہلچل مچا دی تھی۔ مصر و افریقہ و شام و عراق و خراسان غرض ہر ملک میں عباسیوں کی حکومت کا تختہ اُلٹ دینے کی تیاریاں

ہو چکی تھیں۔

قرامطہ کے منادسندھ میں ۲۷۸ھ میں مذہب قرامطہ کی بنیاد رکھی گئی ۔ ان لوگوں نے بجائے خانہ کعبہ کے بیت المقدس کو اپنا کعبہ قرار دیا تھا ۔ ۲۸۶ھ میں ابو سعید قرمطی نے بصرہ پر قبضہ کرلیا ۔ ان لوگوں کی طاقت و شدت یہاں تک بڑھ گئی کہ انھوں نے حج بیت اللہ میں سخت رکاوٹیں پیدا کیں ۔ ۲۹۰ھ میں یحیٰی بن زکرویہ قرمطی لڑائی میں مارا گیا تو اس کے بھائی حسین نے اس کی جگہ متمکن ہوکر امیرالمومنین مہدی اپنا لقب رکھا ۔ ۲۹۴ھ میں قرامطہ نے حاجیوں کو قتل کیا اور خلیفہ کو خود ان کے مقابلے کے لئے نکلنا پڑا ۔ ۳۰۰ھ میں قرامطہ بحرین یعنی ساحل خلیج فارس سے فلسطین تک اور بصرہ سے مکہ معظمہ تک چھا گئے ۔ ماوراء النہر اور خراسان پر سامانی حکومت قائم ہوگئی ۔ آذربیجان و فارس پر غزنوی اور غوریوں کے طرفدار مسلط ہوگئے ۔ سامانیوں کو تو عباسی خلیفہ کی روحانی سیادت تسلیم تھی ۔ لیکن قرامطہ اور شیعہ عباسیوں کے سخت دشمن تھے ۔ ان حالات میں قرامطہ کا سندھ کی اسلامی ریاستوں کی طرف متوجہ ہونا ضروری تھا ۔ دربار بغداد کی طرف سے چونکہ مزاحمت اور طاقت سے استقلال کا سلسلہ قرامطہ کے خلاف جاری تھا ۔ لہٰذا قرامطہ کوئی فوج اور جنگی مہم تو نہیں بھیج سکے لیکن ان کے مناد اس ملک میں آتے رہے ۔ یہاں کے مرکزی مقاموں یعنی ملتان و منصورہ وغیرہ میں ان کو کوئی کامیابی حاصل نہ ہو سکی ۔ لیکن مضافات میں قرمطی تحریک کا چرچا ضرور کچھ نہ کچھ ہوا۔

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ دربار خلافت سے تعلق منقطع ہونے کے بعد سندھ میں ملتان و منصورہ کی دو طاقتور ریاستیں قائم ہوگئی تھیں لیکن یہ بھی ذہن نشین رہنا چاہیئے کہ ان دونوں اسلامی ریاستوں کے علاوہ اور بھی کئی چھوٹی چھوٹی اسلامی ریاستیں سندھ میں ان کے ساتھ ہی قائم ہو گئی تھیں جو مختلف سرداروں اور بعض ان لوگوں نے قائم کرلی تھیں جو محمد بن قاسم کے ہمراہیوں کی اولاد اور زیادہ تر پہاڑوں اور ریگستانوں کے دشوار گذار مقامات میں آباد تھے ۔ سندھ جب خلافت عباسیہ کے دربار سے منقطع ہوا تو ان لوگوں نے بھی جو بنو امیہ کے طرفداروں کی اولاد تھے اطمینان کا سانس لیا اور اپنی حالت کے مضبوط کرنے اور اولوالعزمی سے کام لینے

میں مصروف ہوئے۔

سندھ کی اسلامی ریاستوں کی اجمالی کیفیت

ان تمام اسلامی ریاستوں کی مجمل کیفیت جو مسعودی کی کتاب مروج الذہب اور اسی کے قریبی زمانے کے سفرناموں سے مستفاد ہوتی ہے یہ ہے کہ ملتان سے جنوب کی جانب ساحل بحر تک یقیناً ملتان و منصورہ کی دونوں زبردست اسلامی ریاستیں پھیلی ہوئی تھیں۔ ان دونوں ریاستوں کی حدود مقام الور پر جو راجہ داہر کا دارالسلطنت تھا ملتی تھیں۔ شہر الور ریاست منصورہ میں تھا الور سے شمال کی جانب ریاست ملتان کی حد شروع ہوجاتی تھی۔ ان دونوں ریاستوں کی مشرقی اور مغربی حدود کا صحیح تعین اور پتہ اس وقت بتانا دشوار ہے۔ مگر اس میں شبہ نہیں کہ ان ریاستوں کی مشرقی حدود پر چھوٹی چھوٹی ہندو ریاستیں پیدا ہوگئی تھیں۔ اور یہ مشرقی ہندو ریاستیں سابقہ صوبہ سندھ کا جزو تھیں۔ ان ہندو ریاستوں کے رئیس وہی ہندو سردار تھے جن کو مسلمانوں نے اپنی ماتحتی میں حاکم مقرر کیا تھا۔ ان ریاستوں سے ملتان و سندھ کی ریاستوں کے دوستانہ تعلقات تھے۔ ملتان و منصورہ کے مغرب کی جانب چھوٹی چھوٹی مسلمان ریاستیں تھیں۔ ان سے بھی منصورہ و ملتان کے اسی طرح دوستانہ تعلقات تھے جیسے ہندو ریاستوں سے تھے۔

مسعودی ۳۰۳ھ میں داخل سندھ ہوا ہے۔ وہ اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ ملتان کے اندر سامہ بن لوی بن غالب کی حکومت ہے۔ سامہ بن لوی بن غالب قبیلۂ قریش کا وہ شخص تھا جس نے آنحضرت صلعم کی ولادت سے پہلے جزائر عمان کے ساحل پر اقامت اختیار کرلی تھی اسی شخص کی نسل سے ملتان کا فرماں روا تھا۔ مسعودی کا بیان ہے کہ ملتان کی سلطنت میں ایک لاکھ کے قریب گاؤں آباد ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ ملتان میں ہندوؤں کا ایک بہت بڑا بت خانہ ہے جس کی پرستش اور زیارت کے لئے دور دور سے جاتری آتے ہیں اور موتی۔ سونا۔ چاندی۔ زیتون کا تیل اور خوشبودار چیزیں

چڑھ جاتے ہیں جب کوئی ہندو راجہ ملتان پر چڑھائی کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو ملتان کا امیر اس کو دھمکی دیتا ہے کہ میں تمھارے مندر کو تباہ کردوں گا اس لئے وہ حملہ آوری سے رُک جاتا اور امیر ملتان سے دوستانہ تعلقات قائم رکھتا ہے۔ ابن حوقل کا بیان ملتان کی نسبت یہ ہے کہ ملتان بہت بڑا شہر ہے۔ اس میں ایک قلعہ بنا ہوا ہے۔ ملک سرسبز ہے اور غلہ ارزاں مگر منصورہ کی سرسبزی کو نہیں پہنچتا۔ منصورہ کھیتی باڑی کے معاملہ میں ملتان پر فضیلت رکھتا ہے۔ امیر ملتان شہر سے باہر اپنے قلعہ میں رہتا۔ اور جمعہ کے دن ہاتھی پر سوار ہو کر شہر کے اندر جامع مسجد میں آتا ہے۔ یہاں کوئی خاص سکہ نہیں ہے۔ تمام ملکوں کے درہم و دینار یہاں چلتے ہیں۔ سندھی لوگ عراقیوں کا سا لباس پہنتے اور عراقی لوگ سندھی لباس استعمال کر لیتے ہیں ہندوؤں اور مسلمانوں کے لباس میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ ملتان اور منصورہ دونوں ریاستوں کے فرماں روا مطلق العنان ہیں ان میں سے کوئی ایک دوسرے کا ماتحت نہیں ہے۔

منصورہ کی ریاست

منصورہ کی ریاست میں بھی ایک قریشی امیر فرماں روا تھا۔ ریاست منصورہ سمندر کے ساحل سے شہر الور تک وسیع تھی۔ اس ریاست کا رقبہ ملتان کی ریاست سے بڑا تھا۔ اس میں تین لاکھ گاؤں آباد تھے۔ زراعت خوب ہوتی تھی۔ باغات کی کثرت تھی۔ تمام ملک اپنی سرسبزی و آبادی کے اعتبار سے قابل رشک حالت میں تھا۔ یہاں کا امیر ہبار بن اسود قریشی النسل تھا۔ ہبار بن اسود کی نسبت بیان کیا گیا ہے کہ یہ ان اشخاص میں سے تھا جن کی نسبت فتح مکہ کے بعد آنحضرت صلعم نے حکم دیا تھا کہ جہاں ملیں ان کو قتل کر دیا جائے۔ لیکن بعد میں ہبار نے اسلام قبول کر لیا اور آنحضرت صلعم نے اس کی خطاؤں کو معاف کر دیا تھا۔ ریاست منصورہ کی فوج بھی زبردست اور ہمہ اوقات کیل کانٹے سے درست اور مستعد مقابلہ رہتی تھی۔ ریاست منصورہ کو بلوچستان کی طرف سے حملہ آور ہونے اور لوٹ مار کرنے والے قبائل کا مقابلہ کرنا اور اپنی حدود کو محفوظ رکھنا پڑتا تھا۔ منصورہ کی فوج میں زرہ پوش جنگی ہاتھی بھی خاصی تعداد میں موجود تھے۔ شہر الور میں امیر منصورہ کا ایک نائب رہتا تھا۔ شہر الور کی دوہری فصیل تھی اس کے علاوہ اور بھی کئی مضبوط قلعے اور بڑے بڑے شہر اس ریاست

میں موجود تھے ۔ منصورہ اور ملتان کی ریاستوں میں عربی اور سندھی دونوں زبانیں بولی جاتی تھیں ۔ مسلمانوں کی یہ دونوں اسلامی ریاستیں اس قدر طاقتور تھیں کہ کوئی ہندو ریاست ان پر حملہ آور ہونے کی جرأت نہیں کر سکتی تھی ۔ ملتان کی ریاست منصورہ سے کسی قدر کمزور تھی ۔ لیکن ملتان کے مندر کی اہمیت نے اس کمی کو پورا کر دیا تھا ۔

مسلمانوں کی ایک ریاست مغربی سندھ میں توران نامی تھی ۔ مسعودی کے زمانے میں یہاں کے امیر کا نام ابوالقاسم تھا جو بصرہ کا رہنے والا تھا ۔ کیکانان میں بھی ایک اسلامی ریاست تھی ۔ جہاں کے حاکم کا نام معین بن احمد تھا ۔ یہ اپنی ریاست میں خلفائے عباسیہ کے نام کا خطبہ پڑھواتا تھا ۔

ایک اور ریاست قصدار تھی جو ملتان سے بیس منزل کے فاصلہ پر شمال و مغرب کی جانب واقع تھی ۔ اس ریاست میں خارجی لوگ زیادہ آباد تھے اور ملک میں ہر قسم کا امن و امان تھا ۔

سندھ کی ہندو ریاستیں

سندھ کی ہندو ریاستوں میں بھی مسلمان آباد تھے مسلمانوں کی مسجدیں بھی آباد اور مسلمانوں کو ہر قسم کے ہمسرانہ حقوق حاصل تھے اور ہندو راجہ ان کی بہت کچھ رعایت اور خاطر مدارات کرتے تھے ۔ ۲۷۰ھ میں پنجاب کے ایک راجہ نے جس کا نام مہروگ بن رائیک تھا ۔ ابوالمنذر عبداللہ بن عمر بن عبدالعزیز فرماں روائے منصورہ کو خط لکھا کہ میرے پاس کسی ایسے مسلمان عالم کو بھیجئے جو ہندی زبان جانتا ہو اور اسلام کے اصول و عقائد مجھ کو سمجھا سکے ۔ فرماں روائے منصورہ نے عراق کے ایک عالم کو جو عرصہ سے ہندوستان کے شہروں میں سفر کرتا رہا تھا اور اس ملک کی زبان سے خوب اچھی طرح واقف تھا بلا کر اس خط کا مضمون سنایا اس نے تمام اسلامی عقائد و احکام کو اس ملک کی زبان میں نظم کر کے یہ نظم راجہ کے پاس بھجوا دی ۔ راجہ اس نظم کو پڑھ کر بہت ہی خوش ہوا ۔ اور ابوالمنذر فرماں روائے منصورہ کو لکھا کہ اس نظم کے مصنف کو میرے پاس بھیج دیجئے ۔ حاکم منصورہ نے اس عراقی عالم کو راجہ کے پاس بھیج دیا ۔ وہ ۲۷۳ھ تک راجہ کے پاس رہا ۔ اس عرصہ میں راجہ مسلمان ہو گیا ۔ مگر اپنی رعایا کے خوف سے اپنا اسلام

کا اعلان نہیں کر سکا۔ عراقی عالم نے واپس آکر ابوالمنذر عبداللہ حاکم منصورہ سے بیان کیا کہ راجہ نے مجھ سے قرآن مجید کا ترجمہ ہندی زبان میں شروع سے سورۂ یٰسین تک سنا جب یہ آیت آئی کہ قَالَ مَنْ یُّحْیِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ۝ قُلْ یُحْیِیْهَا الَّذِیْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۝ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِیْمٌ ۝ تو اس کا ترجمہ سن کر راجہ نے کہا کہ مجھکو دوبارہ سناؤ۔ میں نے دوبارہ ترجمہ سنایا۔ راجہ اپنے تخت سے اُترا اور چند قدم چل کر خاک پر جو پانی چھڑکنے کی وجہ سے گیلی تھی اپنے گال اور پیشانی رکھ دی اور زار و قطار روتا رہا اس کا چہرہ گِل آلودہ تھا اور وہ بے اختیار کہتا تھا کہ یہی وہ ازلی معبود ہے جس کی مانند کوئی نہیں اس عراقی عالم نے یہ بھی کہا کہ راجہ مہروگ نے ایک گھر بنا لیا ہے۔ اس میں جا کر وہ تنہائی میں نماز پڑھتا ہے اور لوگوں سے کہہ رکھا ہے کہ اس مکان میں تنہائی حاصل کرنے کے لئے چلا جاتا ہوں۔ اس واقعہ کو بزرگ بن شہریار نے اپنے سفرنامہ عجائب الہند میں بیان کیا ہے۔

بشاری مقدسی کا بیان

۳۸۰ھ کے قریب زمانہ کا حال بشاری مقدسی نے لکھا ہے کہ ملتان کے لوگ شیعہ ہیں مگر دوسرے شہروں اور منصورہ میں عام طور پر لوگ اہلِ حدیث اور داؤدی مذہب کے پیرو ہیں۔ امام ابوحنیفہ کے پیرو اس ملک میں موجود ہیں۔ مگر مالکی و حنبلی نہیں ہیں ۳۰۳ھ میں مسعودی نے یہ مذہبی تفریق نہیں دیکھی تھی۔ مگر ۳۸۰ھ تک مسلمانوں میں مذہبی فرقے پیدا ہوگئے تھے۔ اسی عرصہ میں ملتان کے اندر شیعوں کی کثرت ہوئی ۳۷۵ھ میں تقریباً تمام عالم اسلامی شیعی طاقت سے مرعوب و مغلوب نظر آنے لگا تھا حکومت بغداد پر دیلمیوں کا تسلط تھا۔ انھیں کے نام کا خطبہ بغداد کے ممبروں پر پڑھا جاتا تھا۔ فارس و ایران اور مکران و بلوچستان سب پر دیلمیوں کی خودمختارانہ حکومت تھی۔ بحرین و نجد و شام پر قرامطہ مسلط تھے مصر و فلسطین وغیرہ سب عبیدیوں کے تسلط میں تھے۔ حجاز پر کبھی قرامطہ کبھی عبیدی قابض ہو جاتے تھے صرف ماوراء النہر کی سامانی سلطنت سُنی مذہب رکھتی تھی۔ مگر سامانیوں میں ضعف و انحطاط پیدا ہو چکا تھا اسی زمانے میں خاندان دیلمیوں کے اثر سے فیصیت [illegible] تھا۔ مگر منصورہ کی ریاست [illegible] اس افراتفری [illegible] نہیں ہوئی۔ اسی زمانے سے ملتان اور منصورہ اور تمام دوسری

سندھی مسلم ریاستوں کے درمیان نااتفاقی پیدا ہوئی اور ایک دوسرے سے برسر جنگ رہنے لگے اس حالت کے پیدا ہوتے ہی سندھ میں مسلمانوں کے اثر و اقتدار اور اشاعت اسلام کو سخت نقصان پہنچا۔ اوپر ذکر آ چکا ہے کہ قرامطہ کے واعظین نے اس ملک میں آکر بعض لوگوں کو اپنے مذہب کی دعوت دی تھی۔ اب دیلمیوں کے اقتدار اور قرامطہ کی فتح مندیوں کے افسانوں نے اس ملک کے بہت سے جاہلوں کو گمراہ کیا اور قرامطہ کی ایک جماعت نے مکران و توشکی کی ریاستوں میں داخل ہو کر اور بلوچوں کے غارت گر فرقوں کو اُبھار کر ریاست منصورہ کے مغربی حدود پر حملہ آوری شروع کردی۔ اُدھر سے ملتان کی ریاست حملہ آور ہوئی اس طرح منصورہ کے خلاف دوسری اردگرد کی ریاستیں بھی اُٹھ کھڑی ہوئیں اور سب نے حملہ آور ہو کر ۳۸۴ھ میں منصورہ کی ریاست کا خاتمہ کردیا۔

منصورہ کی ریاست کی بربادی کا اثر

منصورہ کی ریاست کے برباد ہوتے ہی سندھ میں اسلامی رعب اور اسلامی طاقت کا زوال شروع ہو گیا قرامطہ نے منصورہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور مسلمانوں کی نااتفاقی نے سندھ کے اندر اسلامی حکومت کا گویا خاتمہ کردیا۔ ریاست منصورہ کا اکثر حصہ ہندوؤں کے قبضہ میں چلا گیا اور ملتان کی ریاست جو منصورہ سے کمزور تھی تنہا رہ گئی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ امیر ناصر الدین سبکتگین نے غزنی میں اپنی ایک الگ مستقل سلطنت قائم کرلی تھی۔ ریاست منصورہ کی بربادی کے بعد قرامطہ کا زور شور بڑھ گیا اور پہاڑی قبیلوں میں اس مذہب بلکہ لا مذہبی کی خوب ترقی ہوئی۔ سامانی سلطنت اور ان کے بعد غزنوی سلطنت قرامطہ کی سخت دشمن تھی اور اسی لئے کوہ سلیمان اور دریائے سندھ کے ساحل تک سامانی فوجیں اور ان کے بعد سبکتگین کی فوجیں قرامطہ کے تعاقب میں آتی رہتی تھیں۔ لہٰذا پنجاب کے راجہ جے پال کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ کہیں میری حدود مملکت میں یہ فوجیں دست درازی نہ کریں۔ اس نے قرامطہ کی اس کوشش کو کہ انھوں نے ریاست منصورہ کو برباد کردیا۔ بڑے اطمینان سے دیکھا۔ اور ملتان کی متصلہ ہندو ریاست بھاطنہ کے راجہ کو شریک مشورہ کرکے یہ تدبیر سوچی کہ سلطنت غزنی کے مشرقی سرحدی قبائل کو جو بوجہ جہالت قرامطہ کی جانب مائل تھے ترغیب دی جائے،

اور ملتان پر حملہ کرا کر ان کی حکومت ملتان میں قائم کرادی جائے۔ چنانچہ جے پال اور بھاطنہ کے راجہ نے سرحدی قبائل کے سردار حمید خاں لودھی سے اول ایک معاہدہ لکھایا اور پھر اپنی فوجوں کے ذریعے مدد دے کر ۳۸۵ھ میں حمید خاں کے ہاتھوں ملتان کے قریشی عربی خاندان کی حکومت کا خاتمہ کرادیا۔ حمید خاں کا تسلط ملتان پر اس لئے اور بھی جلدی قائم ہوگیا کہ ہندو راجاؤں کے علاوہ قرامطہ بھی اس کے دوست تھے اور وہ خود قرمطی مسلک کا پیرو تھا۔ جے پال نے حمید خاں لودھی کو حاکم ملتان بنانے میں محض اسی لئے دلچسپی لی تھی کہ وہ قرمطی تھا اور جے پال جانتا تھا کہ سبکتگین کے لئے اس طرح بہت سی مشکلات پیدا ہوسکتی ہیں۔ مگر حمید خاں لودھی بھی یقیناً بہت بیدار مغز اور دور اندیش شخص تھا کہ اس نے ملتان کی فرمانروائی حاصل کرتے ہی ایک درخواست سبکتگین کی خدمت میں بھیجی کہ میں مسلمان اور شریعتِ اسلام کا پابند ہوں مجھ کو قرامطہ سے کوئی تعلق نہیں اس لئے توقع رکھتا ہوں کہ آپ میرے علاقے کو اپنی فوجوں کا جولاں گاہ نہ بنائیں گے۔ سبکتگین نے حمید خاں کی اس درخواست کے جواب میں اس کو تسلی و تشفی کا خط لکھا اور ملتان میں اس کی حکومت کو بہ نظر استحسان دیکھا۔

مذہب قرامطہ عباسیوں کی خلافت و حکومت کے خلاف علویوں نے جو عالمگیر جد و جہد جاری رکھی تھی اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے بعض ایرانی الاصل چالاک لوگوں نے تحریک قرامطہ جاری کرکے اسلام اور مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچایا۔ اس جگہ صرف یہ بتادینا ضروری ہے کہ قرامطہ کا مذہب اس قدر جلد اور سرعت کے ساتھ کیوں پھیل گیا تھا۔ قرامطہ کا مذہب در حقیقت کوئی خاص مذہب نہ تھا بلکہ ایک سیاسی تحریک تھی جس کا مقصد دنیا سے اسلام کو مٹانا اور عربوں کی فوقیت و برتری کو نیچا دکھانا تھا۔ اس تحریک کو مذہبی جامہ پہنایا گیا تھا۔ لوگوں کو نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور تکالیف شرعیہ سے آزادی دے کر بتایا جاتا تھا کہ یہ سب فضول باتیں ہیں۔ خدا کو ان چیزوں کی ضرورت نہیں۔ ساتھ ہی محمد بن حنفیہ کو خدا کا رسول منوایا جاتا تھا۔ حضرت علیؓ کی تکریم محض اس لئے رکھی گئی تھی کہ علویوں کے طرفدار تمام شیعہ ہمدرد بن جائیں اور مخالفت کا اظہار نہ کریں۔ مسلمانوں کا قتل کرنا موجب ثواب بتایا

جاتا تھا۔ قتل و غارت اور اپنے ہم مشربوں کے سوا دوسروں کو اذیت پہنچانا اور ستانا کوئی جرم نہ تھا۔ حلال و حرام کی قید کو بھی اُٹھا دیا گیا تھا۔ غرضکہ اچھی خاصی لامذہبی اور بدمعاشی کا نام مذہب رکھا گیا تھا۔ چونکہ جاہل اور غارت گر لوگوں کے مزاج اور خواہشات سے اس مذہب کو خصوصی مناسبت تھی۔ لہٰذا ہر ملک اور ہر قوم کے جاہل و بدوضع لوگ اس مذہب کو بڑی آسانی سے قبول کر لیتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ فارس و خراسان تک کے شہروں میں یہ وبا پھیل چکی تھی۔ شیعوں نے قرامطہ کو عباسیوں کا دشمن دیکھکر ان کی کوئی مخالفت نہیں کی۔ علویوں کی سازشوں اور عباسیوں کی اس دار و گیر نے جو انھوں نے بنوامیہ اور سادات کے مقابلہ میں کی، مذہب قرامطہ کے لئے پہلے سے زمین تیار کر دی تھی۔ لوگوں نے قرامطہ کو شیعہ مذہب کی ایک شاخ سمجھا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ سخت بے دین، مسلمانوں کے جانی دشمن اور بدترین دشمن تھے۔

محمود غزلوی کا سب سے نمایاں کارنامہ

ہندوستان کی تاریخ لکھنے والے مورخین نے عام طور پر قرامطہ اور ان کے اس تعلق کی طرف جو ہندوستان کی تاریخ سے ان کو ہے کوئی توجہ نہیں کی کیونکہ جس زمانے میں یہ تاریخیں لکھی گئی ہیں قرامطہ کا اثر و اقتدار صفحۂ ہستی سے فنا ہو چکا تھا لہٰذا بہت سے واقعات جن کا سبب قرامطہ کے سوا دوسرا نہ تھا ان مورخین نے غلط اور بے حقیقت اسباب سے وابستہ کر دیئے مثلاً امیر سبکتگین اور سلطان محمود غزلوی قرامطہ کے جانی دشمن تھے اور انھوں نے شروع ہی سے اس خطرے کو محسوس کر کے تمام ملک خراسان یعنی اپنی حدود سلطنت سے چُن چُن کر انا کستوں کے اس گروہ کو ناپید کیا اور اپنی تمام تر ہمت ان کے استیصال میں صرف کر دی۔ لیکن تاریخوں میں قرامطہ کے خلاف سلطان محمود غزلوی کی کوششوں کو بہت ہی معمولی الفاظ میں بیان کیا گیا ہے اور آج کل کی درسی تاریخوں میں تو سلطان محمود کو ہندوؤں کا جانی دشمن ظاہر کیا گیا ہے۔ حالانکہ سلطان محمود کی زندگی کے اہم اور قابل تذکرہ کارناموں میں سب سے زیادہ نمایاں کارنامہ قرامطہ کی مخالفت ہے۔ اس ایک بات کے سمجھ لینے سے محمود غزلوی کے بہت سے حملوں کی اصلیت ظاہر ہو جاتی ہے۔ بعض مورخوں نے ان قرامطہ کو جو قطیف و بحرین و ہجر میں اپنا مرکز رکھتے تھے فراموش کر کے حسن بن صباح کے قائم کئے ہوئے مرکز قلعہ الموت کے فدائیوں کو

قرامطہ کا اولین دور سمجھ لیا ہے اور جب حمید خاں لودی کے قرمطی ہونے کا حال وہ لکھتے ہیں تو یہ سمجھ لیتے ہیں کہ حمید خاں قلعہ الموت کی سلطنت سے وابستہ ہو گیا تھا۔ حالانکہ اس زمانے میں حسن بن صباح اور قلعہ الموت کی حکومت کا کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔ حسن بن صباح ۴۳۳ھ میں سلطان محمود کی وفات سے ساٹھ سال بعد پیدا ہوا تھا۔ حسن بن صباح اور اس کی جماعت واقعی قرامطہ یا قرامطہ سے بہت ہی مشابہ اور خطرناک تر جماعت تھی۔ لیکن یہ قرامطۂ بحرین جنھوں نے ہزار ہا حاجیوں کو خانۂ کعبہ میں قتل کیا۔ خانۂ کعبہ کی بے حرمتی انتہا کو پہنچا دی اور حجر اسود کو بیس بائیس سال تک مقام ہجر میں لا کر رکھا اور خانۂ کعبہ بلا حجر اسود کے رہا۔ حسن بن صباح کی جماعت سے بہت زیادہ طاقتور اور عالم اسلام کے لئے بے حد موجب خطر تھے۔ سلطان محمود نے انھیں کے مٹانے کے لئے ہندوستان پر حملے کئے اور مرتے دم تک انھیں کی بیخ کنی میں مصروف رہا۔ محمود غزنوی کو جب یہ معلوم ہوا کہ حمید خاں لودی خود قرمطی ہو گیا ہے تو اس نے اس کی خراج گذاری کی بھی پروا نہیں کی اور اس پر چڑھائی کر دی۔ آخر حمید خاں نے قرمطی ہونے سے توبہ کر کے اپنی جان اور حکومت بچائی۔ اسی زمانے میں ہندوؤں نے موقع پا کر تمام ملکِ سندھ پر اپنی حکومتیں قائم کر لیں اور کسی مسلمان کو ان کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنے کی مہلت نہ ملی۔ حمید خاں لودی کے بعد اس کا پوتا ابوالفتح داؤد بن نصر بن حمید ملتان کا حاکم بنتے ہی قرمطی ہو گیا اور قرامطہ کا ملتان میں اس قدر زور ہوا کہ ملتان کی جامع مسجد جو خلفائے بنی اُمیہ کے زمانے کی تعمیر شدہ تھی اس کو نمازیوں کے لئے بند کر دیا گیا اور الحاد و بے دینی تمام ریاست میں پھیل گئی۔ یہ سُن کر محمود غزنوی کو ملتان پر پھر چڑھائی کرنی پڑی اور ابوالفتح نے مسلمانوں کو قرمطی بنانے اور خود بھی قرمطی بننے سے توبہ کر کے اپنی جان بچائی۔ بہر حال اب ہم محمد بن قاسم کے زمانے سے لے کر محمود غزنوی کے زمانے تک پہنچ گئے ہیں محمود غزنوی کے حملوں کا حال آئندہ بیان ہونے والا ہے۔ اس وقت سندھ سے رخصت ہوتے ہوئے چند باتیں اور بھی سُن لینی چاہییں۔

عربوں کا اثر ملک سندھ پر جس زمانے میں مسلمانوں کی فاتحانہ آمد ملک سندھ میں ہوئی ہے۔ یہاں عام طور پر بُت پرستی رائج تھی

مجرموں کی شناخت کے لئے ان کو جلتی ہوئی آگ میں سے گذارنے کا عام رواج تھا اگر آگ میں جل گیا تو مجرم اور بچ گیا تو بے گناہ تھا۔ کبھی لوہے کا گولا انگارے کی مانند سرخ کرکے مجرم کے ہاتھ پر رکھا جاتا تھا۔ کبھی گہرے پانی میں مشتبہ شخص کو اتنی دیر تک ڈوبا رکھا جاتا تھا کہ ایک شخص تیر کمان میں رکھکر چھوڑے اور دوسرا شخص جاکر اس تیر کو واپس اُٹھا لائے اس عرصہ میں اگر پانی کے اندر دم نکل گیا تو مجرم تھا اور زندہ نکل آیا تو بے گناہ۔ جادو کا عام طور پر رواج تھا۔ غیب کی باتیں اور شگون کی تاثیرات بتانے والوں کی بڑی گرم بازاری تھی۔ کثرت الجہول اور محرمات ابدی کے ساتھ شادیاں کر لینے میں بھی تامل نہ تھا۔ چنانچہ راجہ داہر نے اپنی حقیقی بہن کے ساتھ پنڈتوں کے ایمار سے شادی کی تھی۔ رانہزنی اکثر لوگوں کا پیشہ تھا۔ ذات باری تعالےٰ کا تصور معدوم ہوکر اعلیٰ وادنیٰ پتھر کی مورتوں اور بتوں کو حاجت روا سمجھتے تھے۔

مسلم فاتحین کے سندھ پر احسان مسلمانوں نے سندھ میں فاتحانہ داخل ہونے کے بعد اس ملک کے باشندوں کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچایا۔ نہ ان کو اپنے مذہب کے تبدیل کرنے پر مجبور کیا۔ عدل وانصاف اور اعلیٰ اخلاق کا نمونہ جو مسلمانوں نے پیش کیا اس کا یہ اثر ہوا کہ سندھیوں میں روشن خیالی پیدا ہوئی۔ انھوں نے مسلمانوں کے اخلاق۔ تمدن اور معاشرت سے بہت سے مفید سبق حاصل کرکے اپنے اخلاق ومعاشرت میں تبدیلیاں پیدا کیں۔ مسلمانوں سے محبت و دوستی کے تعلقات بڑھائے۔ مسلمان یہاں کے ہندؤوں اور بدھوں کے لئے اچھے دوست۔ اچھے ہمسایہ اور اچھے معلم ثابت ہوئے۔ انھوں نے بخوشی مسلمانوں کو اپنی بیٹیاں دیں اور تمام کاروبار حتیٰ کہ سرکار دربار میں بھی مسلمانوں کے ساتھ شریک
علیٰ خیال اور اعلیٰ طبقہ کے لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ برہمنوں نے خود مسلمانوں کی تعریف میں تقریریں کیں اور ان کو اچھا حاکم بتایا۔ وحشیانہ سزائیں اور وحشیانہ طریق انصاف موقوف ومعدوم ہوئے۔ مسلمانوں نے ہندی اور ہندؤوں نے عربی زبان سیکھی اس محبت ودوستی اور ہم آغوشی کا اثر آج بھی سندھی زبان کے رسم الخط اور خود سندھی زبان میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ سندھی زبان میں ماں کو اُمّا اور عربی میں اُمّ کہتے ہیں۔ سندھی زبان میں باپ کو اَبّو۔ اور عربی میں اَبّ بولتے ہیں۔ بیوی کو سندھی

میں صاحبان اور عربی میں صاحبہ۔ سندھی میں بات کو گھالھ اور عربی میں قال کہتے ہیں۔ غرض اسی طرح ہزارہا الفاظ ہیں جو موجودہ سندھی زبان میں عربی کے بولے جاتے ہیں۔ سندھیوں کے لباس میں بھی عربی شان موجود ہے۔ سندھ کا جبہ و عمامہ ہرگز ہندوستانی چیز نہیں ہے۔ سندھ کی مہمان نوازی بھی عربوں کی مہمان نوازی کا نمونہ ہے۔

سندھ کی قومیں سندھ میں ایک قوم چاچڑ ہے جو اپنے آپ کو راجہ داہر کے وزیر کی اولاد بتاتے ہیں اور اسلام کے بڑے پابند ہیں۔ ایک قوم "داہر" کہلاتی ہے جو راجہ داہر کی اولاد ہے اور مسلمان ہے۔ صدیقی۔ انصاری۔ فاروقی۔ عباسی۔ سادات وغیرہ خالص عربی قومیں بھی سندھ میں بکثرت آباد ہیں۔ پنوار۔ سپرہار وغیرہ خالص راجپوت قومیں بھی سندھ میں موجود ہیں۔ کچھ قومیں ایسی بھی موجود ہیں جو عام لوگوں کی نگاہ میں ہندی قومیں سمجھی جاتی حالانکہ وہ خالص عربی قومیں ہیں ان میں سب سے زیادہ قابل تذکرہ ارائیں قوم ہے۔ اوپر کئی جگہ محمد بن قاسم کے ہمراہیوں کا ذکر آچکا ہے کہ وہ شامی و عراقی دو گروہوں پر مشتمل تھے شامی لوگ سب سے زیادہ با اعتماد اور خلافت بنو امیہ کے حامی و ہمدرد تھے انھیں لوگوں کو شاہی فوج اور شاہی قوم سمجھا گیا تھا۔ یہ عموماً بنی اُمیہ اور حجازی تھے۔ جو حضرت امیر معاویہؓ کے زمانے میں حجاز سے شام میں جاکر آباد ہو گئے تھے۔ ان لوگوں کی ایک بڑی تعداد ملک شام کے مقام اریحا میں آباد تھی۔ اور حجاج بن یوسف ثقفی نے محمد بن قاسم کے ساتھ جو چھ ہزار شامی فوج بھیجی تھی اس میں ایک معقول تعداد اریحاء کے باشندوں کی بھی تھی۔ ان شامی لوگوں کو جیسا کہ اوپر بیان ہوچکا ہے ملک شام میں واپس جانا نصیب نہ ہوا اور ان کو مجبوراً یہیں اقامت اختیار کرنی پڑی۔ خلافت عباسیہ کے زمانے میں اُن پر مصائب آئے۔ پہاڑوں میں پناہ لینی پڑی۔ منصورہ کی خودمختار ریاست کا قیام اُن کے لئے پھر راحت واطمینان کا زمانہ تھا۔ اس ریاست کی بربادی ان کے لئے پھر مصائب ونوائب کا نزول تھا۔ کچھ کوہ سلیمان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ کچھ ملتان میں آکر آباد ہوئے اور جہاں جس کے سینگ سمائے چلے گئے۔ ملتان میں اگرچہ قرامطہ کا طوفان آیا اور اس طوفان میں ملتان کا مشہور مرکزی مندر بھی قرامطہ کے ہاتھ سے تباہ ہوا لیکن محمود غزنوی نے جلد اس فتنہ کو فرو کردیا۔ اور اس طرح ان عربی باقیات یعنی شام سے آئی ہوئی نسلوں کو زیادہ ملتان ہی کی ریاست میں جمع ہونا پڑا۔ چند ہی روز کے بعد پنجاب کا تمام ملک

سلطنتِ غزنی کا صوبہ بن گیا اور مستقل طور پر پنجاب میں محمود غزنوی نے اسلامی حکومت قائم کر دی ملتان سے اکثر قبائل پنجاب کی طرف چلے آئے۔

ارائیں انھیں قبائل میں ایک قبیلہ وہ تھا جو شام کے علاقہ اریحا سے آیا تھا اور اریحائی کہلاتا تھا۔ پنجابی لہجے اور پنجابی تلفظ نے اس کو ارائیں بنا دیا۔ ان تمام مذکورہ حوادث اور تغیرات کا لازمی نتیجہ یہی ہونا چاہیے تھا کہ یہ لوگ پنجاب کے سرسبز و شاداب علاقے میں آکر افغانی فاتحوں اور ہندو مفتوحوں سے بے تعلق رہ کر زراعت و کشت کاری کے کاموں میں مصروف ہو جائیں اور اپنے ان تجربات کو کام میں لائیں جو ریاست منصورہ کی سرسبزی و شادابی کے لئے وہ کام میں لا چکے تھے۔ عرب کا ملک زرعی ملک نہیں ہے لیکن عربی قومیں جب کبھی کسی زرعی ملک میں پہنچیں وہ سب سے بہتر کاشت کار اور نہایت قابل کسان ثابت ہوئیں۔ یہی عربی قومیں جب اندلس میں پہنچیں تو انھوں نے اندلس کو گلزارِ بہار بنا دیا۔ اور ایک چپہ بھر زمین ایسی نہیں چھوڑی جہاں کھیتی اور سبزی موجود نہ ہو۔ جب اندلس سے بے دخل ہوئے تو وہ ملک پھر بنجر اور ویران نظر آنے لگا آج تک بھی اندلس میں وہ سرسبزی واپس نہیں آئی جو عربوں نے وہاں پیدا کر دی تھی۔ اسی طرح منصورہ کو عربوں نے گلزار بنا دیا تھا ان کے جاتے ہی وہ پھر بنجر اور غیر آباد علاقہ بن گیا۔ پنجاب میں آکر بھی انھوں نے اپنی اسی قابلیت کا اظہار کیا۔ غالباً عربوں کے اسی ذوقِ کشت کاری اور آلات کشاورزی کی نسبت ہمت افزا الفاظ بیان نہیں فرمائے چنانچہ ان ہمرا بیان محمد بن قاسم نے سیاسی زندگی سے دور و بے تعلق رہنے اور کشتکاری میں ہمہ تن مصروف ہو جانے کی وجہ سے اپنی حیثیت کو بہت کچھ گھٹا اور مٹا دیا۔ ہندوستان کے ہر صوبے اور ہر حصے میں ایسی قومیں آباد اور موجود ہیں جو ملتان سے ان صوبوں میں جا کر آباد ہوئی ہیں ایک قوم جو پنجاب سے بہار و بنگال تک پائی جاتی ہے ملتانی قوم کے نام سے مشہور ہے اور اپنا کوئی دوسرا نام نہیں بتا سکتی۔ یہ ملتانی لوگ عموماً تجارتی، آہنگری اور معماری کا پیشہ کرتے ہیں۔ ملتان ہندوستان کی صدہا قوموں کا مرکز و منبع ہے اور جس قدر قومیں ملتان سے تعلق رکھتی ہیں وہ سب کی سب عربی النسل سمجھی جاتی ہیں۔ اور یقیناً عربی باپوں، ہندو ماؤں کی اولاد ہیں۔ یہ عربی قومیں پنجاب کے سلطنت غزنی میں شامل ہو جانے کے بعد پنجاب میں آئیں۔ اور شہاب الدین غوری کے بعد جب مسلمانوں کی حکومت

تمام شمالی ہند میں قائم ہوئی تو بہار و بنگال تک پھیل گئیں۔ پنجاب کے اعوان، کشمیر کے ککھے اور ببے بھی یقیناً انھیں لوگوں میں سے ہیں، مسلمانوں کا سندھ پر حملہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ محمد بن قاسم اپنی تلوار کے سایہ میں جس محبت و مدارات اور درگذر و رعایت کو لایا تھا وہ ہرگز ضائع نہیں ہوئی اس کے ہمراہیوں میں سے ایک ایک شخص غالباً ایک ایک قوم کا مورث اعلیٰ بنا اور ان قوموں نے ہندو مسلم تعلقات کو پائدار و استوار بنانے میں وہ کام کیا کہ آج تک باوجود سخت کوششوں کے ہندو مسلم تعلقات کے جوڑ بند جدا کرنا بے حد دشوار ثابت ہو رہا ہے۔

محمد بن قاسم سے محمود غزنوی تک ہندوستان کی حالت

اوپر کے صفحات میں سندھ کی قریباً تین سو سال کی نہایت مجمل مختصر تاریخ جو اس کتاب کے موضوع سے تعلق رکھتی ہے۔ بیان ہو چکی ہے۔ اس کے بعد محمود غزنوی کے حملوں کی داستان شروع ہونے والی ہے۔ محمود غزنوی کا حال شروع کرنے سے پیشتر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس تین سو سال کے ہندوستان کی کیفیت پر بھی ایک سرسری نظر ڈال لی جائے۔ تاکہ دوسرے باب کا مطالعہ کرنے کی استعداد پیدا ہو جائے۔ مسلمانوں کو چونکہ سندھ کے سوا ہندوستان کے دوسرے حصوں سے بہت ہی کم تعلق رہا لہٰذا ان کی تصانیف میں اس زمانہ کی تاریخ نہیں ہو سکتی تھی۔ ہندوؤں سے دنیا کے مورخوں اور تاریخی مطالعہ کرنے والوں کو یہ عام شکایت ہے کہ اُنھوں نے کبھی اپنے ملک کی صحیح تاریخ نہیں لکھی اور ہمیشہ فرضی افسانوں اور کہانیوں ہی سے اپنا دل بہلاتے اور اسی کو مایۂ ناز سمجھتے رہے ان افسانوں یا فرنگستانی محققوں کی کوہ کاویوں سے جو قابلِ التفات حالات مرتب و مدون ہوئے ہیں ان کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

محمد بن قاسم کی حملہ آوری کے وقت کشمیر و پنجاب کا راجہ للتا وردھن یا اس کا بیٹا چندر پیدیا تھا جو بدھ مذہب کا پیرو تھا۔ چندر پیدیا کے بعد اس کا چھوٹا بھائی للتا دتیا تخت نشین ہوا جو بڑی شان و شوکت کا راجہ تھا۔ اسی خاندان میں کشمیر کا ایک راجہ آٹھویں صدی ہجری میں مسلمان ہوا تھا۔ قنوج میں وہی خاندان فرماں روا تھا جو چینی سیاح ہونگ تسانگ کی آمد کے وقت حکمراں تھا۔ اس کا مذہب بھی بدھ تھا۔ یہ

خاندان قنوج میں اس وقت تک حکمراں رہا جب تک کہ خلفائے بنوامیہ نے حکومت کی۔ جس سال خلافت بنوامیہ برباد ہوئی۔ اس سے ایک سال بعد یعنی ۱۳۴ھ میں قنوج کے اندر ایک نئے خاندان کی حکومت شروع ہوئی۔ اس خاندان کا اول راجہ یا سوورمن نامی تھا۔ ۱۸۵ھ میں اس خاندان کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ اور راجہ ناگ بھٹ نے قنوج کے ملک پر قبضہ کیا۔ اسی راجہ نے اپنے طبیب منک چند کو ہارون الرشید کے پاس بھیجا تھا۔ اس کی اولاد میں راجہ بھوج تھا جس نے ۲۲۶ھ سے ۲۷۷ھ تک حکومت کی اور شمالی ہند کا بڑا حصہ اپنی مملکت میں شامل کرلیا۔ اسی راجہ بھوج کی نسل سے قنوج کا وہ راجہ تھا جس نے محمود غزنوی کی اطاعت قبول کی تھی اور جس کو کالنجر کے راجہ نے محمود کی واپسی کے بعد قتل کردیا تھا۔ پنجاب کے ملک میں ترکوں یا مغلوں کے ایک خاندان نے جو بدھ مذہب کا پیرو تھا کابل کی طرف سے آکر اپنی جداگانہ سلطنت دوسری صدی ہجری میں قائم کرلی تھی۔ اسی خاندان کے آخری راجہ جے پال اور انند پال تھے۔ جنھوں نے محمود غزنوی سے شکستیں پائیں اور ان کے بعد پنجاب حکومتِ اسلامیہ غزنی کا صوبہ بنا۔

بنگال میں ۱۴۰ھ میں راجہ گوپال نے اپنی حکومت قائم کی۔ گوپال کے بعد دھرم پال دھرم پال کے بعد دیوپال۔ غرض اسی طرح اس خاندان کے ہر ایک راجہ کے نام کا جزو لفظ پال ضرور ہوتا تھا۔ اور اسی لئے اس کو پال خاندان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے پال خاندان محمود غزنوی کے حملوں تک بنگال کا فرماں روا رہا۔ اس کے بعد سین خاندان کی حکومت شروع ہوئی۔ جن کے نام وجیا سین۔ بلال سین۔ لچھمن سین وغیرہ تھے۔ یہ دونوں خاندان بدھ مذہب کے پیرو تھے۔ سین خاندان کے بعد بنگال پر مسلمانوں کی حکومت شروع ہوئی۔ کالنجر میں چندیل خاندان کی حکومت تھی جو محمود غزنوی کے زمانے تک قائم رہی۔ اس سے زیادہ توضیح وتفصیل کچھ نہیں کی جاسکتی۔ اس تین سو سال کی مدت یعنی محمد بن قاسم سے محمود غزنوی تک کے زمانے کا اندازہ کرنے کے لئے میں مسٹر کے ایم پانیکار ایم۔اے کی کتاب تاریخ ہند قدیم سے ذیل کی عبارت نقل کردینا کافی سمجھتا ہوں وہ لکھتے ہیں کہ

"ہندوستان کا نظم ونسق متزلزل ہوگیا۔ شمالی ہند کی مرکزی حکومت (خاندان گپتا کی حکومت) جاتی رہی۔ طوائف الملوکی نے کشمیر سے آسام تک تسلط جما لیا۔ چھوٹے چھوٹے اضلاع خود مختار بن بیٹھے۔ چارسو برس

تک شمالی ہند کی یہی حالت رہی۔ اس عرصے میں چھوٹے چھوٹے غیر معروف خاندان جن کی مجہول الذکر داستان تاریخ ہند کا عقدہ لاینحل ہے اُٹھے اور فنا ہو گئے۔ جن میں سے ایک کو بھی شاہانہ عظمت نصیب نہ ہوئی۔"

اسی زمانے کا ذکر کرتے ہوئے مصنف مذکور راجپوتوں کی نسبت رقم طراز ہے کہ۔

"آٹھویں اور نویں صدی عیسوی (دوسری اور تیسری صدی ہجری) میں قوم راجپوت کا ستارہ چمکا۔ راجپوتوں کا نسب اور ان کی قومیت تاریخ ہند کا لاینحل معمہ ہے اور ان کی اصل ابھی تک سربستہ راز بنی ہوئی ہے غالباً زیادہ تر راجپوت قوم مغول یعنی تاتاری فاتحین کی نسل سے ہیں۔ قوم کشن مرور ایام نے ہندو مذہب اور ہندو تہذیب اختیار کر کے آریہ ورت کے فرزندوں میں داخل ہو چکی تھی۔ بعد میں آنے والے تاتاری قبائل کبھی جنھوں نے دولت گپتا کا شیرازہ منتشر کر دیا تھا اور علاقہ پنجاب میں زبردست حکومت قائم کر لی تھی۔ آریہ مذہب اختیار کر چکے تھے۔ قیاس غالب ہے کہ یہی تاتاری قبائل آریہ مذہب میں داخل ہو کر راجپوتوں کے نام سے مشہور ہو گئے۔ راجپوت روایات کے مطابق یہ قوم اگنی کولا یعنی آگ کی نسل سے پیدا ہوئی ہے۔ پرمر، پرہار، چوہان اور سولنکی چار۔ وں مشہور راجپوت ذاتوں کا سلسلۂ نسب آگ پر جا کر ختم ہوتا ہے شاید آگ سے پاک ہونا مراد ہے۔ پاک کرنے کی رسم راجپوتوں کو ہندو مذہب میں داخل کرتے وقت ادا کی گئی ہو گی۔ ان ذاتوں کے علاوہ کچھ ایسی ذاتیں بھی راجپوت قوم میں شامل ہو گئی ہیں جو نسلاً ہندوستان کے قدیم باشندوں سے تعلق رکھتی تھیں اس دور کی عام طوائف الملوکی اور بے ربطی سے فائدہ اُٹھا کر یہ ذاتیں ذی اثر اور ذی اقتدار ہو گئیں اور سیاسی اقتدار نے انھیں راجپوت بنا دیا چندیل گرہوار اور رہتور راجپوت اسی شاخ سے ہیں۔ یہ تینوں ذاتیں جنوبی راجپوت کہلاتی ہیں۔ شمالی راجپوت یعنی پرمر، پرہار اور چوہان جنوبی راجپوتوں سے ہمیشہ سرگرم پیکار رہتے تھے۔"

مندرجہ بالا اقتباس کا حاصل مطلب یہ ہے کہ محمد بن قاسم کی حملہ آوری کے وقت سے راجپوتوں کا عروج شروع ہوا۔

راجپوت راجپوت ہندی قوم نہیں ہے بلکہ مغل و تاتاری ہیں جو مسلمانوں کی آمد کے وقت یا اس سے کچھ ہی پہلے ہندی قوم میں شامل ہوئے تھے۔ جنوبی راجپوت ہندوستان کی غیر آریہ قوموں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہندوستان میں بدھوں کی حکومت و سلطنت کمزور ہو کر بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہوگئی۔ تو برہمنی مذہب کے ماننے والوں یا یوں کہیے کہ برہمنوں نے بدھوں کی حکومت کے اس ضعف و اختلال سے فائدہ اٹھانے اور منو کے عہد کے برہمنی اقتدار کو پھر واپس لانے کی کوشش کی۔ اس کوشش کی کامیابی کا انحصار چونکہ بہت کچھ جنگی طاقت پر مبنی منحصر تھا۔ منو کے زمانے کی تقسیم کے موافق چھتری لوگ طاقت کے وارث اور جنگی کاموں کے لئے مخصوص تھے اور برہمن۔ چھتری۔ ویش۔ شودر کی تقسیم بالکل مدآبادی مذہب کی تقسیم کے موافق تھی۔ چھتریوں کی نسل کو چونکہ پرسرام ختم سرخت کر چکا تھا لہذا برہمنوں نے اب بدھوں کے مذہب اور حکومت کو مٹانے کے لئے ایک نئی جنگی قوم تیار کر کے اس سے وہ کام لیا جو چھتریوں سے لیا جاتا۔ یہ نئی قوم مغلوں اور تاتاریوں کے جنگجو قبائل اور غیر آریوں یعنی شودروں کے ذی حوصلہ اور بہادر لوگوں کو اپنا ہمدرد اور ہوا خواہ بنا کر تیار کی گئی اور ان کو راجپوت کا خطاب دیا گیا۔ یہ مغول تاتار اور غیر آریہ یقیناً وہ لوگ تھے جو ڈاکہ زنی اور لوٹ مار کا پیشہ رکھتے تھے ان کو برہمنوں نے اپنی سازش میں شریک کر کے باقاعدہ طور پر اپنی قوم و مذہب کا ایک رکن بنا لیا۔ اس جگہ لالہ لاجپت رائے صاحب مشہور ہندو لیڈر کی مصنفہ تاریخ ہند کے حصہ اول سے بھی راجپوتوں کی اصلیت کے متعلق عبارت کا نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے وہ فرماتے ہیں کہ۔

"اس میں کچھ شک نہیں کہ موجودہ ہندو سوسائٹی کی ورن دوستھا میں بہت سے آدمی ایسے شامل ہیں جو خالص آریہ نسل سے نہیں جو مشرق یا مغرب سے ہندوستان میں آئے اور جن کو ہندوؤں نے اپنے مذہب میں شامل کر کے اپنی سوسائٹی کا معزز ممبر بنا لیا۔ اسی طریقہ

سے انھوں نے بہت سی ایسی قوموں کو بھی ہندو سوسائٹی میں داخل کرلیا جو اس ملک کے ابتدائی باشندوں گونڈ، بھیل وغیرہ سے ہیں یہ طریقہ نہایت قدیم زمانے سے جاری رہا اور اب تک جاری ہے۔ ہندو سماج میں نئی جاتیاں روز بنتی ہیں اور ہمیشہ یہ سلسلہ جاری رہتا ہے کہ بعضوں کو اونچا ورن اور بعضوں کو نیچے ورن کا درجہ دیا جاتا ہے۔ یہ امر بھی تاریخی طور پر ثابت شدہ سمجھ لینا چاہیے کہ شاک اور یوچی قوم کے بہت سے آدمی جو کہ ترکمانی نسل سے تھے سن عیسوی کی ابتدائی صدیوں میں اس ملک میں آئے اور ہندو سوسائٹی میں داخل ہو گئے۔ چنانچہ یورپین محقق اقوام جاٹ۔ اہیر۔ اور گوجروں کو بھی ان ہی قبیلہ جات میں سے گنتے ہیں۔ لیکن یہ بحث بہت حد تک فضول ہے۔ راجپوتوں کو جاٹوں کو۔ گوجروں اور اہیروں کو ہندو سماج اپنا رکن سمجھتی ہے اور یہ امر کہ وہ کب اور کس طرح ہندو سوسائٹی میں داخل ہوئے بالکل غیر متعلق ہے اور اس پر زیادہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں جس طرح بیسیوں خاندان برہمنوں کے اصلی آریہ نسل سے نہیں ہیں اور جس طرح سے بہت سی اور جاتیاں بھی اصلی آریہ نسل سے نہیں ہیں بلکہ مخلوط ہیں۔ اسی طرح سے موجودہ راجپوت بھی ہو سکتے ہیں۔"

لالہ لاجپت رائے بھی راجپوتوں کی قوم کو برہمنوں کی ترتیب دادہ نئی قوم تسلیم کرنے سے انکار نہیں کرتے اور ان کا منول وتاتار یا غیر آریہ نسل سے ہونا مانتے ہیں۔ بہر حال جس طرح یہ نئی قوم نیا رہوئی اسی طرح مذہب بھی بالکل نیا ترتیب دیا گیا۔ پرانے برہمنی مذہب یا ویدک دھرم میں عناصر پرستی کا زور شور تھا۔ جس کو سمرتیوں کے عہد اور منو کے زمانے میں متغیر اور تبدیل کیا گیا۔ اس کے بعد بدھ مذہب نے اس کو بالکل مٹا ڈالا اور ذات پات کی قیود کو جو منو کے زمانے میں بہت ہی سخت ہو گئی تھیں بالکل اٹھا دیا۔ بدھ مذہب میں بت پرستی حد سے زیادہ بڑھ گئی تھی۔ اب برہمنوں نے چونکہ مغلوں اور تاتاریوں کو جو بدھ مذہب کے پیرو تھے اپنی سازش میں شریک کیا۔ لہٰذا بہت سی باتیں بدھ مذہب کی بھی اپنے اس جدید مذہب میں شامل کر کے ان کے بہت سے بتوں کی پرستش کو جائز رکھا اور بدھ کو بھی وشنو کا اوتار تسلیم کر لیا۔ اسی طرح غیر آریوں کی بھی بہت سی باتوں کو اپنے جدید مذہب میں

شامل کرلیا۔ یہ سلسلہ غالبًا مسلمانوں کی آمد سے تھوڑے ہی دنوں پہلے جاری ہوا ہوگا۔
مسلمانوں کا مذہب چونکہ سب سے پہلے جنوبی ہند۔ لنکا اور ملابار میں آیا تھا لہذا کماریلا برہمن اور شنکراچارج نے اسلامی دلائل سے بھی بہت کچھ فائدہ اٹھاکر شمالی ہند کی طرف خروج کیا اور بدھوں سے مباحثوں اور مناظروں کا سلسلہ جاری کیا۔ جس زمانے میں سندھ پر اسلامی حکومت قائم ہوچکی تھی۔ اس زمانے میں شنکراچارج یقینًا پیدا نہیں ہوا تھا۔ شنکراچارج غالبًا خلافتِ عباسیہ کے ابتدائی زمانے میں پیدا ہوا ہے۔ شنکراچارج سے پہلے راجپوتوں کی اس نوزائیدہ قوم میں جان پڑنے لگی تھی اور وہ بعض چھوٹے چھوٹے قطعات پر قابض ہونے لگے تھے۔ شنکراچارج نے جب بدھوں کے خلاف جہاد شروع کیا۔ اور نوزائیدہ جدید برہمنی مذہب کی تائید شروع کی تو راجپوتوں کی اس جدید قوم اور جدید طاقت نے شنکراچارج کی خوب اعانت کی اور شنکراچارج نے راجپوتوں کی طاقت سے فائدہ اُٹھانے میں خوب مستعدی دکھائی۔ قنوج، بنارس، وسط ہند۔ اور دامن کوہ ہمالہ تک برہمنوں اور راجپوتوں کو نمایاں غلبہ حاصل ہوگیا۔ اس جدید مذہب اور جدید قومیت کی تعمیر میں چونکہ شنکراچارج سب سے پہلا مصنف اور مقنن تھا۔ لہذا اس کی تعلیمات خصوصی وقعت و عزت کی نظر سے دیکھی گئیں۔ چونکہ برہمنوں کی مجوزہ یہ تحریک ایک سیاسی تحریک تھی۔ لہذا جابجا نئے نئے مذہبی اصول قائم ہوئے۔ کہیں وشنو کو سب سے بڑا اوتار مانا گیا۔ کہیں برہما کو اور کہیں مہیش کو اس طرح ہندو مذہب کے نام سے ہزارہا فرقے پیدا ہوگئے جن میں کوئی اُصولی اتفاق بجز لفظ ہندو کے نہیں پایا جاتا۔ غرض مسلمانوں کی آمد اور حملہ آوری کے وقت بدھوں کی قومیت، مذہب، اور حکومت پر برہمنوں اور راجپوتوں نے حملہ آوری شروع کر رکھی تھی اور ملک میں ضرور ایک ہلچل مچی ہوتی تھی۔ اس کشمکش اور زدوخورد کا سلسلہ محمد بن قاسم کے حملہ سے شہاب الدین غوری کے حملوں یعنی قریبًا پانچ سو سال تک ملک کے کسی نہ کسی حصے میں جاری رہا۔ اس طویل مدت میں کوئی علامت ایسی ظاہر نہیں ہوتی جس سے قطعی طور پر یہ حکم لگایا جاسکے کہ اگر مسلمان اس ملک میں نہ آتے تو جدید ہندو مذہب بدھ مذہب پر غلبہ پاکر اپنی حکومت قائم کرلیتا کیونکہ سندھ میں مسلمانوں کو بدھوں کی حکومت کا مقابلہ کرنا پڑا۔ سندھ کے فرماں روا کی قوم تو برہمن تھی لیکن مذہب اس حکومت کا بدھ ہی تھا۔ پنجاب کو فتح کرتے ہوئے محمود غزنوی کو بھی بدھوں کی حکومت کا مقابلہ کرنا پڑا۔

کیونکہ راجہ جے پال اور اس کے بیٹے انند پال کی قوم مغول یا تاتار تھی اور مذہب بدھ تھا۔ بنگال اور آسام کو بھی مسلمانوں نے بدھ حکومتوں سے چھینا۔ علاء الدین خلجی نے دکن کا ملک بھی بدھ حکومت کو شکست دے کر فتح کیا۔ صرف قنوج و کالنجر کی نسبت یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہاں کے راجہ جدید برہمنی مذہب کو اختیار کر چکے تھے۔ لیکن پنجاب و سندھ کے راجاؤں نے جس بہادری کے ساتھ مسلمانوں کا مقابلہ کیا ہے قنوج و کالنجر سے اس ہمت کا اظہار نہیں ہوا۔ قنوج کے راجہ نے محمود غزنوی کی بلا تامل اطاعت قبول کر لی۔ جس پر کالنجر کے راجہ کو بہت غصہ آیا۔ لیکن اگلے ہی سال خود اس نے بھی محمود غزنوی کی فرماں برداری کا جوا اپنے کندھے پر رکھا اور محمود غزنوی کی تعریف میں ایک قصیدہ بھی لکھا۔

پس موجودہ ہندو مذہب یا جدید برہمنی مذہب جس کام کو پانسو سال میں بھی پورا نہ کر سکا تھا۔ اس کو مسلمانوں نے بآسانی انجام دیا۔ اگر مسلمان اس ملک میں نہ آتے تو بہت زیادہ ممکن بلکہ یقینی تھا کہ بدھ مذہب اپنی قوت کو مجتمع کر کے اس جدید مذہب اور جدید طاقت کو جو بدھوں کے مقابلہ میں پیدا ہو رہی تھی بالکل کچل ڈالتا اور ان مظالم کا انتقام لیتا جو قنوج - بنارس و الہ آباد وغیرہ میں برہمنوں اور راجپوتوں نے بدھوں پر شنکر اچارج وغیرہ کی رہبری میں کئے تھے۔ لیکن سندھ کی اسلامی حکومت اور کابل و خراسان و ماوراء النہر میں مسلمانوں کی فتوحات نے ہندوستان کے بدھ حکمرانوں کو ششدر و حیران بنا کر قنوج وغیرہ کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیا اور انند پال فرمانروائے پنجاب کو مجبور کیا کہ وہ تمام ہندو اور بدھ راجاؤں کو متحد ہونے اور متفقہ طاقت سے مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کی دعوت دے۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ ہندوستان کی بدھ حکومت کے خلاف برہمنوں اور راجپوتوں کی تحریک کامیاب ہو جاتی اور وہ تمام ملک ہندوستان پر قابض و متصرف ہو جاتے تو غیر ممکن تھا کہ کابل و خراسان و کشمیر و تبت وغیرہ کے بدھ خاموش بیٹھے ہوئے تماشا دیکھتے۔ بلکہ کابل و خراسان و بخارا کے جنگجو لوگ جو بدھ مذہب کے پیرو تھے۔ یقینا ہندوستان پر حملہ آور ہوتے اور جس طرح ان لوگوں نے کنشک کے زمانہ میں اپنی شہنشاہی اس ملک میں قائم کر لی تھی پھر قابض و متصرف ہوتے اور تمام ملک میں بدھ مذہب کا دور دورہ ہوتا۔ لیکن مسلمانوں نے چونکہ پہلے ہی کابل و خراسان و ماوراء النہر کو فتح کر کے

بیرونی بودھوں کے حملوں کو غیر ممکن بنا دیا اور اس کے بعد ہندوستان کی طرف متوجہ ہوئے۔ لہذا برہمنوں کو اگنی کو لا راجپوتوں کے پیدا کرنے اور جدید قوم و مذہب کے ترتیب دینے کی ترغیب ہوئی۔ مگر وہ اپنی اس کوشش میں کافی کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ آخر مسلمانوں نے اس ملک کو فتح کر کے ہندوؤں کے اس جدید مذہب کو باقی رہنے دیا اور بربادی کے خطرے سے بچا لیا۔ مسلمانوں کے فتح سندھ ہونے کے بعد موجودہ ہندو مذہب اور موجودہ ہند و قومیت بالکل محفوظ و مامون ہو گئی اور اس نے مسلمانوں کے سائے میں نہایت اطمینان کے ساتھ اپنے قومی و مذہبی اُصول مرتب کئے چنانچہ موجودہ ہندو مذہب کی تصانیف اور مذہبی اُصولی کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ اسلامی عہد حکومت میں تیار ہوا۔ اور بڑے بڑے عظیم الشان مذہبی فرقے جو آج اپنی آغوش میں قریبًا تمام ہندو آبادی کو لئے ہوئے ہیں سب کے سب اس زمانے میں مرتب و مدون ہوئے جب کہ اسلامی شہنشاہی ہندوستان میں نہایت شان و شوکت کے ساتھ قائم تھی۔ اسلامی مساوات اسلامی مسالمت۔ اسلامی درگذر۔ اسلامی مذہبی آزادی کا غالبًا اس سے بڑھکر اور کوئی ثبوت تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ اب ہم کو یہ باتیں ختم کر کے ملک سندھ سے رخصت ہو جانا چاہیئے اور آخر میں مسٹر کے ایم پانیکار کی رائے بھی سن لینی چاہیئے جو انھوں نے جدید ہندو مذہب کی نسبت ظاہر کی ہے وہ لکھتے ہیں کہ

"شنکراچاریہ نے جس ہندو مذہب کی تعلیم و تلقین کی وہ اس بھینٹ و قربانی والے مذہب سے بالکل جدا تھا جس کے خلاف گوتم بدھ صدائے احتجاج بلند کر چکا تھا۔ سر آر ڈی بھنڈار کر نے ایک فاضلانہ تصنیف میں بتلایا ہے کہ کرشنا اور شیوا فرقوں نے کس طرح بتدریج ہندو مذہب کی شکل اختیار کی اور یہ فرقے ابتدا میں کس قدر مرکب اور مخلوط نظر آتے تھے ادھر مدرسوں میں ماہرین مذہب مخالف فرقوں پہ نکتہ چینیاں کر رہے تھے ادھر عوام میں عام پسند مذہب کے عقائد پختہ ہو رہے تھے۔ مذہب کے فنا ہو جانے سے شنکراچاریہ کو وید کے فلسفہ پہ عام مذہب کے ڈھالنے میں آسانی ہوئی۔ نئے مذہب کا بانی شنکراچاریہ جنوبی برہمن مالا بار کا رہنے والا تھا.... شنکراچاریہ

نے ایک طرف مقامی دیوتاؤں کی پوجا جائز قرار دے کر چھوٹے چھوٹے
مقامی مخلوق خداوندوں کو پوران کے ایک نہ ایک دیوتا سے ملا دیا۔
دوسری طرف ایسے فلسفہ کی بنیاد رکھی جسے وحدانیت سے تعبیر کر سکتے ہیں"

اس پہلے باب میں تاریخی کتابوں کے نام اور حوالے کہیں کہیں موجود ہیں لیکن اس باب کے مندرجہ تمام مطالب تاریخ اسلام ۔ تاریخ ابن خلدون ۔ تاریخ فرشتہ' چچ نامہ ۔ تاریخ سندھ معصومی ۔ ناسخ التواریخ ۔ جامع التواریخ ۔ تاریخ ذکا اللہ روضتہ الصفا سے ماخوذ ہیں جو بطور حاصل مطلب ترتیب دے کر پیش کئے گئے ہیں۔ جن نتائج کو میں نے اخذ کیا ہے یا جو میری ذاتی رائے ہے وہ ہر شخص مطالعہ کرتے وقت الگ معلوم کر سکتا ہے اور اس کتاب کے پڑھنے والے خود فیصلہ کریں گے کہ میں نے کہاں کہاں نتائج کے اخذ کرنے میں غلطی کی ہے ۔ میں انسان ہوں مجھ سے غلطیاں بہت ہو سکتی ہیں لیکن میری نیت نیک ہے اور کسی کے دل کو رنج پہنچانا میرا منشا ہرگز ہرگز نہیں ہے

نمی خواہم کہ در عالم دلے از من غمیں باشد
زفیض دوستی آگاہ گرداں دشمنانم را

باب دوم

عربوں کا سندھ پر حملہ آور ہونا اور تین سو سال تک سندھ میں حکومت کرنا اوپر بیان ہو چکا ہے۔ جس میں مندروں کے ڈھائے۔ مورتیوں کے توڑنے اور ہندوؤں کو زبردستی مسلمان بنانے یا ناجائز طور پر نقصان پہنچانے کا کوئی واقعہ نظر نہیں آتا۔ خود سندھ کے راجہ نے مسلمانوں کو حملہ آوری پر مجبور کیا تھا اور مسلمانوں نے سندھ پر قابض ہو کر یہاں عدل و داد اور مہربانی و انصاف قائم کیا۔ جہالت کی تاریکی دور کر کے علم و تہذیب کی روشنی پھیلائی اور ہندوؤں پر احسانات کی بارشیں کیں۔ اس باب میں مسلمانوں کے ان حملوں کا ذکر ہوگا۔ جو انھوں نے ہندوستان کے شمالی و مغربی پہاڑوں یعنی افغانستان کی طرف سے کیے۔ مسلمانوں کی اس حملہ آوری کی فرضی داستانوں نے ہمارے زمانے میں حیرت انگیز طور پر ہندوؤں کو مصروف سوگواری بنا دیا ہے۔ تعجب ہے کہ مغول و تاتار۔ سیتھین۔ ہن۔ آتش پرست ایرانی سکندر یونانی سب ہی ان شمالی و مغربی پہاڑوں کے دروں سے ہندوستان پر حملہ آور ہوئے اور بڑی بڑی بربادیاں اور تباہیاں ہندوستان کے باشندوں پر وارد کیں لیکن ان میں سے کسی کو کبھی مجرم نہیں بتایا جاتا۔ مسلمانوں ہی نے کچھ ایسے ستم ڈھائے ہوں گے کہ ان کی یاد کا تازہ ہو جانا اور فریباً ایک ہزار سال کے بعد پہلے زخموں کا ہرا ہو جانا ضروری تھا۔ غیر آریہ یعنی شودر قوموں کی تو کیا مجال ہے کہ وہ سب سے پہلے حملہ آوروں یعنی آریوں کے ان مظالم کا ذکر زبان تک لا سکیں جنھوں نے نسل انسانی کے ایک بہت بڑے حصے یعنی ہندوستان کی تمام قدیمی آبادی کو حقوق انسانی سے محروم کر کے ان کو درندوں کی طرح قتل کیا اور بقیۃ السیف کے گلے میں ذلت و خواری کا ایسا طوق ڈالا کہ وہ آج تک بھی چوپایوں کے درجہ سے کچھ ہی بلند

نظر آتے ہیں۔ آریوں یعنی دو جنموں کے پہلو بہ پہلو کھڑے ہونے کا تو خیال بھی شاید اپنے دل میں نہیں لا سکتے۔ بہرحال ہم کو اس وقت مسلمانوں کے اس جرم عظیم کی کیفیت ملاحظہ کرنی ہے۔ پہلا مسلمان حملہ آور محمد بن قاسم تو اپنی برأت کا ثبوت پیش کر چکا ہے اب دوسرے سب سے بڑے مجرم محمود غزنوی کی باری آئی ہے۔

امیر ناصر الدین سبکتگین

سلطان محمود غزنوی کے تخت نشین ہونے سے پہلے پنجاب اور غزنی کی سلطنتوں میں لڑائی کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ لہٰذا ہم کو سلطان محمود غزنوی کے باپ سبکتگین اور پنجاب کے راجہ جے پال کی طرف متوجہ ہونا پڑے گا۔

جے پال

جے پال بن ہٹ پال کے بزرگوں میں پہلا شخص جس نے حکومت و سلطنت کی بنیاد ڈالی اس کا نام کنر ماتی یا درتمان تھا۔ وہ قوم سے مغول تاتاری اور بدھ مذہب کا پیرو تھا۔ اس نے غالباً ہارون الرشید کی تخت نشینی سے پہلے اور خلافت بنو امیہ کی بربادی کے بعد یعنی دوسری صدی ہجری کے درمیانی زمانہ میں پنجاب و کشمیر کے راجہ چندر پیدیا کی اولاد میں کسی راجہ سے پنجاب کا ملک چھین کر اپنی حکومت قائم کی تھی اور چندر پیدیا کی اولاد صرف کشمیر ہی پر قابض رہ گئی تھی۔ جے پال بڑا اولوالعزم اور چالاک شخص تھا۔ اس کی دوربینی اور مآل اندیشی کا ثبوت اس کے اس کارنامے سے دستیاب ہوتا ہے کہ اس نے حمید خاں لودی کو ملتان پر قابض ہونے اور قریشی خاندان کا خاتمہ کرنے میں امداد پہنچائی اور اس طرح سبکتگین کے لئے قرامطہ کی مسلم کش طاقت کی ہمت افزائی کر کے خود سبکتگین کی رعایا میں سے مضبوط سرحدی قبائل کو حریف بنا کر کھڑا کر دیا۔ جو دلیل اس بات کی ہے کہ جے پال غزنی کی نوزائیدہ سلطنت کو کچل ڈالنے اور اپنی اولوالعزمی کے سبب مملکت غزنی پر (جو سلطنت سامانیہ اسلامیہ کا ایک حصہ تھا) خود قابض ہونے کا خواہاں تھا۔

الپتگین

الپتگین۔ ایک سامانی سردار علاقہ غزنی کا صوبہ دار تھا اور موقعہ پا کر اپنی خود مختاری کا اعلان کر کے اپنی جدا خود مختار سلطنت قائم کر چکا تھا۔ ۳۶۵ھ میں الپتگین فوت ہوا تو اس کا بیٹا ابو اسحٰق غزنی کا فرماں روا ہوا۔ وہ بھی چند ہی مہینے کے بعد فوت ہوا تو امرا نے ایک ترکی امیر بلکاتگین کو اپنا

حاکم منتخب کیا چندروز کے بعد وہ بھی فوت ہوا تو ۳۶۶ھ میں امراء نے سلطنت غزنی کے سپہ سالار سبکتگین کو اپنا حاکم بنایا۔ سبکتگین نے بست و قصدار کی ریاستوں کو اپنی سلطنت میں شامل کیا۔ یہ ریاستیں مسلمان حاکموں کے قبضے میں تھیں جے پال کے حدودِ مملکت میں اس نے قطعاً کوئی دخل نہیں دیا۔ بعض مورخین نے جے پال کے ملک کی مغربی سرحد کو دریائے سندھ کے مغربی کنارے سے بھی آگے جلال آباد و لمغان تک بڑھا دیا ہے۔ مگر یہ سراسر غلط اور حقیقت کے بالکل خلاف ہے۔ یہ دھوکا محض اس لئے لگا ہے کہ جے پال کے دوسرے حملے کو سبکتگین کا جوابی حملہ تصور کر لیا گیا ہے حالانکہ جے پال دوسری مرتبہ بھی لشکر لے کر سبکتگین کے ملک میں دور تک داخل ہو گیا تھا اور لڑائی لمغان کے قریب یعنی سلطنت غزنی کے وسطی علاقے میں ہوئی تھی۔ اس میدان کو غلطی سے پنجاب و غزنی کی حدِ فاصل سمجھ لیا گیا ہے۔ کابل کی ریاست کو جس کے حاکموں کا لقب رتبیل تھا مسلمان پہلے ہی فتح کر چکے تھے رتبیل کی حکومت دریائے سندھ کے مغربی کنارے تک وسیع تھی یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ کابل و غزنی کا علاقہ سامانی سلطنت میں شامل ہو اور سامانی سلطنت جلال آباد تک کا ملک پنجاب کے راجہ کو فتح کر لینے دے یہ بات بھی کسی طرح سمجھ میں نہیں آسکتی کہ دریائے سندھ یا زیادہ سے زیادہ درۂ خیبر اور اس کے پہاڑی سلسلہ کی قدرتی حدود کو چھوڑ کر پنجاب کی ریاست اور اسلامی سلطنت کی غیر قدرتی حد لمغان کے میدان میں قائم ہوتی۔

درۂ خیبر اور کابل کے لوگ سب مسلمان ہو چکے تھے۔ حالانکہ جے پال کی رعایا میں کسی مسلمان گروہ یا مسلمان آبادی کا نام و نشان نہ تھا۔ لہذا کسی طرح فرض نہیں کیا جا سکتا کہ موجودہ سرحدی علاقہ جے پال کے پاس تھا۔

غرض اس بلا دلیل اور بے اصل دروغ بے فروغ کی تردید میں کہ جے پال کی مغربی حد مغربی دروں کے اندر تک پھیلی ہوئی تھی ہم کو زیادہ وقت صرف کرنے کی مطلق ضرورت نہیں۔

سلطنت غزنی کی ابتدا

امیر ناصر الدین سبکتگین نے غزنی کا فرماں روا بننے کے بعد بست و قصدار پر قبضہ کر لیا تھا اس کے بعد وہ سلطنت بخارا کے خرخشوں میں مبتلا ہو گیا۔ اس کے لئے کبھی یہ موقع نہ آیا کہ وہ پنجاب کو فتح کرنے کا ارادہ کرتا تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ۳۲۵ھ میں ابوالفوارس عبدالملک بن نوح سامانی

شہنشاہِ بخارا چوگان کھیلتے ہوئے گھوڑے سے گر کر فوت ہوا۔ دارالسلطنت بخارا میں جو امیر موجود تھے انھوں نے ان بڑے بڑے سرداروں کے پاس جو مختلف صوبوں کی حکومت پر مامور تھے خطوط بھیج کر رائے طلب کی کہ خاندان شاہی سے کس شہزادے کو تخت نشین کیا جائے۔ اس مضمون کا خط غزنی کے عامل الپتگین کے نام بھی آیا۔ الپتگین نے اپنی رائے لکھ کر بخارا کی جانب روانہ کر دی۔ الپتگین کا خط پہنچنے سے پہلے وہاں ابو صالح منصور بن نوح سامانی تخت نشین ہو چکا تھا۔ الپتگین کا خط اس کے ہاتھ میں پہنچا۔ جس میں ابو صالح منصور کے خلاف رائے ظاہر کی گئی تھی۔ اب الپتگین کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے اور اس نے اپنی حفاظت اسی میں دیکھی کہ غزنی اور کابل کے علاقے پر قابض رہ کر خود مختاری کا اعلان کر دے۔ چنانچہ ابو صالح منصور الپتگین کا کچھ نہ بگاڑ سکا اور ملک کا یہ صوبہ سلطنت سامانی سے جدا ہو گیا۔ ابو صالح منصور کے بعد اس کا بیٹا ابو القاسم نوح بن منصور تخت نشین ہوا۔ چند روز کے بعد اسی سال الپتگین بھی فوت ہو گیا اور دو سال تک غزنی کا انتظام ابو اسحٰق اور بلکاتگین کے جلد جلد فوت ہونے کے سبب کمزور رہا اس زمانے میں نوح بن منصور سامانی غزنی کو ضرور فتح کر لیتا لیکن سلطنت بخارا کے دو امیر یعنی نیشاپور اور ہرات کے عامل باغی ہو گئے اور دربار بخارا غزنی کی طرف متوجہ نہ ہو سکا۔ سبکتگین کو اس بات کا سخت اندیشہ تھا کہ سلطان بخارا ضرور غزنی پر چڑھائی کرے گا۔ اس خطرے اور اندیشے میں وہ کسی بڑی سلطنت سے لڑائی چھیڑنے کی جرأت ہی نہیں کر سکتا تھا۔

نیشاپور کے عامل ابو علی نے ہرات کے عامل فائق کو شکست دے کر بھگا دیا اور تمام خراسان پر قبضہ کر کے اپنی ایک جداگانہ سلطنت قائم کر لی۔ فائق ابو علی سے شکست پا کر دیلمیوں کے پاس پہنچا۔ فخر الدولہ دیلمی نے اپنا لشکر اس کے ساتھ بخارا پر چڑھائی کرنے کے لئے بھیج دیا اُدھر دوسری طرف بغراخاں حاکم ترکستان نے بخارا پر چڑھائی کر دی۔ اس طرح نوح بن منصور تین زبردست دشمنوں میں گھر گیا۔ اس نے اس پریشانی اور مجبوری کے عالم میں سبکتگین کو خط لکھا کہ میری مدد کو پہنچو۔ سبکتگین نے اس کو اپنے لئے تائیدِ غیبی سمجھا اور غزنی سے فوج لے کر بخارا کی طرف چلا۔ شاہ ترکستان تو خود ہی بیمار ہو کر فوت ہو گیا اور اس کی فوج اپنے ملک کو واپس چلی گئی۔ اب دو دشمن باقی رہ گئے جو آپس میں نوح بن منصور کے خلاف متحد ہو چلے تھے ہرات کے متصل نوح بن منصور اور سبکتگین نے مل کر ابو علی اور

فایق اور فخر الدولہ کی متحدہ افواج کو شکست فاش دی۔ اس لڑائی میں سبکتگین کے ہمراہ اُس کا بیٹا محمود بھی موجود تھا۔ ابو علی لڑائی میں مارا گیا اور فائق ترکستان کے نئے بادشاہ ایلک خاں کے پاس چلا گیا نوح بن منصور نے بعد فتح سبکتگین کو ناصرالدین اور اس کے بیٹے محمود کو سیف الدولہ کا خطاب دیا اور غزنی کی سندِ حکومت کے علاوہ خراسان کا تمام ملک بھی ناصرالدین سبکتگین کے سپرد کر دیا۔ فائق نے ترکستان پہنچ کر بغرا خاں یا بغرا خاں کے جانشین ایلک خاں کو بخارا پر چڑھائی کرنے کی ترغیب دی چنانچہ ایلک خاں حملہ آور ہوا۔ نوح بن منصور نے پھر سبکتگین کو بلایا۔

سبکتگین کے پہنچنے پر دونوں بادشاہوں میں صلح ہو گئی۔ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ ان ایام میں قرامطہ کا بہت زور تھا اور سبکتگین ان کے استیصال کو نہایت ضروری سمجھتا تھا۔ ایک طرف قرامطہ کی خفیہ سازشوں کا اندیشہ دوسری طرف دیلمیوں کی مخالفت تیسرے فائق وابو علی کے مذکورہ خرخشے چوتھے خود ہی اپنے خاندان کی سلطنت کا بانی اور نیا بادشاہ ہونے کی وجہ سے اندرونی بغاوتوں کا خوف ان حالات میں اس کی توجہ حدودِ ہندوستان کی طرف صرف اسی قدر مبذول ہو سکتی تھی کہ وہ اپنی مشرقی و جنوبی سرحد کی طرف جہاں قرامطہ کا چرچا تھا متوجہ ہو کر ہر قسم کی احتیاط اور مضبوطی سے کام لے کر اس سلم کُش بلکہ انسانیت کُش تحریک کا استیصال کرے۔ چنانچہ اس نے کوہ سلیمان کے پہاڑی قبائل میں قرامطہ کو چُن چُن کر پکڑا۔ اور لوگوں کو نماز روزے کی تاکید کر کے مسجدیں بنوا کر ان کے آباد رکھنے کا انتظام کیا۔ اسی سال یعنی ۳۸۵ھ کے اواخر میں حمید خاں لودی نے متوہم ہو کر امیر سبکتگین کو اپنے مسلمان ہونے کا یقین دلا کر اطمینان حاصل کیا۔ ابھی سبکتگین پورے طور پر اپنی مغربی حدود کے انتظام سے فارغ نہ ہوا تھا کہ نوح بن منصور سامانی کی طلب پر اُس کو ایلک خاں کے مقابلے کے لئے بخارا کی سمت روانہ ہونا پڑا اور صلح پر جیسا کہ اوپر ذکر آ چکا ہے اس مہم کا خاتمہ ہوا۔

جے پال کا حملہ

اب سوچنے اور غور کرنے کے قابل بات یہ ہے کہ اس وقت تک سبکتگین نے بجز اس کے کہ اپنی سرحد کے قرامطہ کا قلع قمع کیا اور لوگوں کو نماز روزے کا پابند بنایا۔ راجہ جے پال یا اس کے ملک سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ مگر راجہ جے پال نے یا تو اپنے دوستوں یعنی قرامطہ کے انتقام میں یا اولوالعزمی اور ملک گیری کے شوق

میں سبکتگین کی اس جدید سلطنت کو ایک تر لقمہ سمجھ کر نہایت عظیم الشان اور جرار لشکر کے ساتھ اس وقت چڑھائی کی جب کہ باغیوں اور دیلمیوں کے لشکر نے سیف الدولہ محمود بن سبکتگین کو نیشاپور میں تنہا پاکر چڑھائی کر دی تھی اور یہ خبر سنکر سبکتگین اپنے بیٹے کی حفاظت و امداد کے لئے غزنی سے گیا ہوا تھا۔ وہاں طوس کے قریب سبکتگین نے دشمنوں کے ساتھ میدانِ کارزار گرم کر رکھا تھا اور اس کا بیٹا محمود بھی نیشاپور سے اسی میدان میں پہنچ کر باپ کے ساتھ دشمنوں کا مقابلہ کر رہا تھا اور یہاں راجہ جے پال لاہور سے پشاور اور پشاور سے حملہ ہوتا ہوا سلطنت غزنی میں داخل ہوکر سیلاب کی طرح سیکڑوں میل سفر طے کر چکا تھا سبکتگین نے طوس کے میدان میں فتح پاکر اس غیر مترقب مصیبت کا حال سُنا کہ پنجاب کے راجہ نے عظیم الشان لشکر کے ساتھ داخل ہوکر ملک کو روند ڈالا ہے اور عنقریب شہر غزنی پر بھی قابض ہوا چاہتا ہے سبکتگین بلا تامل اپنے اہل و عیال کی محبت اور دار السلطنت کے بچانے کے خیال میں دیوانہ وار دومنزلہ اور سہ منزلہ یلغار کرتا ہوا طوس سے غزنی کی جانب چلا اور شہر غزنی کے متصل جنوب کی جانب جے پال کے لشکر کے مقابل پہنچا۔ یہاں پہنچتے ہی لڑائی کا سلسلہ شروع کر دیا تمام مورخوں کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ لڑائی ایک ایسے چشمے کے قریب ہوئی جس میں اگر نجاست ڈال دی جائے تو فوراً برف باری شروع ہو جاتی تھی۔ اور یہی چشمہ راجہ جے پال کی شکست کا موجب ہوا۔ ہم کو اس وقت اس چشمہ کی پاکی اور برف باری کے اسباب تلاش کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ صرف اس بات پر غور کرنا ہے کہ ایک عجیب الاثر چشمہ کا اس نواح میں ہونا تمام ہندو مسلمان مورخین نے بالاتفاق بیان کیا ہے۔ اگر اس چشمے کا محلِ وقوع معلوم ہو جائے تو پھر اس بات کا فیصلہ بڑی آسانی سے ہو سکتا ہے کہ اس سب سے پہلی معرکہ آرائی میں جے پال سبکتگین پر حملہ آور ہوا تھا۔ یا سبکتگین بلا وجہ جے پال پر چڑھ کر آیا تھا۔ اس چشمے کا محلِ وقوع معلوم کرنے کے لئے ایک ایسے ہندو کی گواہی ضرور قابلِ قبول ہونی چاہیئے جس نے افغانستان کا جغرافیہ بھی لکھا ہے اور جو آج سے ڈھائی سو سال پیشتر ایک ایسی تاریخ کی کتاب لکھکر چھوڑ گیا ہے جو آج تک مورخین کے زیرِ مطالعہ چلی آئی ہے اور ہمارے زمانہ میں خاص اہتمام کے ساتھ چھپ کر شائع ہو چکی ہے۔ سنئے منشی المناشی سجان رائے بھنڈاری بٹالوی ۱۱۰۷ھ میں جب کہ کابل و غزنی ہندوستان

کی سلطنت میں شامل تھے اس عجیب الاثر چشمہ کا حال اس طرح لکھتا ہے کہ۔

"طومان غزنی (پرگنہ غزنی) کہ آنرا زابل گویند در زمانِ باستان تخت گاہِ سلاطین خراسان بود بخصوص پایۂ تخت سلطان ناصر الدین سبکتگین و سلطان محمود غزنوی و سلطان شہاب الدین غوری و نیز خوابگاہ حکیم سنائی و بسیارے اولیاست از کثرت برف و شدتِ سرما آنرا برابر تبریز و سمرقند نشان دہند۔ در آن حدود میوہ ہائے فراوان پیدا شود بہ ہندوستان رود و در نزدیکی آن چشمہ ایست کہ اگر قاذورات (پلیدی و نجاست) دران افتد شورش ابر و برف پیدا گردد۔"

پس معلوم ہوا کہ وہ چشمہ پرگنہ غزنی میں تھا جیسا کہ منشی سجان رائے کے بیان سے ثابت ہے پھر یہی منشی سجان رائے ۔ ۔ ۔ بٹالوی اپنی تاریخ خلاصۃ التواریخ میں راجہ جے پال کے حملہ آور ہونے کا حال ان الفاظ میں لکھتا ہے کہ

"راجہ جے پال با بسیارے لشکر و فیلان صفدر بہ سرحد غزنی رفعت سلطان بدریافت این خبر لشکر بسیار و مبارزان جرار در حدودِ ولایتِ خویش رسیدہ آمدہ پیکار گردید۔"

لڑائی کا ذکر کرتے ہوئے سجان رائے کہتا ہے کہ جے پال کے لشکر کو فتح اور سلطان کے لشکر کو شکست ہونے والی تھی۔ مگر سلطان نے یہ تدبیر کی کہ اس چشمے میں پلیدی ڈلوادی جس سے برف باری شروع ہوگئی اور ہندی لشکر سردی کی شدت کا متحمل نہ ہو سکا بہت سے آدمی اکڑ کر رہ گئے۔ ہاتھیوں کے ہاتھ پاؤں بیکار رہ گئے۔ سبکتگین اور اس کے لشکری سردی کے عادی تھے لہذا جے پال نے اپنی شکست کا اعتراف کر کے سلطان سے جاں بخشی چاہی۔ اس جگہ سجان رائے کے الفاظ اس چشمے کی نسبت یہ ہیں۔

"سلطان چوں دید کہ کار شمشیر پیش نمیرود و خرد را پیشوائے دلیری و تدبیر را رہنمائے دلاوری ساخت یعنی در آں نواحِ چشمہ بود کہ اگر بحسب اتفاقات چرک یا قاذورات درونِ آن افتادے برف عظیم باریدے سلطان فرمود تا در آں چشمہ قاذورات انداختند۔"

غرض راجہ جے پال نے سلطنت غزنی پر حملہ آور ہو کر توقع کے خلاف شکست و ذلت حاصل کی۔ راجہ نے یہ حملہ پوری تیاری اور بڑی قوت کے ساتھ کیا اور تاک کر ایسے اچھے

موقع سے کیا تھا کہ اس کی کامیابی اور سلطنت غزنی پر قابض ہوجانے میں کوئی شبہ نہ تھا۔ کیونکہ سبکتگین دوسری جانب دشمنوں کے دفع کرنے میں مصروف اور اپنے دارالسلطنت سے دور تھا۔ مگر ہندی فوج شدت سرما کا مقابلہ نہ کرسکی۔ جب راجہ جے پال نے اپنے آپ کو مجبور دیکھا۔ تو سبکتگین کے پاس درخواست بھیجی کہ مجھ سے بہت بڑی خطا ہوئی ہے آپ اس مرتبہ میرا قصور معاف کردیں۔ میں آئندہ ہمیشہ آپ کا فرماں بردار ہوں گا اور پنجاب پہنچ کر بہت سا چاندی سونا بطور جرمانہ آپ کے پاس بھیجوں گا۔ آپ اپنے آدمی میرے ہمراہ بھیج دیجئے میں اُن کے ہمراہ خزانہ اور قیمتی تحفے معہ پچاس ہاتھیوں کے بھیج دوں گا۔ سبکتگین کے فوجی سرداروں نے اس صلح کو ناپسند کیا اور قابو میں آئے ہوئے دشمن کو رہائی دینا عقل کے خلاف بتایا مگر سبکتگین نے اسلامی تعلیم یعنی وان جنحوا للسلم فاجنح لھا پر عمل کرنا ضروری سمجھا۔ اور عاجز دشمن کی درخواست صلح کو رد کرنا مردانگی کے خلاف سمجھ کر راجہ کو پنجاب کی طرف مراجعت کرنے کی اجازت دی اور اس کی درخواست کے موافق اپنے چند معتمد اس کے ہمراہ کردیئے۔

جے پال کی بدعہدی جے پال نے دریائے سندھ کو عبور کرتے ہی ہندوستان کے تمام راجاؤں کے پاس ایلچی روانہ کردیئے کہ سبکتگین پنجاب پر حملہ کرنے والا ہے۔ اگر میں اس کو روک نہ سکا تو پھر پنجاب پر قابض ہوکر وہ تم کو بھی سلامت نہ چھوڑے گا۔ اس وقت آپس کے تمام جھگڑوں کو طاق میں رکھو اور سب متحد ہوکر غزنی کی سلطنت کا خاتمہ کردو تاکہ آئندہ کے خطرے سے سب کی حفاظت ہوجائے۔ یہ چٹھیاں راجہ جے پال نے اپنے الفاظ میں لکھیں اور اس طرح سب کو اپنی مدد کے لئے بلایا کہ اجمیر و قنوج ہی نہیں بلکہ گجرات و کالنجر تک کے راجہ بیتاب ہوگئے اور فوراً اپنی اپنی فوجیں جے پال کی مدد کے لئے روانہ کیں جے پال نے لاہور پہنچ کر سبکتگین کے آدمیوں کو گرفتار کرکے اپنے عہد و اقرار کو پورا کرنے سے انکار کیا تو اس کے درباریوں نے اس بدعہدی سے اس کو روکنا چاہا۔ مگر راجہ نے کسی کا کہنا نہ مانا۔ اس واقعہ کو فرشتہ نے ان الفاظ میں لکھا ہے کہ۔

"گویند درآں زماں قاعدہ چناں بود کہ ہنگام دیوان داری راجہ ہا چند تن از دانایان برہمن بریمین مے نشستند و جمعے از کھتریان بریسار دہر گاہ

بہے عہدہ رو نمودے ایشاں را یان رأئے داد ندے چوں دیدند کہ جے پال چناں کارے ناشائستہ می خواہد کہ بکند باتفاق در خدمت شاہ معروض داشتند کہ در آئین حزم و عاقبت اندیشی چناں مشاہدہ می کنیم کہ از شامت نقض عہد او بارہ و اسپہ تاخت بریں دیار آوردہ و مارا زندگی ما برآید باید کہ بایں ترک ستیزہ نمودہ بار سال آنچہ کہ مقرر گشتہ خود و خلائق را در عہد امن و امان نگاہداری جے پال راچوں وقت اوبار رسیدہ بود قبول نہ نمود

مگر سجان رائے صرف اس قدر لکھتا ہے کہ

"لیس از رسیدن بمسکن خود از قرار داد برگشتہ کساں سلطان راکہ برائے سپردن فیل و مال ہمراہ آوردہ بود بہ مبادلہ مردم خود کہ نزد سلطان گذاشتہ آمدہ گرد بندی کرد"

سبکتگین کا ردّ عمل

سبکتگین کے پاس جے پال کی بد عہدی کی خبر پہنچی تو اس کو یقین نہ آیا اور سمجھا کہ یہ جھوٹی افواہ ہے۔ لیکن جب اپنے آدمیوں کے واپس پہنچنے کا انتظار کرتے کرتے تھک گیا تو اس نے اس خبر کی تصدیق کے لئے جاسوس روانہ کئے۔ اس عرصہ میں ہندوستان کے دوسرے راجاؤں کی فوجیں جن میں کالنجر و گجرات کی فوجیں بھی شامل تھیں لاہور پہنچ گئیں جاسوسوں نے واپس جاکر سبکتگین کو اطلاع دی کہ جے پال عنقریب حملہ آور ہونے والا ہے اور آپ کے معتمدوں کو اس نے قید کر لیا ہے۔ سبکتگین اب اس تیاری میں مصروف ہوا کہ جے پال پر حملہ کرکے اپنے آدمیوں کو قید سے چھڑائے اور اس کے حملہ کو روکے۔ لیکن جے پال کی تیاری بہت زبردست اور سریع تھی سبکتگین ابھی غزنی ہی میں تھا کہ اس کے پاس خبر پہنچی کہ جے پال نے اس کے معتمدوں کو جام شہادت پلاکر دریائے سندھ کو عبور کر لیا ہے۔ یہ سنتے ہی وہ غزنی سے چلا اور لمغان کے میدان میں دونوں کا مقابلہ ہوا۔ اس جگہ یہ امر تحقیق طلب ہے کہ لمغان کس مقام کا نام ہے اور وہ کہاں واقع ہے کوئی تو لمغان کو جلال آباد کے متصل بتاتا ہے۔ کسی کا بیان ہے کہ لمغان وادیٔ بامیان کا دوسرا نام ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے باپ کا نام از لام تھا ان کو لمک بھی کہتے تھے۔ ان کا مزار بامیان میں ہے۔ وہاں کے آدمی کاف کو غین بولتے ہیں اس لئے

المک کو المغ کہتے ہیں لہذا اس علاقے کو المغآن کہنے لگے کثرت استعمال سے لمغان رہ گیا۔ تزک بابری اور دوسری تاریخوں میں لمغآن کی جمع لمغآنات استعمال ہوئی ہے جو دلیل اس بات کی ہے کہ یہ نام کئی متصلہ مقامات پر بولا جاتا ہے۔ لمغانات جس علاقے پر بولا گیا ہے وہ ایک وسیع علاقہ ہے جو جلال آباد۔ کابل اور غزنی کے درمیان پھیلا ہوا ہے' بعض مورخوں نے ورہ خورک متصل جلال آباد کا نام لمغان بتایا ہے۔ بہرحال اس لڑائی کا مقام جلال آباد کے جنوب اور غزنی کے شمال میں سمجھنا چاہیئے۔ یہ مقام بھی سلطنت غزنی کا وسطی مقام تھا۔ سبکتگین بیچارا اب بھی اپنی سلطنت کے اندر حملہ آور دشمن کو روکنے اور مدافعت کرنے کا گنہگار ہے۔ کس قدر حیرت ہوتی ہے کہ اس دوسری لڑائی کو جو جے پال کا دوسرا حملہ تھا سبکتگین کا دوسرا حملہ بتایا جاتا ہے۔ اور بعض یورپی مورخوں نے تو اس کو محمود غزنوی کا دوسرا حملہ قرار دیا ہے۔ ؏

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست

زینت التواریخ میں لکھا ہے کہ اس مرتبہ لمغان کے میدان میں جے پال کے ہمراہ تین لاکھ جرار فوج اور بہت سے جنگی ہاتھی تھے۔ سبکتگین کی کل فوج ساٹھ ہزار سے زیادہ نہ تھی ملکم صاحب نے بھی فوجوں کی یہی تعداد بتائی ہے۔ سبکتگین جب سامنے پہنچا تو اس نے ایک اونچے ٹیلے پر چڑھ کر جے پال کے لشکر کا معائنہ کیا اور اس کی کثرت دیکھ کر گھبرایا۔ لیکن پھر اپنے دل کو قوی کرکے یہ تصور کیا کہ کلنگوں کی کثرت سے باز کو اور گوسفندوں کی کثرت سے قصاب کو جس طرح خوف نہیں ہوا کرتا۔ اسی طرح مجھ کو بھی خوف زدہ نہیں ہونا چاہیئے۔ آخر لڑائی ہوئی اور جے پال شکست کھا کر بھاگا۔ سبکتگین نے دریائے سندھ کے کنارے تک تعاقب کیا اور ہندی لشکر کو دریا پار بھگا کر دس ہزار لشکر کے ساتھ ایک سردار کو پشاور میں متعین کیا کہ ہمیشہ سرحد کی حفاظت کرتا رہے۔ اس لڑائی میں جے پال اس قدر سامان اور زر و زیورات سراسیمگی کی وجہ سے میدان میں چھوڑ آیا تھا کہ سبکتگین کے تمام مصارف جنگ پورے ہو گئے۔ ہندوستان کی متفقہ افواج کو یہ ایسی شکست فاش ہوئی کہ پنجاب سے بہار و بنگال اور گجرات و دکن تک حیرت و حسرت چھا گئی اور تمام ملک میں برہمنوں اور بدھوں کے جو مباحثے اور مناظرے جاری تھے۔ وہ سب یک لخت ملتوی ہو کر غزنی کی اس نئی ریاست کی قوت کو فنا

کرنے کی تدبیروں کا سوچنا ایک دلچسپ اور ضروری مسئلہ بن گیا۔ لمغان کی لڑائی کا تمام ہندوستان پر اس لئے زیادہ اثر پڑا کہ اس لڑائی میں ہندوستان کے تقریباً ہر حصے اور ہر ریاست کی فوج شامل تھی اس شکست کو ہر ایک راجہ نے اپنی شکست تصور کیا اور ہزیمت خوردہ سپاہیوں نے اپنے اپنے وطن میں پہنچ کر روئداد جنگ سنائی۔ جس سے سبکتگین کی حیرت انگیز قابلیت سپہ سالاری کا سکہ بیٹھ گیا۔ سبکتگین کا حق تھا کہ وہ راجہ جے پال کے ملک پر حملہ کرتا اور کم از کم اس کو اپنے اس وعدے کے ایفا پر مجبور کرتا جو وہ پہلی مرتبہ فرماں برداری اور خراج گذاری کا کر آیا تھا۔ مگر اس نے اپنی اس فتح ہی کو غنیمت سمجھا اور اپنے معتمدوں کے مظلومانہ خون کا بدلہ جے پال کی فوج کے ان مقتولوں کو تصور کرلیا جو لمغان کے میدان اور دوران فرار میں غزنوی تلواروں سے ہلاک ہوتے تھے۔ اس کے بعد سبکتگین کو فوراً شمال کی جانب سامانی سلطنت کے جھگڑے سلجھانے کے لئے جانا پڑا اور ابھی اپنے دارالسلطنت غزنی میں واپس نہیں آنے پایا تھا کہ بلخ کے متصل ۳۸۷ھ میں فوت ہوگیا۔

سلطان محمود غزنوی

جس وقت امیر ناصر الدین سبکتگین کا انتقال ہوا ہے تو اس کا چھوٹا بیٹا امیر اسمٰعیل جو الپتگین کی بیٹی کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا اس کے ہمراہ موجود تھا اور بڑا بیٹا محمود نیشاپور میں تھا۔ ہمراہی سرداروں نے اسمٰعیل کو بلخ میں لے جاکر تخت نشین کیا۔ محمود نے نیشاپور سے بھائی کو لکھا کہ میں بڑا ہوں تم چھوٹے ہو مناسب یہ ہے کہ تخت مجھ کو ملے اور تم میری اطاعت کرو۔ تاکہ ملک میں فتنہ برپا نہ ہوسکے۔ تم ناتجربہ کار ہو۔ امور سلطنت کا بار تم سے نہ اُٹھ سکے گا۔ میں تمہارے لئے یہ رعایت روا رکھتا ہوں کہ تم کو بلخ وخراسان کا مستقل حاکم بنادوں گا لیکن دارالسلطنت غزنی اور بقیہ تمام ملک میرے تصرف میں ہوں گے۔ اسمٰعیل نے اس مناسب تجویز اور ملک کی تقسیم کو نامنظور کیا اور لڑائی پر آمادہ ہوگیا۔ آخر لڑائی ہوئی اور اسمٰعیل گرفتار ہوکر محمود کے سامنے پیش ہوا۔ محمود نے اس کو عزت وآرام کے ساتھ نظر بند کرکے ایک قلعہ میں رکھا اور خود باپ کے ملک کا مالک ہوا۔ محمود اسمٰعیل کے تنازعے میں چھ مہینے سے زیادہ مدت صرف ہوئی۔ اسمٰعیل کی طرف سے مطمئن ہوکر اور سلطنت غزنی کا فرماں روا بننے کے بعد اگر محمود کو جے پال سے لڑنے کا شوق ہوتا تو وہ سب سے پہلے دریائے سندھ کو عبور کرکے پنجاب

پر حملہ آور ہوتا۔ لیکن اس کو تین سال تک جے پال کا خیال بھی نہ آیا جب تک کہ جے پال خود ہی اس کے ملک پر حملہ آور نہ ہوا۔ جے پال یہاں سلطنت غزنی پر حملہ آور ہونے کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ وہاں محمود نے تخت نشین ہوتے ہی بخارا کے سامانی سلطان منصور سے اس امر کی شکایت کی کہ بلخ و خراسان کی امیر الامرائی میرا حق ہے۔ آپ نے خراسان میں اپنی طرف سے بکتوزن نامی سردار کو کیوں امیر الامرا مقرر کیا۔ اس کا جواب منصور سامانی کی طرف سے محمود کے حسب منشا نہ آیا تو محمود نے لشکر فراہم کر کے خراسان کو بزور شمشیر اپنے قبضے میں لانا چاہا۔ بکتوزن نے محمود کے مقابلہ کی ہمت اپنے اندر نہ دیکھ کر منصور سامانی کو لکھا۔ منصور سامانی خود بخارا سے فوج لے کر خراسان کی حفاظت اور محمود کے مقابلے کو روانہ ہوا۔ محمود اس خوف سے کہ لوگ مجھ کو نمک حرام کہیں گے منصور سامانی کے مقابل نہ ہوا۔ اور نیشاپور میں قیام کر دیا۔ بکتوزن نے یہ گستاخی کی کہ منصور سامانی کو جو اس کی امداد کے لئے آیا تھا موقعہ پا کر قتل کر دیا اور اس کی جگہ ایک ناتجربہ کار نو عمر لڑکے عبد الملک کو تخت نشین کر کے خود بخارا کی سلطنت کا مدار المہام بن گیا۔ محمود نے یہ خبر سن کر حملہ کیا۔ بکتوزن شکست کھا کر بھاگا اور دوسرے سردار عبد الملک کو لے کر بخارا چلے گئے وہاں ترکستان کے بادشاہ ایلک خاں نے بخارا پر حملہ کر کے عبد الملک سامانی کو قتل کیا اور اس طرح سامانی خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔ محمود نے خراسان پر قابض ہو کر ہرات و بلخ وغیرہ کا انتظام کیا۔ ان تمام ہنگاموں میں تین سال ختم ہو گئے۔

سنہ ۳۹۰ھ میں محمود ہرات سے سیستان کی جانب آیا۔ جہاں صفاری خاندان کا آخری بادشاہ خلف بن احمد جو یعقوب بن لیث صفار کا نواسا تھا فرماں روائی کر رہا تھا خلف بن احمد کے قبضے میں سیستان و مکران کے صوبے تھے۔ اس نے اپنے بیٹے کو جو اس کی فوج کا سپہ سالار اور رعایا میں ہر دل عزیز تھا۔ بغاوت کے شبہ میں نہایت ظالمانہ طور پر قتل کیا تھا۔ لہٰذا سیستان کی رعایا نے محمود غزنوی کے پاس خلف بن احمد کے مظالم کی شکایت اور اس کے قرابتی ہو جانے کا حال لکھ کر درخواست کی کہ آپ اس ملک پر چڑھائی کریں محمود نے سیستان پہنچ کر خلف کو محصور کر لیا۔ اس نے اپنے آپ کو محمود کے حوالے کیا اور رحم کی درخواست کرتے ہوئے محمود کو سلطان کہہ کر مخاطب کیا۔ محمود کو سلطان کا لفظ بہت پسند آیا اور اسی روز سے اپنے آپ کو سلطان کہو

کے لقب سے ملقب کیا۔ خلف چونکہ ترمطی ہوچکا تھا لہذا اس کو اپنے ہمراہ غزنی لا کر نظربند کیا۔ جہاں وہ چار برس تک بحالتِ نظربندی زندہ رہا۔ اس طرح سامانی خاندان کے بعد ہی خاندان صفاریہ کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ یہ تمام حالات ملکم صاحب نے زینت التواریخ کے حوالے سے لکھے ہیں۔

بخارا ایلک خاں کے قبضے میں آچکا تھا۔ فارس و آذر بائیجان اور بغداد کے دربارِ خلافت پر دیلمی مستولی تھے۔ اور محمود کو یہ فکر درپیش تھی کہ تاتاریوں اور دیلمیوں کے خطرے سے محفوظ رہنے کا کوئی انتظام کیا جائے۔ چنانچہ اس نے ایلک خاں کے پاس ایلچی بھیج کر اس سے مصالحانہ و دوستانہ تعلقات قائم کر لینے مناسب سمجھے مگر یہ دوستی زیادہ دنوں قائم نہ رہ سکی ایلک خاں سے دوستی پیدا کرنے کے بعد سلطان محمود نے خلیفہ بغداد قادر باللہ عباسی کی خدمت میں درخواست بھیج کر اقرار اطاعت کیا اور خلیفہ سے سندِ حکومت کی استدعا کی خلیفہ نے سلطان کے پاس ایک گراں بہا خلعت بھیجا اور "امین الدولہ یمین الملت" کا خطاب عطا کیا۔

جے پال کا تیسرا حملہ

سلطان محمود ابھی اپنے ملک کے محفوظ رکھنے کی تدبیروں سے فارغ نہ ہونے پایا تھا کہ محرم ۳۹۱ھ میں اس کے پاس حاکم پشاور کی عرضداشت پہنچی کہ پنجاب کا راجہ جے پال ایک عظیم الشان لشکر فراہم کر کے سلطنتِ غزنی پر حملہ آور ہونے والا ہے۔ اوپر جو واقعات درج ہو چکے ہیں ان سے اس بات کا سمجھ لینا کچھ بھی دشوار نہیں ہے کہ محمود غزنوی کی تمامتر توجہ بخارا و آذربائیجان و فارس کی طرف منعطف تھی۔ وہ جانتا تھا کہ صفاریوں اور دیلمیوں نے کس طرح دربارِ خلافت پر اپنا تسلط قائم کر کے رعب داب قائم کیا۔ اس کو ترکستان کی طرف سے بھی خطرہ تھا۔ وہ اپنی تمام اولوالعزمی اور ہمت اس بات میں صرف کرنی چاہتا تھا کہ دیلمیوں کو جن کا آفتابِ اقبال زوال پذیر ہو چکا تھا اور جو مذہب و عقیدے کے اعتبار سے محمود کے مخالف تھے ہٹا کر خلیفہ کو جو محمود کا ہم عقیدہ اور مخدوم تھا آزادی دلائے اور دربارِ خلافت میں اپنا رسوخ قائم کر کے تمام عالمِ اسلامی میں شہرت و عظمت حاصل کرے۔ یہ کام محمود کے لئے کچھ دشوار بھی نہ تھا۔ وہ یقیناً افغانستان۔ خراسان و ایران و آذربائیجان و عراق و شام و حجاز و ایشیائے کوچک وغیرہ پر اپنی حکومت و سطوت قائم

کر سکتا تھا۔ جیسا کہ اس کے بعد سلجوقیوں نے کیا۔ لیکن راجہ جے پال نے ان کا موں کی طرف سے اس کی توجہ زبردستی اپنی جانب منعطف کی اور اس کو مجبور کر دیا کہ وہ فوج لے کر ایک ایسے بدعہد۔ باغی۔ ضدی مزاج دشمن کی گوشمالی کے لئے روانہ ہوا جو اس سے پہلے دو مرتبہ سخت ذلت اٹھانے کے بعد بھی سلطنت غزنی کے رحم و درگذر سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اب تیسری مرتبہ پھر بلا وجہ حملہ آور ہوا ہے۔ محمود نے غزنی میں جے پال کی تیاریوں کا حال محرم ۳۹۱ھ میں سنا۔ لیکن وہ فوراً ہی مقابلہ کو روانہ نہ ہوا۔ کیونکہ اس کی خواہش تھی کہ کسی طرح یہ خبر غلط ثابت ہو جائے۔ اس نے اس خبر کو عامل پشاور کی بدگمانی اور غیر ضروری احتیاط پر محمول کر کے تحقیق حالات کے لئے جاسوس روانہ کئے۔ وہ اُس وقت تک اس خبر کو غلط ہی سمجھتا رہا جب تک کہ ماہ شوال ۳۹۱ھ میں اُس کے پاس یہ خبر نہ پہنچ گئی کہ جے پال اپنی فوجوں کو دریائے سندھ کے کنارے لے آیا ہے۔

اب ہندوستان کا حال سنیئے یہاں جیسا کہ اوپر ذکر آ چکا ہے جے پال اور ہندوستان کی متحدہ افواج کے میدان لمغان میں شکست یاب ہو کر بھاگنے کے بعد سنگھٹن کی تحریک پورے زور شور کے ساتھ شروع ہو گئی تھی نیز بدھ عالم اور ہندو پنڈتوں کے مناظرے ملتوی ہو کر بھارت نواسیوں کو محبت و یک جہتی کی فضا میں متفق ہو کر سلطنت غزنی کے فتح کرنے کی تیاریوں کا نہایت زریں موقع حاصل ہو چکا تھا۔ سبکتگین کی وفات نے جے پال کی ہمت میں ایک نئی جان ڈال دی تھی۔ اُس نے گذشتہ ہزیمتوں کے تجربہ سے فائدہ اُٹھانے میں کمی نہیں کی اور اسی لئے وہ کئی سال تک محمود کو غزنی سے باہر بلخ و ہرات و سیستان کے مخصوص میں مبتلا دیکھ کر اس کے زوال و اضمحلال کا متوقع رہا اور رات دن فوجی تیاریوں میں مصروف رہ کر اپنے آپ کو خوب طاقتور بناتا رہا۔ جے پال پنجاب جیسے وسیع و زرخیز ملک کا راجہ، ہندوستان کے راجاؤں میں سب سے بڑا اور مشہور و معزز راجہ تھا۔ اُس کو دو مرتبہ سبکتگین سے شکست پانے کی سخت ندامت تھی وہ سب سے زیادہ اس بات کا خواہاں تھا کہ کسی طرح کھوئی ہوئی عزت واپس حاصل ہو اور دو مرتبہ کی کھائی ہوئی شکست کی کافی تلافی ہو جائے۔ اس کی ہمت اس لئے بھی ترقی کر گئی تھی کہ سبکتگین جیسا تجربہ کار سپہ سالار مر چکا تھا اور اب ایک نو عمر ناتجربہ کار لڑکا یعنی محمود اس کا مدِ مقابل تھا۔ غرض جے پال نے اس مرتبہ دور دراز کے راجاؤں سے مدد لئے بغیر اپنی ہی زبردست قوت سے افغانستان کو فتح کر کے ناموری حاصل کرنا چاہی چنانچہ

ڈیڑھ لاکھ سوار و پیادہ اور تین سو جنگی ہاتھی لے کر دریائے سندھ کو عبور کیا اُدھر محمود غزنوی بھی غزنی سے پشاور کی جانب روانہ ہو چکا تھا۔ پشاور کے قریب دونوں لشکر ایک دوسرے کے سامنے خیمہ زن ہوئے۔ نظام الدین احمد ہروی نے اپنی طبقات میں جے پال کی فوج کے سواروں کی تعداد تو دس ہزار بتائی ہے مگر پیدلوں کے لیے لفظ بسیار استعمال کیا ہے اور ہاتھیوں کی تعداد تین سو ظاہر کی ہے۔ فرشتہ جے پال کے پیدلوں کی تعداد تیس ہزار بتاتا ہے اور سوار بارہ ہزار۔ سجان رائے فوج کی تعداد کچھ نہیں بتاتا۔ سیر المتاخرین والے نے اپنی کتاب میں سجان رائے کی کتاب خلاصۃ التواریخ کو حرف بحرف نقل کر دیا ہے۔ روسی میجر جنرل سبیتولف اپنی کتاب میں جے پال کے پیدلوں کی تعداد ایک لاکھ تیس ہزار بتاتا ہے۔ پشاور کے میدان میں جے پال کی فوج کس قدر تھی اس میں اختلاف ہے مگر بیالیس ہزار سپاہی اور تین سو ہاتھیوں سے کم ہرگز نہ تھی محمود کی فوج کو تمام مورخین نے ایک زبان ہو کر صرف دس ہزار بتایا ہے۔ جس میں سوار اور پیدل سب شامل ہیں جے پال کی فوج کی تعداد بیان کرنے میں اختلاف کیوں ہوا؟ اس کا جواب رامچندر صاحب کی تاریخ حالات ہند کے ان الفاظ میں تلاش کرنا چاہیے کہ

"اس لڑائی کے بعد محمود نے اُن سرحدی قبائل کو سزائیں دیں جن کو راجہ جے پال نے سازش کر کے پہلے سے اپنا شریک بنا لیا تھا"

معلوم ہوتا ہے کہ جو فوج لاہور سے راجہ جے پال کے ساتھ اٹک کی جانب روانہ ہوئی وہ صرف بیالیس ہزار سپاہی اور تین سو ہاتھیوں پر مشتمل تھی۔ لیکن دریائے سندھ کو عبور کرنے کے بعد سرحدی قبائل جن کو انواع و اقسام کے لالچ دیئے گئے ہوں گے اُس کے لشکر میں شامل ہوتے ہوں گے۔ محمود جب جے پال کے مقابل پہنچا تو دشمن کے لشکر کی کثرت اور اپنی قلت سے مطلق مرعوب نہ ہوا۔ لڑائی شروع ہوئی اور نتیجہ یہ ہوا کہ جے پال کی فوج دس ہزار محمودی لشکر کے مقابلہ کی تاب نہ لا سکی پانچ ہزار لاشیں میدان میں چھوڑ کر اور جے پال کو مع پندرہ سرداروں کے گرفتار کرا کر باقی فوج لاہور کی جانب بھاگ آئی۔ محمود غزنوی نے اس فتح کے بعد سرحدی چوکیوں کا انتظام کیا اور جے پال کو مع پندرہ جے پالی سرداروں کے لئے ہوئے غزنی پہنچا۔ غزنی پہنچ کر اُس نے جے پال سے پوچھا کہ تم نے کیوں ہم کو بار بار دق کرنے کا ارادہ کیا۔ جے پال نے کہا کہ

اس مرتبہ میری خطا اور معاف کی جائے اور مجھ کو چھوڑ دیا جائے میں اب تا زیست فرماں برداری سے انحراف نہ کروں گا اور پنجاب کو غزنی کا ایک صوبہ سمجھ کر آپ کی جانب سے حکومت کروں گا اور سالانہ خراج بلا عذر و حیلہ بھیجتا رہوں گا۔

محمود کی شرافت

محمود نے انتہائی شرافت کو کام میں لا کر راجہ کی اس استدعا کو قبول کرلیا اور غزنی سے لاہور کی جانب رخصت کر دیا۔ پشاور کے میدان میں ۸ر محرم ۳۹۲ھ مطابق ۵ر اگست ۱۰۰۱ء کو محمود نے فتح پائی تھی اور شعبان ۳۹۲ھ مطابق مارچ ۱۰۰۲ء میں جے پال کو غزنی سے رخصت کیا۔ اس طرح راجہ جے پال تقریباً آٹھ مہینے محمود کے ہمراہ رہا۔ لاہور میں جے پال کا بیٹا انند پال جو معرکۂ جنگ سے فرار ہو کر اپنی جان سلامت لے آیا تھا ملک کا بندوبست کرتا رہا۔

اب سوچنے اور غور کرنے کا مقام ہے کہ راجہ جے پال تیسری مرتبہ سلطنت غزنی پر حملہ آور ہوتا ہے اس کی رعایا کو سازش کے ذریعہ باغی بنا کر اپنے ساتھ شامل کرتا ہے اور محمود کی مٹھی بھر فوج سے شکست پا کر دوسری مرتبہ گرفتار ہوتا ہے محمود نے ابھی تک دریائے سندھ کے اس طرف قدم نہیں رکھا ہے لیکن اس لڑائی کو محمود کا تیسرا حملہ قرار دیا جاتا ہے اور اسی مارسڈن صاحب۔ جے سی ایلیٹ صاحب۔ ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر صاحب۔ لیتھبرج صاحب اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سرجان ملکم صاحب بھی یک زبان ہو کر فرماتے اور ہمارے بچوں کو مدرسوں اور کالجوں میں یقین دلاتے ہیں کہ محمود غزنوی نے ہندوؤں کو زبردستی مسلمان بنانے اور ہندوستان کی دولت سمیٹ کر غزنی لے جانے کے لئے بلا وجہ بیچارے ہندوؤں پر حملے کئے اور وہ ہندوؤں کا بلا سبب قتل کرنا ثواب کا کام سمجھتا تھا۔ اسی مارسڈن صاحب اپنی طرف سے محمود کے اس فرضی حملہ کا ایک سبب یہ بھی تصنیف فرماتے ہیں کہ

"محمود ابھی بچہ ہی تھا کہ اس نے اکثر اوقات گراں بہا مال و منال سے لدی ہوئی اونٹوں کی لمبی لمبی قطاریں اپنے باپ کے ملک میں سے بار ہوتی دیکھی تھیں وہ سوداگروں سے بات چیت کیا کرتا تھا جو بڑے بڑے شہروں اور پُر از دولت مندروں کا کُل حال سُناتے تھے اس پر وہ کہتا کہ جب میں بڑا ہو کر بادشاہ بنوں گا تو ہند کے راجاؤں کے ساتھ

لڑوں گا اور ان سے سارا سونا چاندی اور بیش قیمت مال و اسباب
چھین کر غزنی لے آؤں گا۔"

دوسرے صاحب یعنی لیتھبرج صاحب فرماتے ہیں کہ

"محمود کا ہند کی دولت پر تو دانت تھا ہی مگر ساتھ ہی یہ بھی آرزو تھی
کہ بڑے بڑے بانکے راجپوتوں کو تلوار کے زور سے مسلمان کرے۔"

تیسرے صاحب جے سی ایلین صاحب لکھتے ہیں کہ

"محمود لوگوں کو مسلمان بنانے کے لئے شہروں کو برباد کر دیتا تھا جو مسلمان ہونے سے انکار کرتا اُس کو قتل کر ڈالتا تھا۔ اُس نے شہروں کو برباد کیا۔ مندروں کو گرا دیا۔ متبرک برہمنوں کو جن کی ہندو عزت کرتے تھے قتل کر ڈالا۔ گاؤں اور قصبوں کو اُجاڑ دیا۔ پختہ غلوں کے کھیتوں کو جلا کر خاک کر دیا اور خوش و خرم گھروں کو ماتم کدہ بنا دیا۔ ... راجہ جے پال والیٔ لاہور نے اپنے ملک کو بچانے کے لئے سخت کوشش کی۔ سلطان محمود ایک جرار فوج لے کر کوہستانی علاقوں سے گذرتا ہوا ہندوستان کے میدانوں پر حملہ آور ہوا اور شہر پشاور کے نزدیک اپنے ڈیرے ڈال دیئے راجہ جے پال راجپوت سوار۔ پیدل اور بہت سے ہاتھی لے کر حملہ آور فوج کو پسپا کرنے کے لئے آگے بڑھا گھمسان کی لڑائی ہونے لگی مسلمان سپاہیوں نے تلواروں سے ہاتھیوں کی سونڈیں کاٹ ڈالیں اور تیروں سے اُن کی ٹانگیں زخمی کر دیں۔ مسلمانوں نے مذہب کے جوش میں متاثر ہو کر ہندوؤں پر اس زور سے حملہ کیا کہ اُن کی فوج تتر بتر ہو کر بھاگ گئی محمود کے سپاہی راجہ جے پال کو رسیوں سے باندھ کر اپنے بادشاہ کے سامنے لے گئے اور نیز اُنھوں نے بہت سے ہندوؤں کو قید کر لیا کچھ قیدیوں کے ہاتھ اُن کی کمر سے باندھ دیئے بعضوں کو اُن کے کان پکڑ کر اور بعضوں کی گردن پر تھپڑ مارتے ہوئے لے چلے۔"

اب بڑے سنجیدہ مزاج مورخ ملکم صاحب کی مضمون آفرینی بھی ملاحظہ ہو اُن کو اپنے مقصد کے پورا کرنے میں اس قدر جلدی تھی کہ جو کچھ اوروں نے محمود کے سر تھوپا تھا

اُنھوں نے اُس کو سبکتگین کا حال لکھتے ہوئے اُسی کے بیٹے محمود کے باپ کے سر پر لاد دیا۔ چنانچہ وہ سبکتگین کی نسبت لکھتے ہیں کہ

"اس نے ہندوستان پر اس لئے حملہ کیا تھا کہ ہندوستان کی دولت کا حال وہ سُن چکا تھا اور لوٹ کی چاٹ اُس کو بے ڈھب لگی تھی اور علاوہ اس کے بڑی غرض یہ تھی کہ بُت پرستوں کے دین و مذہب کو خاک میں ملا دے اور اپنے پیغمبر کی ملت اُجاگر کرے چنانچہ اُس نے پہلے پہل راجہ جے پال کو شکست فاش دی جو اُن دنوں شمالی ہندوستان کا راجہ تھا اور کابل پر قبضہ کیا اور پنجاب کو لوٹا کھسوٹا اور دوسری مہم میں پہلی مہم کی بہ نسبت بڑی کامیابی حاصل ہوئی یعنی ہندوستان کے راجہ پر بڑے معرکہ میں غالب آیا۔"

(تاریخ ایران حصہ دوم مصنفہ ملکم صاحب)

یورپی مورخوں سے ایک سوال

جے پال و سبکتگین کی دو لڑائیوں اور جے پال و محمود کی ایک پہلی لڑائی کا حال اوپر بیان ہو چکا ہے اُس کو پڑھو اور اِن یورپی مورخوں کے بیان کو پڑھو اور تحقیق کرو کہ آج تک کسی نے اُن عالی جاہ مورخوں سے یہ دریافت کرنے کی بھی جرأت کی کہ جناب آپ کے محمود کو اپنے باپ کی سلطنت میں سوداگروں سے باتیں کرتے اور ہندوستان کے راجاؤں سے لڑنے اور ہندوستان کی دولت غزنی لے جانے کا ارادہ ظاہر کرتے ہوئے خود سُنا تھا اور جے پال کو رسیوں سے باندھتے اور اُس کے ہمراہیوں کو کان پکڑ کرے جاتے اور دھولیں مارتے ہوئے دیکھا تھا یا محض زینتِ کلام کے طور پر آپ کے دماغ کا اختراع ہے اور یہ حالات و اسباب جو آپ نے بیان کئے ہیں کس تاریخ یا کس ماخذ سے آپ کو معلوم ہوئے ہیں۔ کس قدر حیرت کا مقام ہے کہ انھیں یورپی مورخین کی لکھی ہوئی کتابوں کے حوالوں کو اثباتِ مدعا کے لئے تمام ہندو مسلمان مصنفین اس طرح پیش کر کے مطمئن ہو جاتے ہیں کہ گویا اُنھوں نے اپنی تحقیق حدِ کمال تک پہنچا دی اور اب اُن کے مخاطب کو علم الیقین اور عین الیقین کے مدارج سے گذر کر حق الیقین کے مرتبہ تک پہنچ جانا چاہیئے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ ہندوستانیوں کی نفسیات سے واقف ہو چکے ہیں اُن کو موقعہ حاصل ہے کہ وہ بلا تکلف ان کو احمق اور اُلو بنا کر اپنا اُلو سیدھا کریں اور اُن کی جہالت مآبیوں اور حماقت پناہیوں کا تماشا دیکھ دیکھ کر لطف اُٹھائیں

اور قہقہے لگائیں۔

آدم. برسر مطلب محمود غزنوی اگر واقعی لوگوں کو مسلمان بنانے اور جو انکار کرے اُس کو فوراً قتل کرڈالنے کا شوقین تھا تو تعجب ہے کہ جے پال آٹھ مہینے تک اُس کے پاس رہا اور مسلمان نہ ہوا بلکہ ہندو کا ہندو ہی بنا ہوا صحیح و سلامت واپس آیا محمود نے اُس سے خراج گذاری اور فرماں برداری کا اقرار تو لیا مگر مسلمان ہونے کی فرمایش نہ کی اگر فرمائش کی تھی تو اُس کے انکار پر اُس کو قتل کیوں نہیں کیا جے پال تو اُس کے باپ سے بھی دو مرتبہ پہلے لڑ چکا تھا۔ اُس نے پہلی مرتبہ اقرارِ اطاعت اور خراج گذاری کے وعدہ پر رہائی پاکر دوبارہ حملہ کیا اور اب سہ بارہ حملہ آور ہوکر محمود کے پنجہ میں گرفتار ہوا تھا۔ ایسے بدعہد دروغ گو اور فتنہ برپا کرنے والے کو سوائے محمود کے اور کون ہے جس نے اس طرح رہائی دی ہو اور عزت کے ساتھ اُس کے ملک کی طرف رخصت کیا ہو۔ کیا دُنیا میں اس سے بڑھ کر بھی کوئی سفید جھوٹ ہو سکتا ہے کہ محمود کو ظالم اور جے پال کو مظلوم بتایا جاتا ہے اور جے پال کی یورش کو محمود کا حملہ قرار دیا گیا ہے؟ محمود نے جے پال کو قول وقرار سے کر غزنی سے ہندوستان کی طرف رواد اور خود چند مہینے بعد یعنی محرم ۳۹۳ھ میں سیستان کی طرف گیا اس نو مفتوحہ ملک میں آثار بدامنی پیدا ہوئے تھے جن کو محمود نے جاکر رفع کردیا اور وہاں سے غزنی واپس آکر دو تین سال تک غزنی میں مقیم رہا اس عرصہ میں اُس کے کیا کیا کام کئے اور کن مشاغل میں معروف رہا اُن کے بیان کرنے کی یہاں ضرورت نہیں مگر یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ ہندوستان پر حملہ کرنے کا اُس کو بھول کر بھی خیال نہ آیا حدودِ ہند کی جانب سے وہ بالکل مطمئن اور بے فکر تھا کیونکہ سلطنت پنجاب سے اُس کی صلح تھی اور برائے نام خراج جس کا وعدہ جے پال سے اُس نے لیا تھا سالانہ غزنی پہنچ رہا تھا۔

وشنومت کی ایجاد

راجہ جے پال جب غزنی سے لاہور پہنچا تو اُس نے اپنے بیٹے انند پال کو فرماں روائے پنجاب پایا۔ بیٹے نے باپ کے لئے تخت خالی کرنا چاہا مگر جے پال نے انکار کیا اور انند پال کو محمود کی مخالفت نہ کرنے اور سالانہ خراج بھیجتے رہنے کی وصیت کرکے خود اپنے مذہبی عقیدے کے موافق آگ میں جل مرا اس واقعہ کو تمام مورخین نے متفقہ طور پر اس طرح لکھا ہے کہ جے پال

ایک مذہبی عقیدے کے موافق کہ جو راجہ دو مرتبہ دشمن کے ہاتھ میں گرفتار ہو جاتے اُس کو آگ میں جل کر مرجانا چاہیے آگ میں جل کر مرا تھا۔

راجہ شیو پرشاد ستارہ ہند نے اپنی کتاب آئینہ تاریخ نما میں ایک سنسکرت زبان کا لفظ تشانل استعمال کرکے بتایا کہ تشانل پھوس کی آگ کو کہتے ہیں اور جے پال پھوس کی آگ یعنی تشانل میں جل کر مرا تھا۔ ظاہر ہے کہ جے پال کے اس طرح مرنے نے ہندوستان کے مذہبی گروہوں پر خاص اثر کیا ہوگا اور مذہبی پیشواؤں یعنی برہمنوں نے راجہ کے اس حسنِ عمل کا حال سُن کر اُس کو یقیناً ایک مذہبی شہید کا مرتبہ دیا ہوگا۔ جس کے ساتھ ہی محمود غزنوی سے نفرت و عداوت اور جے پال کے جانشین انند پال سے محبت وہمدردی کا پیدا ہونا لازمی تھا۔ ہندوستان کی آب و ہوا کے مخصوص اثر اور تمام مذکورہ واقعات کو ذہن میں رکھکر غور کرو کہ اُس زمانہ کے ہندوستان میں کس طرح سلطان محمود کے متعلق نفرت و انتقام کے جذبات مشتعل ہوئے ہوں گے۔ اور نو زائیدہ برہمنی مذہب اور پُرانے مسخ شدہ بدھ مذہب کے مناقشات کو دونوں مذہبوں کے پنڈتوں نے فراموش کرکے کس طرح اپنی تمام تر توجہ اتفاق و اتحاد اور دونوں مذہبوں کے درمیان ایک مشترکہ راہ اختیار کرکے تمام باشندگان ہند کو سلطنت غزنی کے خلاف آمادہ ہو جانے کی کوششیں کی ہوں گی۔

چنانچہ راجہ جے پال کی خودکشی کے بعد ہندوستان میں فوراً ایک ایسے مذہب کی بنیاد رکھی گئی جس میں بدھ اور برہمنی مذہب کے ماننے والے دونوں شریک کئے جاسکتے تھے۔ افسوس ہے کہ بادشاہوں اور لڑائیوں کی تاریخ لکھنے والے جب واقعات پر رائے زنی کرتے ہیں تو وہ مذہبوں اور قوموں کی تاریخ کو بالکل فراموش کر دیتے ہیں اور حقیقتِ اصلیہ کا چہرہ بے نقاب کرنے میں کما حقہٗ تلاش و جستجو سے کام نہیں لیتے سبے پال کے بار بار سلطنت غزنی پر حملہ کرنے اور تین مرتبہ شکست پانے کے بعد خودکشی کرنے اور اس کے بعد انند پال کے بھی باپ کے نقش قدم پر چلنے کا جہاں ایک طرف یہ نتیجہ ہوا کہ پنجاب کا ملک سلطنت غزنی میں شامل ہوگیا وہاں دوسری طرف اس سے بھی زیادہ اہم ایک یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ ہندوستان کے دو رقیب مذہبوں یعنی بدھ اور برہمنی مذہب کے عالموں اور پیشواؤں میں ایک زبردست صلح قائم ہوکر آیندہ کے لئے یہ مذہبی کشمکش بالکل نابود ہوگئی اور پنجاب کی بدھ

حکومت کے برباد ہونے پر بدھ مذہب کے پیرو اکثر اُس جدید مذہب میں جذب ہوگئے جو ہندوستان کے پنڈتوں نے پنجاب و غزنوی کی حکومتوں میں مذکورہ سلسلۂ جنگ قائم ہونے کے سبب تجویز کیا تھا اور جس کا نام ویشنو مت رکھا تھا۔

ویشنو پران کی تدوین

اس مذہب کے ایک الگ مستقل مذہب بننے کی صلاحیت شنکر اچارج کی تعلیمات نے مہیا کر دی تھی جو محمود غزنوی سے تھوڑے ہی دنوں پہلے برہمنی مذہب کو بہت کچھ مرتب و مدون کر چکا تھا۔ آنریبل ڈاکٹر ڈبلیو ہنٹر صاحب جنھوں نے ہندوستان کا گزیٹیر مرتب کیا ہے اپنی کتاب "تاریخ اہلِ ہند" میں ویشنو پران کا ذکر اس طرح کرتے ہیں۔

"ویشنو پران کی تاریخ تصنیف سنہ ١٠٤٥ء (مطابق سنہ ٤٣٧ھ) سے شمار کرنی چاہیے اس پران میں جیسا کہ اُس کے نام سے مترشح ہے قدیم روایتیں قلمبند ہیں جو شیوا اور بدھ کے متوں کے ساتھ ساتھ چلی آتی تھیں اس پران کے مسائل براہِ راست وید سے نہیں لیے گئے بلکہ دو مشہور نظم رزمیہ کی وساطت سے حاصل ہوئے ہیں یہ اٹھارہ پرانوں یعنی علم الٰہی کی سنسکرت کتابوں میں سے ایک ہے جس میں برہمنوں نے ویشنو اور شیو کے مخالف مذہبوں کو یکجا جمع کیا ہے۔"

ویشنو پران کے متعلق ہنٹر صاحب جیسے ہندو نواز مورخ کا بیان ذہن میں رکھ کر غور کرو کہ جے پال سنہ ٣٩٢ھ کے آخر یا سنہ ١٠٠٢ء کے شروع میں ہلاک ہوا اور اسی زمانہ میں ویشنو مت کا رنگ بنیاد رکھا گیا۔ سنہ ٤٢١ھ میں سلطان محمود کا انتقال ہوا اور سنہ ٤٣٧ھ میں ویشنو مت کی سب سے پہلی کتاب ویشنو پران لکھی گئی یعنی وہ مذہب جس کی بنیاد سنہ ٣٩٢ھ میں رکھی گئی تھی پینتالیس سال کے بعد اس قابل ہو گیا کہ اُس کے عقائد و احکام کو کتابی شکل میں مدون کیا جائے۔ ویشنو پران کی تصنیف کا حال لنگ پران کی ادھیائے چونسٹھ میں بیان ہوا ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ لنگ پران کے اس ادھیائے کو اس جگہ درج کر دیا جائے۔

"رشی لوگوں نے سوت جی سے دریافت کیا کہ بشسٹھ جی کے بیٹوں کو راکھشش نے کیوں کھا لیا۔ سوت جی نے جواب دیا کہ وشوامتر کی بد دعا

سے رُدھر نام راکھشس نے کلماکھ پاد نام راجہ کے جسم میں حلول کر کے بششٹھ جی کے سو بیٹوں کو کھا لیا۔۔۔ بششٹھ جی یہ خبر سنتے ہی غش کھا کر گر پڑے جب ہوش آیا تو اپنے خاندان کے تخم سوخت ہونے کا تصور کر کے خودکشی پر آمادہ ہو گئے مگر اُن کے ایک بیٹے شکت نامی کی بیوی ادرشینتی نے آکر کہا کہ مہاراج آپ خودکشی نہ کریں میرے رحم میں ایک لڑکا ہے جو آپ کا پوتا ہے وہ سب کام درست کر دے گا بششٹھ جی نے خودکشی کا ارادہ ترک کر دیا۔ اسی اثناء میں شکت کی بیوی کے پیٹ میں بچے نے وید کی ایک رچا پڑھی بششٹھ جی سے کہا کہ اے برخوردار بششٹھ یہ رچا تیرے پوتے نے پڑھی ہے جو ہماری برابر طاقت والا ہو گا۔ یہ کہکر وشنو بھگوان غائب ہو گئے۔ دسویں مہینے لڑکا پیدا ہوا جس کا نام پراشر رکھا گیا۔ پراشر نے ایک روز اپنی ماں سے کہا کہ میرا باپ کہاں ہے اُس کی ماں نے کہا تیرے باپ کو راکھشس نے کھا لیا ہے۔ پراشر نے کہا کہ میں راکھشسوں کو ہلاک کروں گا اور تینوں لوک کو جلا دوں گا۔ بششٹھ جی نے کہا کہ بیٹا تم راکھشسوں کا سنبانا س کرنے کیلئے تو مجاہدہ کرو مگر تینوں لوک نے تمھارا کیا بگاڑا ہے۔ دادا کا یہ کلام سُن کر پراشر سب سے رخصت ہوا اور تنہائی میں جا کر مٹی کا شیولنگ بنا کر وید منتروں کے ذریعہ شیوجی کا پوجن کرنے لگا پاربتی جی نے مہادیو جی سے پراشر کی سفارش کی چنانچہ مہادیو جی اور پاربتی جی دونوں پراشر کے سامنے آگئے اور پراشر کو غیر معمولی روحانی طاقت عطا کر کے غائب ہو گئے۔ اس کے بعد پراشر راکھشسوں کو جلانے لگا بششٹھ جی نے پوتے سے کہا کہ بیٹا تم اب غصہ کو تھوک دو راکھشس لوگوں پر رحم کرو وہ بے قصور ہیں یہ سُن کر پراشر جی نے راکھشسوں کو مارنا چھوڑ دیا۔ اسی اثناء میں پلست منی آئے بششٹھ جی نے ان کو بڑی عزت سے بٹھایا پلست منی نے پراشر جی سے کہا کہ بیٹا تم نے بششٹھ جی کے کہنے سے بڑی بھاری عداوت کو فراموش کر دیا اور ہمارے بیٹوں یعنے راکھشسوں کو مارنا چھوڑ دیا لہذا ہم تم سے بہت ہی خوش ہیں اور ہم تم کو یہ کرامت عطا کرتے ہیں کہ تم کو پوران تصنیف کرنے کی قوت حاصل ہو گی اور دیوتا تم سے بہت خوش ہوں گے اور تمھاری عقل بالکل صاف

اور روشن ہو جائے گی۔ یہ سُن کر بشسٹھ جی نے بھی کہا کہ اے پراشر جیسا پلست جی نے فرمایا ایسا ہی ہوگا۔ چنانچہ پراشر جی نے بشسٹھ جی اور پلست جی کی مہربانی اور امداد پاکر وشنو پوران تصنیف کیا جو ہر قسم کی طاقت عطا کرنے والا ہے اور وید کے ارتھ سمیت چوتھا پوران شمار کیا گیا ہے۔ اُس میں چھ ہزار اشلوک ہیں۔ ہم نے شکت کے بیٹے پراشر کا حال سُنا دیا۔ اب تم کیا سُننا چاہتے ہو بتاؤ۔ ختم شد ادھیائے چونسٹھ۔ (لنگ پوران)

وشنو پران کی تدوین کی وجہ

لنگ پوران کوئی ایسی کتاب نہیں ہے جس سے کوئی تاریخی سند لی جا سکے۔ لنگ پوران کے مذکورہ ترجمہ اور اقتباس سے صرف یہ مدعا ہے کہ وشنو پوران کی تصنیف کا سبب جو لنگ پوران نے بیان کیا ہے اُس سے نہایت صاف اور نمایاں طور پر یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ دو مخالف و معاند گروہوں میں صلح قائم ہونے کی تقریب وشنو پوران کی تصنیف کا سبب ہے بشسٹھ جی اور پلست جی دو مذہبی پیشوا ہیں جن میں ایک راکھشسوں کا بزرگ ہے اور دوسرا رشیوں کا۔ ممکن ہے کہ بشسٹھ جی برہمنی مذہب کے پنڈت ہوں اور پلست جی بدھ مذہب کے یا اس کے برعکس ہوں۔ ان میں سے ہر ایک دوسرے کو راکھشس کے نام سے یاد کرتا ہوگا۔ لیکن اب حالات ایسے پیدا ہو چکے تھے کہ دونوں مذہبوں کے پنڈتوں نے آپس کی عداوتوں کو فراموش کر دیا اور ایسا مذہب اختیار کیا جس میں دونوں متفق و متحد ہو گئے۔

وشنومت کی خصوصیت اور سب سے زیادہ قابل تذکرہ بات یہ تھی کہ اُس میں انسان کو خودکشی کرنے اور اپنی جان کو قربان کر دینے کی ترغیب دی جاتی تھی اور جو لوگ مرنے سے ڈرتے تھے اُن کی تحقیر کی گئی تھی جو دلیل اس بات کی ہے کہ جے پال کی خودکشی کے بعد ہی یہ مذہب ایجاد ہوا تھا جو درحقیقت ایک سیاسی تحریک تھی اور بدھ برہمنی مذہب کے سنگھٹن سے پیدا ہوئی تھی جس کا مقصد اصلی یہ تھا کہ تمام ملک کو لڑنے اور سلطنت غزنی کے برباد کرنے پر آمادہ کر دیا جائے۔ بعد میں جب حالات تبدیل ہو گئے اور اس تحریک کا منشائے اصلی حاصل ہونے سے مایوسی ہو گئی تو اس مذہب

کی شکل بہت کچھ تبدیل ہوگئی مگر وہ ایک مستقل مذہبی فرقہ کی حیثیت سے ہندوستان میں باقی رہا۔ اس مذہب کے عقیدۂ خودکشی کے متعلق ہنٹر صاحب لکھتے ہیں کہ

"وہ روایتیں جو جگن ناتھ کی رتھ جاترا سے عموماً منسوب کی جاتی ہیں کہ پرستار خود اپنے تئیں ہلاک کرتے ہیں محض بے بنیاد ہیں"

ہنٹر صاحب کے ان الفاظ سے کم از کم یہ تو ثابت ہے کہ اس مذہب کے متعلق اپنے آپ کو خود ہلاک کرنے کی روایتیں ضرور موجود ہیں گو آج کل وہ عمل در آمد میں نہ ہوں لیکن جگنا تھ جی کی رتھ جاترا کے چشم دید حالات جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کے زمانہ میں انگریز سیاحوں نے قلم بند کئے ہیں وہ ہنٹر صاحب کے بیان کی تردید کرتے ہیں اور اس میں ذرا بھی شک وشبہ نہیں کہ جگن ناتھ جی کی سواری کے رتھ کے نیچے اپنے آپ کو کچلوا کر ہلاک کرنا موکش حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ سمجھا جاتا تھا اور یہ رسم ماضی قریب تک جاری تھی اور انگریزوں کے صوبہ اڑیسہ پر قابض ہونے کے بعد تک بھی لوگ اپنے آپ کو خود ہلاک کرتے تھے۔ اور میں نے خود سیاحوں کی وہ تفصیلی رپورٹیں پڑھی ہیں۔ جن میں پرستاروں کے اس طرح خود ہلاک ہونے کی نہایت مفصل کیفیت درج تھی۔ افسوس کہ اس وقت وہ رسالے باوجود تلاش دستیاب نہ ہوسکے۔

ریاست ملتان اور ریاست بھاطنہ پر محمودی حملہ

انند پال نے ایک طرف تو جےپال کا تسلیم کردہ خراج روانہ کرکے محمود کو مطمئن رکھا اور دوسری طرف باپ کی بے عزتی کا انتقام لینے کی آرزو میں ہندوستان کے دوسرے راجاؤں، برہمنوں اور پنڈتوں سے خواہانِ امداد اعانت رہا۔ ملتان کی ریاست کا ذکر اوپر آچکا ہے کہ رئیس ملتان نے امیر سبکتگین کو اپنی دوستی و ہمدردی کا یقین دلا کر اطمینان حاصل کیا تھا وہ سبکتگین کی وجہ سے اپنے قرمطی ہونے کو چھپاتا تھا تاہم ملتان میں قرامطہ کو پناہ ملتی رہتی تھی۔ محمود جو قرامطہ کا دشمن اور ان کو بدمعاشوں اور زناکاروں کی جماعت یقین کرتا تھا۔ جب سیستان سے ان کو خارج کرچکا تو اس کے پاس اطلاع پہنچی کہ قرامطہ نے بحرین سے ایک مہم بذریعہ جہازات بندرگاہ دیبل اور ٹھٹھہ میں بھیجی ہے۔ ان قرامطہ نے سندھ میں وارد ہو کر سندھ کے راجاؤں سے محمود کے خلاف معاہدے اور ہر قسم کی امداد پہنچانے کے وعدے کئے جس کا نتیجہ یہ

ہوا کہ انند پال کی حمایت پر اس طرف کے تمام راجہ آمادہ ہو گئے اور حمید خاں لودی کا پوتا یا نواسا داؤد بن نصر والی ملتان بھی قرامطہ اور انند پال کے معاہدوں میں شریک ہو کر قرامطہ کیلئے ملجا و ماوہ بنگیا۔ ملتان کی ریاست کے متصل کوئی ہندو ریاست تھی اسکا نام بھاطنہ۔ بھٹنیر۔ بھٹنڈا۔ ویہند۔ بھیرہ وغیرہ بتایا جاتا ہے جس طرح اس ریاست کا نام ہر مورخ جُدا جُدا بیان کرتا ہے اسی طرح اُس کے محلِ وقوع میں بھی اختلاف ہے۔ کوئی اس ریاست کو پشاور کے شمال میں بتاتا ہے کوئی اس کو ٹھٹھہ یا کراچی کا دوسرا نام سمجھتا ہے کسی نے اس کو موجودہ ریاست پٹیالہ کا مقام بھٹنڈا سمجھا ہے کوئی اس کو متھرا اور قنوج کے قریب بیان کرتا اور کوئی اس کو راجپوتانہ میں جگہ دیتا ہے۔ غالباً نام کے اختلاف نے محلِ وقوع میں بھی اختلاف پیدا کر دیا ہے مگر واقعات کی تفصیل سے کم از کم اس ریاست کی حدود ریاست ملتان کی حدود سے ملتی تھیں اور غالباً اس کا محلِ وقوع ملتان سے جنوب و مغرب اور دریائے سندھ و بلوچستان و ریاست مکران کے درمیان تھا۔

بجے رائے سے جنگ

ایک قرینہ یہ بھی موجود ہے کہ یہ ریاست ملتان کے جنوب اور دریائے سندھ کے مشرقی جانب تھی۔ یہ ریاست یقیناً ریاست منصورہ کی بربادی کے بعد قائم ہوئی تھی۔ اس ریاست کے فرماں روا کا نام بجے رائے تھا۔ ۳۹۵ھ میں محمود کو معلوم ہوا کہ بجے رائے کی ریاست میں قرامطہ کا اجتماع ہو رہا ہے۔ محمود کے بارہ یا سترہ حملوں کی شہرت نے ہندوستانیوں کو محمود کے دوسرے حالات اور واقعات سے بالکل ناواقف و بے خبر رکھا ہے اور اسی لئے وہ اندازہ نہیں کر سکتے کہ محمود اپنا سب سے بڑا دشمن قرامطہ ہی کو سمجھتا اور اپنی تمام ہمت اسی گروہ کے استیصال میں صرف کرنا چاہتا تھا۔ قرامطہ اس سے پہلے سنگِ اسود کو خانہ کعبہ سے اکھیڑ کر بحرین لے آئے تھے انھوں نے ہزارہا بلکہ لکھوکھا حاجیوں کو قتل کیا تھا۔ انھوں نے خلافت بغداد کی بڑی بے عزتی کی تھی اور بڑی بڑی تباہیوں اور نالائقیوں کے مرتکب ہوئے تھے۔ قرامطہ کے استیصال میں کوشاں رہکر محمود اپنے آپ کو خلیفۂ بغداد کی نگاہ میں بھی محبوب بنا سکتا تھا جس کی اس کو بڑی آرزو تھی۔ نیز اُس کو اپنی سلطنت و حکومت کے محفوظ رکھنے کے لئے بھی قرامطہ کے استیصال کرنے کی سخت ضرورت تھی۔ قرامطہ کے لئے سندھ و بلوچستان اور سلسلہ کوہ سلیمان کے

رہنے والے قبائل میں اثر و نفوذ کی سب سے زیادہ گنجائش تھی آج تک بھی اس کے اثرات و شواہد موجود ہیں سلسلہ کوہ سلیمان کے قبائل میں بکثرت ایسے قبائل اب بھی موجود ہیں جو قرامطہ کے اعمال و عقائد کا بہت سا حصہ اپنے اندر موجود رکھتے ہیں۔ اسی مذکورہ علاقہ میں ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی اب بھی آباد ہے جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو خدا سے بڑا یا خدا کی برابر ہی مانتے اور کسی رسول کی کوئی تکریم ضروری نہیں جانتے ہیں۔ نماز روزہ سے بالکل نابلد اور ارکان اسلام کی بجا آوری سے قطعاً بے تعلق ہیں یہ تمام لوگ اسی زمانہ کی یادگار اور قرامطہ کی باقیات طائحات ہیں۔ غلطی سے لوگ اُن کو شیعہ سمجھتے ہیں۔ حالانکہ شیعہ حضرات ان کے نام سے بیزار اُن کی صورت پر لعنت بھیجتے ہیں میں نے خود ایک شیعہ عالم کو ان بلوچی اور سرحدی لوگوں کی نسبت جن کو عام لوگ شیعہ خیال کرتے ہیں نہایت بُرائی اور بیزاری کے کلمات کہتے ہوئے سُنا ہے۔ محمود کو قرامطہ سے کس قدر نفرت تھی اس کا اندازہ اس طرح بھی ہو سکتا ہے کہ ۳۰۳ھ میں فرماں روائے مصر کی جانب سے جو قرامطہ کو مشرق میں خلیفۂ بغداد کے خلاف اپنا آلہ کار بنانے میں مصروف تھا ایک سفیر دوستی و محبت کا پیغام لے کر محمود کے پاس غزنی میں آیا۔ محمود کا فرض تھا کہ وہ اس سفارت کا عزت کے ساتھ استقبال کرے اور مصر کی طاقتور عبیدی سلطنت کے اس سفیر کو اپنا مہمان عزیز سمجھے مگر چونکہ یہ سفیر قرمطی عقیدے کا آدمی تھا لہٰذا محمود نے حکم دیا کہ سفیر کو نہایت ذلت کے ساتھ شہر میں تشہیر کر کے نکال دیا جائے اور زیر حراست رکھکر حدود سلطنت سے باہر کیا جائے۔ غرض ۳۹۵ھ میں محمود نے بجے رائے کے پاس پیغام بھیجا کہ تم ہمارے دشمنوں یعنی قرامطہ کو اپنے یہاں جگہ نہ دو ورنہ ہمارے تمہارے درمیان حالتِ جنگ قائم ہو جائے گی۔ بجے رائے نے اس پیغام کا جواب سختی کے ساتھ انکار میں دیا۔ محمود فوراً بجے رائے کی ریاست پر حملہ آور ہوا بجے رائے نے جو پہلے سے آمادہ تھا خوب ڈٹ کر مقابلہ کیا تین دن تک برابر لڑائی ہوتی رہی آخر راجہ میدان چھوڑ کر محمود کے مقابلہ سے بھاگا اور بھاگتے ہوئے محمودی بہادروں کے ہاتھ میں گرفتار ہو جانے کے بعد خودکشی کر کے مرگیا۔ اُس کی فوج میں جس قدر قرامطہ تھے اُن میں سے کچھ تو مارے گئے جو باقی بچے وہ فرار ہو کر ملتان پہنچے۔ بجے رائے

کو شاید کوئی شخص قومی شہید اور مستحق تکریم سمجھے لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ ایک ہندو ہی کے الفاظ نقل کر دیئے جائیں جو اُس نے بجے رائے کی نسبت استعمال کئے ہیں۔ سجان رائے اپنی کتاب خلاصۃ التواریخ میں لکھتا ہے۔

"سلطان درحوالی تھتہ رسید راجہ بجے رائے باوجود کثرت لشکر و نیلان کوہ پیکر و متانت قلعہ و صعوبتِ جائے از روئے بے ہمتی و بے تدبیری لشکر خود را بمقابلہ سلطان گذاشتہ بجانب سندھ رواں شد لشکریان سلطان باستماع ایں خبر تعاقب کردہ و او را دستگیر نمودہ راجہ بے حمیت را سر دارے گلو گرفتہ بخنجر آسا برخاکِ ہلاک انداخت۔"

فرشتہ نے اس لڑائی کا حال نہایت تفصیل سے لکھا ہے اور وہ بجے رائے کو بے حمیت کا خطاب نہیں دیتا بلکہ اُس کی بہادری و شجاعت کا اقرار کرتا اور بعد گرفتاری اپنے ہاتھ سے اپنے سینے میں خنجر مار کر ہلاک ہونا بیان کرتا ہے۔ محمود غزنوی کو اس لڑائی کے بعد معلوم ہوا کہ تمام قرامطہ ملتان میں جا جا کر فراہم ہوئے ہیں۔ ملتان کا حاکم داؤد بن نصر اب تک اپنے آپ کو محمود کا مطیع و منقاد ظاہر کرتا رہا تھا۔ لیکن اب محمود کو معلوم ہوا کہ داؤد لودی قرمطی ہو گیا ہے اور اُس نے اب تک ہم کو دھوکے ہی میں رکھا بجے رائے کی شکست و ہلاکت کے بعد ملتان پر حملہ کرنا اور داؤد کو سزا دینا بہت آسان تھا مگر چونکہ محمود کو قرامطہ کا استیصال منظور تھا لہٰذا وہ ملتان پر اس طرح اچانک پہنچنا چاہتا تھا کہ قرامطہ بچ کر نہ نکل سکیں۔ پس وہ ملتان اور اُس کے حاکم داؤد کی طرف متوجہ ہوئے بغیر سیدھا غزنی کو واپس چلا گیا۔

ملتان پر حملہ

اگلے سال ۳۹۶ھ میں محمود نے ملتان پر اس طرح حملہ کرنا چاہا کہ داؤد بن نصر یا قرامطہ کو پہلے سے اس حملہ کی مطلق اطلاع نہ ہو سکے۔ اس جگہ یہ بھی بیان کر دینا ضروری ہے کہ پشاور سے محمود جس وقت جے پال کو گرفتار کر کے غزنی لے گیا تھا تو جے پال کے ساتھ پندرہ سردار اور بھی گرفتار ہوئے تھے ان میں ایک جے پال کا نواسہ سکھپال بھی تھا جس وقت محمود نے جے پال کو غزنی سے رخصت کیا تو سکھپال نے محمود کے ایک سردار ابو علی سجوری کے ہاتھ پر اسلام قبول کر کے غزنی ہی میں سکونت اختیار کر لی۔ اس نو مسلم سکھپال کو مورخین نے عام طور پر نواسہ شاہ کے نام سے یاد

کیا ہے یہ نام اُس کا غالبًا اسلام قبول کرنے کے بعد مشہور ہوا ہوگا۔ بجے رائے کی مذکورہ مہم میں سکھ پال یا نواسہ شاہ محمود کے ہمراہ تھا محمود نے سکھ پال کو بجے رائے کی ریاست کا فرماں روا بنا کر غزنی کی طرف مراجعت کی۔ محمود درۂ گومل کی راہ سے آیا اور اسی راستہ سے واپس گیا تھا۔ غزنی پہنچ کر اُس نے ملتان پر حملہ کرنے کے لئے درۂ خیبر کی راہ اختیار کی جس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ برسات کی وجہ سے دریائے سندھ کو جنوبی گھاٹوں سے عبور کرنا دشوار تھا۔ سجان رائے نے اس طویل اور پیچیدہ راہ اختیار کرنے کی وجہ وہی لکھی ہے جو اوپر ذکر ہو چکی ہے چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ

"سلطان راحمیت دین برآں داشت کہ براہ ملتان متوجہ شدہ آں ملک را از داؤد بن نصر انتزاع نماید دریں صورت بعزیمت ملتان راہ راست از دست دادہ براہ مخالف بنا برآنکہ حاکم آنجا خبردار نشود و ناگہاں برسر او برسد سواری کرد راجہ انند پال بن راجہ جے پال کہ برسر راہ بود در مقام مخالفت شد"

فرشتہ نے بھی زین الاخبار کے حوالہ سے یہی وجہ بیان کی ہے جو سجان رائے نے لکھی ہے۔ چنانچہ فرشتہ لکھتا ہے کہ

"دراں زماں کہ لشکر اسلام بمحاصرۂ بلدۂ بھاطنہ اشتغال داشت از داؤد بن نصر اداہائے خارج از عقل سرزدہ مصدر اعمال ناشایستہ شد سلطان محمود دراں سال بنا بر صلاح وقت اغماض عین نمودہ ہیچ نگفت در سال دیگر عازم انتقام گردیدہ بروایت زین الاخبار از ملاحظہ آنکہ او واقف نشود براہِ مخالف رواں شد۔ انند پال بن جے پال کہ بر سر راہ بود در مقام ممانعت شد و شکست خوردہ جانب کشمیر گریخت"

غرض کوئی بھی وجہ ہو محمود نے درۂ خیبر کی راہ سے پنجاب میں ہو کر یعنی انند پال کے علاقہ میں سے گذر کر ملتان پر حملہ کرنا چاہا۔ انند پال محمود غزنوی کا باج گذار تھا لہذا محمود پنجاب کے علاقے کو اپنے ایک ماتحت اور باج گذار دوست کا ملک سمجھ کر گذرنا چاہتا تھا اُس کی یہ خواہش ضرورتًا یا مجبورًا تھی۔ اُس کو اس امر کا وہم و گمان بھی نہ تھا کہ انند پال میرا مقابلہ کرے گا مگر خلاف توقع انند پال نے اُس کو دریائے سندھ کے کنارے روکا اوپر بیان ہو چکا ہے کہ محمود اور سلطنت غزنی کے خلاف ہندوستان میں ایک عام

تحریک شروع ہو چکی تھی اور ملک کے ہر حصہ میں مذہبی پیشواؤں کے زیر اہتمام تبلیغی کام زور شور سے جاری تھا۔ قرامطہ ہندوؤں کی ہمدردی حاصل کر چکے تھے اُنھوں نے مصلحت وقت سمجھ کر حضرت علی کو وشنو کا دسواں اوتار بتا کر اپنے آپ کو اس سنگٹھن میں شامل کر لیا تھا۔ انہی قرامطہ کو جب مسلمانوں کے خلاف عیسائیوں کو شامل کرنے کی ضرورت شام والیشیائے کوچک میں پیش آئی تو اُنھوں نے حضرت علیؓ کو فارقلیط کا مظہر بیان کیا۔ ٹی ڈبلیو ارنلڈ اپنی کتاب پریچنگ آف اسلام میں اُن لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"یہ لوگ جب ہندوستان میں اپنے مذہب کی اشاعت کے لئے آئے تو اُنھوں نے اُس کی صورت ایسی بنادی کہ ہندو اُس کو فوراً تسلیم کریں۔ حضرت علیؓ کو وشنو کا دسواں اوتار بتایا جو مشرق سے آئے گا اور ایک مہدی پوران لکھا اور دعا ماچاریوں کے انداز پر بھجن لکھے جن میں راز اور معموں کی باتیں اس انداز سے بیان کیں کہ ہندوؤں کو ان کا مسلک اختیار کرنے کی ترغیب ہوئی۔"

دوسری جگہ اسی مصنف نے لکھا ہے کہ ان لوگوں نے وشنو کے باقی نو اوتاروں کی صداقت کو تسلیم کر لیا تھا ہندوستان میں ان دنوں مذہبی عقائد کی جو نازک حالت تھی اُس کا اندازہ گذشتہ صفحات کے مطالعہ سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ نئے نئے فرقے بن رہے تھے۔ نئی نئی قومیں تیار کی گئی تھیں نئی نئی تحریکیں جاری تھیں اسی طوفان بے تمیزی میں قرامطہ بھی آکر شامل ہو گئے جو مذہبی رنگ میں بھی ہندوؤں کے دوست بن سکے اور سیاسی اعتبار سے بھی وہ ہندوؤں کے معین ومددگار ہوئے کیونکہ ہندوستان والوں کو محمود سے جو عداوت تھی اُس سے بدرجہا زیادہ قرامطہ اُس کے دشمن تھے۔ انندپال شاید ابھی محمود سے لڑنے کو تیار نہ تھا۔ لیکن جب محمود نے اُس کو اطلاع دی کہ ہم تمہارے علاقے میں سفر کرتے ہوئے گذر جائیں گے ہمارا مقصودِ سفر ملتان پر حملہ آور ہونا ہے تو انندپال نے اپنا فرض سمجھا کہ وہ داؤد بن نصر کو جو انندپال کا حلیف اور قرمطی مسلک اختیار کر کے دائرۂ اسلام سے خارج ہو چکا تھا اس طرح ہلاک ہونے اور اپنے سنگٹھن کو نقصان پہنچنے سے بچالے۔ اُس نے فوراً دریائے سندھ کے کنارے محمود کو روکنے کے لئے فوج روانہ کی اُدھر داؤد بن نصر کو آنے والے خطرے سے

اطلاع دی اور خود بھی پشاور کی طرف روانہ ہوا۔ محمود کو جب یہ حالات معلوم ہوئے تو اُس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جس طرح حاکم ملتان اُس کا باج گذار تھا اسی طرح انند پال بھی اُس کا خراج گذار تھا۔ اُس نے مجبوراً انند پال کی فوج کا مقابلہ کیا یہ خلاف توقع لڑائی محمود کو سخت ناگوار و ناپسند تھی وہ انند پال سے ہرگز لڑنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ وہ غزنی سے ملتان کا ارادہ کرکے روانہ ہوا تھا۔ انند پال کی فوجیں محمود کو دریائے سندھ پر نہ روک سکیں اور شکست کھا کر بھاگ گئیں انند پال بھی جلد مقابلے پر پہنچ گیا اور فراریوں کو سمیٹ کر خود حملہ آور ہوا اُس کی قسمت میں بھی شکست ہی لکھی تھی چنانچہ بھاگا اور لاہور آکر دم لیا۔ محمود نے دوآبہ سندساگر کو طے کرکے دریائے جہلم کو عبور کیا اور دوآبہ چج کو بھی بلا روک ٹوک طے کرکے دریائے چناب پر آپہنچا۔ یہ سُن کر کہ محمود نے دریائے چناب کو عبور کرلیا ہے انند پال لاہور چھوڑ کر کشمیر کی طرف بھاگا۔ کیونکہ اس سراسیمگی اور عجلت میں وہ نہ دوسرے راجاؤں سے امداد طلب کرسکا نہ محمود کے مقابل ٹھہر سکا۔ محمود یہ سُن کر کہ انند پال لاہور چھوڑ کر کشمیر کی طرف روانہ ہوگیا ہے اُس کے دارالسلطنت لاہور میں نہیں آیا بلکہ انند پال کے تعاقب میں خود بھی دریائے چناب کے کنارے کنارے کشمیر کی طرف روانہ ہوا۔ یہ سُن کر کہ انند پال پہاڑوں کے دروں میں داخل ہوگیا ہے محمود واپس ہوکر سیدھا ملتان کی جانب روانہ ہوا۔ کیونکہ وہی اُس کا مقصودِ سفر تھا۔ اگر محمود کو لوٹ مار کرنے۔ ہندوؤں کو زبردستی مسلمان بنانے اور مندروں کے ڈھانے کا شوق ہوتا تو وہ لاہور کو لوٹے بغیر ہرگز نہ چھوڑتا۔ پنجاب کا تمام ملک اُس کے لئے بلا کسی مزاحمت کرنے والے حاکم کے بے خطر شکارگاہ تھا۔ وہ اس سرسبز و شاداب ملک کو اپنی سلطنت میں شامل کرکے یہاں اپنی فوج اور اپنا نائب مقرر کرسکتا تھا۔ وہ ملتان کی مہم کو ملتوی کرکے پنجاب ہی کے بندوبست میں مصروف ہوجاتا اور ایک ریگستانی ریاست پر حملہ کرنے کو زیادہ ضروری نہ سمجھتا مگر اُس نے نہ پنجاب کو لوٹا۔ نہ یہاں کے لوگوں کو مسلمان بنایا نہ یہاں کے مندروں کو ڈھایا نہ اور کسی قسم کا نقصان پہنچایا بلکہ سیدھا ملتان کی طرف روانہ ہوگیا جو دلیل اس بات کی ہے کہ وہ قرامطہ کے امن سوز اور فساد انگیز گروہ کو سزا دینا اور اُن کی بیخ کنی کرنا سب سے زیادہ ضروری کام سمجھتا تھا۔ داؤد بن نصر کو انند پال کے ذریعہ پہلے ہی اطلاع ہوچکی تھی اور وہ اپنی فوجیں

انندپال کی مدد کے لئے روانہ کرنے والا تھا کہ انندپال کے شکست کھاکر کشمیر کی طرف بھاگ گئے کی خبر پہنچی اس خبر سے داؤد کی ہمت پست ہوگئی اور وہ اپنا خزانہ اور قیمتی اسباب اونٹوں پر لادکر دکن کی جانب فرار ہونے کی تیاری کرنے لگا وہ ابھی سامان سفر ہی میں مصروف تھا کہ آندھی اور بگولے کی طرح محمودی فوج ملتان کے سامنے نمودار ہوئی۔ داؤد نے محصور ہوکر مقابلہ کی تیاری کی تاریخ فرشتہ اور تاریخ نظامی دونوں نے لکھا ہے کہ محمود نے دریائے چناب کے کنارے پہنچ کر انندپال کے کشمیر کی جانب بھاگ جانے کا حال سُن کر اس کا تعاقب نہیں کیا بلکہ ملتان کی جانب روانہ ہوگیا۔ فرشتہ کے الفاظ یہ ہیں۔

"انند پال ہراساں شدہ بکوہ ہائے کشمیر گریخت و سلطان و نبالش نہ کردہ براہ بتہندہ جانب ملتان کہ غرضِ اصلی او ازاں یورش تسخیر آں بود رواں شد۔"

اسی کے قریب نظام الدین احمد ہروی کے الفاظ ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ محمود نے انندپال کی اس گستاخی کی سزا دینی اس قدر ضروری نہیں سمجھی جس قدر کہ وہ داؤد بن نصر کو سزا دینا ضروری سمجھتا تھا اور اسی سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ محمود ہندوؤں کا زیادہ دشمن تھا یا قرامطہ کا۔ محمود نے ملتان کا محاصرہ کرلیا سات روز تک محاصرہ جاری رہا آخر محمود کی خدمت میں داؤد نے عاجزانہ التجا کی کہ میں مذہب قرامطہ سے توبہ کرتا اور سچے دل سے مسلمان ہوتا ہوں۔ ساتھ ہی اس بات کا اقرار کیا کہ آئندہ قرامطہ سے کوئی تعلق نہ رکھوں گا اور بیس ہزار درہم سالانہ خراج دارالسلطنت غزنی کو روانہ کرتا رہوں گا۔

محمود کے ملتان کی جانب آنے کا حال سُن کر ۳۹۶ھ میں ایلک خاں حاکم ماوراءالنہر نے اپنے سپہ سالار سیاوشتگین کو فوج دے کر خراسان پر حملہ کرنے کے لئے بھیج دیا اور دوسرے سردار جعفر تگین (چغر تگین) کو بلخ پر قبضہ کرنے کا حکم دیا تھا جعفر تگین نے بلخ پر قبضہ کرلیا اور سیاوش تگین نے خراسان میں لوٹ مار مچا دی۔ یہ حال دیکھ کر اور تاب مقابلہ نہ لاکر محمود کے عامل ارسلان جاذب نے جو ہرات میں مقیم تھا ایک تیز رفتار

قاصد ملتان کی جانب محمود کے پاس روانہ کیا اور ہرات میں تاب مقاومت نہ لاکر غزنی کی جانب چلا آیا۔ ارسلان جاذب کا یہ قاصد محمود کے پاس اُس وقت پہنچا جب کہ وہ ملتان کے محاصرہ میں مصروف تھا۔ لہٰذا محمود نے داؤد کی توبہ کو غنیمت سمجھ کر اُس کی التجا قبول کرلی اور سکھ پال (نواسہ شاہ) کو جو ریاست ملتان کی متصلہ ریاست کی حکومت پر مامور تھا داؤد بن نصر کے افعال و حرکات کا نگراں مقرر کرکے اور داؤ سے سکھ پال کے احکام کی تعمیل کا اقرار لے کر یعنی سکھ پال کو اپنا قائم مقام بنا کر غزنی کی جانب روانہ ہوگیا واپسی میں کوہ سلیمان کے کسی جنوبی درے سے گذرا اور انند پال کے ملک کی طرف قطعاً متوجہ نہیں ہوا۔ غزنی پہنچ کر اور ارسلان جاذب سے تمام حالات سُن کر ایک زبردست لشکر مرتب کیا اور اُن ہاتھیوں کو بھی ہمراہ لیا جو اُس نے بجے رائے کی جنگ میں بطور مال غنیمت حاصل کئے تھے۔ ایلک خاں نے چین کے حاکم قدر خاں کو بھی اپنا شریک کار بنا لیا تھا اور خود مع قدر خاں کے ایک جرار اور بے شمار فوج لے کر بلخ کے قریب پہنچ گیا تھا۔ محمود نے ارسلان جاذب کو ایک حصہ فوج دے کر سیاوش تگین کے مقابل خراسان کی جانب بھیجا اور خود بلخ کی طرف متوجہ ہوا۔ ایلک خاں اور قدر خاں نے سخت مقابلہ کے بعد شکست کھائی اور محمود نے دریائے جیحون کے کنارے تک اُن کا تعاقب کیا۔ اس لڑائی میں ہاتھی بہت کارآمد ثابت ہوئے اور اُسی روز سے محمود ہاتھیوں کو جنگ کے لئے نہایت ضروری چیز سمجھنے لگا۔ سیاوش تگین کو بھی ارسلان جاذب نے خراسان سے بھگا دیا۔

محمود اس مہم میں ایک سال سے زیادہ مصروف رہا اور ماہ ربیع الاول ۳۹۸ھ میں غزنی واپس آیا یہاں پہنچ کر سنا کہ سکھ پال جس کو وہ ہندوستان میں اپنا قائم مقام اور ریاست ملتان کا نگراں مقرر کر آیا تھا اپنے ماموں انند پال کی ترغیب و سازش سے مرتد ہوکر باغی ہوگیا ہے اور بجائے اُس کے کہ داؤد بن نصر کے پاس قرامطہ کو جمع نہ ہونے دے اور اُس کے اوضاع و اطوار کا نگراں رہے خود قرامطہ کو اپنے گرد فراہم کر رہا ہے یہ سنتے ہی وہ غزنی سے روانہ ہوکر سکھ پال کے سر پر اس طرح یکایک پہنچا کہ وہ کچھ بھی ہاتھ پاؤں نہ ہلا سکا چنانچہ اُس کو گرفتار کرکے غزنی لے گیا اور وہاں نظر بند کر دیا۔

ہندوؤں کا سلطنت غزنی پر چوتھا حملہ

انند پال جو پہلے سلطان محمود کا خراج گذار اور حملہ ملتان کے وقت سے باغی ہوکر

علانیہ برسر مخالفت تھا مستحق سزا ٹھہر چکا تھا لیکن چونکہ محمود کو ترکستان۔ خراسان اور آذر بائیجان کی طرف سے خطرات درپیش تھے اور وہ انند پال کے مقابلہ میں شمالی و مغربی حریفوں کو زیادہ سخت اور اہم سمجھتا تھا لہٰذا اُس نے انند پال کے متعلق جو اس سے پہلے فرار کی عار گوارا کرچکا تھا چشم پوشی و درگذر ہی مناسب سمجھی مگر ہندوستان میں مذہبی پیشواؤں اور پنڈتوں نے جو تحریک شروع کی تھی وہ محمود کی مذکورہ لڑائیوں کے سبب اس طرح مشتعل اور ترقی پذیر رہی جیسے آگ ہوا کے جھونکوں سے مشتعل ہوا کرتی ہے انند پال اپنی گذشتہ گستاخیوں اور سرکشیوں کی وجہ سے بخوبی جانتا تھا کہ محمود غزنوی ضرور مجھ سے انتقام لینے کے لئے پنجاب پر حملہ آور ہوگا۔ اُس کے پاس متھرا۔ قنوج اور سندھ و گجرات کی طرف سے برابر ہمت افزا خبریں پہنچ رہی تھیں چنانچہ اُس نے اب زیادہ تامل مناسب نہ سمجھ کر ہندوستان بھر کے تمام راجاؤں کے پاس قاصد اور خطوط بھیجے اور لکھا کہ اب وقت آگیا ہے کہ ہم سب اپنے ملک کی حفاظت اور محمود غزنوی کی ہلاکت کے لئے متفقہ طور پر میدان میں نکل آئیں اور اس امر اہم کو اختتام تک پہنچائیں چنانچہ ان خطوط اور سفیروں کو ہر جگہ بہت بڑی کامیابی ہوئی۔ کوہ بالناتھ پر نندونہ یا نندنہ نام ایک شہر تھا۔ وہاں کا راجہ ندر بھیم اور بروایت سجان رائے نرد جیپال نامی تھا جو انند پال کا باج گذار اور ہوا خواہ تھا اُس نے سب سے پہلے اپنی فوج انند پال کے پاس بھیجی۔ ملک گجرات کا دارالسلطنت انہلواڑہ تھا وہاں کے راجہ کا نام پرم دیو تھا اُس نے بھی ایک زبردست فوج لاہور کی جانب روانہ کردی۔ بھٹنڈہ کے راجہ کا نام بھی پرم دیو تھا اُس نے بھی فوج بھیج دی۔ دہلی

کے راجہ ہردت اور جیاپن

پال کے پاس روانہ کیا۔

کا راجہ چندر رائے۔ سرسوا

گڈھ کا راجہ بھیم پال بھی اپنی اپنی فوجوں اور خزانوں کے ساتھ انند پال کی امداد کے لئے مستعد ہوگئے۔ قنوج کے راجہ کنور رائے اور کالنجر کے راجہ نندا نے بھی زبردست اور باساز و سامان فوجیں روانہ کیں۔ سجان رائے نے قنوج کے راجہ کنور رائے کا نام اپنی تاریخ میں کورہ لکھا ہے جو غالباً کنور رائے کی تصغیر ہے۔ اسی طرح اُجین۔ گوالیار۔ اجمیر۔ دہلی۔ تھانیسر۔ نگر کوٹ اور کشمیر کے راجاؤں نے بھی اپنی اپنی فوجیں لاہور کی طرف

روانہ کردیں۔ مالوہ کے راجہ بھوج اور ہیرٹھ کے راجہ دھرم دت نے بھی امداد دی روپیہ اور فوجیں روانہ کیں۔

ان بیس پچیس راجاؤں کے نام جو اوپر درج ہوئے مختلف تاریخوں سے نقل کئے گئے ہیں کسی تاریخ میں چند راجاؤں کے نام ہیں اور چند کے نہیں دوسری تاریخ میں دوسرے چند راجاؤں کے نام ہیں اور ان میں سے بعض کے نہیں۔ ہر ایک مورخ تھوڑے سے نام لکھتا اور آخر میں یہ مزید لکھتا ہے کہ ہندوستان کے تمام راجہ شریک تھے۔ جو جو نام تاریخوں میں بیان ہو گئے ہیں میں نے وہ سب اوپر درج کر دیئے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی اور راجہ ضرور شریک ہوں گے اور یہ تعداد صرف بیس پچیس ہی تک محدود نہ ہوگی۔ تاہم اگر انھیں پر حصر کر لیا جائے تو گجرات سے بہار تک اور کشمیر سے قنوج تک کے تمام راجہ ضرور شامل ہیں اس قدر راجاؤں کا ایک آواز پر متفقہ لبیک کہنا۔ فوج اور روپیہ روانہ کرنا اور بعض بعض کا خود بھی فوج کے ساتھ روانہ ہو کر لاہور پہنچنا اور انند پال کی سپہ سالاری میں دادِ شجاعت دینا کوئی اتفاقی اور فوری واقعہ نہیں ہو سکتا۔ اس زمانے میں نہ ریل و تار برقی تھی نہ ڈاک کا انتظام تھا نہ اخبارات تھے۔ اس کام کو سرانجام دینے اور تمام برِاعظم ہند کو جنگ پر آمادہ کر دینے کے لئے ضرور کافی وقت اور زبردست کوشش صرف کرنی پڑی ہوگی سلطنتوں اور بادشاہوں کی رقابتیں ہر زمانے اور ہر ملک و قوم میں یقیناً رہی ہیں۔ غزنی کی سلطنت پر حملہ کرنے اور محمود غزنوی کو نیچا دکھانے کے لئے ان تمام رقابتوں کا فراموش ہو جانا اور کالنجر و بندیلکھنڈ اور گجرات تک کی فوجوں کا متحد ہو کر پشاور کے میدان میں پہنچنا ہرگز ہرگز معمولی واقعہ اور ایک اتفاقی حادثہ قرار نہیں دیا جا سکتا اس سے پیشتر جے پال اس سنگٹھن کی بنیاد رکھ چکا تھا اس کے بعد وہ خودکشی کر کے قومی شہید کا مرتبہ بھی حاصل کر چکا تھا جس سے ہندوستان بھر میں ایک انقلاب پیدا ہوا اور مذہبی واعظوں نے سیاسی خدمات انجام دینے کے لئے اپنے مذہبی جھگڑوں کو اتحاد و اتفاق کے سانچے میں ڈھال کر تمام ہندوستان کو اپنے دیا کھیانوں اور دھواں دھار تقریروں سے مشتعل بنا دیا تھا یہ کام کسی ایک یا چند راجاؤں کے بس کا نہ تھا۔ ہندوستان اور تمام ایشیائی ملکوں میں اس قسم کے کام ہمیشہ مذہبی پیشواؤں ہی نے انجام دیئے ہیں۔ گوتم بدھ نے منو کے قوانین اور قدیم برہمنی مذہب کی حکومت کو پارہ پارہ کر کے اس کی دھجیاں ہوا میں اڑا دیں اور چند

روز کے بعد بدھ مذہب کی شہنشاہی ہندوستان میں قائم ہوگئی۔ راجپوتوں کی قوم کے بنانے اور بدھوں کی حکومت کے مٹانے کی کوشش بھی مذہبی پیشواؤں یعنی پنڈتوں ہی نے شروع کی تھی اور اس کام میں اُن کو کامیابی حاصل ہو رہی تھی۔ جے پال کی پیہم شکستوں اور پھر خودکشی نے اس جدید برہمنی مذہب کے پنڈتوں اور بدھ مذہب کے پیشواؤں کو بڑی آسانی سے اس مسلم کُش تحریک کے لئے متحد و متفق کر دیا اور ان مذہبی پیشواؤں کے اتفاق نے تمام راجاؤں ہی کو متفق نہیں بنایا بلکہ عام رعایا میں بھی مذہبی رنگ کا جوش اور قتل و خوں ریزی کے شوق کا خروش پیدا کر دیا۔ یہ بات محض تخیل اور مضمون آفرینی پر مبنی نہ سمجھنی چاہیئے۔ بلکہ اس کے لئے ناقابل تردید ثبوت اور زبردست شہادتیں موجود ہیں۔ شاید کسی تاریخی مسئلہ میں مورخین کا اس قدر عظیم الشان اتفاق موجود نہیں جس قدر اس مسئلہ میں ہے کہ اس لڑائی میں امداد پہنچانے کے لئے ماؤں نے اپنے بیٹوں کو اور بیبیوں نے اپنے شوہروں کو لڑائی میں جانے اور مارنے مرنے کی ترغیب دی۔ خوش حال اور امیر گھروں کی عورتوں نے اپنے سونے چاندی کے زیور اُتار کر مصارفِ جنگ کے لئے پیش کر دیئے۔ غریب عورتوں اور بیواؤں نے سوت کات کات کر پیسے جمع کئے اور جنگ کو کامیاب بنانے کے لئے اس قومی جنگی خزانے میں شامل کئے۔

اب سوچنے اور غور کرنے کا مقام ہے کہ برّاعظم ہندوستان کے طول و عرض میں عورتوں تک کا یہ جوش و ایثار سوائے مذہبی پیشواؤں کی کوششوں کے کیا اور کسی طرح بھی ممکن تھا۔ اس تحریک کو کامیاب بنانے میں کئی سال صرف ہوئے کیونکہ ایک دن یا ایک دو مہینے میں عام لوگوں کو اس قدر مشتعل اور آمادۂ قتال نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کوئی ہندو اگر چاہے تو فرشتہ، نظام الدین ہروی، بیہقی، روضۃ الصفا، تاج المآثر وغیرہ کو اُن کے مسلمان ہونے کی وجہ سے ناقابل التفات قرار دے سکتا ہے مگر وہ راجہ شیو پرشاد کی گواہی کو کس طرح رد کرے گا جو اپنی تاریخ آئینہ تاریخ نما میں ہندو عورتوں کے سوت کات کات کر جنگ میں مدد کرنے اور اپنے شوہروں اور بیٹوں کو لڑائی میں بھیجنے کی تصدیق فرماتے ہیں۔ مسٹر جے۔ سی۔ ایلین صاحب سے بڑھ کر مسلمانوں سے ناراض مورخ اور کون ہو سکتا ہے وہ فرماتے ہیں کہ

"راجہ انند پال نے جو ایک بہادر سپاہی تھا راجپوتوں کو اپنی مدد کے لئے بلایا تمام راجپوت راجہ اپنی اپنی فوج لے کر جمع ہو گئے۔ ہندو عورتوں نے اپنے زیور طلائی اُتار اُتار کر اس لئے گلوا ڈالے کہ وہ اپنے اُن بھائیوں اور خاوندوں کی روپیہ سے مدد کریں جو لڑائی میں شریک ہوں۔ راجپوتوں کی فوج اس قدر جرار تھی کہ بہت دنوں تک سلطان محمود کو اُس سے مقابلہ کرنے کرنے کی جرأت نہ ہوتی"

آنریبل ڈاکٹر ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر صاحب سے بڑھ کر اور کون ہندو نواز مورخ ہو سکتا ہے وہ فرماتے ہیں کہ۔

"ہندوؤں نے ایسی حب الوطنی ظاہر کی کہ شریف عورتوں نے اپنا گہنا پاتا گلوا ڈالا اور غریبوں نے سوت کات کات کر لڑائی میں اپنے خاوندوں کی مدد کی"

یہی مورخ آگے چل کر اسی لڑائی کے ذکر میں لکھتا ہے کہ

"محمود نے اس خوف سے کہ جملہ راجاؤں نے صوبہ مالوہ سے لے کر ملک اودھ تک ایکا کر لیا تھا پشاور میں مورچے ڈالے اور ایک مرتبہ جو ان مورچوں میں سے برآمد ہو کر حملہ کیا تو سخت زک اُٹھائی یہاں تک کہ گھکڑ قوم کے وحشی لوگ محمود کے لشکر میں گھس پڑے اور چار ہزار مسلمانوں کو تہ تیغ کیا"

ان شہادتوں کے موجود ہوتے ہوئے ہم فرشتہ کے بیان کو کیسے رد کر سکتے ہیں۔ جس نے اب سے قریباً تین سو سال پہلے جب کہ ہندو مسلمانوں کی اس موجودہ کشمکش کا کسی کو وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا اپنی تاریخ میں درج کیا کہ

"بقصد ثواب جمیع راجہائے ہند و اطراف مثل راجہ اُجین و گوالیار و کالنجر و قنوج و دہلی و اجمیر در مقام مدد شدند و فوج فوج لشکر روئے بجانب پنجاب نہادند و زیادہ از آنچہ در زمان امیر ناصر الدین سبکتگین بقلم در آمدہ بود ایں دفعہ عرض لشکر گرفتہ بسر کردگی انند پال متوجہ حرب سلطان شدند و در صحرائے پشاور بسلطان محمود نزدیک گشتہ قریب چہل روز در مقابل ہم خیمہ زدند

ہیچ کدام بر جنگ اقدام نمی نمودند اما روز بروز لشکر کفار زیادہ تر می گشت و از اطراف مدد بایشاں می رسید تا آنکہ کفار گھکڑ نیز دریں سفر بایشاں ملحق گشتہ وحشرے عظیم برانگیختہ در حرب مسلماناں بنوے ساعی گردیدند کہ زنان زیور خود فروختہ خرچ از جائے دور دست نزد شوہران خود می فرستادند تا صرف مصالح سفر کردہ در حرب مسلماناں بکوشند و زنانیکہ دسترس نداشتند چرخہ زنی و مزدوری نمودہ چیزے برائے مردم لشکر ارسال می داشتند۔

اب سوچنے اور غور کرنے کے قابل یہ بات ہے کہ راجاؤں کی باقاعدہ فوج کے علاوہ عام رعایا بھی بطور رضا کار بھرتی ہو کر میدانِ جنگ کی طرف روانہ ہو گئی تھی اور ان لوگوں کو جو جنگ کے جوش اور شوق میں گھروں سے نکل پڑے تھے انند پال یا دوسرے راجاؤں کی طرف سے سامانِ رسد اور ضروری اخراجات نہیں دیئے جا سکے تھے اس لئے اُن کی بیویوں اور بہنوں کو سوت کات کات کر روپیہ اُن کے لئے بھیجنا پڑتا تھا۔ یا یہ کہ تمام لوگوں کو مرکزی خزانہ سے خرچ ملتا تھا اور مرکزی خزانہ کو قابلِ اطمینان حالت میں رکھنے کے لئے تمام ملک کو چندوں سے امداد کرنی پڑتی تھی جس میں غریب اور بیوہ عورتوں تک کو بھی حصہ لینا پڑا تھا۔ کیا یہ صورت پنڈتوں اور مذہبی پیشواؤں کی کوششوں کے بغیر بھی پیدا ہو سکتی تھی؟ ہرگز نہیں۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ ان افواج کے پنجاب میں فراہم ہونے کے لئے مہینے اور برس صرف ہوئے ہوں گے۔ اور یہ سلسلہ دیر تک جاری رہنے کے بعد پشاور کے میدان میں لڑائی ہوئی ہو گی کیونکہ عورتوں کو بار بار خرچ بھیجتے رہنے کی ضرورت پیش آتی رہی تھی۔

بہر حال یہ حملہ ہندوؤں کی طرف سے خاص اہتمام کے ساتھ کیا گیا۔ اس حملہ کی تیاریوں اور ترغیبوں کا کام مذہبی پیشواؤں نے بڑی سرگرمی اور مستعدی سے انجام دیا گاؤں گاؤں اور شہر شہر میں منادی پہنچے اور انھوں نے رضا کاروں کو میدانِ جنگ کی طرف روانہ کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ دور دراز مقامات کی فوجوں نے جب لاہور کی طرف سفر کیا تو راستے کے شہروں قصبوں اور گاؤں میں قدرتاً جوش پیدا ہوا ہو گا اور فوجوں کے اس مظاہرے نے پنڈتوں کے کاموں میں یقیناً بڑی کامیابی اور عوام میں شرکتِ جنگ کی

آمادگی پیدا کی ہوگی۔ انند پال نے لاہور میں متحدہ فوج کی عظیم الشان تعداد کے فراہم ہونے پر پشاور کی طرف کوچ کیا۔ یہ فوج جو پشاور کے میدان میں پہنچی اگرچہ ہندوستان کی پوری قوت کہی جاسکتی تھی مگر لڑائی میں شریک ہوکر ثواب حاصل کرنے والے گروہوں کی آمد کا سلسلہ برابر جاری تھا جن کو پنڈت لوگ شہروں اور قصبوں سے مسلسل روانہ کر رہے تھے۔ پشاور کے میدان میں پہنچ کر انند پال نے قیام کیا تاکہ آنے والے جنگجو گروہوں کی آمد کے سلسلے سے فوج کی تعداد جس قدر زیادہ ہوسکتی ہے ہوجائے۔

پشاور کے قریب جنگ

محمود کے پاس جب خبر پہنچی کہ انند پال کی سپہ سالاری میں ایک فوجی سمندر موجیں مارتا ہوا پشاور کی جانب روانہ ہوا ہے تو وہ اس حملہ کو جے پال کے حملہ کا ضمنی سمجھ کر بلا تامل دارالسلطنت کی موجودہ فوج لے کر روانہ ہوا۔ پشاور کے قریب پہنچ کر اس نے ہندوؤں کے لشکر عظیم اور ہندوستان بھر کے تمام سورماؤں کو پہلے سے خیمہ زن اور مقابلہ پر مستعد پایا۔ محمود سے یہی توقع ہوسکتی تھی کہ وہ آتے ہی ہندوؤں کے لشکر پر حملہ آور ہوکر میدانِ کارزار گرم کردے گا مگر اس نے جب ہندوؤں کے لشکر کو توقع کے خلاف لاتعداد اور بے اندازہ پایا اور اپنی قلیل فوج کو بے حقیقت دیکھا تو بقول ملکم صاحب اُس کے حواس باختہ ہوگئے اور بجائے حملہ آور ہونے کے وہ اپنی حفاظت کی تدبیریں سوچنے لگا اُس کی عجیب حالت تھی نہ وہ ہندو لشکر کے سامنے آکر بھاگ سکتا تھا نہ حملہ آور ہونے کی جرأت کرسکتا تھا۔ چنانچہ اُس نے حواس بجا کرکے فوراً اپنے لشکرگاہ کے گرد خندق کھدوانی شروع کردی تاکہ ہندو یکایک حملہ آور ہوکر اُس کے لشکر کو بآسانی پیس نہ ڈالیں۔ ادھر انند پال کو اطمینان تھا اور اُس کا شکار جس کی تلاش میں وہ نکلا تھا اُس کے سامنے پہنچ کر مقیم ہوچکا تھا۔ محمود نے اپنی طرف سے کوئی حملہ نہیں کیا اور حفاظتی سامانوں کے مہیا کرنے میں مصروف رہا۔ اس طرح دونوں لشکر ایک دوسرے کے مقابل چالیس روز تک خیمہ زن رہے اور کسی نے کسی پر پیش قدمی اور پیش دستی نہیں کی۔ محمود کو جب یہ معلوم ہوا کہ ہندوؤں کی تعداد ہر روز ترقی کر رہی ہے اور نئے نئے فوجی دستے روزانہ آکر شریک ہو رہے ہیں تو وہ اپنے اس تامل اور وقت کے گذارنے پر متاسف ہوا آخر اُس نے فیصلہ کیا کہ اسی میدان میں لڑکر جامِ شہادت نوش کرنا چاہیئے چنانچہ اس نے ایک ہزار تیر اندازوں کے ایک دستے کو اوّل آگے بھیجا کہ ہندوؤں کے قریب پہنچ کر تیراندازی کریں اور پیچھے ہٹتے ہوئے ہندو حملہ

آوروں کو اپنی خندقوں کے قریب لے آئیں اُس کا مدعا اس سے یہ تھا کہ اپنی لشکرگاہ کے قریب ایک اچھے موقعہ پر افغانی لشکر ہندوستانی لشکر کا مقابلہ کرے تاکہ چاروں طرف سے دشمنوں کے نرغہ میں نہ آجائے کھلے میدان میں نکل کر مقابلہ کرنے سے مسلمان جن کی تعداد بہت ہی تھوڑی تھی چاروں طرف سے گھیرلیے جا سکتے تھے۔ انند پال بھی اس جنگی داؤں پیچ سے واقف تھا اُس نے تیس ہزار گھکڑوں یا کھوکھروں کی جمعیت کو جو پنجاب ہی کے شمالی اضلاع کی ایک قوم تھی محمود کے لشکر کی دوسری جانب پہنچ کر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ اِدھر ان ایک ہزار تیراندازوں نے نکل کر لڑائی شروع کی اُدھر ان تیس ہزار گھکڑوں نے دوسری طرف سے محمودی کیمپ میں داخل ہو کر قیامت برپا کردی اور چشم زدن میں چار پانچ ہزار مسلمانوں کو شہید کردیا۔ محمود کو مجبوراً خود سوار ہو کر اور اپنی رکابی فوج لے کر ان گھکڑوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اور بمشکل اُن کو مار کر اپنے لشکرگاہ سے بھگایا۔ ادھر ہندوؤں کا لشکر ایک بحرِ مواج کی مانند حرکت میں آچکا تھا اور محمودی فوج کا بڑا حصہ اپنی خندق کے سامنے مصروفِ جنگ ہوچکا تھا۔ بظاہر محمود کی فتح کسی طرح ممکن نظر نہ آتی تھی مگر مسلمانوں کے جوشِ شجاعت اور شوقِ شہادت نے اُن کو پہاڑ کی طرح اُستوار اور فولاد کی طرح سخت وصعوبت کش بنا دیا۔ محمودی سرداروں میں عبداللہ طائی اور ارسلان جاذب نے حیرت انگیز شمشیر زنی اور محیرالعقول کارنامے دکھائے۔ محمود گھکڑوں کو بھگا کر خود بھی اس ہنگامۂ زد و خورد میں آکر شامل اور صفِ قتال میں شریک ہو کر اپنے بہادروں کی حوصلہ افزائی کا موجب ہوا۔ صبح سے قریب شام تک شمشیر زنی جاری رہی۔ لڑائی کے شروع ہوتے وقت ہر ہندو کو اپنی فتح کا یقین اور ہر مسلمان کو سعادتِ شہادت کے حصول کی آرزو تھی مگر جوں جوں وقت گذرتا گیا ہندوستانی لشکر میں نتیجۂ جنگ کے متعلق شک و شبہ کو دخل ملتا گیا۔

انند پال کی شکست انند پال جو باپ کے انتقام اور فتح مندی کے پر غرور یقین کے جوش میں اپنے ہاتھی کو سپاہیوں کا دل بڑھانے کے لئے صفِ قتال میں بڑھا لایا تھا۔ غروبِ آفتاب کے قریب اسلامی لشکر کو پیچھے دھکیلنے اور پامال کرنے سے مایوس ہو کر خود پیچھے ہٹا اور اپنے ہاتھی کا منہ موڑا سپہ سالار کو پیچھے ہٹتے ہوئے دیکھ کر ہندو سپاہی جو مسلمانوں کے مقابلے میں اپنی تمام طاقتوں اور کوششوں کو بیکار و بلا نتیجہ پا چکے تھے صفوں کو توڑ توڑ اور لڑائی سے منہ موڑ موڑ کر ایسے بے تحاشا بھاگنا شروع ہوئے کہ پچھلوں کو ان

اگلوں سے کچھ بھی دریافت کرنے کا موقعہ نہ ملا اور یہ فوجی سمندر اس تیز رفتاری سے ہزارہا شاخوں میں منشعب ہو کر مشرق کی سمت پھیل کر بہنے لگا کہ تاریکی کے پھیلنے سے پہلے پہلے ہندوستانی افواج کا کیمپ (لشکر گاہ) بالکل خالی اور سنسان ہو گیا۔

اس جگہ یہ ذکر کر دینا بھی ضروری ہے کہ بعض مورخین نے انند پال کے فرار کو اُس کے ہاتھی کے بے قابو ہو جانے پر محمول کیا ہے۔ یعنی ہاتھی کسی وجہ سے مہاوت کے قابو میں نہ رہا اور خود ہی اپنی فوج کو کچلتا ہوا پیچھے کو بھاگا ہندو لشکر نے یہ سمجھا کہ ہمارا سپہ سالار بھاگا جاتا ہے لہٰذا وہ سب کے سب بھاگ پڑے۔ ملکم صاحب نے تو ایک انگریز مورخ کے حوالے سے کسی کا یہ بیان بھی لکھ دیا ہے کہ انند پال کا ہاتھی توپ کی آواز یا توپ کے گولے کے لگنے سے بھاگا تھا۔ مگر خود ہی اُس کی تردید بھی کر دی ہے اور لکھا ہے کہ اُس زمانہ میں توپ لڑائیوں میں کہاں استعمال ہوتی تھی۔ بعض نے جلتی ہوئی رال کے گولے اور جلتے ہوئے بارود کی وجہ سے ہاتھی کا بھاگنا بیان کیا ہے۔ مگر چونکہ صبح سے شام تک دونوں لشکروں کا معروفِ جنگ رہنا ثابت اور سب کو تسلیم ہے لہٰذا ہندوؤں کی اس شکست کو محض اتفاقی شکست نہیں کہا جا سکتا کیونکہ طرفین کو اپنے حوصلے پورے کرنے اور لڑنے کا کافی موقع مل چکا تھا۔ فرشتہ کے بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ لڑائی دو روز تک جاری رہی۔ بہرحال یہ لڑائی ہندوستان کی مجموعی طاقت کا ایک زبردست مظاہرہ تھا۔ ہندوستان کی اتنی بڑی جنگی طاقت اب تک کسی ایک میدان میں جمع نہیں ہوئی تھی۔ اس نتیجے کے بعد سلطان محمود نے وقت کو ضائع کئے بغیر صرف دو دن فوج کو آرام لینے کا موقع دے کر انند پال کا تعاقب شروع کیا کیونکہ اُس کو اندیشہ تھا کہ کہیں پھر ان فراریوں کو فراہم کر کے دوبارہ انند پال حملہ آور نہ ہو۔ انند پال سلطان محمود کو اپنے متعاقب آتے ہوئے سن کر لاہور میں نہیں آیا بلکہ نگر کوٹ یا قلعہ بھیم کے راجہ کی معیت میں نگر کوٹ پہنچا کیونکہ وہ پہاڑی مقام ہونے کی وجہ سے بہت مضبوط اور ناقابلِ تسخیر مقام تھا۔ محمود بھی انند پال کا سراغ لگاتا ہوا نگر کوٹ پہنچا۔ اول انند پال نے اس قلعہ میں ٹھہرنا اور مقابلہ کرنا چاہا مگر یہ دیکھ کر کہ محمود کی فوج کے افغان سپاہی پہاڑی راستوں اور پہاڑی گذر گاہوں کو خاطر میں نہ لا کر ہر طرف پہاڑوں پر چھائے جاتے ہیں وہ وہاں سے کھسک کر اندرونِ کوہ کے دور و دراز مقامات میں پہنچ گیا۔

نگرکوٹ کی فتح

سلطان محمود نے آتے ہی نگرکوٹ کا محاصرہ کیا اور قلعہ کی فوج نے معمولی مقابلہ کے بعد ہتھیار ڈال دیئے اور جان بخشی کی درخواست کی سلطان محمود قلعہ میں داخل ہوا اور یہاں کے مندر کو جو مجمع الاصنام تھا دیکھا پجاریوں نے جان کی امان طلب کر کے مندر کے متعلقہ خزانہ کا پتہ بتایا۔ یہاں سے اس قدر سونا چاندی محمود کے ہاتھ آیا کہ اس سے پیشتر نہ سلطان محمود نے اس قدر خزانہ دیکھا تھا نہ ایران و خراسان کے کسی دوسرے بادشاہ کی نظر سے ایسے ایسے زیورات سونے چاندی کے گندے ہوں گے۔ اس جگہ ذرا مذہبی پیشواؤں اور اُس زمانے کے پجاریوں کی اس اخلاقی حالت کا بھی تصور کیجئے کہ ان ہی لوگوں نے محمود غزنوی کے خلاف تمام ہندوستان کو لڑائی پر آمادہ کیا۔ ان ہی لوگوں کے وعظ و پند کا اثر تھا کہ عورتوں نے اپنے مردوں کے لئے سوت کات کات کر روپیہ جمع کیا مگر ان لوگوں کے دل مال و دولت کی محبت سے خالی نہ ہوئے اور اُنھوں نے اتنے بڑے بڑے خزانوں کو اپنی ملکیت اور قبضہ میں رکھتے ہوئے خرچ کرنا نہ چاہا۔ محمود غزنوی کو نگرکوٹ سے جو خزانہ ملا وہ اُس کی زحمت سفر اور ضیاع نفوس کا کافی معاوضہ تھا۔ سلطان محمود نے ۳۹۹ھ کے آخر ایام میں پشاور کے قریب انندپال اور ہندوستان کی متحدہ طاقت کو شکست دی اور ۴۰۰ھ کے شروع میں نگرکوٹ سے فارغ ہو کر غزنی کی جانب روانہ ہوا۔

انندپال کی درخواست معافی

سلطان محمود ابھی نگرکوٹ ہی میں مقیم تھا کہ انندپال نے جو پہاڑوں کے اندر جا چھپا تھا پیغام بھیجا کہ جس طرح آپ نے اس سے پہلے بھی بار بار میری اور میرے باپ کی خطائیں معاف کی ہیں ایک مرتبہ اور میری گستاخی سے درگذر فرمائی جائے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اب شرائط فرماں برداری کے بجا لانے اور سالانہ زرِ خراج ادا کرنے میں کوئی کوتاہی عمل میں نہ آئے گی۔ نگرکوٹ کے راجہ نے بھی اسی طرح عفوِ تقصیرات کی درخواست بھیجی اور برہمنوں کی سازش و کوشش سے آمادۂ جنگ ہو جانے پر اظہارِ ملال کیا۔ سلطان نے اس درخواست کو بلا تامل منظور کر لیا۔ چونکہ سلطان کو معلوم ہو چکا تھا کہ برہمنوں اور پنڈتوں کی کوششوں سے یہ ہنگامہ برپا کرانے اور ہندوستان والوں کے دلوں میں نفرت و عداوت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے لہٰذا اُس نے ازراہِ مآل اندیشی عام اعلان کر دیا کہ جو ہندو ہماری فوج میں نوکر ہونا چاہے وہ خوشی سے بھرتی ہو سکتا ہے ہم اُس کو مثل مسلمانوں کے تمام حقوق عطا کریں گے پشاور کی مذکورہ

شکست نے چونکہ عام لوگوں کے دلوں میں ایک زبردست مایوسی پیدا کردی تھی لہٰذا دریائے سندھ کو عبور کرنے سے پہلے پہلے مختلف مقامات سے آ آکر دس ہزار ہندو سلطانی فوج میں بھرتی ہوگئے۔ اور سلطان نے انھیں میں سے ایک ہندو کو سپہ سالاری کا عہدہ دے کر ان دس ہزار ہندوؤں کی ایک الگ مستقل فوج قائم کردی۔ ہندوؤں کی اس فوج کے قائم کرنے سے سلطان کا مدعا یہ تھا کہ اس نفرت کو جو ہندوؤں کے دلوں میں سلطنت غزنی کی طرف سے قائم ہوئی تھی دور کردیا جائے اور اس بات کا یقین دلایا جائے کہ ہم ہندوؤں پر بخوبی اعتماد کرسکتے ہیں۔ جامع التواریخ میں پشاور اور نگرکوٹ کی لڑائی کا حال لکھ کر لکھا ہے

"ملوک ہند اطاعت و خراج قبول ساختہ دہ ہزار سوار ملازم سلطان گردانیدند"

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سلطان نے انندپال وغیرہ سے یہ فرمائش کی ہوگی کہ تم ہماری فوج میں ہندوؤں کو بھرتی کرادو۔ انندپال اور نگرکوٹ کے راجہ نے دس ہزار سوار سلطان کے لشکر میں بھرتی کرادیا ہوگا۔ بہرحال ۳۹۹ھ سے سلطنت غزنی کے لشکر میں ہندو شامل ہوئے اور اُن کی تعداد برابر سلطانی فوج میں ترقی کرتی رہی اور خسرو ملک یعنی خاندان سبکتگین کے سب سے آخری بادشاہ کے زمانہ تک مسلسل یہ ہندو فوج قائم رہی جیسا کہ آگے اس کی تفصیل آتی ہے۔ سلطان نے غزنی کو جاتے ہوئے نہ کسی شہر کو لوٹا نہ کسی کو زبردستی پکڑ کر مسلمان بنایا نہ کسی کو گرفتار کرکے غلام بنایا بلکہ نہایت امن و امان اور خاموشی کے ساتھ پشاور و جمرود و خیبر کے راستے غزنی چلا گیا۔ اگر محمود واقعی ایسا ہی ہوتا جیسا کہ گمراہ کن تاریخوں میں ہمارے بچوں کو پڑھایا جاتا ہے تو نگر (کانگڑہ) سے پشاور تک وہ نہایت آباد و سرسبز علاقے میں سفر کرتا ہوا گذرا اس آباد علاقے کے شہروں اور قصبوں کو لوٹتا اور خاک سیاہ بناتا ہوا گذرتا اور خون کی ندیاں بہا کر پنجاب کے دریاؤں کا پانی سُرخ کردیتا۔ انندپال محمود کے چلے جانے کے بعد اپنے دارالحکومت لاہور میں آیا تھا اُس وقت یہ ملک بالکل بے والی وارث پڑا تھا محمود کو کسی مزاحمت اور کسی کے مقابلے کا بھی اندیشہ نہ تھا مگر اُس نے نگرکوٹ سے پشاور تک کسی کو بھی کوئی نقصان نہیں پہنچایا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اُس نے لاہور کو بھی دیکھنا مناسب نہ سمجھا۔

ملتان اور غور میں قرامطہ کا استیصال

غزنی پہنچ کر اُس کو معلوم ہوا کہ غور و ہرات کے علاقے میں قرامطہ نے شورش برپا کردی ہے

اور وہاں کا حاکم محمد بن سوری قرمطی ہو کر علم بغاوت بلند کر چکا ہے۔ اس جگہ یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اس زمانے میں مصر کے اندر عبیدیوں کی حکومت بڑے زور شور سے قائم تھی ان ہی عبیدیوں کو فاطمیین بھی کہتے ہیں یہ لوگ خود خلافت کے مدعی اور بغداد کی عباسیہ خلافت کے رقیب اور جانی دشمن تھے محمود غزنوی عباسیوں کا طرف دار اور اپنے آپ کو عباسی خلیفہ کا خادم جانتا تھا۔ مصر کا فرماں روا حاکم بن عزیز عبیدی تھا۔ حاکم بن عزیز عبیدی کو محمود کی روزافزوں طاقت وشہرت کے مٹانے اور نقصان پہنچانے کا بہت خیال تھا۔ قرامطہ کی بیخ کنی اور بربادی کے لئے محمود نے سندھ وسیستان وخراسان وغیرہ میں جو جو کوششیں کی تھیں ان سب کا حال سن کر حاکم عبیدی محمود غزنوی کا جانی دشمن بن گیا تھا۔ اوپر ذکر آچکا ہے کہ محمود نے مصر کے ایلچی کو قرمطی ہونے کی وجہ سے ذلیل کر کے نکلوادیا تھا۔
حاکم بن عزیز عبیدی اگرچہ قرمطی نہ تھا لیکن اس کو قرامطہ سے اس لئے ہمدردی تھی کہ قرامطہ کے مذہب میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی تکریم موجود تھی۔ نیز یہ کہ اب تک قرامطہ کی تمام تر کوششیں خلافت عباسیہ اور اس کے متوسلین کو نقصان پہنچانے میں صرف ہوئی تھیں۔ اس زمانے کے قرامطہ بھی حاکم بن عزیز عبیدی کو اپنا سردار ومربی ماننے لگے تھے کیونکہ حاکم عبیدی نے ان کی ہمت افزائی کی تھی۔ ہندوستان میں جو تحریک برہمنوں کی کوشش سے نشوونما پا رہی تھی اس میں شروع سے قرامطہ شریک تھے اور انھوں نے حاکم بن عزیز عبیدی سے امداد طلب کی تھی۔ حاکم عبیدی کو انند پال کی تیاری اور حملہ آوری کا بخوبی علم تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ملک گجرات کی فوجیں تو پشاور کے معرکہ میں شریک تھیں مگر کسی قرمطی کا معرکہ پشاور میں انندپال کے زیر علم موجود ہونا ثابت نہیں۔ قرامطہ نے اپنے لئے دوسرا میدان تجویز کر لیا تھا اور ہندوؤں کو اس کا علم تھا اس لئے انھوں نے قرامطہ کو پشاور کی طرف آنے کی تکلیف نہیں دی۔
تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ مصر سے کچھ جہاز امدادی فوج اور منادے لے کر دیبل کے بندرگاہ پر آئے۔ داؤد بن نصر حاکم ملتان کے پاس حاکم بن عزیز عبیدی کے سفیر پہنچے اور اس کو خلیفہ مصر یعنی حاکم عبیدی کی بیعت پر آمادہ کر کے محمود غزنوی کے خلاف جنگ پر مستعد کیا۔ مصری فوج ملتان میں پہنچی اور قرامطہ کا بھی ملتان میں خوب اجتماع ہوا۔ ایک حصہ سفارت مصر اور قرامطہ کا غور کے جاہل اور پہاڑی علاقے میں خفیہ طور پر پہنچ چکا تھا۔ ادھر انندپال نے لاہور سے پشاور کی جانب کوچ کیا ادھر مصری سفیروں اور قرمطی منادوں نے محمد بن سوری اور اس نواح کی

جاہل رعایا کو محمود کی مخالفت اور بغاوت پر آمادہ کیا۔ چنانچہ ٹھیک اُس زمانے میں جب کہ پشاور کے میدان میں محمود وانند پال آمادۂ پیکار تھے ملتان اور غور میں بیک وقت علمِ بغاوت بلند کئے گئے سلطان محمود نے غزنی پہنچتے ہی غور پر حملہ کیا اور محمد بن سوری دس ہزار جنگ جُو لے کر مقابلہ پر آیا۔ آخر گرفتار ہوا اور گرفتار ہوتے ہی خود کشی کر کے مرگیا۔ جس وقت سلطان محمود محمد بن سوری سے معروف جنگ تھا اُس وقت داؤد بن نصر فوج لے کر محمودی علاقہ میں دست درازی کر رہا تھا۔ سلطان نے محمد بن سوری سے فارغ ہوتے ہی ملتان پر فوج کشی کی داؤد بن نصر نے سلطان محمود کا نہایت سختی سے مقابلہ کیا مگر انجام کار شکست پا کر گرفتار ہوا۔ بہت سے قرامطہ تہِ تیغ ہوئے بعض ہاتھیوں کے پاؤں میں کچلوائے گئے۔ قرامطہ کو سلطان محمود نے نہایت تلاش و تجسس کے ساتھ گرفتار کرا کر قتل کیا۔ غور و ملتان کی شورشوں کا بیک وقت برپا ہونا اور انند پال کی چڑھائی کے ساتھ ہی ان مقامات میں بھی علمِ بغاوت بلند ہونا صاف بتا رہا ہے کہ یہ کیسی عظیم الشان سازش تھی۔ اس قسم کی خطرناک سازشوں کا اسلام اور مسلمانوں کے خلاف برپا ہونا کوئی عجیب اور غیر معمولی بات نہیں۔ خلافتِ راشدہ کے آخری زمانے سے ایسی ہی خطرناک اور بڑی بڑی سازشوں کا سلسلہ جو سلطنتِ اسلامیہ کے خلاف شروع ہوا ہے وہ آج تک بھی ختم ہونے میں نہیں آیا۔ جن لوگوں کو ان مخالفِ اسلام سازشوں کی مفصل تاریخ سے واقفیت حاصل کرنی منظور ہو وہ میری کتاب تاریخِ اسلام کی پہلی۔ دوسری، تیسری جلد ملاحظہ فرمائیں جن کا مسودہ تیار کر کے میں صوفی کمپنی کو اشاعت کے لئے دے چکا ہوں۔ اگر محمود غزنوی کو پشاور کے میدان میں شکست حاصل ہوتی تو سندھ سے لے کر آذربائیجان و بخارا تک تمام ملکوں میں قرامطہ یا عبیدیین مصر کی حکومت کا قائم ہو جانا یقینی تھا اور اس کے ساتھ ہی خلافت عباسیہ کا بھی خاتمہ تھا۔ غور و ملتان کی لڑائیوں میں محمود کو آسانی کے ساتھ فتوحات حاصل نہیں ہوئی تھیں یہ لڑائیاں پشاور کی لڑائی سے ہرگز کم خطرناک نہ تھیں بخوفِ طوالت ان کی تفصیل سے اعراض کیا گیا ہے۔ جنگِ پشاور کے بعد پورا ایک سال سلطان محمود کو نگرکوٹ غور اور ملتان کی لڑائیوں میں صرف کرنا پڑا۔ ۴۰۱ھ کی ابتدا میں سلطان ان لڑائیوں سے فارغ ہوا۔

تھانیسر پر حملہ

اب بظاہر سلطان محمود کے لئے کوئی خطرہ موجود نہ تھا لیکن اُس کے اصلی دشمنوں کا ایک حصہ ابھی تک پسِ پردہ اور محفوظ تھا جس سے سلطان بخوبی واقف و آگاہ ہو چکا تھا قرامطہ کو وہ شروع ہی سے جانتا اور اُن کے استیصال کے درپے رہا تھا لیکن اب اُس کو معلوم ہوا کہ ہندوستان کے برہمن جو مذہبی پیشوا ہونے کے سبب عوام پر بڑا اثر رکھتے ہیں وہ بھی قرامطہ کے ہم نوا اور قرامطہ سے کچھ کم خطرناک نہیں ہیں۔ انند پال اب سلطان کا پھر فرماں بردار و باج گذار بن چکا تھا۔ ملتان کی ریاست جو عرصہ سے قرامطہ کے زیر اثر چلی آتی تھی اب باقاعدہ طور پر سلطان کی مملکت میں شامل ہو گئی تھی اور سلطان نے وہاں اپنی طرف سے ایک عامل مقرر کر دیا تھا۔ مگر سلطان کو اس بات کا بہت خیال تھا کہ جس طرح پنجاب وملتان کے صوبے پہلے کئی مرتبہ مطیع ہونے کے بعد باغی ہو چکے ہیں اب پھر باغی نہ ہو جائیں لہٰذا اُس نے اس بات کا سُراغ لگایا کہ انند پال کو بغاوت پر آمادہ کرنے کے لئے کون کون سی طاقتیں محرک ہو سکتی ہیں تاکہ پہلے سے اُن کا علاج کر دیا جائے اور انند پال کو دوبارہ باغی ہونے کا موقعہ نہ دیا جائے چنانچہ اُس کو معلوم ہوا کہ تھانیسر۔ قنوج اور متھرا کے راجہ اس لئے زیادہ موجب فساد ہو سکتے ہیں کہ یہی مقامات برہمنوں اور سازشی لوگوں کے بھی مرکز ہیں۔ یہاں کے بُت خانے سازش خانے بنے ہوئے ہیں اور نہ صرف اپنے اپنے مقامی راجاؤں پر بلکہ تمام ہندوستان پر اثر ڈال سکتے ہیں اور یہی وہ زبردست راجا ہیں جو انند پال کی مدد کو سب سے پہلے پہنچ سکتے ہیں۔ دوسری طرف انہلواڑہ (گجرات) اور اُجین کی ریاستیں ملتان کے صوبہ کو نقصان پہنچا سکتی ہیں مگر چونکہ ملتان میں سلطان ایک مسلمان حاکم مقرر کر چکا تھا لہٰذا اُس کو پنجاب ہی کا سب سے زیادہ خیال تھا اور اسی لئے اُس نے ۴۰۲ھ میں تھانیسر پر حملہ کرنا مناسب سمجھا تاکہ تھانیسر کے راجہ کا وہ قرضہ بھی ادا کرے جو اُس نے اس سے پہلے ایک سے زیادہ مرتبہ انند پال وجے پال کا معاون بن کر اور سلطنت غزنی پر حملہ آور ہو کر محمود کے ذمہ چڑھا دیا تھا۔ نیز وہاں کے سازشی لوگوں کو بھی جو قرامطہ سے ہرگز کم نہ تھے سزا دے۔ تھانیسر اور دہلی کی ریاست انند پال کے ملک یعنی پنجاب کی مشرقی سرحد سے ملحق تھی اس ریاست پر حملہ کرنا بغیر اس کے ممکن نہ تھا کہ انند پال کے ملک میں ہو کر سلطانی لشکر گذرے۔ سلطان کو اس امتحان کا بھی موقعہ مل گیا کہ انند پال

سلطانی لشکر کو اپنے علاقے میں ہو کر گذرنے دیتا ہے یا پہلے کی طرح پھر بغاوت پر آمادہ ہو کر سدِراہ بنتا ہے۔ چنانچہ سلطان نے اپنی روانگی سے پیشتر انند پال کو لکھا کہ ہمارا ارادہ تھانیسر و دہلی پر حملہ کرنے کا ہے لشکر سلطانی تمہارے علاقے میں ہو کر گذرے گا منشا یہ ہے کہ تم اپنے آدمی ہمارے ساتھ متعین کردو کہ وہ تمہارے ملک کی حدود سے ہم کو آگاہ کریں اور تمہارے علاقہ میں سلطانی لشکر سے کسی کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ انند پال نے فوراً اپنے بھائی کی سرداری میں دو ہزار سواروں کا ایک لشکر پشاور کے مقام پر بھیج دیا کہ سلطان محمود کے ہمراہ اس سفر میں رہے اور لشکرِ سلطانی کو کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچنے دے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اب انند پال کے سر سے سلطان محمود کے مقابلہ اور مخالفت کا سودا دور ہو چکا تھا اور اُس نے مطیع و فرماں بردار رہنے ہی میں اپنی فلاح و بہبود دیکھی تھی۔ فرشتہ کہتا ہے کہ

"سلطان غازی چوں داخلِ ممالک پنجاب شد خواست کہ بنا بر عہد و شرطیکہ میانۂ او و انند پال شدہ تخلف نشود و آسیبے در اثنائے راہ عبور بملکت وے نرسد ازاں سبب کس پیش انند پال فرستادہ اعلام نمودہ کہ عزیمت تھانیسر داریم باید کہ جمعے از معتمدانِ خود را ملازم کوکب ہمایوں ماگردانی تا ہر پرگنہ کہ تعلق بتو داشتہ باشد از صدمۂ سپاہ گردوں اشتباہ مصون و محفوظ ماند انند پال انثال امر را موجب بقائے دولت خود دانستہ بسرعت اسباب ضیافت مہیا کرد و تجار و بقالان مملکت خویش را فرمودہ تا امتعہ و روغن و غلہ و جمیع مایحتاج بار دوئے لشکر سلطان بردہ نوعے نمایند کہ رفاہیت در لشکر پدید آید و دو ہزار سوار بسرکردگی برادرِ خود بخدمت سلطان فرستادہ عریضہ نوشت کہ بندہ مطیع و منقاد است۔"

حکم صاحب انند پال کی اس اطاعت و فرماں داری اور سلطانی لشکر کی ضیافت و مہماں نوازی کے حال کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

"محمود نے دوسری یورش تھانیسر کی کی جو بڑی مشہور پرستش گاہ ہے اور دلی سے شمال کی جانب کوئی ستر میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انند پال نے اس یورش میں اس کا مقابلہ نہ کیا مگر چونکہ وہ اب ایک سردار خدمت گذار کی برابر رہ گیا تھا اس لئے اپنی دارالحکومت لاہور ہی میں رہا اور بڑے صبر و تحمل

سے اس حملہ کو دیکھتا رہا جس کی روک تھام کی تاب اُس میں نہ رہی تھی:۔

اوپر جن لڑائیوں اور یورشوں کا ذکر ہوا ان میں ایک بھی ایسی نہیں ہے جس کو محمود کی ملک گیری کے شوق یا ہندوستان والوں کو لونڈی غلام بنانے اور مندروں کو نقصان پہنچانے کی خواہش کا نتیجہ کہا جا سکے بلکہ ہر مرتبہ قرامطہ یا ہندوستان کے راجاؤں کی پیش قدمی نے اُس کو لڑائی کی دعوت دی۔ وہ اگر دشمن تھا تو قرامطہ کا دشمن تھا۔ ہندو یا بدھوں سے من حیث القوم اُس کو کوئی عداوت و پرخاش نہ تھی۔

تھانیسر پر حملہ کی وجہ تھانیسر چونکہ برہمنوں کی سازش کا مرکز تھا اور یہیں یہ مندر تھا جس کا نام سوم جگ۔ یا جگ سوم رکھا گیا تھا اور جہاں سلطنت غزنی کی بربادی کے لئے برہمنوں نے سازشی مرکز قائم کیا تھا لہٰذا اس سیاسی مرکز کو جو قرامطہ کے مرکزی مقام سے کم خطرناک نہ تھا تہ و بالا کرنا محمود کا فرض تھا۔ محمود کے پنجاب میں پہنچنے اور تھانیسر کی جانب جلد جلد بڑھنے کا حال سُن کر یہاں کے راجہ نے اپنی مدد کے لئے میرٹھ۔ مہابن۔ برن اور قنوج کے راجاؤں کو بُلایا لیکن ان راجاؤں کے تھانیسر پہنچنے سے پہلے محمود تھانیسر پہنچ گیا۔ تھانیسر کا راجہ شہر چھوڑ کر بھاگ گیا محمود نے مندر کو توڑا اور سازشی گروہ کے جس شخص کا پتہ چلا اُس کو گرفتار کیا۔ اُس کو معلوم ہوا کہ مندر میں جو بُت رکھا ہے اُس کی نسبت عوام کو برہمنوں نے یقین دلا رکھا ہے کہ جو شخص اس بُت کے سامنے خودکشی کر کے اپنے آپ کو ہلاک کرتا ہے وہ عقبٰے کی نجات حاصل کر لیتا ہے۔ یہ سُن کر محمود نے اُس بُت کے توڑنے کا حکم دیا تاکہ اس خیالِ فاسد اور ہلاکت آفریں عقیدے سے عوام کو نجات ملے فرشتہ کی روایت کے موافق سوم جگ کا بُت توڑا نہیں گیا بلکہ اُس کو محمود بجنسہٖ اُٹھا کر اپنے ہمراہ غزنی لے گیا مگر ملکم صاحب لکھتے ہیں کہ بُت کو توڑ کر اُس کے ٹکڑے غزنی لے گیا۔ طبقاتِ اکبری میں لکھا ہے کہ

"سوم جگ را کہ در تھانیسر بود بغزنی بردند۔ سلطان فرمود کہ آں بت را بر درگاہ نہادہ پے سپر خلائق سازند"

خلاصۃ التواریخ میں سجان رائے لکھتا ہے کہ

"بتِ چکر سوم را بغزنی بردہ بفرمودۂ سلطان بر درگاہ نہادند تا پے سپر خلائق گردد

بُتے چوں برآرد مہماتِ کس | کہ نتواند از خویش راندن مگس
نہ نیروئے دستش نہ رفتار پائے | دگر بفگنی بر نہ خیزد زجائے"

ذرا غور کرنا کہ ایک ہندو اس بت کا ذکر کرتے ہوئے کیسے لطیف دو شعر لکھتا ہے اور کوئی ماتمی فقرہ اُس کی زبان سے نہیں نکلتا۔ محمود کا یہی حملہ ہے جس میں بُت کے توڑنے یا یہاں سے اُٹھا کر غزنی لے جانے اور ہندوؤں کو بھی گرفتار کر کے لے جانے کا ذکر پہلی مرتبہ آتا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ اسی حملہ میں محمود کے ساتھ بارہ ہزار ہندو فوج بھی موجود ہے۔ جس میں سے دس ہزار ہندو تو باقاعدہ اُس کی فوج میں نوکر ہیں اور دو ہزار کا ہندو لشکر انند پال کے بھائی کی سپہ سالاری میں بطور معاون اور بطریق میزبان موجود ہے۔ محمود نے جب خالص اسلامی لشکر سے کر اس ملک میں راجاؤں کا مقابلہ کیا تو کسی مندر کو ڈھایا نہ کسی مورت کو توڑا لیکن جب ہندو اُس کی فوج میں بھرتی ہو جاتے ہیں تو مندر اور مورت کے توڑنے اور ہندوؤں کو قید کر کے غزنی لے جانے کا واقعہ ظہور میں آتا ہے۔ بات یہ ہے کہ ان ہندو سپاہیوں اور ہندو سرداروں ہی نے جو محمود کی فوج میں نوکر تھے محمود کو ان سازشی مرکزوں، سازشی لوگوں اور سازشی کارروائیوں کا پورا پورا حال بتایا اور سُنایا ہوگا۔ اور اسی لئے محمود نے تھانیسر میں وہ کارروائیاں جن کا ذکر اوپر ہوا آزادی کے ساتھ کیں اُس نے جس طرح قرامطہ کو قتل و گرفتار کیا تھا اُسی طرح تھانیسر کے سازشی مرکز سے سازشی ہندوؤں کو گرفتار کیا۔ اس کی فوج کے ہندوؤں اور انند پال کی دو ہزار ہندو فوج نے بھی جو اُس کے ہمراہ موجود تھی کوئی اظہار ناراضی نہیں کیا۔ نہ ہندوؤں نے محمود کی ملازمت کو ترک کیا۔ یہ جو کچھ بھی ہوا ہندوؤں ہی کی رہبری میں ہوا۔ پس اس کارروائی کو مذہبی تعصب کا نتیجہ قرار دینا سیاسی ضرورت اور سیاسی تقاضے کو فراموش کر دینا عقل و عدل کے سراسر خلاف ہے۔ محمود کی جگہ کوئی دوسرا شخص ہوتا تو اس کے لئے بھی یہ تمام کارروائیاں جائز اور ناگزیر تھیں۔ ایک بادشاہ اور ایک سلطان کے اخلاق اور اُس کی ضرورتوں کو ایک سادھو کے اخلاق اور ایک سادھو کی ضرورتوں پر قیاس کرنا پرلے درجے کی حماقت اور نابینائی ہے۔

کشمیر پر حملہ محمود جب کہ ہندوستان آیا ہوا تھا اُس کی غیر موجودگی میں خراسان کی جانب کچھ بدامنی اور بغاوت پیدا ہوئی لیکن محمود کے غزنی پہنچتے پہنچتے اُس کے سپہ سالار ارسلان جاذب نے اس بغاوت و بدامنی کو فرو کر دیا تھا۔ اسی سال یعنی ۴۰۵ھ

میں ابوالفوارس بن بہاء الدولہ دیلمی اپنے بھائیوں کے غلبہ سے مجبور ہو کر سلطان محمود کے پاس آیا اور اعانت طلب کی۔ سلطان نے اُس کے بھائیوں کے پاس خطوط بھیجے اور صلح کرادی۔ سنہ ۴۰۲ھ میں پنجاب کے حاکم انند پال کا انتقال ہوا۔ انند پال مرتے دم تک سلطان محمود کا فرماں بردار رہا۔

جے پال ثانی

اب اُس کی وفات کے بعد اُس کا بیٹا جے پال ثانی تخت نشین ہوا۔ جے پال ثانی نے تخت نشین ہو کر اپنی خود مختاری کا اعلان اور محمود کی فرماں برداری وخراج گذاری سے انکار کیا۔ محمود نے اُس کی تادیب کے لئے لشکر کشی کی۔ جے پال ثانی نے مقام نندونہ (ضلع جہلم) میں اس نے مقابلہ کی تیاری کی کہ وہ نہایت مضبوط اور مستحکم مقام تھا محمود نے قلعہ نندونہ کا محاصرہ کیا۔ جے پال ثانی عاجز ہو کر نندونہ سے نکل بھاگا اور کشمیر کے دروں میں جا چھپا محمود اُس کے تعاقب میں کشمیر تک گیا مگر وہ کشمیر کے راجہ کی پناہ اور کشمیر کے اندرونی علاقے میں پہنچ گیا۔ سلطان نے کشمیر کے دروں میں پہنچ کر کئی قلعے فتح کئے اور نندونہ میں اپنا ایک عامل مقرر کر کے غزنین کو واپس چلا گیا۔ جے پال ثانی نے کشمیر سے لاہور واپس آکر پھر پنجاب میں حکومت شروع کی اور سلطان کی خدمت میں خراج سالانہ کے ساتھ درخواست بھیجی کہ میری ناتجربہ کاری ونوعمری پر نظر فرما کر میری گستاخی معاف فرمائی جائے آئندہ اپنے باپ کے زمانہ کا مقررہ خراج بلا عذر وحیلہ روانہ کرتا رہوں گا اور اطاعت وفرماں برداری کے شرائط بجالانے میں کوتاہی ہرگز عمل میں نہ لاؤں گا۔ سلطان نے جس طرح اُس کے باپ اور دادا کو بار بار معاف کیا تھا اُسی طرح جے پال ثانی کی خطاؤں کو معاف کر کے پنجاب کی سندِ حکومت اُس کے پاس بھیج دی۔ سلطان محمود ۴۰۶ھ تک غزنی اور خراسان کے اندرونی معاملات کی اصلاح میں مصروف رہا۔ وہاں سے فارغ ومطمئن ہو کر اُس نے ضروری سمجھا کہ کشمیر کے راجہ کی تادیب کی جائے تاکہ وہ جے پال ثانی کے گمراہ کرنے اور سلطان کی مخالفت میں اُس کو امداد پہنچانے کی جرأت نہ کرسکے ۴۰۶ھ کے آخر ایام میں وہ فوج لے کر کشمیر پر حملہ آور ہوا اور جے پال ثانی سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ لوہ کوٹ کے قلعہ پر کشمیری لشکر نے سلطانی لشکر کا مقابلہ کیا سلطان نے اس قلعہ کا محاصرہ کر لیا یہ محاصرہ چند روز جاری رہا۔ قریب تھا کہ یہ قلعہ فتح ہو جائے کہ اسی اثناء میں خبر پہنچی کہ حاکم خوارزم کو جو سلطان کا رشتہ دار تھا وہاں کے لوگوں نے بغاوت کر کے مار ڈالا ہے۔

سلطان قلعہ لوہ کوٹ سے ۴۰۸ھ میں محاصرہ اٹھا کر غزنی اور غزنی سے خوارزم پہنچا وہاں کے باغیوں کو سزا دی اور اس ملک میں امن و امان قائم کرکے غزنی واپس آیا ۴۰۹ھ میں سلطان محمود غزنی سے ایک زبردست لشکر لے کر اس ارادہ سے روانہ ہوا کہ تمام سرکشوں کو قرار واقعی سزا دے کر ملکِ پنجاب کو ہر قسم کے خطرات سے محفوظ کر دے۔ چنانچہ وہ غزنی سے چل کر اول کشمیر پہنچا کیونکہ اُس کے پہلی مرتبہ لوہ کوٹ سے چلے جانے پر کشمیر کے راجہ کی نخوت اور بھی بڑھ گئی تھی۔ اس مرتبہ محمود جب حدودِ کشمیر میں داخل ہوا تو کشمیر کے راجہ نے اطاعت و فرماں برداری کی درخواست بھیج کر امان طلب کی اور اپنی خدمت گذاری و خراج گذاری کا وعدہ کرکے محمود کے غصہ کو فرو کیا۔ سلطان نے کشمیر کے راجہ کی درخواست منظور کرکے اُس کے ملک کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچایا اور اُس کو حکم دیا کہ تم اپنی مناسب فوج لے کر بطور مقدمۃ الجیش ہمارے لشکر کے آگے آگے چلو۔

قنوج و متھرا وغیرہ پر حملہ

کشمیر کا راجہ سلطانی حکم کی تعمیل میں حاضر ہو کر خلعت و خطاب سے سرفراز اور محمودی لشکر کے ساتھ بطور مقدمۃ الجیش روانہ ہوا۔ سلطان نے اُس کو سمجھا دیا تھا کہ ہم قنوج و مہابن و برن وغیرہ پر حملہ آور ہو کر وہاں کے سازش خانوں کو برباد اور سازشی لوگوں کو گرفتار کرنا چاہتے ہیں تم ہم کو اس طرح پہاڑوں ہی پہاڑ سفر کرا کر لے چلو کہ ان مذکورہ مقامات میں پہلے سے خبر نہ پہنچ سکے۔ کشمیر کے راجہ نے رہبری کرکے سلطان اور اُس کے لشکر کو پنجاب کے دریاؤں اور گنگا جمنا کے دہانوں سے کوہ ہمالہ کے اندر عبور کراتے اور گھاٹیوں ہی گھاٹیوں گذارتے ہوئے رام گنگا کے دہانے تک پہنچا دیا اس سفر میں صرف ہندوستانی سپاہیوں کو جو سلطان کی فوج میں نوکر تھے کسی قدر تکلیف ہوئی باقی سرحدی افغانوں۔ خراسانیوں۔ غوریوں اور ترکوں کو کوئی اذیت نہیں پہنچی کیونکہ یہ لوگ پہاڑوں کے رہنے والے اور پہاڑی سفر کے عادی تھے۔ ملا محمد قاسم ہندو شاہ نے بھی کشمیری لشکر کے مقدمۃ الجیش ہونے کا ذکر کیا ہے چنانچہ لکھا ہے کہ:

> "چوں بحدودِ کشمیر رسید والی آنجا تحف و ہدایائے لائق پیش کش نمودہ بعنایاتِ پادشاہانہ مفتخر گردید و حسب الحکم در مقدمہ لشکر ظفر اثر رواں شد۔"

سلطانی لشکر کوہ ہمالہ سے میدان میں اُتر کر اس طرح یکایک قنوج کے سامنے پہنچ گیا کہ قنوج کا راجہ کنور رائے لشکرِ سلطانی کی کثرت و شوکت دیکھ کر حواس باختہ ہو گیا۔ سلطان محمود کے

اس حملے اور پہاڑی سفر کا حال روسی میجر جنرل آئی این سبولوف نے اپنی کتاب "ہندوستان پر حملے" میں اس طرح لکھا ہے کہ

"محمود مکرر کشمیر پر حملہ آور ہوا پھر قنوج پر چڑھائی کا ارادہ کیا جو اس زمانے میں ہندوستان کا دارالسلطنت تھا۔ ۱۰۱۸ء کے موسم بہار میں محمود ایک لاکھ سوار اور تیس ہزار پیدل سپاہ سے کشمیر و پشاور کے راستہ سے ہندوستان آیا۔ ایسے پیچ کی راہ اختیار کرنے سے اس کی یہ غرض تھی کہ دشمن کو اس کی آمد کا علم نہ ہو اور وہ دفعۃً اس کے سر پر جا پڑے۔ محمود اس پُر صعوبت سفر میں کامیاب ہوا۔ یہ اُس کے استقلال اور بے نظیر قوت ارادہ ہی کا نتیجہ تھا کہ وہ ایسے دشوار گذار راستہ سے اپنی فوج سلامت لے گیا۔ چونکہ وہ غیر معمولی قوت ارادی رکھتا تھا اُس کی سپاہ اور افسروں کو اُس کے آگے سر تسلیم خم کرنے کے سوا چارہ نہ تھا اور اس وجہ سے اُس نے وہ اہم کام انجام دیئے جن کی اوروں کو بمشکل جرأت ہوسکتی تھی۔ بہت سے بلند و مرتفع کوہی سلسلے محمود کی فوج کو عبور کرنے پڑے فوج مذکور کو انتہا درجہ کی کٹھن گھاٹیوں برف پوش ہیبت ناک دروں اور خطرناک کوہی آبشاروں اور ندی نالوں کو عبور کرنا پڑا اور وہ ان تمام رکاوٹوں اور مشکلات پر غالب آئی۔ یہ ساری مصیبتیں اس لئے جھیلی گئی تھیں کہ اس کی یورش کا راز مخفی رہے۔ محمود اپنی فوج کو کشمیر سے لیہ لے گیا جو سطح سمندر سے ۱۱۰۰۴ فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ پھر لداخ اور وہاں سے بتدریج شو شول و ہردوہ کے دروں میں پہنچا جو ۱۲۷۳۶ فٹ سطح سمندر سے بلند ہیں بعدۂ سلسلہ ہمالہ کو ڈینگورجہ ۱۸۱۲۴ فٹ بلند ہے یا ٹنکور (جو ۱۶۰۰۰ فٹ بلند ہے) کے قریب سے طے کیا۔ اس قسم کا سفر جاری رکھنے کے لئے آہنی ارادے کی ضرورت تھی۔ نقشہ پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوسکتا ہے کہ ہندوؤں کو ان راستوں سے مسلمانوں کے قہر الٰہی کی طرح نازل ہونے کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔ لیکن جب غزنی کا لشکر نیپال کی مغربی سرحد پر پہنچ گیا تو اُنھیں معلوم ہوا کہ خوفناک سپہ سالار طاقتور لشکر کے ساتھ ہندوستان کے قلب میں معرکہ آرا ہونے کے لئے بگولے اور آندھی کی طرح تیزی سے

چلا آتا ہے۔ اس کے مقابلہ کی تیاریوں کے لئے اب وقت کہاں تھا۔ محمود
اپنے شان دار رسالے کے ساتھ قنوج پر جو وادی گنگا میں واقع ہے
صاعقہ کی طرح جا پڑا۔"

محمود کی صفتِ خطا بخشی

قنوج کا راجہ کنور رائے محمود کی صفتِ خطا بخشی سے واقف تھا اور اُس کو معلوم تھا کہ مسلمانوں کے عادات واخلاق کا یہ امتیازی نشان ہے کہ وہ ہر معافی مانگنے والے کو ضرور معاف کر دیتے ہیں لہٰذا اُس نے یہی مناسب سمجھا کہ اپنے گلے میں دوپٹہ ڈال کر اور اپنے ہاتھ رومال سے بندھوا کر معہ اپنے بیٹوں اور قریبی رشتہ داروں کے محمود کے سامنے آکھڑا ہوا۔ محمود نے یہ دیکھ کر فوراً اُس کے ہاتھ کھولے گلے سے لگایا۔ اور اپنے برابر تخت پر بٹھایا اور ہر طرح تسلی وتشفی دے کر رخصت کیا۔ جو حملہ اس محنت اور اس جاں فروشی ومصیبت کے ساتھ کیا گیا تھا وہ راجہ کے معافی مانگ لینے سے ایک منٹ کے اندر ختم ہوگیا۔ اب اس کو محمود کی ہندوکشی کہہ لو یا ہندو نوازی سمجھ لو۔ راجہ کنور رائے والیٔ قنوج نے سلطان محمود اور اُس کے لشکر کی ضیافت کی۔ جو سلطان غزنی سے اُس کی سزا دہی کا ارادہ کر کے چلا تھا وہ اب اُس کا مہمان عزیز بن کر قنوج میں داخل ہوا۔ اور تین روز یا آٹھ روز تک راجہ کا مہمان رہا محمود اور اُس کی فوج کے سردار قنوج میں اس طرح سیر کرتے ہوئے پھرتے تھے جیسے اپنے وطن اور بھائیوں میں ہوتے۔ راجہ کی بے بسی کوئی پوشیدہ بات نہ تھی اُس نے نہایت مجبوری کے عالم میں محمود سے امان طلب کی محمود اگر ویسا ہی ہوتا جیسا کہ ہمارے اسکولوں اور کالجوں کے طالب علم اپنی کتابوں میں پڑھتے ہیں تو وہ ہرگز راجہ کو معاف نہیں کر سکتا تھا بلکہ اُس کو نہایت زریں موقع ملا تھا کہ وہ راجہ کو قید یا قتل کر کے قنوج میں قتل عام کا حکم دیتا۔ قنوج کے مندروں کو لوٹتا اور وہاں کا تمام مال واسباب گاڑیوں، چھکڑوں اور اونٹوں پر لاد کر غزنی کو لے جاتا۔ قنوج اُس زمانہ میں اپنا نظیر نہ رکھتا تھا۔ جس قدر مال ودولت قنوج سے ہاتھ آسکتا تھا ہندوستان کے دوسرے شہروں سے ہرگز اس قدر مال ودولت کے حصول کی توقع نہیں تھی مگر محمود کی وجہ سے قنوج میں کسی کی نکسیر تک نہیں پھوٹی۔ محمود نے راجہ کنور رائے کی دوستی کو بہت قیمتی چیز سمجھا اور اُس سے دوستی ومحبت کے پیمان مستحکم کر کے اور مخالفانہ سازشی تحریکوں

بچے رہنے کا اقرار لے کر اور ارد گرد کے سازشی مرکزوں کا پتہ لگا کر قنوج سے روانہ ہوا۔
اس جگہ ایک ہندو مورخ لالہ بابو رام صاحب خلف لالہ اجودھیا پرشاد صاحب کے الفاظ بھی ملاحظہ ہوں جو انھوں نے اپنی تاریخ موسومہ "مختصر سیر گلشن ہند" میں لکھے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ:-

"محمود اس مرتبہ اپنا لشکر اچانک قنوج کے سامنے لے آیا مہاراجہ قنوج سے کچھ نہ ہو سکا فوراً معہ عیال و اطفال کے دربار سلطانی میں حاضر ہوا اور اطاعت بادشاہ کی قبول کر لی۔ محمود نے راجہ قنوج کی بڑی عزت اور توقیر کی اور تین روز تک قنوج میں مقیم رہ کر راجہ قنوج کا مہمان رہا وقت رخصت کے بادشاہ نے راجہ سے اقرار کیا کہ اگر تم اور تمھارے وارث ہم سے سرکش نہ ہوں گے تو جب تم یا تمھارے وارث مدد سلطانی چاہیں گے فوراً غزنی سے ملے گی۔ چنانچہ راجہ قنوج کو ہر طرح سے تسلی دے کر متھرا میں داخل ہوا۔"

یہ وہی قنوج ہے جس کے راجہ نے خلیفہ ہارون الرشید کے پاس اپنا طبیب بھیجا تھا اور جہاں مسلمانوں کی آمد و رفت سیکڑوں برس پہلے پائی جاتی تھی مگر اُس زمانہ میں کوئی عام مسلم کش تحریک ہندوستان میں موجود نہ تھی قنوج کا راجہ محمود کے خلاف انند پال اور اُس کے باپ کی امداد کر کے نتیجہ دیکھ چکا تھا اُس نے اب محمود کے آگے سپر ڈال کر اور تعلقات دوستی پیدا کر کے اپنی دانائی اور عقلمندی کا ثبوت دیا۔ تاریخ فرشتہ کی روایت کے موافق محمود قنوج سے رخصت ہو کر اول میرٹھ پھر مہابن اور اُس کے بعد متھرا گیا لیکن طبقات اکبری میں لکھا ہے کہ قنوج سے بلند شہر (برن)، اور بلند شہر سے مہابن اور متھرا گیا۔ بہر حال قنوج کی طرف سے مطمئن ہو کر محمود نے قریب قریب کے تمام سرکشوں کو ٹھیک بنانا اور مرعوب کرنا ضروری سمجھا۔

مختلف راجاؤں کی اطاعت

چنانچہ وہ راجہ ہردت پر حملہ آور ہوا۔ ہردت اپنے سرداروں کو معہ فوج قلعہ میں چھوڑ کر اور خود فرار ہو کر جنگل میں جا چھپا۔ ہردت کے سرداروں نے تیس ہاتھی اور بہت سا روپیہ بطور نذرانہ سلطان کی خدمت میں پیش کر کے امان طلب کی سلطان نے یہ نذرانہ قبول کر کے وہاں سے مہابن کے راجہ کلچند ر پر حملہ کیا اُس نے اول مقابلہ کیا پھر شکست کھا کر بھاگا اور اپنے ہاتھی کو

جمنا کے پار سے جانا چاہا کہ اتنے میں سلطانی لشکر نے اُس کو گرفتار کر لیا کلچند نے اسی حالت میں خودکشی کر کے اپنی جان گنوائی۔ محمود نے مہابن سے اُن لوگوں کو جو مایۂ شرارت تھے گرفتار کر کے متھرا پر حملہ کیا۔ یہاں اُس نے ایک مندر کو توڑا باقی سیکڑوں مندر جو یہاں موجود تھے اُن کو ہاتھ نہیں لگایا۔ یہاں سے بھی اُس نے خاص خاص آدمیوں کو اپنے ہندو ہمراہیوں کی ہدایات و اطلاعات کے بموجب گرفتار کیا۔ یہاں اُس نے بعض بتوں کو بھی توڑا اس جگہ چند روز قیام کرنے کے بعد وہ مشرق کی جانب مقام اسوتی (ضلع فتحپور) کے راجہ چنڈیل بھور یا چندر پال کی طرف متوجہ ہوا اس راجہ نے اپنے اندر مقابلہ کی طاقت نہ دیکھ کر راہِ فرار اختیار کی اور جنگلوں میں جا چھپا لیکن سلطان کے پاس تحف و ہدایا اور اطاعت و فرماں برداری کا اقرار نامہ بھیج دیا جس سے سلطان کا طیش و غضب فرو ہو گیا۔ اس کے بعد سلطان راجہ چندر رائے کی طرف متوجہ ہوا اُس نے بھی چندر پال کی روش اختیار کی۔ سلطان نے اُس کا قصور معاف کیا اور ایک مشہور ہاتھی جو اُس کے پاس تھا لے کر واپس ہوا یہ تمام راجہ جن پر اس مرتبہ سلطان نے حملہ کیا وہی تھے جو سلطان محمود کا مقابلہ انند پال کے حامی بن کر پشاور کے میدان میں کر چکے تھے۔ انند پال نے تو اطاعت قبول کر لی تھی اور اب اُس کا بیٹا بھے پال ثانی بھی مطیع و فرماں بردار تھا۔ پس ان راجاؤں کو مطیع و منقاد بنانا اور ان سب سے بھی اقرار طاعت لینا یا کم از کم اُس حملۂ پشاور کا عوض لینا سلطان محمود کا حق تھا۔ لیکن اگر بہ نظر غور دیکھا جائے تو سلطان کو درحقیقت اُس سازش کا مٹانا مقصود تھا۔ جس نے ہندو مسلم منافرت پیدا کر کے بدامنی اور ہنگامہ آرائی کے ذریعہ قرامطہ کو تقویت پہنچائی تھی۔ سلطان محمود بجائے اس کے کہ ہندو راجاؤں کو قتل و ذلیل کرے اُن سے صلح کرنے کا زیادہ شائق تھا۔ اس حملہ میں کشمیر کا راجہ معہ اپنی فوج کے سلطان کی ہمراہی میں موجود تھا۔ سلطان کی فوج میں بھی کافی ہندو ملازم تھے۔ ان ہندو دوستوں کی موجودگی میں محمود کیا کوئی بھی تھوڑی سی عقل رکھنے والا بادشاہ کوئی ایسی کارروائی نہیں کر سکتا تھا جو اُس کے دوستوں کی دل شکنی کا موجب ہوتی۔ حالانکہ محمود تو ہر ایک ہندو راجہ کی طرف مصالحت اور دوستی کا ہاتھ بڑھانے کو ہمیشہ مستعد رہتا اور کسی پیغام صلح کو کبھی رد کرنا نہ چاہتا تھا متھرا و مہابن وغیرہ میں اُس نے جو کچھ کیا وہ یقیناً مصالح ملکی اور عدل و استحقاق کے عین موافق تھا اور ان تمام کارروائیوں کا سبب ہرگز کوئی مذہبی منافرت

اور بے جا تعصب نہ تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو محمود اپنی ہندو فوج اور ہندو سرداروں پر ہرگز وہ اعتماد نہ کرتا جو اُس نے ہمیشہ کیا، اور نہ ہندو اُس کے لئے وہ ہمدردی اور جانفشانی دکھاتے جو اُنھوں نے دکھائی اور جس کا بیان آگے آئے گا۔

مالِ غنیمت سبحان رائے اپنی کتاب خلاصۃ التواریخ میں تمام نذرانوں اور اُس تمام مال و اسباب کی میزان لکھتا ہے جو سلطان محمود اور اُس کی فوج کو اس سفر میں حاصل ہوا اور جس کا غزنی پہنچ کر جائزہ لیا گیا سبحان رائے کے الفاظ اس مال و دولت کی نسبت یہ ہیں کہ

"چوں بغزنی رسید غنائم سفر قنوج بشمار درآمد پنج لک و بست ہزار درم و سی صد و پنجاہ فیل بقلم درآمد"

پانچ لاکھ بیس ہزار درم آج کل کے ڈیڑھ لاکھ روپیہ کے برابر ہوتے ہیں اس کے علاوہ ساڑھے تین سو ہاتھی ہیں۔ اس مالِ غنیمت اور خراج کے مجموعہ کو دیکھو اور اس بات کو سوچو کہ سلطان محمود کس قدر فوج لے کر آیا ہے سات آٹھ راجاؤں کو اُس نے شکست دی ہے کئی شہروں کو لوٹا اور کئی راجاؤں سے خراج و نذرانہ وصول کیا ہے اور سب کی میزان وہ ہے جو سبحان رائے کے الفاظ میں اوپر نقل کی گئی ہے کیا یہ کسی بہت بڑی لوٹ مار کی میزان ہوسکتی ہے؟ اس میزان میں متھرا و مہابن کے سونے چاندی کے بُت اور اُن شہروں کی لوٹ مار کا مال سبھی کچھ شامل ہے اور یہی محمود کا وہ حملہ ہے جس کی سب سے زیادہ ہندوؤں اور یورپی مورخوں کو شکایت ہے اور اسی حملہ کو اُس کی غارت گری کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے۔ اوپر جو تعداد مالِ غنیمت کی لکھی گئی ہے وہ ایک ہندو مورخ کی روایت ہے مگر فرشتہ نے اس تعداد کو ان الفاظ میں لکھا ہے۔

"چوں بغزنی رسید غنائم سفر قنوج را شمار کردند بست ہزار دینار و ہزاران ہزار درم بشمار درآید"

اس طرح پندرہ لاکھ روپے کے دینار اور ہزارہا درم ہوتے ہیں۔ اس تعداد کو کتنا ہی بڑھا لیجئے پھر بھی بیس پچیس لاکھ روپے سے زیادہ فرض نہیں کر سکتے۔ میرے وطن نجیب آباد کی نسبت تاریخ امیرنامہ میں لکھا ہے کہ جب نواب امیرخان بانئ ریاست ٹونک نے انگریزوں کو پریشان کرنے کے لئے روہیلکھنڈ میں آکر لوٹ مار مچائی اور

جنرل اسکاٹ کو پریشان و مبہوت رکھا تو اُسی زمانہ میں نواب امیر خاں اپنی تمام فوج کو نگینہ میں چھوڑ کر صرف چار پانچ ہزار سواروں کے ساتھ نجیب آباد آئے اور دو کروڑ روپیہ یہاں سے لوٹ کرلے گئے یہ وہ زمانہ تھا کہ نجیب آباد کا بڑا حصہ ویران ہو چکا تھا کوئی نواب یا حاکم موجود نہ تھا اس واقعہ کو اس قدر معمولی اور نا قابل تذکرہ واقعہ سمجھا جاتا ہے کہ نجیب آباد والوں کی زبان پر بھی اس کا چرچا نہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ نواب امیر خاں کے دو کروڑ روپے کے مقابلے میں سلطان محمود غزنوی کے ڈیڑھ لاکھ یا زیادہ سے زیادہ بیس پچیس لاکھ روپے کی کیا حقیقت ہے جس کے لئے ربع مسکون میں ایک شور برپا ہے۔

جنگی قیدیوں کی تعداد

سجان رائے نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس حملہ میں محمود غزنوی ترپن ہزار آدمیوں کو گرفتار کرکے لے گیا اگر یہ تعداد صحیح تسلیم کرلی جائے تو محمود غزنوی سے بڑی غلطی ہوئی کہ وہ ان ترپن ہزار آدمیوں کے سال بھر کے کھانے کا خرچ بھی ہندوستان سے لے کر نہ گیا۔ بات صرف یہ ہے کہ وہ فسادی اور شرارت پیشہ لوگوں کو یہاں سے گرفتار کرکے لے گیا تھا اور وہاں لے جا کر اُس نے اُن کو نواح غزنی اور شہر غزنی میں آباد کر دیا تھا یہ ایک بہت بڑی سیاسی تدبیر اور ملکداری کا تقاضا تھا۔ آج کل بھی حکومتوں کو جب ضرورت پیش آتی ہے تو وہ جرائم پیشہ لوگوں کو ایک جگہ سے ترک سکونت کرا کر دوسری جگہ آباد کرا دیتے ہیں اور اس طرح یہ جرائم پیشہ لوگ بہت ہی مفید گروہ ثابت ہو جاتے ہیں اگر محمود کو محض ہندو ہونے کی وجہ سے ہندوؤں کے پکڑنے اور لے جانے کا شوق ہوتا تو وہ تھانیسر، متھرا اور مہابن ہی کو اس کام کے لئے انتخاب نہ کرتا بلکہ پنجاب کے شہروں سے جو نسبتاً بہت قریب تھے لوگوں کو پکڑ پکڑ کرلے جاتا۔ بات یہ ہے کہ اُس نے چُن چُن کر جرائم پیشہ اور فسادی لوگوں کو مع اہل و عیال اپنے ساتھ غزنی چلنے پر مجبور کیا تھا اور آئندہ چل کر ثابت ہوگا کہ ان لوگوں کو وہاں کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ سلطان محمود کی غرض قنوج و متھرا وغیرہ کے حملے سے صرف یہ تھی کہ ان راجاؤں کو جنھوں نے اُس کے خلاف فوج کشی کی تھی سزا دے کر اپنا رعب قائم کرے اور سازشی لوگوں کو جو اصلی خطاوار تھے گرفتار و قتل کرے ملک گیری اُس کا مقصد نہ تھا وہ صرف ملک پنجاب کو ایک ایسی ریاست بنا کر رکھنا چاہتا تھا جس کا راجہ محمود کا ہوا خواہ رہے۔ اور سلطنت غزنی پر ہندوستان کی طرف سے کوئی حملہ نہ ہو سکے۔ حملۂ قنوج کے بعد اُس کی یہ غرض حسب دل خواہ پوری

ہوچکی تھی اور اب اُس کو پنجاب کی طرف سے حملہ کا کوئی خطرہ نہ رہا تھا اس کے بعد وہ ملتان وسندھ کی جانب اُس طرف کے خطرہ کو مٹانے کے لئے متوجہ ہوتا لیکن کالنجر کے راجہ نے اُس کو پھر مشرقی ہندوستان کی طرف حملہ آور ہونے کے لئے مجبور کیا۔

کالنجر پر حملہ پنجاب کا الحاق کالنجر کی اطاعت

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ہندوستان سے محمود کے چلے جانے کے بعد کالنجر کے راجہ نندا نے قنوج۔متھرا۔مہابن۔میرٹھ برن وغیرہ کے راجاؤں کو ملامت آمیز خطوط لکھے اور محمود کے اس طرح آنے اور کامیاب واپس چلے جانے کو ان راجاؤں کی بزدلی و نامردی پر محمول کر کے غیرتیں دلائیں۔ قنوج کا راجہ کنور رائے اُس قول وقرار پر جو اُس نے محمود سے کیا تھا قائم رہا لیکن باقی راجاؤں نے نندا کی بلند ہمتی اور عالی حوصلگی کر کے آئندہ کیلئے مستعد ہونے اور نندا کی رہبری میں کام کرنے کا وعدہ کیا۔ نندا نے ان راجاؤں کو اپنے مُوافق اور مستعد دیکھکر قنوج پر چڑھائی کی اور ساتھ ہی پنجاب کے راجہ جیپال ثانی کو لعنت ملامت کا خط لکھکر محمود کے مقابلے پر مستعد ہونے کی ترغیب دی۔ قنوج کے راجہ نے اپنے آپ کو خطرہ میں مبتلا دیکھ کر غزنی کی جانب قاصد روانہ کیا اور سلطان سے امداد طلب کی۔ سلطان محمود اس حادثہ سے مطلع ہوکر ۴۰۹ھ میں فوراً قنوج کی جانب روانہ ہوا۔ جے پال ثانی چونکہ نندا کی ترغیب اور تمام راجاؤں کے متحد ہوکر مستعد مقابلہ ہونے کا حال سننے سے بغاوت پر آمادہ ہوچکا تھا اُس نے سلطان کو تھوڑی سی فوج کے ساتھ پنجاب میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ کر روکنا اور مقابلہ کرنا چاہا کہ اس طرح باپ دادا کی کھوئی ہوئی عزت وشہرت کو بآسانی حاصل کر سکے۔ مگر سلطانی لشکر نے ایک ہی حملے میں پنجابی لشکر کو بھگا دیا اور بھگوڑوں کا تعاقب کئے بغیر قنوج کی طرف تیز رفتاری سے سفر کو جاری رکھا تاکہ قنوج کے راجا کنور رائے کو جلد از جلد امداد پہنچائی جا سکے مگر سلطان محمود کے پہنچنے سے پہلے ہی قنوج کا راجا نندا کے مقابلے میں مارا جاچکا تھا۔ سلطان جب قنوج پہنچا ہے تو نندا قنوج سے کالنجر کی طرف روانہ ہوچکا تھا۔ سلطان نے اُس کو حدود کالنجر میں جالیا۔ نندا نے چھتیس ہزار سوار اور پینتالیس ہزار پیادے اور چھ سو چالیس جنگی ہاتھی لے کر مقابلہ پر ڈٹ گیا۔ سلطان کے ہمراہ بہت ہی تھوڑی سی فوج تھی۔ جو اس دو منزلہ اور سہ منزلہ یلغار میں بمشکل ساتھ دے سکتی تھی۔ نندا کے مقابل سلطانی لشکر خیمہ زن ہوا اور سلطان نے ایک اونچے ٹیلے پر چڑھ کر نندا کے لشکر کو دیکھا تو اُس کی کثرت وشوکت دیکھ کر اس قدر

دور دراز مقام پر اتنی تھوڑی فوج کے ساتھ آنے سے پشیمان ہوا اور خدائے تعالٰے سے دعا مانگی۔ اس روز دن آخر ہونے کی وجہ سے لڑائی نہیں چھڑی۔ رات کو لشکر نے خیمہ زن ہو کر آرام کیا صبح ہونے پر دیکھا تو معلوم ہوا کہ نندا کے دل پر اس قدر خوف طاری ہوا کہ وہ اپنا تمام سامان وہیں چھوڑ کر اور اپنی جان بچا کر صبح ہونے سے پہلے ہی فرار ہو گیا ہے سلطان نے جب نندا اور اُس کے لشکر کو بھاگتے ہوئے دیکھا تو اول کمین گاہوں کی دیکھ بھال اور جانچ پڑتال کا حکم دیا کہ کہیں ہندوؤں نے کوئی جنگی چال تو نہیں چلی۔ جب راجہ کے بھاگ جانے کا یقین ہو گیا تو سلطان نے اپنی فوج کو تعاقب کرنے اور مالِ غنیمت حاصل کرنے کی اجازت دی۔ تھوڑی دور تک نندا کا تعاقب ہوا اور اس تعاقب میں پانسو اسی جنگی ہاتھی سلطانی فوج نے نندا کے آدمیوں سے چھینے۔ بہت سا سامان اور خزانہ جو نندا قنوج سے لایا تھا سب سلطان کے قبضہ میں آیا مگر نندا تیز رفتاری سے جان بچا کر نکل گیا اور سلطان نے اس کا زیادہ تعاقب کرنا مناسب نہ سمجھا اسی فتح کو کافی سمجھ کر وہاں سے غزنی کی جانب واپس ہوا کیونکہ اُس کو اب جے پال ثانی کی طرف سے خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔

پنجاب کا حکومتِ اسلامیہ میں شمول

غزنی پہنچ کر سلطان نے ارادہ کیا کہ پنجاب کو حکومت اسلامیہ میں شامل کر لیا جائے۔ جے پال ثانی کی حرکات ناشائستہ نے اُس کو اس قابل ہی نہ رکھا تھا کہ اُس کے ساتھ کوئی رعایت مرعی رکھی جائے۔ مگر سلطان کو تقریباً دو سال تک سوات اور بونیر کی طرف مصروف و متوجہ رہنا پڑا۔ وہاں سے مطمئن ہو کر ۴۱۲ھ میں سلطان نے پنجاب و لاہور کا قصد کیا۔ جے پال ثانی تاب مقاومت نہ لا کر لاہور سے اجمیر کی جانب فرار ہوا کیونکہ اب وہ کشمیر کی جانب پناہ گزیں نہیں ہو سکتا تھا یہاں کا راجہ پہلے ہی سلطان کا حلقہ بگوش بن چکا تھا۔ سلطان نے لاہور میں داخل ہو کر قیام کیا پنجاب کے اضلاع میں عامل مقرر کر کے اپنے نام کا سکہ خطبہ جاری کیا اور اس وقت سے پنجاب سلطنت غزنی میں شامل ہوا۔ یہ کام سلطان اب سے بہت پہلے بھی کر سکتا تھا مگر اُس نے نہ چاہا کہ یہاں کے قدیمی حکمراں خاندان کو محروم و مستاصل کرے۔ اُس نے بار بار خطائیں دیکھ کر بار بار معافی دی اور عفو و درگذر سے کام لیا۔ اس عفو و درگذر کی مثالیں دوسری قوموں کی تاریخ میں ہرگز دستیاب نہیں ہو سکتیں مگر حیرت ہے کہ محمود کو ظالم اور ڈاکو کا خطاب دیا جاتا ہے۔ محمود لاہور میں اپنے عزیز غلام ایاز کو پنجاب کا صوبہ دار

جنا کر غزنی کی جانب چلا گیا۔ پنجاب کے اس پہلے مسلمان گورنر کی (جو کشمیری النسل تھا) قبر لاہور کی کنک منڈی کے متصل آج تک موجود ہے۔

والئ کالنجر کی اطاعت

۴۱۳ھ میں سلطان نے ایک زبردست لشکر ہمراہ لے کر نندا کی سرکوبی کے لئے غزنی سے کوچ کیا۔ راستے میں گوالیار کے راجہ نے محمود کے لشکر کو روکا اور مقابلہ پر مستعد ہوا لیکن اُس کو بہت جلد معلوم ہو گیا کہ محمود کی اطاعت ہی موجب فلاح و بہبود ہے چنانچہ اُس نے پینتیس ہاتھی سلطان کی خدمت میں بطور نذرانہ بھیج کر امان طلب کی اور آئندہ مطیع و منقاد رہنے کا وعدہ کیا۔ گوالیار سے سلطان کالنجر کی طرف روانہ ہوا۔ کالنجر کا راجہ نندا قلعہ بند ہو بیٹھا۔ سلطان نے قلعہ کا محاصرہ کیا چند روز کے بعد راجہ نے عاجز ہو کر بعد راجہ نے عاجز ہو کر درخواست بھیجی کہ تین سو ہاتھی مجھ سے بطور نذرانہ قبول فرما کر میری جان بخشی اور تاج بخشی فرمائی جائے۔ سلطان محمود کبھی کسی کی درخواست صلح یا اقرار اطاعت کو رد نہیں فرماتا تھا چنانچہ اُس نے راجہ کی یہ درخواست منظور کر لی۔ راجہ نے تین سو ہاتھی خالی بلا مہاوتوں کے قلعہ کے دروازے سے باہر نکال دیئے سلطان نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ اُن کو پکڑ لو چنانچہ سلطانی بہادروں نے بلا خوف وخطران ہاتھیوں کو قابو میں کر لیا اور قلعہ والے جو اوپر سے تماشا دیکھ رہے تھے محمودی سپاہیوں کی چابک دستی و مستعدی دیکھ کر حیران رہ گئے۔ اگلے دن راجہ نے سلطان محمود کی مدح میں ایک قصیدہ لکھ کر بھیجا سلطان نے یہ قصیدہ اپنے اُن ہمراہیوں کو جو ہندی زبان جانتے تھے دکھایا اور ہندی زبان کے مُسَلّم انشاپردازوں سے نندا کی شاعری کا مرتبہ دریافت کیا۔ ان لوگوں نے سلطان کو قصیدہ کا ترجمہ سُنایا اور نندا کی شاعری کی تعریف کی۔ سلطان نے خوش ہو کر اس مدحیہ قصیدے کے صلے میں پندرہ قلعے ریاست کالنجر میں اپنی طرف سے شامل کئے راجہ نندا نے اس گراں سنگ انعام سے مفتخر ہو کر بہت سے قیمتی تحائف اور نذرانے سلطان کی خدمت میں بھیجے۔ سجان رائے لکھتا ہے کہ

"راجہ نندا شعر ہندی بعبارت متین و استعارات رنگین کہ پسندیدۂ شعر فہمان خردگزین و گزیدۂ سخن دان دانش آئین بودہ باشد در مدح سلطان نوشتہ ارسال داشت زباندانان ہند مضمون آں را بعرض رسانیدند سلطان مسرت اندوز گشتہ تحسین نمود و بجلدوئے آں منشور حکومت پانزدہ قلعہ ضمیمہ کالنجر

نمودہ با تحف دیگر مرحمت فرمود راجہ نندا نیز مال بسیار و جواہر بے شمار
در عوض آں بخدمت سلطان مرسل نمود و سلطان بعد صلح بغزنی معاودت کرد۔"

اس کے بعد سلطان محمود کو پنجاب کے مشرقی ملکوں میں آنے کی ضرورت پیش نہیں آئی اور راجہ نندا ہمیشہ سلطان محمود کا مطیع و فرماں بردار اور ہمدرد و مداح رہا۔ محمود کو بھی اُس پر اس قدر اعتماد تھا کہ دو برس کے بعد ۴۱۶ھ میں جب سلجوقیوں نے شمالی خراسان اور ماوراءالنہر میں خروج کیا تو محمود نے سلجوق اعظم کے بیٹے اسرائیل کو گرفتار کر کے نندا کے پاس کالنجر میں بھیج دیا کہ اس کو اپنے قلعہ میں نظر بند رکھو۔ اسرائیل بن سلجوق سات برس تک کالنجر کے قلعہ میں نظر بند رہا اور ۴۲۱ھ میں سلطان محمود کی وفات کے بعد سلطان مسعود بن محمود کے حکم سے رہا ہو کر غزنی اور وہاں سے اپنے قبیلہ میں گیا یہ وہی اسرائیل بن سلجوق ہے جس کی اولاد میں ساتویں صدی ہجری کے آخر تک ایشیائے کوچک کی حکومت و سلطنت رہی اور اُن کے جانشین سلاطین عثمانیہ ہوئے۔ ایک مسلمان اور زبردست سلجوقی سردار کا کالنجر کے قلعہ میں قید رکھنا دلیل اس بات کی ہے کہ محمود کو کالنجر کے راجہ کی فرماں برداری پر پورا پورا اعتماد تھا اور کالنجر کا راجہ نہ صرف محمود بلکہ اُس کے بیٹے کا بھی فرماں پذیر رہا۔ جس سال اسرائیل بن سلجوق کو گرفتار کر کے کالنجر میں قید رہنے کے لئے بھیجا ہے اُسی سال ماوراءالنہر کے حاکم علی تگین کو بھی گرفتار کر کے اسی قلعہ میں بھیجا گیا تھا چنانچہ علی تگین بحالتِ قید کالنجر ہی میں فوت ہوا۔ احمد بن حسن میمندی وزیر اعظم بھی اسی قلعہ میں قید کیا گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلطان محمود نے کالنجر کو کالا پانی بنا رکھا تھا۔

سومنات پر حملہ

علی تگین کے فتنہ سے فارغ ہو کر سلطان غزنی میں آیا تو اُس کے پاس خبر پہنچی کہ متھرا و مہابن اور تھانیسر کے برہمنوں نے اپنے دوسرے مرکز سومنات (ملک گجرات) میں جا کر پناہ لی ہے اور گجرات کے راجہ کی سرپرستی میں انواع و اقسام کی فریب دینے والی باتیں شائع کر رہے ہیں نیز سندھ و فارس و گجرات کے بقیۃ السیف قرامطہ بھی اسی حلقہ فراہم ہو گئے ہیں اور اُنھوں نے فرماں روائے مصر سے خط و کتابت شروع کر دی ہے۔ سومنات کا ذکر حملہ محمودی سے پہلے ہندوستان کی ملکی و مذہبی تاریخ میں نہیں آتا۔ ممکن ہے کہ اس جگہ پہلے سے کوئی معمولی اور غیر مشہور مندر ہو لیکن وہ کوئی مرکزی بت خانہ نہ تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو چینی سیاح بھی اس کا ذکر کرتا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے

کہ تھانیسر کے بت ستوم جگ کی بجائے سومنات کو قائم کیا گیا تھا۔ یا یہ کہ سوم جگ اور سومنات دونوں کی بنیاد ساتھ ہی ساتھ دو مختلف مقامات میں رکھی گئی تھی۔ ان دونوں بتوں یا بت خانوں کے نام میں لفظ سوم موجود ہے جو دلیل اس بات کی ہے کہ یہ مندر یا یہ بت چاند سے منسوب تھے۔ سورج گرہن اور چاند گرہن کے موقع پر سوم جگ اور سومنات دونوں مندروں میں یکساں پرستش ہوتی تھی۔ اُدھر ملکِ عرب کے تمام مشرکوں میں چاند کے بت کو عام طور پر فضیلت حاصل تھی۔ قرامطۂ بحرین کی رعایت کبھی سوم (چاند) کے بت میں مدِّ نظر رکھی گئی ہو تو تعجب نہیں سومنات کی نسبت سجان رائے لکھتا ہے کہ

"گویند در زمان پیغمبرؐ آں بت را از خانۂ کعبہ بر آوردہ درآں جا گذاشتہ اند"

برہمنوں نے تمام ملک میں اس بات کو شہرت دی تھی کہ سومنات کا بت تھانیسر اور متھرا کے بتوں سے ناراض تھا لہٰذا اُس نے موقع دیا کہ محمود اُن بتوں کو توڑ دے اور اسی لئے سومنات نے محمود کی مخالفت میں کوئی کام نہیں کیا۔ لیکن اب سومنات ایک چشم زدن میں محمود کا کام تمام کر دے گا کیونکہ وہ تمام بتوں کا بادشاہ ہے اور سمندر اُس کی عبادت کے لئے مقررہ اوقات میں حاضر ہوتا ہے چونکہ سومنات بالکل سمندر کے کنارے گجرات کے جنوبی ساحل پر واقع ہوا تھا لہٰذا جوار بھاٹے کے وقت سمندر کا پانی کبھی مندر کی دیواروں سے آکر ٹکراتا اور کبھی میلوں فاصلے پر چلا جاتا تھا۔ جوار بھاٹا سمندر میں چاند کی گردش سے قمری مہینے کی مقررہ تاریخوں میں چونکہ آتا ہے اس لئے مقررہ اوقات میں سمندر کے پانی کا مندر تک آنا سمندر کا بت کی عبادت کے لئے آنا بیان کیا گیا اور شمالی ہند اور دور دراز کے رہنے والوں کو یہاں لا لا کر اور سمندر کے اس طرح برائے عبادت آنے کا تماشا دکھا کر معتقد بنایا گیا۔ یہ لوگ چونکہ ساحل سمندر کے رہنے والے نہ تھے اُنھوں نے اس نظارہ کو دیکھ کر بت کی عظمت بلا تامل تسلیم کر لی اور اپنے اپنے شہروں میں جا کر دوسروں کو یہ حال سُنایا اور سومنات پہنچنے کی ترغیب دی۔ شمالی ہند کے لوگوں کا تانتا بندھ گیا اور لوگ ہردوار سے گنگا کا پانی لے لے کر سومنات کے بت پر چڑھانے کے لئے پہنچنے لگے چنانچہ راجہ شیو پرشاد ستارۂ ہند نے اپنی کتاب میں صاف طور پر اس بات کا اقرار کیا ہے کہ ہر روز گنگا کا پانی سومنات پر چڑھانے کے لئے پہنچتا تھا۔ اب قیاس کر لیجئے کہ ہردوار سے سومنات تک کتنے میدان و ریگستان و کوہستان ہیں اور کتنے راجاؤں کی حکومتیں راستے میں پڑتی ہوں گی۔ یہی وجہ تھی کہ یک لخت تمام ہندوستان میں سومنات کی شہرت ہو گئی اور سومنات کو محمود سے انتقام

یلنے والا ظاہر کرکے اُس سازش مردہ میں جس کو محمود فنا کر چکا تھا از سرِ نو جان ڈالنے کی کوشش کی گئی اور سومنات کی نسبت عجیب عجیب قسم کے عقیدے تراشے گئے۔ ابوالقاسم فرشتہ لکھتا ہے کہ

"در ہماں سال کہ خمس و عشرو اربعمائہ باشد بعرض محمود رسانیدند کہ اہل ہنود میگوئند کہ ارواح بعد از مفارقت ابدان بخدمت سومنات می آئند و او ہر یکے را از ارواح ببدنے کہ لائق می داند حوالہ نماید اما بطریق تناسخ و ہم چنیں معتقد اے شاں در حق سومنات آنست کہ مد و جزر دریا از برائے عبادت اوست و براہمہ می گویند کہ چوں سومنات از اں بتہا کہ سلطان محمود شکستہ است رنجیدہ بود حمایت ایشاں نہ کرد والا دریک چشم زدن ہر کرا بخواہد ہلاک می تواند ساخت۔"

غزانامۂ مسعود مصنفہ عنایت حسین بلگرامی میں حملہ سومنات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"ایک روز سلطان نے جہاد سومنات میں پہلوان لشکر سالار ساہو سے مشورہ لیا کہ ستیہرہ میں ہمارے جہاد کرنے سے ہنود نے یہ بات بنائی کہ سومنات کی خفگی سے بتانِ ہند پر آفت آئی ورنہ سومنات لشکر شاہ کو تباہ کرتا فوج کو خاک سیاہ کرتا اس وجہ سے ہم کو زعم ہنود باطل کرنا منظور ہے بُت سومنات کو توڑنا ضرور ہے۔"

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سومنات کا مندر کرشن کے زمانہ سے قائم تھا اور اسی لئے متھرا و تھانیسر و مہابن کے لوگوں کو اس مندر سے قدیمی تعلق تھا کیونکہ یہ لوگ دوارکا (گجرات) کی عظمت ہردوار و متھرا سے کم نہ سمجھتے تھے۔ اس مندر میں پانسو نوجوان لڑکیاں سومنات کی خدمت کے لئے ایسی موجود رہتی تھیں جو راجاؤں اور بڑے بڑے ہندو سرداروں کی بیٹیاں تھیں۔ دو ہزار برہمن اس مندر کے پجاری تھے جو رات دن وہیں مصروفِ جرس نوازی رہتے تھے۔ اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ سومنات میں کس قدر لوگوں کا ہجوم رہتا ہوگا۔ یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ جب محمود غزنوی سومنات کے قریب پہنچا ہے تو مندر اور شہر میں ایک نہایت زبردست فوج کو مقابلہ پر مستعد پایا۔ یہ فوج اور جنگی سامان کسی مندر یا عبادت گاہ کے لئے جزو لازم نہیں ہو سکتے تھے۔

سومنات پر حملے کی وجوہ

سومنات میں ایک نہایت زبردست جنگی طاقت کا موجود ہونا کافی دلیل اس بات کی ہے کہ یہ کوئی نہایت اہم

سازشی مرکز تھا اور اسی سے سلطان محمود غزنوی کے حملہ آور ہونے کی وجہ سمجھ میں آ سکتی ہے۔ ملکم صاحب نے سومنات کے مندر کی نسبت ایک اور بھی نئی بات لکھی ہے وہ لکھتے ہیں کہ

"یہ مندر وہ تھا جس کے پجاری سومنات کے زور و قوت پر فخر کرتے تھے اور شمالی ہندوستان کے باشندوں کی ستم شعاری بدکرداری اور وہاں کے دیوتاؤں کے ضعف و ناتوانی کو وہاں کی آفتوں اور مصیبتوں کا باعث بتاتے تھے۔"

اگر ملکم صاحب کے اس بیان کو صحیح سمجھ لیا جائے تو سلطان محمود کے اس حملہ کی ایک نئی وجہ یہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ خود شمالی ہندوستان کے ہندوؤں ہی نے سلطان محمود کو سومنات پر حملہ کرنے کی ترغیب دی ہوگی اور انھوں ہی نے سومنات کی نسبت ایسی ایسی خبریں سلطان تک پہنچائی ہوں گی کہ وہ حملہ آور ہونے پر مجبور ہو جائے اور شمالی ہند کے بتوں کی تحقیر کرنے کے سومنات والے جو فخر و غرور کرتے اور ڈینگیں مارتے تھے وہ بھی اپنے بُت کی بے بسی و بے چارگی دیکھ کر سیدھے ہو جائیں۔ روضۃ الصفا کی روایت کے موافق سلطان محمود نے دہم ماہ شعبان ۴۱۵ھ کو معہ لشکر غزنی سے کوچ کیا اور ۱۵ رمضان ۴۱۵ھ کو ملتان پہنچا۔ ملتان سے سلطان گجرات کی طرف روانہ ہوا یہ حملہ درحقیقت سلطان محمود کو گجرات کے راجہ پر کرنا ضروری تھا۔ سومنات کی جدید شہرت اور سازشی مرکز ہونے کا حال سن کر اُس نے یہاں کے جنگی اجتماع کو منتشر اور سازشی گروہ کو ہلاک کرنا ضروری سمجھا جو گجرات کے راجہ کی سرپرستی میں مصروف کار تھا۔ محمود نے بیس ہزار اونٹوں پر پانی کی مشکیں لاد کر ملتان سے کوچ کیا وہ اول انھلواڑہ (نہروالہ) دارالسلطنت گجرات پہنچا۔ گجرات کا راجہ اس اچانک حملہ سے سراسیمہ ہو کر اور شہر چھوڑ کر کسی طرف کو بھاگ گیا محمود نے اس شہر میں قیام کرنے یا اس کے لوٹنے کا مطلق خیال نہیں کیا بلکہ نہروالہ سے سومنات کی طرف روانہ ہوا سومنات والوں کو بھی اس اچانک حملے کی پہلے سے اطلاع نہ تھی۔ محمود کو فصیل شہر کے نیچے دیکھ کر شہر والوں نے فصیل کے اوپر سے کہا کہ تمھاری موت تم کو یہاں کھینچ کر لائی ہے یاد رکھو کہ اب تم یہاں سے بچ کر ہرگز نہیں جا سکتے اور سومنات اب تم سب کو ضرور

ہلاک کرڈالے گا۔محمود نے اس کے جواب میں اپنے سواروں کو تیر اندازی کا حکم دیا۔۔ لڑائی شروع ہوگئی۔سومنات میں دس ہزار سے زیادہ بہادر راجپوتوں کی فوج تھی اور اب تو شہر کے باشندے بھی مسلح ہوکر مقابلے پر مستعد ہو گئے تھے۔محمود کے ہمراہ تیس ہزار سپاہی تھے شہر سومنات کے تین طرف سمندر اور ایک سمت خشکی تھی اسی خشکی کی جانب سے محمودی لشکر حملہ آور ہوا تھا۔سلطان نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ساحل سمندر پر جس قدر کشتیاں دستیاب ہوسکیں اُن سب پر قبضہ کرکے اُن میں ایک حصہ فوج بٹھاکر جو عموماً ہندو سپاہیوں پر مشتمل تھا حکم دیا کہ تم سمندر کی جانب سے شہر کا محاصرہ جاری رکھو اور کوئی بحری امداد شہر والوں کو نہ پہنچنے دو۔سلطان کی اس احتیاط اور اس اولیں کارروائی سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس کو ضرور یہ اندیشہ تھا کہ سومنات والوں کے لئے خلیج فارس اور بحر عمان سے ترامطہ کی امداد پہنچ سکتی ہے ورنہ کسی ہندو ریاست سے تو جہازوں کے ذریعہ فوجی امداد کے آنے کا احتمال ہی نہ تھا سومنات والوں نے دو دن تک بڑی بہادری اور جاں فروشی کے ساتھ مقابلہ کیا تیسرے دن نہروالہ کے راجہ پرم دیو اور اُسی نواح کے دوسرے راجہ دابشلیم نامی نے اپنی فوجوں کو فراہم و آراستہ کرکے سومنات کے بچانے اور سومنات کی فوج کو امداد پہنچانے کے لئے تیس چالیس ہزار فوج سے حملہ کیا۔ادھر محمود سومنات کی فوج سے مصروف پیکار تھا اُدھر پیچھے سے یہ زبردست فوج آگئی اور محمودی لشکر دونوں فوجوں کے بیچ میں گھر گیا۔ یہ وقت بڑا نازک تھا لیکن محمود نے اپنے خدا سے مدد طلب کی دعا مانگی اور فوج کے دو حصہ کرکے ایک حصہ کو سومنات کی جانب مصروف جنگ رکھا اور دوسرے کو لے کر ان راجاؤں کی حملہ آور فوج پر خود حملہ آور ہوا۔شہر والے بھی اب بہت دلیری اور جرأت کے ساتھ لڑنے لگے۔لیکن محمود نے تھوڑی ہی دیر میں پرم دیو اور دابشلیم کی فوج کو شکست دے کر بھگا دیا اس فتح کے ساتھ ہی سومنات کی فوج نے ہمت ہار دی۔اور محمودی لشکر فصیل شہر پر قابض ہوکر شہر میں داخل ہوا۔پانچ ہزار کے قریب راجپوت لڑائی میں مارے گئے پانچ ہزار کے قریب سمندر کی جانب کشتیوں میں سوار ہو ہوکر بھاگے اور محمودی سپاہیوں نے جو پہلے سے کشتیوں میں سوار تھے اُن کو غرق کیا۔

سومنات کی فتح کے بعد

سومنات کی فتح اور بت شکنی کے بعد سلطان محمود نے پرم دیو راجۂ نہروالہ کو سزا دینا ضروری سمجھا۔ لیکن وہ پہلے ہی نہروالہ سے تمام خزانہ اور زر و جواہر لے کر ساحلِ گجرات کے قریب کسی جزیرہ میں چلا گیا تھا۔ محمود نے اُس جزیرہ میں پہنچ کر اُس کو محصور کیا وہ وہاں سے بھیس بدل کر اور چھپ کر نکل بھاگا اور اپنی جان بچا کر لے گیا۔ مگر اُس کا مال و اسباب سب محمود کے قبضہ میں آیا اُس کے بعد محمود نے نہروالہ میں آکر قیام کیا اور ملک گجرات کو فسادی اور شر انگیز مادہ سے پاک کیا۔ پھر محمود نے سومنات کے لوگوں کو بُلا کر کہا کہ تم کس کو اپنا حاکم بنانا چاہتے ہو۔ انھوں نے اپنے مندر کے ایک پجاری کا نام لیا جو راجہ دابشلیم کا بھائی تھا اُس نے دابشلیم سے خوف ظاہر کیا محمود نے حملہ کر کے دابشلیم کو گرفتار کر لیا اور دابشلیم کے بھائی کو گجرات و سومنات کا فرماں روا بنا کر دابشلیم کو اپنے ہمراہ غزنی لے گیا۔ جب دوسرے سال دابشلیم کے بھائی کا انتقال ہو گیا تو اُس نے دابشلیم کو گجرات و سومنات کی حکومت پر مامور کر کے غزنی سے روانہ کیا۔ اس حملۂ سومنات میں محمود کے ڈھائی سال صرف ہوئے اور وہ ۴۱۷ھ میں غزنی واپس پہنچا۔ اسی حملے میں واپس جاتے ہوئے اُس نے اجمیر کے راجہ کی بھی گوشمالی کی اور اُس سے اقرار اطاعت لے کر اور قریبًا تمام راجپوتانہ کو اپنی حکومت میں شامل کر کے غزنی پہنچا۔ پنجاب۔ ملتان۔ سندھ اور گجرات کے صوبے براہِ راست غزنی کی سلطنت میں شامل ہو چکے تھے۔ کالنجر تک کے راجہ محمود کے پاس خراج بھیجتے اور اُس کی فرماں برداری کو موجب فخر جانتے تھے۔ محمود نے سومنات میں داخل ہو کر سومنات کی مورت کو ضرور توڑا لیکن شہر کے باشندوں کا قتل عام نہیں کرایا۔ بلکہ گجرات والوں کے ساتھ بے حد رعایت و محبت کے ساتھ پیش آیا۔ تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ سلطان محمود گجرات ہی میں مستقل سکونت اختیار کرنے اور نہروالہ کو اپنا دارالسلطنت بنانے پر آمادہ تھا مگر اُس کے وزیروں اور سرداروں نے اس رائے کی مخالفت کی اور اُس کو غزنی لے گئے۔ غالبًا محمود گجرات میں اسی لئے رہنا چاہتا ہو گا کہ یہاں رہنے سے قرامطہ بحرین کا بخوبی استیصال ہو سکتا تھا۔ سلطان محمود کی ساری عمر قرامطہ کی بیخ کنی میں صرف ہوئی۔ چنانچہ گجرات سے غزنی پہنچ کر سلطان کو معلوم ہوا کہ رے میں قرامطہ نے مادۂ فساد فراہم کر دیا ہے ساتھ ہی صوبۂ طوس کے عامل کی عرض داشت پہنچی کہ اس طرف ترکمانوں کا فتنہ

آپ کے آئے بغیر فرو نہ ہوگا چنانچہ اول سلطان طوس کی طرف گیا وہاں سے فارغ ہوکر رے پہنچا اور قرامطہ کی بیخ کنی کی۔ طبقات اکبری میں لکھا ہے کہ

"امیر طوس بعد از جنگہائے عظیم بسلطان نوشت کہ تدارک فساد بجز آنکہ سلطان بذات خویش حرکت فرماید ممکن نیست۔ سلطان بذات خویش توجہ نمودہ استیصال ترکمانان نمود، از آنجا برے رفتہ خزائن و دفائن رے کہ حکام آنجا بسالہائے دراز اندوختہ بودند بے محنت و مشقت بدست آورد و از باطل مذہبان و قرامطہ آنجا بسیار بودند ہر کہ ثابت شد بقتل رسید و این ولایت رے و اصفہان را بامیر مسعود دادہ خود بغزنی مراجعت نمود"

سلطان محمود کی وفات

روز پنجشنبہ ۲۳ ربیع الآخر ۴۲۱ھ کو سلطان محمود نے وفات پائی۔ اس کی تمام فوج کشیوں کا حال جو اس نے ہندوستان پر کیں اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ اب ہر ایک شخص خود ہی غور کر کے سلطان محمود کے متعلق رائے قائم کر سکتا ہے کہ اس کی لوٹ مار اور ظلم و ستم کے افسانے کیا حقیقت رکھتے ہیں۔ میں اس وقت سلطان محمود غزنوی کی علم دوستی۔ علم پروری۔ منصف مزاجی۔ رعیت نوازی کی شاندار روایتیں بھی نقل نہیں کرتا ہوں جو تاریخوں کے صفحات کی زینت اور مسلم فرمانرواؤں کے لئے موجب افتخار ہیں۔ میں اس وقت صرف الفنسٹن صاحب کا یہ قول اور سنانا چاہتا ہوں کہ

"یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس نے (سلطان محمود نے) ایک ہندو کو بھی مسلمان بنایا ہو"

پھر یہی مورخ آگے کہتا ہے کہ

"سوائے لڑائی کے اس نے کسی ہندو کو قتل نہیں کیا"

اس باب کے ختم کرنے سے پہلے ہم کو سلطان محمود غزنوی کی اولاد اور اس کے ہندو سپہ سالاروں اور ہندو لشکروں کا بھی مجمل طور پر کچھ بیان کر دینا چاہیے تاکہ ہمارے ہندو دوستوں میں مسلمانوں کی حملہ آوری کی کیفیت کے سمجھنے کی استعداد پیدا ہو سکے۔

سلطنت غزنی کا ہندو لشکر

جب سلطان محمود غزنوی کا انتقال ہوا ہے تو اس کا بیٹا مسعود اصفہان میں اور دوسرا بیٹا محمد گرگان میں تھا

اور سلطان محمود کی اولاد

محمد بن محمود اول غزنی پہنچا اور باپ کی جگہ تخت نشین ہوا۔ امرائے سلطنت مسعود بن محمود کی جانب زیادہ مائل تھے اُن کو محمد بن محمود کی تخت نشینی کچھ پسند نہ تھی۔ پچاس روز تک سب خاموش رہے پچاسویں روز امیر ایاز نے جو لاہور سے غزنی آیا ہوا تھا دوسرے شاہی غلاموں کو اپنا ہم خیال بنا کر اور سب سے قسمیں لے کر ایک دوسرے امیر ابوالحسن علی بن عبد اللہ معروف بہ علی دایہ کو بھی اپنا شریک کار بنایا اور دونوں امیر اپنی اپنی جمعیت لے کر اور شاہی طویلہ سے زبردستی گھوڑوں پر چڑھ کر امیر مسعود کی طرف روانہ ہوئے سلطان محمد بن محمود کو جب یہ حال معلوم ہوا تو اُس نے سوندیرائے ہندو سردار کو ان دونوں امیروں کے تعاقب میں روانہ کیا۔ طبقات اکبری کے الفاظ یہ ہیں۔

"امیر محمد سوندیرائے ہندو را بالشکر بسیار بر تعاقب ایشاں فرستاد چوں سوندیرائے وجمع کثیر از ہندواں کشتہ شدند و از غلاماں نیز جمع کثیر بقتل آمدہ سرہائے ایشاں را نزد امیر محمد فرستادند و ایاز و علی را بہ ہم چناں باتفاق غلاماں بہ تعجیل مے رفتند تا با امیر مسعود در نیشاپور رسیدند"

سلطان مسعود

سوندیرائے سلطان محمود غزنوی کے زمانے سے ہندو لشکر کا سپہ سالار تھا۔ امیر مسعود نے غزنی پر حملہ کر کے امیر محمد بن محمود کو گرفتار کر کے اندھا کر دیا اور ایک قلعہ میں محبوس و نظر بند کر دیا اور تخت سلطنت پر جلوس کر کے ہندوؤں کی سپہ سالاری سوندیرائے کی جگہ ناتھ نامی ہندو کو عطا کی ۴۲۴ھ میں کیچ و مکران کا صوبہ براہ راست سلطنت غزنی میں شامل ہوا اور سلطان مسعود کے نام کا سکہ و خطبہ وہاں جاری ہوا سلطان محمود غزنوی نے اپنی وفات سے پہلے احمد بن حسن میمندی کو معزول کر کے کالنجر کے قلعہ میں قید کر دیا تھا اور اُس کی جگہ احمد بن حسین بن میکائیل کو اپنا وزیر بنایا تھا جو سلطان محمود کی وفات تک وزارت کے عہدے پر مامور رہا۔ سلطان مسعود کی تخت نشینی کے بعد احمد بن حسین بن میکائیل حج کے لئے چلا گیا تھا وہاں ملک حجاز پر چونکہ عبیدیوں کا تسلط تھا لہٰذا حجاز سے اس وزیر کو عبیدی فرمانروا نے مصر بلوایا اور خوب خاطر مدارات بجا لا کر اپنی طرف مائل کیا۔ احمد بن حسن نے عبیدی فرمانروا کی بیعت کی اور سلطنت غزنی کے خلاف اشاعتی مقصد کو پورا کرنے کے ارادے سے واپس آیا یہاں اس کے آنے پر قرامطہ اس کے پاس آنے جانے لگے۔ یہ حال سلطان مسعود کو معلوم ہوا اُس

نے بلاتامل ۴۲۲ھ میں احمد بن حسن بن میکائیل کو بلخ میں پھانسی دے کر مار ڈالا۔ اسی سال احمد بن حسن میمندی نے وفات پائی اور اسی سال سلطنت غزنی کا سپہ سالار اعظم التونتاش جو بڑا تجربہ کار شخص تھا فوت ہوا۔ ۴۲۴ھ میں سلطان مسعود نے قلعہ سرستی پر حملہ کیا۔ یہ قلعہ کشمیر کے کسی درہ میں واقع تھا یہاں حملہ کرنے کی یہ وجہ ہوئی تھی کہ کچھ مسلمان سوداگر اس طرف آتے تھے قلعہ والوں نے ان سوداگروں کو پکڑ کر ان کا تمام مال و اسباب چھین لیا اور اُن کو قلعہ میں قید کر دیا۔ یہ خبر سُن کر سلطان مسعود نے قلعہ سرستی پر حملہ کیا اور قلعہ والوں کو سزا دے کر سوداگروں کو آزاد کرایا اور اُن کے اموال اُن کو واپس دلائے یہ سلطان مسعود بن محمود کا ہندوستان پر پہلا حملہ تھا۔ سلطان محمود کا غلام ایاز پنجاب کی حکومت عبداللہ قراتگین یا قاضی شیراز کے سپرد کر کے غزنی چلا گیا تھا اور ایاز ہی کی کوشش و پامردی سے سلطان مسعود کو تخت ملا تھا۔ لہٰذا سلطان مسعود نے ایاز کو اپنی مصاحبت میں رکھ لیا تھا۔

اب ۴۲۴ھ میں سلطان مسعود کو ہندوستان آنا پڑا تو اُس نے پنجاب کے صوبے کی حکومت کا یہ مستقل انتظام کیا کہ احمد نیالتگین کو ہندوستان کا سپہ سالار بنایا اور قاضی شیراز کو ہندوستان کے عہدۂ قضا پر مامور رکھا۔ اُس زمانہ میں ملک کے انتظام کا یہ قاعدہ تھا کہ کسی ملک یا صوبہ کا ایک سپہ سالار ہوتا تھا جس کا کام فتوحات حاصل کرنا، فوج پر اقتدار قائم رکھنا اور ماتحت رئیسوں سے خراج وصول کرنا تھا۔ دوسرا بڑا افسر قاضی ہوتا تھا قاضی تمام مالی اور اندرونی انتظام کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ سلطان مسعود نے جب احمد نیالتگین کو ہندوستان کا سپہ سالار مقرر کیا تو قاضی شیراز نے جو لاہور میں قاضی ہندوستان کی حیثیت سے مقیم تھا احمد نیالتگین کی سپہ سالاری کو ناپسند کیا۔ احمد نیالتگین سلطان محمود غزنوی کے زمانے میں سلطنت کے نہایت اہم اور ذمہ دارانہ عہدوں پر مامور رہ چکا تھا۔ سلطان محمود کا بڑا مزاج داں اور سلطان اُس پر بے حد مہربان تھا۔ احمد نیالتگین اپنی فوج لے کر لاہور سے مشرق کی جانب روانہ ہوا اور کالنجر تک کے تمام راجاؤں سے مقررہ خراج وصول کرتا ہوا چلا گیا۔ راستہ میں وہ بنارس بھی گیا اور وہاں کے راجہ کو مطیع بنا کر خراج وصول کیا۔ جو چھوٹے چھوٹے راجہ اور ٹھاکر ایسے رہ گئے تھے کہ اُن پر نہ سلطان محمود غزنوی نے حملہ کیا تھا نہ کوئی اقرار فرماں برداری اُن سے لیا گیا تھا اُن کو احمد نیالتگین نے اقرار اطاعت اور خراج گذاری پر مجبور کیا اور اس طرح شمالی ہند میں صوبہ بہار تک سلطنتِ غزنی

کی باقاعدہ شہنشاہی اور سیادت قائم ہو گئی۔ ہر ایک چھوٹے بڑے راجہ نے خراج گذاری اور سلطنت غزنی کی فرماں برداری اپنا فرض سمجھا۔ قاضی شیراز نے احمد نیا لتگین کی غیر حاضری میں اُس کی شکاتیں لکھ لکھ کر سلطان مسعود کے پاس بھیجنی شروع کیں اُس نے سلطان کو لکھا کہ میرے خاص لخاص معتمد احمد نیا لتگین کے ہمراہ ہیں اُنھوں نے مجھ کو لکھا ہے کہ احمد نیا لتگین بغاوت اور اپنی خود مختاری کے اعلان کی تیاری کر رہا ہے اس قسم کے شکایتی خطوط قاضی شیراز نے سلطان کے پاس بیس کے قریب روانہ کئے۔ ہر خط میں سلطان کو احمد نیا لتگین کی بغاوت اور عزم فاسد کا یقین دلایا جاتا تھا۔ اُدھر احمد نیا لتگین کے خطوط ٹھاکروں سے خراج وصول ہونے اور شاہی خزانے کی حالت درست ہونے کی خوشخبری پر مشتمل براہِ راست پہنچ رہے تھے۔ سلطان مسعود حیران تھا کہ ایک طرف احمد نیا لتگین کے خطوط سے خلوص کی خوشبو آتی ہے دوسری طرف قاضی کے خطوط سے اُس کی بغاوت و سرکشی کی تیاریوں کا حال ظاہر ہوتا ہے۔ آخر احمد نیا لتگین اضلاع مشرق سے فارغ ہو کر لاہور واپس آیا تو قاضی شیراز نے اُس کو لاہور میں داخل نہ ہونے دیا اور سلطان کو لکھا کہ وہ لاہور پر قابض ہو کر اپنی خود مختاری کا اعلان کرنے والا ہے۔ سلطان مسعود نے تفتیش احوال اور ضرورت ہو تو احمد نیا لتگین کے گرفتار کر لینے کے لئے ناتھ نامی سپہ سالار کو مامور کیا کہ اپنی ہندو فوج لے کر جاؤ۔ ناتھ نے پنجاب آتے ہی قاضی شیراز کی باتوں میں آ کر احمد نیا لتگین پر حملہ کر دیا احمد نیا لتگین کو مجبوراً مقابلہ کرنا پڑا۔ اس لڑائی میں ناتھ مارا گیا۔ ناتھ کے مارے جانے کا حال سُن کر سلطان مسعود کو احمد نیا لتگین کے باغی ہونے میں کوئی شبہ نہ رہا مگر دوسرے تمام سردار احمد نیا لتگین کو بے گناہ جانتے اور قاضی شیراز کی شرارتوں سے واقف تھے مگر سلطان کے خوف سے کچھ نہیں کہہ سکتے تھے۔ سلطان مسعود باغ صد ہزارہ میں فروکش تھا تمام سرداروں، سپہ سالاروں، امیروں، وزیروں اور مصاحبوں کو بُلا کر مجلس مشورت منعقد کی اور کہا کہ بتاؤ احمد نیا لتگین کے فتنے سے کس طرح نجات حاصل کی جائے۔ ان ایام میں وزیر اعظم ختلان و طخارستان کی طرف گیا ہوا تھا۔ سپہ سالار اعظم موجود تھا اُس نے کہا کہ مجھ کو حکم دیجئے میں لاہور جا کر سب بندوبست کر دوں گا۔ سلطان نے کہا کہ تجھ کو خراسان کی طرف بھیجنے کی سخت ضرورت ہے اگر میں خود اُس طرف گیا تب بھی تجھ کو میرے ہمراہ چلنا ضروری ہے۔ سپہ سالار نے کہا کہ اس مجلس میں اور بھی بہت سے سردار

موجود ہیں جس کو آپ حکم دیں گے وہ تعمیل کرے گا چونکہ تمام سردار احمد نیالتگین کی بے گناہی اور قاضی کی شرارت سے واقف تھے اس لئے سب یہی چاہتے تھے کہ سپہ سالار اعظم یا وزیر اعظم جائے اور وہاں پہنچ کر اصلیت یعنی قاضی کی شرارت سے سلطان کو آگاہ کرے۔ احمد نیالتگین پر چونکہ بغاوت کا الزام لگ چکا تھا اس لئے اس کی سفارش کرنا اب کوئی آسان کام نہ تھا۔ خود سپہ سالار اعظم بھی باوجود واقف ہونے کے اس وقت سلطان سے کچھ نہیں کہہ سکا تھا اور اسی لئے وہ خود لاہور جانا چاہتا تھا۔ غرض اس مسئلہ کی پیچیدگی سے تمام سردار ابھی خاموش اور سلطانی حکم کے منتظر تھے کہ یکایک تلک نامی ہندو نے آگے بڑھ کر عرض کیا کہ میں لاہور جانے اور خدمت انجام دینے کے لئے تیار ہوں اور چونکہ میں ہندوستانی ہوں اس لئے ہندوستان کے گرم موسم کی سختی بھی باسانی برداشت کر سکوں گا۔ یہ مہم مجھ کو سپرد فرمائی جاوے۔ سلطان مسعود تلک کی اس پیش قدمی اور جرأت سے بہت خوش ہوا اور اس کو ہندوستان کی جانب روانہ کیا۔ تلک نے ہندوستان آکر احمد نیالتگین کو قتل کیا اور سلطان کی خدمت میں واپس پہنچ کر مورد تحسین و آفرین ہوا۔ یہ واقعہ یعنی احمد نیالتگین کا قتل ۴۲۶ھ میں وقوع پذیر ہوا۔

قلعہ ہانسی کی فتح

ذالحجہ ۴۲۶ھ کو تلک ہندوستان سے بمقام مرو سلطان کی خدمت میں پہنچا اور عرض کیا کہ ہندوستان میں ایک قلعہ ہانسی کا ایسا باقی رہ گیا ہے جہاں ابھی تک اسلامی لشکر کا قدم نہیں پہنچا اور ہندوستان میں اس کی نسبت شہرت ہے کہ مسلمان اس قلعہ پر قابو نہیں پا سکیں گے۔ سلطان مسعود جانتا تھا کہ اس قسم کی شہرتوں کا کیسا مضر اثر پیدا ہوسکتا ہے اور اسی مضر اثر سے محفوظ رہنے کے لئے سلطان محمود کو سومنات پر حملہ کرنا پڑا تھا یہ وہ زمانہ تھا کہ سلطان مسعود سلجوقیوں کی معرکہ آرائیوں میں مصروف تھا اور خراسان و ماوراءالنہر و خوارزم کا علاقہ سلطنت غزنی کے قبضہ سے نکلنے والا تھا۔ آخر ماہ ذالحجہ ۴۲۹ھ کو سلطان مسعود نے دربار منعقد کیا اور ارکان دربار سے مخاطب ہو کر کہا کہ میں ہندوستان میں قلعہ ہانسی کو ضرور فتح کروں گا اگرچہ آج کل ترکمانوں نے ہر طرف سے زور باندھ رکھا ہے اور بلخ و مرو وغیرہ کی طرف میرے پہنچنے کی ضرورت ہے لیکن میں بلخ کی جانب اپنے بیٹے مودود کو اور مرو کی جانب سپہ سالار کو بھیجتا ہوں اور خود ہندوستان کی طرف جاتا ہوں۔ وزیر اعظم

میری جگہ اس ملک میں رہے گا۔ بادشاہ کی زبان سے یہ الفاظ سن کر تمام اہل دربار نے اس رائے کی مخالفت کی اور مودبانہ عرض کیا کہ ہانسی کا قلعہ تو کوئی معمولی سردار یہاں سے جاکر اور لاہور کی فوج کو ہمراہ لے کر فتح کر سکتا ہے لیکن سلطان کے مرو کی جانب جانے کی اس وقت سخت ضرورت ہے ورنہ اندیشہ ہے کہ ترکمانان سلجوقی تمام ملک پر چھا جائیں گے اور پھر تدارک محال ہوگا۔ سلطان نے کہا چاہے کچھ ہو میں قلعہ ہانسی کی فتح میں اب دیر کرنا نہیں چاہتا۔ سلطان کو بضد اور مصر دیکھ کر سب خاموش ہو گئے لیکن دربار سے نکل کر سب نے سلطان کی رائے کو ہلاکت آفریں بتایا۔ ۲۲ ذالحجہ ۴۲۸ھ کو سلطان مسعود غزنی سے کابل کی جانب روانہ ہوا یکم محرم کو کابل سے چلا اور ۲۵ محرم ۴۲۹ھ کو دریائے جہلم کے کنارے دینار کوٹہ کے مقام پر پہنچ کر قیام کیا یہاں بیمار ہو کر چودہ روز مقیم رہا۔ شراب سے توبہ کی۔ تمام شراب دریائے جہلم میں پھینکوا دی، شراب کے تمام برتن تڑوا دیئے۔ ابھی اسی جگہ مقیم تھا کہ کشمیر کے راجہ کے مرنے کی خبر پہنچی۔ ۱۷ صفر ۴۲۹ھ بروز سہ شنبہ دریائے جہلم کو عبور کیا اور چہار شنبہ ۹ ربیع الاول کو قلعہ ہانسی کے سامنے پہنچ کر فصیل قلعہ کے نیچے قیام کیا۔ قلعہ کا محاصرہ کر کے لڑائی شروع کی۔ ۱۹ ربیع الاول ۴۲۹ھ کو بزور شمشیر قلعہ پر قبضہ کیا۔ ۲۶ ربیع الاول ۴۲۹ھ کو ہانسی سے روانہ ہو کر قلعہ سونی پت فتح کیا پھر لاہور میں اپنے بیٹے مجدود کو چھوڑ کر ایاز کو اس کے ہمراہ بطور اتالیق مقرر کیا۔ اور شروع جمادی الاول ۴۲۹ھ میں غزنی پہنچ گیا۔

سلجوقیوں سے کشمکش اور سلطان مسعود کی شکست

سلطان کی اس غیر حاضری میں ترکمانوں نے بہت زور پکڑ لیا اور پھر اس مصیبت کا کوئی تدارک سلطان مسعود سے نہ ہو سکا۔ ۴۳۱ھ میں بیابان سرخس کے اندر سلجوقیوں سے سلطان کی لڑائی ہوئی۔ اس لڑائی میں پانسو ہندو بھی سلطان کے ہمراہ موجود تھے۔ سلجوقیوں کے مقابلہ میں سلطان مسعود کو یہ ایسی شکست ہوئی کہ پھر اس نے ہمت ہار دی۔ غزنی پہنچ کر اس نے تمام اموال و خزائن فراہم کئے اور سب کو اونٹوں پر بار کر کے ہندوستان کی جانب روانہ کیا۔ سرداروں اور امیروں نے ہرچند روکا لیکن سلطان مسعود نہ مانا غزنی سے تین ہزار اونٹ صرف سونے چاندی اور جواہرات کے خزانوں سے لدے ہوئے لے کر ہندوستان کی جانب اس ارادے سے چلا کہ لاہور کو

دارالسلطنت قرار دے کر اور ہندوستان میں فوج مرتب کرکے سلجوقیوں کا مقابلہ کروں گا۔ اُس کا بیٹا مجدود ہندوستان میں پہلے ہی سے تھا تمام خزانہ ہندولشکر کی نگرانی میں لئے ہوئے ہندوستان آیا۔

ہندو لشکر کی غداری

غزنی سے چلتے وقت اپنے بھائی محمد کو بھی جو اندھا ہونے کے بعد قید خانہ میں تھا اپنے ہمراہ لے لیا تھا۔ دریائے جہلم کے کنارے پہنچ کر ہندو لشکر نے بغاوت اختیار کرکے تمام خزانہ لوٹ لیا اُس وقت سلطان مسعود کو اپنی غلطی کا احساس ہوا مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ اس ہندو لشکر نے یہ چالاکی کی کہ سلطان مسعود کو فوراً گرفتار کرکے اُس کے بھائی محمد کو جو قید میں تھا۔ آزاد کر دیا۔ اور اُس کو زبردستی تخت نشین کرکے مسعود کو اُس کے سامنے بطور مجرم پیش کیا۔ محمد نے مسعود کو قید کیا۔ اور محمد کے بیٹے احمد نے اپنے باپ کی اجازت کے بغیر اپنے چچا مسعود کو قید خانے میں قتل کر دیا۔ اس جگہ یہ اشارہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ سلطان محمود غزنوی سے اس لئے بہت ناخوش ہیں کہ وہ ہندوستان سے سونا اور چاندی وغیرہ لوٹ کر غزنی لے گیا تھا اُن کو خوش ہونا چاہیئے کہ سلطان محمود کا بیٹا مسعود غزنوی سلطنت غزنی کا تمام خزانہ جس میں ہندوستان کی لوٹ کے علاوہ خراسان و ماوراءالنہر وغیرہ کے صوبوں کا خراج بھی شامل تھا سب کا سب ہندوستان واپس لے آیا اور دریائے جہلم کے کنارے ہندو لشکر نے وہ سب کا سب دھڑی دھڑی کرکے لوٹ لیا۔ یعنی جو سونا چاندی ہندوستان سے گیا تھا وہ مع سود ہندوستان میں واپس آ گیا غزنی میں کچھ نہیں رہا۔ سلطان مسعود کے قتل کا حال سُن کر مودود بلخ سے غزنی پہنچا اور خزانہ کو بالکل خالی پایا۔ سلطان مسعود نے یہاں تک مبالغہ سے کام لیا تھا کہ سرکاری عمارتوں کے قیمتی پردے تک بھی اُتروا کر اپنے ہمراہ لے لئے تھے اور کوئی قیمتی چیز غزنی میں نہیں چھوڑی تھی۔ غزنی سے مودود باپ کا انتقام لینے کی غرض سے روانہ ہوا ادھر سے سلطان محمد بھی مقابلے پر مستعد ہو گیا۔ محمد اور اُس کا بیٹا احمد لڑائی میں مارے گئے۔ لاہور میں مجدود اور ایاز پہلے سے قابض و متصرف تھے اب مودود نے لاہور پر قبضہ کرنا چاہا تو ایاز اور مجدود نے مقابلہ کی تیاری کی اور مودود واپس غزنی چلا گیا۔ یہ واقعہ ۴۳۲ھ کے آخر یا ۴۳۳ھ کے شروع ایام کا ہے۔ ۴۳۳ھ کے آخر ایام میں مودود لشکر لے کر لاہور پر حملہ آور ہوا۔ ابھی دونوں لشکروں

کا مقابلہ نہ ہونے پایا تھا کہ ۹ رماہ ذالحجہ ۴۳۲ھ کو نہایت پُراسرار طریقے سے محدود اپنے خیمہ کے اندر مُردہ پایا گیا اور اسی قریبی زمانے میں ایاز بھی فوت ہوگیا۔ اس طرح پنجاب کا تمام ملک بآسانی مودود کے قبضے میں آگیا۔ سلطان محمود کے زمانے میں ایک ہندو سپہ سالار بجے رائے تھا جو بارگاہ محمودی میں رتبہ عالی رکھتا تھا اور ندیم خاص سمجھا جاتا تھا وہ سلطان محمود سے اجازت لے کر کشمیر چلا آیا تھا۔ طبقات اکبری کی روایت کے موافق ناراض ہوکر کشمیر آگیا تھا۔ سلطان مودود نے بجے رائے کو ۴۳۴ھ میں کشمیر سے اپنے دربار میں بُلوایا اور بڑی تکریم و قدردانی کے ساتھ پیش آیا۔ یہ جو کچھ بیان ہوا ہے تاریخ بیہقی۔ تاریخ فرشتہ اور طبقات اکبری سے بطور خلاصہ درج کیا گیا ہے۔ تاریخ بیہقی کا مصنف ابوالفضل بیہقی ہے۔ جو سلطان مسعود بن محمود کا میر منشی اور مصاحب خاص تھا اُس نے ۴۵۱ھ میں اپنی تاریخ بیہقی لکھی ہے پس ظاہر ہے کہ تاریخ بیہقی سے زیادہ معتبر دوسری کتاب سلطان محمود غزنوی اور مسعود غزنوی کی نسبت ہم کو دستیاب نہیں ہو سکتی۔ میں اس جگہ مناسب سمجھتا ہوں کہ تاریخ بیہقی سے تلک کا مفصل حال ترجمہ کر کے ذیل میں درج کروں یہ وہی تلک ہے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے اور جس نے احمد نیالتگیں کو قتل کیا تھا۔

راجہ تلک پسر جے سنگھ کا حال

تلک ایک ہندو حجام کا لڑکا تھا۔ خوش گفتار و خوش سیرت تھا۔ ہندی اور فارسی بہت خوش خط لکھتا تھا۔ ایک مدت تک کشمیر میں رہ چکا تھا۔ وہاں کئی کا شاگرد بن کر جادوگری اور بازی گری بھی سیکھ چکا تھا۔ کشمیر سے روانہ ہوکر قاضی شیراز ابوالحسن کی خدمت میں آیا اور اُسی کے پاس رہنے لگا۔ قاضی ابوالحسن ابو قاضی شیراز کے نام سے شہرت رکھتا تھا اُن میں اور وزیر اعظم احمد بن حسن میں اَن بن تھی قاضی شیراز نے تلک کو نامناسب طور پر نظر بند کر دیا اس کا حال وزیر اعظم کو معلوم ہوا تو اُس نے تین خیلتاشوں کے ہاتھ شاہی حکم بھجوا کر تلک کو اپنے پاس بُلوا لیا اور سلطان محمود سے قاضی کی شکایت کی چنانچہ قاضی پر سلطانی عتاب نازل ہوا۔ تلک وزیر اعظم کے پاس رہنے لگا اور چند روز کے بعد وزیر اعظم نے اُس کو اپنا میر منشی اور مترجم مقرر کر لیا۔ تاریخ بیہقی کا مصنف ابوالفضل لکھتا ہے کہ میں نے بارہا بچشم خود تلک کو دیکھا ہے کہ وہ وزیر اعظم کے دربار میں دبیری و مترجمی کے علاوہ باہر کے پیغامات لاتا اور وزیر اعظم تک پہنچاتا تھا اور کام سلیقہ سے کرتا تھا۔ جس طرح وزیر اعظم کا میر منشی تلک

تھا اسی طرح شہزادہ ولیعہد یعنی مسعود ابن محمود کا میر منشی بھی ایک ہندو تھا جس کا نام بیر پال تھا۔ ایک روز سلطان محمود غزنوی نے وزیر اعظم خواجہ احمد بن حسن کے تمام نوکروں اور منشیوں کو بلا کر سب کی قابلیتوں کا اندازہ کرنے کے لئے امتحان لیا تا کہ جو لوگ سلطانی دربار کے قابل ہوں اُن کو انتخاب کیا جائے۔ اس امتحان میں تلک سب سے زیادہ قابل ثابت ہوا۔ چنانچہ سلطان محمود نے تلک کو وزیر اعظم سے مانگ لیا اور تلک سلطانی ترجمان بہرام کے ساتھ مل کر کام کرنے لگا۔ جب سلطان محمود نے اپنے بیٹے مسعود کو ولی عہدی سے معزول کر کے اپنے دوسرے بیٹے محمد کو ولیعہد بنایا تو امراء کے دو فریق ہو گئے ایک فریق محمد کا طرفدار تھا اور دوسرا مسعود کا۔ تلک اس فریق میں شامل تھا جو مسعود کا طرفدار تھا اور سپہ سالاران ہندوان یعنی سوندی رائے اُس فریق میں شامل تھا جو محمد کا خیر خواہ تھا جیسا کہ اوپر ذکر آ چکا ہے سوندی رائے سلطان محمد بن محمود کی طرف سے لڑتا ہوا مارا گیا اس کے بعد ہی امیر محمد اندھا ہو کر قید ہوا اور سلطان مسعود نے تخت نشین ہو کر سوندی رائے کی جگہ ناتھ کو ہندو فوج کا سپہ سالار مقرر کیا جب ناتھ احمد نیالتگین کے مقابلے میں مارا گیا تو اُس کی جگہ تلک کو ہندو فوج کا سپہ سالار بنایا گیا۔ سلطان مسعود نے اس کو خلعت زر عطا کیا۔ زریں طوق جس پر بیش قیمت موتی اور ہیرے جڑے ہوئے تھے اپنے ہاتھ سے تلک کی گردن میں پہنایا گھوڑے عطا کئے سراپردہ اور چتر سے سرفراز کیا اس عزت افزائی کے موقعہ پر طبل جس کا ہند کے راجاؤں میں دستور ہے بجتا تھا۔ ایک جھنڈا جس کے اوپر خاص زریں آویزاں تھا عطا کیا۔ سرداران اعظم کے برابر بیٹھنے کی اجازت دی گئی خلوت اور خاص الخاص مشوروں میں شامل کیا جانے لگا۔ اس موقعہ پر ابوالفضل بیہقی کے الفاظ یہ ہیں۔

"خردمندان چنیں اتفاق کردہ اند کہ کس از مادر بچہ نزاید کہ بر مردماں می رسند
اما شرط آن است کہ نام نیکو یادگار ماند۔ این تلک مردے آمد و اخلاق ستودہ نمود و آں
مدت کہ عمر یافت زیانش نداشت کہ پسر حجامے بود و اگر با آں نفس و خرد و ہمت
اصیل بودے نیکوتر نمودے کہ خرامی عصامی ازیں نیکو باشد لیکن عظامی بکشتی نپرزد
چوں فضل و ادب و نفس یافت رتبت نداشت و ہمہ بخشش آں باشد کہ پدرم چنیں بود چنانچہ گفتہ اند
ما بالنسب افتخار ذی الحسب لعمرک قد ولکن بنفس ما یلدوا

یہ ذکر بھی اوپر آ چکا ہے کہ کس طرح احمد نیالتگین کی سزا دہی کے لئے سلطان مسعود نے تلک کو سپہ سالار ہند بنا کر بھیجا تھا۔ تفصیل اُس کی اس طرح ہے کہ سلطان مسعود کو تلک کی پیش قدمی بہت پسند آئی۔ دربار برخاست ہوا۔ سلطان نے محل میں جا کر اپنے دبیر ابوالحسن

عراقی کو تلک کے پاس بھیجا اور پیغام دیا کہ ہم تم کو تمام سرداروں پر فوقیت و برتری دینا چاہتے ہیں تم کسی کی رقابت سے ہرگز نہ گھبرانا جس قسم کے سامان کی ضرورت ہوگی تم کو دیا جائے گا اور کل اس مہم پر تم نامزد کر دیئے جاؤ گے تلک نے ابوالحسن عراقی کے ذریعہ چند خواہشات سلطان کی خدمت میں پیش کیں چنانچہ دربار سلطانی سے یہ فرمان جاری ہوا کہ

"جب تلک مقام برغوزک سے گذر جائے تو اُس کے بعد وہ خود مختار رہے اپنے اختیار سے جو چاہے کرے اور ہندوؤں کی تمام فوجیں تلک کے ہمراہ جائیں شاہی بیرق تلک کے ہمراہ رہے گا اور وہ تلک کے احکام اسی طرح لکھا کرے گا جیسے کہ شاہی فرامین لکھے جاتے ہیں تلک کے تمام ہمراہی تلک کی فرماں برداری اسی طرح کریں گے جیسے صاحب تخت بادشاہ کی کی جاتی ہے۔"

اہلِ دربار کو یہ تمام کارروائیاں بہت ہی شاق گذریں مگر چونکہ احمد نیالتگین کی موت آچکی تھی اُس کے قدرتی سامان ہونے ضروری تھے۔ سلطان نے تلک کو بے قیاس اموال وخزائن اور ذخائر زرو جواہر عطا کئے۔ جب تلک کا تمام ساز و سامان درست ہوگیا اور وہ روانگی پر آمادہ ہوا تو سلطان نے اُس کو نہایت اعلیٰ درجہ کا خلعت پہنایا نقارہ و علم عطا کیا۔ بڑی محبت کی باتیں کیں۔ دوسرے روز سلطان قصر فیروزہ میں آکر بیٹھے۔ ہندوؤں کا لشکر سوار و پیادہ اُس کے سامنے سے گذرنا شروع ہوا۔ تلک جب سلطان کے سامنے پہنچا تو قریب آکر گھوڑے سے اُتر پڑا۔ زمین خدمت چومی اور پھر سوار ہوگیا۔ یہ منگل کا روز جمادی الآخر کی پندرھویں تاریخ تھی۔ ڈیڑھ مہینے کے بعد تلک لاہور کے قریب پہنچ گیا اُس نے دیکھا کہ شہر پر قاضی شیراز قابض ہے اور شہر کے قریب تھوڑے فاصلے پر احمد نیالتگین اپنے ہمراہیوں کو لئے پڑا ہے۔ قاضی شیراز نے تلک کے پہنچنے پر بڑی خوشی اور مسرت کا اظہار کیا۔ باشندگان لاہور کا اکثر حصہ احمد نیالتگین کا ہوا خواہ تھا اور اس کے لشکر کو شہر لاہور سے سامان رسد پہنچتا رہتا تھا۔ قاضی شیراز نے سب سے پہلے لاہور کے اُن لوگوں کے نام تلک کو بتائے جو احمد نیالتگین کی ہمدردی کا دم بھرتے تھے تلک نے ان تمام لوگوں کو گرفتار کرا کر اپنے سامنے بلوایا اور سب کے داہنے ہاتھ کٹوا ڈالے۔ اس سخت سزا کو دیکھ کر تمام شہر کانپ گیا اور کسی کو اتنی جرأت نہ رہی کہ احمد نیالتگین کی ہمدردی کا دعوےٰ کرے یا اُس کے لشکر کو رسد پہنچا سکے۔ اس کے بعد تلک اور احمد نیالتگین میں لڑائیوں کا سلسلہ

جاری ہوا۔ تلک نے انواع و اقسام کے لالچ دے کر احمد نیالتگین کے ہمراہیوں کو توڑنا اور اپنی طرف مائل کرنا شروع کیا۔ احمد نیالتگین کی جمعیت دن بدن کم ہونے لگی اور تلک نے اُس کو کوئی ایسا موقعہ نہیں دیا کہ وہ اپنی بے گناہی کا یقین سلطان مسعود کو دلا سکتا۔ آخر چند روزہ معرکہ آرائی کے بعد احمد نیالتگین صرف دو سو ہمراہیوں کے ساتھ لاہور سے ملتان و سندھ کی جانب چل دیا تلک نے منادی کرادی کہ جو شخص احمد نیالتگین کا سر کاٹ کر لائے گا اُس کو پانچ لاکھ درم انعام دیا جائے گا۔ جٹوں کی قوم اس گراں سنگ انعام کے لالچ میں اُٹھ کھڑی ہوئی آخر مقام منصورہ کے قریب دریائے سندھ کو عبور کرتے ہوئے جٹوں نے جا لیا اُس وقت احمد نیالتگین کے ہمراہ صرف چند آدمی باقی رہ گئے تھے اُس نے اپنا ہاتھی دریا میں ڈالا۔ دوسرے ہاتھی پر اُس کا خرد سال بیٹا سوار تھا بین دریا کے اندر ایک ہزار جٹوں نے اُس کو گھیر لیا۔ سخت معرکہ آرائی اور بڑے کشت و خوں کے بعد احمد نیالتگین مارا گیا جٹوں نے اُس کا سر کاٹ لیا اور اُس کے چھوٹے بچے کو گرفتار کر لیا ماہ ذالحجہ ۴۲۶ھ کو تلک احمد نیالتگین کا سر لے کر سلطان مسعود کی خدمت میں جب کہ وہ مرو میں مقیم تھا پہنچا تلک ہندوستان سے ہندوؤں کا ایک نہایت شاندار لشکر لے کر پہنچا اور یہاں کے ٹھاکروں اور جٹ سرداروں کو بھی اپنے ہمراہ لے گیا۔ ان ٹھاکروں میں ایک دوسرا تلک بھی تھا سلطان اس دوسرے تلک کو دیکھ کر بہت خوش ہوا تلک ہندوستان سے پچپن ہاتھی بطور خراج وصول کر کے لے گیا تھا وہ بھی سلطان کی خدمت میں پیش کئے۔ محرم ۴۲۷ھ میں سلطان بلخ کی طرف آیا یہاں ایک بڑا دربار منعقد کیا ابوالفضل بیہقی کے الفاظ یہ ہیں۔

"روز دوشنبہ یاز دہم صفر دیگر دربار عظیم منعقد فرمودہ تلک را خلعت دادند بسالاری ہندوان خلعت سخت نیکو۔ چوں پیش سلطان آمد و خدمت کرد سلطان خزینہ دار را گفت طوقے بیار مرصع بجواہر کہ ساختہ بودند بیاوردند سلطان بستد و تلک را پیش خواند وآں طوق را بدست عالی خویش در گردن تلک افگند و نیکو یہا گفت بزبان بحد شنے کہ نمودہ بود در کار احمد نیالتگین و باز گشت"

اس کے بعد سلطان مسعود نے ایک بہت بڑی ضیافت تلک کی تکریم میں ترتیب

دی تمام ارکان سلطنت اور شرفائے ملک کو بلایا اور کھانا کھلایا۔ احمد نیالتگین کے قتل کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام ارکان سلطنت سلطان سے بددل ہو گئے اور دم بدم سلطنت کے کاموں میں اختلال پیدا ہوتا گیا۔ چونکہ تلک کو اول ٹھاکر اور پھر راجہ کا خطاب سلطان مسعود نے دیا تھا اسی لئے پنجاب میں آج تک حجاموں کو ٹھاکر اور راجہ کے خطاب سے مخاطب کیا جاتا ہے۔

ہندو فوج کا کرمانی کارنامہ

ایک مرتبہ سلطان مسعود نے احمد علی نوشتگین کو سپہ سالار بنا کر کرمان کی جانب روانہ کیا کہ وہاں کی بغاوت کو فرو کرو۔ چار ہزار ہندو سپاہی اس کے ہمراہ کئے اور دو ہزار سکزی پیادے سبستان سے احمد علی نوشتگین کے ہمراہ ہوئے اس طرح یہ چھ ہزار کا لشکر کرمان پہنچا برماشیر کے مقام پر دشمنوں سے مقابلہ ہوا تو ہندوؤں نے بڑی بزدلی دکھائی اور سلطانی لشکر نے شکست پائی۔ اس غم و شرمندگی میں احمد علی نوشتگین کی جان گئی۔ ہندو لشکر کی بزدلی جب ثابت ہو گئی تو سلطان نے فوج سے اُن کا نام کاٹ دینے کا حکم دیا۔ اپنی موقوفی و برطرفی کا حکم سُن کر چھ ہندو سردار خودکشی پر آمادہ ہو گئے اور اپنے پیٹ میں کٹار مارنے لگے سلطان نے سُن کر کہا کہ یہ کٹار کرمان میں چلانی چاہیئے تھی۔ بہرحال یہ واقعہ زبردست دلیل اس بات کی ہے کہ ہندو لوگ غزنوی سلطنت کے لشکر میں بڑی آرزو اور خواہش کے ساتھ بھرتی ہوتے تھے اور جب اُن کو موقوف کیا جاتا تھا تو وہ غم کے مارے خودکشی پر آمادہ ہو جاتے تھے مندرجہ بالا واقعہ کو ابوالفضل بیہقی نے اپنا چشم دید ان الفاظ میں لکھا ہے کہ

"اما ہندوان سستی کردند و پشت بہزیمت بدادند دیگراں را دل بشکست و احمد علی نوشتگین را بضرورت ببایست رفت وے با فوجے از خواص خویش و لشکر سلطان از راہ قائن بنیشاپور باز آمدند و فوجے بمکراں افتادند و ہندوان بسیستان آمدند و از آنجا بغزنیں من کہ بوالفضلم باسلطان بخدمت رفتہ بودم بباغ صد ہزارہ مقدمان ایں ہندوان را دیدم کہ آنجا آمدہ بودند و امیر فرمودہ بود تا کہ ایشاں را در خانۂ بزرگ آنجا کہ دیوان رسالت دارند بہ نشاندہ بودند و بوسعید مشرف پیغامہا درشت می آورد سوئے ایشاں از سلطان وکارہا بدانجا رسید کہ پیغامے آمد کہ شمارا جواب فرمودہ آید شش

تن مقدم تر ایشاں خویشتن را بکنارہ زد چنانکہ خون در آں خانہ رواں شد من و بوسعید و دیگراں ازاں خانہ برفتیم و ایں خبر بسلطان رسانید ند گفت ایں کٹارہ بکرمان بایست زدو بسیار بمالید شان و آخر عفو کرد۔ احمد علی نوشتگین نیز بیامد و چوں خجلے و معذورے بود بس روزگار بر نیامد کہ گذشتہ شد۔"

خاندان محمود کا زوال

اوپر ذکر آ چکا ہے کہ سلطان محمود غزنوی کے بیٹے سلطان مسعود غزنوی نے ہندو نوازی کی بدولت کس طرح اپنی جان دی۔ سلطان مسعود کے بیٹے مودود نے ۲۴ رجب ۴۴۱ھ میں وفات پائی۔ اُس کے بعد تین بیٹے علی بن مسعود نے حکومت کی اُس کے بعد عبد الرشید بن مسعود نے چار سال حکومت کی اُس کے بعد فرخ زاد بن مسعود چھ سال فرماں روا رہا اُس کے بعد ابراہیم بن مسعود تخت نشین ہوا۔ ابراہیم بن مسعود نے تخت نشین ہو کر سلجوقیوں سے صلح کی اور ہندوستان کی طرف متوجہ ہوا۔ کئی بار حملے کئے یہاں کے سرکشوں کو درست کیا بعض کو گرفتار کر کے غزنی لے گیا۔ سیاوش گرد عرف جالندھر کا قلعہ فتح کیا۔ اجودھن یا پاک پٹن کو فتح کر کے وہاں کے باغیوں کو راہ راست پر لایا اور اسی مقام سے تخم بغاوت مٹایا۔ ۴۸۱ھ میں سلطان ابراہیم بن مسعود نے وفات پائی۔

اُس کے بعد اُس کا بیٹا مسعود بن ابراہیم تخت نشین ہوا اور سولہ سال حکومت کی۔ اُس کے بعد اُس کا بیٹا ارسلان شاہ بن مسعود تخت نشین ہوا اُس کا بھائی بہرام شاہ بھاگ کر سلطان سنجر سلجوقی کے پاس گیا اور اُس سے اعانت خواہ ہوا۔ سلطان سنجر نے غزنی پر فوج کشی کی۔ ارسلان شاہ شکست کھا کر ہندوستان کی طرف بھاگ آیا۔ سنجر نے بہرام شاہ کو تخت نشین کر کے خود غزنی سے خراسان کی جانب مراجعت کی۔ ارسلان شاہ نے ہندوستان سے بہت بڑا لشکر لے کر غزنی پر چڑھائی کی مگر بہرام شاہ کے ہاتھ سے مارا گیا کیونکہ ہندی فوج نے کوئی بہادری نہیں دکھائی بلکہ میدان کارزار گرم ہوتے ہی پیٹھ دکھائی اور ارسلان شاہ نے غیرت کی وجہ سے اپنی جان گنوائی۔ اس کے بعد بہرام شاہ نے ہندوستان پر کئی مرتبہ حملے کئے اور یہاں کے تمام سرکشوں کو مطیع و منقاد بنایا اور ہر قسم کے مادۂ فساد کو مٹایا۔ ۵۴۷ھ میں بہرام شاہ نے وفات پائی اُس کے بعد اُس کا بیٹا خسرو شاہ بن بہرام شاہ تخت نشین ہوا چونکہ وہ علاء الدین حسین غوری کا مقابلہ نہ کر سکا لہٰذا لاہور چلا آیا اور یہاں

۵۵۵ھ میں فوت ہوا اُس کے بعد اُس کا بیٹا خسرو ملک لاہور میں تخت نشین ہوا اور ۵۸۳ھ میں خاندانِ محمود کا خاتمہ ہوگیا۔ خاندان محمود کے زوال کا سبب سلجوقیوں کے حملے اور سلاطین غزنی کا ہندوؤں پر سب سے زیادہ اعتماد کرنا بتایا جاتا ہے خاندانِ محمود کا آخری بادشاہ خسرو ملک تھا جس کو سلطان شہاب الدین غوری پنجاب سے گرفتار کرکے لے گیا تھا۔

خاندان غزنی کے عہدِ حکومت میں ہندوؤں کی حالت

محمود غزنوی ہندوؤں پر کس قدر مہربان تھا اُس نے کس قدر عفو و درگذر سے کام لیا اُس کی اولاد نے ہندوؤں کی کیسی قدردانی کی اور کیسے کیسے اعلیٰ عہدے ہندوؤں کو سلطنت غزنی میں حاصل ہوتے اس کا ذکر بطور نمونہ اوپر ہو چکا ہے۔ اس باب کو ختم کرنے سے پہلے ہم کو ہندوستان پر پھر ایک نظر ڈالنی چاہیئے کہ محمود کی وفات سے خسرو ملک تک ہندوستان میں ہندوؤں کی حالت کیا رہی اور اُن میں کون کون سے تغیرات پیدا ہوئے پنجاب کے راجہ جے پال کی خودکشی کے بعد ملک ہندوستان میں مسلمانوں کے خلاف جو جوش پیدا ہوا تھا اُس کو سلطان محمود غزنوی نے اپنی زندگی ہی میں فرو کردیا اور جنگ سومنات کے بعد ہندوؤں نے مسلمانوں کے مقابلے کا خیال ترک کردیا یا یوں کہیئے کہ تمام ملک پھر مسلمانوں کے مقابلے پر متحد نہیں کیا جاسکا اس پاس اور بار بار کی ہزیمتوں نے جدید برہمنی اور مسخ شدہ بدھ مذہب کے اُس اتفاق و اتحاد کو جو مسلمانوں کی مخالفت میں عارضی طور پر ہوا تھا پائدار و استوار اتفاق میں تبدیل کردیا اور دونوں مذہبوں کے پنڈتوں نے اپنے راجاؤں اور اپنی فوجوں کو مسلمانوں کے مقابلے میں ضعیف و بیکار دیکھ کر اور مایوس ہوکر آپس کی پُرانی رقابتوں کے بیدار کرنے اور ایک دوسرے کے مقابلے میں مستعد ہونے کے خیال کو ترک کرکے آپس میں ایک ہی ہو جانے کو مناسب سمجھا۔ اس اتفاق کی ابتدا اگرچہ جنگی تیاریوں کے لئے کی گئی تھی مگر اب جنگی تیاریوں میں ناکامی دیکھ کر مذہبی تعمیر اور مذہبی امتزاج ایک دوسرے نقطۂ نظر کی بنا پر عمل میں آنا شروع ہوا۔ ویدانیت اور جدید تصوف کی بنیاد پڑی۔ شیوی مذہب کی ترقی ہوئی اور اس موضوع پر خیالات کی نشوونما شروع ہوئی۔ دوسری طرف نوزائیدہ ویشنو مذہب کے بہت سے اعمال و عبادات میں مناسب تادیلیں ہونے لگیں یہ تمام حالات اب کسی نظام کسی سازش اور باقاعدہ مرکز کے ماتحت اور محتاج

نہ تھے بلکہ ایک فطری تقاضا تھا اور اسباب و علل کی لہر نے ہندو نسلوں کو بلا ارادہ اس جانب بہا دیا تھا۔ پنجاب، ملتان اور سندھ کے صوبے براہ راست سلطنت غزنی کا جزو بن چکے تھے۔ گجرات، مالوہ، اجمیر، دہلی، مہابن، برن، قنوج، میرٹھ، گوالیار، کالنجر وغیرہ ریاستیں سلطنت غزنی کو باقاعدہ خراج ادا کرتی تھیں۔ سلطان مسعود کے زمانہ میں سونی پت اور بنارس کے رہے ہوئے علاقے بھی مفتوح اور خراج گذار بنا لیے گئے تھے۔ ہندوستان میں خواجہ ایاز کی وفات تک کسی قسم کا کوئی خطرہ پیدا نہیں ہوا۔ ایاز کی وفات اور سلجوقیوں کے مقابلے میں مسعود کے شکست پانے اور مبتلائے آلام ہونے کے بعد جب کہ خراسان و ماوراء النہر و خوارزم وغیرہ بڑے بڑے صوبے سلطنت غزنی سے سلجوقیوں نے چھین لیے تھے دہلی کے راجہ اننگ پال اول نے مذہبی جذبے سے کام لینے اور فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اس مناسب موقع سے فائدہ اٹھانے اور عجیب و غریب چالاکی کو کام میں لانے کی بے اختیار داد دینی پڑتی ہے۔

من گھڑت خواب

تفصیل اس کی اس طرح ہے کہ دہلی کے راجہ اننگ پال اول نے ایک پنڈت کے مشورے سے یہ مشہور کیا کہ میں نے اس بت کو جسے محمود غزنوی اپنے ہمراہ غزنی لے گیا ہے خواب میں دیکھا ہے۔ بت نے مجھ سے فرمایا ہے کہ میں اتنے دنوں غزنی میں اسی لیے رہا کہ سلطنت غزنی کو برباد کر سکوں، چنانچہ میں اس سلطنت کو اب بہت کچھ کمزور کر چکا ہوں یقین ہے کہ چند روز میں یہ سلطنت خود بخود مٹ جائے گی اب میرے غزنی میں رہنے کی ضرورت نہیں رہی۔ لہٰذا میں ہندوستان واپس آنے والا ہوں تم کو چاہیے کہ اپنا تمام وہ ملک جو مسلمانوں کے قبضے میں چلا گیا ہے ان سے چھین لو اور میرے منتظر رہو۔ اس اعلان کے بعد راجہ نے اپنے معتمد سنگ تراش کو بلایا اور کہا کہ جس قسم کا وہ بت تھا اسی قسم کے پتھر کا بالکل ویسا ہی ایک بت پوشیدہ طور پر تیار کرو۔ سنگ تراش نے حسب فرمائش بت تیار کر لیا۔ راجہ نے ہانسی اور تھانیسر کا علاقہ جو صوبہ پنجاب کا مشرقی حصہ تھا سلطنت غزنی کے عاملوں سے چھین لیا اور عوام میں اپنے خواب کو خوب شہرت دی۔ ہندوؤں کو دوبارہ متحد بنانے اور مسلمانوں کے مقابلہ پر آمادہ کرنے کی اس سے بہتر کوئی دوسری تدبیر نہیں ہو سکتی تھی جو راجہ نے ایک پنڈت کی رہبری میں انجام دی۔ ہانسی اور تھانیسر کی فتح کے بعد نگرکوٹ پر چڑھائی کی غزنوی سلطنت کے عامل کو

نکال کر قبضہ کیا اور اُس علاقہ میں ایک باغ کے اندر اُس بت کو رات کے وقت رکھوا دیا۔ باغ کا مالی صبح کو بیدار ہوا تو اس نے بُت کو باغ میں موجود پایا۔ راجہ کے خواب کی پہلے سے شہرت تھی ادھر بُت بھی ویسا ہی تھا یک دم شور مچ گیا کہ غزنی سے بُت واپس تشریف لے آیا جیسا کہ اُس نے خواب میں راجہ سے کہا تھا۔ اس کے بعد وہ پنڈت جو اس تجویز کا بانی تھا راجہ کو ہمراہ لے کر بُت کے سامنے پہنچا خوب خوشیاں منائی گئیں۔ آخر وہی پنڈت جی مہاراج بُت کے پجاری اور خادم قرار دیئے گئے۔ انھوں نے اعلان کیا کہ بُت کہتا ہے کہ میں ایک شب میں غزنی سے چل کر یہاں تک پہنچا ہوں اس لئے کسی قدر تھک گیا ہوں مجھ کو ذرا آرام کرنے دو اور بہت جلد نگرکوٹ کو مسلمانوں سے خالی کردو۔ چنانچہ نگرکوٹ پر ہندوؤں کا قبضہ مکمل ہوگیا۔ اس واقعہ کی شہرت تمام ہندوستان میں ہوئی اور بہت سے راجہ دہلی کے راجہ کی امداد و اعانت کو پہنچ گئے اور بت کی زیارت سے مشرف ہوئے یہ تمام واقعات اور بُت کے خواب میں دیکھنے اور غزنی سے واپس آنے کا قصہ بالتفصیل تاریخ فرشتہ میں درج ہے۔ سلطان عبدالرشید کے زمانہ میں ایک مسلمان سردار نے حملہ کرکے اس علاقہ کو دہلی کے راجہ سے چھین لیا۔

لیکن ۴۶۳ھ میں ہندوؤں نے پھر زور پکڑ کر تھانیسر و ہانسی پر قبضہ کرلیا۔ یہ حال سُن کر ۴۷۵ھ میں سلطان ابراہیم بن مسعود نے حملہ کیا اور ہندوؤں سے اس علاقے فتح کیا۔ ہندو راجاؤں نے خراج بھیجنا بند کر دیا تھا اُن سے خراج وصول کرلیا اور سلطان محمود کے زمانہ کی عظمت و شوکت پھر ہندوستان میں قائم کردی۔ ۵۱۱ھ میں جب کہ ارسلان شاہ اور بہرام شاہ کی مخالفت کے سبب سلطنت غزنی کی حالت بہت ہی خراب ہوگئی تھی خود سلطنت غزنی کے ایک سپہ سالار نے جو ہندوستان میں مامور تھا اپنی بغاوت کو کامیاب بنانے کے لئے تھانیسر و سونی پت کے علاقہ کو دہلی کے راجہ کی سپرد کردیا مگر چند ہی روز کے بعد بہرام شاہ نے ہندوستان آکر اس علاقہ کو سلطنت غزنی میں شامل کیا اور پھر سلطنت غزنی کا تسلط اور رعب اس ملک کے راجاؤں پر قائم کیا معلوم ہوتا ہے کہ سلطنت غزنی اگرچہ بے حد کمزور ہوکر موت اور زیست کی کشمکش میں مبتلا تھی لیکن پھر بھی اُس کا اس قدر رعب ضرور قائم تھا کہ پنجاب و سندھ وغیرہ کی طرف ہندو نظر اُٹھا کر نہ دیکھ سکے۔ ہانسی و تھانیسر کے علاقے کو جب کبھی موقعہ ملتا تھا ہندو

دبالینا چاہتے تھے مگر جب کبھی سلطنت غزنی کا کوئی سلطان یا سردار اس طرف فوج کشی کرتا تھا فوراً چھوڑکر الگ ہوجاتے تھے۔

بہرام شاہ کے بعد جب کہ خسرو شاہ غوریوں کے مقابلے میں نہ ٹھہر سکا تو دہلی کے راجہ نے پھر اس علاقے پر قبضہ کرنے کی کوشش کی اور خسرو ملک کے عہد میں وہ اس پر قابض ہوگیا۔ اس علاقے کو سلطنتِ غزنی نے پنجاب کا جزو بنادیا تھا لیکن دہلی کا راجہ اس کو اپنی ریاست کا جزو اور پنجاب سے جدا سمجھ کر اس پر قابض ہونا اور اس علاقے کو اپنے ماتحت رکھنا چاہتا تھا۔ اس جگہ یہ بیان کردینا بھی ضروری ہے کہ ۳۰۷ھ میں توار قوم کے ایک راجپوت راجہ نے دلی کو آباد کیا تھا جو تھانیسر کا راجہ تھا۔ اس کے بعد سلطان محمود غزنوی کے خلاف تمام ملک میں ایک عام تحریک پھیل گئی اور سلطان محمود کو تھانیسر وغیرہ پر حملے کرنا پڑے اور تھانیسر کے راجہ نے دہلی میں قیام کیا۔ سلطان مسعود کی فوج کشی اور ہانسی و سونی پت کی فتح کے بعد تھانیسر کا راجہ جو تھانیسر سے بے دخل ہوکر دہلی میں رہنے لگا تھا بہت ہی زیادہ ذلیل و بے اعتبار ہوگیا تھا مگر سلطان مودود کے زمانے میں جب کہ سلطنت غزنی کے وقار کو سلجوقیوں نے سخت نقصان پہنچا دیا تھا تو اسی توار خاندان کے ایک نوعمر راجہ اننگ پال اول نے جو اپنے باپ کی سقیم و ذلیل حالت دیکھ چکا تھا اپنی حالت میں تبدیلی پیدا کرنی چاہی اور ۴۳۵ھ میں تھانیسر اور کانگڑہ کا علاقہ مصنوعی خواب کے ذریعہ جیسا کہ اوپر ذکر ہوچکا ہے فتح کرلیا۔ اس کے بعد اننگ پال نے ۴۳۶ھ میں دلی کے اندر سنگین عمارتیں اور قلعہ تعمیر کیا۔ ۴۶۵ھ میں سلطان ابراہیم غزنوی نے اننگ پال اول کی اچھی طرح گوشمالی کی اور دوسرے راجاؤں کو بھی درست بنایا۔ ۴۸۱ھ میں سلطان ابراہیم غزنوی کا انتقال ہوا اور ہندوستان کے راجاؤں کو پھر اپنی حالت مضبوط کرنے کا خیال آیا۔ مسلمانوں کی حملہ آوریوں کا یہ نتیجہ ضرور ہوا تھا کہ بعض راجپوت جو پہلے طاقتور تھے کمزور اور بعض جو پہلے کمزور تھے وہ طاقتور ہوگئے تھے۔ چنانچہ ۴۸۳ھ میں بنارس کے راجہ چندر دیو نے قنوج پر حملہ کرکے راجہ کنور رائے کی اولاد کو چُن چُن کر قتل کیا اور اس خاندان کا جو سلطان محمود غزنوی کے زمانے میں قنوج کا حکمران تھا خاتمہ ہوکر چندر دیو اور اس کے خاندان کی حکومت قنوج میں شروع ہوئی۔ چندر دیو راٹھور خاندان کا راجپوت تھا اسی کی

اولاد میں قنوج کا راجہ جے چند تھا۔ جو سلطان شہاب الدین غوری کے مقابلے میں قطب الدین ایبک کے تیر سے مارا گیا تھا۔

حسن بن صباح عجیب اتفاق کی بات ہے کہ جس سال قنوج میں راٹھور خاندان کی حکومت شروع ہوئی اسی سال سیستان کے قلعہ الموت میں حسن بن صباح نے باطنی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ حسن بن صباح بھی ایک خاص مذہب کا بانی تھا اس کی جماعت کے لوگوں کو باطنی، فدائی اور حشاشین وغیرہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ لوگوں نے غلطی سے قرامطہ اور باطنی فرقہ میں کوئی امتیاز نہیں کیا۔ حالانکہ یہ دو جدا جدا فرقے ہیں لیکن دشمن اسلام اور قاتل المسلمین ہونے میں دونوں ایک دوسرے کے مثیل و مماثل ہیں جس طرح قرامطہ نے سلطان محمود غزنوی کے خلاف ہندوؤں کی طرح طرح سے امداد کی اسی طرح ان باطنیوں نے سلطان شہاب الدین غوری کے خلاف ہندوؤں کو امداد پہنچائی۔ ان باطنیوں نے قرامطہ سے بھی زیادہ عالم اسلام کو نقصان پہنچایا۔ قرامطہ کی سرگرمیوں کے کم ہوتے ہی باطنی گروہ میدان میں نکل آیا حسن بن صباح نے اس گروہ کو پیدا کر کے الپ ارسلان اور ملک شاہ سلجوقی کے وزیر اعظم نظام الملک طوسی کو اپنے ایک شاگرد ابو طاہر فدائی کے ہاتھ سے بمقام نہاوند ۴۸۵ھ میں قتل کرادیا۔ یہ باطنیوں یا ملحدوں کا سب سے پہلا شکار تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ مسعود بن ابراہیم غزنی کا فرماں روا تھا۔ سلجوقیوں کی سلطنت میں بھی زوال پیدا ہو چکا تھا۔ ادھر یورپی عیسائیوں نے کروسیڈ یعنی صلیبی لڑائیوں کا سلسلہ جاری کر دیا تھا۔ ادھر باطنیوں نے چن چن کر مسلمان سرداروں اور بہادر بادشاہوں کو قتل کرنا شروع کر رکھا تھا ۴۹۴ھ میں باطنیوں نے عراق میں ہزاروں مسلمانوں کو قتل کر ڈالا لوگ خوف کے مارے کپڑوں کے نیچے ہمہ اوقات زرہ پہنے رہتے تھے۔ عیسائیوں نے سروج، حیفا، ارسوف، قیساریہ وغیرہ مقامات پر قبضہ کیا اور باطنیوں نے اصفہان مسلمانوں سے چھین لیا۔ ۵۰۲ھ میں باطنیوں نے شیراز پر قبضہ کیا اور ۵۰۳ھ میں طرابلس پر عیسائیوں کا قبضہ ہوا۔ موصل کے بادشاہ مودود کو جو عیسائیوں سے لڑنے کے لئے نکلا تھا ۵۰۷ھ میں ایک باطنی نے جامع مسجد دمشق میں قتل کر دیا۔

عالم اسلام کی پریشانی غرض یہ زمانہ عالم اسلام کے لئے بڑی پریشانی اور مصیبت کا زمانہ تھا۔ سلاطینِ غزنی کوئی طاقت نہ رکھتے تھے ۔۔۔

ہندوستان میں اگرچہ اُن کا رعب ہندوؤں پر چھایا ہوا تھا مگر حقیقۃً وہ برائے نام فرماں روا تھے۔ ترکانِ غز (غارت گر قبائل ترک) نے تمام خراسان و ایران کو پامال کر ڈالا تھا اور سلجوقیوں کا رعب مٹ چکا تھا۔ غور کے حاکم جو سلطان غزنی کے محکوم تھے سلطان غزنی کے مقابلے کی تیاری کر رہے تھے۔ ادھر ۴۹۸ھ میں چندر دیو کے پوتے گوبند چندر نے قنوج میں تخت نشین ہوکر اپنی خود مختاری کا اعلان کیا اور ۵۵۰ھ تک قنوج میں خوب زور شور سے حکومت کرتا رہا۔ اسی گوبند چندر کے زمانہ میں غزنی کے ایک سپہ سالار نے جو ہندوستان میں مامور تھا بغاوت اختیار کی اور تھانیسر و سونی پت کا علاقہ دہلی کے راجہ اننگ پال ثانی کے سپرد کر دیا تھا۔ اجمیر کے راجہ کا ذکر اوپر آچکا ہے کہ سومنات کی فتح کے بعد ۴۱۷ھ میں سلطان محمود غزنوی نے اس کو سزا دے کر سلطنت غزنی کا باقاعدہ خراج گذار بنایا تھا۔ بنارس کے راٹھور راجہ پر فتح مند ہوکر احمد نیالتگین نے اس کو سلطنت غزنی کا باج گذار بنایا تھا۔ یہی بنارس کا خاندان اب قنوج میں حکمران تھا۔ غرض یہ سارے کے سارے راجہ سلطنت غزنی کے خراج گذار و ماتحت تھے۔ لیکن اب سلطانِ غزنی کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اُنھوں نے باقاعدہ خراج بھیجنا بند کر دیا تھا۔ اننگ پال ثانی فرماں روائے دہلی کی دو بیٹیاں تھیں کوئی بیٹا نہ تھا اُس نے ایک بیٹی کی شادی اجمیر کے راجہ مسمی سومیشور یا سومیر جی سے اور دوسری کی شادی قنوج کے راجہ گوبند چندر سے کی تھی۔ اجمیر کا راجہ قوم سے چوہان تھا اور قنوج کا راٹھور۔ اننگ پال کی ان دونوں لڑکیوں سے ایک ایک لڑکا پیدا ہوا۔ اننگ پال کے قنوجی نواسے کا نام جے چند اور اجمیری نواسے کا نام پرتھی راج تھا۔ جے چند عمر میں بڑا تھا وہ ۵۵۰ھ میں قنوج کا راجہ ہوا۔ پرتھی راج جو چھوٹی بیٹی کا بیٹا اور عمر میں بھی چھوٹا تھا اننگ پال کو زیادہ محبوب تھا۔ اننگ پال نے پرتھی راج کو اپنا متبنیٰ بنا کر اپنا وارث و جانشین قرار دیا۔ پرتھی راج اننگ پال کی وفات کے بعد دہلی اور اجمیر دونوں ریاستوں کا مالک اور فرماں روا قرار پایا۔ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ سلاطینِ غزنی جب کہ بے حد کمزور ہو چکے تھے یعنی خسرو شاہ اور خسرو ملک کے زمانے میں بھی کسی ہندو راجہ کو یہ جرأت نہیں ہوئی تھی کہ وہ پنجاب پر قبضہ کرنے کی کوشش کرتا۔ دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ ہندوؤں نے پنجاب کے ملک کو سلطنت غزنیں کا صوبہ اور مسلمانوں کا ملک تسلیم کر لیا تھا۔ اس عرصہ میں ویشنو مذہب کی جگہ شیو کے مذہب کا رواج زیادہ ہو گیا تھا اور راجپوت قومیں جن کو

برہمنوں نے چھتریوں کا قائم مقام بنایا تھا اب اپنی ریاستیں قائم کرکے برہمنوں کی اطاعت سے بہت کچھ آزاد ہوچکی تھیں ہندوؤں میں مسلمانوں کی مصاحبت وہمسائگی کے اثر سے بہت کچھ روشن خیالی اور تہذیب وشائستگی پیدا ہونے لگی تھی۔ وہ مذہبی نفرت وعداوت جو محمود غزنوی کے ابتدائی زمانے میں برہمنوں نے مسلمانوں کی نسبت ہندوؤں میں پیدا کردی تھی سلطنت غزنی کے آخری ایام حکومت میں بہت کچھ مٹ چکی تھی اور برہمنوں کی گذشتہ انقلابی کوششوں اور ہندو قوموں نیز ہندی ریاستوں اور راجاؤں کو اپنے مشوروں اور منصوبوں کے مواقع متحرک اور معمول بنائے رکھنے کا یہ قدرتی اثر تھا کہ ہندوستان کی محکوم ومغلوب ہندو قوم نے برہمنوں کو اپنا رہبر پیشوا اور دیوتا سب کچھ سمجھ لیا تھا۔ سلطان محمود غزنوی کے زمانے سے سلطان شہاب الدین غوری بلکہ سلطان علاء الدین خلجی کے زمانے تک ہندو ریاستیں متزلزل اور ہندو طاقت روبہ انحطاط رہی۔ لیکن اس عرصہ میں برہمنوں کا اثر واقتدار ہندو اقوام میں برابر ترقی کرتا رہا مسلمانوں کو برہمنوں سے اگر مخالفت ہوسکتی تھی تو محض اس لئے کہ وہ قرامطہ اور ملاحدہ کی سازشوں میں شریک ہوکر سلطنت اسلامیہ کی بربادی کے خواہاں رہتے تھے۔ لیکن جب قرامطہ اور ملاحدہ کا خاتمہ ہوگیا یا برہمنوں نے اُن سے تعلق نہ رکھا تو مسلمانوں نے بھی ان کے اس اثر واقتدار کو جو وہ ہندو اقوام میں حاصل کر رہے تھے قطعاً کوئی نقصان پہنچانا نہیں چاہا اور نہ اُن کو اس کی ضرورت تھی کہ وہ ہندو اقوام کے مذاہب ومعتقدات میں دخل دیتے اور ہندوؤں کو برہمنوں کی سیادت وپیشوائی سے نکالنے کی کوشش کرتے۔ برہمنوں نے اسی زمانے میں نئے نئے مذاہب اور نئے نئے عقیدے ایجاد کئے۔ پران تصنیف ہوئے اور برہمنوں کی ہستی ایک مافوق الانسانیت ہستی سمجھی جانے لگی۔ ہندو اقوام میں برہمنوں کا یہ درجہ ابھی ماضی قریب تک بدستور باقی رہا۔ لیکن اب بہت جلد جلد اُن کا اثر واقتدار فنا ہو رہا ہے۔

ہندوستان میں اسلامی حکومت قائم ہونے کا اثر

خلاصۂ کلام یہ کہ ہندوستان کے ہندو مذاہب اور پرانوں کی عمر ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے زمانے سے زیادہ پرانی نہیں ہے اور خاندان غزنی کے عہد حکومت میں ہندو مذاہب واقوام کا ایک بڑا حصہ تعمیر ومرتب ہوا تھا، یہ بات بھی فراموش نہ ہونی چاہیئے کہ مسلمانوں نے اگرچہ ہندوؤں کے مذہبی وقومی اور اندرونی معاملات میں کوئی دخل نہیں دیا تاہم ہندوستان میں اسلامی حکومت کے قائم ہونے

کا یہ اثر ضرور ہوا کہ غیر آریوں یعنی ہندوستان کے قدیم باشندوں پر بدھوں کے زوال سے جو مصائب کے پہاڑ اُسی طرح ٹوٹنے والے تھے جیسا کہ بدھوں کی حکومت سے پیشتر منو شاستر کے موافق ٹوٹ چکے تھے اُن میں ضرور تخفیف ہوئی۔ برہمنوں نے اگرچہ جدید برہمنی مذہب میں برہمنوں کی تکریم اور شودروں کو حقوقِ انسانیت سے محروم رکھنے کے اُصول کو فراموش نہیں کیا لیکن مسلمان حاکموں کے ماتحت وہ آزادانہ شودروں کو چوپاؤں کی طرح ہدفِ مظالم بنانے کی جرأت نہیں کر سکے اگرچہ معتقدات اور معاشرتی تعلقات میں شودروں کی ذلت و تحقیر بخوبی موجود رہی۔ یہی وجہ ہے کہ سندھ میں جہاں مسلمانوں کی حکومت سب سے پہلے قائم ہوئی برہمن اور شودر کے درمیان کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ پنجاب میں جہاں سندھ کے بعد مگر باقی تمام صوبجات ہند سے قریباً دو سو سال پہلے سلطان محمود نے اسلامی حکومت قائم کر دی تھی برہمن اور شودر کا امتیاز موجود تو ہے مگر دوسرے صوبوں کے مقابلے میں اُس کی کوئی حقیقت نہیں۔ دکن کو مسلمانوں نے سب سے بعد کو فتح کیا لہٰذا دکن میں یہ امتیاز سب سے زیادہ نمایاں نظر آتا ہے اور آج بھی وہاں برہمنوں اور غیر برہمنوں کا ہنگامہ برپا نظر آتا ہے۔ جن جن صوبوں یا ضلعوں میں اسلامی حکومت کے قائم ہونے میں دیر ہوئی اُن ہی صوبوں اور ضلعوں میں برہمنوں کو غیر آریوں یعنی شودروں کے ذلیل کرنے اور اپنا اقتدار قائم کر کے شودروں کو حقوقِ انسانیت سے محروم رکھنے کا زیادہ موقعہ ملا۔ اور اسی لئے آج ہندوستان کے مختلف حصوں میں مختلف مراتب اور مختلف طرزِ عمل نمایاں ہیں۔ پس اس حقیقت سے ہرگز انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمانوں کا اس ملک میں آنا اور اپنی حکومت قائم کرنا غیر آریہ قوموں اور شودروں کے لئے ایک ابرِ رحمت تھا۔

یہ دوسرا باب کسی قدر طویل ہو گیا مگر اظہار و بیان کے قابل بہت سی باتیں ابھی باقی رہ گئی ہیں جن کی طرف اشارہ انشاء اللہ آئندہ ابواب میں کیا جائے گا۔ اس دوسرے باب میں بھی جس حقیقت کو بے پردہ کیا گیا ہے اُس کا یہ منشا ہرگز نہیں کہ اس ملک کی کسی قوم کو رنج پہنچایا جائے بلکہ اُس شرارت سے ہم وطنوں کو آگاہ کرنا ہے جو تاریخ کے نام سے اس ملک میں شائع اور سلطان محمود غزنوی کو بلاوجہ بدنام و مطعون کرنے کا باعث ہوئی ہے۔

باب سوم

پہلے اور دوسرے باب میں سندھ اور پنجاب کے صوبوں کی فتح اور ان کے سلطنت اسلامیہ میں شامل ہونے کا حال بالتفصیل بیان ہو چکا ہے۔ اس باب میں یہ بیان ہونے والا ہے کہ پنجاب کے علاوہ باقی شمالی ہند یعنی پنجاب کی مشرقی سرحد سے بنگال کی مغربی حد تک کا علاقہ کس طرح سلطنتِ اسلامیہ میں شامل ہوا اور تمام شمالی ہند پر قابض ہوتے ہی مسلمانوں نے ہندوستان میں ایک مستقل حکومت قائم کرلی اور اس ملک کو اپنا وطن قرار دے کر کسی دوسرے ملک کی سیادت اور کسی دوسری مرکزی حکومت کی ماتحتی سے ہندوستان کو آزاد اور ہندوستانی سلطنت کو خود مختار بنا دیا اور اس طرح ہندوستانی مال و دولت کو غور و ہرات و بخارا و کابل و بغداد و خوارزم وغیرہ کہیں بھی جانے کا موقع نہیں ملا اور نہ مغولان چنگیزی ہندوستان کو کوئی نقصان پہنچا سکے۔ پہلے باب کا مرد میدان (ہیرو) محمد بن قاسم اور دوسرے کا سلطان محمود غزنوی تھا۔ اس تیسرے باب کا ہیرو سلطان شہاب الدین غوری کو سمجھنا چاہیئے۔ اور اسی لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اول خاندان غوری کے مختصر حالات بیان کر دیئے جائیں۔

غوری خاندان کا تذکرہ شروع کرنے سے پیشتر یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ اس باب کو شروع کرتے وقت تاریخ فرشتہ، تاریخ بدایونی، خلاصۃ التواریخ، مفتاح التواریخ، طبقات ناصری، تاریخ ہنٹر، تاریخ الفنسٹن وغیرہ پچیس سے زیادہ تاریخیں میں نے اپنے سامنے الماریوں سے نکال کر رکھ لی ہیں۔ لیکن میں سب سے زیادہ طبقات ناصری پر اعتماد کروں گا اور واقعات

کی نگارش میں اسی کو زیادہ پیش نظر رکھوں گا۔ کیونکہ سلطان شہاب الدین غوری کی شہادت سے قریباً پچاس سال بعد طبقات ناصری لکھی گئی ہے۔ طبقات ناصری کا مصنف ابوعمر منہاج الدین عثمان بن سراج الدین جوزجانی جو منہاج سراج کے نام سے مشہور ہے سلاطین غوریہ سے خصوصی تعلق رکھتا اور اکثر اپنے چشم دید حالات قلمبند کرتا ہے۔ اس تیسرے باب کے لئے طبقات ناصری اور تاج المآثر سے بڑھ کر کوئی اور کتاب قابل التفات اور لائق اعتماد نہیں ہو سکتی جیسا کہ دوسرے باب کے لئے تاریخ بیہقی سب سے زیادہ مفید اور قابل اعتماد کتاب تھی۔

غوری خاندان کے مختصر حالات

اوپر دوسرے باب میں محمد بن سوری حاکم غور کا ذکر آچکا ہے کہ اس نے قرامطہ کی سازش و تحریک سے سلطان محمود غزنوی کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا اور بالآخر سخت معرکے کے بعد گرفتار و مقتول ہوا تھا۔ اس محمد بن سوری کا خاندان عرصہ دراز سے غور کے پہاڑی علاقے میں برسر حکومت چلا آتا تھا۔ پٹھانوں یا افغانوں کی دو مشہور قومیں ہیں ایک شنسبی دوسری قیسی۔ قیس بن عیص المعروف بہ عبدالرشید کی نسبت بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلعم کے زمانے میں مدینہ منورہ حاضر ہو کر مسلمان ہوئے اور افغانستان واپس آکر اپنے قبیلے کو مسلمان بنایا۔ انھیں کو آنحضرت صلعم سے بتان یا پٹھان کا خطاب دیا تھا۔ قیس عبدالرشید کی اولاد افغانستان و صوبہ سرحدی کی غالب آبادی ہے۔

شنسب بن حریق جو علاقہ غور کا رئیس تھا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے زمانے میں مسلمان ہوا اس کی اولاد قوم شنسبی کہلائی۔ انھیں میں لودی و سوری وغیرہ پٹھان شامل ہیں۔ محمد بن سوری مذکور اسی شنسب بن حریق کی اولاد میں تھا۔ عباسیوں اور علویوں نے مل کر جب بنو اُمیہ کے خلاف سازشیں اور کوششیں شروع کیں تو علاقہ غور کا یہ شنسبی خاندان جو اس علاقے میں حکومت و سرداری بھی رکھتا تھا ابومسلم خراسانی کا شریک کار بن گیا۔ خلافتِ عباسیہ کے قائم ہو جانے پر اس خاندان کی عزت افزائی کی گئی اور اس کو علاقہ غور کی سندِ حکومت خلیفہ کی طرف سے مل گئی۔ چند ہی روز کے بعد جب علویوں نے عباسیوں کے خلاف سرگرمی شروع کی تو غور کا یہ خاندان محب اہلِ بیت ہونے کی وجہ سے علویوں کی خفیہ سازشوں میں شریک ہو گیا۔ جب قرامطہ نے خراسان و افغانستان میں اپنی تحریک شروع کی تو سب سے پہلے یہی خاندان قرامطہ کا ہم نوا ہوا اور ناقابلِ تسخیر پہاڑی علاقہ ہونے کی

وجہ سے قرامطہ نے اس علاقے اور اس شنسبی خاندان کو اپنی خصوصی کوششوں کا محل و معمول بنا یا۔ حتیٰ کہ محمد بن سوری نے سلطان محمود غزنوی کا زبردست مقابلہ کیا۔ سلطان محمود غزنوی نے محمد بن سوری کے بعد اس کے بیٹے ابو علی کو غور کا حاکم مقرر کر دیا۔ ابو علی سلطان محمود کا ہم عقیدہ اور قرمطی مسلک سے سخت متنفر تھا امیر ابو علی کے بعد اس کا بھائی شیش (شیث) غور کا امیر مقرر ہوا۔ شیش کے بعد اس کا بیٹا عباس امیر غور ہوا۔ عباس کے بعد اس کا بیٹا امیر محمد اور امیر محمد کے بعد اس کا بیٹا قطب الدین حسن اور قطب الدین حسن کے بعد اس کا بیٹا عزالدین حسین غور کا امیر مقرر ہوا یہ سب کے سب اپنے مورث اعلیٰ محمد بن سوری کی تقلید میں مذہب قرامطہ کے پیرو مگر سلاطین غزنی کے مطیع رہے سلطان محمود غزنوی اور سلطان مسعود بن محمود غزنوی کے بعد الرشید بن مسعود اور فرخ زاد بن مسعود کے عہد حکومت میں مصر کے عبیدی فرماں روا مستنصر باللہ نے اپنے معتمد خاص اور مرید با اختصاص حکیم ناصر خسرو علوی خراسانی کو جو اسمٰعیلیہ عقیدہ کا پیرو اور عبیدی سلطنت کا بدل ہوا خواہ تھا۔ ممالکِ مشرقیہ کی طرف اس مہم پر روانہ کیا کہ غزنوی وسلجوقی و عباسی حکومتوں کے خلاف کوششیں عمل میں لائے اور عبیدی خاندان کی اسمٰعیلیہ سلطنت کو مذہبی سلطنت اور فرماں روائے مصر کا خلیفہ برحق ہونا ثابت کرے چنانچہ حکیم موصوف مصر سے گجرات ہوتا ہوا ملتان اور ملتان سے لاہور پہنچا لاہور سے افغانستان و خراسان پہنچ کر اسمٰعیلیت کی اشاعت میں مصروف رہا اور غوریوں نے سب سے زیادہ اثر قبول کیا۔ حکیم ناصر خسرو نے اپنے سفرنامے میں واضح طور پر اپنے مقصد سفر کو بیان نہیں کیا اور نہ کر سکتا تھا۔ لیکن خواجہ الطاف حسین صاحب حالی نے موصوف کی زندگی کے حالات لکھتے ہوئے بہت کچھ حقیقت کو نمایاں کر دیا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں کہ

> "باید دانست کہ خلفائے فاطمیین (عبیدیین) ہموارہ داعیۂ آن داشتند کہ سایہ صولت واقتدار خویش بر ممالک آسیا اندازند وعظمت وبزرگی خلفائے بغداد را از قلوب اہالی شرق محو کردہ ایشان را بسوئے خویش مائل سازند خاصۃً مستنصر باللہ کہ شصت سال متصدیٔ امر خلافت بودہ فرصت این کار بیشتر از خلفائے ماضیہ اورا دست دادہ بود وہموارہ از طرف او جواسیس و دعاۃ درین صفحات میرسیدند تا مردم را بہ روش اسمٰعیلیت دعوت کنند وحکومت مصررا در لباس مذہب رونق دہند

حکیم ناصر خسرو نے ۴۴۴ھ سے ۴۸۱ھ تک افغانستان و خراسان میں نہایت سرگرمی سے اسمٰعیلیہ مذہب اور عبیدی سلطنت کی خدمات انجام دیں اور اپنے آپ کو کبھی صوفی باصفا کبھی شاعر غرا اور کبھی اعلم العلماء کی حیثیت سے پیش کیا اور سلاطین غزنویہ کو بہت کچھ نقصان پہنچایا۔
غرض ملک عزالدین حسین جس زمانے میں غور کے علاقے پر حکومت کرتا تھا اس زمانے میں غزنی کی سلطنت سلطان ابراہیم غزنوی کی وفات کے بعد بہت کمزور ہو چکی تھی۔ ملک عزالدین حسین نے سلطان سنجر سلجوقی سے نیازمندانہ مراسم پیدا کر کے سلطنت غزنی کی اطاعت سے عملی طور پر کامل آزادی حاصل کر لی تھی۔ مسعود بن ابراہیم اور اس کے بیٹے ارسلان بن مسعود نے بھی چشم پوشی اور بے التفاتی سے کام لے کر عزالدین حسین کی آزادی کو تسلیم اور گوارا کر لیا تھا۔ عزالدین حسین جب فوت ہوا تو اس کے سات بیٹے تھے جو سب کے سب جوان اور مردانِ کار تھے۔ ان کے نام یہ ہیں (۱) فخرالدین مسعود (۲) قطب الدین محمد (۳) سیف الدین سوری (۴) بہاؤالدین سام (۵) علاؤالدین حسین (۶) شہاب الدین محمد (۷) شجاع الدین علی۔ سب سے بڑا فخرالدین مسعود اور اس سے چھوٹا قطب الدین محمد تھا۔ یہ دونوں ترکیہ پرستاروں کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے۔ باقی پانچ بیٹوں میں سب سے بڑا سیف الدین سوری تھا لہٰذا عزالدین حسین کی وفات کے بعد سیف الدین سوری باپ کا جانشین اور غور کی ریاست کا جو عزالدین حسین کے زمانے میں بہت وسیع ہو چکی تھی فرماں روا مقرر ہوا۔ لیکن سیف الدین سوری نے تنہا فرماں روا بن کر باقی بھائیوں کو حکومت و فرماں روائی کے لطف سے محروم رکھنا گوارا نہ کر کے غور کی ریاست کو سات چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کر کے ہر ایک بھائی کو ایک ایک ریاست کا خود مختار فرماں روا بنا دیا۔ اپنے پاس بھی بہ حصہ مساوی ایک چھوٹی سی ریاست رکھی۔ اتفاق کی بات قطب الدین محمد کی باقی بھائیوں سے ان بن اور ناچاقی ہو گئی۔ اور اس آپس کی مخالفت نے یہاں تک نوبت پہنچائی کہ قطب الدین محمد اپنی ریاست چھوڑ کر غزنی چلا آیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ غزنی میں بہرام شاہ بن مسعود فرماں روا تھا۔ بہرام شاہ قطب الدین کے ساتھ بہت خاطر اور عزت سے پیش آیا۔ قطب الدین محمد غزنی میں رہنے لگا۔ چند روز کے بعد حاسدوں اور واقعہ پسند لوگوں نے بہرام شاہ سے قطب الدین کی شکایت کی کہ وہ آپ کو قتل اور غزنی کے تخت پر قبضہ کرنے کی سازش اور کوشش کر رہا ہے۔ بہرام شاہ نے قطب الدین کو قتل کرا دیا اور وہ غزنی میں مدفون ہوا۔

پہلا غوری بادشاہ

قطب الدین محمد کے حادثہ کا حال سُن کر سیف الدین محمد سوری نے فوج لے کر اور اپنی ریاست اپنے بھائی بہاؤالدین سام کی نگرانی میں چھوڑ کر غزنی پر انتقاماً چڑھائی کی۔ بہرام شاہ غزنوی نے مقابلہ کر کے شکست کھائی اور ہندوستان کی طرف چلا آیا سیف الدین محمد سوری نے غزنی پر قبضہ کر کے تختِ سلطنت پر جلوس اور اپنے نام کے ساتھ سلطان کے لقب کا اضافہ کیا۔ خاندان غوری میں سیف الدین سب سے پہلا سلطان ہوا۔ سیف الدین نے غزنی میں نہایت عدل و انصاف کے ساتھ حکومت کی باشندگان غزنی نے بھی اس کی اطاعت و فرماں برداری میں کوتاہی نہ کی۔ جب موسم سرما آیا اور برف باری سے غور و غزنی کے درمیان آمد و رفت کا راستہ بند ہو گیا تو بہرام شاہ نے ہندوؤں کی فوج اور ہندو ماتحت راجاؤں اور ٹھاکروں کو ہمراہ لے کر غزنی پر حملہ کیا۔ سیف الدین مقابلہ کے لئے غزنی سے باہر نکلا۔ اہل غزنی جو سیف الدین کی فوج میں شامل تھے میدان جنگ میں پہنچتے ہی بہرام شاہ سے جا ملے اور سیف الدین بآسانی گرفتار کر لیا گیا۔ بہرام شاہ نے سیف الدین سوری کو نہایت ذلت کے ساتھ ایک سریل بیل کے اوپر سوار کرا کر شہر میں تشہیر کرایا اور پھر قتل کرا دیا۔ سیف الدین سوری کے وزیر سید مجد الدین موسوی کو بھی اسی ذلت کے ساتھ قتل کیا گیا۔ یہ حال سُن کر بہاؤالدین سام نے غور کی ریاست اور اپنا تمام علاقہ اپنے چھوٹے بھائی علاؤالدین حسین کے سپرد کیا اور خود فوج لے کر اپنے دونوں مقتول بھائیوں کے خون کا بدلہ لینے کے لئے غزنی کی جانب روانہ ہوا لیکن ابھی راستے ہی میں تھا کہ فوت ہو گیا۔

علاء الدین جہانسوز

یہ خبر سُن کر علاؤالدین حسین نے ایک زبردست لشکر فراہم کیا اور علاقہ غور کے جنگجو لوگوں کو اپنے مقتول بھائیوں کی مظلومی کے حالات سُنا سُنا کر انتقام پر مستعد اور بے حد پُرجوش بنا دیا۔ علاؤالدین کی فراہمی لشکر اور غزنی پر فوج کشی کے ارادے کا حال سُن کر بہرام شاہ نے ہندی سطلیوں اور راناؤں کو ہمراہ لے کر غور کی طرف پیش قدمی کی مقام زمینداور کے قریب دونوں لشکر ایک دوسرے کے مقابل خیمہ زن ہوئے، بہرام شاہ نے علاؤالدین کے پاس پیغام بھیجا کہ تم غور کی وسیع ریاست پر قناعت کرو اور ہماری مخالفت کا خیال ترک کر دو تو ہم تم سے مطلق تعرض نہ کریں گے۔ علاؤالدین نے جواب دیا کہ میں اپنے مظلوم بھائیوں کا انتقام لینے کے لئے نکلا ہوں اس لئے مجھ کو یقین ہے کہ میں ضرور فتحمند ہوں گا۔ آخر لڑائی ہوئی اس لڑائی میں بہرام شاہ کا بیٹا دولت شاہ جو بہرام شاہ

کی فوج کا سپہ سالار بھی تھا مارا گیا۔ اس کے مارے جانے سے بہرام شاہ اور اس کی فوج بددل ہوگئی۔ چنانچہ غوری لشکر نے غزنوی فوج کو بھگا دیا۔ تگین آباد میں آکر بہرام شاہ نے اپنی فوج اور مفرور ہندو سرداروں کو سمیٹ کر پھر ایک مقابلہ کیا مگر اس مرتبہ بھی شکست کھائی یہاں سے فرار ہوکر خاص شہر غزنی کی دیواروں کے نیچے ایک مقابلہ کیا۔ لیکن شکست کھائی اور ہندوستان کی طرف بھاگ آیا۔ علاؤالدین حسین نے غزنی میں داخل ہوکر سات شبانہ روز قتل عام کرایا اور شہر میں آگ لگا کر ایک ایک عمارت کو جلا یا حتی کہ سلاطین غزنی کے مقبروں کو اُدھیڑ کر لاشوں اور ہڈیوں کو نکلوایا اور آگ میں جلایا۔ صرف سلطان محمود غزنوی سلطان مسعود غزنوی اور سلطان ابراہیم غزنوی کی قبروں کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ غزنی کا کوئی گھر اور کوئی خاندان جلنے اور قتل ہونے سے نہیں بچا اسی لئے علاؤالدین کو جہانسوز کا خطاب ملا۔ علاؤالدین جہانسوز غزنی کو برباد کرکے اپنے بھائیوں کے تابوت لے کر غور کی جانب چلا گیا اور اس کی ہیبت و شوکت کا دور دور تک سکہ بیٹھ گیا۔ بہرام شاہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ علاؤالدین غزنی سے غور چلا گیا ہے تو وہ ہندوستان سے پھر غزنی پہنچا اور چند روز کے بعد فوت ہوگیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا خسرو شاہ غزنی میں نہ ٹھہر سکا اور لاہور آکر قیام پذیر ہوا جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے۔ علاؤالدین جہانسوز نے غزنی کی فتح کے بعد ایک فخریہ نظم لکھی تھی جس کے بعض اشعار اس طرح ہیں ؎

آنم کہ ہست فخر ز عدلم زمانہ را / آنم کہ ہست جور ز بذلم خزانہ را
انگشت دست خویش بدندان کند عدو / چوں بر زہ کماں نہم انگشتوانہ را
بہرام شہ بہ کینۂ من چوں کماں کشید / کندم بہ کینہ از کمر او کمانہ را
پشتی خصم گرچہ ہمہ رائے و رانہ بود / کردم بہ گرز خورد سر رائے و رانہ را
کیں توختن بہ تیغ در آموختم کنوں / شاہانِ روزگار و ملوکِ زمانہ را

ان اشعار میں چوتھے شعر کے اندر رائے اور رانا خاص طور پر قابل توجہ ہیں جس محمود غزنوی کو آج کل ہندوؤں کا سب سے بڑا دشمن بنایا جاتا ہے اسی محمود غزنوی کی اولاد کی طرف دار بن کر ہندوؤں کے رائے اور رانا غوریوں سے لڑنے کے لئے نہ صرف غزنی بلکہ حدود غور تک پہنچے تھے۔ پس سمجھ میں نہیں آتا کہ اُس زمانہ کے ہندوؤں کی یہ حالت تھی تو آج کل کے ہندوؤں کو کس چیز نے غزنویوں کا مخالف و معاند بنا دیا ہے! علاؤالدین جہانسوز نے غزنی سے علاقہ غور کے

شہر فیروزکوہ میں آکر تخت سلطنت پر جلوس کیا اور اپنے آپ کو سلطان کے لقب سے ملقب کرکے وہ نذرانہ جو عزالدین حسین کے زمانہ سے سلطان سنجر سلجوقی کی خدمت میں بھیجا جاتا تھا بھیجنا بند کر دیا اور اپنے دونوں بھتیجوں یعنی بہاؤالدین سام کے بیٹوں شمس الدین اور شہاب الدین کو ایک قلعہ میں نظر بند کرکے ان کا روزینہ مقرر کر دیا۔ سلطان سنجر نے علاؤالدین جہانسوز کی سرکشی و سرتابی دیکھ کر لشکر خراسان کے ساتھ غور پر حملہ کیا۔ علاؤالدین نے مقابلہ کیا مگر شکست یاب ہو کر گرفتار ہوا۔ سلطان سنجر علاؤالدین جہانسوز کو پابزنجیر اپنے ہمراہ خراسان کی جانب لے گیا۔ یہاں تخت فیروزکوہ پر اُمراء نے مل کر علاؤالدین کے بھتیجے ناصرالدین حسین ابن شجاع الدین علی ابن عزالدین حسین کو بٹھایا۔ چند روز کے بعد ترکانِ غز نے خراسان پر حملے شروع کر دیئے۔ سلطان سنجر نے ترکان غز کے خطرات کو محسوس کرکے علاؤالدین حسین جہان سوز پر احسان کرنا مناسب سمجھا اور اس کو غور کے علاقے پر حکومت کرنے کے لئے آزاد کر دیا۔ علاؤالدین جہاں سوز کے آنے کی خبر سُن کر اُمراء نے ناصرالدین حسین ابن شجاع الدین علی کو قتل کرا دیا۔ علاؤالدین نے فیروزکوہ میں آکر تخت سلطنت پر جلوس کیا۔ انھیں ایام میں ترکانِ غز نے سلطان سنجر کو گرفتار کر لیا اور انھیں کی ایک جماعت نے آکر غزنی پر بھی قبضہ کر لیا۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ حسن بن صباح کی جماعت یعنی فدائیوں یا ملحدوں نے ممالک اسلامیہ میں ایک تہلکہ برپا کر دیا تھا اور اسی لئے ترکان غز کو ممالک اسلامیہ میں دست درازی کا موقع مل گیا تھا۔ حسن بن صباح کے جانشین محمد بن کیا۔ بزرگ اُمید فرماں روائے الموت (قہستان) نے علاؤالدین جہاں سوز کے دوبارہ غور میں آکر تخت نشین ہونے کے بعد اپنے ایلچی اس کے پاس بھیجے اور اپنے کیش و مذہب میں داخل ہونے کی ترغیب دی۔ علاؤالدین جہاں سوز اور اس کے باپ دادا چونکہ عرصہ دراز سے قرامطہ عقائد کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے مگر اول غزنویوں اور اب بعد میں سلجوقیوں کی وجہ سے اپنے خیالات و عقائد کی تشہیر و اشاعت میں احتیاط سے کام لیتے تھے۔ فرماں روائے الموت کی ترغیب و تبلیغ سے علاؤالدین جہاں سوز کو فدائی مذہب کے قبول کرنے میں کوئی تامل نہ ہوا۔ کیونکہ سلطان سنجر ترکان غز کے ہاتھ میں جن کو اسلام سے کوئی تعلق نہ تھا گرفتار ہو چکا تھا۔ فدائی مذہب قرامطہ مذہب سے مشابہ اور اسی کا مثنیٰ تھا۔ علاؤالدین نے نہ صرف خود ہی ملاحدہ کے عقیدے کو قبول کیا بلکہ محمد بن کیا بزرگ امید کے بھیجے ہوئے منادوں کو جا بجا اپنی حدودِ حکومت

میں تبلیغ کرنے اور لوگوں کو بے دین بنانے کا آزادانہ موقع عطا کیا۔ منہاج سراج کے الفاظ یہ ہیں

وبآخر عمر رسل ملاحدہ الموت بہ نزدیک سلطان علاؤ الدین آمدند وایشاں را اعزاز کرد وبہر جا از مواضع غور در سر دعوت کردند وملاحدہ الموت طمع بضبط وانقیاد اہل غور در بستند وایں معنی غبار بدنامی شد بر ذیل دولت علاؤ الدین"

سیف الدین محمد

۵۵۶ھ میں سلطان علاؤ الدین جہاں سوز کا انتقال ہوا۔ اور اس کی جگہ اس کا بیٹا سیف الدین محمد تخت نشین ہوا۔ سیف الدین محمد نے تخت نشین ہوتے ہی اپنے دونوں چچا زاد بھائیوں شمس الدین وشہاب الدین کو قید ونظر بندی سے آزاد کر دیا۔ چنانچہ آزاد ہوکر شہاب الدین تو اپنے چچا فخر الدین مسعود کے پاس بامیان چلا گیا اور شمس الدین دار السلطنت فیروزکوہ میں سلطان سیف الدین محمد کی خدمت میں رہنے لگا۔ سیف الدین بن علاؤ الدین نہایت پاک طینت اور باخدا سلطان تھا، وہ اپنے باپ کے خلاف اسلامی عقائد کا سختی سے پابند اور ملاحدہ الموت سے سخت متنفر تھا۔ اُس نے تخت نشین ہوکر ملاحدہ کے ان تمام مناددں اور مبلغوں کو، جو حدودِ سلطنت غور میں پھیلے ہوئے لوگوں کو بے دین بنانے میں مصروف تھے دار السلطنت میں طلب کیا اور جب سب کے سب فیروزکوہ میں آگئے تو سب کو قتل کرا دیا اور اپنی سلطنت سے ملاحدہ کی تعلیمات کے اثر کو مٹانے کی مؤثر کوشش کی۔ منہاج سراج کے الفاظ یہ ہیں:۔

"وآں رسل راکہ از ملاحدۂ الموت آمدہ بودند ودر سر ہر کس را بہ بطلان وبدعت وضلال دعوت می کردند، باز طلب فرمود وجملہ را فرمان داد تا بزیر تیغ آوردند وہلاک کردند وبہر موضعے کہ از روائح فتنہ ایشاں بوئے یافت فرماں داد تا در کل بلاد ملحد کشی کردند وہمہ را بہ دوزخ فرستاد"۔

سلطان سیف الدین نے صرف ایک سال اور چند ماہ سلطنت کی۔ ترکان غز جو خراسان وغزنی پر مستولی ہو چکے تھے حدودِ سلطنت غور پر حملہ آور ہونے لگے۔ سلطان سیف الدین نے لشکر فراہم کرکے ترکان غز پر حملہ کیا۔ رود بار مرو کے قریب لڑائی ہوئی جس وقت معرکہ کارزار تیزی سے گرم تھا سلطان سیف الدین کے سپہ سالار ابو العباس شیس نے پیچھے سے آکر سلطان کے پہلو میں نیزہ مارا۔ سلطان کو اس طرح مقتول دیکھ کر تمام فوج ترکان غز کے مقابلہ سے فرار ہو گئی اور سلطان کی لاش کو اسی طرح میدان میں چھوڑ آئی۔ سپہ سالار ابو العباس کو سلطان

سیف الدین سے اس لئے دلی عناد تھا کہ وہ ملاحدہ الموت کی تعلیمات سے متاثر اور اُن کا خفیہ ایجنٹ تھا۔

سلطان غیاث الدین

غور کی یہ بھاگی ہوئی فوج جب شہر نشین سے بھی گذر کر ایک قصبہ میں پہنچی تو سپہ سالار ابو العباس شیش کی شمس الدین ا. بن بہاؤ الدین سام سے ملاقات ہوئی جو سلطان سیف الدین مرحوم کی فوج میں شامل تھا۔ ابو العباس نے اسی جگہ تمام سرداران لشکر کو جو فراہم ہو سکتے تھے فراہم کیا اور شمس الدین کے بادشاہ تسلیم کر لینے پر سب کو رضامند کر لیا۔ چنانچہ اسی جگہ شمس الدین کو تخت نشین کر کے سب نے بیعت کی۔ اور شمس الدین کا لقب غیاث الدین تجویز ہوا۔ اور اسی جگہ ہر قسم کا انتظام کر کے ترکان غز کو شکست دے کر پسپا کیا۔ فیروز کوہ میں آکر سلطان غیاث الدین بن بہاؤ الدین سام نے مراسم تخت نشینی ادا کئے۔ یہ واقعہ ۵۵۲ھ یا ۵۵۳ھ میں وقوع پذیر ہوا۔ شہاب الدین نے بامیان میں جب بھائی کے تخت نشین ہونے اور سلطان بن جانے کا حال سُنا تو وہ اپنے چچا فخر الدین مسعود سے رخصت ہو کر فیروز کوہ میں بھائی کے پاس پہنچا۔ سپہ سالار ابو العباس نے چونکہ غیاث الدین کو تخت نشین کیا تھا اس لئے وہ بہت قابو یافتہ تھا اور غیاث الدین اپنے سلطانی اختیارات پورے طور پر کام میں نہ لا سکتا تھا۔ ابو العباس کو جب یہ معلوم ہوا کہ سلطان غیاث الدین بھی سلطان سیف الدین کی طرح ملاحدہ الموت کا دشمن اور اُن سے سخت متنفر ہے تو اس نے غیاث الدین کے خلاف غور کے لوگوں میں شورش برپا کرادی اور خود اس شورش کو بہ نظر اطمینان دیکھتا رہا۔ غیاث الدین کے بھائی شہاب الدین نے بھائی سے کہا کہ ہم کو اپنے چچا زاد بھائی سیف الدین کے خون کا بدلہ ابو العباس سے ضرور لینا چاہیئے۔ چنانچہ سردربار ابو العباس کو قتل کیا گیا۔ اس کے بعد تمام شورشیں فرو ہو کر سلطان غیاث الدین کی حکومت و سلطنت خوب مستحکم ہو گئی۔

سلطان شہاب الدین

سلطان غیاث الدین نے اپنے بھائی شہاب الدین کو تگین آباد اور گرم سیر کے علاقہ کا حاکم مقرر کیا۔ شہاب الدین تگین آباد سے بار بار غزنین پر جو ترکان غز کے قبضہ میں تھا حملہ آور رہتا تھا۔ آخر سلطان غیاث الدین نے فرشتہ کی روایت کے مطابق ۵۶۷ھ میں اور منہاج سراج و نظام الدین ہروی کی روایتوں کے موافق ۵۶۹ھ میں غزنی کو فتح کر کے اپنے بھائی شہاب الدین کو

غزنی کے تخت پر بٹھا کر اس کا لقب سلطان معزالدین قرار دیا اور خود اپنے دارالسلطنت فیروز کوہ کی جانب چلا گیا۔ اس طرح دونوں بھائی مستقل سلطان ہو گئے مگر چھوٹے بھائی شہاب الدین نے اپنے بڑے بھائی کی بزرگی کو ہمیشہ ملحوظ رکھ کر اپنے آپ کو ہر ایک کام میں اس کا تابع فرمان رکھا اور دونوں بھائیوں نے بڑی یک جہتی اور اتحاد و اتفاق کے ساتھ حکومت کی سلطان شہاب الدین کو سلطان غیاث الدین کا وزیر بھی کہہ سکتے ہیں اور سپہ سالار بھی جس طرح بڑا بھائی شمس الدین اپنے لقب غیاث الدین کے نام سے مشہور ہوا اسی طرح چھوٹا بھائی شہاب الدین اپنے لقب معزالدین کے نام سے مشہور نہیں ہوا بلکہ عام طور پر اس کو شہاب الدین غوری کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ سلطان غیاث الدین غوری نے ۵۹۹ھ تک حکومت کی اس نے مشرق، مغرب اور شمال و جنوب کی جانب فتوحات حاصل کر کے اپنے حدود ملک کو بہت وسیع کیا۔ سلطان غیاث الدین ابتدائً مذہب اہلِ حدیث رکھتا تھا مگر آخر عمر میں شافعی مذہب کا پابند ہو گیا تھا۔ سلطان غیاث الدین غوری نے ترکانِ غز کو بھی اپنا مطیع بنایا۔ اُمرائے سنجر کو شکست دے کر ہرات و بلخ وغیرہ کا علاقہ فتح کیا اور خوارزم شاہی سلطنت کو شکست دے کر اپنا لوہا منوایا۔ اور ملاحدہ الموت کے اثر کو اپنی حدود حکومت سے مٹایا۔ سلطان غیاث الدین نے ۴۳ سال حکومت کر کے بعمر ۶۳ سال ۵۹۹ھ میں وفات پائی اور سلطان شہاب الدین غوری کی شہادت ۶۰۲ھ میں ہوئی یعنی سلطان غیاث الدین کے بعد سلطان شہاب الدین صرف تین سال تنہا مطلق العنان سلطان رہا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ سلطان غیاث الدین کے زمانے میں بھی سلطان شہاب الدین غوری بطور خود مختار فرماں روا برسرِ حکومت تھا۔ سلطان شہاب الدین غوری اپنے بھائی غیاث الدین غوری سے تین سال چھوٹا تھا اور تین ہی سال بعد شہید ہوا۔ یعنی دونوں بھائیوں نے برابر عمر پائی۔

سلطان شہاب الدین غوری کی حملہ آوری کے وقت ہندوستان کی حالت

مسلمانوں نے ۹۲ھ سے ۵۹۰ھ تک سندھ و ملتان اور پنجاب تک ہی اپنی سلطنت کو محدود رکھا حالانکہ ان کی فوجیں سومنات سے کالنجر تک ہندوستان کے وسیع صوبوں کو پامال کر چکی تھیں۔ وہ اگر چاہتے اور ان کے داخلی و اندرونی جھگڑے ان کو اپنی طرف متوجہ نہ رکھتے

تو جنوب میں راس کماری اور مشرق میں آسام تک ہندوستان کو فتح کر کے اپنی حکومت وسلطنت میں شامل کر لینا مسلمانوں کے لئے کوئی بڑی بات نہ تھی۔ سندھ وپنجاب پر پانسو سال تک قانع رہنا اور مشرق کی جانب آگے نہ بڑھنا دلیل اس بات کی ہے کہ مسلمانوں کو ہندوؤں سے نہ کوئی خصوصی عداوت تھی نہ مسلمان ہندوستان پر قابض ہونے اور اس کو اپنی حدود سلطنت میں شامل کر لینے کے زیادہ شائق تھے۔ ان کو ہندوؤں سے کوئی خطرہ واندیشہ نہ تھا کہ وہ خواہ مخواہ ان کے استیصال اور بربادی کے خواہاں ہوتے ہندو موریا اور گپت خاندانوں کی حکومت کے زمانے اور بدھ مذہب کے عروج ورواج کے زمانے میں ہندو کسی شائستہ تمدن اور مناسب وموزوں معاشرت کے مالک ہو گئے لیکن بدھ مذہب کے زوال اور گپت خاندان کی بربادی کے بعد تو ہندوؤں میں مذہبی اخلاقی سیاسی تمدنی اور معاشرتی پستی اس قدر داخل ہو چکی تھی کہ وہ مسلمانوں کی آمد اور ان کی صحبت کے بغیر کسی طرح بھی کسی قسم کی ترقی نہیں کر سکتے تھے۔ مسٹر کے ایم پانیکر اپنی تاریخ ہند قدیم میں ہندوؤں کی ناقص حالت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

"اسی پراگندگی کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں کی آمد سے پیشتر ہندوستان میں سیاسی نظام کی ترقی ناپید ہو چکی تھی"۔

پہلے باب میں کسی قدر بیان ہو چکا ہے کہ مسلمانوں کی آمد کے وقت سندھ میں اخلاق ومعاشرت کی پستی کا کس قدر دور دورہ تھا۔ مسلمانوں کے سندھ میں داخل اور قابض ہو جانے کے بعد ان کی صحبت سے سندھ کے ہندوؤں کی اخلاقی پستی نہ صرف رک گئی بلکہ انھوں نے مسلمانوں کی صحبت سے متاثر ہو کر نمایاں ترقی کی اسی طرح سندھ کے ملحقہ علاقوں پر مسلمانوں کا اثر پڑا۔ یہی حال محمود غزنوی کی فتوحات کے بعد پنجاب کا ہوا۔ لیکن ہندوستان کے جن صوبوں اور جن حصوں میں مسلمانوں کا اثر نہیں پہنچ سکا وہاں ہندوؤں کی اخلاقی ومعاشرتی حالت برابر روبہ تنزل رہی۔ یہاں تک کہ مسلمانوں نے تمام ہندوستان پر حکومت قائم کر کے ہندوؤں کی رو بانحطاط قوم کو سنبھالا اور اس کے اخلاق ومعاشرت میں ایک خوشگوار تبدیلی وترقی پیدا کی۔ ہندوؤں کے تنزل کی رفتار کا اندازہ کرنے کے لئے سلطان شہاب الدین غوری کے زمانے سے چند روز پہلے کی حالت کا معائنہ اگر ممکن ہو تو ازبس ضروری ہے۔ دوسرے باب میں بیان ہو چکا ہے کہ ۱۰۴۵ء مطابق ۴۳۷ھ میں وشن پران تصنیف ہوا تھا۔ وشنو مت کی

ایجاد کا مقصد اصلیہ جب پورانہ ہوا تو تنو برس کے بعد ۱۱۵۰ء مطابق ۵۴۵ھ میں رامانج نامی ایک شخص نے دکن میں وشن مت کی تجدید و اصلاح کر کے اس کو بالکل ایک جدید قالب میں ڈھال دیا اور وشن پوران میں بھی تحریف و تبدیل و تجدید کا سلسلہ حسب دستور جاری رہا۔ مگر اسی زمانے میں شیومت کی خوب گرم بازاری ہو گئی تھی۔ چولا یا چلوکیہ خاندان کے ایک راجہ نے شیومت کی سرپرستی اختیار کر کے رامانج کو جو وشن مت کا پیرو تھا اپنی حدود حکومت سے خارج کیا۔ رامانج نے میسور کے راجہ کی پناہ میں جا کر جو جینی مذہب کا پیرو تھا اس کو وشن مت کا پیرو بنا لیا ۱۱۸۲ء مطابق ۵۷۸ھ میں چلوکیہ نبس کا خاتمہ ہوا۔ اور اس کی جگہ کالاکھوریا نبس حکمران ہوا۔ اس خاندان کے عہد حکومت یعنی ۱۱۹۲ء مطابق ۵۸۸ھ میں جب کہ شمالی ہند میں شہاب الدین غوری اور پرتھی راج نبرد آزما تھے۔ دکن کے ایک پنڈت نے شیومت کے اندر لنگ کی پوجا کو اصل عبادت قرار دے کر ایک نیا فرقہ جاری کیا۔ نیز شیو کے لنگ کی مورت کے ساتھ شیو کی بیوی کی شرمگاہ کی پرستش بھی ضروری قرار دی گئی۔ دکن میں آج تک بھی لنگ اور بھگ کی پوجا کرنے والے بکثرت موجود ہیں۔ انھیں شیوی فرقوں میں اگھوریوں کا بھی ایک فرقہ ہے جو انسان کے گوشت کو کھانا جائز سمجھتا اور ناقابل تصور افعال کا مرتکب ہوتا ہے۔ مہا دیو کی لنگ کی پوجا کرنے والوں کا معاصر ایک دوسرا گروہ اگم نامی پیدا ہوا اس گروہ کے عقیدے میں ناقابل بیان بے حیائیاں موجب ثواب سمجھی جاتی ہیں اور ان بے حیائیوں کو اس فرقے نے مستحسن قرار دیا۔ اس گروہ کے عقیدے میں پرش میدھ یعنے انسان کا قتل کرنا اور اس کے گوشت کو آگ میں بھون کر کھانا ثواب کا کام ہے۔ تاریخ مالوہ میں لکھا ہے کہ ایک فرقہ ایسا بھی ہے جو دیبی کا پجاری ہے اور جب کوئی شخص ان میں مرتا ہے تو وہ مردے کو زمین میں دفن کر دیتے ہیں جب اس کا گوشت پھول کر پھٹتا ہے تو اس کو سب مل کر کھا جاتے اور اس کو بڑا نیک کام سمجھتے ہیں یہ فرقہ بھی اسی مذکورہ زمانہ کی پیداوار ہے۔ اسی زمانے میں ایک فرقہ ہندوؤں میں براگ پنتھی پیدا ہوا۔ ان کے مذہب میں کوئی چیز حرام نہیں اگھوری فرقے کے عقیدے میں جس کا ذکر ابھی ہوا پیشاب اور پاخانہ ملا کر پارچہ بیز کر کے پینا اور حبس دم کو عبادت قرار دیا گیا (دیکھو تاریخ مالوہ) اسی زمانے میں ایک فرقہ پرم ہنس نامی پیدا ہوا جنھوں نے ڈاڑھی مونچھ اور سر کو منڈانا۔ مادر زاد ننگے پھرنا اور عورتوں سے پوجا کرانا حسن عمل قرار دیا۔ سنا ہے کہ ان لوگوں کو ناگے کہتے ہیں اور ہردوار کے بعض میلوں میں وہ آتے اور مذکورہ پوجا بھی کراتے ہیں۔ ایک

فرقہ ایسا پیدا ہوا جس نے اپنے اندر اس رسم کو لازمی قرار دیا کہ جو شخص لاولد مرجائے اس کی بیوہ عورت کا گھر کے ایک ستون سے عقد کر دیا جائے اور عزیز و اقارب میں سے جو شخص اس گھر میں تعزیت کے لئے جائے وہ اس طرح جو لڑکا پیدا ہو وہ اس فوت شدہ مردہ بیٹا سمجھا جائے اور اس کی میراث پائے (تفصیل کے لئے دیکھو تاریخ مالوہ) بطور مشتے نمونہ از خروارے یہ چند فحش باتیں مجبوراً نہایت افسوس کے ساتھ بیان کرنی پڑی ہیں اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس زمانہ میں ہندوستان کی تہذیب۔ اخلاق اور جذبات کس قدر پست و ذلیل ہو چکے تھے یہ تمام فرقے اور پنتھ برہمن لوگ ہی ایجاد کرتے اور کسی نہ کسی راجہ کی سرپرستی سے امداد پاتے اور مذکورہ بے حیائیوں کو رواج دیتے تھے۔ خلاصۂ کلام یہ کہ ہندوستان میں ظلم و عصیان اور بے شرمی و طغیان کا وہ عظیم الشان طوفان آچکا تھا کہ بابلیوں، عادیوں، لوطیوں، نمرودیوں وغیرہ اقوام کی طرح ہندوؤں کی قوم بھی صفحۂ ہستی سے ناپید و بے نشان ہو جائے اور عذاب الٰہی کی تلوار اس قوم کو تہس نہس کر ڈالے لیکن ہند اور اہل ہند کی خوش نصیبی تھی کہ پرستاران الٰہی یعنی مسلمانوں کے قدم اس سرزمین پر پہنچ چکے تھے انھوں نے جلد جلد تمام شمالی ہند اور دکن پر بھی قابض و متصرف ہو کر ان بہیمی کارروائیوں، حیا سوز بداخلاقیوں اور انسانیت کش مظالم کی بیخ کنی میں کوتاہی نہیں کی اور ہند و قوم کو اپنے شریفانہ نمونہ سے تہذیب و متانت اور آدمیت و انسانیت کی تعلیم دے کر برباد ہونے سے بچا لیا۔ مذکورہ اقسام کے قریباً تمام فرقے اور تمام بداعمالیاں اس بدتہذیبی و بداخلاقی کے طوفان کا پتہ بتانے کے لئے آج بھی ہندوؤں کی قوم میں غالباً تلاش کرنا ممکن ہے لیکن اسلامی عہد حکومت میں یہ تمام فرقے ٹھٹھرنے سکڑنے اور اپنے اعمال و عقائد کو عیب سمجھ کر چھپانے لگے اور تہذیب و متانت و انسانیت کا رواج ترقی پانے لگا۔ اسلامی حکومت کے مٹنے کے بعد پھر سننے میں آتا ہے کہ بعض جدید مذہبی فرقے نیوگ جیسی حیا سوز مراسم پر عمل درآمد کرانا ضروری سمجھنے لگے ہیں۔

محمود غزنوی اور شہاب الدین غوری کا درمیانی زمانہ ایسا ہے کہ سندھ و پنجاب کے علاوہ ہندوستان کے تاریخی حالات نہایت گہری تاریکی میں روپوش و مدفون ہیں اور کسی طرح بھی ہم اس زمانہ کے تفصیلی حالات معلوم نہیں کر سکتے۔ حالانکہ محمود غزنوی سے پہلے کے حالات بہت کچھ معلوم ہو سکتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس زمانے میں ہندوستان کے اندر قومی و مذہبی نظامات تمام درہم برہم ہو چکے تھے۔ برہمنوں کی مطلق العنانی اور ان کی اغراض

نفسانی نے اخلاق و تہذیب و معاشرت کو تباہ کر دیا تھا اور ان کی پیدا کردہ راجپوت قوم سے خوب قابو یافتہ ہو کر برہمنوں کے حقیقی اقتدار کو فنا کر کے بے دست و پا اور اپنی خواہشات نفسانی کے پورا کرنے کے لئے مذہبی تائید حاصل کرنے کا آلہ بنا لیا تھا۔ ایسی حالت میں جب کہ بداعمالیوں کا ہر طرف دور دورہ ہو۔ اور نفسانی خواہشات و جذبات نے عام طور پر لوگوں کو مغلوب کر کے اخلاق و تہذیب کو مفلوج کر دیا ہو نہ کسی کو کسی تصنیف کا موقعہ مل سکتا ہے۔ نہ ایسے زمانے کی یاد تازہ رکھنے کا کوئی سامان کیا جا سکتا نہ کوئی یادداشت رکھی جا سکتی ہے اس زمانے کی تصانیف میں شاکت مت اور بام مارگیوں کی تصانیف کا خصوصیت سے نام لیا جا سکتا یا چند ایسی دور از عقل باتوں سے مملو کہانیوں کا پتہ بتایا جا سکتا ہے جن سے انسان کو کسی قسم کا کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا اور کوئی مفید واقفیت حاصل نہیں کی جا سکتی۔

سلطان شہاب الدین غوری کے حملے ہندوستان پر

اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ ۵۶۹ھ میں سلطان غیاث الدین غوری نے اپنے بھائی شہاب الدین غوری کو غزنی کے تخت پر بٹھا کر سلطان معز الدین کا لقب یا خطاب دیا تھا، سلطان شہاب الدین نے تختِ سلطنت پر جلوس کر کے سب سے زیادہ اپنی توجہ ملاحدہ الموت کا اثر مٹانے میں صرف کی۔ علاء الدین جہاں سوز ملاحدہ کے مسلک پر عامل ہو چکا تھا۔ اس کے زمانے میں ملاحدہ الموت کے منادوں اور مبلغوں نے سلطنت غور کے قصبوں شہروں اور گاؤں میں اپنے مسلک کی خوب تبلیغ کی تھی، علاؤ الدین جہاں سوز کے بیٹے سلطان سیف الدین نے ملاحدہ کے اثر کو مٹایا۔ اس کے بعد سلطان غیاث الدین غوری بھی چونکہ ملاحدہ الموت کا دشمن تھا ان کے اثر کو مٹانے اور شریعتِ اسلام کو رواج دینے میں مصروف رہا۔ اب جب کہ سلطان شہاب الدین غوری غزنی کا بادشاہ بنا تو اس نے بھی اپنی تمام تر توجہ اسلام کے رواج دینے اور الحاد و کفر کے مٹانے میں صرف کی۔ دو سال تک سلطان شہاب الدین نواح غزنی کے انتظام اور ارد گرد کے ملاحدہ کو خارج کرنے میں مصروف رہا۔ ۵۷۱ھ میں اس کو اطلاع پہنچی کہ ملاحدہ نے ملتان پہنچ کر اپنی حکومت قائم کر لی ہے۔ چونکہ اس سے پہلے ملتان قرامطہ کا مسکن و ملجا رہ چکا تھا اس نے ملاحدۃ الموت کو ملتان پر قابض ہونے اور ہندوؤں کی اعانت حاصل کرنے میں بڑی آسانی ہوئی۔ غوری خاندان چونکہ غزنوی خاندان کا جانشین اور اپنے آپ کو محمود غزنوی کی قائم کی ہوئی

سلطنت کا وارث و مالک سمجھتا تھا لہذا غزنی پر قابض و متصرف ہونے کے بعد سلطان غیاث الدین غوری کے حسب الایما سلطان شہاب الدین کا مصمم ارادہ تھا کہ پنجاب پر چڑھائی کر کے خسرو ملک سے پنجاب کا صوبہ چھین لیا جائے کیونکہ غزنی پر قابض ہونے کے بعد سلطنت غزنی کے تمام صوبوں کو اپنے قبضے میں لانے کا حق خاندان غور کو حاصل ہو چکا تھا۔ مگر چونکہ اپنی حدود حکومت سے ملاحدہ الموت کا استیصال زیادہ ضروری تھا لہذا دو سال تک کسی دوسری جانب متوجہ ہونے کا موقع نہیں مل سکا۔ اب ملتان پہ ملاحدہ کے قابض ہونے کی خبر نے پنجاب کی طرف متوجہ ہونے سے باز رکھا اور ملتان کو پنجاب پر ترجیح دینا ضروری سمجھا گیا۔ کیونکہ ملتان بھی پنجاب کی طرح سلطنت غزنی کا ایک جزو تھا۔

سلطان شہاب الدین کا ملتان پر حملہ

چنانچہ ۵۷۱ھ میں سلطان شہاب الدین غوری نے ملتان پر حملہ کیا ملاحدہ نے سخت مقابلہ کے بعد شکست کھائی اور اکثر گرفتار و مقتول ہوئے۔ سلطان شہاب الدین غوری نے اپنے سپہ سالار علی کرماخ کو ملتان کا حاکم و عامل مقرر کیا اور ملتان کے انتظام سے فارغ ہو کر مقام اُچ پر حملہ کیا، جہاں ملتان کے مفرور ملاحدہ نے پناہ لی تھی۔ اُچ کا راجہ مقابلہ پر آمادہ ہوا اور قلعہ بند ہو کر مدافعت کرنے لگا، راجہ کی بیوی نے سلطان کے پاس پیغام بھیجا کہ اگر میری خوبصورت جوان بیٹی سے نکاح کرنے کا وعدہ کرو اور میرے مال و زیور و جائداد وغیرہ کو نقصان نہ پہنچاؤ تو میں راجہ کا کام تمام کئے دیتی ہوں۔ اس طرح تمہارا کام بہت ہلکا ہو جائے گا۔ سلطان نے جواباً راج کماری سے نکاح کرنے کا وعدہ کیا۔ رانی نے راجہ کو ہلاک کر دیا جو خود ہی مغلوب ہو کر ہلاک ہونے والا تھا۔ سلطان نے قلعہ اُچ پر قابض ہو کر اپنے وعدہ کو پورا کیا۔ راج کماری سے نکاح کر کے اس کو اپنے ہمراہ غزنی لے گیا۔ دو برس کے بعد یہ لڑکی فوت ہو گئی تھی۔ سلطان ابھی اُچ سے فارغ نہ ہوا تھا کہ اس کے پاس مقام سنقران میں بغاوت برپا ہونے کی خبر پہنچی۔ قلعہ الموت میں ملاحدہ کا بادشاہ محمد بن علی ذکرہ تخت نشین تھا جو تمام سلاطین ملاحدہ میں سب سے زیادہ متعصب و چالاک اور سب سے زیادہ اپنے مسلک کی اشاعت میں سرگرم تھا۔ سنقران کے لوگ سلطان محمد بن علی ذکرہ کے ہوا خواہ اور فدائی بن کر اسی کے اشارے سے باغی ہوئے تھے کہ ملتان کی فتح معرض التوا میں پڑ جائے۔ مگر سلطان شہاب الدین نے ملتان و اُچ کو بھی فتح کر لیا اور وہاں سے سنقران کے ملحد باغیوں

کا بھی قتلِ عام کیا ملتان کی فتح کو شہاب الدین غوری کا ہندوستان پر پہلا حملہ سمجھنا چاہیئے ۔ محمد بن علی نوکرہ فرماں روائے الموت اور راجہ بھیم دیو حاکم نہروالہ (ملک گجرات) کے درمیان سلطان شہاب الدین کے خلاف سلام و پیام کا سلسلہ جاری ہو کر دوستی کا عہدنامہ ہو چکا تھا۔ راجہ بھیم دیو نے ملاحدہ سے امداد پاکر سندھ و ملتان کو علی کرماخ سے چھین لینے کی تیاری کی اور ایک عظیم الشان لشکر اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے مرتب کیا اس خبر کو سُن کر ۵۷۴ھ کے آخر ایام میں سلطان شہاب الدین غزنی سے روانہ ہو کر ملتان پہنچا اور یہاں سے نہروالہ کی جانب روانہ ہوا۔ اس سفر میں سلطان سے ریگستان کی صعوبات اور پانی نہ ملنے کا صحیح اندازہ کرنے اور بھیم دیو کی جنگی طاقت کا تخمینہ لگانے میں غلطی ہوئی۔ نہروالہ کے قریب سلطان اس وقت پہنچا جب کہ اس کی فوج کا بڑا حصہ پانی نہ ملنے کی وجہ سے راستے میں ہلاک ہو چکا تھا۔ بھیم دیو نے فدائی لشکر کے ساتھ سلطان کی تھکی ماندی اور نہایت قلیل فوج کو آرام لینے اور سستانے کی مہلت نہ دی۔ سلطانی لشکر کو ہندوؤں اور ملحدوں کی تازہ دم اور کثیر التعداد فوج کے مقابلہ میں ناکامی تو ہوئی مگر دشمنوں کے دل پر اس مٹھی بھر فوج کی شمشیر زنی و جاں بازی دیکھ کر ہیبت ضرور چھا گئی سلطان کو بے حصول مقصد نہروالہ سے ۵۷۴ھ میں واپس آنا پڑا۔ اور واپسی میں بھی ریگستانی سفر بڑی دشواریوں سے طے ہوا۔ اس سفر کے تجربے نے سلطان پر ثابت کر دیا کہ گجرات سے پہلے پنجاب پر قبضہ کرنا ضروری ہے سلطان کا یہ خیال صحیح ثابت ہوا۔ کیونکہ بھیم دیو کو بھی سندھ و ملتان پر چڑھائی کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔

پشاور اور پنجاب کے مغربی اضلاع کی فتح

سلطان نے ۵۷۵ھ میں غزنی سے پشاور کی طرف کوچ کیا اور شہر پشاور کو فتح کر کے پنجاب کے مغربی اضلاع کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔

ان اضلاع کے انتظام و استحکام سے فارغ ہو کر ۵۷۶ھ میں لاہور پر حملہ آور ہوا۔ خسرو ملک تاب مقابلہ نہ لاکر لاہور میں محصور ہوا۔ اور اپنے عجز کا اقرار کر کے ایک ہاتھی بہ طور پیش کش سلطان کی خدمت میں بھیجا اور اپنے بیٹے کو بھی بطور یرغمال سلطان کے پاس بھیج دیا۔ سلطان لاہور سے محاصرہ اُٹھا کر غزنی پہنچا اور اپنے بھائی سلطان غیاث الدین کو تمام حالات سے اطلاع دی۔ مغربی پنجاب کے شامل سلطنت اور خسرو ملک کے مطیع ہو جانے کے بعد پنجاب کی طرف سے اطمینان حاصل

ہو چکا تھا۔ لہٰذا گجرات کے راجہ اور ملاحدہ الموت کے خطرہ کا انتظام ضروری تھا۔سلطان نے اس خطرے سے مطمئن ہونے کے لیے بہترین تدبیر سوچی اور پنجاب سے غزنی پہنچ کر آرام کئے بغیر فوراً دیبل (کراچی) کی طرف فوج کشی کی۔ساحل سمندر اور دریائے سندھ کے مغربی کنارے کا علاقہ فتح کرکے اپنی طرف سے دیبل میں ایک عامل مقرر کر دیا۔اس فتح اور اس انتظام سے سلطان کا مقصد یہ تھا کہ ملاحدہ الموت اور حاکم گجرات کے درمیان فوجی امداد کے آنے جانے کا راستہ مسدود ہو جائے۔چنانچہ یہ مقصد بخوبی حاصل ہو گیا اور بظاہر سلطان کے ہندوستان پر حملہ آور ہونے کی کوئی ضرورت باقی نہ رہی۔لیکن خسرو ملک نے لاہور میں پنجاب کے ہندوؤں کی مشہور جنگجو قوم گکھڑوں کی بھرتی شروع کی اور ان کو اپنی طرف مائل کرکے مغربی پنجاب کو فتح کرنے کی تیاری شروع کی۔سلطان کو جب خسرو ملک کے اس ارادے کا حال معلوم ہوا تو وہ ۵۸۱ھ میں فوج لے کر پنجاب آیا۔خسرو ملک لاہور میں متحصن ہوا جہاں وہ مدافعت کی پوری تیاری کر چکا تھا۔سلطان نے لاہور کو چھوڑ کر راوی و چناب کے دوآبہ میں سیالکوٹ کا قلعہ تعمیر کیا اور پنجاب کے ایک بڑے علاقہ کو اپنی سلطنت میں شامل کرکے قلعہ سیالکوٹ میں اپنی طرف سے اپنے ایک سردار حسین خرمیل کو متعین کیا کہ تمام مفتوحہ ملک پر قبضہ رکھو اور خسرو ملک کی تادیب پر مستعد رہو۔اس انتظام کو کافی سمجھ کر اور خسرو ملک کے قبضے سے ایک بڑا علاقہ نکال کر سلطان غزنی واپس چلا گیا۔سلطان کے جاتے ہی خسرو ملک نے گکھڑوں اور بقول بعض کھوکھروں کی جنگجو اور جرائم پیشہ ہندو قوم کو ہمراہ لے کر سیالکوٹ پر حملہ کیا اور حسین خرمیل کو محصور کیا۔حسین خرمیل نے بھی محصور ہو کر حق مدافعت ادا کر دیا اور بڑی جوانمردی کے ساتھ خسرو ملک کا مقابلہ کیا۔یہاں تک کہ خسرو ملک قلعہ سیالکوٹ کو فتح نہ کر سکا اور مجبور ہو کر لاہور چلا آیا مگر اس تمام علاقے پر جو سلطان شہاب الدین نے دوسری مرتبہ آکر فتح کیا تھا قبضہ کر لیا یہ خبریں سن کر ۵۸۲ھ میں سلطان شہاب الدین نے لاہور پر حملہ کیا اور خسرو ملک کو گرفتار کر لیا۔اس طرح تمام ملک پنجاب سلطان شہاب الدین غوری کے قبضے میں آگیا۔سلطان نے ملتان سے علی کرماخ کو لاہور طلب کرکے پنجاب و ملتان دونوں صوبوں کی حکومت اس کو سپرد کی اور طبقات ناصری کے مصنف منہاج سراج کے باپ مولانا سراج الدین کو لشکر ہندوستان کا قاضی اور امام مقرر کیا۔خسرو ملک کو اپنے ہمراہ غزنی لے گیا۔غزنی سے سلطان غیاث الدین کی خدمت میں بمقام فیروز کوہ روانہ کیا۔جہاں پانچ سال قید

رہ کر ۵۸۲ھ میں خسرو ملک اور اس کا بیٹا دونوں فوت ہوئے یا ہلاک کئے گئے۔

خسرو ملک کی نسبت اوپر بیان ہو چکا ہے کہ اس نے اپنے ایام حکومت میں پنجاب کے مشرقی علاقے پر دہلی کے راجہ کو قبضہ کر لینے دیا تھا اور کوئی تدارک اس کا نہ کر سکا تھا۔ اب جب کہ سندھ و ملتان و پنجاب کے صوبے بھی سلطان کے قبضہ میں آ چکے تھے تو یہ کسی طرح جائز نہ تھا کہ سلطنت محمودی کا ایک حصہ دہلی کے راجہ کو غصب کر لینے دیا جائے اور اس سے واپس نہ مانگا جائے جس پر کہ اس نے خسرو ملک کی کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر غاصبانہ قبضہ کر لیا تھا۔

پرتھی راج کے نام خط

چنانچہ سلطان نے رائے پتھورا (پرتھی راج) حاکم دہلی واجمیر کو خط لکھا کہ سلطنت غزنی کے علاقہ کو خالی کر دو اور جس طرح سلطان محمود غزنوی کے خاندان کی سیادت کو تسلیم کرتے تھے اسی طرح اب ہماری سیادت کو تسلیم کرو۔ پرتھی راج نے بجائے اس کے کہ وہ مغصوبہ علاقہ سے دست بردار ہو جاتا سلطان کے خط کا جواب سختی سے دیا اور مقابلہ ومقاتلہ پر آمادگی ظاہر کی سلطان شہاب الدین غوری نے ۵۸۷ھ میں لاہور آ کر حالات کی تحقیق کی۔ اس کو معلوم ہوا کہ کرنال و تھانیسر تک کا علاقہ پرتھی راج کے قبضے سے نکالنا ضروری ہے۔ چنانچہ اس نے لاہور سے روانہ ہو کر سرہند کے قلعہ کو پرتھی راج کے آدمیوں سے چھین لیا اور قلعہ سرہند میں طبقات ناصری کے مصنف منہاج سراج کے ایک قریبی رشتہ دار قاضی ضیاء الدین تولکی کو بارہ سو آدمی دے کر قلعدار مقرر کیا اور اسی تصرف کو کافی سمجھ کر اور قلعہ سرہند پر قبضہ قائم رکھنے کا انتظام کر کے لاہور کی طرف واپس ہوا۔ طبقات ناصری، طبقات اکبری، منتخب التواریخ، خلاصۃ التواریخ وغیرہ اکثر کتابوں میں قلعہ سرہند لکھا ہے لیکن تاریخ فرشتہ میں اس قلعہ کا نام بھٹنڈہ بتایا گیا ہے۔ اس قلعہ سے لاہور کی جانب روانہ ہونے کے بعد سلطان نے سُنا کہ پرتھی راج اور اس کا بھائی کھانڈے رائے معہ بہت سے راجاؤں کے دو لاکھ سپاہی اور بہت سے جنگی ہاتھی لئے سلطان کے مقابلے کو آ رہے ہیں۔ سلطان اگرچہ اس وقت ہرگز پرتھی راج کے مقابلہ کی مستعدی اور لڑائی کا ارادہ نہ رکھتا تھا کیونکہ اس کے ہمراہ تین چار ہزار سے زیادہ فوج نہ تھی۔ مگر یہ سُن کر کہ پرتھی راج لڑائی کے ارادے سے نکلا ہے غیرت سلطانی نے گھوڑے کی باگ موڑی اور دشمن کے استقبال کو تھانیسر کی جانب روانہ ہوا۔ پرتھی راج خود اجمیر میں رہتا تھا اور دہلی میں اپنی طرف سے اپنے ایک رشتے کے بھائی کھانڈے رائے کو بطور نائب السلطنت مقرر کر رکھا

تھا یہ کھانڈے رائے پرتھی راج کی فوج کا سپہ سالار اعظم اور ہندوستان کا مشہور بہادر سردار سمجھا جاتا تھا۔

شہاب الدین اور پرتھی راج کا پہلا معرکہ

موضع نرائن میں جس کو آج کل تراوری کہتے ہیں دونوں لشکروں کا مقابلہ ہوا۔

یہ مقام دریائے سرستی کے کنارے تھانیسر سے سات کوس اور دہلی سے چالیس کوس کے فاصلے پر تھا۔ سلطان اپنے مٹھی بھر ہمراہیوں کو میمنہ و میسرہ وقلب میں تقسیم کرکے ہندو فوج کے مقابلے میں ڈٹ گیا۔ سلطانی لشکر کی صحیح تعداد تو کسی مورخ نے نہیں لکھی لیکن اس میدان میں سلطانی لشکر تین چار ہزار سے زیادہ نہ تھا۔ ایک فروگذاشت یہ بھی ہو گئی تھی کہ بارہ سو کی تعداد میں جو سب سے بہتر انتخابی لشکر میں شامل نہ تھے۔ ہندو لشکر نے بڑے جوش وخروش سے حملہ کیا۔ سلطان قلب لشکر میں موجود اور مصروف قتال تھا کہ ایک مصاحب نے آکر سلطان کو اپنی طرف متوجہ کرکے کہا کہ میمنہ و میسرہ کی فوجیں فرار ہو چکی ہیں آپ کا اب یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں ہے اس وقت یہاں سے جان سلامت لے جانا ہی مصلحت ہے۔ تاکہ دوسرے وقت پوری تیاری اور مضبوطی کے ساتھ آکر ہندوؤں کا مقابلہ کر سکیں۔ سلطان نے کہا کہ میں میدانِ جنگ سے منہ موڑنا مناسب نہیں سمجھتا۔ اسی اثناء میں ہندو لشکر نے اسلامی لشکر کے دونوں بازوؤں کو مفرور دیکھ کر اور زیادہ دلیر ہو کر پوری شدت سے حملہ کیا اور قلب کی قلیل جمعیت کو جس میں سلطان بھی موجود تھا چاروں طرف سے گھیر لیا۔ سلطان نے پہلے سے چوگنی شمشیر زنی شروع کی، کھانڈے رائے جو ہاتھی پر سوار تھا اس نے سلطان کو سب سے زیادہ مصروف شمشیر زنی دیکھ کر اپنا ہاتھی اس پر ریل دیا سلطان نے بھی چابکدستی وحملہ آوری میں مطلق کوتاہی نہیں کی کھانڈے رائے اور سلطان کے وار ایک دوسرے پر بہم ہوئے۔ سلطان کا نیزہ ہودہ کو سوراخ کرتا ہوا کھانڈے رائے کے چہرے تک پہنچا اور اس کے دو دانت اس نیزے کی ضرب سے ٹوٹ کر اس کے منہ میں گر گئے۔ کھانڈے رائے کے نیزے نے سلطان کے بازو کو زخمی کیا اور ساتھ ہی دوسرے ہندو سرداروں کے وار سلطان پر پڑے جس سے سلطان سخت زخمی ہو کر بیہوش ہو گیا اور قریب تھا کہ گھوڑے سے گر پڑے، اتنے میں پیچھے سے ایک خلجی بچے نے سلطان کی اس نازک حالت کو دیکھ کر جرأت و ہمت اور بے حد قابلِ تعریف ہوشیاری سے کام لیا کہ اُچھل کر فوراً سلطان کے پیچھے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔

اور سلطان کو کولی میں بھر کر گھوڑے کو مہمیز کر دیا۔ گھوڑے کی جفاکشی و شہ زوری اس خلجی بچے کی چابک دستی سے بھی زیادہ قابل تعریف ہے کہ دو آدمیوں کو لے کر اس ہجوم میں سے اس طرح بھاگا کہ کسی کو تعاقب کی جرأت نہ ہوئی۔ میدانِ جنگ سے بیس میل کے فاصلے پر جا کر سلطان کو گھوڑے سے اُتارا گیا جہاں بعض مفرورین پہلے سے پہنچے ہوئے تھے سلطان کی حالت بہت نازک تھی۔ سپاہیوں نے اپنے نیزے توڑ کر اور نیزے کے بانسوں کو جوڑ کر سلطان کے لئے ایک ڈولی بنائی اور اس میں ڈال کر لاہور کی جانب لے چلے۔ سلطان لاہور سے غزنی کی جانب گیا۔

یہاں پرتھی راج نے تراوری کے میدان میں فتحمند ہو کر قلعۂ سرہند پر حملہ کیا اور قاضی ضیاءالدین کو محصور کر لیا۔ قاضی ضیاءالدین نے قلعہ بند ہو کر اس خوبی کے ساتھ مدافعت کی کہ پرتھی راج کی زبان پر چھٹی کا دودھ آ گیا۔ تیرہ مہینے تک محاصرہ جاری رہا مگر قلعہ فتح نہ ہو سکا آخر تیرہ مہینے کے بعد قاضی ضیاءالدین نے خود ہی صلح کے ساتھ قلعہ خالی کر دیا اور تمام سامان لے کر لاہور پہنچ گیا۔ جب کہ سلطان بھی غزنی سے فوج لے کر ہندوستان واپس آ چکا تھا۔ لاہور اور ملتان کے عاملوں نے یہ بڑا کام کیا کہ مذکورہ قلعہ سرہند کے علاوہ ہندوؤں کو اور کسی سمت سے قدم آگے نہیں بڑھانے دیا۔ سلطان شہاب الدین کے زخمی ہونے اور میدانِ جنگ سے زندہ بچ کر نکل آنے کا جو حال درج ہوا اس میں بہت ہی خفیف اور ناقابل التفات اختلاف کے ساتھ تمام مورخ متفق ہیں۔ لیکن تاریخ زین المآثر کا یہ بیان یقیناً قابل التفات ہے کہ سلطان جب زیادہ زخمی ہوا تو بیہوش ہو کر گھوڑے سے نیچے گر پڑا۔ چونکہ سلطان کے جسم پر کوئی امتیازی لباس اور مخصوص شاہی نشان نہ تھا، اس لئے کسی نے نہ پہچانا کہ یہ سلطان شہاب الدین غوری ہے اور کوئی اس کی طرف متوجہ نہ ہوا۔ اسلامی لشکر کے بقیتہ السیف مفرورین نے سلطان کو شہید سمجھا۔ جب رات ہوئی تو سلطان کے چند غلام جو میدان کے قریب کسی جگہ چھپ گئے تھے میدانِ جنگ میں آئے اور سلطان کی لاش کو تلاش کرنے لگے۔ چنانچہ اُنھوں نے سلطان کو لاشوں میں پڑا ہوا نہایت نازک حالت میں پایا۔ وہاں سے اُٹھا کر نوبت بہ نوبت اپنے کاندھوں پر بٹھاتے ہوئے رات بھر سفر کر کے بیس کوس چل کر صبح ہوتے اس مقام پر پہنچے جہاں لشکر کے مفرورین جمع تھے وہاں نیزوں کی ڈولی بنا کر اور اس میں سلطان کو ڈال کر لاہور کی جانب لے گئے۔

پرتھی راج کا کچھ حال پرتھی راج کا اکثر حال اوپر بیان ہو چکا ہے۔ اس جگہ یہ ظاہر کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے زمانے کے بعض ہندو اور یورپی مورخین نے پرتھی راج اور جے چند کے متعلق بعض ایسی باتیں لکھی ہیں جن کا اُس زمانے کے قریب العہد مورخین نے کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ ہندوؤں کی نسبت ہر شخص جانتا ہے کہ انھوں نے اپنے بزرگوں کے صحیح حالات کبھی نہیں لکھے اور ہمیشہ فرضی کہانیوں اور جھوٹے افسانوں ہی سے دل بہلاتے رہے۔

بے سروپا باتیں تاریخ کی طرف سے اس بے التفاتی کا افسوس جس قدر خود ہندوؤں کو ہوتا ہوگا اس سے بڑھ کر اُن لوگوں کو ہے جو قدیم ہندو راجاؤں اور ہندو رہبروں کے حالات معلوم کرنا چاہتے ہیں اور کہیں بھی حسب ضرورت سامان نہیں پاتے ہندو اتہاس کی کتابوں میں اگر کسی شخص کی عمر دو لاکھ سال بتائی جائے یا کسی مرد کو کسی جگہ کی آب و ہوا یا جادو کی تاثیر سے عورت بنا کر اس کے پیٹ سے بہت سے بچے بھی جنوا کر پھر اس کو مرد بنا دیا جائے۔ یا کسی شخص کے جسم میں کثیر التعداد عورت کی شرمگاہیں پیدا کردی جائیں یا کسی کی ہتھیلی پر سیکڑوں میل مکعب پہاڑ رکھ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دیا جائے یا کسی ایک شخص کے دو پاؤں پر ایسا جسم بتایا جائے جس میں بیس ہاتھ اور دس گیارہ سر ہوں تو ہم کو نہ کوئی تعجب ہونا چاہیے نہ شکایت کرنا چاہیے۔ مگر تعجب اس بات پر ہے کہ ٹاڈ صاحب، ہنٹر صاحب، لیتھبرج صاحب، الفنسٹن صاحب وغیرہ یورپین مؤرخ اگر کہیں ان دور از عقل ہندو اتہاس کی کتابوں اور عقل سوز فرضی کہانیوں کو پالیتے ہیں تو اس بات کی کوشش کرنے لگتے ہیں کہ ان ناقابل قبول باتوں کو لوگ وحی و الہام سمجھ کر ان پر ایمان لے آئیں اور کسی قسم کے شک و شبہ اور خدشہ کو پاس نہ پھٹکنے دیں اسی قبیل کی باتوں میں سے ایک جے چند کی بیٹی کا سوئمبر (مجلس شوہر پسندی) اور پرتھی راج کا اس تقریب کے موقع پر اس کو زبردستی قنوج کے محل شاہی سے اُٹھا لانا ہے۔ اسی طرح شہاب الدین غوری کا ایک دو مرتبہ نہیں سات مرتبہ پرتھی راج کے ہاتھ میں گرفتار ہونا ہے اس قسم کی بیہودہ اور دور از حقیقت باتوں کو درست اور صحیح یقین کرلینے کے لئے ہم کو پرتھی راج کے کسی بھاٹ کی بنائی ہوئی نظم کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ اعلیٰ طبقہ کے ہندو مصنفین کی تاریخی تصانیف ہی کونسی قابل اعتماد اور لائق قبول ہیں کہ ایک بھاٹ کے کبت پر ایمان لانے کی فرمائش

کی جاتی ہے۔

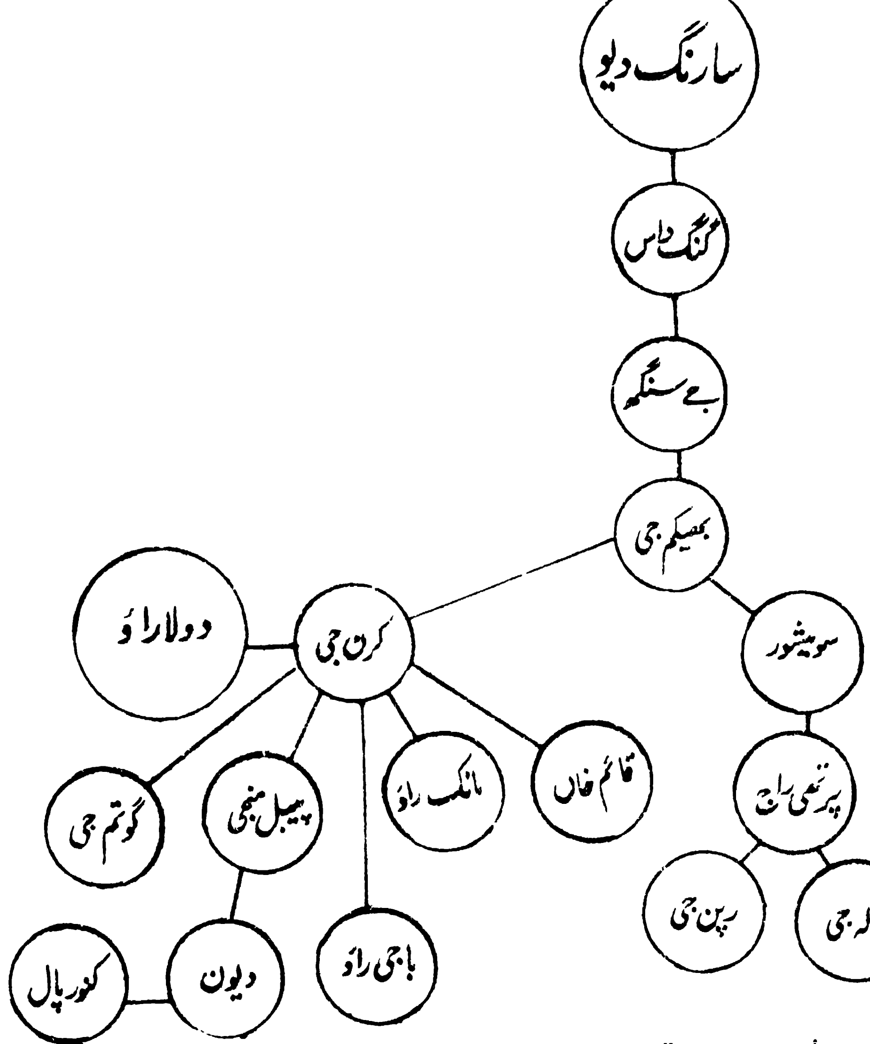
پرتھی راج اور جے چند کی نسبت ایک طرف تو یہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ آپس میں خالہ زاد بھائی تھے۔ دوسری طرف یہ بتایا جاتا ہے کہ پرتھی راج جے چند کی بیٹی سنجوگتا کو زبردستی قنوج سے اٹھا لایا اور اپنی بیوی بنا لیا۔ لیکن ہندوؤں اور چوہان راجپوتوں میں تو خالہ زاد بھائی کی بیٹی یعنی بھتیجی کو بیوی بنانا سخت معیوب سمجھا جاتا ہے چہ جائیکہ اس زبردستی اور دھینگا مشتی کی بداخلاقی کا ارتکاب کیا جائے اور اس کو مستحسن سمجھا جائے۔ ہاں اگر سندھ کے راجہ داہر کا طرز عمل ملحوظ رکھا جائے تو پرتھی راج پر کوئی الزام عائد نہیں ہوتا۔ لیکن ہم تو اپنے اعتراض کا جواب موجودہ زمانے کے ہندوؤں سے لینا چاہتے ہیں۔ زمانۂ حال کے چالاک اور ہوشیار ہندوؤں نے ایک یہ ڈھکوسلا بھی تراش لیا ہے کہ جے چند نے سلطان شہاب الدین غوری کو پرتھی راج پر دوبارہ حملہ کرنے کی ترغیب دی تھی اور اسی نے سلطان کو دوبارہ بلا کر اور خود پرتھی راج کی اعانت سے محترز رہ کر پرتھی راج کو ہلاک کرا دیا۔ لیکن وہ یہ ثابت نہیں کر سکتے کہ پہلی لڑائی میں جو ۵۸۷ھ میں بمقام تراوری ہوئی جے چند پرتھی راج کے ساتھ تھا۔ اس وقت تک سنجوگتا کا سوئمبر نہیں ہوا تھا اور جے چند و پرتھی راج کے درمیان نااتفاقی و عداوت کا پیدا ہونا تراوری کی پہلی لڑائی کے بعد بتایا جاتا ہے اور اسی کو دوسری لڑائی میں پرتھی راج کے مغلوب ہونے کی وجہ قرار دیا جاتا ہے۔ بابو جوالا سہائے صاحب اپنی تاریخ وقائع راجپوتانہ میں لکھتے ہیں کہ پرتھی راج کو گرفتار کر کے سلطان شہاب الدین غوری اپنے ہمراہ غزنی لے گیا تھا۔ وہاں ایک روز موقع پا کر پرتھی راج نے شہاب الدین کو قتل کر دیا۔ یہی مؤرخ ایک دوسری جگہ لکھتا ہے کہ شمس الدین التمش سلطان شہاب الدین غوری سے پہلے فرماں روا رہ چکا تھا۔ مگر قدیم زمانے کے مسلمان مورخوں میں سے کسی نے بھی پرتھی راج اور جے چند کے متعلق ان مذکورہ باتوں کا ذکر نہیں کیا۔ پھر لطف یہ کہ ۵۸۷ھ کی لڑائی کے بعد اور ۵۸۸ھ کی دوسری لڑائی سے پہلے جن واقعات کا ظہور پذیر ہونا ہندو مورخ بیان کرتے ہیں ان کا درست ہونا کسی طرح فرض بھی نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً بیان کیا جاتا ہے کہ شہاب الدین غوری کے شکست پانے کے بعد جے چند نے اپنی بیٹی کی مجلس شوہر پسندی منعقد کی اور پرتھی راج کو دربانی کی خدمت پر طلب کیا۔ پرتھی راج نے اس مجلس میں شریک ہونے سے انکار کیا تو جے چند نے پرتھی راج کی شکل کا ایک سونے کا بت دربان کی جگہ نصب کر دیا۔ قنوج سے اجمیر دعوت بھیجنے، وہاں سے انکاری جواب آنے، پھر سونے کا بت بنوانے میں یقیناً بہت نہیں کئی مہینے صرف ہوئے ہوں گے۔ پھر پرتھی راج کو اپنی

سورت کے دربان کی جگہ نصب ہونے کا حال معلوم ہوا اور وہ اپنی اس بےعزتی کو برداشت نہ کرسکا اور عین وقت پر قنوج پہنچ گیا۔ بھری مجلس کے سامنے سنجوگتا کو جب کہ وہ اس سونے کی مورت کے گلے میں ہار ڈال رہی تھی اٹھا کر چل دیا۔ جے چند نے تعاقب بھی کیا۔ لڑائی بھی ہوئی مگر پرتھی راج سنجوگتا کو دلّی لے آیا اور اس کو اپنی بیوی بنا لیا۔ حالانکہ اس کو بجائے دہلی کے اجمیر لے جانا چاہیئے تھا۔ تاہم ان ہنگاموں اور سنجوگتا سے شادی کرکے کسی دوسری مہم کی طرف متوجہ ہونے میں بھی کافی زمانہ صرف ہوا ہوگا۔ سنجوگتا سے شادی کرنے کے بعد پرتھی راج نے بندیلکھنڈ کے راجہ پر چڑھائی کی اور تمام بندیلکھنڈ فتح کرلیا۔ تعجب ہے کہ بیچ میں قنوج کا ملک چھوڑ کر بندیلکھنڈ کو کیسے فتح کرلیا اور جے چند جو بندیلکھنڈ کا زیادہ حق دار تھا خاموش رہا۔ یہ کام بھی مہینوں اور برسوں کا تھا۔ اس کے بعد دہلی یا اجمیر میں آکر اور اپنے رشتہ داروں کو میرٹھ وعلی گڑھ وغیرہ کے قلعوں میں نامزد کرکے اس علاقہ کا بندوبست کیا۔ اس کے بعد ملک مالوہ پر چڑھائی کی۔ مالوہ میں کئی راجاؤں سے معرکہ آرائیاں ہوئیں۔ اس میں بھی بڑا وقت صرف ہوا۔ اس کے بعد پرتھی راج اور جے چند کے درمیان بعض خیرخواہوں نے صلح کی تحریک کی۔ آخر دونوں میں صلح ہوگئی۔ اس صلح کی تحریک اور صلح ہونے میں بھی کچھ نہ کچھ وقت ضرور صرف ہوا ہوگا۔ صلح کے بعد پرتھی راج تو جے چند کی طرف سے بالکل صاف تھا۔ لیکن جے چند نے کورباطنی اور دغا بازی کی راہ سے خفیہ سلطان شہاب الدین سے خط وکتابت شروع کی اور اس کو ترغیب دی کہ پرتھی راج پر چڑھائی کیجئے۔ چنانچہ قنوج وغزنی کے درمیان خط وکتابت کا یہ نتیجہ نکلا کہ سنہ ۵۸۸ھ میں سلطان شہاب الدین فوج لے کر پرتھی راج پر چڑھ آیا اور پرتھی راج کا کام تمام ہوا۔

ان تمام مذکورہ باتوں پر غور کرو اور سوچو کہ یہ سب کچھ سنہ ۵۸۷ھ اور سنہ ۵۸۸ھ کی لڑائیوں کے درمیان ہوا۔ ان دونوں لڑائیوں میں صرف پندرہ یا سولہ مہینے کا فاصلہ ہے۔ اس قلیل مدت میں مذکورہ بالا سلسلہ واقعات کو انسانی عقل کسی طرح فرض نہیں کرسکتی۔ ساتھ ہی جب اس طرف توجہ کی جاتی ہے کہ پرتھی راج کو تیرہ مہینے تک قلعہ سرہند کے محاصرہ میں مصروف رہنا پڑا تھا تو سرے سے اس سلسلہ واقعات کا ہر ایک واقعہ غائب ہوجاتا ہے۔ مسلمان مورخین کے بیان پر اس قسم کی کوئی جرح اور کوئی اعتراض وارد نہیں ہوسکتا بلکہ ان کے بیان کی بےساختگی خود ان کی صداقت کی زبردست دلیل ہے اور حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ بالا کہانی محض فرضی اور من گھڑت افسانہ ہے جس کو اصلیت سے اس قدر بعد ہے جس قدر مغرب اور مشرق میں فاصلہ ہے۔

پرتھی راج کا خاندانی شجرہ

ہند و مورخین کے دور از عقل بیان کا تذکرہ کرنے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ پرتھی راج کے خاندان کا شجرہ بھی درج کر دیا جائے۔



اس شجرہ کے اندر پرتھی راج کے چچازاد بھائیوں میں ایک نام قائم خاں بھی موجود ہے۔ کرن جی کا یہ بیٹا مسلمان ہو گیا تھا اور اس کا اسلامی نام قائم خان رکھا گیا تھا۔ چنانچہ ہندوستان کے مسلمانوں میں قائم خانی مسلمانوں کی ایک قوم اب تک موجود ہے جو اسی قائم خان کی اولاد ہونے کا دعویٰ کرتی ہے۔

پرتھی راج کا مفرور ہو کر گرفتار و مقتول ہونا

سلطان شہاب الدین نے غزنی پہنچ کر اپنی فوج کے ان لوگوں کو جنھوں نے ۵۸۷ھ کی جنگ تراوری میں اپنی جان بچا کر مجبورانہ فرار کی عار گوارا کی تھی نہایت سخت اور ذلت آفریں سزائیں دیں۔ یعنی جس طرح گھوڑوں کو دانہ کھلایا جاتا ہے اس طرح توبروں میں جو بھر کر ان کی گردنوں میں لٹکا دیے اور غزنی کے گلی کوچوں میں گشت کرایا۔ ساتھ ہی حکم دیا کہ ان میں سے جو شخص جو نہ کھائے اُس کی گردن اُڑا دی جائے۔ غرض اس طرح گھوڑوں کی طرح جَو کھلا کر اور ذلیل کر کے چھوڑ دیا اور نئی فوج کی بھرتی اور ترتیب و تہذیب میں مصروف ہوا۔ جن لوگوں کو یہ سزائیں دی گئی تھیں۔ وہ عموماً غور و خلج و خراسان کے لوگ تھے۔ افغان ان میں کوئی نہ تھا یعنی افغانوں نے تراوری کے میدان میں سلطان کے ہمرکاب رہ کر اپنی جانیں قربان کر دیں مگر فرار کی عار گوارا نہ کی۔ فرشتہ کے الفاظ یہ ہیں :۔

"با افغانان ہیچ نہ گفت و امرائے غور و خلج و خراسان را معاتب و مواخذ گردانید و توبرہ ہائے پُر جو بہ گردن ایشاں درآویختہ گرد شہر بہ گردانید و حکم کرد کہ ہر آنچہ در توبرہ ہست نخورد سرش از تن جدا کنند۔"

اس سزا دہی کے واقعہ سے بھی صاف ثابت ہے کہ سلطان شہاب الدین غوری نے خود اپنے گھوڑے کی باگ میدان جنگ سے نہیں موڑی تھی بلکہ وہ بیہوشی کی حالت میں میدانِ جنگ سے باہر لایا گیا تھا۔ اگر اپنی جان بچانے کے لئے سلطان اپنے گھوڑے کی باگ موڑتا تو یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ وہ اپنے ہمراہیوں کو اس قسم کی سزائیں دیتا۔

بہرحال سلطان نے نہایت خموشی کے ساتھ چند مہینے غزنی میں قیام کیا اور کسی کو اپنے عزم و ارادے سے مطلع نہیں کیا۔ آخر ایک طاقتور لشکر لے کر غزنی سے روانہ ہوا اور پشاور پہنچا۔ پشاور سے روانہ ہو کر اول ملتان آیا۔ ملتان کے عامل اور وہاں کی فوج کا تحسین و آفرین کے ذریعے دل بڑھایا۔ کیونکہ ان لوگوں نے ملتان کے علاقے کی حفاظت نہایت عمدگی سے کی تھی اور نواحی ہندو راجاؤں کے حملوں کو جو انھوں نے تراوری کی سابقہ جنگ کے بعد دلیر ہو کر ملتان پر کیے تھے نہایت دلیری کے ساتھ رد کیا تھا۔ ملتان کی جانب سے مطمئن ہو کر لاہور آیا یہ وہ زمانہ تھا کہ ضیاء الدین تولکی سرہند سے لاہور پہنچ چکا تھا اور پرتھی راج اجمیر جا کر شہاب الدین غوری کے مقابلہ کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ لاہور پہنچ کر سلطان نے اپنی

فوج خاصہ کے سردار قوام الملک رکن الدین حمزہ کو سفیر یا ایلچی بنا کر پرتھی راج کے نام خط دے کر اجمیر کی جانب روانہ کیا۔ رکن الدین حمزہ نے سلطان کا خط پرتھی راج کے پاس اجمیر میں پہنچایا۔ اس خط کا مضمون یہ تھا کہ:۔

"بے راہ روی چھوڑ دو اور سرہند (تھا نیسر) کا علاقہ جو قدیم سے سلطنتِ اسلامیہ کا ایک حصہ ہے خالی کر دو اور جس طرح اجمیر کے راجہ سلطان محمود غزنوی اور اس کی اولاد کے مطیع رہے تھے اسی طرح ہماری سیادت کو تسلیم کرو۔ ورنہ پھر تلوار میدانِ جنگ میں اپنا فیصلہ صادر کر دے گی۔"

پرتھی راج کو پہلے ہی سے سلطان کے پنجاب (ملتان) میں آنے کا حال معلوم تھا اور وہ تراوری کی پہلی جنگ میں کامیاب ہونے کے بعد ہی سے بخوبی جانتا تھا کہ سلطان شہاب الدین یقیناً انتقامی یورش کرے گا اور مسلمان اپنی اس شکست کی تلافی کے لئے ضرور دوبارہ حملہ آور ہوں گے۔ محمود غزنوی اور اس کی اولاد کے زمانے میں چونکہ ہندو برابر اسلامی فوج میں کام کرتے رہے اور مسلمانوں کے طریقِ جنگ سے ہر طرح واقف و آگاہ ہو کر اپنے اندر جنگی قابلیت پیدا کر چکے تھے اور اب حال ہی میں وہ مسلمانوں کو ایک شکست دے کر اور بھی زیادہ جری ہو چکے تھے۔ لہٰذا پرتھی راج کی فوج کو اس ہندو فوج پر قیاس نہیں کرنا چاہیئے جس نے محمد بن قاسم اور محمود غزنوی سے شکستیں کھائی تھیں۔ پرتھی راج پہلے ہی سے جنگی تیاریوں میں مصروف تھا۔ اس نے ہندوستان کے دوسرے راجاؤں کو اپنی امداد و اعانت پر آمادہ کر لیا تھا اور چھوٹے بڑے ڈیڑھ سو راجہ بذاتِ خود اپنی اپنی انتخابی فوجیں لے کر پرتھی راج کے ساتھ میدانِ جنگ میں مسلمانوں کے مقابل دادِ شجاعت دینے پر آمادہ ہو چکے تھے۔

لہٰذا پرتھی راج نے بڑی نخوت کے ساتھ نہایت سخت و درشت جواب سلطان کے پاس بھیجا اور لکھا کہ تمہاری خیر اسی میں ہے کہ ٹھنڈے ٹھنڈے غزنی کی طرف سدھار جاؤ ورنہ ہم اچھی طرح تم کو مزا چکھائیں گے اور اس مرتبہ زندہ بچ کر بھاگنے کا موقعہ بھی نہ دیں گے۔ اس خط و کتابت کے بعد پرتھی راج نے تراوری کے میدانِ جنگ کو جہاں وہ پہلے ایک مرتبہ فتح حاصل کر چکا تھا مبارک سمجھ کر اسی جگہ اپنی فوجیں فراہم کرنا شروع کیں اور قرارداد کے موافق دوسرے راجہ بھی اپنی اپنی فوجیں لے کر آنا شروع ہوئے۔ سلطان نے بھی اس بات کو غنیمت سمجھا کہ جس میدان میں اس کو ایک مرتبہ شکست ہو چکی تھی اسی میدان میں حریف کو شکست دے کر

سرخ روئی حاصل کرے۔ چنانچہ حریف کے فوجی اجتماع کا حال سُن کر وہ بھی لاہور سے تراوڑی کی جانب روانہ ہوا۔ اس جگہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ پھر یہ بات یاد دلادی جائے کہ جے چند کی دختر سنجوگتا کے اُٹھا کرے جانے کی کہانی بالکل فرضی اور از سرتا پا غلط ہے۔ اس قسم کی ہزارہا فرضی کہانیاں قدیم ہندو لٹریچر میں موجود ہیں جن کو کوئی بھی سمجھ دار شخص صحیح سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا کوئی مسلمان مورخ حتیٰ کہ فرشتہ تک بھی اس کا ذکر نہیں کرتا۔ مسلمان مؤرخوں کو چھوڑو۔ سجان رائے کو کس نے مجبور کیا تھا کہ وہ بھی اس کا ذکر نہ کرے اگر یہ فرضی کہانی کوئی تاریخی حیثیت اور ذرا سی بھی اصلیت اپنے رکھتی تو مسلمانوں کا کیا ہرج تھا کہ وہ اس کا ذکر نہ کرتے اور ہندو مورخوں کو بھی مجبور کرتے کہ اس کا ذکر زبان تک نہ لائیں۔ قیاس تو یہ چاہتا ہے کہ وہ خوب مزے لے لے کر اس کا ذکر کرتے کیونکہ اب سے سو یا دو سو برس پہلے تک کسی کو ان حالات اور ان خیالات وجذبات کا وہم وگمان بھی نہ تھا جو آج کل ہندو مسلمانوں کے درمیان بدقسمتی سے پیدا ہو چکے ہیں۔ پرتھی راج نے جنگ تراوڑی کے بعد تیرہ مہینے تک قلعہ سرہند کا محاصرہ جاری رکھا۔ طبقات ناصری میں منہاج سراج لکھتا ہے کہ

"رائے پتھورا بپائے قلعہ آمد و جنگ بپیوست و مدت سیزدہ ماہ درجپرے جنگ داد"

سجان رائے لکھتا ہے کہ:۔

"رائے پتھورا بعد فتح در سرہند آمدہ قلعہ را از کسان سلطان بعد محاصرہ یک سال ویک ماہ تسخیر نمودہ بہ کسان خود سپرد۔"

فرشتہ لکھتا ہے کہ:۔

"رائے پتھورا آمدہ قلعہ بتھندہ را کہ ضیاءالدین تولکی در انجا بود یک سال ویک ماہ محاصرہ نمود و آخر بصلح گرفت۔"

غرض تمام مؤرخ اس پر متفق ہیں کہ پرتھی راج تیرہ مہینے قلعہ کے محاصرہ میں مصروف رہا اس قلعہ پر قبضہ پاتے ہی یا قبضہ پانے سے بھی پہلے ہی اس کو شہاب الدین غوری کے آنے کا حال معلوم ہوا۔ وہ فوراً اجمیر آیا اور جنگی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔ تراوڑی کی پہلی جنگ سے دوسری جنگ تک کا زمانہ ایک سال اور چند مہینے ہے۔ اس میں سے ابتدائی تیرہ مہینے جو قلعہ سرہند کے محاصرے میں صرف ہوئے نکال دیئے جائیں تو پھر سنجوگتا والی کہانی اور بندیلکھنڈ ومالوہ کی فتوحات وغیرہ کے لئے کون سا وقت بچتا ہے۔

دوسرا حملہ

قصہ مختصر دونوں طرف کی فوجیں تراوری کے میدان میں ایک دوسرے کے مقابل چند کوس کا فاصلہ اور سرستی ندی کو بیچ میں حائل چھوڑ کر خیمہ زن ہوئیں۔ اسلامی لشکر کی کل تعداد ایک لاکھ بیس ہزار تھی۔ جس میں اسّی ہزار پیادے اور چالیس ہزار سوار تھے یہ ایک لاکھ بیس ہزار کی تعداد تو طبقات ناصری میں درج ہے۔ لیکن سوار و پیادے کی تقسیم اس میں نہیں بتائی گئی۔ سواروں اور پیادوں کی الگ الگ تعداد منتخب التواریخ سے معلوم کی گئی ہے۔ پرتھی راج کے لشکر کی تعداد تاریخ فرشتہ اور دوسرے مؤرخین نے تین لاکھ سوار اور تین ہزار سے زیادہ جنگی ہاتھی بتائی ہے۔ پیادوں کی صحیح تعداد کسی نے نہیں لکھی۔ بلکہ لاتعداد اور بے قیاس کے الفاظ سے پیادوں کی کثرت کو ظاہر کیا ہے۔ سرستی ندی کے کنارے پہنچ کر سلطان نے اتمام حجت کے لئے پھر ایک خط پرتھی راج کے پاس بھیجا اور وہاں سے وہی درشت و نادرست جواب آیا جس میں اپنی فوج کی کثرت اور جنگی ہاتھیوں سے ڈرایا گیا تھا۔ سلطان شہاب الدین غوری کے لئے اس مرتبہ بھی خطرات موجود تھے کیونکہ ہندو لشکر کی کثرت کے مقابلہ میں اسلامی لشکر کی کوئی حقیقت ہی نہ تھی۔ پرتھی راج کو اس مرتبہ پہلے سے بھی زیادہ اپنی فتح کا یقین تھا۔ سلطان کے لشکر میں کسی اضافہ کا کوئی امکان نہ تھا اور ہندو فوجیں ہر روز برابر آ آ کر شامل ہو رہی تھیں۔ ہندو راجاؤں نے پرتھی راج کے سامنے جمع ہو کر بہادرانہ انداز میں قسمیں کھائیں کہ جب تک مسلمانوں کو شکست دے کر نغانہ کر دیں گے۔ دم نہ لیں گے اور کسی کو منہ نہ دکھائیں گے۔ فرشتہ کے الفاظ یہ ہیں :۔

"راجہ ہائے راجپوت کہ یک صد و پنجاہ نفر می شدند تشقۂ شجاعت بر جبیں کشیدہ بقاعدہ ورواج سوگند ہائے غلیظ و شدید یاد نمودند کہ رقم ہزیمت از صحیفۂ خاطر محو سازند و تا دفع خصم ننمایند دست از کارزار برندارند "

پرتھی راج نے کھانڈے رائے کو ہندو افواج کا سپہ سالار اعظم قرار دیا اور خود ڈیڑھ سو راجاؤں اور ان کے انتخابی سورماؤں کے ساتھ قلب لشکر میں قائم ہوا۔ ان راجاؤں میں قنوج کا راجہ جے چند موجود نہ تھا۔ جس کا سبب یا تو پرتھی راج سے ایک قسم کی رقابت کا ہونا تھا۔ جو اپنے نانا اننگ پال ثانی کی ریاست سے حصہ نہ پانے اور پرتھی راج کے متبنٰی ہونے کی وجہ سے قرین قیاس ہے یا کوئی بیماری یا کسی دوسری مجبوری نے اس کو تراوری کے میدان میں پہنچنے سے باز رکھا ہوگا۔ لیکن پرتھی راج اور جے چند کے درمیان ایسی عداوت ہرگز نہ تھی

کہ جے چند پرتھی راج کے مقابلہ میں سلطان شہاب الدین غوری کا ہمدرد بن جاتا۔ اگر ایسی عداوت ہوتی تو وہ ضرور دوسرے راجاؤں کو بھی روکتا اور پرتھی راج کا شریک نہ ہونے دیتا۔ کیونکہ پہلی لڑائی میں پرتھی راج کے ساتھ صرف ساٹھ یا چونسٹھ راجہ تھے اور اس مرتبہ ڈیڑھ سو۔ پہلی مرتبہ پرتھی راج کی کل فوج دو لاکھ تھی اور اس مرتبہ صرف سواروں کی تعداد تین لاکھ بیان کی گئی ہے۔ اگر جے چند واقعی کوئی بڑا صاحب اثر اور عظیم الشان راجہ تھا تو ممکن نہ تھا کہ جے چند کے ہوا خواہ ہونے کی حالت میں جس قدر راجہ، جس قدر فوج پرتھی راج فراہم کر سکا اب اس سے کئی حصے زیادہ فراہم کر سکتا اور اگر یہ کہا جائے کہ جے چند نے تو ضرور مخالفت کی ہوگی مگر اس کی بات لغو سمجھ کر کسی نے سُنی ہی نہیں اور پرتھی راج کی امداد سب نے ضروری سمجھی تو ثابت ہوا کہ جے چند کی مخالفت پرتھی راج کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکی۔ اور جے چند کی شرکت پرتھی راج کو کوئی قابل تذکرہ اعانت نہیں پہنچا سکتی تھی۔ غرض یہ کہنا کہ جے چند کی مخالفت کی وجہ سے پرتھی راج کو تراوری کی دوسری لڑائی میں شکست ہوئی سراسر غلط اور واہیات بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جے چند اور پرتھی راج کے جو تعلقات تراوری کی جنگ اول کے وقت تھے وہی جنگ دوم کے وقت بھی تھے۔ ان دونوں لڑائیوں کے درمیان کوئی نئی اور جدید بات پیدا نہیں ہوئی تھی۔ جے چند نہ پہلی لڑائی میں شریک تھا۔ نہ دوسری میں شریک ہو سکا۔ اگر جے چند اور سلطان شہاب الدین کے درمیان کوئی ہمدردی اور محبت قائم تھی اور سلطان نے جے چند ہی کی ترغیب سے ۵۸۸ھ ہجری میں ہندوستان پر چڑھائی کی تھی تو تھوڑے ہی دنوں کے بعد جے چند اور سلطان شہاب الدین کے درمیان لڑائی کیوں ہوئی۔ جس کا آگے ذکر آتا ہے۔ بہرحال سلطان نے پرتھی راج کے پاس سے اس دوسرے خط کا بھی جواب پاکر اور اپنی طرف سے حجت پوری کرنے کے بعد زیادہ تامل مناسب نہ سمجھا اور اپنی قابلیت سپہ سالاری کا اظہار اس طرح کیا کہ رات کے وقت فوج کو چار حصوں میں تقسیم کر کے ہر حصہ ایک ایک تجربہ کار و بہادر سردار کے سپرد فرما کر حکم دیا کہ پہلے ایک سردار حملہ کرے۔ باقی اپنی اپنی جگہ خاموش تماشا دیکھتے رہیں۔ جب خوب زور شور کی لڑائی ہونے لگے تو مصروف جنگ سردار اپنی فوج کے ساتھ اس طرح پسپا ہونا شروع کر دے کہ دشمنوں کو اپنی فتح کا یقین ہو جائے اور وہ دلیر ہو کر تعاقب کرنے لگیں۔ اس حالت میں دوسرا سردار اپنی تازہ دم فوج کے ساتھ حملہ آور

ہو کر ہندو حملہ آوروں کو اپنی طرف متوجہ کرے اور پہلے سردار کی طرح تھوڑی دیر جم کر مقابلہ کرنے کے بعد وہ بھی پیچھے ہٹنے لگے۔ اس کے بعد تیسرا اور اسی طرح چوتھا سردار حملہ آور ہو اور پیچھے ہٹ کر دم لینے والے پھر اپنی جمعیت کو درست کر کے اور تازہ دم ہو کر حملہ آور ہونے کے لئے مستعد ہو جائیں۔ سلطان نے بارہ ہزار انتخابی سوار جدا کر کے اپنے ہمراہ رکاب رہنے کے لئے مخصوص کر لیے۔

اس انتظام اور صدور احکام کے بعد طلوع آفتاب سے پہلے اسلامی لشکر نے سرستی ندی کو عبور کیا اور ہر حصۂ فوج نے اپنی اپنی جگہ متعین کر لی۔ سلطان اپنے بارہ ہزار سوار لے کر ایک بلند مقام یا اونچے ٹیلے پر کھڑا ہو کر لڑائی کا تماشا دیکھنے اور تیز رو سواروں کے ذریعے سرداران لشکر کے پاس احکام بھیجنے لگا۔ سلطانی حکم کے موافق اول ایک حصۂ فوج نے حملہ کیا۔ اس کے پسپا ہونے پر دوسرا حصہ حملہ آور ہوا۔ ہر مرتبہ ہندوؤں نے مسلمانوں کو مفرور و مغلوب یقین کر کے ان کا تعاقب کیا اور اس طرح ہندو لشکر جو ایک ٹھوس اور مضبوط پہاڑ کی طرح قائم تھا۔ مختلف سمتوں میں پھیل کر بکھرنے لگا اور اسلامی لشکر نے نہایت خوبی کے ساتھ اپنے فرائض کو انجام دیا۔ طلوع سحر سے لڑائی شروع ہوئی تھی۔ سہ پہر تک میدان جنگ کی بچھی ہوئی بساط پر سلطان کے سب نقشے حرکت کرتے رہے اور ہندوؤں کی کثرت مسلمانوں کی قلت پر غالب نہ آسکی۔ سلطان نہایت ہوشیاری کے ساتھ میدان جنگ کے نظاروں کی تبدیلیوں کو معائنہ کر رہا تھا۔

پرتھی راج کی شکست

عصر کے قریب سلطان نے فیصلہ کیا کہ اب میرے حملہ آور ہونے کا وقت آگیا ہے چنانچہ اس نے اپنے بارہ ہزار سواروں کو جو اب تک سلطان کے ہمراہ خاموش کھڑے تھے لے کر ہندو لشکر کے قلب کو جہاں پرتھی راج ڈیڑھ سو راجاؤں اور انتخابی سورماؤں کے درمیان موجود تھا مطمح نظر قرار دے کے حملہ کیا۔ سلطان اور اس کے بارہ ہزار ہمراہیوں نے جو سب زرہ پوش سوار تھے اپنے نیزے گھوڑوں کی کنوتیوں پر رکھ کر اس طرح حملہ کیا کہ چشم زدن میں ہر سد راہ کو مٹاتے اور پامال کرتے ہوئے قلب پر جا پڑے۔ حریف افگنی میں وہ چابک دستی دکھائی کہ پرتھی راج کو فرار ہی میں عافیت نظر آئی اور کھانڈے رائے نے بھی بصد دشواری میدان سے بھاگ کر اپنی جان بچائی سرداروں کی جب یہ حالت ہوئی تو دوسروں کا کیا حوصلہ تھا کہ میدان میں قدم جماتے

اور تلوار چلاتے۔ایک آندھی تھی کہ ہندو لشکر کو درختوں کے خشک پتوں اور ریت کے ذروں کی طرح اُڑا کرلے گئی۔غروب آفتاب سے پہلے مقتولوں کی لاشوں اور مسلمان فتحمندوں کے سوا ترائن کا میدان ہندوؤں سے خالی تھا۔مسلمانوں نے بھاگنے والوں کا تعاقب کیا اس تعاقب میں پرتھی راج کو قلعہ سرستی کے قریب جالیا اور زندہ گرفتار کرکے غروبِ آفتاب کے ساتھ ہی اس کی مشعلِ حیات کو گل کر دیا۔کھانڈے رائے بھی بھاگتا ہوا زخم کھا کر مارا گیا۔لیکن سجان رائے کہتا ہے کہ وہ گرفتار نہیں ہوا بلکہ زندہ وسلامت بچ کر نکل گیا۔چنانچہ سجان رائے کے الفاظ ملاحظہ ہوں:۔

کھانڈے رائے برادر رائے پتھورا کہ سپہ سالار بود ہزیمت را غنیمت دانستہ بعد سعی وتلاش جان خودرا ازآں مہلکہ سلامت بُرد

چناں بیمناک وہراساں گریخت
کہ زنّار را از گرانی گیخت

سجان رائے نے کھانڈے رائے کے بھاگنے کا مکمل نقشہ ایک شعر میں جس خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے اس کی لطافت مستحق آفریں ہے۔

مشرقی اضلاع کی فتوحات اور سلطان شہاب الدین کی شہادت

اس فتح عظیم کے بعد سلطان نے سرستی، ہانسی سامانہ کہرام وغیرہ قلعوں کو فتح کیا۔اس کے بعد پرتھی راج کے دارالسلطنت اجمیر کی طرف گیا۔شہر اجمیر کو سلطان نے کوئی نقصان نہیں پہنچایا اور پرتھی راج کے بیٹے اکولہ جی کو اجمیر کا راجہ بنا کر اور اقرارِ اطاعت لے کر واپس چلا آیا۔دہلی میں پرتھی راج کا دوسرا بیٹا رین جی موجود تھا جو کھانڈے رائے کی غیر موجودگی میں اس کا قائم مقام تھا جب اجمیر سے واپس ہوکر سلطان دہلی کے قریب پہنچا تو رین جی نے سلطان کے پاس عاجزانہ درخواست بھیج کر جان کی امان چاہی سلطان اس کو دہلی کا راجہ بنا کر شہر دہلی میں داخل ہوئے بغیر باہر ہی واپس چلا آیا اور قلعہ کہرام میں اپنے غلام قطب الدین ایبک کو اس نومفتوحہ علاقہ کا۔جو پہلے بھی سلطنت اسلامیہ میں شامل تھا عامل بنا کر غزنی کو واپس چلا گیا۔یہ واقعہ ۵۸۸ھ میں ظہور پذیر ہوا۔میرٹھ کے قلعہ میں پرتھی راج کا رشتہ دار کوئی راجہ حکومت کرتا تھا۔اس سے سلطان نے کوئی تعرض نہیں کیا۔سلطان کے واپس چلے جانے کے بعد

ہی میرٹھ کے راجہ نے دہلی کے راجہ پرتھی راج کے بیٹے کو سرکشی کی ترغیب دے کر خود اس کی اعانت پر آمادگی ظاہر کی اور جے چند نے پرتھی راج کا انتقام لینے پر آمادگی ظاہر کر کے ان دونوں کی بہت افزائی کی۔ چنانچہ میرٹھ و دہلی کے یہ دونوں راجہ قطب الدین ایبک کے خلاف مستعد ہو گئے۔ قطب الدین ایبک نے یہ سنتے ہی بلا تامل چڑھائی کر دی اور یکے بعد دیگرے دہلی و میرٹھ دونوں کو فتح کر کے اپنے قبضے میں لے آیا۔ قلعہ علی گڑھ بھی پرتھی راج کے کسی رشتہ دار کی حکومت میں تھا اس نے بھی علامات ناستودہ اور مقابلہ کی تیاری کا اظہار کیا۔ قطب الدین نے علی گڑھ بھی بلا تامل فتح کر کے اس نواح کے تمام علاقے کو قبضے میں لا کر بجائے کہرام کے دہلی کو اپنا دارالحکومت بنایا۔ کولہ جی پسر پرتھی راج اپنے عہد پر قائم رہا اس لئے قطب الدین ایبک اس کو نقصان پہنچانے کا خیال تک بھی دل میں نہ لایا۔ مذکورہ علاقے قطب الدین نے ۵۸۹ھ میں فتح کئے۔

ان فتوحات سے جے چند اور قطب الدین ایبک کے مقبوضات کی حد مل گئی۔ جے چند جو اپنے بھائی پرتھی راج کے مقتول ہونے کی خبر سننے کے بعد ہی سے کانٹوں پر لوٹ رہا تھا اور مسلمانوں کی طرف سے خار کھائے بیٹھا تھا۔ قطب الدین کی ان فتوحات کو خموشی سے نہ دیکھ سکا۔ اس نے پرتھی راج کا انتقام لینے کی تیاری کی اور قطب الدین کو مار کر نکال دینے پر آمادہ ہوا اور راجہ گوالیار و راجہ بدایوں کے علاوہ اودھ و بہار تک کے راجاؤں کو امداد کے لئے بلایا۔ قطب الدین نے اس خطرے کو محسوس کرتے ہی احتیاطاً سلطان کو اطلاع دی اور سلطان یہ اطلاع پاتے ہی بلا توقف ہندوستان کی طرف روانہ ہو گیا۔ دہلی پہنچ کر قنوج کے راجہ جے چند کی سرکوبی کے لئے روانہ ہوا۔ قطب الدین ایبک کو ایک دستہ فوج کے ساتھ بہ طور ہراول چند کوس آگے آگے چلنے کا حکم دیا۔ جے چند نے مقام چندواڑہ میں جو اٹاوہ سے جانب شمال ہے اپنی فوجیں آراستہ کر کے میدانِ کارزار گرم کیا۔ سلطانی لشکر کے ہراول یعنے قطب الدین ایبک نے جے چند کے مقابل پہنچتے ہی سلطان کا جو چند میل پیچھے لشکر لئے آرہا تھا۔ انتظار کئے بغیر حملہ کر دیا اور سلطان کے میدان جنگ تک پہنچنے سے پہلے ہی جے چند کے لشکر کو شکست دے کر بھگا دیا۔ جے چند اس لڑائی میں قطب الدین ایبک کے تیر سے مارا گیا سلطان قنوج پر قبضہ کر کے بنارس پر بھی جو جے چند کا مقبوضہ تھا حملہ آور ہوا۔ بنارس کے بعد گوالیار اور بدایوں وغیرہ کئی قلعوں کو فتح کیا اور سب جگہ اپنے عامل مقرر کر کے اسلامی

حکومت قائم کی۔ اس طرح شمالی ہند کا ایک بڑا حصہ اسلامی سلطنت میں شامل ہوگیا پنجاب و ملتان و سندھ تو پہلے ہی سے اسلامی حکومت کے صوبے تھے۔ اب وہ ملک بھی جس کو آج کل صوبۂ متحدہ کہتے ہیں سلطنتِ اسلامیہ میں شامل ہوگیا۔

قطب الدین بحیثیت گورنر ہندوستان

قطب الدین ایبک کی قابلیت سرداری چونکہ اب اچھی طرح ثابت ہو چکی تھی لہٰذا قطب الدین کو تمام مقبوضاتِ ہند کا حاکم اور وائسرائے بنا کر ۵۹۱ھ میں سلطان غزنی کی جانب روانہ ہوگیا۔ اسی سال سلطان کے غزنی چلے جانے کے بعد پرتھی راج کے کسی رشتہ دار مسمی ہیمراج نے بہت سے راجپوتوں کو اپنے ساتھ ملا کر پرتھی راج کے بیٹے کولہ جی کے خلاف خروج کیا اور اس کو شکست دے کر اجمیر پر قبضہ کر لیا۔ کولہ جی نے قطب الدین ایبک سے فریاد و استمداد کی۔ قطب الدین فوراً دہلی سے فوج لے کر اجمیر گیا۔ ہیمراج نے زبردست مقابلہ کیا۔ آخر لڑائی میں مارا گیا اور قطب الدین ایبک نے کولہ جی کو پھر اجمیر کی گدی پر بٹھادیا۔ اس کے بعد ۵۹۲ھ میں قطب الدین ایبک نے ایک زبردست فوج لے کر گجرات کے راجہ بھیم دیو پر چڑھائی کی۔ یہ وہی بھیم دیو ہے جس پر شہاب الدین غوری نے بھی حملہ کیا تھا۔ قطب الدین ایبک کو فتح حاصل ہوئی اور گجرات کے راجہ سے اقرار اطاعت اور خراج لے کر واپس ہوا۔ ۵۹۳ھ میں راجپوتوں نے کولہ جی کے خلاف متفق ہو کر پھر اجمیر پر قبضہ کر لیا قطب الدین ایبک نے پھر جا کر راجپوتوں کو سزائیں دیں اور کولہ جی کو پھر اجمیر کا راجہ بنا دیا۔ اس سال کے آخری ایام میں بیانہ و گوالیار میں بغاوت و سرکشی نمودار ہوئی اور راجپوتوں نے ان دونوں قلعوں پر قبضہ کر لیا۔ یہ خبریں سُن کر ۵۹۴ھ میں سلطان خود ہندوستان آیا اور قلعہ بیانہ فتح کر کے اپنے ایک سردار بہاؤالدین طغرل کو بیانہ میں مقرر کر کے اس طرف کے علاقہ کا مستقل گورنر مقرر کیا اور گوالیار کے قلعہ کی فتح اس کے سپرد کر کے خود غزنی کی جانب چلا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ سلطان شہاب الدین بڑی باریک بین اور دقیقہ رس نظر رکھتا اور انتظام ملکی سے خوب واقف و آگاہ تھا۔ اسی لئے اُس نے بیانہ کا ایک الگ صوبہ بنا دینا ضروری سمجھا تا کہ قطب الدین ایبک کو کسی قدر سہولت ہو۔ بہاؤالدین طغرل نے گوالیار کا قلعہ فتح کر لیا۔ مگر اس کے چند روز بعد وہ فوت ہوگیا اور یہ علاقہ پھر قطب الدین ایبک ہی کے زیر حکومت آگیا۔ قطب الدین ایبک نے اس کے بعد بھی اپنی ملک گیری کا ثبوت دیا۔ یعنی قلعہ کالپی

اور کالنجر کو بھی فتح کرلیا۔
۵۹۹ھ میں سلطان شہاب الدین غوری کے بڑے بھائی سلطان غیاث الدین غوری کا انتقال ہوا اور اس کی وصیت کے موافق سلطان شہاب الدین غوری تمام غوری سلطنت کا فرماں روا بن گیا۔ سلطان شہاب الدین نے اپنے بھتیجوں اور رشتہ داروں کو خراسان وایران وافغانستان وغیرہ کے علاقوں پر حاکم مقرر کیا۔ خاندان خوارزم شاہی اور خاندانِ غوریہ میں عرصہ سے کشمکش چلی آتی تھی، سلطان غیاث الدین کے فوت ہوتے ہی خوارزم شاہیوں نے حملے شروع کر دیئے اور سلطان شہاب الدین کو ان کے مقابلہ میں خود جانا پڑا۔ اتفاقًا ایک لڑائی میں سلطانی لشکر کو سخت نقصان اٹھانا پڑا۔ اور سلطان برف باری اور راستے کی صعوبات برداشت کرتا ہوا بمشکل اپنے دارالسلطنت میں واپس آیا۔ اس نقصان واذیت اور صعوبات سفر کا ایک یہ نتیجہ تھا کہ سلطان کے شہید یا فوت ہونے کی غلط افواہ اکثر شہروں میں پھیل گئی۔ بعض شرارت پیشہ اشخاص نے ہندوستان میں اس خبر کو خوب شائع کیا اور جا بجا بغاوت وسرکشی کا سلسلہ جاری ہوا۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ عزالدین محمد بختیار خلجی نے جو قطب الدین ایبک کے ماتحت مشرقی اضلاع کا عامل تھا۔ ایک قلیل جمعیت کے ساتھ بہار و بنگال میں فتوحات شروع کردی تھیں۔ مشرقی علاقوں کو تو قطب الدین نے خوب قابو میں رکھا لیکن پنجاب و ملتان میں شورش پسند و جرائم پیشہ قبائل اور ملاحدہ نے جو خفیہ طور پر جا بجا پھیلے ہوئے تھے ایک اودھم مچا دی۔ ملاحدہ جو شاہ الموت کے زیر ہدایات جا بجا مسلمانوں کے لباس میں پھیلے ہوئے موقعہ کے منتظر تھے ان جرائم پیشہ قبائل کی رہبری وہمت افزائی کا موجب ہوئے۔ یہ واقعہ ۶۰۰ھ کے اواخر اور ۶۰۱ھ کے شروع ایام سے تعلق رکھتا ہے۔
سلطان نے خوارزم شاہیوں سے نبرد آزما ہونے کو موخر کرکے اول سندھ و ملتان کی خبر لینا ضروری سمجھا۔ کیونکہ وہ ملاحدہ کے خطرے کو سب سے زیادہ اہم سمجھتا تھا۔ چنانچہ اول ملتان کی بغاوت فرو کرکے باغیوں کو سخت سزائیں دیں۔ پھر غزنی پہنچ کر پشاور کی طرف روانہ ہوا۔ شمالی و مغربی پنجاب کے اضلاع کا امن وامان برباد ہو گیا تھا۔ لہٰذا اس کی طرف متوجہ ہونا بھی ضروری تھا۔ سلطان کے پنجاب پہنچنے کی خبر سن کر دہلی سے قطب الدین ایبک بھی روانہ ہو کر سلطان کی خدمت میں پہنچ گیا۔ گکھڑوں یا کھوکھروں کو جو مایۂ فساد بنے ہوئے تھے خوب سزائیں دیں اور اس طرح اپنے زندہ موجود ہونے کا عملی ثبوت پیش کرکے امن وامان پھر قائم

کر دیا۔ اس جگہ تاریخ فرشتہ سے ایک حکایت کا نقل کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ فرشتہ لکھتا ہے کہ ان گھکڑوں یا کھوکھکروں کی قوم اس وقت تک نامسلمان اور زنار دار تھی ان کا پیشہ رہزنی تھا اور مسلمانوں کے قتل کو ثواب جانتے تھے۔ اسی لئے ملاحدہ کو ان کے اندر خوب رسوخ حاصل تھا۔ ایک مسلمان اتفاقاً ان کے ہاتھ میں گرفتار ہوا جس کو انھوں نے بجائے قتل کرنے کے قید رکھا۔ اس مسلمان قیدی کے اوضاع و اطوار اور حرکات و سکنات اس شخص کو بہت پسند آئے جس کے یہاں وہ مسلمان قید تھا۔ قیدی نے موقعہ پاکر اسلام کی تبلیغ و تلقین شروع کی نتیجہ یہ ہوا کہ گھکڑ نے اسلام قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ قیدی نے سلطان کے پاس یہ خبر بھجوائی۔ سلطان شہاب الدین غوری نے اس نومسلم گھکڑ کو اس علاقے کا حاکم بنا دیا تاکہ وہ خود اپنی قوم کا بند و بست کر سکے اور قتل و غارت سے یہ قوم باز آئے۔ اس نومسلم گکھڑ کی کوشش سے کئی لاکھ گھکڑ دائرۂ اسلام میں داخل ہو کر بہت شائستہ زندگی بسر کرنے لگے۔ ورنہ اس سے پیشتر ان میں کثرت البعول اور دختر کشی وغیرہ کا عام رواج تھا۔ اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہندو قوموں میں اسلام کس طرح پھیلا ہے اور مسلمان بادشاہوں نے کہاں تک لوگوں کو زبردستی مسلمان بنایا ہے۔

سلطان شہاب الدین کی شہادت

سلطان شہاب الدین غوری نے مذکورہ انتظام سے فارغ ہو کر قطب الدین ایبک کو لاہور سے دہلی کی جانب روانہ کیا اور خود لاہور سے غزنی کی طرف روانہ ہوا۔ ملاحدہ الموت کی سرگرمیاں اس زمانے میں اپنے معراج الکمال کو پہنچی ہوئی تھیں۔ سلطان شہاب الدین کے لشکر میں حضرت امام فخر الدین رازی روزانہ درس دیتے اور نمازوں کی امامت فرماتے تھے۔ ان کے درس میں جو مسلمان بڑی عقیدت اور شوق کے ساتھ شریک ہوتے تھے ان میں بعض ملاحدہ بھی شامل تھے جن سے امام صاحب بالکل بے خبر تھے۔ یہ ملاحدہ جب مسلمانوں میں شامل رہتے تو اپنے آپ کو اعلیٰ درجہ کا عابد زاہد ثابت کرتے بعض اوقات سلطنت کے اعلیٰ عہدوں پر بھی فائز ہو جاتے تھے اور کسی کو خبر بھی نہ ہوتی تھی کہ یہ ملحد اور مسلمانوں کے جانی دشمن ہیں۔ سلطان شہاب الدین ملاحدہ کا سخت دشمن اور ان کی بیخ کنی پر ہمیشہ آمادہ رہتا تھا۔ مگر ان ظالموں کا وجود اس کے لشکر میں موجود تھا اور سلطان کیا ہر ایک مسلمان اس سے بے خبر تھا سلطان لاہور سے روانہ ہو کر جس وقت مقام دمیک میں جو پنجاب کے ضلع جہلم میں بتایا جاتا ہے پہنچا اور

دریائے جہلم کے کنارے سلطانی لشکر خیمہ زن ہوا تو رات کے وقت ان ملاحدہ نے جو سلطانی لشکر میں موجود اور ان میں سے بعض دربانی کی خدمت پر بھی مامور تھے موقع پاکر سلطان کے قتل کی قرارداد پر عمل کیا اور خنجر سے سلطانی خیمہ کو چاک کرکے دس بیس ملاحدہ اندر داخل ہوئے اور سوتے ہوئے سلطان کو چھریوں سے شہید کر ڈالا اور خیمہ کے اسی شگاف سے نکل کر بھاگ گئے۔ ان میں سے بعض بھاگتے ہوئے پکڑے اور پہچانے گئے تو وہی اشخاص تھے جو حضرت امام فخرالدین رازی کی مجلس میں بڑے شوق اور گرویدگی سے شامل ہوا کرتے اور اسی لئے امام صاحب کے مقرب و خدام خاص سمجھے جاتے تھے۔ لوگوں نے یہ قیاس کیا کہ امام فخرالدین رازی کا ملاحدہ سے تعلق ہے اور انھوں نے ہی سلطان کو شہید کرایا ہے۔ لہٰذا امام صاحب کو اسیر و دستگیر کرلیا اور سلطان کے جنازے کو لے کر غزنی کی جانب روانہ ہوئے۔ امام صاحب نے بڑی مشکل سے اپنی برأت ثابت کرکے جان بچائی۔ سلطان شہاب الدین غوری ۳ شعبان ۶۰۲ھ کو شہید ہوا۔ اس وقت سندھ و گجرات سے لے کر بنگال و آسام تک تمام شمالی ہند مسلمانوں کے قبضے میں آچکا تھا۔ بہار و بنگال کو اسی قریبی زمانے میں بختیار خلجی فتح کرکے آسام پر چڑھائی کرچکا تھا۔

بہار و بنگال کا فتح ہونا

اس جگہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بہار و بنگال کی فتح کا تفصیلی حال درج کردیا جائے۔ غور کے نواح میں جو قبائل آباد تھے ان میں ایک قبیلہ خلجیوں کا بھی تھا۔ قبیلہ خلجی کے اکثر افراد سلطان شہاب الدین غوری اور ملک قطب الدین ایبک کی فوج میں نوکر تھے۔ اسی قبیلہ کا ایک شخص محمد محمود خلجی ہندوستان آیا اور فتح قنوج کے بعد قنوج کے علاقے میں ایک جاگیر حاصل کرسکا۔ جب محمد محمود کا انتقال ہوا تو اس کے بھتیجے محمد بختیار خلجی کو وہ جاگیر مل گئی۔ محمد بختیار نے یہاں اپنے لئے ترقی کی راہیں مسدود دیکھ کر اس جاگیر کو چھوڑ دیا اور اودھ کے حاکم ملک حسام الدین اغلبک کے پاس پہنچا۔ اس نے محمد بختیار کو اس کی خواہش کے موافق ایک جاگیر اودھ کے مشرقی حصے میں عطا کردی۔ وہاں محمد بختیار نے ملک حسام الدین کو کئی معرکوں میں اپنی بہادریاں دکھا کر اپنے اوپر اس قدر مہربان کرلیا کہ اس نے اس چھوٹی سی جاگیر کے عوض اودھ کے ایک پورے ضلع کی حکومت سپرد کی۔ اب محمد بختیار نے موقعہ پاکر ملک بہار کے علاقے پر تاخت و تاراج کا سلسلہ شروع کیا اور اس ملک کے ہندو راجہ سے کئی قلعے چھین لئے۔ جب سے محمد بختیار

کی شہرت دور دور تک پھیل گئی اور اس کی قوم کے آدمی جو مختلف شہروں میں پھیلے ہوئے تھے ہر طرف سے آ آ کر محمد بختیار کے پاس جمع ہو گئے۔ محمد بختیار کی اولوالعزمی اور بہادری کی خبر جب ملک قطب الدین ایبک وائسرائے ہند کے پاس پہنچی تو اس نے بہادر سپاہی کی قدر دانی اور عزت افزائی ضروری سمجھ کر دہلی سے اس کے لئے خلعت و انعام بھیجا اور ملک حسام الدین اغلبک عامل اودھ کو لکھا کہ اس بہادر کی قدر دانی و عزت افزائی کا ضرور خیال رکھو۔ اس طرح صاحب عزت اور صاحب طبل و علم ہو کر محمد بختیار نے بہار کے علاقے پر باقاعدہ حملہ شروع کیا اور صرف ایک سال کے اندر بہار کا ملک فتح کر کے قلعہ بہار پر بھی قبضہ کر لیا۔ قلعہ بہار کی تسخیر کے وقت محمد بختیار خلجی کے ساتھ کل دو سو آدمیوں کی فوج تھی اور یہ قلعہ ملک بہار میں سب سے زیادہ مضبوط اور ناقابلِ تسخیر مقام سمجھا جاتا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں بہار کی سلطنت۔ جو بدھ مذہب رکھتی تھی کس قدر کمزور تھی اور مسلمانوں نے اس کو کتنے تھوڑے آدمیوں سے فتح کیا تھا۔ یہ بدھ حکومت مسلمانوں کی فتوحات کا سلسلہ ہندوستان میں شروع ہونے کے سبب راجپوت ریاستوں کی حملہ آوری سے بچی ہوئی تھی۔

بہار کا گورنر فتح بہار کے بعد قطب الدین ایبک نے محمد بختیار خلجی کو اپنے پاس دہلی بلوایا اور خلعت و خطاب دے کر بہار کا گورنر مقرر کیا۔ بختیار خلجی نے واپس آ کر ملک بہار میں اپنی طرف سے عامل مقرر کئے اور انتظام ملکی سے مطمئن ہو کر بنگال کی طرف بڑھا۔ بنگال کا دارالسلطنت اُس زمانہ میں شہر لوڈیہ یا ندیہ تھا۔ ندیہ کا راجہ لکشمن سین جو لکھمنیہ کے نام سے مشہور تھا۔ محمد بختیار خلجی کا مقابلہ نہ کر سکا۔ محمد بختیار جب ندیہ کے قریب پہنچا تو اس نے اپنی فوج پیچھے چھوڑی اور صرف اٹھارہ آدمی لے کر شہر ندیہ کے اندر داخل ہوا۔ شہر کے دروازہ پر محافظوں نے یہ سمجھ کر کہ کوئی سوداگر یا مسافر یا سفیر ہے جو اس طرح بے تکلف شہر میں داخل ہو رہے ہیں ان کو نہ روکا ان اٹھارہ بہادروں نے راجہ کی محل سرائے کے دروازے پر جا کر محل سرائے کے دربانوں کو قتل کرنا شروع کیا اس وقت لکشمن سین رسوئی میں کھانا کھانے بیٹھا تھا۔ شور و غل کی آواز سن کر معلوم ہوا کہ مسلمان آ پہنچے۔ اس قدر حواس باختہ ہوا کہ فوراً اٹھ کر سرنگ کے راستے محل سے بھاگا اور ندیہ سے فرار ہو کر اڑیسہ کے شہر کٹک میں پہنچ کر وہاں کے مندر میں پناہ لی اور پجاریوں میں شامل ہو کر بقیہ چند روزہ زندگی بسر کی محمد بختیار نے داخل ہو کر دیکھا کہ چاندی اور سونے کے برتنوں میں کھانا چنا ہوا رکھا ہے۔ جس کو چھوڑ کر راجہ بھاگ گیا تھا۔ غرض اس طرح بلا کشت و خون بڑی آسانی سے مسلمانوں کا بنگالہ پر بھی قبضہ

ہو گیا۔ محمد بختیار نے ندیہ چھوڑ کر مقام لکھنوتی کو بنگالہ کا دارالحکومت قرار دیا۔ لکھنوتی کا خرابہ آج کل ضلع مالدہ میں موجود اور سیاحوں کے لئے جاذب توجہ مقام ہے (دیکھو سفرنامۂ مظہری) اسی لکھنوتی کا نام گور بھی تاریخوں میں لیا گیا ہے اور اسی کا نام ہمایوں نے جنت آباد رکھا ہے۔

لکھنوتی میں محمد بختیار اپنا نائب مقرر کر کے خود دس ہزار کا لشکر لے کر آسام کی فتح کے لئے روانہ ہوا۔ آسام (کامروپ) کے راجہ نے اطاعت قبول کی۔ طبقات ناصری کی روایت کے موافق ملک کامروپ میں کوچ، میچ، تھارو تین قومیں آباد تھیں اُن میں سے کوچ اور میچ کا سردار جو میچ قوم سے تعلق رکھتا تھا محمد بختیار خلجی کے ہاتھ پر برضا و رغبت مسلمان ہو گیا تھا چنانچہ منہاج سراج کے الفاظ یہ ہیں:۔

"در اطراف آں کوہا کہ میاں تبت و بلاد لکھنوتی است سہ جنس خلق اندیکے را کوچ گویند دوم را میچ وسوم را تھارو۔ ہمہ ترک چہرہ اند ایشاں را زبانے دیگر است میاں لغت ہند و تبت۔ یکے از رؤسائے قبائل کوچ و میچ کہ اورا علی۔ میچ گفتندے بر دست محمد بختیار اسلام آورده بود"

اس کے بعد محمد بختیار نے دریائے برہمپتر کو عبور کر کے ملک تبت پر حملہ کیا۔ دریا کو عبور کرنے کے بعد پندرہ روز تک برابر پہاڑوں کے دروں اور گھاٹیوں میں لشکر اسلام کو سفر کرنا پڑا۔ سولھویں روز تبت کے میدانی علاقے میں پہنچے۔ سامنے ایک مضبوط قلعہ آیا وہاں کے لوگوں نے مقابلہ کیا سخت لڑائی کے بعد اس قلعہ کو فتح کیا۔ وہاں سے پندرہ کوس کے فاصلہ پر کرم پٹن نامی شہر تھا جس میں دشمنوں کی نہایت زبردست فوج موجود تھی۔ محمد بختیار کی فوج اس طویل واذیت رساں سفر اور اس لڑائی میں بہت سی ضائع ہو چکی تھی مصلحت یہی سمجھی گئی کہ اس وقت آگے نہ بڑھیں اور اگلے سال پوری تیاری کے ساتھ آ کر اس ملک کو فتح کریں۔ چنانچہ وہاں سے واپس ہوئے راستے میں دیکھا کہ پہاڑی لوگوں نے تمام درختوں اور سبزیوں کو جو اس پہاڑی راستہ میں مل سکتی تھیں جلا دیا ہے۔ پندرہ روز تک نہ باربرداری کے جانوروں اور سواری کے گھوڑوں کو گھاس ملی نہ سپاہیوں کو کوئی سامان رسد ہاتھ آیا۔ بہت سے آدمی اور جانور ہلاک ہوئے۔ دریائے برہمپتر کے کنارے پہنچے تو اُس پل کو جس کی حفاظت کے لئے ایک دستہ فوج کا چھوڑ گئے تھے شکستہ اور فوجی دستے کو غیر موجود پایا۔ ایک جگہ دریا کو پایاب سمجھ کر عبور کرنا چاہا مگر پانی زیادہ نکلا تمام آدمی غرق ہوئے، صرف

سو آدمیوں کے ساتھ محمد بختیار دریا کے پار پہنچا علی پیچ اور دوسرے اسامی سردار استقبال کو آئے اور اپنی وفاداری کا ثبوت پیش کیا۔ دیوکوٹ پہنچ کر محمد بختیار سخت بیمار ہوگیا۔ اس بیماری کے عالم میں بار بار اُس کی زبان سے یہ کلمات نکلے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ سلطان شہاب الدین غوری کو کوئی آسیب پہنچا ہے اسی لئے مجھ پر یہ مصیبت آئی ہے چنانچہ وہ اس بیماری سے جاں بر نہ ہوسکا اور ۲۰۶ھ میں فوت ہوگیا۔ ان ہی ایام میں سلطان شہاب الدین غوری شہید ہوا تھا۔ بختیار خلجی کے بعد اُس کے جانشینوں نے بنگال میں حکومت کی۔ غرض سلطان شہاب الدین غوری کی زندگی میں تمام شمالی ہند سلطنت اسلامیہ میں شامل ہوچکا تھا۔

سلطان شہاب الدین کے کارناموں پر ایک نظر

اگر محمد بن قاسم کا سندھ پر حملہ آور ہونا ہندوستان اور ہندو قوم کے لئے نقصان رساں تھا تو اس نقصان کی ذمہ داری محمد بن قاسم پر نہیں بلکہ راجہ داہر پر عائد ہوتی ہے۔ اسی طرح سلطان محمود غزنوی کا ہندوستان پر حملہ آور ہونا اگر برا تھا تو اس برائی کا باعث محمود غزنوی نہیں بلکہ راجہ جے پال اور اُس کے بعد اُس کا بیٹا انند پال تھا جیسا کہ باب اوّل اور باب دوم میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ سلطان شہاب الدین غوری کی حالت بھی ان پہلے ہر دو محمدوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ اگر تھانیسر وغیرہ کے علاقہ کو جو پنجاب میں شامل اور سلاطین غزنی کی حدود مملکت میں داخل چلا آتا تھا، پرتھی راج زبردستی اپنے قبضہ میں رکھنے کی کوشش نہ کرتا تو سلطان شہاب الدین غوری کے لئے خوارزم شاہیوں سے نبرد آزما رہنے اور خراسان و ترکستان وغیرہ کی طرف اپنی حکومت کے وسیع و مستحکم کرنے کے کافی مشاغل موجود تھے۔ جس طرح سلطان محمود کو قرامطہ کی وجہ سے ہندوستان کی طرف متوجہ ہونا پڑا تھا اسی طرح سلطان شہاب الدین کو ملاحدہ کے سبب اس طرف آنے کی ضرورت پیش آئی تھی۔

ہندوؤں کی ایک غلطی

ہندوؤں کی ایک اس غلطی کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ انھوں نے مسلمانوں کے دشمن قرامطہ اور ملاحدہ کو اپنے پہلو میں لیا اور ان کے حامی بن کر مسلمانوں کو لڑائی کا چیلنج دیا۔ گذشتہ پانسو سال کے تجربوں سے یہ بات بخوبی ثابت ہوچکی تھی کہ ہندو پست اخلاقی میں ترقی کر رہے ہیں اور موقع پاکر باعث

تکلیف بن سکتے ہیں۔ پس وقت آچکا تھا کہ مسلمان ہندوستان کو فتح کر کے یہاں ایک مستقل سلطنت قائم کریں اور ہندوستان میں بسنے والی کثیر التعداد و عظیم الشان نسلِ انسانی کو تہذیب و انسانیت سکھا کر بدامنی و بدتہذیبی کا شکار ہونے سے بچائیں اور ترقیات کے راستے دکھائیں محمود غزنوی کی ہندوکشی اور بت شکنی کی حقیقت اوپر بیان ہو چکی ہے تاہم اگر وہ بت شکن تھا تو بیچارے شہاب الدین پر تو یہ الزام بھی نہیں لگایا جا سکتا کیونکہ اُس نے مندروں اور مورتیوں کی طرف نظر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ شہاب الدین غوری ہندوستان کے اندر جنوب میں بھی اور مشرق میں بھی وہاں تک نہیں پہنچا جہاں تک محمود اپنی فتحمند فوجوں کے ساتھ پہنچ چکا تھا۔ محمود دکن میں سومنات تک پہنچا۔ لیکن شہاب الدین نہروالہ سے بھی ادھر ہی رہا۔ محمود نے کالنجر فتح کیا لیکن شہاب الدین بنارس سے آگے نہیں بڑھا۔ فرق صرف یہ ہے کہ محمود نے باوجود اس قدر عظیم الشان فتوحات حاصل کرنے کے ہندوؤں کو اُن کے ملک واپس کر دیئے کہ وہ آنکھیں کھولیں اور مسلم آزاری سے باز رہیں۔ لیکن شہاب الدین غوری کے لئے دوبارہ اس تجربہ کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ یہی سبب تھا کہ جب شہاب الدین غوری فوت ہوا ہے تو بنگال و آسام تک شمالی ہند سلطنت اسلامیہ میں شامل تھا اور اُس کے چند ہی روز بعد جنوبی ہند بھی سلطنت اسلامیہ میں شامل ہو گیا۔ تمام براعظم ہندوستان کو فتح کر کے اسلامی سلطنت میں شامل کر لینا مسلمانوں کے لئے نہ محمود کے زمانے میں مشکل تھا نہ شہاب الدین کے زمانے میں اتمام کو پہنچا دینا ضروری ہو گیا تھا ہندوؤں کی حکومت برطرف ہو کر مسلمانوں کی حکومت قائم ہونے کے اسباب سب کے سب بے ساختہ اور یکے بعد دیگرے پیش آنے والے واقعات کا ایک سلسلہ ہے۔ اس سلسلہ میں کہیں یہ نظر نہیں آتا کہ ہندوؤں کو صرف اس لئے نوچ کیا جا رہا ہو کہ وہ ہندو کیوں ہیں یا کوئی فتحمند مسلمان محض اس لئے ہندوؤں پر فوج لے کر چڑھا ہو کہ وہ اسلام میں کیوں داخل نہیں ہوتے۔ مسلمانوں کی کوئی بھی چڑھائی اور ایک بھی لڑائی ایسی نہیں جس کا کوئی ایسا سبب نہ ہو کہ اُس سبب کے واقع ہونے سے ایک مسلمان دوسرے مسلمان پر اور ایک ہندو دوسرے پر چڑھائی کر سکتا تھا۔ محمود غزنوی پر ایک یہ الزام بھی عائد کیا جاتا ہے کہ وہ ہندوستان سے ہندوؤں کو پکڑ پکڑ لے گیا۔ لیکن شہاب الدین غوری پر اس غلط الزام کے لگانے کا بھی کوئی موقع کسی کو نہیں مل سکتا۔ سلطان شہاب الدین کی وفات کے وقت تمام شمالی ہند اسلامی سلطنت میں شامل ہو چکا تھا جس کا بڑا حصہ سلطان شہاب الدین کے آخری

ایامِ حیات میں فتح ہوا تھا۔ سلطان کے فوت ہوتے ہی نہ صرف نو مفتوحہ صوبے بلکہ معہ پنجاب و سندھ تمام شمالی ہند غزنی کی ہوم گورنمنٹ سے آزاد ہو کر ایک مستقل خود مختار سلطنت بن گیا اور مسلمان فرماں رواؤں نے ہندوستان ہی کو اپنا وطن بنالیا اور کبھی بھول کر بھی افغانستان وخراسان کی طرف جانے یا وہاں کے لوگوں کو ہندوستان کی دولت سے مالا مال کرنے کا خیال نہ کیا۔ جس طرح محمود غزنوی نے جے پال کے خاندان کو حکومت وسلطنت سے محروم کرنا نہ چاہا تھا اسی طرح سلطان شہاب الدین نے بھی پرتھی راج کے بیٹوں کو حکومت وسلطنت سے محروم نہیں کیا مگر چونکہ ہندوستان کے ان فرماں روا خاندانوں سے قابلیت فرماں روائی قدرتی طور پر جاتی رہی تھی۔ لہٰذا وہ مسلمانوں کی اس شفقت سے کوئی فائدہ نہ اُٹھا سکے اور خود ہی اپنی ناقابلیت کے سبب گمنامی کے قعرِ مذلت میں روپوش ہوگئے۔ سلطان شہاب الدین غوری کے جانشین اُس کے غلام ہوئے اور وہی ہندوستان کے ابتدائی خود مختار مسلم فرماں روا قرار پائے۔ انھوں نے اس ملک میں کیسی حکومت کی اور ہندوستان کو کس طرح بربادی سے بچایا اور ان کا اخلاق کیسا تھا۔ یہ آئندہ بیان ہونے والا ہے۔ اس وقت صرف اس طرف توجہ دلانی مقصود ہے کہ سلطان شہاب الدین غوری بھی ہرگز ایسا مجرم ثابت نہیں کیا جا سکتا جیسا کہ ہمارے ہندو دوست اُس بے گناہ کو سمجھ رہے ہیں حقیقتِ اصلیہ قارئین کرام کے سامنے ہے اور وہ خود ہی بہترین فیصلہ کرسکتے ہیں۔

ہنٹر کی غلط بیانی

اس جگہ یورپی مورخین کی ابلہ فریبی اور چالاکی کی نسبت کچھ لکھنا فضول ہے کیونکہ ان کا منشائے تاریخ نویسی اور نقطۂ نظر کچھ اور ہی ہے۔ تاہم ہنٹر صاحب کی ایک دیدہ دلیری کی طرف اشارہ ازبس ضروری ہے۔ ہنٹر صاحب اپنی تاریخ میں سلطان شہاب الدین غوری اور پرتھی راج کا حال درج کرتے ہوئے مجلس شوہر پسندی کا حال۔ پرتھی راج کا زبردستی قنوج کے محل شاہی میں گھس کر سنجوگتا کو اُٹھا لانا۔ جے چند کا افغانوں کو حملہ آوری کی ترغیب دینا۔ سنجوگتا کا پرتھی راج کے قتل کی خبر سُن کر ستی ہونا وغیرہ باتیں لکھ کر آخر میں لکھتے ہیں کہ:-

"تاریخ ہند کے یہ خاص واقعات فارسی مورخوں کے بیان سے لئے گئے ہیں۔"

اس موقعہ پر فارسی کی یہ ضرب المثل شاید سب سے زیادہ خوبی کے ساتھ چسپاں

ہو سکتی ہے کہ چہ دلاور ست دزدے کہ بکف چراغ دارد۔ فارسی مورخوں کے بیانات اِن لغویات سے قطعًا پاک ہیں۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ ہنٹر صاحب کے زمانے میں کسی نے فارسی زبان میں کوئی غیر معروف و ناقابلِ التفات کتاب لکھی ہو اور اُس سے ہنٹر صاحب نے ان باتوں کو نقل کر کے اپنی امورخانہ تحقیق کا سکہ جمانے کی کوشش کی ہو جو درحقیقت اُن کے مورخانہ مرتبہ کی پردہ دری کا موجب ہے۔

بابِ چہارم

سلطنتِ غلامان

سلطان شہاب الدین غوری کے فوت ہوتے ہی ہندوستان میں مسلمانوں کا تعلق غزنی کی سلطنت سے منقطع ہو کر ہندوستان کی ایک الگ خود مختار سلطنت قائم ہو گئی تھی جس کا سب سے پہلا شہنشاہ قطب الدین ایبک تھا۔ ادھر قطب الدین ایبک ہندوستان کا سلطان و فرماں روا بنا ادھر شہاب الدین غوری کے خاندان والے خوارزم شاہیوں کے لڑائی جھگڑوں میں مصروف ہوئے جن کا ذکر اس تصنیف کے مقصد سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ سلطان شہاب الدین کا کوئی بیٹا نہ تھا اُس نے اپنے غلاموں ہی کو بیٹوں کی طرح تربیت کیا تھا۔ چنانچہ اس کے بعد قطب الدین ایبک، تاج الدین یلدوز، ناصر الدین قباچہ وغیرہ جو شہاب الدین غوری کے غلام حکومت و سلطنت کے مرتبہ تک پہنچے۔ قطب الدین ایبک سے ہندوستان میں خاندانِ سلطنت کی بنا پڑی وہ غلاموں کا خاندان کہلاتا ہے۔ اس خاندان میں قطب الدین ایبک، آرام شاہ، شمس الدین التمش، رکن الدین، رضیہ بیگم، بہرام شاہ، علاؤ الدین مسعود، ناصر الدین محمود، غیاث الدین بلبن، کیقباد، کل دس بادشاہ تخت نشین ہوئے۔ اس خاندان نے ۶۰۲ھ سے ۶۸۹ھ تک چھیاسی سال حکومت کی۔ اس خاندان کو غلاموں کا خاندان صرف اسی لئے نہیں کہا جاتا کہ قطب الدین ایبک غلام تھا بلکہ شمس الدین التمش و غیاث الدین بلبن نے بھی غلامی کے مرتبہ سے ترقی کر کے شہنشاہی حاصل کی تھی اسی زمانے میں مصر کے

اندر بھی اسی قسم کے غلاموں کی حکومت تھی۔ ہندوستان اور مصر کے غلاموں کی شہنشاہی پر غور کرنے سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ مسلمان اپنے غلاموں کے ساتھ کس قسم کا سلوک روا رکھتے تھے اور غلاموں کے لئے اسلام نے کہاں تک ترقی کی راہیں کشادہ رکھی ہیں۔ ہندوستان میں غلاموں کے اس خاندان میں شمس الدین التمش، ناصرالدین محمود اور غیاث الدین بلبن تین بادشاہوں نے بیس بیس سال یا اس سے زیادہ مدت تک حکومت کی ان تینوں بادشاہوں کی حکومت کا زمانہ مل کر ستر سال ہوتا ہے۔ باقی سولہ سال میں سات بادشاہوں کی حکومت پوری ہوئی۔ اس خاندان نے صرف شمالی ہند کو اپنے قبضے میں رکھ کر امن و امان کے قیام اور سلطنت کے استحکام کی کوشش کی اور ملک دکن کی جانب نئی فتوحات حاصل کرنا نہ چاہیں۔ یہ بات کہ مسلمانوں نے ہندوستان میں اپنی حکومت قائم کرتے ہی ہندوؤں کو تہذیب سکھانے ان کو ترقی دے کر ابھارنے کی کوشش شروع کر دی تھی ایک الگ مستقل باب میں بیان ہو گی۔ اس وقت نہایت مجمل طور پر خاندانِ غلامان اور خاندان خلجی کا ذکر اور ملک دکن کی فتح کا تذکرہ مدنظر ہے تاکہ مسلمانوں کی ہندوؤں پر حملہ آوری کا بیان ختم ہونے پر اس داستان کو شروع کیا جا سکے کہ مسلمان فرماں رواؤں نے اپنی ہندو رعایا کے ساتھ کس قسم کا سلوک کیا تھا۔ لہٰذا اس باب میں نہایت مختصر طور پر طرز حکومت اور ملک دکن کی فتوحات کا ذکر کیا جائے گا۔ اس کتاب کے قاری کو مطمئن رہنا چاہیئے کہ وہ آئندہ ابواب میں اُن چیزوں کو مطالعہ کر سکے گا۔ جن سے واقف ہونے کا شوق اس باب کو پڑھتے ہوئے اُس کے دل میں پیدا ہو سکتا ہے۔

سلطان قطب الدین ایبک

سلطان قطب الدین ایبک کا حال خواجہ صدر نظامی نے اپنی کتاب تاج المآثر میں اور قاضی منہاج سراج نے اپنی کتاب طبقات ناصری میں تفصیل سے لکھا ہے لیکن میں اس جگہ صرف اُس خلاصہ کو درج کرتا ہوں۔ جو اخوند شاہ نے اپنی کتاب روضۃ الصفا میں سلطان قطب الدین ایبک کے ابتدائی حالات کی نسبت لکھا ہے۔ اخوند شاہ کے الفاظ یہ ہیں۔

"بازرگانے قطب الدین را از ترکستان بہ نیشاپور آورد و قاضی فخرالدین عبدالعزیز کوفی کہ از اولاد امام اعظم بود و قضائے نیشاپور تعلق بأوی داشت را بخرید و او در خدمت فرزند قاضی قرآن بخواند و بعد ازاں تیراندازی و سواری تعلیم گرفت

ودر آن ما بر گشت ۔ آنگاہ باز رگانے اور ا از قاضی بخرید و بغزنین برد بسلطان شہاب الدین بفروخت گویند کہ شبے سلطان شہاب الدین غلامان خود را بانعامات فاخرہ اختصاص داد و قطب الدین حصۂ خود را از نقد و جنس ہم دراں مجلس بفراشاں بخشید و چوں ایں معنی لبسمع سلطان رسید او را بمزید عنایت و قرب مخصوص گردانیدہ سر خیل سائر ممالک ساخت و کار او در ظل حمایت سلطان تضاعف می پذیرفت تا امیر آخور شد۔

سلطان شہاب الدین غوری کی شہادت کے بعد اس کے بھتیجے سلطان محمود نے دارالسلطنہ فیروزکوہ سے قطب الدین کے پاس ایک شقہ اور چتر شاہی بھیجا۔ شقہ میں لکھا تھا کہ آپ شوق سے اپنے آپ کو سلطان کے لقب سے ملقب کریں اور ہندوستان میں عدل و انصاف کے ساتھ حکومت کریں۔ اس سندِ حکومت اور چتر شاہی کے آنے پر سلطان قطب الدین نے دہلی سے لاہور جا کر ماہ ذیقعدہ ۶۰۲ھ میں مراسم تخت نشینی ادا کئے۔ جس طرح سلطان قطب الدین ایبک کے پاس ہندوستان کی سندِ حکومت بھیجی گئی تھی اسی طرح غزنی کی حکومت تاج الدین یلدوز کو سپرد ہوئی تھی۔ تاج الدین یلدوز نے صوبۂ پنجاب کو غزنی کی سلطنت میں شامل رکھنا چاہا۔ اور سلطان قطب الدین ایبک نے پنجاب کو ہندوستان کا صوبہ ہونے کی حیثیت سے اپنے قبضہ میں رکھنے پر اصرار کیا۔ چنانچہ دونوں میں جنگ ہوئی اوّل تاج الدین یلدوز نے لاہور کو فتح کیا پھر قطب الدین ایبک نے تاج الدین یلدوز کو پنجاب سے نکال کر غزنی پر چڑھائی کی اور شہر غزنی سے بھی تاج الدین یلدوز کو بھگا دیا۔ چالیس روز تک غزنی کے تخت پر جلوس کر کے وہاں سے لاہور واپس چلا آیا۔ اس کے بعد سلطان تاج الدین یلدوز پھر غزنی پر قابض ہو گیا۔ سلطان قطب الدین ایبک کی شادی تاج الدین یلدوز کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ سلطان قطب الدین ایبک کی ایک بیٹی کی شادی سلطان شہاب الدین غوری کے غلام ناصر الدین قباچہ سے اور دوسری بیٹی کی شادی قطب الدین ایبک کے غلام شمس الدین التمش سے ہوئی تھی، ناصر الدین قباچہ کو سلطان قطب الدین ایبک نے سندھ کا حاکم مقرر کیا تھا، اور شمس الدین التمش کو بدایوں کا۔ ان دونوں دامادوں میں شمس الدین التمش سے قطب الدین ایبک کو زیادہ محبت تھی اور اس کو مثل بیٹے کے سمجھتا تھا۔ چونکہ تاج الدین یلدوز بار بار پنجاب پر حملہ آور ہوتا تھا اس لئے اس کا مقابلہ کرنے کے لئے قطب الدین ایبک کو بجائے دہلی کے لاہور ہی میں رہنا پڑا۔

وفات

۶۰۷ھ میں چوگان کھیلتے ہوئے قطب الدین ایبک کا گھوڑا سکندری کھا کر اس طرح گرا کہ سلطان گھوڑے کے نیچے دب گیا۔ گھوڑے کی زین کا پیش کوہہ سلطان کے سینہ میں گڑا اور فوراً مرغِ روح قالبِ عنصری سے پرواز کر گیا۔ سلطان قطب الدین نے فتح دہلی کے بعد سے اپنی وفات تک بیس سال ہندوستان میں حکومت کی لیکن ابتدائی سولہ سال میں وہ نائب السلطنت کی حیثیت سے تھا۔ آخری چار سال خود مختار اور مستقل شہنشاہِ ہند رہا۔ اتنے بڑے جنگی کارنامے جن میں اُس نے راجپوتوں اور ہندوؤں کو بار بار شکستیں دیں، نائب السلطنت ہونے کے زمانے میں وقوع پذیر ہوئے۔ ہندوستان کا خود مختار سلطان ہونے کے بعد اُس کی کوئی قابلِ تذکرہ جنگ کسی ہندو راجہ سے نہیں ہوئی۔ اُس نے دستِ سخاوت کو اس قدر کشادہ کیا کہ حاتمِ ہند مشہور ہوا۔ اس جگہ یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ ادھر ہندوستان میں مسلمانوں کی ایک الگ مستقل سلطنت قائم ہونے والی تھی اور اُدھر مغولستان میں چنگیز خاں اپنی بادشاہت قائم کر چکا تھا۔ ماہِ رجب ۶۰۲ھ میں چنگیز خاں نے جس کا اصلی نام تموچین تھا اپنا لقب چنگیز خاں یعنی شہنشاہ تجویز کیا اور ۱۸ ذیقعدہ ۶۰۲ھ کو قطب الدین ایبک نے لاہور میں تخت نشین ہو کر تاجِ شاہی سر پر رکھا۔ دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ چنگیزی سلطنت اور ہندوستان کی مستقل اسلامی سلطنت ساتھ ہی ساتھ قائم ہوئی تھیں۔

آرام شاہ ابن قطب الدین ایبک

قطب الدین ایبک کی وفات کے بعد امرائے سلطنت نے اُس کے بیٹے آرام شاہ کو دہلی میں تختِ سلطنت پر بٹھایا۔ آرام شاہ میں سلطنت کی قابلیت نہ تھی۔ ناصر الدین قباچہ نے سندھ و ملتان پر قبضہ کر کے سلطان کا لقب اختیار کیا۔ اُدھر بنگالہ میں حسام الدین عوض خلجی نے خود مختار ہو کر تاجِ شاہی سر پر رکھا اور اپنے آپ کو سلطان کے لقب سے ملقب کر کے بہار و بنگالہ میں اپنی سلطنت قائم کی۔ تاج الدین یلدوز نے غزنی سے پنجاب پر حملہ آور ہو کر لاہور اور تمام ملک پنجاب پر قبضہ کر لیا۔ جس ملک کو آج کل صوبہ آگرہ و اودھ کہا جاتا ہے یہ آرام شاہ کے قبضے میں رہا۔ اس طرح سلطان قطب الدین کے فوت ہوتے ہی ہندوستان کی سلطنت اسلامیہ چار حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ مسلمانوں کی حیرت انگیز بہادری اور اودھ و بہار و بنگالہ و آسام تک کی فتوحات دیکھ کر اس ملک کے راجپوت اور ہندو لوگ اس قدر مرعوب ہو چکے تھے کہ مالوہ و روہیلکھنڈ و راجپوتانہ کے بعض مضبوط مقامات مثلاً گوالیار، اجین اور رنتھمبور و قنوج و مندور

وغیرہ کے قلعوں پر جہاں کوئی اسلامی فوج موجود نہ تھی خودمختارانہ قبضہ کرنے کے سوا کوئی ایسی مؤثر کوشش نہ کر سکے کہ اس اختلال کے زمانے میں مسلمانوں کو ہندوستان سے خارج کر دیتے آرام شاہ اس بدنظمی کا کوئی تدارک نہ کر سکا، امرائے سلطنت نے یہ حالت دیکھ کر شمس الدین التمش حاکم بدایوں کو دہلی بلوایا اور آرام شاہ کو معزول کر کے اُسے تخت سلطنت پر بٹھایا۔ آرام شاہ نے دہلی سے نکل کر اور اپنے ہواخواہوں کو فراہم کر کے التمش کا مقابلہ کیا مگر گرفتار ہو کر قید خانہ میں فوت ہوا۔ آرام شاہ نے ایک سال سے بھی کم مدت تک سلطنت کی۔

شمس الدین التمش

شمس الدین التمش ترکانِ قراخطائی میں سے تھا اس کا باپ اپنے قبیلہ کا ایک نامور اور امیر آدمی تھا چچازاد بھائیوں نے حضرت یوسف کے بھائیوں کی طرح اُس کو باہر لے جا کر ایک سوداگر کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ اس سوداگر نے بخارا میں لا کر فروخت کیا یہاں جس نے خریدا تھا اُس نے اس کی پرورش اور تعلیم اپنے بچوں کی طرح کی پھر حاجی جمال الدین چست قبا نے خریدا۔ حاجی جمال الدین چست قبا سے قطب الدین ایبک نے ایک لاکھ چیتل (ڈھائی ہزار روپیہ) کے عوض خرید کر اپنے بیٹے کی طرح تربیت کی اور میر شکار کا عہدہ عطا فرمایا۔ پھر گوالیار کا حاکم بنایا پھر برن (بلند شہر) کا حاکم مقرر کیا۔ اُس کے بعد بدایوں کا ناظم بنایا۔ جب سلطان شہاب الدین غوری آخری مرتبہ گکھڑوں کا فساد رفع کرنے پنجاب میں آیا اور قطب الدین ایبک دہلی سے سلطان غوری کی خدمت میں حاضر ہوا تو شمس الدین التمش بھی قطب الدین ایبک کے ہمراہ گیا تھا اُس نے گکھڑوں کی لڑائی میں ایسی بہادری دکھائی کہ سلطان شہاب الدین غوری بہت ہی خوش ہوا اور التمش کو خلعتِ فاخرہ عطا کر کے قطب الدین سے سفارش کی کہ التمش کو غلامی سے آزاد کر کے اُس کے مرتبہ کو بڑھانا چاہیے۔ چنانچہ قطب الدین ایبک نے التمش کو سندِ آزادی عطا کی اور اپنی بیٹی کی شادی اُس سے کر دی۔

تخت نشینی

۶۰۷ھ میں شمس الدین التمش تخت نشین ہوا۔ اُس کی تخت نشینی کے بعد بعض اُمرائے مخالفت پر کمر باندھی۔ تین چار سال اس خانہ جنگی کے فرو ہونے میں صرف ہوئے اور جو صوبے سلطنت دہلی سے جدا اور خودمختار ہو گئے تھے بدستور خودمختار رہے۔ دہلی اور نواح دہلی کی لڑائیوں سے فارغ ہو کر سلطان التمش پنجاب کو تاج الدین یلدوز کے قبضے سے نکالنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ تاج الدین یلدوز نے خود ہی دہلی کی جانب

فوج کشی کی۔ التمش نے آگے بڑھ کر مقام تراوری میں اس کا مقابلہ کیا۔ اس لڑائی میں تاج الدین یلدوز شکست کھا کر گرفتار ہوا۔ التمش نے اس کو بدایوں میں قید کیا۔ جو چند روز کے بعد بحالتِ قید فوت ہو کر بدایوں میں مدفون ہوا۔ اس عرصہ میں موقعہ پا کر ناصر الدین قباچہ نے پنجاب پر حملہ کر کے لاہور کو فتح کر لیا۔ التمش نے اس کو بھی شکست دے کر سندھ و ملتان کی طرف بھگا دیا۔

یہاں یہ لڑائیاں ہو رہی تھیں۔ اُدھر سلطان خوارزم نے غور و غزنی کو فتح کر کے خاندانِ غوری کا خاتمہ کر دیا اور اب اس کی فوجیں ہندوستان کی طرف بڑھیں اور ملتان کے قریب ناصر الدین قباچہ سے جو التمش کے مقابلے میں ابھی شکست کھا چکا تھا۔ شکست پا کر واپس لوٹ گئیں۔ سنہ ۶۱۴ھ میں سلطان شمس الدین التمش نے ناصر الدین قباچہ کو شکست دے کر گجرات کی طرف بھگا دیا اور مقام دیبل یعنی ساحل سمندر تک سندھ کا ملک اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ مگر چند روز کے بعد ناصر الدین قباچہ نے پھر سندھ و سیوستان پر قبضہ کر لیا سنہ ۶۱۸ھ میں سلطان جلال الدین خوارزمی چنگیز خاں سے شکست کھا کر ہندوستان کی طرف آیا اور پنجاب کے ایک حصہ پر قابض ہو گیا یہ سنتے ہی سلطان التمش لاہور گیا۔ سلطان جلال الدین پنجاب سے سندھ کی طرف اور وہاں سے کیچ مکران کی جانب روانہ ہوا۔ اسی سال سلطان التمش نے بنگال کی جانب فوج کشی کی اور حسام الدین عوض خلجی سے اقرار اطاعت اور تیس ہاتھی بطور نذرانہ لے کر اور اپنے بیٹے ناصر الدین کو بہار و بنگال کا ناظم مقرر کر کے واپس ہوا۔ سلطان کے چلے آنے کے بعد ناصر الدین اور بنگالے کے خلجی سلطان میں لڑائی ہوئی جس میں خلجی سلطان مارا گیا اور بنگالہ کا ملک بھی براہِ راست سلطنت دہلی میں شامل ہو گیا ۶۲۳ھ میں قلعہ رنتھمبور کو چند مہینے کے محاصرے کے بعد سلطان نے فتح کیا۔ ۶۲۴ھ میں قلعہ مندور یا قلعہ منڈاور کو فتح کیا۔ اس فتح کی خوشی میں امیر روحانی بخاری نے قصیدہ لکھ کر پیش کیا جس کے بعض اشعار یہ ہیں ؎

خبر باہلِ سما بردہ جبرئیل امین — زفتحنامہ سلطانِ عہد شمس الدین
کہ از بلادِ ملاحد شہنشہِ اسلام — کشاد بارِ دگر قلعہ سپہر آئین
شہ مجاہد و غازی کہ دست و تیغش را — روان حیدرِ کرار می کند تحسین

اسی زمانے میں ناصر الدین قباچہ نے اُچ اور ملتان پر قابض ہو کر مخالفت شروع کی۔

۶۲۵ھ میں سلطان التمش نے ناصرالدین قباچہ کی سرکوبی کے لئے سندھ و ملتان کی طرف فوج کشی کی، ناصرالدین قباچہ نے اپنے وزیر کو فوج دے کر قلعہ اُچ میں چھوڑا اور خود خزانہ لے کر قلعہ بھکر میں چلا گیا۔ ایک مہینے کے محاصرے کے بعد بروز سہ شنبہ ۲۸ رماہ جمادی الاوّل ۶۲۵ھ کو قلعہ اُچ فتح ہوا اور ناصرالدین قباچہ اُچ کی فتح کا حال سُن کر دریائے سندھ میں ڈوب کر مر گیا۔ سلطان نے بندرگاہ دیبل یعنی سمندر کے کنارے تک تمام ملک قبضے میں لا کر اپنے عامل مقرر کئے اور دہلی کی طرف واپس ہوا۔ مقام اُچ سے طبقات ناصری کے مصنف منہاج سراج کو جو چند ہی روز پہلے وارد ہند ہو کر اُچ میں مقیم تھا اپنے ہمراہ لے گیا۔ ۶۲۶ھ میں خبر پہنچی کہ شہزادہ ناصرالدین بنگالہ میں فوت ہو گیا۔ سلطان شمس الدین التمش نے اپنے چھوٹے بیٹے کو ناصرالدین کا خطاب دے کر بدایوں کا حاکم مقرر کیا۔ یہی وہ ناصرالدین محمود ہے جس کے نام پر منہاج سراج نے طبقات ناصری اپنی کتاب کا نام رکھا۔ اسی سال یعنی ۶۲۶ھ میں بغداد کے عباسی خلیفہ المستنصر باللہ نے سلطان شمس الدین التمش کے پاس خلعت روانہ کیا اور سلطان شمس الدین التمش نے اس خوشی میں شہر کو آئینہ بند کر کے جشن ترتیب دیا۔ اسی سال لمکا ملک خلجی نے بنگالہ پر قبضہ کر کے علم بغاوت بلند کیا۔ یہ سُن کر سلطان بنگالہ کی طرف روانہ ہوا اور ۶۲۷ھ میں لمکا ملک کو گرفتار اور اُڑیسہ کا ملک بھی بنگال میں شامل کر کے ملک علاؤالدین جانی کو وہاں کا حاکم بنا کر دہلی واپس آیا۔ ۶۲۹ھ میں قلعہ گوالیار کی فتح کے لئے روانہ ہوا۔ ماہ صفر ۶۳۰ھ میں گوالیار فتح ہوا۔ اس سفر میں منہاج سراج سلطان کے ہمراہ موجود اور نمازوں کا امام تھا۔ قلعہ گوالیار کی فتح پر دبیرالملک تاج الدین ریزہ نے یہ رباعی لکھی ؂

ہر قلعہ کہ سلطانِ سلاطین بگرفت — از عونِ خدا و نصرتِ دیں بگرفت
آں قلعہ گوالیار و آں حصن حصین — در سنہ ستہ و ثلاثین بگرفت

۶۳۲ھ میں سلطان مالوہ کے باغیوں کو سزائیں دیں اول بھیلسے کو فتح کیا اُس کے بعد اُجین فتح ہوا۔ یہاں مہاکال دیو کا بُت خانہ تھا اس بُت خانہ میں راجہ بکرماجیت کی بہت بڑی مورت پتھر کی بنی ہوئی براجمان تھی اُس کے اِردگرد چند چھوٹی چھوٹی مورتیں تانبے اور پیتل کی بنی ہوئی نصب تھیں یہ بُت خانہ چونکہ مالوہ کے تمام باغیوں کا مرکز اور بغاوت کی سازش کا دفتر تھا لہٰذا سلطان نے اس مندر کو مسمار کیا اور دھات کی مورتیوں کے ساتھ پتھر کی مورت کو بھی

دہلی لے گیا۔ اس طرح تمام ملک مالوہ میں اسلامی سلطنت مستحکم ہو گئی۔

وفات دہلی آکر سلطان کو پھر ایک سفر پیش آیا۔ طبقات ناصری میں لکھا ہے کہ یہ سفر بیانہ کی جانب تھا مگر تاریخ فرشتہ، طبقات اکبری، منتخب التواریخ میں لکھا ہے کہ ملتان کی طرف روانہ ہوا۔ بہر حال اس سفر میں سلطان بیمار ہو کر دہلی واپس آیا اور ۲۰ ربا شعبان ۶۳۳ھ بروز دوشنبہ فوت ہوا۔ اُس کا مقبرہ پرانی دہلی میں مسجد قوۃ الاسلام کے متصل غیر مسقف آج تک موجود ہے۔ یہ سلطان بڑا خدا ترس، رحم دل، عابد، زاہد، سخی، بہادر اور شب زندہ دار شخص تھا۔ پنج وقتہ نمازیں مسجد میں باجماعت ادا کرتا اور درویش خدا آگاہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں اکثر حاضر رہتا تھا۔

قطب مینار کی تعمیر سلطان قطب الدین ایبک نے دہلی کی فتح کے بعد مسجد قوۃ الاسلام اور قطب مینار کی تعمیر شروع کی تھی۔ قطب مینار کے صرف دو نیچے کے درجے قطب الدین ایبک کے زمانے میں تیار ہوئے تھے سلطان التمش نے باقی اوپر کے درجے تعمیر کرا کر اس مینار کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا اور مسجد قوۃ الاسلام میں بھی تین دروازے اضافہ کئے۔ حوض شمسی بھی جس کو تالاب شمسی کہتے ہیں اُس کی یادگار ہے۔ اس سلطان پر سب سے بڑا الزام یہ لگایا جاتا ہے کہ اُس نے مہاکال کے بت خانے کو توڑا لیکن یہ کوئی نہیں سوچتا کہ کیا دریائے سندھ کے ڈیلٹا سے برہم پتر کے ڈیلٹا تک تمام شمالی ہند جس میں اُڑیسہ کا ملک بھی شامل ہے مندروں سے بالکل خالی تھا۔ شمس الدین التمش مذہب کا پابند اور خود مذہب سے بخوبی واقف ہونے کے علاوہ علماء کی صحبت میں رہتا تھا وہ اسلامی تعلیم کے خلاف غیر مذہب والوں کی عبادت گاہوں کو بلا سبب ہرگز نقصان پہنچانے اور مسمار کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ مہاکال کا مندر توڑنے اور پتھر کی مورت دہلی لانے کا حال جس نے بھی لکھا ہے طبقات ناصری سے لکھا ہے۔ ہندوؤں کی کسی قدیم کتاب سے اس مندر کے اُجین میں ایک مرکزی عبادت گاہ ہونے کی حیثیت سے مسمار ہونے کا ثبوت نہیں ملتا۔

ملاحدہ کا فتنہ ہندوؤں کے ساتھ ملاحدۂ الموت کے خصوصی تعلقات قائم تھے ملاحدہ کو ہندوستان میں اسلامی سلطنت کے قائم ہونے کا سخت ملال تھا۔ وہ چند روز پہلے سلطان شہاب الدین غوری کو پنجاب میں شہید کر چکے تھے، ملتان و سندھ کو وہ اپنا ملک سمجھ کر اُس پر قبضہ کرنے کی کوششوں میں مسلسل معروف

رہے تھے۔ گجرات میں جہاں سومنات کا مندر تھا وہ کافی رسوخ حاصل کر چکے تھے۔ گجرات میں ۵۰۰ھ سے اُنھوں نے ہندوؤں کو اپنے مسلک میں باقاعدہ طور پر شامل کرنا شروع کر دیا تھا اسی زمانے میں ملاحدۂ الموت کے ایک واعظ نورستا گرنامی نے گجرات کے راجہ سدھ راج کے عہد میں وارد گجرات ہو کر اپنا نام ہندوؤں کا ساظاہر کیا اور کنبئی۔ کھاروہ۔ اور کوری قوموں کو باقاعدہ اپنے مسلک میں شامل کر لیا تھا۔ سلطان قطب الدین ایبک کو سلطان بننے کے بعد دہلی میں قیام کرنے کا بہت ہی کم موقع ملا تھا سندھ و راجپوتانہ کے ہندو و ملاحدہ کے دھوکے میں اب اس لیے کم آتے تھے کہ وہ اسلامی طاقت کا اچھی طرح اندازہ کر چکے تھے شمس الدین التمش ہی کے زمانے میں دہلی ہندوستان کی سلطنت اسلامیہ کا دارالسلطنت اور مرکز حکومت بنی تھی لہٰذا ملاحدہ کی تمام تر دہلی کی جانب منعطف ہوئی اُنھوں نے گجرات و سندھ سے آگے بڑھ کر مالوہ کے ہندوؤں کو اپنا معمول بنایا اور اُجین و بھیلسہ کو بجائے گجرات کے اپنا ساتھ یا بنگاہ قرار دے کر پیش رو دشتے دوآبہ گنگ و جمن میں پھیلا دیئے۔ برج کے دوآبے اور سوہیلکھنڈ میں جو راجپوت موجود تھے وہ فوراً اسلام کش سازش میں شریک ہو گئے۔ منڈاور کے مقام کو کسی نے مندو اور کسی نے مندور لکھا اور مالوہ کا مقام سمجھا ہے لیکن حقیقتاً یہ مقام گنگا اور مالن ندی کے درمیان ضلع بجنور میں آج تک منڈاور کے نام سے موجود ہے۔ یہ بدھوں کے زمانے میں ایک مرکزی مقام تھا ہیونگ شانگ چینی سیاح بھی یہاں آیا تھا۔ سلطان شہاب الدین غوری کے زمانے میں فتح قنوج سے پہلے قطب الدین ایبک نے اس کو پہلی مرتبہ سلطنتِ اسلامیہ میں شامل کیا تھا۔ ملاحدہ نے اس مقام کو بھی اپنا مرکز بنا کر تمام راجپوتوں کو مسلمانوں کے خلاف جنگ کرنے پر آمادہ کر لیا تھا اور کوہ ہمالہ تک جابجا مضبوط قلعوں اور دشوار گذار گھاٹیوں اور درّوں میں مامن بنائے گئے تھے۔ ۶۲۴ھ میں سلطان نے جب قلعہ منڈاور کو فتح کیا ہے تو دو مہینے تک منڈاور میں قیام کر کے یہاں سے فوجیں بھیج بھیج کر کوہ ہمالہ تک تمام سرکشوں کو سزائیں دینے کے بعد امن و امان قائم کیا تھا پھر منڈاور میں ایک عامل کو مناسب ہدایات کے ساتھ نامور کر کے دہلی کی جانب واپس ہوا تھا منڈاور کے قلعہ کا تو اب نام و نشان بھی موجود نہیں ہے لیکن سلطان شمس الدین التمش کے قدوم میمنت لزوم کی یادگار کے طور پر منڈاور جامع مسجد آج تک موجود ہے فتح منڈاور کی تہنیت میں امیر روحانی بخاری نے جو قصیدہ لکھا تھا

اُس کا ذکر اوپر آچکا ہے اُس میں بھی صاف مذکور ہے کہ سلطان نے اس قلعہ کو جو ملاحدہ کے قلعوں میں سے تھا بار دگر فتح کیا دوآبہ گنگ وجمن میں تورنامی ملحد نے دہلی کا تختہ اُلٹ دینے کی خفیہ ہی خفیہ پوری تیاری کرلی تھی۔ چنانچہ تاریخ فرشتہ کی روایت کے موافق سلطان شمس الدین التمش کے زمانے میں ایک ہزار ملحدوں کی فوج جو تمام ہتھیاروں سے مسلح تھی ٹھیک اُس وقت جبکہ تمام مسلمان جامع مسجد میں نماز جمعہ ادا کر رہے تھے جامع مسجد میں داخل ہوکر مسلمانوں کو بے محابا قتل کرنے لگی مدعا یہ تھا کہ سلطان بھی معہ تمام سرداروں کے بآسانی قتل ہوجائے۔ ہزار ہا مسلمان اس طرح جامع مسجد میں قتل ہوئے اور پھر بعض سرداروں نے موقعہ پاکر مسلح جمعیت کے ساتھ باہر سے جامع مسجد میں داخل ہوکر ان ملاحدہ کو محصور کرلیا۔ جو مسلمان مسجد کے اندر تھے اور بچ گئے تھے انھوں نے معہ سلطان مسجد کی چھت پر چڑھ کر جان بچائی اور تمام ملاحدہ ایک ایک کرکے مسجد ہی میں قتل کئے گئے۔ یہ ملاحدہ خدا جانے کیا کیا مصائب ہندوستان کی سلطنتِ اسلامیہ پر لاتے مگر خیریت گذری کہ تھوڑے ہی دنوں بعد یعنی ۶۵۵ھ میں مغلوں کے سیلاب نے ملاحدہ کے مرکز الموت کو غارت کرکے ان کے آخری بادشاہ خورشاہ کو گرفتار کرلیا اور ملاحدہ کے فتنے سے عالم اسلامی نے نجات پائی۔

سلطان شمس الدین التمش کے عہدِ حکومت میں دہلی اور دہلی کے متصلہ اضلاع میں ملاحدہ کی اس قوت وشوکت واثر ونفوذ کا اندازہ کرو پھر ملاحدہ وقرامطہ کے ان تمام کارناموں پر جو اوپر کے ابواب میں بیان ہوچکے ہیں غور کرو تو بڑی آسانی سے یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ سلطان شمس الدین التمش کے زمانے میں ملاحدہ کے ذریعے اسی قسم کے فتنے سر اٹھانے والے تھے جو قرامطہ کے ذریعہ رونما ہوکر سلطان محمود غزنوی کے لئے موجبِ تکلیف ہوئے تھے اور یہی وجہ تھی کہ بھیلسہ اور اُجین کو جو ملاحدہ اور اُن کے شریک کار ہندوؤں کے مرکزی مقام تھے سلطان التمش نے نقصان پہنچایا اور اُن کے سازش خانوں کو جو ہمیشہ حفاظت کی غرض سے مندروں ہی میں قائم کئے جاتے تھے مسمار کیا۔ اگر ان مندروں کو اس امن سوز اور انسانیت کُش مقصد کے لئے استعمال نہ کیا جاتا تو سلطان التمش ان کو کبھی ہاتھ نہ لگاتا اگر مندروں کے مسمار کرنے ہی کا اُس کو شوق تھا تو متھرا، مہابن، الہ آباد، بنارس، تھانیسر، کانگڑہ، قنوج، گوالیار، جگنا تھ پوری (اڑیسہ) میں اُس وقت مندروں کی کمی نہ تھی وہ ان تمام مقامات کے مندروں کو بھی مسمار کرتا اور اپنا شوق پورا کرکے خوش ہوتا۔ پھر لطف یہ کہ اُجین میں مہاکال کے مندر کے سوا اور بھی مناد

موجود تھے مگر اُس نے صرف ایک ہی مندر کو توڑا باقی کو ہاتھ نہ لگایا۔ اُس کی غرض صرف یہ تھی کہ آئندہ ہندو اپنے مندروں کو سازش خانہ اور بغاوت خانہ نہ بننے دیں بلکہ عبادت خانہ ہی رہنے دیں اگر کسی مندر کو سازش خانہ بنایا جائے گا تو وہ عبادت خانہ نہ رہے گا اور اُس کو مسمار کر دیا جائے گا۔ یہ صاف اور سیدھی بات اگر کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو اسی کے فہم کا قصور ہے۔

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

سلطان شمس الدین التمش نے ہندوؤں کو بھی اپنی مصاحبت میں داخل کر کے ان کی دلدہی اور عزت افزائی کو ملحوظ خاطر رکھا تھا مگر اس جگہ سلطان التمش کے تذکرہ کو اس سے زیادہ طول نہیں دیا جا سکتا۔ خلاصۂ کلام یہ کہ سلطان التمش نے شمالی ہند میں اسلامی شہنشاہی قائم کر کے قطب الدین ایبک کے زمانے سے بھی زیادہ طاقتور اور ہر قسم کے خرخشوں سے پاک و پُرامن سلطنت چھوڑی۔

رکن الدین فیروز شاہ ابن التمش

سلطان شمس الدین التمش جب چھبیس سال کی حکومت و سلطنت کے بعد فوت ہوا تو اُمرائے سلطنت نے اُس کے بیٹے رکن الدین کو فیروز شاہ کے لقب سے تخت سلطنت پر بٹھایا۔ اُس نے تخت نشین ہوتے ہی انعام و اکرام میں تمام خزانہ لٹا دیا۔ اپنی ماں کو جو ایک ترکی کنیز تھی امورِ سلطنت سپرد کر کے خود عیش و عشرت میں مشغول ہوا۔ رکن الدین کی ماں نے سلطان التمش کے سب سے چھوٹے بیٹے قطب الدین کو اول اندھا پھر قتل کرایا۔ ان مظالم اور بدانتظامیوں کو دیکھ کر اودھ، بدایوں، ہانسی، لاہور، ملتان وغیرہ کے عامل باغی ہو گئے اور سب نے آپس میں خط و کتابت کرنے کے بعد متحد ہو کر سلطان رکن الدین کے معزول کرنے کا تہیہ کیا۔ رکن الدین دہلی سے فوج لے کر لاہور کی جانب روانہ ہوا کہ وہاں کے حاکم ملک علاء الدین شیر خانی کو اول راہِ راست پر لائے ابھی منصور پور تک ہی پہنچا تھا کہ اُس کے ہمراہی سواروں اور امیروں میں سے بہت سے اُس سے جدا ہو کر دہلی واپس آئے اور آتے ہی سلطان التمش کی سب سے بڑی لڑکی رضیہ سلطانہ کے ہاتھ پر بیعت کر کے اُس کو تختِ سلطنت پر بٹھا دیا۔ رضیہ سلطانہ نے تخت نشین ہوتے ہی رکن الدین کی ماں کو جو مختار کل سمجھی جاتی تھی گرفتار کرا کر قید کرا دیا۔۔۔ رکن الدین منصور پور سے دہلی کی طرف واپس ہوا رضیہ سلطانہ نے دہلی کے متصل رکن الدین کا

مقابلہ کرکے اُس کو بتاریخ ۱۸ ربیع الاوّل ۶۳۴ھ گرفتار کرکے محبوس کیا۔ چند روز کے بعد قید خانہ میں رکن الدین فوت ہوا۔ اُس نے سات مہینے سلطنت کی۔

رضیہ سلطانہ رضیہ سلطانہ نے تخت نشین ہوکر ملک کا نہایت خوبی کے ساتھ انتظام کیا۔ بعض امیروں نے اُس کی بادشاہی کے تسلیم کرنے سے انکار کیا اور متفق ہوکر مقابلہ پر مستعد ہوئے۔ رضیہ سلطانہ نے سب کو شکست دی۔ پھر کسی کو قید، کسی کو قتل اور کسی کو معاف کردیا۔ چند ہی روز میں بنگالہ و اڑیسہ سے پشاور و کراچی تک تمام ملک میں اُس کی سلطنت مسلم اور خوب مستحکم ہوگئی۔ رضیہ سلطانہ امور ملک داری سے خوب واقف اور تعلیم یافتہ عورت تھی وہ گھوڑے پر سوار ہوتی اور صفِ قتال میں شمشیر زنی کرتی تھی۔ چھوٹے بڑے تمام امرا اُس کی اطاعت کرتے اور اُس کے احکام کی تعمیل میں چون وچرا کی جرأت نہیں کرسکتے تھے۔

ایک غلطی اگر رضیہ سلطانہ سے ایک لغزش نہ ہوجاتی تو وہ یقیناً عرصۂ دراز تک نہایت کامیابی اور نیک نامی کے ساتھ سلطنت کرتی اُس سے غلطی یہ ہوئی کہ اُس نے جمال الدین یاقوت نامی ایک غلام کو اُس کی قابلیت سے بڑھ کر امیر الامرا کا عہدہ عطا کردیا بڑے بڑے ترک و افغان اُمرا جو اس غلام کو اپنی نگاہ میں کمتر و کہتر سمجھتے تھے اُس کی امیر الامرائی سے برافروختہ ہوکر بغاوت پر آمادہ ہوگئے اور لاہور کے صوبہ دار ملک اعزالدین سے علامات سرکشی نمایاں ہوئے۔ رضیہ سلطانہ لشکر لے کر لاہور پہنچی ملک اعزالدین نے خائف ہوکر عفو تقصیر کی درخواست کی۔ چنانچہ اُس کی خطا معاف کرکے لاہور سے دہلی واپس آئی۔ اسی عرصہ میں امیر الامرا جمال الدین یاقوت کی زیادتی سے تنگ آکر بھٹنڈے کے عامل ملک التونیہ نے علم بغاوت بلند کیا۔ رضیہ سلطانہ اُس کی سرکوبی کے لئے فوج لے کر بھٹنڈے کی جانب روانہ ہوئی اس سفر میں جمال الدین یاقوت بھی ہمراہ تھا۔ اُمرائے لشکر نے موقع پاکر بھٹنڈے پہنچنے سے پہلے ہی یاقوت حبشی کو قتل کیا اور رضیہ سلطانہ کو گرفتار کرکے ملک التونیہ کے پاس بھیج دیا اور خود سب کے سب دہلی کی جانب واپس آئے۔ یہاں آتے ہی معزالدین بہرام شاہ ابن سلطان التمش کو تخت پر بٹھایا۔ وہاں بھٹنڈے میں ملک التونیہ نے سلطانہ رضیہ سے نکاح کیا اور دونوں نے جاٹوں اور گکھڑوں کی ہندو فوج بھرتی کرکے دہلی پر چڑھائی کی۔

وفات اُدھر سے سلطان معزالدین بہرام شاہ نے فوج مقابلہ پر بھیجی۔ مقام کیتھل کے قریب ۶۳۷ھ میں لڑائی ہوئی۔ رضیہ و التونیہ کی فوج تھوڑا سا مقابلہ کرکے فرار ہوئی۔ رضیہ

والتونیہ بمشکل میدان سے اپنی جان بچا کر بھاگے۔ راستے میں کسی گاؤں کے ہندو کاشتکاروں نے ان دونوں کو قتل کر دیا۔ رضیہ سلطانہ کی لاش دہلی میں لا کر دفن کی گئی۔

دوسری روایت یہ ہے کہ خود رضیہ کی ہندو فوج نے رضیہ والتونیہ کو گرفتار کر کے بہرام شاہ کی فوج کے سپرد کر دیا تھا اور جب یہ دونوں گرفتار ہو کر دہلی آئے تو بہرام شاہ نے ان کو قتل کرایا۔ طبقات ناصری کے الفاظ یہ ہیں:-

"سلطان معز الدین لشکر دہلی را بدفع ایشاں بیروں برد و سلطان رضیہ والتونیہ منہزم شدند و چوں بہ کیتھل رسیدند لشکریکہ با ایشاں بود ہمہ تخلف نمودند سلطان رضیہ والتونیہ بدست ہندواں گرفتار شدند و ہردو شہید گشتند و ہزیمت ایشاں بست و چہارم ماہ ربیع الاول ۶۳۸ھ بود و شہادت سلطان رضیہ روز سہ شنبہ بیست و پنجم ماہ ربیع الآخر ۶۳۸ھ بود۔"

معز الدین بہرام شاہ

سلطان معز الدین بروز دوشنبہ ۲۰ رمضان ۶۳۷ھ دہلی میں تخت نشین ہوا۔ اس کی تخت نشینی کے بعد ہی اُمرائے سلطنت میں اس لئے بددلی پیدا ہو گئی کہ اُس نے بعض سرداروں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا تھا چند روز کے بعد سلطنت ہند کی بدنظمی کا حال سن کر مغلوں نے پنجاب پر حملے شروع کر دیئے لاہور کے صوبہ دار ملک قراقش نے ان کا مقابلہ کیا لیکن وہ پنجاب کے ہندوؤں یعنی گکھڑوں وغیرہ غارت گروں کو بھی مغلوں کا معاون اور اپنی جمعیت کو قلیل دیکھ کر لاہور سے دہلی کی جانب روانہ ہوا۔ مغلوں نے ۶۳۹ھ میں لاہور پہنچ کر ملک قراقش کا تعاقب کیا مگر وہ ہاتھ نہ آیا صحیح سلامت دہلی پہنچ گیا۔ لاہور پر قابض ہو کر مغلوں نے مسلمانوں کا قتل عام کیا اور بڑی بربادی پھیلائی۔ سلطان معز الدین بہرام نے ایک زبردست فوج مرتب کر کے مغلوں کے مقابلہ کو پنجاب کی جانب روانہ کی۔ یہ فوج دریائے بیاس کے کنارے قصبہ سلطان پور تک جو اُسی زمانے میں آباد کیا گیا تھا پہنچی۔ یہاں سوارانِ لشکر نے بجائے اس کے کہ پنجاب کو مغلوں سے پاک کرتے سلطان معز الدین بہرام کے معزول کرنے کی سازش کی اور سب نے آپس میں عہد و پیمان محکم کر کے سلطان کے خلاف دہلی کی جانب مراجعت کی۔ سلطان نے اس واقعہ سے مطلع ہو کر شیخ الاسلام حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کو بھیجا کہ ان باغیوں کو سمجھا بجھا کر راہ راست پر لائیں مگر ان حضرت خواجہ صاحب رحمہ کی نصیحت کا کوئی اثر

نہ ہوا اور اُنھوں نے آتے ہی دہلی کا محاصرہ کرلیا۔ انھیں ایام میں قاضی منہاج سراج مصنف طبقات ناصری کو دہلی اور کل سلطنت اسلامیہ کا قاضی القضاۃ بنایا گیا تھا۔ قاضی صاحب ممدوح نے بھی بہت کچھ ان باغیوں کو سمجھایا مگر وہ باز نہ آئے۔ ساڑھے تین مہینے تک دہلی کا محاصرہ رہا اور طرفین سے بہت سے آدمی مارے گئے۔

وفات آخر سلطان معز الدین بہرام کو گرفتار کرکے باغی اُمرا نے دہلی پر قبضہ کرلیا اور روز شنبہ ۸ ذیقعدہ ۶۳۹ھ کو بہرام شاہ قتل کیا گیا۔ اس نے دو سال ایک مہینہ پندرہ روز سلطنت کی۔ اس کے بعد اُمرا نے سلطان رکن الدین فیروز شاہ کے بیٹے علاء الدین مسعود کو قیدخانہ سے نکال کر تخت نشین کیا۔ علاء الدین مسعود کے علاوہ دو شہزادے اور بھی قید تھے یعنی ناصر الدین محمود اور جلال الدین پسران سلطان التمش۔ مگر اُمرا نے سلطان التمش کے ان دونوں بیٹوں پر اُس کے پوتے علاء الدین مسعود کو ترجیح دی۔

سلطان علاء الدین مسعود سلطان علاء الدین مسعود نے تخت نشین ہوتے ہی سب سے پہلے مغلوں کو پنجاب سے نکالا اور اپنے دونوں چچاؤں کو قیدخانہ سے نکال کر جلال الدین بن التمش کو قنوج کا اور ناصر الدین محمود کو بہرائچ کا حاکم مقرر کیا۔ ماہ شوال ۶۴۲ھ میں مغلوں نے اس راستے سے کہ جس سے محمد بختیار خلجی نے ملک تبت پر حملہ کیا اور ملک بنگالہ کے ایک حصے کو تاخت و تاراج کرڈالا۔ یہ سُن کر علاء الدین مسعود نے اپنے ایک سردار تمر خان قیراں کو ایک زبردست فوج دے کر بھیجا کہ صوبہ دار بنگالہ کے ساتھ مل کر مغلوں کو بنگالہ سے نکالے چنانچہ مغلوں کو شکست دے کر جدھر سے آئے تھے اُدھر ہی کو بھگا دیا گیا۔ ماہ رجب ۶۴۳ھ میں منکوتہ نامی مغل نے ایک زبردست لشکر کے ساتھ اُچ و ملتان پر حملہ کیا اور اس نواح کے بہت سے مسلمان مغلوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔ سلطان علاء الدین مسعود نے یہ سُن کر فوجیں تمام صوبوں سے طلب کیں اور ایک نہایت عظیم الشان لشکر لے کر خود مغلوں کے مقابلے کو روانہ ہوا۔ اس لشکر کی کثرت و شوکت کا حال سُن کر مغل اس قدر مرعوب ہوئے کہ ابھی سلطانی لشکر دریائے بیاس کے کنارے پہنچا تھا کہ وہ اُچ اور ملتان کو چھوڑ کر خراسان کی جانب بھاگ گئے اور سلطان مظفر و منصور دہلی کی جانب واپس آیا۔ اس سفر میں بعض نا اہل لوگوں کو سلطان کی خدمت میں تقرب حاصل ہوا اور اُن کی صحبت کا یہ اثر ہوا کہ یہ نوجوان سلطان لہو و لعب اور عیش و عشرت میں اپنا وقت گذارنے

لگا اور سلطنت کے کاموں کی طرف سے توجہ ہٹالی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نظام سلطنت مضبوط ہونے کے بعد پھر کمزور ہوگیا اور اُمرائے سلطنت تختِ سلطنت کے معاملے میں مشورے کرنے لگے۔ شہزادہ ناصر الدین محمود ابن التمش نے بہرائچ کی حکومت پر فائز ہوکر اپنی اعلیٰ قابلیت اور پاک باطنی کا اظہار کیا تھا وہاں کی رعایا اُس سے بہت خوش تھی۔ آخر اُمرائے سلطنت نے اس بات پر اتفاق کیا کہ شہزادہ ناصر الدین محمود کو بہرائچ سے بلاکر تخت سلطنت پر بٹھایا جائے۔ چنانچہ ۲۳ محرم ۶۴۴ھ کو اُمرا نے متفق ہوکر سلطان علاء الدین مسعود کو قید خانہ میں محبوس کردیا۔ اُس نے چار برس ایک ماہ سلطنت کی۔

سلطان ناصر الدین محمود

۲۳ محرم ۶۴۴ھ کو سلطان ناصر الدین محمود تخت نشین ہوا۔ اس زمانے میں مغلوں نے دریائے سندھ کو عبور کرکے ملتان وغیرہ علاقوں پر پھر قبضہ کرلیا تھا۔ سلطان ناصر الدین محمود نے ماہ رجب ۶۴۴ھ میں لشکر لے کر مغلوں کے دفع کرنے کے لیے دہلی سے کوچ کیا۔ ماہ ذیقعدہ ۶۴۴ھ میں دریائے راوی کو عبور کرکے مقام سوہدرہ میں قیام کیا اور غیاث الدین بلبن المخاطب بہ الغ خاں کو فوج دے کر دوآبہ سندھ ساگر کی طرف روانہ کیا الغ خان نے مغلوں کو خارج کرکے دریائے سندھ کے پار بھگا دیا اور گکھڑوں وغیرہ کو مناسب سزائیں دے کر مطیع و منقاد بنا دیا۔ سلطان نے واپس ہوکر عید اضحیٰ کی نماز جالندھر میں پڑھی اور محرم ۶۴۵ھ میں دہلی واپس آیا۔ جمادی الثانی ۶۴۵ھ میں سلطان دہلی سے پانی پت آیا مگر پھر وہیں سے قنوج کے ہندوؤں کی بغاوت کا حال سُن کر واپس ہوا اور قنوج کے قریب ایک مضبوط قلعہ کا جس میں ہندوؤں نے مقابلہ اور مدافعت کا سامان فراہم کیا تھا محاصرہ کیا آخر سخت معرکے کے بعد یہ قلعہ فتح کرکے باغیوں کو سزائیں دیں۔ یہاں سے فارغ ہوکر ماہ ذیقعدہ ۶۴۵ھ میں سلطان کڑہ مانک پور کے علاقہ میں پہنچا۔ اس طرف ایک ہندو راجہ جس کا نام دلکی ملکی تھا باغی ہوگیا تھا اُس کو گرفتار کرکے اس فتنہ کو فرو کیا۔ اسی سال کے آخر ایام میں سلطان دہلی واپس پہنچا۔

ماہ ذالحجہ ۶۴۶ھ میں سلطان نے قلعہ رنتھمبور کو جہاں ہندوؤں نے پھر شورش و فساد برپا کیا تھا فتح کیا۔ ماہ شوال ۶۴۷ھ میں دوآبہ گنگ و جمن اور روہیلکھنڈ میں ہندوؤں نے پھر شورش برپا کی اور سلطان نے دہلی سے روانہ ہوکر اس فساد کو مٹایا اور اسی سال کے ماہ

ذی الحجہ میں دہلی واپس آیا۔ مغلوں نے دریائے سندھ کو عبور کر کے ملتان پر پھر چڑھائی کی اور ملک اختیار الدین گربز نے اُن کو شکست دے کر بھگایا اور بہت سے مغلوں کو جو گرفتار ہوئے تھے دہلی بھیجا۔ یہ واقعہ ماہ شوال سنہ ۶۴۸ھ میں ظہور پذیر ہوا۔ اس کے بعد ملتان کی صوبہ داری غیاث الدین بلبن المخاطب بہ الغ خاں کے چچازاد بھائی شیر خاں کو سپرد ہوئی۔ اس شیر خاں نے مغلوں کے حملوں کو بار بار روکا۔ تاریخ ہند میں مغلوں کے حملات کو بار بار رد کرنے اور مغلوں پر چیرہ دست رہنے کی وجہ سے شیر خاں بہت بڑا آدمی سمجھا جاتا اور اُس کا ذکر نمایاں طور پر بیان ہوتا ہے۔ گوالیار، چندیری اور مالوہ وغیرہ میں پھر ہندوؤں نے علامات سرکشی کا اظہار کیا اور ماہ شعبان سنہ ۶۴۹ھ میں سلطان ناصر الدین محمود نے ہندوؤں کے سردار جاہر دیو کو جس نے دو لاکھ پیادے جمع کر لئے تھے شکست دے کر گرفتار کیا اور ماہ ربیع الاول سنہ ۶۵۰ھ میں دہلی واپس آیا۔ الغ خاں کو سنہ ۶۵۰ھ میں سلطان نے وزارت سے معزول کر کے عماد الدین ریحانی کو قلمدان وزارت سپرد کیا اس تبدیلی کو لوگوں نے پسند نہیں کیا۔ کیونکہ الغ خاں کی وزارت سے سب خوش تھے سنہ ۶۵۱ھ میں شیر خاں نے مغلوں کے تعاقب میں دریائے سندھ کو عبور کیا اور غزنی تک اُن کے تعاقب پہنچا۔

بروز پنج شنبہ ۱۲ ماہ محرم سنہ ۶۵۲ھ کو سلطان ناصر الدین محمود نے دریائے گنگ کو میاپور کے گھاٹ پر عبور کیا اور پہاڑ کے دامن میں سفر کرتا ہوا دریائے رام گنگا کے کنارے تک پہنچا۔ اثنائے سفر میں کئی جگہ ہندوؤں سے چھاپہ مارے۔ مقام تکیہ پانی کے قریب بروز یک شنبہ ۱۵ ماہ صفر سنہ ۶۵۲ھ کو پیش گردوستن کے سردار رضی الملک عز الدین درمشی نے ہندوؤں کے ہاتھ سے شہادت پائی۔ اگلے دن بروز دوشنبہ ۱۶ ماہ صفر کو سلطان ناصر الدین نے کٹھیریا کا ننھد کے ان ہندوؤں پر حملہ کر کے اُن کو ایسی سخت سزا دی کہ پھر عرصہ دراز تک اُن کو کان ہلانے کی جرأت نہ ہو سکی۔ اس کے بعد بداؤں کی جانب کوچ کیا اور ۱۹ ماہ صفر سنہ ۶۵۲ھ کو لشکر شاہی بداؤں پہنچا۔ یہاں دو روز قیام کر کے بادشاہ کول (علی گڑھ) کی جانب روانہ ہوا اور کول میں ۲ ربیع الاول سنہ ۶۵۲ھ کو طبقات ناصری کے مصنف منہاج سراج کو جو اس سفر میں ہمراہ تھا "صدر جہاں" کا خطاب عطا کیا اور ۲۶ ربیع الاول کو دہلی واپس آیا۔ کٹھیڑہ و ناگور کے عاملوں نے دوسرے امرا کو بھی اپنا شریک کر کے آثار بغاوت نمایاں کئے۔ سلطان نے دہلی سے روانہ ہو کر عید الفطر کی نماز مقام سنام میں ادا کی۔ سنام سے ہانسی کی طرف روانہ ہوا۔ ان

باغی سرداروں کا کہرام وکیتھل میں اجتماع ہوا۔ یہ بغاوت درحقیقت سلطان کے خلاف بغاوت نہ تھی بلکہ ایک قسم کا احتجاج تھا جس سے مقصود یہ تھا کہ عماد الدین ریحانی کو بادشاہ دربار سے نکال دے اور الغ خاں کو پھر وزیر بنالے چنانچہ بعد غور وتحقیق اس مطالبے کو درست سمجھ کر بادشاہ نے عماد الدین کو بدایوں کا عامل بنا کر دربار سے رخصت کر دیا اور الغ خاں کو قلمدان وزارت عطا ہوا امراء نے اقرار فرماں برداری کیا۔

۶۵۳ھ میں سلطان نے بعض عمال کی گوشمالی اور حالات کا معائنہ کرنے کی غرض سے اودھ اور کالنجر تک کا سفر کیا۔ ۶۵۴ھ میں قتلغ خان نامی ایک سردار نے بغاوت اختیار کر کے اس علاقے پر قبضہ کیا جو آج کل ضلع دہرہ دون کے نام سے مشہور ہے اور پہاڑی ہندوؤں کو اپنے ساتھ ملا کر مقام سرمور میں سامان جنگ فراہم کیا۔ سلطان نے ۶۵۵ھ میں دہلی سے فوج لے کر سرمور پر حملہ کیا۔ اس لڑائی میں ہندوؤں کی فوج کو شکست ہوئی اور سرمور پر مسلمانوں کا قبضہ ہوا۔ یہ فتح ماہ ربیع الاول ۶۵۵ھ میں حاصل ہوئی اور ۲۶ ربیع الثانی ۶۵۵ھ کو بادشاہ دہلی واپس پہنچا۔ قتلغ خاں کوہستان ہمالہ سے نکل کر قلعہ چتور میں چلا گیا۔ اسی سال کے آخر میں مغلوں نے اُچ و ملتان کی طرف حملہ کیا اور سلطان ناصر الدین محمود اُن کے مقابلے کے لئے خود لشکر لے کر بروز یک شنبہ ۱۰ محرم ۶۵۶ھ دہلی سے روانہ ہوا اور جا بجا لشکر کو مناسب مقامات پر تعینات کر کے بماہ رمضان دہلی میں واپس آیا۔ اسی سال کے ماہ صفر میں ہلاکو خاں نے بغداد کو برباد اور خلیفہ معتصم باللہ عباسی کو شہید کیا اور خلافت بغداد کا خاتمہ ہوا۔ ماہ محرم ۶۵۶ھ میں ہندوؤں نے بیانہ و گوالیار کی طرف پھر سر اٹھایا اور سلطان ناصر الدین محمود نے اس طرف جا کر اس فتنے کو فرو کیا۔ ماہ صفر ۶۵۸ھ میں علاقہ میوات میں میواتیوں نے لوٹ مار اور رہزنی شروع کر کے اس علاقے کے امن وامان کو بدامنی سے تبدیل کر دیا۔ یہ خبر سنتے ہی بادشاہ نے الغ خاں کو اس فتنے کے فرو کرنے پر مامور کیا۔ الغ خاں نے میواتیوں کو خوب اچھی طرح درست کیا۔ اسی سال چنگیز خاں کے پوتے ہلاکو خاں کا سفیر سلطان ناصر الدین محمود کی خدمت میں دہلی آیا۔ اس سفیر کی آمد پر دہلی میں شان و شوکت کے اظہار کا خصوصی اہتمام کیا گیا۔ خان اعظم الغ خاں وزیر سلطنت پچاس ہزار سوار باساز و یراق اور دو لاکھ پیادے زرق برق لباس اور مجلی ہتھیاروں سے آراستہ و مسلح اور دو ہزار جنگی ہاتھی اور تین ہزار عرادہ آتش بازی ہمراہ لے کر دہلی سے استقبال کے لئے نکلا۔ اس تمام فوج کو شہر سے باہر قرینے کے ساتھ استادہ

کیا گیا طبل و دہل اور نفیری و بگل وغیرہ جنگی باجے ہر پلٹن اور رسالے میں بج رہے تھے اس فوج کی دو طرفہ قطاروں کے بیچ میں سفیر مذکور کو استقبال کر کے لایا گیا۔

جب یہ سفیر دربار سلطانی میں داخل ہوا تو وہاں اور بھی زیادہ مرغوب کن نظارہ پیش نظر ہوا تمام دربار جگمگا رہا تھا سونے چاندی اور جواہرات کے آرائشی سامان اور تخت شاہی کی عظمت سے دلوں پر ہیبت طاری ہوتی تھی۔ سلطان تخت پر جلوہ افروز تھا تخت کے ایک پہلو پر سادات و مشائخ و قضاۃ عظام کی صف تھی۔ دوسری جانب اُن پچیس شہزادوں اور بادشاہوں کی قطار تھی جو خراسان و ایران و عراق و آذربائیجان وغیرہ ممالک سے اپنی سلطنتوں کو مغلوں کے ہاتھوں برباد کرا کر ہندوستان میں بطور پناہ گزیں آئے ہوئے تھے اور شاہی مہمان تھے۔ ان کے علاوہ بڑے بڑے اُمرائے نامدار و سپہ سالار و عمال سلطنت ایک صف میں مؤدب کھڑے تھے ایک قطار ہندو راناؤں، راجاؤں اور راجہ زادوں کی تھی جو دست بستہ تخت شاہی کے گرد کھڑے تھے منہاج سراج نے اس موقعہ پر یہ اشعار موزوں کئے تھے ؎

زہے جشنے کزاں اطراف چوں خلد بریں گشتہ ۔۔۔ خہے بزمے کزاد اکناف عدن راتیں گشتہ
زترتیبِ نہاد و رسم و آئین و نشاطِ او ۔۔۔ تو گفتی عرصہ دہلی بہشت ہشتمیں گشتہ
زفرِ ناصرالدین شاہ محمود ابن التمش ۔۔۔ ملک تزئین دعا خواند فلک تحسیں زمیں گشتہ
شہنشاہے کہ در عالم بہ فیضِ فضلِ ربانی ۔۔۔ سزائے چترِ شاہی لائق تخت و نگیں گشتہ
چو خاقانانِ چیں آمد چو سلطانانِ دیں پرور ۔۔۔ بدل داعی کہ فراست بجاں حامی دیں گشتہ
مبارکباد بیرا سلطان اہل بزم شہ عالم ۔۔۔ کزیں ترتیب ہندوستاں بسے خوشتر زمیں گشتہ
معین از جلال شاہاں باد بہر ہند و زور گاہش ۔۔۔ چو منہاج سراج از جان دعا گوئے کمیں گشتہ

ہلاکو خاں کے سفیر پر اس شان و شوکت کے معائنے سے بڑی ہیبت طاری ہوئی ہلاکو خاں نے اس سفیر کے واپس جانے کے بعد ہندوستان پر حملہ کرنے کے خیال کو ترک کر دیا اور اپنے سرحدی امیروں کے پاس احکام بھیج دیئے کہ آئندہ ہندوستان پر ہرگز کوئی فوج حملہ آور نہ ہو۔ اس سفارت کے آنے سے یہ بڑا فائدہ ہوا کہ چند روز کے لیے مغلوں کے حملوں کا سلسلہ رُک گیا۔ سلطان ناصرالدین محمود کی سلطنت کے آخری چھ سال یعنی ۶۵۸ھ سے ۶۶۴ھ تک نہایت امن و امان اور اطمینان کے ساتھ گذرے اور کوئی اہم قابل تذکرہ واقعہ نہیں ہوا۔

سلطان ناصرالدین محمود ایک طرف شجاع و جفاکش اور ہمہ اوقات مستعد رہنے والا

بادشاہ تھا تو دوسری طرف عابد شب زندہ دار اور زاہد خوش اطوار بھی تھا۔ چھ مہینے میں ایک قرآن مجید اپنے ہاتھ سے پورا لکھ لیتا تھا۔ سال بھر میں دو قرآن مجید اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے فروخت کر کے اسی سے سال بھر تک اپنی گزر کرتا تھا۔ اُس کے ایک ہی بیوی تھی وہی اپنے ہاتھ سے روٹی پکاتی تھی۔ ایک مرتبہ اس سلطانہ نے عرض کیا کہ کوئی خادمہ روٹی پکانے کے لئے نوکر رکھ دیجئے۔ سلطان نے کہا کہ میری آمدنی میں اس قدر گنجائش کہاں ہے کہ کوئی خادمہ نوکر رکھ سکوں۔ رہا شاہی خزانہ تو وہ سب رعایا کا مال ہے۔ میں اُس میں سے ایک کوڑی بھی اپنی ذات کے لئے نہیں لے سکتا۔ چنانچہ یہ شہنشاہ بیگم اپنے ہاتھ ہی سے روٹی پکاتی رہی۔ اسی ایک واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ سلطان ناصرالدین محمود کس قدر نیک اور باخدا شخص تھا۔

وفات ۱۱رجمادی الاول ۶۶۴ھ کو بیس سال کی سلطنت کے بعد اس پاک باطن سلطان نے وفات پائی۔

سلطان غیاث الدین بلبن سلطان ناصرالدین محمود کی وفات کے بعد شمس الدین کی اولاد میں کوئی شخص تخت و تاج کے سنبھالنے کے قابل نہ تھا لہٰذا اُمرائے سلطنت نے وزیر السلطنت الغ خاں کو سلطان غیاث الدین بلبن کے لقب سے تخت سلطنت پر بٹھایا۔ سلطان بلبن شمس الدین التمش کا غلام اور اُس کا ہم قوم بھی تھا۔ سلطان التمش کی وفات کے وقت اُس کے چالیس غلام جو اُمرائے چہلگانی کہلاتے تھے بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے۔ سلطان التمش کی وفات کے بعد تقریباً دس سال تک اُس کے کئی بیٹے بیٹی اور پوتا تخت نشین ہوئے جو سب کے سب ناتجربہ کار اور بارِ سلطنت کے اٹھانے کی پورے طور پر اہلیت نہیں رکھتے تھے اس دس سال کے عرصے میں اُمرائے چہلگانی کا اثر و اقتدار اور بھی ترقی کرتا رہا اور ان کی خودسری و خود مختاری دن بدن بڑھتی رہی۔ سلطان ناصرالدین محمود نے اپنی شجاعت و مستعدی سے سلطنت کے کاموں کو سنبھالا اور اُمرائے چہلگانی کو بھی کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بار بار صوبوں میں بغاوتیں برپا ہوئیں اور سلطان ناصرالدین کو یہ بغاوتیں خود جا جا کر فرو کرنی پڑیں۔ ان بغاوتوں میں اُمرائے چہلگانی بڑی آسانی سے ماتحت ہندو راجاؤں کو اپنا شریک کر لیتے تھے جیسا کہ قتلغ خاں نے سرمور کے راجہ دیپال سنگھ کو بغاوت میں اپنا شریک کر لیا تھا۔ یا مالوہ اور روہیلکھنڈ وغیرہ

صوبوں میں ہندو راجاؤں نے بار بار سرکشی کا اظہار کیا۔

سلطان غیاث الدین بلبن نے ۶۶۴ھ میں تخت نشین ہوتے ہی سب سے پہلے اپنی توجہ ان امرائے چہلگانی کا اثر و اقتدار مٹانے میں صرف کی حالانکہ وہ خود بھی امرائے چہلگانی میں شامل تھا۔ مگر وہ سلطان ناصر الدین محمود کے زمانے سے جانتا تھا کہ جب تک یہ سرکش امرائے چہلگانی باقی رہیں گے اُس وقت تک نظام سلطنت معرض خطر ہی میں رہے گا۔ چنانچہ اُس نے ایک ایک کرکے سب کا اثر و اقتدار مٹا دیا۔ بعض فوت ہوئے جو باقی رہے وہ بے دست و پا ہو کر رہے۔ سلطان ناصر الدین محمود کے زمانے میں ہندوؤں کو برابر سلطنت کے اعلیٰ عہدے سلطان کی مصاحبت راجاؤں کے خطاب اور بڑے بڑے اضلاع کی حکومتیں سب کچھ میسر تھا۔ سلطان بلبن نے اپنے عہد سلطنت میں اس بات کی بھی کوشش کی کہ ہندوؤں کو بار بار بغاوتیں برپا کرنے اور امن و امان رد... یا وکرنے کا موقعہ نہ ملے وہ تخت و تاج کا مالک ہونے سے پہلے بھی امارت اور سرداری کے مرتبے پر فائز اور مختلف صوبوں کی حکومت پر قریباً بیس سال مامور رہ چکا تھا۔ بے حد عقلمند ذی ہوش اور باریک بین شخص تھا اُس کو یہ بات بخوبی معلوم تھی کہ برہمنوں نے کس کس طرح سازشوں اور چالاکیوں کے ذریعہ سلطان محمود غزنوی کے زمانے سے لے کر اب تک ملک کے امن و امان کو بار بار معرض خطر میں ڈالا اس لئے اُس کو برہمنوں سے سخت نفرت تھی اور بار بار اُس کی زبان سے برہمنوں کی برائی سنی گئی۔ لیکن ہندوؤں میں جو راجہ اور شریف سردار امارت و حکومت کا مستحق تھا اُس کو سلطان بلبن نے ضرور حکومت و امارت کے مرتبہ پر قائم رکھا۔ ہندوؤں کے اخلاق و معاشرت کی پستی چونکہ انتہا کو پہنچی ہوئی تھی اس لئے اُس کو اس بات کا بہت خیال تھا کہ مسلمانوں میں اس قسم کی بداخلاقیاں اور بے حیائیاں پیدا نہ ہونے پائیں۔ چنانچہ اُس نے تخت نشین ہوتے ہی اس خطرہ کی طرف سب سے زیادہ توجہ مبذول کی۔

وہ حسب و نسب اور قوم و خاندان کی شرافت کا بھی خاص طور پر لحاظ رکھتا تھا اور اجلاف و کم قوم لوگوں کو اعلیٰ عہدے نہیں دیتا تھا۔ اس قسم کی بہت سی حکایتیں ضیا برنی کی تاریخ فیروز شاہی میں سلطان بلبن کے متعلق مندرج ہیں جو بخوف طوالت نظر انداز کی گئی ہیں۔ سلطان شمس الدین التمش کے بعد اُس کی اولاد کے ایام حکومت میں گجرات اور مالوہ کا کچھ حصہ سلطنت دہلی سے نکل گیا تھا اور وہاں کے ہندو راجہ خود مختار ہو گئے تھے سلطان

بلبن سے اُس کے اُمرائے بار بار تقاضا کیا کہ گجرات پر چڑھائی کیجئے لیکن سلطان بلبن نے ہمیشہ انکار کیا اور کہا کہ اگر میں دوسرے ملکوں پر چڑھائی کروں اور دارالسلطنت سے بہت دنوں غیر حاضر رہوں تو اندیشہ ہے کہ مغل ہندوستان پر حملہ کرکے سلطنتِ اسلامیہ کو درہم برہم نہ کر ڈالیں اُس کی تمامتر توجہ مغلوں کے دفع کرنے اور ہندوستان کو اُن کے حملوں سے محفوظ رکھنے میں صرف ہوئی اُس نے بائیس سال سلطنت کی اس بائیس سال میں وہ صرف ایک مرتبہ لکھنوتی یعنی بنگالہ تک گیا اور بہت دنوں دہلی سے غیر حاضر رہا۔ اُس نے بنگالہ کے باغی سردار طغرل کو جو مغیث الدین کے لقب سے بنگالہ کا خود مختار بادشاہ بن چکا تھا قتل کیا اور اپنے بیٹے ناصر الدین محمود المعروف بہ بغراخاں کو بنگالہ کی حکومت پر مامور کرکے واپس ہوا۔ یہی اُس کا سب سے بڑا سفر تھا۔ اس کے علاوہ ایک مرتبہ وہ چناب وجہلم کے دوآبے تک بھی گیا۔ سلطان بلبن نے خود بھی شاندار عمارتیں بنا کر دہلی کی رونق اور شان وشوکت میں اضافہ کیا اور اُمراء کو بھی ترغیب دی کہ وہ عالیشان عمارتیں بنائیں۔ موسم سرما میں ہر روز سلطان پچھلی رات سے بغرض شکار روانہ ہوتا اور پندرہ کوس کے فاصلے پر پہنچ کر شکار کھیلتا اور بعد عشا دہلی میں واپس آتا۔ اس شکار میں کئی ہزار فوج بھی ہمراہ ہوتی تھی اس کا اس شکار اور سفر سے صرف یہ تھا کہ فوج اور گھوڑے جفاکش رہیں اور ضرورت کے وقت میدانِ جنگ میں خوب کام کر سکیں۔ اس کے علاوہ روہیلکھنڈ اور دوآبہ گنگ وجمن کے سرکشوں کو وہ خود کئی مرتبہ سزا دینے آیا۔

عدل وانصاف

عدل وانصاف کے قائم رکھنے کا اُس کو سب سے زیادہ خیال تھا۔ اس معاملے میں وہ اپنے بھائیوں، بیٹوں، اور بھتیجوں کی بھی مطلق پروا نہیں کرتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک نہایت عالی جاہ امیر نے جو بدایوں کا صوبہ دار اور چار ہزار اپنے ذاتی سوار رکھتا تھا ایک پیش خدمت کو کسی بات پر ناراض ہو کر تازیانہ سے پٹوایا تازیانہ کی ضربات سے وہ جاں بر نہ ہوسکا۔ اس خدمت گار کے اس طرح مرنے کا حال سلطان بلبن کو معلوم ہوا تو اُس نے امیر مذکور کو اُسی طرح کوڑوں سے پٹوایا۔ یہاں تک کہ اس کا دم نکل گیا پھر اُس کی لاش کو شہر کے دروازے پر لٹکا دیا تاکہ دوسروں کو عبرت ہو اور وہ اپنے ضعیف ماتحتوں پر ظلم روا رکھنے اور بیدردانہ سزائیں دینے کی جرأت نہ کرسکیں۔

ملک ہیبت خاں حاکم اودھ نے ایک شخص کو ناجائز طور پر قتل کیا مقتول کی بیوی نے

بادشاہ سے فریاد کی بادشاہ نے ہیبت خاں کے پانسو کوڑے لگوائے اور مقتول کی بیوہ سے کہا کہ یہ آج تک ہمارا غلام تھا اب تیرا غلام ہے اس کو جان سے مار ڈال اور چاہے زندہ رہنے دے ہیبت خان نے بہت سے لوگوں کو منت سماجت کرکے اپنا سفارشی بنایا اور بیس ہزار ٹنکے دے کر اس عورت سے دستاویز لکھا کر اس کی غلامی سے آزادی حاصل کی اور پھر گوشہ نشین ہو کر کسی کو اپنی صورت نہ دکھائی چند روز اسی حالت میں رہ کر فوت ہو گیا۔ ان واقعات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ سلطان بلبن کس مزاج اور کس قماش کا آدمی تھا اور اس نے ملک کی اخلاقی حالت کو کس قدر سدھار دیا تھا۔ فسق و فجور اور بے حیائی کے کاموں کا اس نے بالکل قلع قمع کر دیا تھا۔ نہایت عابد زاہد اور متقی شخص تھا۔ نیک لوگوں اور عالموں کی مجلس میں عام لوگوں کی طرح شریک ہوتا اور وعظ و پند کی باتیں سن کر اکثر زار و قطار رونے لگتا تھا۔ باوجود اس کے رعب و ہیبت کی یہ حالت تھی کہ ہندوستان کے راجہ اور دوسرے ملکوں کے سفیر اس کے دربار میں آتے تو رعب سلطانی سے لرزہ براندام ہوتے ضیا برنی لکھتا ہے کہ :۔

"اگر دراں محل رسولان و در دست درایاں ورائے زادگان و مقدمان آمدہ دگر را خاک بوس کنانندے بیشتر آں بودے کہ ایشاں مدہوش و بے خبر شدندے واز پا در افتادندے"۔

سلطان بلبن کا قول تھا کہ :۔

"رعایا در عصر پادشاہے حشمت و ہیبت زندقہ بار آید و تمرد و طغیان سر نماید ہندوان سرتابی بکنند و مسلمانان از کثرت فسق و فجور بدبخت شوند"۔

دُور اندیشی ایک مرتبہ سلطان بلبن سے اس کے امیروں نے کہا کہ ملک دکن بھی ہندوؤں سے فتح کر لینا چاہیے سلطان نے جواب دیا کہ میں خوب جانتا ہوں کہ ہندوؤں کے پاس مجموعی طور پر شاید ایک لاکھ فوج لڑنے والی ہوگی جس کو میرے لشکر کے صرف چھ سات ہزار آدمی بآسانی مغلوب کر سکتے ہیں لیکن بعد فتح اگر میں ان نو مفتوحہ علاقوں کے انتظام کے لئے تجربہ کار اور لائق آدمیوں کو مامور کرتا ہوں تو دار السلطنت اور پرانے مقبوضہ صوبوں میں کام کے آدمیوں کی کمی واقع ہوتی ہے جس سے ملکی انتظام اور امن و امان کی اس خوبی کے جاتے رہنے کا اندیشہ ہے اور اگر ان نو مفتوحہ علاقوں میں لائق اور تجربہ کار اشخاص نہ بھیجے گئے تو نالائق عمال امن و امان قائم نہ رکھ سکیں گے۔ اس لئے میں اپنے حلقۂ حکومت

کو وسیع کرنے کے عوض اُس میں ہر قسم کی خوبیاں پیدا کرنا اور نقائص کو دور کرنے میں مصروف رہنا زیادہ اچھا جانتا ہوں۔ تاریخ فیروز شاہی میں اس موقعہ پر سلطان بلبن کے یہ الفاظ بھی درج ہیں۔ کہ

"پیش از ما پادشاہان پختہ وگرم و سرد روزگار چشیدہ گفتہ اند کہ مملکت خود را مضبوط و مستقیم داری و حق آں نگہداری بہتر ازاں بود کہ در اقلیم دیگراں دست نئی وآں را نتوانی داشت۔"

سلطان بلبن پر یہ الزام لگایا جا سکتا ہے کہ اُس نے روہیلکھنڈ اور موجودہ ضلع فرخ آباد کے علاقے میں بہت سے میواتیوں کو جو اُس زمانے میں ہندو تھے قتل و غارت کیا۔ لیکن ان میواتیوں کی حالت یہ تھی کہ انھوں نے رہزنی اور لوٹ مار کا پیشہ اختیار کر کے نواحِ دہلی تک کے علاقے کو ویران اور راستوں کو بند کر رکھا تھا۔ کئی مرتبہ اُن کی تادیب کی گئی لیکن وہ اپنی حرکات سے باز نہ آئے آخر سلطان بلبن نے کٹھیر، پٹیالی، بھوجپور، کمپل وغیرہ میں جہاں میواتیوں نے اپنی مضبوط پناہ گاہیں بنا رکھی تھیں خود پہنچ کر میواتیوں کو قرار واقعی سزائیں دیں اور ان تمام علاقوں میں قلعے بنا کر اور تھانے قائم کر کے ان تھانوں میں افغانوں کو مامور کیا کہ آیندہ کسی قسم کی بدامنی و رہزنی وقوع پذیر نہ ہو۔ یہ انتظام اس قدر مفید ثابت ہوا کہ عرصۂ دراز تک ان علاقوں میں امن و امان قائم رہا۔ ضیاء برنی لکھتا ہے کہ

"آں قصبات را بہ جمعیت افغانان چناں مستحکم گردانید کہ شر رہزنی رہزناں و بلائے قطاع طریق از راہ ہندوستان (اودھ وبہار) دفع شد والی یومنا دشتہ) کہ از برآوردن آں حصارہا واستقامت آں تھانہا قریب سہ قرن (قرن = سی سال) گذشتہ است راہ ہندوستان مسلوک گشتہ است ورہزنی بکلی مرتفع شد وہم دراں نہضت حصار جلالی عمارت فرمود وآں حصار راہم بافغاناں داد۔"

سلطان بلبن کا چچازاد بھائی شیر خاں جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے ملتان و پنجاب میں مغلوں کے حملوں کو سدِ سکندری بن کر روک رہا تھا۔ جب شیر خاں کا انتقال ہوا تو سلطان نے اپنے بڑے بیٹے محمد سلطان المعروف بہ خان شہید کو شیر خاں کی جگہ مامور کیا اور خان شہید نے بھی بڑی بہادری اور شجاعت کے ساتھ مغلوں کو ہر مرتبہ شکست دے دے کر واپس بھگایا۔ جب بنگالہ کے باغی حاکم کی سرکوبی کے لئے فوج بھیجی گئی اور اس سلطانی فوج کو شکست ہوئی تو سلطان

کے ہندو رئیسوں نے اس منہزم شدہ لشکر کو تباہ کیا آخر خود سلطان کو بنگالے کی طرف جانا پڑا جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے اس موقعہ پر ہندو راجہ مسمّٰی بھوج رائے یا دنوج رائے سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سلطان نے اُس سے صرف اس بات کا اقرار لیا کہ بنگالے کے باغی حاکم کو اُس کے فرار ہو کر جان بچانے میں کسی قسم کی مدد نہ دے گا اور کسی قسم کا مواخذہ اس ہندو راجہ سے نہ ہوا۔ اور اس باغی حاکم کے متعلقین کو جو سب مسلمان تھے لکھنوتی کے بڑے بازار میں بڑی بے دردی سے قتل کرایا گیا۔ سلطان بلبن نے کبھی کسی ہندو کو ہندو ہونے کی وجہ سے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ وہ مذہبِ اسلام کا سختی سے پابند تھا اور مذہب اسلام کسی کو محض اختلاف عقائد کی بنا پر نقصان پہنچانے یا قتل کرانے کی اجازت نہیں دیتا جب تک کہ مخلوقِ خدا کو اُس سے جان و مال کا نقصان نہ پہنچے اور ملک کا امن و امان اُس کی وجہ سے برباد نہ ہونے لگے۔

بغرا خاں کو نصیحتیں

سلطان بلبن نے اپنے چھوٹے بیٹے ناصرالدین بغرا خاں کو بنگالہ کا حاکم بنا کر جب وہاں سے دہلی کی جانب کوچ کیا تو بغرا خاں کو چند نصیحتیں کی تھیں منجملہ اُن نصائح کے ایک یہ بھی تھی کہ

"ہرگاہ کہ خلق ایں دیار پادشاہ را واعوان وانصار پادشاہ را وحشم وخدم پادشاہ را در شراب و شاہد مشغول خواہند دید ہر ہمہ خرد و بزرگ و زن و مرد مسلمان و ہندو در فساد مستغرق خواہند شد و با چندیں کفر و شرک کہ ہندوان ایں دیار راست زندقہ و اباحت در مسلمانان ہم از بسیاری فسق و فجور پیدا خواہد آمد و چنانچہ ہندوان مشرک بت پرست از خدائے فراموش کردہ اند مسلمانان ہم فراموش خواہند کرد و نام خدا بپاکی و صدق بر زبان کسے نخواہد رفت و بواسطہ آں من و تو در عذاب بد گرفتار خواہیم ماند۔"

سلطان بلبن کے یہ الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ وہ کس قدر خدا ترس پادشاہ تھا اور اُس کو عقبیٰ کا کس قدر خیال تھا ایسے پادشاہ سے ممکن نہ تھا کہ ہندوؤں پر کوئی بے جا ظلم کرتا مذکورہ الفاظ سے یہ بھی ثابت ہے کہ اُس زمانے میں ہندوؤں کے اندر مذہب کی پابندی اور خدائے تعالیٰ کی عظمت اور اُس کا خوف بالکل جاتا رہا تھا اور اسی سے سلطان بلبن کو اس بات کا بہت خیال تھا کہ ہندوؤں کی صحبت سے مسلمانوں میں اعمالِ بد

پیدا نہ ہونے پائیں۔ اس کے لئے اس نے یہ تدبیر اختیار نہیں کی کہ وہ ہندوؤں کو قتل کرتا اور ان کا نام و نشان مٹا دینے پر آمادہ ہو جاتا بلکہ اس نے اپنے اور اپنے امراء کے اعلیٰ نمونے دکھا کر مسلمانوں کو اسلام پر قائم رکھنے کی کوشش کی۔ اگر وہ چاہتا تو بڑی آسانی سے شمالی ہند کو ہندوؤں سے پاک اور صاف کر دیتا۔ کیونکہ ہندوؤں کی کوئی طاقت ایسی باقی نہ رہی تھی جو اس کام میں اس کی مزاحم ہو سکتی۔ اس کو ہر ایک بدچلن اور فاسق و فاجر سے نفرت تھی خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان اگر ہندوؤں سے محض ہندو ہونے کے سبب نفرت ہوتی تو اس کے دربار میں ہندو راجاؤں و راجہ زادگان کو ہرگز بار نہ مل سکتا۔ نہ کسی سے تو ایک بھی ایسا واقعہ تلاش نہیں کیا جا سکتا کہ اس نے کبھی کسی ہندو راجہ کو مسلمان بننے اور اپنا مذہب تبدیل کرنے کی ترغیب دی ہو۔ سلطان بلبن جب بنگالہ سے دہلی کی جانب واپس آیا ہے تو راستے میں جا بجا ہندو سرداروں یعنی رایوں اور راناؤں نے اس کی خدمت میں حاضر ہو کر فتح کی مبارکباد دی اور سلطان سے قیمتی خلعتیں حاصل کئے۔ پھر جب سلطان دہلی میں پہنچ گیا تو ملک کے ہر حصے سے سرداروں نے آ کر تہنیت و مبارکباد پیش کی۔ ضیاء برنی کے الفاظ تاریخ فیروز شاہی میں یہ ہیں کہ

> "ہر کہ از مسلمان و ہندو و ترک و تاجیک عزتے و شہرتے و ملکے و نعمے داشت ہر ہمہ بہ تہنیت فتح بدرگاہ آمدند و شرائط نثار بجا آوردند و اسپاں و شتراں و تحفہ و ہدایا خدمت درگاہ گذرانیدند و خلعت ہا نوازشہا یافتند"

وزیر اعظم

سلطان بلبن کے وزیر اعظم خواجہ ذکی تھے جو حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے ہمشیرزادے تھے۔ دہلی میں بڑے بڑے علماء اور ہر علم و فن کے ماہر و باکمال اُستاد موجود تھے۔ حضرت شیخ فرید الدین شکر گنج رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شیخ صدر الدین پسر حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ، شیخ بدر الدین غزنوی رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ شیخ قطب الدین بختیار کاکیؒ وغیرہ مشائخ اس سلطان کے ہم عصر تھے مسلمانوں کے اعلیٰ اخلاق اور مہذب طرز زندگی کو دیکھ کر ممکن نہ تھا کہ ہندو اسلام سے واقف ہونے کی کوشش نہ کرتے چنانچہ اسی زمانے میں ٹوانہ قوم کا مورث اعلیٰ ہندو راجپوت خواجہ فرید الدین شکر گنج رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر برضا و رغبت مسلمان ہوا جس کی اولاد

آج تک پنجاب کے ضلع شاہ پور وغیرہ میں آباد ہے۔ اسی زمانے میں سیال، گھیبہ، گکھڑ، کھوکھر، بھٹی، جاٹ وغیرہ قومیں انھیں مشائخ عظام کی خدمت میں حاضر ہو ہو کر پنجاب میں مسلمان ہونے لگیں۔ جواہر فریدیہ میں لکھا ہے کہ ہندوؤں کی سولہ قومیں حضرت بابا صاحب کے ہاتھ پر مسلمان ہوئیں۔ سلطان بلبن کے عہد میں ہندوؤں کے اندر اسلام کو قدرتی طور پر رسوخ حاصل کرنا چاہیے تھا کیونکہ سلطان ناصر الدین محمود اور سلطان بلبن دو ہی بادشاہ ایسے گذرے تھے کہ نئے ملکوں کی فتوحات کا سلسلہ بند ہو کر پہلی مرتبہ شمالی ہند میں سلطنت اسلامیہ نے ایک سکون کی حالت قائم کر کے تمام تر ہمت رعایا میں امن و سکون پیدا کرنے کے لئے صرف کی۔ سلطان بلبن نے باغیوں کی وحشت و پریشانی کا ازالہ کر کے اس یقین کو پائدار بنا دیا کہ اب تمام شمالی ہند کو اسی نظام سلطنت یعنی اسلامی حکومت کے ماتحت رہنا پڑے گا۔ اس حالت کے پیدا ہوتے ہی ہندو مسلمان دونوں نے ایک دوسرے کے اعمال وعقائد یعنی مذہب کے سمجھنے اور جاننے کی مہلت پائی جس کا لازمی نتیجہ ہندوؤں کا اسلام میں داخل ہونا تھا۔ سلطان بلبن کے عہد کی ایک عجیب بات یہ ہے کہ مسلمان سردار اور بڑے بڑے اُمرا سخاوت اور سیرچشمی کے معاملے میں ایک دوسرے پر فوقیت حاصل کرنا چاہتے اور اسی لئے اپنی حیثیت سے زیادہ خرچ کرتے تھے جس کا نتیجہ یہ تھا کہ سب کے سب ہندو ساہوکاروں سے قرض لیتے اور اپنی جاگیر یا تنخواہ کا روپیہ ملنے پر قرضہ معہ سود ہندو ساہوکاروں کو ادا کرتے تھے۔ ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں سب سے پہلی مرتبہ سلطان بلبن ہی کے عہد میں ہندوؤں سے مسلمان اُمرا کے سودی روپیہ قرض لینے کا ذکر آتا ہے اور شاید اسی زمانے سے ہندی مسلمان سود دینے کو سود لینے کے برابر بُرا نہیں سمجھتے تھے جس چیز کو سلطان بلبن کے اُمرا کی سخاوت بیان کیا جاتا ہے وہ درحقیقت اُن کا اسراف تھا۔ قرآن کریم میں صاف موجود ہے کہ انّ اللہ لایحب المسرفین۔ اس اسراف کے گناہ سے ایک دوسرا گناہ پیدا ہوا اور اس نے ممتد ہو کر آج تک مسلمانوں کو سخت پریشانی میں مبتلا کر رکھا ہے۔ کاش مسلمان اب بھی سمجھ جائیں اور سودی روپیہ قرض لینے کی لعنت سے اپنے آپ کو بچائیں۔ ذی الحجہ ۶۸۳ھ میں سلطان بلبن کا بڑا بیٹا خان شہید مغلوں کی لڑائی میں شہید ہوا۔ اُس کے بعد بمشکل دو سال زندہ رہ کر ذی الحجہ ۶۸۵ھ میں بائیس سال کی سلطنت کے بعد اسی سال کی عمر میں سلطان بلبن کا انتقال ہوا۔

سلطان بلبن کے تخت نشین ہونے سے پہلے پچیس فرماں رواجن کی سلطنتیں مغلوں کے ہاتھ سے برّ اعظم ایشیا میں برباد ہوئی تھیں ہندوستان میں پناہ گزین تھے اور سلطان ناصرالدین محمود کے دربار میں مصاحبوں اور امیروں کی طرح حاضر رہتے تھے سلطان بلبن کے زمانے میں اُن پچیس کے علاوہ پندرہ ایسے ہی شہزادے اور آگئے تھے اور سب کے سب دست بستہ تخت کے گرد کھڑے ہوتے تھے۔ صرف دو شہزادوں کو جو عباسی خاندان سے تعلق رکھتے تھے بیٹھنے کی اجازت تھی۔ اس سلطان کی راجہ شیو پرشاد صاحب نے بھی اپنی تاریخ میں تعریف و توصیف بیان کرکے یہ فقرہ لکھا ہے کہ "وہ اپنا نام اور کام دونوں یادگار چھوڑ گیا۔"

سلطان معزالدین کیقباد

سلطان غیاث الدین بلبن کی وفات کے وقت اُس کا بیٹا ناصرالدین بغراخاں بنگال میں تھا۔ اُمرا نے اُس کے پوتے یعنی ناصرالدین بغراخاں کے بیٹے کیقباد کو جس کی عمر اُس وقت سترہ اٹھارہ سال کی تھی، تخت سلطنت پر بٹھایا۔ کیقباد نے تخت نشین ہوتے ہی تمام کاروبار سلطنت خود مطلب امیروں کے سپرد کر دیا اور خود عیش و عشرت میں مصروف ہو گیا۔ کیقباد کی اس غفلت و عیش پرستی کا حال سُن کر اُس کا باپ ناصرالدین جو بنگالہ کا خود مختار حاکم تھا۔ بیٹے کو نصیحت کرنے کے لیے چلا۔ ادھر سے معزالدین کیقباد بھی باپ کے استقبال کو دہلی سے روانہ ہوا۔ دریائے سرجو کے کنارے اور بقول بعض دریائے گنگا کے کنارے بمقام اودھ دونوں کی ملاقات ہوئی۔ باپ نے بیٹے کو سلطنت کے کاموں کی طرف توجہ دلائی اور اچھی اچھی نصیحتیں کیں۔ اس کے بعد دونوں اپنے اپنے دارالحکومتوں کو واپس ہوئے۔ کیقباد اس کے بعد بھی لہو و لعب میں مصروف رہا اور کاروبار سلطنت کی طرف متوجہ نہ ہوا۔ لوگوں نے جب دیکھا کہ بادشاہ کی نالائقی سے سلطنت اسلامیہ معرض خطر میں ہے اور سلطان کی اصلاح بظاہر غیر ممکن نظر آتی ہے تو انھوں نے اس نالائق سلطان کو تین سال سے زیادہ مہلت نہ دی اور ۶۸۹ھ میں جب کہ وہ شراب خواری کی وجہ سے بیمار بھی ہو گیا تھا قتل کر ڈالا۔ چونکہ سلطان بلبن یا سلطان التمش یا سلطان ایبک کی اولاد میں کوئی لائق شخص موجود نہ تھا لہٰذا خلجی خاندان کے ایک امیر ملک جلال الدین کو جو سامانہ کا نائب ناظم اور ستر برس کی عمر کا تجربہ کار شخص تھا تخت پر بٹھایا گیا۔ اس طرح غلاموں کے خاندان کو (جو قوم سے ترک تھے) خاتمہ ہو کر خلجی

خاندان کی (جو افغانی تھے) سلطنت شروع ہوئی۔

غلام خاندان کی حکومت پر ایک نظر

سلطان شہاب الدین غوری کے زمانے میں تمام شمالی ہند پر اسلامی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ غلام سلاطین میں سے قطب الدین ایبک اور شمس الدین التمش نے شمالی ہند کے بعض بچے ہوئے خطوں کو بھی فتح کر کے سلطنت اسلامیہ کو مضبوط و مکمل بنا دیا۔ مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ غلام سلاطین نے مفتوحہ علاقے پر حکومت قائم رکھ کر امن و امان اور رعایا کے فلاح و بہبود میں زیادہ ہمت صرف کی اور نئے ملکوں کے فتح کرنے کا خیال نہیں کیا۔ دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس خاندان کے دس بادشاہوں نے پچاسی یا چھیاسی سال تک نو مفتوحہ ہندوستان کی جدید اسلامی حکومت کے مستحکم و باآئین بنانے میں اپنی تمام تر توجہ صرف کی

اس خاندان کی ایک یہ خصوصیت بھی قابل التفات ہے کہ ان کے عہد حکومت میں مسلمانوں کے اندر بحیثیت مجموعی صحیح اسلامی جذبات بہت نمایاں تھے اور یہی وجہ تھی کہ جو بادشاہ ان میں سلطنت کی قابلیت اور لیاقت زیادہ رکھتا تھا اس کو حکومت کرنے کی زیادہ مہلت ملی اور کوئی اس کی مزاحمت یا مخالفت پر آمادہ نہ ہوا لیکن جب کوئی بادشاہ تخت نشین ہونے کے بعد نالائق ثابت ہوا تو فوراً مسلمان سرداروں نے اس کو سلطنت سے محروم کر کے دوسرے کو تخت سلطنت پر بٹھا دیا اور اس طرح کسی نالائق سلطان کو تا دیر حکمرانی و فرماں روائی کی مہلت نہ مل سکی۔ یہ ایک ایسی خوبی ہے کہ غلاموں کے عہد سلطنت کی بے اختیار تعریف کرنی پڑتی ہے۔

اس عہد کی خوبیوں میں سے ایک یہ خوبی بھی قابل تذکرہ ہے کہ سلطنت کو کسی خاندان کے ساتھ مخصوص و مختص نہیں سمجھا گیا۔ شہاب الدین غوری کے بعد اس کا غلام قطب الدین ایبک ہندوستان کا مطلق العنان بادشاہ بنا قطب الدین ایبک کے بعد جب اسکی اولاد کو نالائق دیکھا تو شمس الدین التمش کو سب نے بادشاہ تسلیم کر لیا جو قطب الدین ایبک کا غلام تھا سلطان التمش کی اولاد جب نالائق ثابت ہوئی تو اس کے غلام بلبن کو جو ایک لائق شخص تھا بادشاہ بنایا۔ جب بلبن کی اولاد کو نالائق دیکھا تو سلطنت خلجی قوم کے ایک معمر شخص کو سپرد ہوئی۔ ہندوستان پر ایک نامعلوم زمانے سے شمالی و مغربی ملکوں میں رہنے والی قوموں کے مسلسل حملہ آور ہوتی رہی ہیں۔ مسلمانوں نے پنجاب پر قبضہ کر لیا تو اس کے بعد سلاجقہ اور ترکان غز

کے دو زبردست سیلاب وسط ایشیا سے اٹھے جن کا رخ حسب دستور قدیم یقیناً ہندوستان ہی کی طرف ہوتا اور یہ لوگ یقیناً سابقہ حملہ آوروں سے زیادہ طاقتور ہونے کے سبب تمام ہندوستان کو خاک سیاہ بنا دیتے، لیکن سلطان محمود غزنوی کی اولاد نے سدراہ ہو کر اگرچہ اپنے آپ کو تباہ کر لیا مگر ان وحشیوں کو ہندوستان کی طرف قدم نہ بڑھانے دیا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا رخ ایران وعراق و ایشیائے کوچک کی طرف پھر گیا اور ان اسلامی ملکوں کو ان سے نقصان پہنچا۔ لیکن مسلمانوں نے بہت ہی جلد ان کو اپنے رنگ میں رنگین کر کے مہذب و شائستہ اور خادم اسلام و پاسبان انسانیت بنا لیا اور دوسری طرف شمالی ہندوستان کے وسیع میدانوں میں تہذیب و انسانیت کے دریا بہا کر اس ملک میں ایک مضبوط سلطنت قائم کر لی۔

غلام خاندان کا احسان عظیم یہ شمالی ہند کی اسلامی سلطنت جو غلاموں کے خاندان کی سلطنت کے نام سے مشہور ہے ابھی قائم ہی ہوئی تھی کہ تیسرا عظیم الشان سیلاب چین کے پہاڑوں سے اٹھا۔ اس کا رخ بھی لازماً ہندوستان کی طرف ہوتا لیکن شمالی ہند کی سلطنت نے سد سکندری بن کر اس کو روکا۔ بار بار اس کی موجیں آ آ کر ہندوستان کو برباد کرنے پر آمادہ تھیں مگر ان کو ملتان و لاہور سے ٹکرا ٹکرا کر واپس ہونا پڑا۔ یہ عظیم الشان اور برباد کن انسانیت سیلاب چنگیزی مغلوں کا سیلاب تھا جن کا کام نسل انسانی کے برباد کرنے اور خون کے دریا بہانے کے سوا اور کچھ نہ تھا اگر غلاموں کی اسلامی سلطنت مغلوں کو ہندوستان میں داخل ہونے سے نہ روکتی تو یقیناً ہندوستان کی موجودہ بتیس کروڑ آبادی کے اکثر آبا و اجداد اب سے سات سو سال پہلے ہی دنیا سے تخم سوختہ ہو چکے ہوتے۔ غلام سلاطین کے اس احسان عظیم میں ہر ایک ہندی انسان کا ذرہ ذرہ دبا ہوا ہے کہ انھوں نے مغلوں کو پنجاب و ملتان کی جانب بھی اور بنگال و آسام کی جانب بھی ہندوستان کے اندر قدم رکھنے سے بار بار روکا اور اس ملک میں آزادی سے قتل و غارت کے ہنگامے برپا کرنے کا موقع نہیں دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان وحشی مغلوں نے ایران وعراق و شام و آذربائیجان وغیرہ اسلامی ممالک کو برباد کر کے خلافت عباسیہ کا چراغ بھی بغداد میں گل کر دیا اور لاکھوں نہیں کروڑوں مسلمانوں کو خاک و خون میں ملا کر روس اور وسط یورپ تک کی دنیا کو تہ و بالا کر ڈالا۔ دنیا میں آج تک چنگیزی مغلوں کی مانند انسانوں کے قتل

کرنے اور آبادیوں کو خاک سیاہ بنانے کی شوقین اور طاقتور قوم ظاہر نہیں ہوئی۔ اگر سلطان شمس الدین التمش چنگیز خاں کو ہندوستان میں داخل ہونے کا موقع دے دیتا اور مغل اپنی ہوس خوں ریزی ہندوستان میں پوری کر سکتے تو اُن کو ہرگز ممالک اسلامیہ کی طرف متوجہ ہونے کی ضرورت باقی نہ رہتی۔ اور آج دنیا میں رام و کرشن کے نام کی سمرن جپنے والا ایک متنفس بھی موجود نہ ملتا۔ مغولانِ چنگیزی کی نسلوں سے ہندوستان کی بستیاں پُر ہوتیں اور چنگیز خاں کی مورتیں ایک سب سے بڑے اوتار کی مورتوں کی مانند ہندوستان کے مندروں میں براجمان نظر آتیں۔ مغولان چنگیزی نے تمام متمدن دنیا کو غارت و برباد کر دیا اور اُن کی چیرہ دستی نے یورپ و ایشیا کو پتے کی طرح لرزا دیا۔ مغولان چنگیزی کا سیلاب مسلمانوں کے لئے ایک تازیانۂ غفلت تھا کہ وہ خوابِ غفلت سے بیدار ہوں اور تعلیماتِ اسلامی سے دور و مہجور ہونے کی سزائیں پا کر پھر اعمال اسلامی کی پابندی میں اپنی نجات و فلاح تلاش کریں کیونکہ انھیں مغولان چنگیزی کو جن سے ساری دنیا لرزاں و ترساں تھی مسلمانوں کے غلاموں سے جو احکام اسلام کے پابند تھے جب مصر و ہندوستان میں واسطہ پڑا تو انھوں نے دونوں جگہ بار بار نہایت ذلت کے ساتھ شکستیں کھائیں۔ تاریخ کا یہ ایک نہایت عبرت آموز سبق ہے اگر کوئی اہلِ دل چاہے تو اس پر بار بار غور کرے اور لطف اٹھائے۔

مغولان چنگیزی کے ظلم و ستم اور قتل و غارت کے شوقین ہونے کا راجہ شیو پرشاد صاحب ستارۂ ہند نے بھی صاف لفظوں میں اقرار کیا ہے وہ ایک جگہ اپنی تاریخ میں جلال الدین خوارزمی کے دریائے اٹک کے پار آنے اور اُس کے تعاقب میں مغلوں کی ایک فوج کے اس طرف پہنچنے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

"وہ (جلال الدین خوارزمی) سندھ سے ایران کی طرف روانہ ہوا تب اُن مغلوں کی فوج بھی اُلٹی پھر گئی۔ لیکن نمونہ اپنے ظلم کا اتنے ہی عرصے میں دکھا گئی کہ دس ہزار ہندو غلام بنانے کے واسطے قید کر کے لے گئے اور جب اُن کے لشکر میں رسد کی قلت ہوئی تو بے تکلف ان سب غلاموں کے سر کاٹ ڈالے۔ چنگیز خاں اور اُس کے ساتھ کے مغل لوگ مسلمان نہ تھے بلکہ ایک قسم کے بدھ کا دین رکھتے اور مورتوں کو پوجتے تھے۔"

سر جون میکنزی والس (ایڈیٹر) معنف نے اپنی کتاب تاریخ روس میں لکھتا ہے کہ

"ملک روس پر فرقۂ پلافسٹی صاحب اقتدار تھا اس فرقے نے ۱۲۲۶ء میں مستسلاف حاکم گلیشیا کے پاس سفیر بھیجا کہ ہمارے ملک پر ایک ستم پیشہ اور قوی دشمن یعنی تاتاریے تاخت کی ہے جنوب سے بھی اور شمال سے بھی یہ لوگ دیکھنے میں عجیب نظر آتے ہیں۔ گندم رنگ، کوچک چشم، موٹے موٹے ہونٹ، چوڑے چوڑے شانے کالے کالے بال ۔۔۔ ان سفیروں نے یہ بھی کہا کہ آج ہمارے ملک پر حملہ ہے۔ کل تمھارے ملک پر ہوگا۔ مستسلاف جانتا تھا کہ پلافسٹی ہمارے ملک پر حملہ کیا کرتے ہیں لیکن اس جدید دشمن سے چونکہ ہم کو اور اُن کو مساوی اندیشہ ہے، لہٰذا مدد پر آمادہ ہوگیا اور گرد و نواح کے امیروں کو بھی ہمراہ لیا۔ مقابلہ ہونے پر سب نے تاتاریوں سے شکست کھائی۔ تاتاریوں نے پولینڈ، ہنگری، سرویا تک کے ممالک کو برباد و غارت کرکے دریائے والگا کے جنوبی ملکوں میں آکر روس کے اُمرا کو پیغام بھیجا کہ ہمارے خان کی خدمت میں آکر حاضری دو۔ روسیوں کو اول معلوم نہ تھا کہ یہ قوی دشمن کون ہے کہاں سے یہ لوگ آئے ہیں اور کیا مذہب رکھتے ہیں نہ صرف کشور روس میں اُنھوں نے استیلا پایا بلکہ اُن کی وجہ سے مغربی یورپ اور انگلستان میں خوف سے زلزلہ پیدا ہوگیا۔ یہ گروہ جو تمام براعظم ایشیا میں پھیلا ہوا تھا اور جو وسط یورپ تک پہنچ گیا تھا دراصل چین کے شمالی پہاڑوں میں دریائے آمور کے منبع کے قریب رہتا تھا۔ بارھویں صدی عیسوی (چھٹی صدی ہجری) کے اختتام پر اُن میں ایک آدمی پیدا ہوا جس کا قد مثل دیو کے تھا اور بہادری میں مشہور تھا، یہ دیو ہیکل آدمی چنگیز خاں تھا۔ گرد و نواح کی قوموں کو شکست دے کر اپنے لشکر میں داخل کرکے شمالی چین کے بڑے ملک پر قابض ہوگیا اور اپنا ایک سردار روس کی فتح کے لیے نامزد کرکے خود جانب مغرب روانہ ہوا، چنگیز خاں نہ صرف ظالم وسفاک تھا بلکہ ایک عظیم الشان ناظم و منتظم بھی تھا، چنگیز خاں کے پوتوں میں سے ایک نے سرحد روس پر ایک سلطنت کی بنیاد ڈالی کہ عام طور پر اُس کا نام جماعت طلائی مشہور تھا۔ والگا کی جانب جنوب ایک دارالسلطنت آباد کیا جس کا نام سرائی تھا اب وہ آباد نہیں بلکہ ویران ہے"

جس زمانے میں مغلوں کی خوں آشامی کے سبب تمام دنیا میں قتل و غارت کے ہنگامے برپا اور خون کے فواروں کے ساتھ آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے اُس زمانے میں ہندوستان کے اندر غلام سلاطین کی ہندو رعایا امن و امان کے ساتھ انند کے ستار بجا رہی تھی اور سلطان غیاث الدین بلبن کا چچا زاد بھائی شیر خاں اور سلطان کا بیٹا خان شہید ہندوستان کی مغربی سرحد پر مغلوں کے حملوں کو روکنے اور بار بار اُن کو شکست دے دے کر بھگا دینے میں مصروف تھے۔ اس طوفانی زمانے میں غلاموں نے جس طرح ہندوستان میں امن و امان قائم رکھا اُس زمانے کی دنیا میں اُس کی کوئی نظیر تلاش نہیں کی جا سکتی۔ یہی وجہ تھی کہ چالیس کے قریب تباہ شدہ فرماں رواؤں نے برّاعظم ایشیا کے مختلف ملکوں سے فرار ہو کر ہندوستان میں پناہ لی تھی اس جگہ یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ جس طرح مسلمانوں نے سلاجقہ اور ترکانِ غز کو بالآخر مسلمان بنا کر مہذب و شائستہ بنا لیا تھا، اسی طرح وہ مغولان چنگیزی کو بھی مسلمان بنا کر مہذب اور شفیق علی خلق اللہ بنا لینے میں کامیاب ہوئے اور وہی مغول جو انسانوں کا خون بہانے میں لذت محسوس کرتے تھے مسلمان بن کر نہ صرف مسلمانوں بلکہ انسانوں کے خادم اور شفیق بن گئے۔

نظمِ سلطنت غلام خاندان کے عہد حکومت میں نظامِ سلطنت بہت ہی سادہ اور راحت رساں تھا، صرف بڑے بڑے راجاؤں سے جو موجودہ زمانے کے صوبوں اور کمشنریوں پر حکمران تھے حکومتیں چھین گئی تھیں مگر ان بڑے راجاؤں کے ماتحت جو چھوٹے چھوٹے رانا اور رائے ضلعوں اور پرگنوں پر حکمران تھے اُن کو بدستور ادائے خراج کے اقرار پر قائم رکھا گیا تھا۔ بڑے بڑے شہروں میں مسلمان صوبہ دار قاضی اور سپہ سالار مامور تھے۔ لیکن چھوٹے چھوٹے قصبات یا دیہات میں قاضیوں اور مفتیوں کی مطلق ضرورت نہ تھی کیونکہ دیہات و قصبات میں تمام تر آبادی ہندوؤں ہی کی تھی۔ اور وہ حسب دستور اپنے ہندو راجاؤں۔ راناؤں اور رایوں کے زیر حکومت زندگی بسر کرتے تھے۔ جب کبھی کوئی سلطان یا خان یا امیر یا سپہ سالار ان چھوٹے قصبوں یا گاؤں کے قریب ہو کر گذرتا اور اس کے لشکر کی آمد کا حال معلوم ہوتا تو ان مقامات کے ہندو سردار اُس کی ملاقات کو آتے اور تحف و ہدایا پیش کر کے خلعت و انعام پاتے تھے۔ دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ تمام شمالی ہند میں چھوٹی چھوٹی با اختیار ہندو ریاستیں اسلامی شہنشاہی کے ماتحت موجود تھیں،

اسلامی شہنشاہی کا یہ اثر تھا کہ ہندو ریاستوں کی حالت اُس حالت کے مقابلے میں جو مسلمانوں کی آمد سے پہلے تھی بدرجہا بہتر تھی اور ہندو رعایا بڑی تیز رفتاری کے ساتھ جہالت و پست خیالی سے نکل کر تہذیب و متانت سے ہمکنار ہوتی جاتی تھی۔ انھیں چھوٹے چھوٹے ہندو رئیسوں میں بعض اوقات بغاوت و سرکشی کا مادہ پیدا ہو کر سلطنت کے لئے مشکلات پیدا ہوجاتی تھیں۔ پنجاب کے ہندو راجا بعض اوقات مغلوں سے ساز باز کرکے اُن کے حملوں کو کامیاب بنانے کا موجب ہوجاتے تھے چنانچہ ۶۴۳ھ میں جو حملہ مغلوں نے پنجاب پر کیا وہ ضلع جہلم کے ایک ہندو رانا کی سازش سے کیا تھا اور اگلے سال اُس کو اس جرم بغاوت کی سزا بھگتنی پڑی تھی ۶۴۹ھ میں کالنجر کے راجہ جاہر اچار ج یا جاہر دیو نے علامات سرکشی ظاہر کئے اور اُس کو سزا دی گئی۔ اسی طرح ۶۵۱ھ میں رنتھمبور کے راجہ باہر دیو نے ارد گرد کے دوسرے راناؤں کو شریک کرکے سرکشی پر کمر باندھی اور اسلامی لشکر نے اُس کی گوشمالی کرکے پھر اُس سے اقرار اطاعت لیا۔ جب قتلغ خاں صوبہ دار باغی ہوا تو ملک اودھ کے بہت سے ہندو سردار اس کے لشکر میں شامل ہوگئے جب وہاں اُس کی دال نہ گلی اور شاہی فوج نے اُس کو ہزیمتیں دیں تو وہ بھاگ کر کوہستان سرمور میں چلا آیا یہاں کے راجہ نے اُس کی خوب خاطر مدارات کی۔ ۶۵۸ھ میں مکا نام ہندو راجہ نے نہٹور سرکشی پر کمر باندھ کر کوہ ہمالہ تک کے تمام ہندو سرداروں کو شریک کار بنا لیا اور اسلامی لشکر کو اس طرف متوجہ ہوکر اس کی سرکوبی کرنی پڑی۔ سلطان بلبن کے عہد حکومت میں میوات کے علاقے میں ہندوؤں نے بدامنی پیدا کی اور اس بدامنی کو شاہی لشکر نے رفع کیا۔ اسی طرح کپل دبھوجپور کے ہندوؤں کو راہ راست پر لایا گیا روہیلکھنڈ میں اکثر ہندو راجپوتوں نے بے راہ روی اختیار کی۔ اور ان کو سیدھا کیا گیا۔ سلطان بلبن کی فوج جب بنگالہ کے مسلمان باغی صوبہ دار سے شکست کھا کر واپس ہوئی تو انھیں ہندو رئیسوں نے راستے میں اُس کو پریشان کیا۔ سلطان بلبن جب بنگالہ سے کامیاب واپس ہوا تو لکھنوتی سے دہلی تک برابر ہر منزل پر ہندو رائے اور رانا آ آکر بادشاہ کو سلام کرتے مبارکباد دیتے اور خلعت و انعام سے سرخ رو ہوکر اپنے گھروں کو واپس جاتے تھے جب سلطان بلبن نے بنگالہ سے دہلی واپس آکر دربار کیا تو شہر دہلی کے ہندوؤں نے دربار میں حاضر ہوکر سلطان کو مبارک باد دی اور خلعت و انعام پایا۔ سلطان بلبن کے اکثر امیروں کا روپیہ سود کے ذریعہ انھیں

ہندو ساہوکاروں کے گھروں میں چلا جاتا تھا۔ ملتان کے ہندوؤں نے دہلی میں آ کر ساہوکارے کی دوکانیں کھول لی تھیں۔

جب سلطان معز الدین کیقباد دہلی سے ملک اودھ کی طرف باپ کی ملاقات کو روانہ ہولئے تو انھیں ہندوؤں راجاؤں اور راناؤں نے ہر ایک منزل پر حاضر ہو ہو کر بادشاہ کی خدمت میں اُس کے ذوق کے موافق گویئے، سازندے اور پاتریں پیش کیں اور انعام واکرام سے مالا مال ہوئے۔ میرٹھ اور کول (علی گڑھ) کے کلالوں نے شراب کا نذرانہ پیش کر کے اس شرابی سلطان سے انعامات حاصل کئے۔

ان تمام واقعات کی طرف اشارہ کرنے سے میرا مدعا یہ ہے کہ جس طرح آریوں نے فرمانروا ہو کر غیر آریوں کا قتل عام کیا تھا اور بقیۃ السیف کو انسانیت کے مرتبے سے گرا کر اور چوپایوں کا ہم مرتبہ بنا کر اپنی خدمت گذاری کے لئے محفوظ رکھا تھا۔ غلام سلاطین اور ہندوستان کے اولین فرماں روایان اسلام نے ہندوؤں کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کیا بلکہ اُن کا سلوک ہندوؤں کے ساتھ اس قدر سیر چشمی اور کشادہ دلی کا تھا کہ حقوق انسانیت کے ہر ایک شعبے میں وہ اس حالت سے بہتر و فائق حالت میں تھے جو ان مسلمانوں کی آمد سے پیشتر حاصل تھی۔ قسم کھانے کو کوئی ایک بھی واقعہ ایسا نہیں بتایا جا سکتا کہ اسلامی لشکر نے کسی ہندو آبادی کو محض اس لئے تاراج کیا ہو کہ وہ ہندو کیوں ہے۔ اگر مسلمان ایسی زیادتی سے کام لیتے تو یہ ہرگز ممکن نہ تھا کہ آج ہندوستان کی آبادی میں صرف تہائی یا چوتھائی مسلمان اور باقی ہندو ہوتے۔

سلاطین خلجی

غلام سلاطین اگرچہ سب ایک ہی خاندان سے تعلق نہ رکھتے تھے لیکن سب کے سب تاتاری النسل اور غلام یا غلاموں کے بیٹے تھے اس لئے ان سب کو ایک ہی خاندان سمجھا گیا ہے ان کے بعد خلجیوں کی حکومت شروع ہوئی۔
خلجی قبیلہ غور و ہرات کے علاقے میں قدیم سے آباد تھا۔ لہٰذا ان لوگوں کو افغانی ہونے کے سبب پٹھانوں میں شمار کیا گیا ہے۔ بعض مؤرخوں نے تو ان کو پٹھانوں کی قوم غلزئی قرار دیا ہے اُن کے نزدیک خلجی اور غلزئی ایک ہی چیز ہے سلطان شہاب الدین غوری کے آخر عہد حکومت میں اسی قبیلے کے ایک شخص بختیار خلجی نے بنگالہ کو فتح کیا تھا جس کا ذکر اوپر آچکا ہے اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ خلجی قبیلے کے لوگ سلطان شہاب الدین

اور سلطان قطب الدین ایبک کے زمانے سے ہندوستان میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے اور بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے۔ ان کی بہادری و صف شکنی کے تاتاری سردار بھی قائل تھے۔ اس خاندان میں صرف تینتیس سال سلطنت رہی ۷۲۰ھ میں اس خاندان کا خاتمہ ہوگیا۔ یہ خاندان ہندوستان کی خودمختار اسلامی سلطنت کا دوسرا فرماں رواخاندان تھا اسی خاندان کے عہدِ حکومت میں ملک دکن سلطنت اسلامیہ میں شامل ہوا اور سلطنت اسلامیہ کی حدود کوہ ہمالہ سے راس کماری تک اور سندھ و گجرات سے بنگال و اڑیسہ تک وسیع ہوگئیں۔ ملک دکن کی فتح اور اس خاندان کے تذکرے پر یہ چوتھا باب ختم ہوجائے گا جس کے ساتھ ہی مسلمانوں کی جدید فتوحات اور ابتدائی حملہ آوریوں کے اسباب تلاش کرنے کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ آئندہ صرف اس موضوع پر تیز روشنی ڈالی جائے گی کہ مسلمان فرماں رواؤں کا اپنی ہندو رعایا کے ساتھ کس قسم کا سلوک تھا اور ہندو رعایا نے اپنے مسلمان فرماں رواؤں کے ساتھ کس قسم کا سلوک کیا۔ اس جگہ یہ بھی بتادینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ضیا برنی کی تاریخ فیروز شاہی ۷۵۸ھ میں تصنیف ہوئی۔ ضیا برنی نے ۶۵۸ھ سے ۷۵۸ھ تک پورے سو برس کے واقعات اپنی تاریخ میں لکھے ہیں۔ اُس کا باپ اور چچا اور دوسرے رشتہ دار سلطنت کے اعلیٰ عہدوں پر مسلسل مامور رہے ہیں۔ اُس نے خاندان خلجی کے تینتیس سالہ واقعات کو دہلی میں رہ کر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے لہٰذا چوتھے باب کے اس نصف آخر میں تاریخ فیروز شاہی کی روایت کو میں دوسری تاریخوں پر ترجیح دوں گا۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دوسری تاریخوں سے بے نیاز رہوں گا۔

سلطان جلال الدین فیروز شاہ خلجی

۶۸۸ھ اور بروایت دیگر ۶۸۹ھ میں سلطان جلال الدین خلجی نے ستر سال کی عمر میں تختِ سلطنت پر قدم رکھا۔ اس سلطان نے سلطنت سے پہلے برسوں مغلوں کے مقابلے میں شمشیر زنی کا حق ادا کرکے شہرت و ناموری حاصل کی تھی بڑا بہادر بڑا پاک باطن اور صاف طینت شخص تھا۔ رقیق القلب اور خدا ترس بھی انتہا کا تھا۔ مغلوں سے جب میدانِ جنگ میں لڑتا تھا تو کشتوں کے پشتے لگا دیتا تھا۔ لیکن ویسے کسی شخص کے پھوڑے کو جراح شگاف دیتا تھا تو اس نظارے کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ رحم و عفو و درگذر کا مادہ اُس کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا اپنے دشمنوں پر ہمیشہ احسان کرکے اُن کو اپنا

دوست بنالیتا اور خطاکاروں کو ہمیشہ معاف ہی کر دیتا تھا۔ قیامت کے دن کو یاد رکھتا اور ہر ایک خلاف شرع کام سے بچتا تھا۔ مسجد میں عام نمازیوں کی طرح جاکر نماز باجماعت ادا کرتا اور اکثر خوف خدا سے چشم پُرآب رہتا تھا۔ اُس نے تخت نشین ہوتے ہی لوگوں پر اس قدر احسانات کئے کہ سب اُس کے ہواخواہ بن گئے۔ اُس نے تخت نشین ہوتے ہی سلطان بلبن کے بھتیجے ملک چھجو المخاطب بہ کشلی خاں کو کڑہ کی صوبہ داری پر مامور کر کے بھیجا۔ سلطان بلبن کے بیٹے ناصرالدین بغرا خاں کو لکھنوتی یعنی بنگال کی حکومت پر برقرار رہنے دیا۔ تخت نشین ہونے کے بعد ایک بیٹی کی شادی اپنے بھتیجے علاء الدین خلجی سے اور دوسری بیٹی کی شادی دوسرے بھتیجے الماس بیگ سے کی، یہ دونوں بھائی سلطان جلال الدین خلجی کے بھائی شہاب الدین مسعود خلجی کے بیٹے تھے۔ شہاب الدین خلجی کے فوت ہونے کے بعد سلطان جلال الدین ہی نے ان کو اپنے بیٹوں کی طرح پرورش کیا تھا۔ سلطان کا ہمشیرزادہ احمد حبیب خلجی بڑا عقلمند اور دور اندیش شخص تھا اُس کو سلطان نے وزارت وندیمی کا رتبہ عطا کیا تھا۔ عہد بلبنی کے معززین کو اُن کے مرتبوں پر قائم رکھا تھا سلطان کے تین بیٹے تھے۔ ان میں منجھلا بیٹا ارکلی خاں بڑا شہ زور بہادر اور اعلیٰ درجے کا سپہ سالار تھا۔ سلطان بلبن کا مولا زادہ امیر علی المخاطب بہ حاتم خاں اودھ کا صوبہ دار تھا۔ کڑہ اور اودھ کے علاقے کے ہندو رؤسا پہلے ہی سے زیادہ چالاک اور وہاں کے مسلمان صوبہ داروں کے دربار میں زیادہ دخیل تھے۔ سلطان بلبن اور سلطان معزالدین کیقباد جب اس نواح میں آئے تو ان ہندو رئیسوں راجاؤں اور مقدموں نے حاضر ہو ہوکر نذرانے اور تحفے پیش کئے اور خلعت پائے اس لئے اور بھی ان کی عزت ورسوخ نے صوبہ داروں کے دربار میں ترقی کر لی تھی۔

اب جبکہ سلطنت خاندان بلبنی سے نکل کر ایک دوسرے خاندان میں پہنچی اور ان صوبوں میں سلطان بلبن کے متعلقین صوبہ دار متقرر ہوئے تو ان ہندوؤں نے ان کے درباروں میں قدیمانہ خدمت گذاری واظہار وفاداری کے ساتھ زیادہ رسوخ حاصل کیا اور ملک چھجو المخاطب بہ کشلی خاں کی مصاحبت میں داخل ہوکر اُس کو بار بار توجہ دلائی کہ سلطنت اور تخت حکومت کے حقیقی مالک تو آپ ہیں خلجیوں کا کیا حق ہے کہ وہ ہندوستان کی شہنشاہی حاصل کریں اور آپ کو اپنا نوکر سمجھیں۔ یہ باتیں بالطبع ملک چھجو کو اچھی معلوم ہوئیں کسی دوسرے مسلمان مصاحب کو ان کی تردید کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی۔ آخر نتیجہ یہ ہوا کہ ملک چھجو اور حاتم خاں صوبہ دار

اودھ دونوں متفق ہو گئے اور ملک چھجو نے کڑہ میں تاج شاہی اپنے سر پر رکھ کر سلطان مغیث الدین اپنا لقب تجویز کیا۔ انھیں ہندوؤں کے ذریعے جو وفاداری وبہادری کی لاف زنی کرتے تھے ہندوؤں کی فوجیں بھرتی کیں۔ تمام ملک اودھ اور علاقہ کڑہ میں سلطان مغیث الدین کے نام کا سکہ اور خطبہ جاری ہوا۔ ۶۹۰ھ میں ملک چھجو یعنی سلطان مغیث الدین ہندوؤں کی لاتعداد فوج لئے ہوئے دہلی کی طرف روانہ ہوا۔ یہ کیفیت سُن کر سلطان جلال الدین بھی اپنی انتخابی فوج لے کر دہلی سے روانہ ہوا۔ اپنے بیٹے ارکلی خاں کو ایک دستۂ فوج کے ساتھ بہ طور ہراول سلطانی لشکر سے دس بارہ کوس آگے چلنے کا حکم دیا۔ بدایوں سے آگے بڑھ کر ارکلی خاں کا ملک چھجو کے ہندو لشکر سے مقابلہ ہوا۔ مقابلے سے پہلے ہندو پایک اور راوت جن کو اپنی بہادری پر بڑا ناز تھا ملک چھجو کے دربار میں پان کے بیڑے اُٹھا اٹھا کر دعوئی کر چکے تھے کہ ہم سلطان جلال الدین کو گرفتار کر کے آپ کے سامنے لائیں گے۔ جب خلجی لشکر سے مقابلہ ہوا تو ان لوگوں نے خوب شور مچایا اور سلطان مغیث الدین کی جے کے نعرے لگائے مگر ارکلی خاں کے پہلے ہی حملے کی تاب نہ لاکر اس طرح فرار ہوئے جیسے شیر کے حملے سے بکریاں بھاگتی ہیں۔ چند مسلمان سرداروں تھوڑی سی مسلمان فوج نے جو ملک چھجو کے ہمراہ تھی، تھوڑی دیر ہاتھ پاؤں مارے۔ کچھ قتل اور کچھ گرفتار ہوئے۔ ملک چھجو میدان جنگ سے نکل کر قریب کے کسی گاؤں میں پناہ گزیں ہوا وہاں کے ہندو مقدم نے اُس کو گرفتار کر کے اگلے روز سلطان جلال الدین کی خدمت میں لاکر پیش کر دیا۔ اس لڑائی کا حال لکھتے ہوئے ضیاء الدین برنی رقم طراز ہے کہ

"ارکلیخاں با لشکر مقدمہ آب کلاب نگر عبرہ کردند و ازان طرف لشکر ملک چھجو پیشتر آمد و در لشکر ملک چھجو راوت و پایک ہندوستانی مانند مور و ملخ گرد آمدہ بود دراوتان و پایکان معروف از پیش ملک چھجو بیڑۂ تنبول برگرفتہ بودند و دعوئی کردہ کہ بر چتر سلطان جلال الدین خواہیم زد و چوں لشکر مقدمہ سلطان جلال الدین بر لشکر ہندوان تیر اندازی کردند ہندوان آب گرفتہ سست مزاج و برنج و ماش خوار کہ شورے و شغبے می کردند دوست و پائے گم کردند و شیران و شیر افگنان لشکر مقدمۂ سلطان جلال الدین تیغ ہا از نیام برکشیدند و بر لشکر ملک چھجو حملہ کردند۔ ملک چھجو و اُمرائے او و ہمہ ہندوان کہ در صف محاربہ مقابل لشکر مقدمہ ایستادہ کردہ بود بشکستند و منہزم گشتند و پشت دادند۔"

سلطان جلال الدین نے ملک چھجو کو ملتان بھیج دیا کہ وہاں نظر بند رہے اور اُس کو کسی قسم کی تکلیف نہ دی جائے ملک احمد حبیب نے کہا کہ آپ نے اس لڑائی کے تمام اسیروں کو آزاد کر دیا اور کسی کو بھی قتل نہ کیا اس سے رعب شاہی میں فرق آئے گا۔ سلطان نے جواب دیا کہ

"من بعد ہفتاد سال در مسلمانی پیر شدہ از دین اعراض نمی توانم کرد و خود را جبار و قہارے نمی توانم ساخت"

اس فتح کے بعد سلطان بدایوں سے دہلی کی جانب آیا اور اپنے بھتیجے اور داماد علاء الدین کو ملک چھجو کی جگہ کڑہ کا حاکم بنا کر کڑہ کی جانب رخصت کیا علاء الدین نے اپنی بیوی اور ساس سے ناراض رہتا تھا اور اپنی ساس یعنی سلطان کی بیوی سے تو بہت ہی خائف تھا اس لئے اس نے دارالسلطنت سے دور چلے جانے کو بہت غنیمت سمجھا۔ یہ خانگی جھگڑا اس قدر طول کھینچ چکا تھا کہ علاء الدین کو ہمہ اوقات اپنی جان کا خطرہ رہتا تھا کہ اُس کی خوشدامن کہیں اُس کو قتل نہ کر دے۔ سلطان جلال الدین کو اس کی پوری اطلاع نہ تھی۔ بہر حال علاء الدین دہلی کی سکونت سے برداشتہ خاطر اور اپنی ساس سے جو ملکہ جہاں تھی سخت ناراض و خائف ضرور تھا۔ کڑہ میں جب پہنچا تو وہی ہندو سردار جو ملک چھجو کو گھیرے رہتے تھے اور جو میدان سے بھاگ کر یا قید سے آزاد ہو کر آ گئے تھے اس کے گرد جمع ہو گئے ملک چھجو کی لڑائی اور شکست کے حالات بیان کرتے ہوئے اُنھوں نے علاء الدین کو یقین دلا دیا کہ ملک چھجو کے پاس اگر خزانہ ہوتا اور روپیہ کی کمی نہ ہوتی تو اس کو ہرگز شکست نہ ہوتی۔ یہ معلوم کرنے کے بعد کہ علاء الدین اپنی ساس اور بیوی سے ناراض ہے اور سلطان جلال الدین سے مطمئن نہیں ہے ان لوگوں نے اور بھی آزادی کے ساتھ اس قسم کی باتیں کہنی شروع کیں کہ کڑہ کے لشکر سے دہلی کا فتح کرنا ممکن ہے اور پہلے ہی سال میں اُس کو بغاوت پر آمادہ کر کے اُس کے راز دار بن گئے۔ ضیاء برنی کہتا ہے کہ

"ہمدراں سال کہ علاء الدین مقطع کڑہ شد و آنجا رفت بسے کارواران و مفولان ملک چھجو کہ مایہ آں فتنہ شدہ بودند و سلطان جلال الدین ایشاں را آزاد کردہ چاکر علاء الدین شدند و ہم در سال اول آں بلند کیان (یا غیان) و مشطان در دماغ سلطان علاء الدین رسانند کہ در کڑہ لشکر بسیار و مستعد و مرتب می تواں کرد و ممکن است کہ از کڑہ دہلی بدست آید زروی باید کہ اگر ملک چھجو زری بودے

ملک دہلی بدست او آمدے اگر از جائے زر فاخر دست آید ملک دہلی گرفتن آسان است"

۶۹۱ھ میں ہلاکو خاں مغل کے پوتے نے ہندوستان پر ایک بڑی فوج کے ساتھ حملہ کیا۔ سلطان جلال الدین خلجی اس کے مقابلے کے لئے خود پنجاب پہنچا۔ مسلمانوں کو مغلوں پر معمولی ابتدائی معرکوں میں فتح حاصل ہوئی اور کئی مغل سردار گرفتار ہو کر سلطان جلال الدین کی خدمت میں پیش ہوئے۔ آخر ایسی صورت پیدا ہوئی کہ طرفین کے سرداروں نے کوشش کر کے دونوں میں صلح کرادی۔ ہلاکو خاں کا پوتا خود سلطان جلال الدین کی ملاقات کے لیے اس کے لشکر میں آیا سلطان نے اس کو بیٹا کہہ کر اور اس نے سلطان کو پدر بزرگوار کہہ کر مخاطب کیا اس صلح کے بعد مغل واپس چلے گئے مگر چنگیز خان کا ایک پوتا جس کا نام الغو خاں تھا معہ چند بڑے بڑے سرداروں کے سلطان جلال الدین کی خدمت میں رہ گیا۔ یہ مغل سلطان کے ہمراہ دہلی آئے یہاں آ کر وہ سب کے سب بہ خوشی مسلمان ہو گئے۔ سلطان نے الغو خاں نو مسلم کے ساتھ اپنی بیٹی کی شادی کردی باقی نو مسلم مغلوں نے اپنے بیوی بچوں کو یہیں بلوا لیا۔ سلطان نے ان سب کے روزینے مقرر کر دیئے اور انھوں نے کیلوگڑھی۔ غیاث پور اور اندرپرست میں اپنے مکانات بنائے ایک دو سال کے بعد ان میں سے بعض کو یہاں کی آب وہوا موافق نہ آئی اس لئے وہ اپنے ملک کو واپس چلے گئے باقی یہیں رہے اور یہاں کے مسلمانوں میں اُن کے بیاہ شادی ہونے لگے۔ لوگ اُن کو نو مسلم کے نام سے پکارتے تھے ۶۹۱ھ کے آخری ایام میں مندور کے ہندؤں نے پھر زور پکڑا اور سلطان نے بلا توقف وہاں پہنچ کر اُن کو سزا دی اور دہلی واپس آیا اسی سال جب کہ سلطان مندور گیا ہوا تھا علاءالدین حاکم کڑہ نے سلطان سے بھیلسہ پر فوج کشی کرنے کی اجازت لی۔ سب سے پہلے بھیلسہ کو سلطان شمس الدین التمش نے فتح کیا تھا جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے، اب بھیلسہ میں ہندؤں نے پھر فساد کا مواد جمع کر لیا تھا۔ علاءالدین کے مصاحبوں نے اُس کو بھیلسہ پر فوج کشی کرنے کی یہ کہکر ترغیب دی کہ وہاں سے بہت کچھ مال و دولت ملنے کی توقع ہے۔ علاءالدین بھیلسہ کو فتح کر کے وہاں کے بڑے بُت کو جو کانسی کا بنا ہوا تھا اور جس کو شمس الدین التمش نے علی حالہ رہنے دیا تھا گاڑی پر لدوا کر دہلی لایا جسے دہلی کے بدایوں دروازہ کے سامنے زمین پر گاڑ دیا گیا۔ سلطان جلال الدین نے اس مرتبہ علاءالدین کو کڑہ کی جانب رخصت کرتے ہوئے اودھ کا ملک

بھی اُسی کی حکومت میں دے دیا۔ علاء الدین نے سلطان کو اپنے اوپر مہربان دیکھکر عرض کیا کہ چندیری کا علاقہ آج کل سلطان دہلی سے تقریبًا بے تعلق اور آزاد ہو گیا ہے۔ وہاں سرکشوں کا اجتماع ہو رہا ہے اگر آپ اجازت دیں تو میں ایک دو سال تک کڑہ واودھ کا خراج سلطان کی خدمت میں نہ بھیجوں اور اس روپیہ کو جنگی طاقت کے بڑھانے میں صرف کرکے چندیری کے سرکشوں کو سزا دوں اور اس علاقہ کو فتح کرکے حدود سلطنت میں شامل کرنے کے بعد کڑہ واودھ کا تمام خراج بے باق کروں۔ سلطان نے بخوشی اجازت دے دی۔ علاء الدین خوشی خوشی دہلی سے کڑہ میں آیا اور ملک دکن پر حملہ کرنے کی تیاری میں مصروف ہوا۔

دکن پر پہلا حملہ علاء الدین نے ۶۹۱ھ کے آخر یا ۶۹۲ھ کے ابتدا میں بھیلسہ پر اپنے مشیروں کے مشورہ سے حملہ کیا جن میں خلجی اُمراء اور ہندو رئیس شامل تھے۔ بھیلسے کے اس حملے اور اس کے بعد دیوگیر کے مشہور حملے کا عام طور پر ایک ہی سبب مشہور ہے۔ یعنی ایصال زر ایصال زر کی ضرورت جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے اس لئے تھی کہ کڑہ کی فوج سے دہلی پر قبضہ کیا جائے اور یہ ضرورت خود علاء الدین کے ہندو مشیروں نے ظاہر کی تھی لیکن بھیلسہ اور دکن کے جانب حملہ آور ہونے کا ایک سبب اس کے علاوہ اور بھی تھا۔ جس کی طرف سے بعد کے واقعات پیش آمدہ نے مؤرخین کی توجہ کو ہٹا دیا اور وہی پہلا مذکورہ سبب ہر ایک کے زیر توجہ رہا۔ اس دوسرے سبب کو سمجھنے کے لئے پہلے ضیاء برنی کے الفاظ پر غور کرو۔

"سلطان علاء الدین از ملکۂ جہاں کہ زن سلطان جلال الدین و خشوی (خوشدامن) او بود آزار بسیار داشت واز مخالفت حرم خود کہ دختر سلطان جلال الدین بود بجان رسیدہ واز خوف ملکۂ جہاں کہ بر سلطان جلال الدین بغایت مستولی بود واز حشمت وعظمت سلطان جلال الدین نمی توانست کہ مخالفت وبے فرمانی حرم خود پیش سلطان عرض دارد واز ترس فضیحت ورسوائی نمی توانست کہ کیفیت درماندگی خود پیش دیگرے کشف کند دائما در اندوہ و کاہش می بود ودر کڑہ با محرمان خود مشورت کردے کہ سر در جہاں گیرد ودر دیارے دیگر سر بزند"

یعنی علاء الدین اپنی بیوی اور خوشدامن کے تسلط سے سخت عاجز تھا اور اپنی مجبوری

بے کسی کا حال شرم کی وجہ سے کسی سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ سلطان سے بھی شکایت نہیں کر سکتا تھا لہذا وہ ہمیشہ اسی فکر میں رہتا تھا کہ کسی دوسرے ملک میں چلا جائے اور سلطان جلال الدین کی حدودِ حکومت سے باہر ہو جائے اُس کے لئے سب سے زیادہ آسان بنگالہ کا ناصر الدین بغراخاں سے فتح کر لینا تھا مگر اُس کے مشیروں نے جو سلطنت خلجی کی بربادی کے خواہاں تھے اُس کو بنگالہ کی طرف متوجہ نہ ہونے دیا اور اول بھیلسہ کی پھر دکن کی فتح کی ترغیب دی۔ تاریخ فیروز شاہی میں لکھا ہے۔

"وراںچہ علاء الدین در بھیلسہ رفت خبر بسیارے مال و پیل دیوگیر در سمع او افتادہ رفتن دیوگیر از آنجا تیاں برسید و در خاطر کرد کہ از کڑہ استعداد کند و سوار و پیادہ بسیار جا کر گیرد و سلطان جلال الدین را علم نہ دہد و جانب دیوگیر لشکر کشد۔"

بھیلسہ ہندوؤں کا مرکزی مقام تھا بھیلسہ میں کسی مسلمان یا مسلمانوں کے کسی ہمدرد کا تو نام و نشان بھی نہ تھا۔ بھیلسہ پر چڑھائی کرنے والی فوج میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے۔ علاء الدین کے مشیروں میں ہندوؤں کی کثرت تھی۔ بھیلسہ میں پہنچ کر دیوگیر کے مال و دولت کی کثرت کا حال اُس کو معلوم ہوتا ہے اس سے پہلے اُس کو دیوگیر کی نسبت کچھ معلوم نہیں ہوتا یعنی بھیلسہ والے ہی جن کو اُس نے مغلوب و مفتوح کیا ہے اُس کو دیوگیر کی دولت کا حال سناتے ہیں پھر انھیں بھیلسہ والوں سے وہ دیوگیر پر حملہ کرنے کا مشورہ کرتا ہے اور وہ اس کو دیوگیر پر حملہ کرنے کا مشورہ دیتے ہیں پھر انھیں بھیلسہ والوں کے بڑے بُت کو گاڑی میں لاد کر دہلی کی طرف آتا ہے اور اُس کے ہندو مشیر اور ہندو سپاہی مطلق ذرا ناراضی نہیں کرتے۔ تاریخ فیروز شاہی کے مذکورہ بالا الفاظ اور واقعات کے سلسلہ پر غور نظر ڈالتے یہ بات بالکل بے پردہ ہو جاتی ہے کہ علاء الدین کو خود ہندوؤں ہی نے کسی زبردست سازش کے ماتحت دکن پر حملہ کرنے کی ترغیب دی تھی اور یہ سازش جلد کامیاب اس لئے ہو گئی کہ علاء الدین اپنے چچا سلطان جلال الدین اور اُس کی بیوی کی طرف سے بددل اور خائف تھا۔ بھیلسے کے بُت کو بھی مصلحتاً دہلی لے جایا گیا تھا جس سے سلطان جلال الدین کو دھوکہ دینے کے سوا اور کچھ مقصود نہ تھا۔ سلطان جلال الدین کو اپنے اوپر مہربان دیکھ کر اور اودھ کا صوبہ بھی حاصل کر لینے کے بعد دونوں صوبوں کے خراج کو کئی سال تک ادا نہ کرنے کی اجازت حاصل کر لینا بھی اسی سازش کا ایک جزو تھا۔ علاء الدین بالکل جاہل اور بے پڑھا

لکھا آدمی تھا۔ اُس کی زندگی کے پورے اور مفصل حالات تاریخوں میں مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کاموں کے کرنے میں کسی چیز کی پرواہ نہ کرتا تھا اپنی مرضی اور خواہش کے مقابلے میں شریعت اسلام کی پابندی کو بھی ضروری نہیں سمجھتا تھا لیکن اگر کوئی شخص جرأت کرکے اس کو سمجھاتا اور کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کی ترغیب دیتا تو وہ اس سمجھانے والے کی بات کو فوراً مان لیتا تھا۔ عام طور پر جاہل اور بے پڑھے لکھے آدمیوں کی ایسی ہی حالت ہوا کرتی ہے۔ جس طرح ہندوستان کا مغل بادشاہ اکبر جاہل تھا۔ اسی طرح علاءالدین بھی جاہل تھا۔ اکبر سے جس طرح ایک نیا دین جاری کرنے کی حماقت سرزد ہوئی اسی طرح علاءالدین بھی اس حماقت میں مبتلا ہوا تھا مگر اُس کے درباریوں نے اُس کو سنبھال لیا۔ غرض بھیلسے کی چڑھائی اور کڑہ و اودھ کے صوبوں کے خراج کی ادائیگی کو معرض التوا میں ڈال کر چندیری پر حملہ آور ہونے کی تیاری کا بہانہ ایک ایسی سازش کا نتیجہ تھا جو علاءالدین کے مشیروں نے ترتیب دی تھی اور علاءالدین اُس پر عمل درآمد کرنے کے لئے تیار ہو چکا تھا۔ تاریخ فرشتہ کے الفاظ بھی اس جگہ قابل غور ہیں وہ چندیری پر حملہ کرنے کی اجازت حاصل کرنے کا ذکر کرکے لکھتا ہے کہ

"سلطان جلال الدین ملتمس او را مبذول داشت و خالی الذہن از آنکہ غرض ملک علاءالدین ازیں مقدمات ہمہ آنست کہ خود را از تحکمات ملکۂ جہان کہ کمال تسلط بر پادشاہ داشت وازاستیلائے او چیزے نمی توانست رسانید خلاص ساختہ ہمیشہ در سفر دور دراز باشد بلکہ اگر واقع شود در ولایت دور دست جائے مضبوط پیدا کردہ آنجا فروکش کند۔"

ضیاء برنی بھی اسی کے قریب قریب الفاظ استعمال کرتا ہے کہ

"ومی خواہد کہ از جفائے ملکۂ جہان و حرم خود و ہدست زدو اتقلیبے جا دیارے فروگیرد و ہمانجا باشد و بیش دریں جانب و درین دیار نیاید۔"

غرض ۶۹۴ھ میں علاءالدین نے چھ ہزار سواروں کے ساتھ کڑہ سے کوچ کیا اور اس بات کو شہرت دی کہ چندیری پر حملہ کرنے جاتا ہوں۔ کڑہ اور اودھ کی حکومت پر اپنی جگہ ضیاء برنی کے چچا علاء الملک کو حاکم بنا گیا۔ اس مغرورانہ کرادکے بہندل کی بھی ایک جماعت

ہندو راجاؤں کے علاقوں میں ہو کر گذرنا پڑا مگر چونکہ اُس نے بڑی تیز رفتاری سے اس سفر کو پہاڑوں اور جنگلوں میں ہو کر بخط مستقیم طے کیا اور کسی لبستی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا اس اس لیئے اُس کو کسی نے نہیں ٹوکا اور اُس نے ریاست دیوگیر یعنی ملک مرہٹ کی سرحد میں داخل ہو کر شہر ایلچپور پر قبضہ کیا۔ ایلچپور میں دو روز قیام کرنے کے بعد شہر دیوگیر (دولت آباد) کی جانب بڑھا۔ دیوگیر کا راجہ رام دیو شہر سے نکل کر دیوگیر سے دو میل کے فاصلے پر صف آرا ہوا۔ علاءالدین نے پہلے ہی حملے میں رام دیو اور اُس کی فوج کو میدان سے بھگا دیا۔ شہر کے متصل قلعہ تھا۔ راجہ شہر میں نہیں ٹھہر سکا میدان سے فرار ہو کر قلعہ میں پناہ گزین ہوا اور علاءالدین نے آگے بڑھ کر شہر پر قبضہ کیا اور قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ رام دیو کا بڑا بیٹا کسی مندر کی زیارت کے لیئے باہر گیا ہوا تھا اُس نے جب یہ سُنا کہ میرے باپ کو قلعہ میں محصور کر لیا گیا ہے تو وہ اردگرد کے راجاؤں کو معہ افواج ہمراہ لے کر آیا اور دیوگڈھ سے تین کوس کے فاصلے پر ٹھہر کر علاءالدین کے پاس پیغام بھیجا کہ قلعہ سے محاصرہ اُٹھا کر چلے جاؤ ورنہ ہم حملہ آور ہوتے ہیں علاءالدین نے ایک ہزار فوج محاصرہ پر مامور رکھی اور باقی پانچ ہزار سپاہی لے کر رام دیو کے بیٹے پر حملہ آور ہوا اُس کو معہ ہمراہی راجاؤں کے شکست دے کر بھگا دیا اور قلعہ کے محاصرہ میں پہلے سے زیادہ شدت کام میں لایا آخر رام دیو نے قریبًا ایک مہینہ محصور رہنے کے بعد مجبور اور بیرونی امداد سے مایوس ہو کر اپنے ایلچی علاءالدین کے پاس بھیجے اور چھ سو من سونا ایک ہزار من چاندی سات من موتی اور دو من جواہرات اور چار ہزار ریشمی کپڑے کے تھان دے کر صلح چاہی ۔ ۔ ۔ علاءالدین نے اس مال و دولت کے علاوہ ایلچپور اور اُس کے متعلقہ علاقہ کا بھی مطالبہ کیا اور رام دیو نے اپنی ریاست کا یہ حصہ علاءالدین کو دینا منظور کر لیا۔ تاریخ فرشتہ کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

"ایلچیان بعد الحاح و مبالغہ تمام قرار دادند کہ رام دیو ششصد من طلاء و ہفت من مروارید و دو من جواہر از لعل و یاقوت و الماس و زمرد و یک ہزار من نقرہ و چہار ہزار جامۂ ابریشمی و دیگر اجناس کہ تفصیلش موجب تطویل می گردد و عقل نیز از تصدیق آں ابا وارد داخل سرکار ملک علاءالدین ساختہ ایلچپور را با توابع و مضافات آں بتصرف متعلقان او بگذارد و یا در ضبط خود داشتہ ہر سال محصول آں ولایت بہ کڑہ می فرستادہ باشد"

آٹھ سو یا نو سو کوس کے فاصلے پر تھوڑی سی فوج کے ساتھ مالوہ و تلنگانہ و خاندیس وغیرہ کے زبردست راجاؤں کے علاقوں کو طے کر کے دیو گیر پر حملہ کرنا اور ایلچپور کے علاقے کو اپنے قبضے میں لانا اور اپنا علاقہ قرار دینا دلیل اس بات کی ہے کہ مسلمان ہندوؤں کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتے تھے اور ہندو مسلمانوں کے مقابلے کی ہرگز تاب نہیں لا سکتے تھے نیز یہ کہ علاء الدین دہلی اور سلطنت دہلی سے دور و بے تعلق ہو کر زندگی بسر کرنے کے لئے کوئی زاویہ تلاش کرنا چاہتا تھا اس نے ایلچپور اور متعلقہ علاقہ کو اپنے قیام کے لئے رام دیو کی ریاست سے جدا کر لینا ضروری سمجھا تھا ہندو ریاستوں کے بیچ میں ایک چھوٹے سے علاقے کو اپنے لئے مخصوص کر لینا بھی اس امر کی دلیل ہے کہ علاء الدین کو ہندوؤں سے کوئی خوف نہ تھا اور وہ ہندوؤں کے درمیان اپنی آزادی کو قائم رکھ کر ایلچپور میں رہنے کی جرأت رکھتا تھا۔ غرض سلطان جلال الدین اور اپنی ساس ملکہ جہاں سے دور و مہجور رہنے کی خواہش کو اس حملۂ دیوگیر سے ضرور تعلق ہے جس کی تائید فرشتہ کے ان الفاظ سے بھی ہوتی ہے کہ

" روایت مؤلف طبقات ناصری کہ معاصر ایشان بود چنین است کہ ملک علاء الدین از کڑہ برآمدہ راہے پیش گرفت و بشکار مشغول گشتہ براجہائے کہ سر راہ واقع شدہ بودند اصلاً مزاحمت نرسانید و بعد از دو ماہ بایلچپور کہ از بلاد مشاہیر دکن است بیک ناگاہ رسید و چنیں آوازہ انداخت کہ ملک علاء الدین از امرائے بادشاہ دہلی ست بنا بر بعضے از مقدمات ترک خدمت او کردہ می خواہد کہ پیش راجہ راج مندری کہ از جملۂ ممالک تلنگانہ است رفتہ ملازم گردد "

طبقات ناصری سے مراد اگر منہاج سراج کی طبقات ناصری ہے تو اس میں یہ عبارت موجود نہیں ہے نہ ہو سکتی ہے کیونکہ منہاج سراج علاء الدین کے زمانہ میں موجود نہ تھا اس سے پہلے ہی فوت ہو چکا تھا ممکن ہے کہ طبقات ناصری کے کسی ضمیمے میں جو بعد میں لوگوں نے لکھے تھے یہ عبارت موجود ہو۔ اگر طبقات ناصری کو کتابت کی غلطی سمجھ کر فیروز شاہی قرار دیا جائے تو تاریخ فیروز شاہی میں بھی یہ الفاظ موجود نہیں ہیں مگر یہ بات بالکل یقینی ہے کہ یہ کسی ایسے مؤرخ کا قول ہے جو علاء الدین کا معاصر تھا اگر ان الفاظ میں کوئی اعتماد اور وزن نہ ہوتا تو فرشتہ اس طرح حوالہ کے ساتھ اپنی کتاب میں درج نہ کرتا۔ بہت زیادہ ممکن ہے کہ راج مہندری کے راجہ سے اس کی خط و کتابت بھی اس معاملے میں پیشتر ہو چکی ہو۔ اگر اس

قیاس کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو پھر یہ اعتراض بھی مرتفع ہو جاتا ہے کہ راستے کے کسی راجہ نے کیوں علاء الدین کو نہیں ٹوکا اس بات پر بھی غور کرو کہ علاء الدین بہت ہی تھوڑی فوج یعنی صرف چھ ہزار آدمی لے کر دیوگیر پہنچا راستے میں جاتے ہوئے مالوہ۔ گونڈوانہ اور خاندیس کے راجاؤں نے کان نہیں ہلایا۔ دیوگیر کا محاصرہ تقریباً ایک مہینے رہا اور ان بڑے بڑے راجاؤں میں سے کوئی مدد کو نہیں پہنچا۔ علاء الدین دیوگیر سے مال و دولت لے کر بھی چند روز ایلچپور میں مقیم رہا۔ پھر جب کڑہ کی جانب روانہ ہوا تو اس مال و دولت کو علاء الدین سے چھین لینے کی جرأت بھی ان مذکورہ راجاؤں میں سے کسی کو نہ ہوئی اس سے یہ شبہ اور بھی قوی ہو جاتا ہے کہ کڑہ کے ہندوؤں کی معرفت جو علاء الدین کی مصاحبت میں موجود تھے ان مذکورہ راجاؤں سے پہلے ہی ساز باز ہو چکا ہوگا اور انھوں نے دیوگیر کے راجہ رام دیو پر یہ مصیبت وارد کرنے اور علاء الدین کو سلطان جلال الدین کے خلاف دولت مند بنا کر بغاوت و سرکشی کی جرأت دلانے کی یہ بہترین تدبیر سوچی ہو۔ بہرحال اس معاملے میں موجود وبہیا شدہ تاریخوں کے ذریعے کوئی صاف اور روشن بیان پیش نہیں کیا جا سکتا۔ علاء الدین کو جب دیوگیر کے راجہ سے بے قیاس دولت حاصل ہو گئی تو وہ اب ایلچپور میں زیادہ دنوں نہیں ٹھہر سکتا تھا کیونکہ اس خلاف اُمید دولت کے حاصل ہو جانے پر وہ بڑی آسانی سے ان لوگوں کے مشورہ کو تسلیم کر سکتا تھا جو اُس کو سلطان جلال الدین کے خلاف نبرد آزمائی پر آمادہ کرنا چاہتے تھے۔ آخر نتیجہ یہ ہوا کہ علاء الدین نے کڑہ پہنچ کر سلطان جلال الدین کے قتل کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا اور اس مال و دولت نے جو دیوگیر سے وہ لے گیا تھا اُس کے ارادہ کو قوت سے فعل میں لانے کا موقعہ بہم پہنچا دیا۔ یہ دولت جو علاء الدین کو دیوگیر سے حاصل ہوئی اُس تمام مال و دولت کے مجموعے سے بدرجہا زیادہ تھی جو محمد بن قاسم کے زمانے سے لے کر شہاب الدین غوری کے زمانہ تک مسلمانوں نے ہندوستان سے حاصل کی تھی لیکن یہ دولت بھی بجز اس کے کہ جنوبی ہند سے شمالی ہند میں پہنچ گئی۔ ہندوستان کی حدود سے باہر نہیں گئی۔ لہٰذا اس کے متعلق بھی کسی شکوہ و شکایت کی کسی کو ضرورت نہیں۔ مشہور سیاح ابن بطوطہ جو ۷۳۴ھ میں یعنی حملہ دیوگیر سے پورے چالیس سال کے بعد ہندوستان میں داخل ہوا ہے۔ اس مال و دولت کے حاصل ہونے کا ایک اور ہی سبب بیان کرتا ہے وہ لکھتا ہے کہ علاء الدین جب دیوگیر کی جانب فوج لے کر گیا ہے تو وہاں کسی

مقام پر جنگل میں سفر کرتے ہوئے علاء الدین کے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور گھوڑے کے سُم سے ایک زنجیر جو زمین میں دبی ہوئی تھی نمودار ہوئی۔ اس زنجیر کے سرے کو دیکھ کر اُس مقام کو کھدوا گیا تو ایک خزانہ برآمد ہوا۔ اس خزانہ کو لے کر علاء الدین کڑہ میں واپس آیا اور سُلطان جلال الدین کے قتل کی تدابیر میں مصروف ہو۔

شہادت ۱۷ رمضان ۶۹۵ھ کو سلطان جلال الدین خلجی اپنے بھتیجے اور داماد علاء الدین خلجی کے ہاتھ سے کڑہ اور مانک پور کے درمیان دریائے گنگ کے کنارے مارا گیا۔ اس جگہ اس حادثہ کی تفصیل بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

سلطان علاء الدین خلجی

سلطان علاء الدین خلجی اپنے چچا جلال الدین خلجی کو قتل کرنے کے بعد بھی دہلی کا تخت سلطنت حاصل کرنے سے مایوس تھا کیونکہ سلطان جلال الدین کا بیٹا ارکلی خاں جو اس زمانے میں ملتان کا صوبہ دار اور مغلوں کے حملوں کو روکنے کی غرض سے ملتان ہی میں رہتا تھا دہلی پہنچ کر باپ کی سلطنت کو سنبھال لینے کی پوری اہلیت و قابلیت رکھتا تھا اور علاء الدین کے لئے اُس کا مقابلہ کرنا آسان نہ تھا مگر یہاں ملکہ جہاں یعنی سلطان جلال الدین کی بیوی نے اپنے چھوٹے بیٹے کو جو سلطنت کی قابلیت نہ رکھتا تھا دہلی کے تخت سلطنت پر بٹھا دیا تھا یہ خبر سُن کر ارکلی خان ملتان ہی میں مقیم رہا اور دہلی کی طرف نہ آیا۔ علاء الدین کڑہ میں اس خبر کو سُن کر بہت خوش ہوا اور ماہ صفر ۶۹۶ھ میں کڑہ سے دہلی کی جانب روانہ ہوا۔ راستہ میں اُس نے خوب روپیہ لٹایا اور سخاوت و بخشش کے ذریعہ لوگوں کو اپنی جانب مائل کیا ملکہ جہاں بیٹے کو لے کر ملتان کی جانب ارکلی خاں کے پاس بھاگ گئی۔ علاء الدین نے دہلی پہنچ کر ۶۹۶ھ میں تخت سلطنت پر جلوس کیا۔ اپنے بھائی الماس بیگ کو الغ خاں کا خطاب دیا۔ ملک نصرت جلیسری کو نصرت خاں کا خطاب ملا۔ ضیاء برنی کے باپ مؤید الملک کو برن (بلند شہر) کی حکومت عطا کی۔ ملتان کی جانب فوج بھیج کر سلطان جلال الدین کے بیٹوں کو گرفتار کر کے اندھا کرا دیا۔ اسی سال یعنی ۶۹۶ھ میں مغلوں نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ علاء الدین نے اُن کے مقابلہ کو فوج بھیجی جالندھر کے قریب لڑائی ہوئی اور مغل شکست کھا کر بھاگ گئے

استحکام سلطنت کے بعد سلطان علاء الدین کی سلطنت جب اچھی طرح مستحکم ہو گئی تو اُس نے ۶۹۷ھ میں اپنے بھائی الغ خاں اور ملک

نصرت خاں کو فوج دے کر گجرات کی طرف روانہ کیا۔ مسلمان گجرات کو اپنا ملک سمجھتے تھے لیکن عرصۂ دراز سے گجرات کے راجہ نے خراج بھیجنا بند کر کے اپنے آپ کو خود مختار بنا لیا تھا اور سلطان جلال الدین نے اُس طرف التفات نہ کیا تھا۔ یہ فوج جب گجرات پہنچی تو وہاں کا راجہ کرن تاب مقاومت نہ لاکر فرار اور دیوگیر کے راجہ رام دیو کے پاس جاکر پناہ گزیں ہوا۔ راجہ کرن اس بدحواسی کے ساتھ فرار ہوا کہ اپنی بیوی کملا دیوی اور خزانہ کو بھی ہمراہ نہ لے سکا۔ چنانچہ اُس کا خزانہ اور رانی کملا دیوی اسلامی لشکر کے قبضے میں آئی جس کو سلطان کی خدمت میں دہلی کی جانب روانہ کیا گیا۔ دہلی پہنچ کر کملا دیوی نے اس شرط پر اسلام قبول کیا کہ اُس کو بانوئے سلطنت اور ملکۂ جہاں بنا دیا جائے۔ چنانچہ سلطان علاؤالدین نے اُس کو بیوی بنا لیا۔ گجرات پر قبضہ کرنے کے بعد ملک نصرت خاں علاقہ کمبایت میں گیا وہاں کے ساہوکاروں سے جو بڑے مالدار تھے روپیہ وصول کیا۔ یہیں اُس نے ایک ہندو بچہ کو، جو قوم کا بروایا برداری تھا اور جسے خوجہ بنا کر وہاں کے کسی ساہوکار نے اپنا غلام بنا رکھا تھا اُس کے مالک سے زبردستی چھین لیا۔ یہی وہ غلام تھا جو سلطان علاء الدین کی خدمت میں پہنچ کر ملک کافور کے خطاب سے مخاطب اور رفتہ رفتہ ترقی کر کے ہزار دیناری اور بالآخر وزیر اعظم بن گیا تھا ملک نصرت خاں اور الغ خاں کے ہمراہ نومسلم مغلوں کی ایک بڑی تعداد تھی۔ گجرات و کمبایت کی فتح اور وہاں کے انتظام سے فارغ ہو کر یہ دونوں سردار جب دہلی کی جانب واپس ہوئے تو راستے میں ان نومسلموں نے بغاوت کی اور سلطان علاء الدین کا ہمشیر زادہ اس بغاوت میں نومسلموں کے ہاتھ سے مقتول ہوا۔ ملک نصرت اور الغ خاں نے جب اِن باغیوں کو بقیہ فوج کے ذریعے شکست دے کر منتشر کر دیا تو یہ سب آوارہ ہو کر تھنبور کے راجہ ہمیر دیو کے پاس چلے گئے اور اُس نے اُن کو تائید غیبی سمجھ کر بڑی آؤ بھگت کے ساتھ رکھا۔

اسی زمانہ میں ایک اور سردار ظفر خاں جو اپنی بہادری میں شہرۂ آفاق تھا سیوستان کی فتح کے لئے نامزد ہوا تھا۔ سیوستان سندھ کا ایک حصہ اور سلطنت اسلامیہ کا جزو تھا لیکن عرصہ سے یہاں بھی ایک ہندو راجہ صلدی یا چھیلدیو نامی مغلوں سے امداد پاکر خود مختار ہو چکا تھا۔ جب ظفر خاں فوج لے کر سیوستان کے قریب پہنچا تو مغلوں کی فوجوں نے بلوچستان کی طرف سے آکر سیوستان کے راجہ کی مدد کی آخر سخت لڑائی کے بعد ظفر خاں نے راجہ اور اُس

کے بھائی اور مغل سرداروں کو گرفتار کرکے گلے میں طوق وزنجیر ڈال کر دہلی کی جانب روانہ کیا اور بعد میں خود بھی معہ مال غنیمت دہلی کی جانب روانہ ہوا۔ نصرت خاں نے جب کھمبایت سے راستے ہوئے غلام کو پیش کیا تو سلطان اس کی تربیت کی طرف خصوصیت سے متوجہ ہوگیا الغ خاں، نصرت خاں اور ظفر خاں کے سالماً غانماً واپس آنے اور گجرات وسیوستان وغیرہ کی فتوحات نے اس جاہل بادشاہ کو بہت مغرور بنا دیا۔ اُدھر کملا دیوی کی صحبت نے جو بادشاہ کی منظور نظر اور محرم راز وانیس خلوت تھی یقیناً اس پر اثر ڈالا ہوگا۔ نیز چھ سات سال پیشتر سے جب کہ وہ کڑہ کا صوبہ دار تھا اس کو ہندوؤں کی صحبت رہ چکی تھی اب اس نے اپنے ان فتحمند سرداروں کے دہلی میں واپس آنے کے بعد ایک نئے مذہب کے جاری کرنے کا ارادہ کیا۔ بادشاہ کی اس لامذہبیت کے بدنتائج کی فوراً روک تھام ہوگئی یعنی اس نے جب دربار میں اپنے ارکانِ سلطنت کے روبرو اس کا اظہار کیا تو بعض باہمت اور باخدا لوگوں نے مخالفت کا اظہار کرکے بادشاہ کو اس خطرناک و مہلک ارادے کے نتائج سے ڈرایا اور قابلیت کے ساتھ سمجھایا چنانچہ بادشاہ باز آگیا۔

مغلوں کا حملہ

چند ہی روز کے بعد ۶۹۸ھ میں مغلوں نے خراسان میں ایک زبردست فوج فراہم کی اور ہندوستان پر حملہ کرکے علاء الدین کو ایک خطرناک مصیبت میں مبتلا کر دیا۔ قتلق خواجہ یا قتلغ خواجہ نامی مغلوں کا ایک شہزادہ دو لاکھ جرار مغلوں کی فوج لے کر ہندوستان میں داخل ہوا۔ چونکہ راستے میں کوئی زبردست فوج اور تجربہ کار سپہ سالار اس کا سد راہ ہونے کے لئے اتفاقاً موجود نہ تھا لہٰذا وہ نہایت تیز رفتاری کے ساتھ سیدھا دہلی تک چلا آیا مدعا اس کا یہ تھا کہ دارالسلطنت پر اوّل قبضہ کرلیا جائے پھر دوسرے شہروں میں لوٹ مار کا بازار گرم کرنا آسان ہوگا۔ دو لاکھ مغلوں کا یکایک فصیل دہلی کے نیچے پہنچ جانا کوئی معمولی حادثہ نہ تھا خوف کے مارے اردگرد کے گاؤں اور قصبوں کے لوگ بھی سب دہلی میں آکر جمع ہوگئے اور تمام کوچہ و بازار آدمیوں سے پُر نظر آنے لگے سامان خورد و نوش بھی غیر مکتفی تھا اور اس محاصرہ کی حالت کو تادیر برداشت نہیں کیا جا سکتا تھا۔ علاء الدین نے لڑنے کے قابل آدمیوں کو منتخب کیا تو تین لاکھ آدمی شہر کے اندر موجود ملے۔ اس تین لاکھ کے لشکر کو لے کر وہ شہر سے باہر نکلا اور مغلوں سے نبرد آزما ہوا۔ ہندوستان میں اس وقت تک اتنی بڑی دو فوجوں کا ایک میدان میں کبھی مقابلہ نہ

ہوا تھا۔ سخت معرکہ آرائی کے بعد مغلوں کو شکست ہوئی۔ علاء الدین کا بہادر سپہ سالار ظفر خاں اس لڑائی میں اپنی شجاعت کے انتہائی جوہر دکھا کر شہید ہوا۔ مغل جس تیزی و سرعت کے ساتھ آئے تھے اسی سُرعت کے ساتھ شکست خوردہ واپس چلے گئے۔ اس فتح عظیم کے بعد علاء الدین نے سکندر ثانی کا خطاب اپنے لئے تجویز کیا اور یہی خطاب سکوں اور خطبوں میں داخل ہوا۔

۶۹۹ھ میں علاء الدین نے قلعہ رنتھمبور پر حملہ کیا یہاں کا راجہ ہمیر دیو پرتھی راج کی نسل سے تھا۔ اور عرصۂ دراز سے خود مختار ہو گیا تھا۔ تازہ خطا اُس کی یہ تھی کہ اُس نے نومسلم مغلوں کو جن کا سردار محمد شاہ نامی ایک شخص تھا اور جو الغ خاں و نصرت خاں کی فوج میں سے باغی ہو کر چلے آتے تھے اپنے یہاں پناہ دی تھی۔ سلطان دہلی سے روانہ ہو کر ابھی رنتھمبور تک نہیں پہنچا تھا کہ راستے میں ایک روز اُس کے بھتیجے سلیمان شاہ نے بادشاہ کو قتل کر کے خود بادشاہ بننے کی ناکام کوشش کی اور قتل ہوا۔ رنتھمبور پہنچ کر محاصرہ شروع کیا اس محاصرے نے طول کھینچا۔ بادشاہ کو وہاں مصروف دیکھ کر اُس کے دو ہمشیر زادوں امیر عمر اور منگو خاں نے بدایوں اور اودھ میں علمِ بغاوت بلند کیا مگر دونوں گرفتار ہو کر رنتھمبور میں بادشاہ کے پاس پہنچے بادشاہ نے محصورین رنتھمبور کو خوف دلانے کے لئے قلعہ کی دیوار کے نیچے ان دونوں کو بڑی اذیت کے ساتھ قتل کرایا۔

ابھی امیر عمر اور منگو خاں کا فتنہ فرو ہوا ہی تھا اور رنتھمبور کا محاصرہ برابر جاری تھا کہ دہلی میں حاجی مولیٰ نام ایک شخص نے دہلی کے بعض بڑے بڑے اہلکاروں کو قتل کر کے علم بغاوت بلند کیا اور ایک شخص علوی کو جس کی ماں شمس الدین التمش کی نسل سے تھی تختِ سلطنت پر بٹھا دیا مگر سلطان کے بعض وفاداروں نے حاجی مولیٰ اور علوی دونوں کو قتل کر کے اس فتنے کو بھی دبا دیا۔ رنتھمبور کا محاصرہ ایک سال تک جاری رہا۔ نصرت خاں اسی دوران محاصرہ میں ایک پتھر کے لگنے سے مارا گیا۔ آخر سلطان نے قہر و شوکت کے ساتھ اس قلعہ کو فتح کر لیا۔ ہمیر دیو اور اس کے متعلقین سب قتل ہوئے۔ فتح ہونے کے بعد سلطان نے مقتولین کے اندر محمد شاہ باغی کو زخمی پڑا ہوا دیکھا اور پہچان کر کہا کہ اگر تیری مرہم پٹی کرا کر تجھ کو تندرست کر دیا جائے تو کیا احسان مانے گا اُس نے سلطان علاء الدین کو جواب دیا کہ میں تندرست ہو کر تجھ کو قتل کروں گا اور تیری جگہ ہمیر دیو کے بیٹے کو ہندوستان کا بادشاہ بناؤں گا۔ —

علاء الدین نے ناراض ہو کر اُس کو ہاتھی کے پاؤں سے کچلوا دیا۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد اُس کی بہادری اور وفاداری کا خیال آیا تو بڑی عزت واحترام کے ساتھ اُس کے جنازہ کو دفن کرایا اور ہمیر دیو کے وزیر رنمل کو جو محاصرہ کے شروع ہی میں سلطان کی خدمت میں حاضر ہو گیا تھا اپنے سامنے بُلوایا اور کہا کہ تم نے اپنے قدیمی آقا کے ساتھ کونسی وفاداری کی ہے جو ہم تم سے وفا کی توقع رکھیں یہ کہہ کر اُس کو بھی قتل کرا دیا۔ یہ قلعہ اپنے بھائی الغ خاں کو دے کر خود دہلی کی طرف روانہ ہوا۔ الغ خاں پانچ مہینے کے بعد بیمار ہو کر دہلی کی جانب روانہ ہوا اور راستہ میں فوت ہو گیا۔

علاء الدین کے نمایاں کارنامے

سلطان نے اپنے سالے الپ خاں کو الغ خاں کا خطاب دیا اور دہلی پہنچ کر سب سے پہلا کام یہ کیا کہ شراب خوری سے توبہ کر کے منادی کرادی کہ آئندہ کوئی شخص شراب استعمال نہ کرے چنانچہ اُس نے اپنی حدود حکومت سے نہایت کامیابی کے ساتھ شراب خوری کا نام ونشان مٹا دیا۔ خفیہ پولیس کا محکمہ قائم کیا۔ تحصیلدار و پٹواری مقرر کر کے زمینداروں سے نقد خراج وصول کرنے کا ضابطہ موقوف کر کے بٹائی کا قاعدہ جاری کیا۔ اس معاملہ میں اس قدر احتیاط کو مرعی رکھا گیا کہ کسی کی مجال نہ تھی جو کاشت کار سے ایک حبہ یا ایک دانہ زیادہ وصول کر سکے رشوت قطعاً موقوف ہو گئی جھوٹ بولنے کی سخت سزا مقرر کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس کی حدود حکومت سے کذب و دروغ کا نام ونشان مٹ گیا۔ غارت گری اور لوٹ مار کا استیصال پورے طور پر کر دیا۔ بہار سے پنجاب و سندھ تک تمام سڑکیں اور راستے اسی طرح محفوظ تھے کہ ایک عورت سونا اُچھالتی چلی جاتی تھی اور کسی کو جرأت نہ تھی کہ اُس سے یہ دریافت کرتا کہ تیرے منہ میں کے دانت ہیں۔ ملک میں ضروریات زندگی کی اس قدر ارزانی ہو گئی کہ گندم ساڑھے سات چیتل کے ایک من آتے تھے۔ چیتل تانبے کا سکہ تھا۔ ایک روپے میں چالیس چیتل ہوتے تھے یعنی فی روپیہ پونے چھ من گندم آتے تھے۔ تمام انتظامات صرف دو سال کے عرصہ میں پایہ تکمیل کو پہنچ گئے۔ اس حیرت انگیز کامیابی کا سبب صرف یہ تھا کہ دہلی میں ذی علم اور تجربہ کار لوگوں کی کثرت تھی اور تخت نشین ہونے کے بعد سلطان علاء الدین اُس زمانے کے ذی علم اور باخدا لوگوں سے مشورہ لینے میں تامل نہ کرتا تھا اور ہر ایک بڑے اور اہم کام میں علماء سے مشورہ کرنے کو عیب نہیں جانتا تھا۔ چونکہ وہ جاہل

تھا اس لیے کبھی علماء کی بات پر عمل نہیں بھی کرتا تھا۔ مگر جب کوئی بات اُس کے ذہن نشین ہو جاتی تھی تو اُس پہ پوری طاقت کے ساتھ عمل درآمد کرتا اور کامیابی حاصل کر کے رہتا تھا۔ علاء الدین خلجی کے عہد میں اُس کے ذی لیاقت عُمّال اور نیک نیت اہلکاروں کی قابلیت کا نتیجہ تھا کہ کاشت کار خوش حال اور سپاہی فارغ البال نظر آتے تھے مقدموں نمبرداروں، اور رشوت خوار اہل کاروں کا طبقہ درمیان سے بالکل مرتفع ہو گیا تھا۔ باوجود اس کے کہ رعایا سے زر نقد لگان یا کسی قسم کا ٹیکس وصول نہیں کیا جاتا تھا۔ سلطانی لشکر کی تعداد پونے پانچ لاکھ سواروں پر مشتمل تھی اس کثرت فوج کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کے ہر حصے سے بغاوت و سرکشی کا نام و نشان مٹ گیا۔ اس جاہل پادشاہ کے عہدِ حکومت میں علماء اور ہر علم و فن کے باکمالوں کی اس قدر کثرت تھی کہ کسی دوسرے زمانے میں نظر نہیں آتی۔ اُس زمانے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے اخلاق میں کس قدر فرق و تفاوت تھا اس کا اندازہ کرنے کے لئے ضیاء برنی کے چچا علاء الملک کے الفاظ قابل توجہ ہیں۔ علاء الملک اور سلطان علاء الدین خلجی کا ایک مکالمہ ضیاء برنی اور دوسرے مورخین نے نقل کیا ہے۔ سلطان ساری دنیا کے فتح کرنے کا ارادہ ظاہر کرتا اور علاء الملک اس ارادہ سے سلطان کو باز رکھنا چاہتا ہے۔ اسی سلسلے میں علاء الملک سکندر یونانی کے زمانے کے لوگوں اور اپنے زمانے کے لوگوں کا فرق بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ

> "بخلاف مردمان زمانہ و عصر ما خاصۃً ہندو کہ اصلاً در ایشاں عہدے و پیمانے نیست کہ اگر پادشاہے قاہر و کامگار بر سر خود نہ بینند و سوار و پیادہ انبوہ تیغ و تبر کشیدہ بر جان و روان و ملک و اسباب خود معائنہ نہ کنند ہرگز فرماں بردلری نہ کنند و خراج نہ دہند و صد عصیاں و تمرد ورزند۔"

علاء الملک کے یہ الفاظ واقعات کی تصویر ہیں۔ سلطان علاء الدین چونکہ سخت گیر تند مزاج اور طاقتور سلطان تھا۔ اور کسی لڑائی میں اُس کو کبھی شکست نہیں ہوئی تھی لہٰذا اُس نے جب ایک مرتبہ طاقت اور شوکت کو کام میں لا کر ملک میں امن و امان قائم کر دیا تو پھر کسی ہندو راجہ کو یہ جرأت نہ ہوئی کہ سرتابی و بغاوت کا خیال بھی دل میں لا سکے یا کوئی گروہ ہندوؤں کا رہزنی پر آمادہ ہو سکے۔ شروع ۷۰۰ھ سے آخر ۷۱۵ھ تک سلطان علاء الدین شمالی ہند میں ایسے قوانین و آئین نافذ کر چکا تھا کہ کسی بدامنی و سرکشی کے سر اُبھارنے یا رعایا میں سے کسی

کے جان و مال کے تلف ہونے کا اندیشہ باقی نہ رہا تھا صرف ایک چتوڑ کا قلعہ باقی رہ گیا
تھا جس نے سلطان کے حسب منشاء اب تک اطاعت نہیں کی تھی۔ چنانچہ سلطان
نے شعبان ۷۰۲ھ میں چتور پر لشکر کشی کی۔ اور شش ماہہ محاصرہ کے بعد محرم ۷۰۳ھ میں
اُس کو فتح کرکے اپنے بڑے بیٹے خضر خاں کو چتور کا حاکم مقرر کیا اور چتور کا نام خضر آباد رکھا
اسی جگہ خضر خاں کو ولی عہد سلطنت قرار دے کر دہلی کی جانب واپس آیا اور چتور کے راجہ رتن سین
کو گرفتار کرکے ہمراہ لایا۔ رتن سین کا خواہر زادہ خود پادشاہ کی خدمت میں آکر حاضر ہوا اور مصاحبین
سلطانی میں داخل کیا گیا۔ رتن سین کی بیوی جس کا نام پدمادت تھا فتح چتور کے وقت فرار
ہوکر کہیں جا چھپی تھی اسی طرح اور بھی بہت سے راجپوتوں نے فرار کی عار گوارا کرکے اپنی جان
بچا لی تھی جن کا کوئی تفحص و تعاقب نہیں کیا گیا تھا۔ یہ کام خضر خاں کا تھا جو وہاں کا حاکم
مقرر کیا گیا تھا کہ وہ اُس تمام علاقہ میں اُن لوگوں کا استیصال کرتا جو ابھی تک سرکشی و بغاوت کا
مادہ اپنے دلوں میں رکھتے تھے۔ خضر خاں میں ملک داری کی قابلیت نہ تھی لہذا وہ عیش و عشرت
میں مشغول ہو گیا اور راجپوتوں کو رام کرنے کا خیال بھی دل میں نہ لایا ان مفرور راجپوتوں نے پہاڑوں
اور جنگلوں میں اپنا مرکز قائم کیا اور رانی کو حاکم قرار دے کر خود مختارانہ زندگی بسر کرنے لگے سلطان
کو چتور سے دہلی آئے ہوئے ایک ہی مہینہ گذرا تھا کہ طرغی بیگ مغل نے ایک لاکھ بیس ہزار
فوج کے ساتھ سلطنت دہلی پر حملہ کیا مگر ناکام واپس ہوا۔ مغلوں کے اس حملے کو دفع کرنے
کے بعد پادشاہ کو معلوم ہوا کہ چتور کے نواح میں رتن سین کی رانی نے راجپوتوں کی جمعیت
فراہم کی ہے۔ اُس نے راجہ کے بھانجے سے جو اُس کے مصاحبوں میں شامل تھا اُس کا
ذکر کیا اُس نے کہا کہ رتن سین آپ کی قید میں موجود ہے آپ اُس سے کہیں کہ وہ رانی کو اس
حرکت اور سرکشی سے باز رہنے کا خط لکھے اور اس کو اپنے پاس بلالے، چنانچہ علاء الدین نے
رتن سین کو، جو معزز قیدیوں کی طرح نظر بند اور آرام و آسائش کے ساتھ زندگی بسر کرتا تھا
اجازت دی کہ تم اپنی رانی کو بھی اپنے پاس بلا لو۔ راجہ نے اس رعایت سے خوش ہوکر اپنے
معتمد کے ہاتھ رانی کے پاس پیغام بھیجا کہ تم بھی میرے پاس چلی آؤ۔ رانی نے یہ ہوشیاری
کی کہ چند پالکیوں میں مسلح راجپوتوں کو بٹھا کر بہت سے راجپوتوں
کو تیز رفتار گھوڑوں پر محافظ دستہ کے طور پر مامور کرکے دہلی کی جانب روانہ کیا اور یہ شہرت
دی کہ رانی حسب الاجازت سلطان اور حسب الطلب راجہ دہلی کو جا رہی ہے چنانچہ چتور سے

دہلی تک کوئی بھی ان راجپوتوں کا مزاحم نہ ہوا۔ رانی کی یہ مصنوعی سواری رات کے ابتدائی حصے میں دہلی پہنچی اور شہر سے باہر رُک کر سلطان کے پاس اطلاع بھیجی کہ رتن سین کو مقام نظربندی سے باہر بھیجئے کہ وہ رانی کو ہمراہ لے جائے سلطان نے اجازت دی اور رتن سین چند محافظوں کی نگرانی میں رانی کے استقبال کو شہر سے باہر نکلا جوں ہی اس مصنوعی سواری کے قریب پہنچا راجپوتوں نے جو ڈولوں کے اندر تھے اور جو بطور محافظ دستے کے آئے تھے ان چند شاہی محافظوں پر حملہ کرکے ان کو قتل کر دیا اور رتن سین کو گھوڑے پر بٹھا کر وہاں سے فرار ہو گئے اور بطریق یلغار نواح چتور میں اپنے محفوظ مقام پر پہنچ گئے۔ سلطان کو جب یہ کیفیت معلوم ہوئی تو راجپوتوں کی اس چالاکی پر حیران رہ گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ۷۰۴ھ میں علی بیگ اور ترپال خواجہ مغل نے کوہ ہمالہ کے اندر ہوکر اُس راستے سے جس راستے سے کہ سلطان محمود غزنوی اپنی فوج لے کر قنوج پر حملہ آور ہوا تھا ہندوستان پر حملہ کیا اور یکایک صوبہ روہیلکھنڈ میں پہاڑوں سے نکل کر دامن کوہ سے امروہہ تک کے علاقے کو تاخت و تاراج کر ڈالا۔ ان مغل سرداروں کے ساتھ چالیس ہزار فوج آئی تھی، سلطان نے غازی ملک تغلق کو جو سلطان کا امیر آخور تھا ان مغلوں کے مقابلہ پر بھیجا۔ غازی ملک تغلق نے پہنچ کر امروہہ میں ان کا مقابلہ کیا اس لڑائی میں مغلوں کو شکست ہوئی علی بیگ اور ترپال خواجہ دونوں سردار گرفتار ہوئے اور بہت سے مغل میدان میں مارے گئے، جو بھاگ کر اِدھر اُدھر منتشر ہوئے اُن کو چھوٹے چھوٹے سرداروں نے اپنے اپنے علاقوں میں گھیر کر کیفر کردار کو پہنچایا صرف چند شخص بچ کر ترکستان و خراسان میں بہزار خرابی پہنچے اور اپنی اس تباہی کی داستان سُنائی۔ چونکہ مغلوں کا یہ حملہ غیر متوقع اور ایک نئے راستے سے ہوا تھا اس لئے سلطان علاء الدین نے اپنا دارالسلطنت سے غیر حاضر ہونا مناسب نہ سمجھا اور یہ سُن کر کہ راجہ رتن سین نے چتوڑ کے قرب و جوار میں ڈاکہ زنی شروع کر دی ہے اور خضر خاں اُس کے تدارک طرف ملتفت نہیں ہوتا خضر خاں کو چتور کی حکومت سے معزول کرکے رتن سین کے بھانجے کو جو سلطان کی خدمت میں موجود تھا چتور کی سند حکومت دے کر بھیجا چنانچہ اُس نے جاتے ہی خضر خاں کو دہلی کی جانب رخصت کیا اور تمام راجپوتوں کو قہراً وجبراً یا محمت سے اپنی جانب مائل کر لیا رتن سین اور اُس کی رانی گمنامی کی تاریکی میں غائب ہو گئے۔ یہ اصل واقعہ تھا جس کو قصہ گویوں نے علاء الدین اور پدماوت کے عشق و حسن کی ایک عجیب و غریب داستان بنا دیا ہے

اور آج ہمارے ملک کا بچہ بچہ اس فرضی کہانی پر ایمان لائے ہوئے نظر آتا ہے۔ اس کہانی میں یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ راجپوتوں نے قید خانہ میں پہنچ کر رتن سین کی بیڑیاں کاٹیں اور اُس کو وہاں سے لے کر بھاگے لیکن سجان سنگھ بھنڈاری بٹالوی کہتا ہے کہ رانی کی مصنوعی سواری حوالیِ دہلی میں پہنچ کر رُک گئی اور وہیں سے سلطان کے پاس پیغام بھیجا گیا۔

"القصہ لشکر با دولہ با طے منازل و قطع مراحل نمودہ در حوالیِ دہلی رسیدہ منزل نمودند و سرداران لشکر بموجب تلقین آں بانوئے پُر فراست از زبان آں عصمت قباب سلطان را پیغام کردند"

پھر آگے چل کر سلطان کے اجازت دینے کا حال اِن الفاظ میں درج کرتا ہے کہ

"بے توقف و تحاشی و بلا تعلل و تامل رائے را خلاص دادہ ہمراہ کسان خود رواں ساخت بمجرد آنکہ رائے بہ لشکر خود ملحق گردید جوانان شجاعت نشان بکسان سلطان بجنگ پیش آمدہ اکثرے را بقتل در آوردند"

اس کہانی میں یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ سلطان خود اس کے بعد چتور پر حملہ آور ہوا اور قلعہ کو فتح کر کے رانی کو تلاش کرتا ہوا قلعہ میں داخل ہوا تو رانی چتا میں بیٹھ کر ستی ہو چکی تھی حالانکہ رتن سین کے دہلی سے بھاگ جانے کے بعد سلطان علاء الدین ہرگز دوبارہ چتور کی طرف نہیں گیا بلکہ رتن سین کے بھانجے کو چتور کا حاکم بنا کر بھیج دیا۔ دہلی سے فرار ہو کر رتن سین کو قلعہ چتور پر قابض ہونے کا موقع نہیں ملا۔ پھر بھلا قلعہ کے فتح کرنے اور قلعہ کے اندر رانی کے ستی ہونے کا واقعہ کس طرح صحیح تسلیم کیا جا سکتا ہے پھر لطف یہ کہ کوئی پدماوت کو رتن سین کی بیوی لکھتا ہے اور کوئی بیٹی بتاتا ہے۔ چتور کے متعلق آخری نتیجہ فرشتہ نے ان الفاظ میں لکھا ہے کہ

"پادشاہ بمقتضائے صلاح وقت قلعہ را از خضر خاں گرفتہ بخواہر زادہ رائے گریند پائے کہ در ملازمت پادشاہ بود و لوازم اخلاص بظہور می رسانید عنایت فرمود و او در اندک زمانے ورا کجا نہایت اقتدار بہم رسانید و جمیع راجپوتان بحکومت او راضی و با او متفق شدند و تا آخر حیات پادشاہ بر جادۂ عبودیت مستقیم بودہ ہر سال با تحف و ہدایائے آں ولایت آستاں بوس شہریار کامگار مشرف می گردید و با اسپ و خلعت خاصہ سرفرازی یافتہ بمقر خود مراجعت

می نمود و سہرگاہ بجائے نامزدی شد غاشیۂ عبودیت بردوش انداختہ با پنج ہزار سوار و دہ ہزار پیادہ دراں سفر حاضری گردید و جان سپاریہا می کرد۔"

۷۰۵ھ میں گنگ نامی مغل سردار نے ساٹھ ہزار سواروں کے ساتھ علی بیگ اور خواجہ ترپال کا انتقام لینے کے لئے حملہ کیا غازی ملک تغلق نے ان کا مقابلہ دریائے سندھ کے کنارے کیا۔ ساٹھ ہزار مغلوں میں سے صرف چار ہزار بچ کر فرار ہو سکے باقی سب مارے گئے اور ان کا سردار گنگ زندہ گرفتار کرکے دہلی بھیجا گیا۔ جہاں اُس کو ہاتھی کے پاؤں سے کچلوایا گیا اس کے بعد اقبال مند نامی مغل سردار نے حملہ کیا اس کو بھی غازی ملک تغلق نے جو دیپالپور میں مغلوں کے حملوں کو روکنے کے لئے متعین تھا۔ شکست دے کر قتل کیا اور بہت سے مغلوں کو گرفتار کرکے دہلی بھیجا جن کو ہاتھیوں کے پاؤں میں ڈالا گیا۔ ان پیہم شکستوں سے مغل بہت مرعوب ہوئے اور غازی ملک تغلق کی دھاک اُن کے دلوں پر بیٹھ گئی اور عرصہ دراز تک اُن کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔

ملک کافور ۷۰۹ھ میں سلطان نے ملک کافور کو ملک نائب کا خطاب دے کر خلعتِ فاخرہ اور سُرخ شامیانہ جو بادشاہ کے سوا دوسرا استعمال نہیں کر سکتا تھا عطا کیا اور تمام اُمراء سے اُس کا مرتبہ بلند کرکے سپہ سالاری اور وزارت عظمٰی کا عہدہ جلیلہ دے کر ایک لاکھ سواروں کے ساتھ ملک دکن کی جانب روانہ کیا اور ایک نہایت تجربہ کار وہوشیار امیر مسمٰی خواجہ حاجی کو اُس کے ہمراہ کیا اور عین الملک ملتانی حاکم مالوہ اور الپ خاں المخاطب بہ الغ خاں حاکم گجرات کے نام فرامین جاری کئے کہ اپنی اپنی فوج لے کر بطور کمکی ملک کافور کے ساتھ شامل ہو جائیں۔ ملک کافور ایک ناتجربہ کار ہندوزادہ نوجوان غلام تھا۔ وہ ہرگز قابلیت سپہ سالاری نہیں رکھتا تھا۔ لیکن بادشاہ کو اُس کی عزت افزائی مقصود اور اپنے اقبال سلطانی کا امتحان منظور تھا اسی لئے اُس کو سب سے بڑا عہدہ دے کر تجربہ کار اُمراء کو اُس کے ساتھ کیا کہ یہ مہم ملک کافور کے نام سے کامیاب ہو۔

اسی طرح اُس نے ایک مرتبہ اپنی ایک پرستار گل بہشت نام کو سپہ سالار بنا کر جالور کے راجہ کانیر دیو یا کنور دیو کے مقابلہ پر بھیجا تھا دکن کی جانب اس فوج کشی کا سبب یہ تھا کہ دیوگیر کا راجہ رام دیو جو علاقہ ایلچپور کی آمدنی اور مقررہ خراج برابر سلطان کی خدمت میں بھیجتا رہتا تھا۔ اُس نے ۷۰۶ھ یعنی تین سال سے خراج بھیجنا بند کر دیا تھا لہٰذا اُس کی

گوشمالی ضروری سمجھی گئی۔ فتح گجرات کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ گجرات کا راجہ کرن اپنی بیوی کملا دیوی اور خزانہ کو حملہ آوروں کے پنجہ میں چھوڑ کر دیوگیر کی جانب بھاگ گیا تھا۔ وہاں رام دیو کی مہربانی سے گجرات و دیوگیر کی سرحد پر مقام بگلانہ میں اُس کو جگہ مل گئی تھی۔ بگلانہ اور اُس کے مضافات پر وہ ایک چھوٹے سے رئیس کی حیثیت سے حکومت کرتا تھا۔ گجرات اسلامی حکومت میں شامل تھا اور الغ خاں ثانی اُس پر حکمران تھا بگلانہ اگرچہ ملک گجرات ہی کا ایک حصہ تھا مگر مسلمانوں نے راجہ کرن کو وہاں سے بے دخل کرنے کی اب تک مطلق کوشش نہیں کی تھی۔ ملک کافور اور خواجہ حاجی جب دہلی سے روانہ ہونے لگے تو کملا دیوی نے بادشاہ کی خدمت میں عرض کیا کہ میں جب گجرات سے آپ کی خدمت میں آئی تو اُس وقت میری ایک بیٹی راجہ کرن کے نطفہ سے چار سال کی تھی وہ اتفاقاً وہیں رہ گئی اور مجھکو معلوم ہوا ہے کہ وہ بگلانہ میں راجہ کرن کے پاس موجود ہے، آپ ایسی کوشش کریں کہ میری بیٹی جس کا نام دیول دیوی ہے میرے پاس آجائے اور میں اُس کو دیکھ کر اپنی آنکھیں ٹھنڈی کروں۔ بادشاہ نے فوراً ملک کافور اور خواجہ حاجی کو تاکید کردی اور الغ خاں حاکم گجرات کو بھی لکھا کہ جس طرح ممکن ہو دیول دیوی کو راجہ کرن سے حاصل کرکے دہلی بھجوادو۔ ملک کافور۔ خواجہ حاجی، عین الملک۔ الغ خاں، سب نے سرحد دکن پر جمع ہوکر مقام سلطان پور میں مقام کیا۔ رائے کرن اور رام دیو کو خطوط لکھ کر سلطانی احکام سے مطلع کیا اور راہ راست پر لانے کی کوشش کی۔ مگر ان خطوط کا جواب ان راجاؤں کی طرف سے حسب منشا نہ ملا تو الغ خاں نے کوہستان بگلانہ کی جانب اور ملک کافور و خواجہ حاجی نے دیوگیر کی جانب پیش قدمی کی۔ رام دیو کا بیٹا سنگل دیو دیول دیوی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا مگر راجہ کرن اس رشتے کو اس لئے ناپسند کرتا تھا کہ وہ رام دیو کو قوم کے اعتبار سے گھٹیا جانتا تھا۔ الغ خاں کے حملے سے مجبور ہوکر راجہ کرن نے دیول دیوی کو دیوگیر بھیج دینا اور سنگل دیو کے ساتھ شادی کرنا منظور کرلیا۔ چنانچہ سنگل دیو کا بھائی بھیم دیو اس لڑکی کو لینے کے لئے راجہ کرن کے پاس پہنچ گیا۔ الغ خاں دو مہینے تک راجہ کرن سے لڑتا اور اُس کا پہاڑوں میں تعاقب کرتا رہا۔ آخر مجبور ہوکر مغارات ایلورا کے متصل پہنچ کر اُس نے دو روز قیام کیا۔ اُس کی فوج کے کچھ سپاہی مغارات ایلورا کی سیر کرنے گئے وہاں اتفاقاً اُن کو دشمنوں کا ایک دستۂ فوج ملا جو دیول دیوی کا ڈولہ لئے ہوئے دیوگیر کی جانب جارہا تھا

مقابلہ ہوا۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کو مقتول و مفرور بنا کر دولہ پر قبضہ کر لیا اور الغ خاں کے پاس لے آئے وہ بہت خوش ہوا اور دیول دیوی کو بہ حفاظت دہلی کی جانب روانہ کیا۔ کملا دیوی بیٹی کو دیکھ کر خوش ہوئی اور اُس کی شادی خضر خاں ولی عہد سلطنت سے ہوئی۔

ملک کافور اور خواجہ حاجی نے دیوگیر کو فتح کر کے رام دیو کو اسیر کیا اور پادشاہ کی خدمت میں لے کر حاضر ہوئے۔ جب رام دیو گرفتار ہو کر دہلی پہنچا تو سلطان علاء الدین نے اُس کے ساتھ نہایت عزت و مرحمت کا برتاؤ کیا اُس سے اقرار اطاعت لے کر اور رائے رایاں کا خطاب دے کر چتر سفید عطا کیا اور دیوگیر کی ریاست پھر اُسی کو واپس دے کر گجرات کے ملک میں سے بھی ایک قلعہ بطور انعام اپنی طرف سے عطا کیا اُس کے تمام عزیز و اقارب اور بیٹوں کو بھی رہا کر کے نہایت تزک و احتشام کے ساتھ دیوگیر کی جانب رخصت کیا۔ اس کے بعد جب تک رام دیو زندہ رہا سلطان کا وفادار و خدمت گذار رہا جس زمانہ میں ملک کافور کو دیوگیر کی جانب روانہ کیا اُسی زمانہ میں قلعہ سیوانا کے راجہ ستیل دیو کی شکایت پادشاہ کے گوش گذار ہوئی۔ چنانچہ پادشاہ خود اُس کی طرف روانہ ہوا۔ ستیل دیو نے اپنی تمثال سونے کی بنوا کر اُس کے گلے میں زنجیر ڈال کر پادشاہ کی خدمت میں روانہ کی مگر پادشاہ نے اُس کی خطا اُس وقت تک معاف نہ کی جب تک کہ وہ خود گلے میں زنجیر ڈال کر حاضر نہ ہوا۔

۷۰۸ھ میں ایک حملہ ورنگل کے راجہ لدر دیو پر اس نواح کے شاہی سرداروں نے کیا تھا جس کا کوئی نتیجہ کامیابی کی شکل میں ظاہر نہ ہوا۔ یہ حملہ اڑیسہ کے راجہ کی ترغیب سے ہوا تھا جو سلطان علاء الدین کا مطیع و فرماں بردار تھا۔ ورنگل کی اس ناکام مہم کا حال سُن کر سلطان نے ۷۰۹ھ میں دوبارہ ملک کافور اور خواجہ حاجی کو روانہ کیا اور ملک کافور کو نصیحت کی کہ خواجہ حاجی کے مشورہ کے بغیر کوئی کام نہ کرے ساتھ ہی حکم دیا کہ اول دیوگیر پہنچو پھر وہاں سے ورنگل پر حملہ کرو یہ بھی حکم دیا کہ تم دیوگیر پہنچ کر اول لدر دیو کے پاس پیغام بھیجو کہ سلطانی اطاعت قبول کر کے اپنے اوپر خراج سالانہ تسلیم کرے اگر وہ اطاعت پر آمادہ ہو اور خراج گذاری کا وعدہ کرے تو اُس سے تعرض نہ کرو اور واپس چلے آؤ۔ اگر سرکشی پر آمادہ ہو تو اُس کو سزا دو۔ یہ فوج جب دیوگیر کے قریب پہنچی تو رام دیو نے اس کا استقبال کیا۔ ملک کافور کی خدمت میں حاضر ہو کر آداب و مجرا بجالایا شاہی لشکر کو اپنا مہمان کیا اور علامات خدمت گذاری کے اظہار میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ ہونے دیا۔ جب راجہ لدر دیو کی رعونت

و سرکشی دیکھ کر لشکر اسلام دیوگیر سے ملک تلنگانہ کی طرف روانہ ہوا تو رام دیو کئی منزل تک بطریق مشایعت لشکر کے ہمراہ آیا اور ملک کافور سے اجازت لے کر واپس ہوا۔ تلنگانہ کی حدود میں داخل ہوتے ہی لشکر اسلام نے قلعوں اور شہروں کو فتح کرنا شروع کیا ارد گرد کے کئی راجہ چھوٹے چھوٹے رئیس لدر دیو کے پاس شہر ورنگل میں جمع ہو گئے۔ ورنگل کے قریب سب نے شکست کھائی اور لدر دیو معہ اپنے رفیقوں کے قلعہ ورنگل میں محصور ہو گیا کئی راجہ اور رئیس گرفتار ہوئے اور بہت سے آدمی لڑائی میں مارے گئے۔ آخر محاصرہ کی شدت اور اپنی کمزوری کے احساس پر لدر دیو نے ملک کافور کی خدمت میں عاجزانہ درخواست بھیجی۔ اور اطاعت و فرماں برداری کا اقرار کر کے تین سو ہاتھی سات ہزار گھوڑے بہت سا سونا چاندی قیمتی تحفے بطور نذرانہ پیش کئے اور ایک معقول زر خراج اپنے اوپر تسلیم کر کے بلا عذر و حیلہ سال بسال بھیجتے رہنے کا وعدہ کیا ملک کافور یہ تمام سامان لے کر دہلی کی طرف واپس ہوا اور تمام مال غنیمت پادشاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ اس طرح ملک دکن کا ایک بڑا حصہ سلطنت اسلامیہ میں شامل ہو گیا۔ مگر کنارہ، میسور، ملیبار، وغیرہ یعنی دکن کا انتہائی جنوبی حصہ باقی رہ گیا تھا۔ سلطان علاء الدین نے مناسب سمجھا کہ اس حصے کو بھی فتح کر کے آئندہ خطرات کا بالکل خاتمہ کر دیا جائے اور ہندوؤں کی طرف سے بالکل مطمئن ہو کر مغلوں کے مقبوضہ علاقوں پر شمال کی جانب فوجیں بھیجنے کی سہولت بہم پہنچائی جائے۔ چنانچہ اس نے ۷۱۰ھ میں تیسری مرتبہ پھر ملک کافور اور خواجہ حاجی کو دکن کی جانب فوج دے کر روانہ کیا۔ اس مرتبہ بھی لشکر شاہی دیوگیر ہوتا ہوا دکن کی جانب گیا۔ اب دیوگیر کے راجہ رام دیو کا انتقال ہو چکا تھا اس کی جگہ اس کے بیٹے کو سند حکومت دے دی گئی تھی۔ اس لشکر نے اول کنارہ کا علاقہ فتح کیا پھر کرناٹک اور ملیبار وغیرہ کو وہاں کے راجہ بلال دیو سے فتح کر کے راس کماری تک پہنچا۔ انتہائی جنوبی راس پر جس کو سیت بندرا میشور کہتے تھے ایک چھوٹی سی پختہ مسجد گچ و سنگ سے بنوائی جو تاریخ فرشتہ کی تصنیف کے زمانہ تک موجود تھی فرشتہ لکھتا ہے کہ

> "مسجدے مختصر از گچ و سنگ مرتب ساختہ بانگ اذان محمدی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم در آنجا گفتہ خطبہ پادشاہ علاء الدین خواندند و تا ایں زماں کہ خامۂ عنبریں شمامہ در تحریر ایں وقائع است آں مسجد در نواحی سیت بندرا میشور موجود است و مسجد علائی مشہور است۔"

راس کماری سے لشکر اسلام ساحل کارومنڈل کی طرف متوجہ ہوا اور اس طرف کے بھی
تمام راجاؤں سے خراج وصول کرتا اور اقرار اطاعت لیتا ہوا سنہ ۷۱۱ھ میں دہلی پہنچا۔ اس
طرح کوہ ہمالہ سے راس کماری تک اور خلیج کنبایت سے خلیج بنگالہ تک تمام براعظم ہند
اسلامی شہنشاہی میں شامل ہوگیا۔ سنہ ۷۱۱ھ میں جب شاہی لشکر دیوگیر ہوتا ہوا ملک کنارہ
میں داخل ہوا تھا تو رام دیو کے بیٹے سے جو چند ہی روز پیشتر اپنے باپ کا قائم مقام ہوا تھا
کچھ خودسری کے آثار محسوس ہوئے تھے۔ سنہ ۷۱۲ھ کے ابتدا میں اس کی نسبت شکایات پہنچیں اور
ساتھ ہی تلنگانہ کے راجہ لدر دیو کی عرضی آئی کہ میں نے نائب ملک (ملک کافور) کے ذریعے
خراج گذاری اور فرماں برداری کا اقرار نامہ لکھ کر پادشاہ کی خدمت میں بھجوا دیا ہے میرے پاس
تین سال کا خراج جمع ہوگیا ہے یا تو سلطان مجھ کو اجازت دیں کہ میں وہ خراج دیوگیر بھجوا دوں
تاکہ وہاں کے سالانہ خراج کے ہمراہ شاہی خزانہ میں پہنچ جائے یا سلطان کسی سردار کو یہاں
بھیج کر براہِ راست زرِ خراج منگوالیں۔ اس عرضی اور دیوگیر کے راجہ کی بے راہ روی کی خبر کے
پہنچنے پر سلطان علاء الدین نے سوچا کہ دکن کے علاقوں کی نگرانی اور دکن میں امن و امان قائم
رکھنے کے لئے ایک ویسرائے یا نائب السلطنت کا دکن میں موجود رہنا ازبس ضروری ہے
چنانچہ اس نے چوتھی مرتبہ سنہ ۷۱۲ھ میں ملک کافور کو یہ حکم دے کر بھیجا کہ تم مقام ایلچپور میں جو
براہِ راست شاہی مقبوضہ اور اب تک ریاست دیوگیر کے زیر اہتمام رہا ہے پہنچ کر قیام کرو۔
لدر دیو اور دکن کے راجاؤں سے خراج وصول کرکے بھیجنا اور وہاں کے انتظام کو درست
رکھنا تمہارا کام ہوگا اور اگر رام دیو کا بیٹا راہِ راست سے منحرف ہوگیا ہو تو اُس کو قتل یا
گرفتار کرکے تم دیوگیر کو اپنی قیام گاہ بناؤ اور اُس علاقہ میں اپنی طرف سے اُمراء اور صوبہ دار
مقرر کردو۔ ملک کافور نے رام دیو کے بیٹے کو جو واقعی منحرف ہوچکا تھا جاتے ہی قتل کیا اور
تمام علاقہ مرہٹ میں گلبرگہ۔ مدکل اور رائچور تک اپنے اہل کار و اُمراء مقرر کردیئے۔ راجاؤں
سے خراج وصول کرکے دہلی بھیجا اور ملک دکن میں ہر جگہ شاہی تھانے قائم کردیئے اور
اس کے بعد کسی راجہ کی یہ ہمت نہ رہی کہ مسلمانوں کی اطاعت و فرماں برداری کے سوا
سرکشی و خودمختاری کا خیال تک دل میں لاسکے۔ اس طرح سنہ ۷۱۲ھ میں اسلامی سلطنت
کا غلبہ تکمیل کو پہنچ کسی ہندو طاقت کا کوئی خطرہ مسلمانوں کے لئے باقی نہ رہا۔ اگرچہ دکن کا
تمام ملک بخشی فوج خواجہ حاجی کی اعلیٰ قابلیت سے فتح ہوا۔ مگر سلطان علاء الدین کا تکلف

دیکھیے کہ اُس نے مرہٹ و گونڈوانہ سے راس کماری تک کا تمام ملک ملک کافور کی سرداری میں فتح کرایا اور آخر میں اُسی کو ملک دکن کا وائسرائے بھی بنایا۔

دکن کی فتوحات اور مال و دولت کی فراوانی نیز ہندو راجاؤں کے دہلی میں باربار آنے اور خلعت و خطاب و انعام و اکرام پاکر واپس جانے کا یہ اثر ہوا کہ دہلی میں ہندو ساہوکاروں کے حوصلے بڑھ گئے جن میں شاکت مت کے پیرو اور بام مارگی بھی شامل تھے ان لوگوں نے اپنے شرم انگیز اعمال و افعال کا ارتکاب بطور مراسم مذہبی شروع کیا اور اتفاقاً اس کی اطلاع سلطان کے کانوں تک بھی پہنچ گئی۔ ان لوگوں کو اُس زمانہ میں لا مذہب۔ بدھ اور اباحتی کے نام سے پکارا گیا۔ سلطان نے ان لوگوں کو گرفتار کرنے اور عبرت انگیز سزائیں دینے کا حکم دیا۔ اِس داروگیر کا اثر یہ ہوا کہ اس بداعمال و بدافعال گروہ کا نام و نشان دہلی سے مٹ گیا۔ سلطان کے اسی ایک کام کو اگر کوئی شخص چاہے تو مذہبی مداخلت قرار دے لے ورنہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ سلطان علاء الدین یا کسی دوسرے مسلمان سلطان نے کبھی کسی ہندو کو اُس کے دین و مذہب سے پھیرنے یا زبردستی مسلمان بنانے کی کوئی کوشش کی ہو اگر ایسا ہوتا تو آج ایک بھی ہندو اس ملک میں نظر نہ آتا۔ سلطان علاء الدین کی اس مداخلت مذہبی کا حال ضیاء برنی نے اپنی تاریخ میں اس طرح لکھا ہے۔

> "و ہم در میانِ سنوات مذکور در شہر اباحتیان و بدھ گان پیدا آمدند سلطان علاء الدین فرمود تا بہ تتبع و تفحص بلیغ ہر ہمہ را بدست آوردند و بہ بدترین سیاست بکشتند۔"

ضیاء برنی ان لوگوں کے افعال ناستودہ کا کوئی ذکر نہیں کرتا لیکن فرشتہ ان کے اعمال ناشایستہ کی طرف بھی اشارہ کرتا اور کہتا ہے کہ

> "بسمع سلطان رسید کہ جمعے از مردم اباحتیان در دہلی جمع گشتہ اند و در سالے یک شب چنانکہ داب ایشان است مجمعے ساختہ با زنان و خواہر و مادر و جمیع محارم فراہم می آیند سلطان ارہ سیاست بر فرق ایشان کشیدہ اثرے ازاں جماعت نگذاشت۔"

مرض الموت

سلطان نے جب ملک کافور کو چوتھی مرتبہ دیوگیر کی جانب رخصت کیا ہے تو وہ بیمار تھا اور اپنی بیوی اور بیٹوں سے بہت ناراض تھا کیونکہ وہ ان

بیماری میں سلطان کی تیمارداری کی کچھ زیادہ پرواہ نہ کرتے تھے اُدھر ملک کافور کے اس اثر و اقتدار کو بھی سب ناپسند کرتے تھے مگر سلطان کی وجہ سے دم بخود تھے۔ ملک کافور کو ایک نامرد غلام سمجھ کر تمام سردار بہ نظر حقارت دیکھتے اور کسی تکریم و التفات کا مستحق نہ سمجھتے تھے سلطان کو اس بات کی ضد تھی کہ میں چونکہ اس کے حال پر مہربان ہوں لہٰذا سب کو اس کی عزت کرنی چاہیئے۔ اسی لئے اُس نے تمام اُمراء سے اُس کا مرتبہ بلند کیا اور اُسی کے ہاتھ پر دکن کا تمام ملک فتح کرایا۔ صرف خواجہ حاجی بخشی فوج ہی ایک ایسا بے نفس اور نیک دل سردار تھا جو اس معاملہ میں بادشاہ کی منشاء کی تعمیل دل سے کرتا تھا اسی لئے بادشاہ نے ہر مرتبہ ملک کافور کے ساتھ اسی جہاں دیدہ اور سرد و گرم چشیدہ افسر کو بھیجا جس نے سلطان کی منشاء کے موافق اپنی قابلیت کا اظہار کیا۔ الغ خاں ثانی جو گجرات کا حاکم تھا ملک کافور سے بے حد متنفر تھا۔ اسی طرح ولی عہد سلطنت خضر خاں اور بادشاہ کے دوسرے بیٹے بھی ملک کافور کو بڑی حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے بادشاہ چونکہ جاہل اور خوشامد سے جلد متاثر ہونے والی طبیعت رکھتا تھا لہٰذا ملک کافور بادشاہ کی خوب خوشامد کرتا اور اپنی وفاداری و فداکاری کا یقین سلطان کو دلاتا رہتا تھا۔ ۷۱۵ھ سے سلطان گویا بالکل ملک کافور کے ہاتھ میں آ گیا تھا۔ اس چالاک غلام نے سلطان کے دل پر اپنا سکہ جما کر اُس کو دوسرے سرداروں اور بیٹوں کی طرف سے بدگمان کر دیا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ سلطان کے بیٹے تھے بھی نالائق ہی سلطان کے مرض میں طوالت ہوئی اور بیوی بیٹوں نے اس حالت میں سلطان کی تیمارداری اور اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کی لہٰذا سلطان پہلے سے بھی زیادہ کافور کی طرف ملتفت اور بیٹوں کی طرف سے متنفر ہوتا گیا۔ آخر ۷۱۶ھ میں سلطان نے ملک کافور کو دیو گیر سے اور الغ خاں کو گجرات سے طلب کیا۔ الغ خاں کو دہلی کی جانب روانہ ہونے میں دیر ہوئی اور ملک کافور پہلے پہنچ گیا، ملک کافور نے اس مرتبہ بادشاہ کو بیمار اور بہت ضعیف پایا اُس نے رات دن بادشاہ کی خدمت میں رہ کر اس کا دل اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور خضر خاں و شادی خاں دونوں بڑے شہزادوں کی طرف سے بادشاہ کو بدگمان کرنا شروع کیا ساتھ ہی الغ خاں کی شکایت و سعایت کا سلسلہ بھی جاری رکھا آخر نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ نے الغ خاں کو قتل اور خضر خاں و شادی خاں دونوں شہزادوں کو گوالیار کے قلعہ میں قید دینے کا حکم دیا ملک کافور نے دونوں شہزادوں کو گوالیار کے قلعہ میں بھیج کر قید کر دیا اور

اپنے آدمی بھیج کر الغ خاں کو جو دہلی کی جانب آرہا تھا راستے ہی میں قتل کرادیا۔ الغ خاں کے بعد اُس کے بھائی کو بھی قتل کرادیا۔

وفات

۶ر شوال ۷۱۶ھ کو رات کے وقت سلطان علاء الدین نے وفات پائی بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ملک کافور (ملک نائب) نے بادشاہ کو زہر دے کر مار ڈالا ملک کافور نے پہلے ہی یہ انتظام کر لیا تھا کہ ایک دستاویز لکھ کر سلطان کی مُہر اُس پر لگوالی تھی یہ دستاویز سلطان کی طرف سے جمع اُمرا کے نام تھی جس میں لکھا تھا کہ میں نے خضر خاں کو ولی عہدی سے معزول کر دیا ہے میرے بعد میرا سب سے چھوٹا بیٹا شہاب الدین تخت نشین کیا جائے۔ شہاب الدین کی عمر اس وقت پانچ چھ سال کی تھی ملک کافور کو پہلے ہی وزارت عظمیٰ کا عہدہ حاصل تھا۔ اُس نے ۷ر شوال کو دہلی کے موجودہ سرداروں کو دربار شاہی میں بلوا کر سلطان کا مذکورہ وصیت نامہ سُنایا اور اس چھوٹے بچے کو تخت پر بٹھا کر سب سے اُس کی بیعت کرائی اور کاروبار سلطنت اپنے ہاتھ میں لیا۔ سلطان علاء الدین کی سلطنت کے تمام حالات مختصر طور پر بیان ہو چکے ہیں پڑھنے والے خود نتائج اخذ کریں اس جگہ کسی ریویو یا تنقید و تبصرہ کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

شہاب الدین بن علاء الدین خلجی و ملک کافور

ملک کافور روزانہ تھوڑی دیر کے لئے شہاب الدین کو تخت پر لا کر بٹھاتا اور پھر اُس کی ماں کے پاس محل کے اندر بھجوا دیتا خود احکام و فرامین جاری کرتا۔ یوں سمجھنا چاہیئے کہ سلطان علاء الدین کے بعد ملک کافور ہی برِاعظم ہندوستان کا شہنشاہ بن گیا۔ اس نے گوالیار میں اپنے معتمدوں کو بھیج کر خضر خاں و شادی خاں دونوں شہزادوں کی آنکھیں نکلوالیں خواجہ سراؤں اور ہندوؤں کو اپنا مصاحب و مشیر بنایا۔ ان ہی لوگوں کو بڑے بڑے عہدے دے کر ایسی تدبیریں سوچنے لگا کہ علاء الدین خلجی کے خاندان کی بیخ کنی کر کے بعد خود تاج شاہی سر پر رکھے۔ خاندان علائی میں صرف ایک شہزادہ مبارک خاں ایسا باقی رہ گیا تھا جس کی عمر سترہ اٹھارہ سال کی تھی اور اُس کی طرف سے اندیشہ ہو سکتا تھا چنانچہ اُس کو بھی ملک کافور نے قید کر دیا تھا اب اُس نے ایک روز قصر ہزار ستون کے محافظوں میں سے دو شخصوں کو مامور کیا کہ شہزادہ مبارک خاں کو قید خانہ میں جا کر قتل کر دیں یا اُس کی آنکھیں نکال لائیں ان دونوں شخصوں کو شہزادہ پر رحم آگیا اُنھوں نے دوسرے سپاہیوں کو بھی

اپنے مشورہ میں شریک کر کے اگلے روز جب کہ ملک کافور اپنے راز دار خواجہ سراؤں کے ساتھ چوسر کھیلنے میں مصروف تھا اُس پر حملہ کیا اور قتل کر ڈالا۔ اس طرح سلطان علاء الدین کی وفات سے ۳۵ روز کے بعد ملک کافور کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ قید خانہ سے شہزادہ مبارک خاں کو نکال کر ملک کافور کی جگہ شہاب الدین کا وزیر بنایا گیا۔ مبارک خاں نے دو مہینے تک اپنے چھوٹے شش سالہ بھائی شہاب الدین کی وزارت و نیابت کا کام انجام دیا۔ آخر اُمراء کے مشورہ سے اُس نے خود تختِ سلطنت پر بیٹھ کر تاج شاہی اپنے سر پر رکھا اور شہاب الدین بے گناہ کو بھی اندھا کر کے اپنے دونوں بڑے بھائیوں خضر خاں و شادی خاں کے پاس قلعہ گوالیار میں بھیج دیا۔ اس طرح یہ تینوں نابینا شہزادے گوالیار کے قلعہ میں جمع ہو گئے۔ مبارک خاں نے تاج شاہی اپنے سر پر رکھ کر اپنا لقب سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی رکھا۔

سُلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی

قطب الدین مبارک شاہ جب تخت نشین ہوا ہے تو سلطان علاء الدین کے دو تین اور بھی نہایت خورد سال چھوٹے چھوٹے بچے فرید خاں و منگو خاں و عمر خاں موجود تھے اُن کو اُس نے نہایت محبت اور غور و پرداخت کے ساتھ رکھا۔ لوگوں کو انعام و اکرام سے مالا مال کر دیا۔ اٹھارہ ہزار قیدیوں کو جو دہلی اور دہلی کے قرب و جوار میں قید تھے۔ رہا کر دیا۔ اور ایک حکم عام تمام ملک میں جاری کیا کہ ہماری تخت نشینی کی خوشی میں تمام قیدی آزاد کر دیئے جائیں۔ سلطان علاء الدین کی وفات کے بعد تین مہینے سے کچھ زیادہ دنوں تک جو بد انتظامی کاروبار سلطنت میں واقع ہوئی تھی اُس کا صرف یہ اثر ظاہر ہوا کہ گجرات کی فوج نے بوالغ خاں کے قتل کی وجہ سے ناراض تھی، بغاوت اختیار کی یہ بغاوت جلد فرو ہو گئی نیز دیوگیر و علاقہ مرہٹ میں رام دیو کے داماد ہرپال دیو نے علم بغاوت بلند کیا۔ باقی تمام انتظام ملک کا بدستور قائم رہا۔ قطب الدین مبارک شاہ کے تخت نشین ہوتے ہی بغاوتوں کے تمام امکانات جاتے رہے۔ عین الملک ملتانی کو گجرات بھیجا گیا اُس نے وہاں کی بغاوت کو فرو کیا اس کے بعد ظفر خاں کو جس کی بیٹی سے سلطان قطب الدین مبارک شاہ نے شادی کی تھی گجرات کا حاکم بنا کر بھیجا۔ ظفر خاں نے گجرات کا بہت اچھا انتظام کیا اور سرکشوں کا چُن چُن کر استیصال کیا۔

خسرو خاں اور حسام الدین گجرات کا ایک ہندو بچہ جس کو سلطان علاء الدین کے ایک سردار ملک شادی خاں نے پرورش کرکے اُس کا نام حسن رکھا تھا۔ سلطان نے اُس کو خسرو خاں کا خطاب دیا۔ اس خسرو خاں کی نسبت عام طور پر مورخین نے لکھا ہے کہ بروایا برواری قوم سے تعلق رکھتا' یعنی ملک کافور کا ہم قوم تھا۔ راجہ شیو پرشاد ستارۂ ہند اپنی تاریخ میں خسرو خاں کی نسبت لکھتے ہیں کہ

"اصل نام اس ہندو بچہ کا کسی تاریخ میں نہیں ملتا"

سجان رائے بھنڈاری بٹالوی اپنی تاریخ میں خسرو خاں کو "خدمت گار بچہ" لکھتا ہے خسرو خاں کا ایک اور بھائی بھی تھا جو خسرو خاں کی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا مگر اُس کا باپ دوسرا تھا۔ اُس کا نام حسام الدین تھا بادشاہ نے خسرو خاں اور حسام الدین دونوں ہندو بچوں پر خصوصی عنایت مبذول فرمائی۔ عہد علائی کے اکثر آئین منسوخ کردیئے مگر شراب خواری کے متعلق امتناعی حکم بدستور جاری رکھا۔ ملک دکن یعنی علاقۂ مرہٹ میں ہرپال دیو نے خوب طاقت حاصل کرلی تھی۔ تخت نشینی کے دوسرے سال قطب الدین مبارک شاہ خلجی فوج لے کر دہلی سے دیوگیر کی جانب روانہ ہوا۔ اور دہلی میں ملک شاہین نام ایک غلام کو وفاء الملک کا خطاب دے کر اپنا قائم مقام بنا گیا۔ دیوگیر پہنچ کر شاہی افواج نے ہرپال دیو اور اُس کے معاونین کو شکست دے کر گرفتار کیا۔ قلعہ دیوگیر کے دروازہ کے سامنے اِن باغیوں کو قتل کیا گیا۔ سلطان نے دیوگیر میں خسرو خاں کو وزارت کا عہدہ دے کر دکن کا انتظام سپرد کیا۔ ملک دکن میں جا بجا تھانے بٹھائے دیوگیر میں ایک مسجد تعمیر کرائی۔ خسرو خاں کو چتر دور باش عطا کرکے ملک کافور کی تمام املاک کا مالک قرار دیا اور ملک دکن کے تمام ماتحت راجاؤں کی نگرانی اور اُن سے خراج وصول کرنے کا اہتمام اُس کے سپرد ہوا ظفر خاں کو بلا جرم محض خسرو خاں اور اُس کے ہم قوموں کی شکایت پر قتل کراکر گجرات کی حکومت خسرو خاں کے بھائی حسام الدین کو سپرد کی۔ اس طرح گجرات و دکن پر ان دونوں ہندوزادوں کو متصرف و فرماں روا بنا کر خود دیوگیر سے دہلی کی جانب روانہ ہوا۔ اس جدید انتظام اور سفلہ پرستی سے اُمرا میں بڑی بددلی پیدا ہوئی۔ دیوگیر اور اُجین کے درمیان بعض اُمرا نے یہ سازش کی کہ سلطان قطب الدین کو قتل کرکے سلطان علاء الدین کے چچازاد بھائی ملک اسدالدین کو بادشاہ بنانا چاہیے۔ اس سازش کا حال سلطان کو معلوم ہوا تو اُس

نے مقام ساگون گھٹی میں ملک اسدالدین اور بعض دوسرے اُمرا کو قتل کرا دیا۔ اُجین پہنچ کر ایک سردار کو گوالیار روانہ کیا کہ خضر خان و شادی خاں و شہاب الدین کو جو اس سے پہلے اندھے ہو کر قید میں پڑے تھے قتل کر دے، چنانچہ ان تینوں شہزادوں کو گوالیار میں قتل کرا گیا۔ خضر خاں کی بیوی دیول دیوی کو دہلی بلوا کر قطب الدین مبارک شاہ نے اپنی بیوی بنا لیا۔ دہلی پہنچ کر بھی بعض اُمرا کو جن پر بغاوت کا شبہ ہو سکتا تھا قتل کرایا۔ چنانچہ وقارالملک شاہین بھی قتل ہوا۔ اب تمام برِاعظم ہند سلطان قطب الدین مبارک شاہ کے زیرِ نگیں تھا۔

گجرات میں حسام الدین نے اپنی قوم کے ہندوؤں کو اپنے گرد فراہم کر کے بڑے بڑے عہدے عطا کئے اور اس خیالِ خام میں مبتلا ہوا کہ خوب مضبوط ہو کر خود مختاری و بغاوت کا اعلان کرے ادھر خسرو خاں نے دکن میں گونڈوانہ کے راجہ سے بغیر اس کے کہ اس سے کوئی خطا سرزد ہوئی ہو ایک سو ایک ہاتھی چھین لیے۔ پھر میسور کے راجہ سے بیس ہاتھی اور بہت سا خزانہ زبردستی حاصل کیا اور ہندوؤں کو فوج میں بھرتی کر کے یہ تجویزیں اور مشورے کرنے لگا کہ ملک دکن میں خود مختار ہو کر مستقل سلطنت قائم کرے۔ ضیاء برنی سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی کی بدانتظامی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ

> "ترک دادن ضوابط علائی در مسلمانان فسق و فجور است و در ہندوان تمردی و سرکشی روئے نمود۔"

ملک کافور کے ہمدرد و ہوا خواہ جس قدر موجود تھے وہ سب کے سب خسرو خاں کے پاس آ کر جمع ہو گئے۔ ضیاء برنی خسرو خاں کی نسبت کہتا ہے کہ

> "شبہا مجلس خلوت می ساخت و بہ ابنائے ہندوئے خود و با چند لمغا کی از یاران ملک نائب کہ مجرم خود گردانیدہ بود اندیشہ بلغا کی (بغاوت) می کرد۔"

ادھر گجرات و دکن میں حسام الدین و خسرو خاں ہندوؤں کی سلطنت دوبارہ قائم کرنے کی تجویزیں کر رہے تھے ادھر دہلی میں سلطان نے نماز اور روزہ دونوں کو ترک کر دیا تھا اور لہو و لعب میں مصروف ہو کر سلطنت کے کاموں سے بے پرواہ ہو گیا تھا حسام الدین نے گجرات سے ایک مسخرہ کو سلطان کی خدمت میں بھیج دیا کہ وہ اس نوجوان سلطان کو لہو و لعب کی طرف متوجہ رکھے۔ ضیاء برنی دربارِ سلطانی میں اس مسخرہ کے مستولی ہونے کی نسبت کہتا ہے کہ

> "تو بہ نام گجراتی مسخرہ را در مجلس خود استیلا داد و آں بھنڈ کم اصل ملوک را نام نن

و مادر می گفت :

حسام الدین کی نسبت کہتا ہے کہ

"آں ءلد الزنا مرتد گشت و در گجرات مو لیشاوندو اقربائے خود را جمع کرد و جملہ برادران نام گرفتۂ گجرات را بر خوگر داورد و بغی ورزید و فتنہ انگیخت "

چونکہ گجرات میں طاقت ور اُمرائے سلطانی موجود تھے اُنھوں نے جب دیکھا کہ حسام الدین نے بغاوت و سرکشی کی پوری تیاری کر لی ہے تو وہ آپس میں متفق ہو کر اس بغاوت کے فرو کرنے پر مستعد ہو گئے اور حسام الدین کو ہاتھ پاؤں ہلانے کا موقعہ دیئے بغیر گرفتار کر کے سلطان کے پاس دہلی بھیج دینے میں کامیاب ہو گئے ان اُمرا کو توقع تھی کہ سلطان ہمارے اس حسنِ عمل سے خوش ہوگا لیکن سلطان بجائے خوش ہونے کے ناراض ہوا ان اُمرا کا مرتبہ گھٹا دیا اور حسام الدین کو عزت کے ساتھ اپنی مصاحبت میں داخل کر کے گجرات کی حکومت پر وحید الدین قریشی کو روانہ کیا۔ اس سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ گجرات میں ہندوؤں کی بغاوت کا خطرہ جاتا رہا مگر مسلمان اُمرا میں بددلی ترقی کرتی رہی۔

خسرو خاں کی خفیہ غداریاں

خسرو خاں نے دکن میں اپنی خود مختاری کا منصوبہ مستحکم کر کے بندرگاہوں کے مسلمان سوداگروں کے اموال چھیننے اور اُن کو قتل کرنے میں کوئی باک نہیں کیا اور اس بات کے درپے ہوا کہ شاہی سرداروں کو جو اُس کے ہمراہ تھے قتل کر کے علمِ استقلال بلند کرے۔ ان حالات کا علم چندیری کے عامل ملک تیمور اور ملک گل افغان اور ملک تلبغہ حاکم کڑا کو جو بطور کمکی مامور تھے معلوم ہوا اُنھوں نے خسرو خاں کو لکھا کہ ہم کو تمھاری نیت درست نہیں معلوم ہوتی اور ہمارے پاس ایسی شہادتیں موجود ہیں جن کی تردید نہیں کی جا سکتی لہٰذا مناسب یہ ہے کہ تم معبر و ملیبار کی جانب سے فوراً دیوگیر پہنچو اور تمام ہاتھی اور خزانہ جو تمھارے پاس جمع ہے دہلی کی جانب روانہ کرو۔ خسرو خاں نے اس میں لیت و لعل کیا مگر ان ہرسہ اُمرا نے نہایت مستعدی اور ہوشیاری کے ساتھ خسرو خاں کو مجبور کیا کہ وہ ہاتھ پاؤں نکالنے سے پیشتر دیوگیر میں واپس آئے اُدھر بادشاہ کو اطلاع دی کہ ہم نے خسرو خاں کے فاسد ارادوں سے مطلع ہو کر اُس کو دیوگیر میں مجبور کر کے بٹھا دیا ہے۔ شاہی فرمان پہنچا کہ اُس کو جس قدر جلد ممکن ہو بحفاظت ہمارے پاس پہنچا دو۔ چنانچہ پالکی میں سوار کر کے دیوگیر سے دہلی تک صرف آٹھ دن کے عرصہ میں خسرو خاں کو

پہنچا دیا گیا۔ خسرو خاں نے پادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر نمک حلال سرداروں کی شکایتیں کیں اور کہا کہ انھوں نے محض حسد اور رشک کی راہ سے مجھ کو بغاوت کے جرم میں متہم کیا ہے۔ ملک تیمور و ملک تلیغہ بھی بعد میں دہلی پہنچے اور تمام واقعات پادشاہ کو سنائے۔ ان کو امید تھی کہ پادشاہ اس حسن خدمت کے عوض کہ ہم نے فتنہ کو سر اُبھارنے سے پہلے ہی دبا دیا ہے ہمارا مرتبہ بڑھائے گا مگر پادشاہ نے خسرو خاں کی پُر فریب باتوں کو صحیح سمجھ کر ان امیروں کو مجرم قرار دیا۔ ملک تیمور کو چندیری کی حکومت سے معزول کر کے چندیری کا علاقہ خسرو خاں کی جاگیر میں شامل کر دیا اور ملک تلیغہ کو بندر گوا کی حکومت سے برطرف کر کے قید خانہ میں ڈال دیا دوسرے سرداروں کو بھی جنھوں نے خسرو خاں کے خلاف گواہیاں دی تھیں سزائیں دی گئیں۔ اس طرز عمل کا یہ اثر ہوا کہ اس کے بعد کسی کو بھی خسرو خاں یا اُس کے بھائی کے خلاف کوئی لفظ زبان تک لانے کی جرأت نہ رہی خسرو خاں کی جگہ دکن میں دوسرے سردار مامور کر دیئے گئے اور خسرو خاں بادشاہ کی خدمت میں رہ کر وزیر اعظم اور مدار المہام سلطنت کی حیثیت سے کار و بار سلطنت انجام دینے لگا۔ تمام سرداران سلطنت مجبوراً خسرو خاں کی رضا جوئی کو اپنی حفاظت کے لئے ضروری سمجھنے لگے۔ اب خسرو خاں کو احساس ہوا کہ دکن یا گجرات سے بڑھ کر مجھ کو دہلی میں سلطنت اسلامیہ کے برباد کر دینے کا موقع میسر آ سکتا ہے۔ چنانچہ اُس نے سلطان کو بالکل اپنے ہاتھ میں لینے کی بیش از بیش کوششیں کیں ملک کافور کے مشیر و ہوا خواہ ہندو سب اُس کے متوسلین میں شامل ہو گئے تھے ملک کافور اسی کی قوم اور اُسی کے وطن کا آدمی تھا۔ ملک کافور کی ناکامی و بربادی کی تمام کیفیت وہ دیکھ چکا تھا۔ روزانہ ملک کافور کے مکان میں جو آج کل خسرو خاں کا مکان تھا ہندو رات کے وقت جمع ہوتے اور مشورے کرتے تھے۔ خسرو خاں نے بڑی احتیاط اور نہایت چالاکی کے ساتھ تمام ان لوگوں کو جو اُس کے حصول مقصد میں سدراہ نظر آتے تھے ایک ایک کر کے دہلی سے جدا کر دیا کسی کو قید کسی کو قتل کرایا کسی کو دور و دراز کے صوبوں میں بھیج دیا۔ پُرانے زمانے کے اُن امیروں کو جن کو کسی نہ کسی وجہ سے سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی سے عناد تھا دہلی میں بلا کر عہدے سپرد کئے گئے۔ جن لوگوں پر سلطان قطب الدین نے ظلم کئے تھے اُن پر احسان و انعام کی بارشیں کر کے اپنا ہمدرد اور بعض کو راز دار بھی بنا لیا۔

اس خفیہ انتظام کے بعد خسرو خاں نے ایک روز پادشاہ کی خدمت میں عرض کیا کہ مجھ پر

حضور کی انتہا سے زیادہ مہربانیاں مبذول ہیں اور حضور کی نظر التفات کا نتیجہ ہے کہ میں ایک ادنیٰ درجہ سے ترقی کرکے وزارت عظمیٰ اور سلطنت کی مدار المہامی کے بلند ترین مرتبہ تک فائز ہو گیا ہوں تاہم قدیمی اُمراء مجھ کو خاطر میں نہیں لاتے کیونکہ جس طرح اور قدیمی اُمراء کے عزیز و اقارب اور رشتہ داروں اور ہم قوموں کی جمعیتیں شہر میں موجود ہیں میرے ہم قوموں اور رشتہ داروں کی کوئی جمعیت نہیں ہے۔ اگر بادشاہ اجازت مرحمت فرمائیں تو میں بھی اپنے رشتہ داروں کو شاہی انعام و اکرام اور منصب و جاگیر کی توقع دلا کر اپنے وطن سے بلواؤں اور اس طرح میرا اثر و اقتدار بھی میرے عہدے کے موافق شہر میں قائم ہو جائے اور بادشاہ جب مجھ کو کسی مہم پر مامور کرے تو میں اپنے ہم قوم لشکر کی مدد سے پوری آزادی اور اطمینان کے ساتھ اس مہم کو سر انجام دے سکوں، پادشاہ نے خسرو خاں کی اس درخواست کو بلا تامل بخوشی منظور کر لیا اور اس نے اپنے چچا رندھول اور جاہر دیو وغیرہ کو گجرات بھیج کر بیس ہزار گجراتیوں کو دہلی بلوا کر اپنی خاص فوج میں بھرتی کیا اور اسی قدر نواح دہلی کے ہندؤں کو اپنی جمعیت میں شامل کرکے چالیس ہزار کا لشکر نہایت خموشی کے ساتھ مرتب کر لیا۔ اس واقعہ کو ضیاء برنی ان الفاظ میں روایت کرتا ہے کہ:۔

"و پیش ازانکہ خسرو خاں عذر بہ کند پیش سلطان گذرانیدہ بود کہ من از دولت خداوند عالم بزرگ شدہ ام و در مہمات دور دست نامزد می شوم و ملوک و اُمراء خویش و قرابت و خیل خانہ دارند و من ندارم اگر مرا از پیش فرمان شود نیائے خود را در زمین گجرات بفرستم تا چند قرابت نزدیک مرا بہ اُمید مرحمت پادشاہ پیش گیرد بیار و سلطان مست و غافل آں ولد الزنا را اجازت دادہ او بدیں بہادہ برواران نام گرفتہ گجراتیان را برخود آوردہ بہادہ آنکہ قرابتیان من اندیشا نرا برمی کشید و ایشاں را زر و اسپ و جامہ می داد و با قوت و شوکت می گردانید۔"

فرشتہ لکھتا ہے کہ

"سلطان التماس او را مبذول داشتہ رخصت طلب ارزانی داشت خسرو خاں ہیں بہانہ اکثر ہندو ہائے گجرات را کہ اوقات گذران نداشتند بہرگونہ تسلی نمودہ قریب بیست ہزار گجراتی نزد خود جمع ساختہ بہرچہ داشت صرف ایشاں کردہ بااسپ و یراق ایشاں را آراستہ ساخت و قوت و مکنت تمام پیدا کردہ از گجراتیان

وغیرہ چہل ہزار سوار اعوان و انصار نزد او مجتمع گشت ۔

دہلی میں خود مختار اسلامی سلطنت کے قائم ہونے کے بعد یہ پہلا ہی موقع تھا کہ برّاعظم ہندوستان کے شہنشاہ کی اجازت سے چالیس ہزار سواروں کی ہندو فوج جمع ہوئی ملک بہاء الدین دبیر سے بادشاہ ناراض تھا اور اُس کو قتل کرنا چاہتا تھا خسرو خاں نے اُس کی سفارش کر کے اُس کو قتل ہونے سے بچا لیا اور اس احسان کے بعد اُس پر اور بھی احسانات کر کے اپنا ہواخواہ بنایا اسی طرح کئی مسلمان نالائقوں کو اپنے ظلِ حمایت میں لے کر سلطان کے خلاف سازشوں میں شریک کار بنایا۔

قاضی ضیاء الدین کا مخلصانہ مشورہ

دہلی کے با اثر امراء میں صرف ایک قاضی ضیاء الدین ایسا شخص تھا جو سلطان سے آزادانہ گفتگو کر سکتا اور سلطان کا سچا ہمدرد تھا۔ قاضی ضیاء الدین بادشاہ کا اُستاد اور قاضی خاں کے نام سے مشہور تھا۔ کوشک سلطانی یعنی قصر ہزار ستون کے دروازوں کی حفاظت بھی اُسی کے سپرد تھی۔ دہلی کے مسلمان ہندوؤں کے اس اقتدار اور اُن کی قوت و شوکت اور فاسد ارادوں سے واقف تھے مگر کسی کو یہ جرأت نہ تھی کہ سلطان کی خدمت میں خسرو خاں کے خلاف ایک لفظ بھی زبان تک لائے۔ ان ہی ایام میں سلطان بغرضِ شکار دہلی سے سرساوہ کی طرف گیا وہاں خسرو خاں اور دوسرے ہندوؤں نے ارادہ کیا کہ سلطان کو شکار کھیلتے ہوئے جنگل میں قتل کر دیا جائے مگر خسرو خاں کے بعض ہمدردوں نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ یہ کام ہم کو قصر سلطانی میں انجام دینا چاہیئے تاکہ دہلی پر قبضہ رہے۔ اگر یہاں قتل کیا گیا تو ممکن ہے کہ دہلی پر قبضہ کرنا دشوار ہو اور مسلمان سردار ہمارے تخت سلطانی تک پہنچنے سے پہلے مخالفت پر اُٹھ کھڑے ہوں۔ سلطان سرساوہ سے دہلی آیا اور قاضی خاں نے شہر کی عام افواہوں سے متاثر ہو کر سلطان کی خدمت میں عرض کیا کہ ہندو فوج کی کثرت خطرہ سے خالی نہیں ہے میں نے سُنا ہے کہ روزانہ خسرو خاں کے مکان میں ہندو جمع ہو کر مشورے کرتے ہیں اور خسرو خاں کا ارادہ ہے کہ سلطان کو قتل کر کے خود بادشاہ بن جائے آپ کم از کم اتنا تو کریں کہ خسرو خاں کی فوج کے بعض گجراتی ہندوؤں کو اپنے پاس تنہائی میں بُلا کر اُن سے اس معاملہ کی نسبت استفسار فرمائیں ممکن ہے کہ وہ رعبِ سلطانی سے پوست کندہ حالات بیان کر دیں اور کوئی فتنہ برپا ہونے والا ہے تو اُس سے آپ اپنی حفاظت کر سکیں اگر خسرو خاں بے گناہ ثابت ہو تو پھر سلطان کو موقع حاصل ہے

کہ اُن ۃ قدر دانی اُس کی عزت و مرتبہ میں اضافہ فرمائیں ابھی قاضی خاں اپنی بات ختم کرنے نہ پایا تھا کہ خسرو خاں بھی حاضر ہو گیا۔ سلطان نے قاضی خاں کے سامنے ہی خسرو خاں کو مخاطب کر کے کہا کہ تیری نسبت قاضی خاں ایسا ایسا کہہ رہا ہے۔ یہ سُن کر خسرو خاں مکار نے فوراً رونا شروع کر دیا اور رو رو کر کہنے لگا کہ یہ تمام مسلمان سردار اس لئے میرے دشمن ہو گئے ہیں کہ حضور نے مجھ کو سب سے بلند مرتبہ عطا کر دیا ہے یہ ضرور مجھ کو حضور کے ہاتھ سے قتل کرا کر رہیں گے اور جب تک مجھ کو آپ کے ہاتھ سے قتل نہ کرا لیں گے کبھی چین سے نہ بیٹھیں گے یہ کہہ کر اور بھی زیادہ زار و قطار رونے لگا اُس کو اس طرح روتا ہوا دیکھ کر بادشاہ کا دل بھی بھر آیا اور اُس کو اپنے سینے سے لگا کر کہنے لگا کہ تیری نسبت اور تیری قوم کی نسبت میں کسی کی شکایت کو ہرگز ہرگز صحیح نہیں سمجھ سکتا تجھکو بالکل مطمئن رہنا چاہئے یہ رنگ دیکھ کر قاضی صاحب پادشاہ کی حماقت پر افسوس کرتے ہوئے اپنا سا منہ لے کر چلے آئے اور اُن کو بھی خسرو خاں یا دوسرے ہندوؤں کی نسبت پادشاہ سے کچھ کہنے کی جرأت نہ رہی۔ فرشتہ کہتا ہے کہ

"پادشاہ را از گریہ او دل بدرد آمدہ او را در کنار گرفت و بوسہ بر رخسارہ اش دادہ گفت کہ خاطر جمع دارد"

شہادت اس واقعہ کے اگلے روز خسرو خاں نے زیادہ تامل کرنا مناسب نہ سمجھ کر سلطان کے قتل کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا اور رات کے وقت بعد عشاء قصر ہزار ستون کے بالا خانہ پر سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا نیچے دروازوں کی نگرانی اور پہرہ بدلوانے کے لئے قاضی خان موجود تھے۔ قرار داد کے موافق خسرو خاں کا چچا رندھول معہ جاہر دیو قاضی خاں کے پاس آیا اور پان کا بیڑا قاضی خاں کی خدمت میں پیش کیا۔ قاضی خاں رندھول سے بیڑا لینے لگے تو جاہر دیو نے جو رندھول کے ساتھ تھا نہایت پھرتی سے قاضی خاں کے پہلو میں خنجر بھونک کر اُن کو شہید کر دیا اور مسلح ہندوؤں کی ایک جمعیت نے فوراً داخل ہو کر پہرہ والوں کو قتل کرنا شروع کیا۔ جب شور و غوغا صحن میں بلند ہوا تو سلطان نے خسرو خاں سے پوچھا کہ یہ کیسا شور ہے، خسرو خاں فوراً اٹھ کر لب بام آیا اور تھوڑی دیر تامل کر کے سلطان کے پاس واپس گیا اور کہا کہ سلطانی اصطبل کے چند گھوڑے کھل گئے ہیں وہ صحن میں بھاگے بھاگے پھر رہے ہیں اور لوگ اُن کو پکڑنے کی کوشش

کر رہے ہیں اس لئے شور مچ رہا ہے۔ سلطان یہ سن کر مطمئن اور خسرو خاں سے باتیں کرنے میں مصروف ہو گیا اسی وقت جاہر دیو اور دوسرے ہندو جو اس کام پر مامور تھے بالاخانے پر چڑھنے لگے۔ زینہ کے دروازے پر ابراہیم اور اسحاق نامی دو پہرہ دار موجود تھے انھوں نے ان کو روکنا چاہا لہذا دونوں مارے گئے اور قاتلوں کی یہ جماعت اوپر چڑھ آئی ابراہیم اور اسحاق کے مزاحمت کرنے اور قتل ہونے کا شور چونکہ قریب ہی تھا سلطان کو کچھ شک پیدا ہوا قاتلوں کی اس جماعت کو بے محابا شمشیر بدست آتے ہوئے دیکھ کر سلطان فوراً اٹھا اور محل سرائے کی طرف بھاگنے لگا۔ خسرو خاں نے سمجھا کہ اگر سلطان محل سرائے کے اندر داخل ہو گیا تو پھر اُس کے پکڑنے اور قتل کرنے میں دقت ہوگی لہذا وہ فوراً سلطان کے پیچھے بھاگا اور محل سرائے کے دروازے میں داخل ہونے سے پہلے ہی سلطان کو جا لیا۔ سلطان اپنے سر پر لمبے لمبے بال رکھتا تھا خسرو خاں کے ہاتھ میں سلطان کے بال آ گئے۔ سلطان طاقتور تھا اُس نے فوراً خسرو خاں کو زمین پر پٹک دیا۔ مگر خسرو خاں نے سلطان کے بال نہ چھوڑے خسرو خاں نیچے پڑا تھا اور سلطان اُس کے اوپر تھا مگر بالوں کی وجہ سے اُٹھ کر بھاگ نہیں سکتا۔ اسی حالت میں جاہر دیو پہنچ گیا اور دونوں کو گتھم گتھا دیکھ کر رات کی تاریکی کے سبب متامل ہوا کہ کہیں میرے ہاتھ سے خسرو خاں زخمی نہ ہو جائے۔ خسرو خاں نے پکارا کہ میں نیچے پڑا ہوں میرے اوپر سلطان ہے جلدی اپنا کام کرو ورنہ میرا کام تمام ہو جائے گا۔ جاہر دیو نے سلطان کے پہلو میں خنجر بھونک دیا اور پھر اس کا سر کاٹ کر نیچے قصر ہزار ستون کے صحن میں اوپر سے پھینک دیا۔ اس کے بعد خسرو خاں، رندھول، اور جاہر دیو اور دوسرے ہندو محل سرائے سلطانی میں داخل ہوئے وہاں سلطان علاء الدین خلجی کی بیوی اور دوسری بے گناہ عورتوں کو قتل کر کے فرید خاں و منگو خاں و عمر خاں پسران سلطان علاء الدین کو قتل کیا اور خاندان علائی کے کسی متنفس کو زندہ نہ چھوڑا۔ اسی وقت جب کہ آدھی رات ہو چکی تھی تمام اُمراء کو قصر ہزار ستون میں بلاتوقف حاضر ہونے کا حکم بھجوایا۔ جب تمام اُمراء جمع ہو گئے تو ان سب کو گرفتار و نظر بند کر لیا۔ صبح ہوئی تو خسرو خاں نے تاج شاہی سر پر رکھ کر تخت سلطنت پر جلوس کیا۔ امراء نے اطاعت قبول کی جن کی نسبت کچھ شبہ تھا ان کو قتل کرا دیا۔ سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی شب پنجم ربیع الاول ۷۲۱ھ کو ہندوؤں کے ہاتھ سے شہید ہوا۔ چار سال اور چند ماہ سلطنت کی۔

خسرو خاں نمک حرام

ضیار برنی اپنی تاریخ میں اس حادثۂ الم انگیز کو درج کرتے ہوئے جو الفاظ استعمال کرتا ہے وہ انتہائی غیظ و غضب کا اظہار کر رہے ہیں ان الفاظ کا ترجمہ نہیں کیا جا سکتا۔

"وبعد آنکہ خسرو خاں و برداران از کار غدر فارغ شدند و ملوک و اُمرائے دولت بر بام ہزار ستون آوردند و در نظر خود داشتند و صبح بدمید و آفتاب برآمد خسرو خاں مابون خود را سلطان ناصر الدین خطاب کرد و آنچناں علام بچہ و برو از بچہ ولد الزنا از قوت برداران و ہندوان بر تخت علائی و قطبی بنشست و روزگار غدار بچہ بوبہ نا بکار شغال نزا و را بر جائے شیران شرزہ رواداشت و خوک بچہ و سگ صفت را بر تخت پیلان صف شکن براونگ صفدران تہمتن بہ پسندید و ہم در ساعت جلوس آں ملعون و ملعون بچہ و مابون و مابون زادہ فرمان داد تا چند نفر غلامان سلطان قطب الدین را کہ اختصاص ہرا و داشتند واز اُمرائے کبار شدہ بودند بگیرند و بکشتند در رمد بعضے از ایشاں را در خانہائے ایشاں کشتند و بعضے در سرائے آوردند و در گوشہ بروند و گردن زوند و خانماں وزنان و غلام و کنیزک ایشاں بہ برداران و ہندوان بخشیدند و خانہ قاضی ضیار الدین را با جمیع اسبابیکہ در خانہ موجود خارج از زن و بچہ کہ ہم در اول شب فرار نمودہ بودند بہ زد معول دادند"

خسرو خاں پہلے ہی تمام اہتمام کر چکا تھا جو صوبہ دار دور دراز کے صوبوں میں مامور تھے اُن کے اکثر عزیز و اقارب دہلی میں موجود تھے ان سب کی نگرانی اور دیکھ بھال کا بندوبست کیا گیا تاکہ یہ لوگ دہلی سے فرار نہ ہو سکیں اور وہ صوبہ دار اپنے ان عزیزوں کی وجہ سے سرکشی پر آمادہ نہ ہو سکیں جن لوگوں کے اہل و عیال دہلی میں نہ تھے ان کے بیٹوں یا بھائیوں کو خسرو خاں نے پہلے ہی سلطان قطب الدین کے حکم سے بطور یرغمال دہلی بلوا لیا تھا۔ لہذا اُس کو زبردست بغاوت کا اندیشہ نہ تھا۔ تمام صوبہ داروں میں سب سے زیادہ جس شخص کا خیال تھا وہ غازی ملک تغلق صوبہ دار دیبالپور تھا جو سلطان علاء الدین کے زمانے سے مغل افگنی کے سبب بڑی شہرت اور اثر رکھتا تھا۔ غازی ملک تغلق کا

ذکر اوپر آ چکا ہے اُس کا بیٹا ملک فخر الدین جونا خاں جو بعد میں سلطان محمد تغلق کے نام سے مشہور ہوا۔ دہلی میں موجود تھا۔ خسرو خاں نے تخت نشین ہوتے ہی ملک جونا خاں کو امیر آخور کا عہدہ عطا کیا اور اُس کی سب سے زیادہ دل دہی اور خاطر مدارات کرنے لگا تاکہ اُس کا باپ غازی ملک مخالفت پر آمادہ نہ ہو سکے۔ جاہر دیو کو جو قاضی خان اور سلطان قطب الدین خلجی کا قاتل تھا زر و جواہر سے تلوایا گیا۔ رندھول کو رائے رایاں کا خطاب ملا اپنے بھائی حسام الدین کو خان خاناں کا خطاب دیا قصر ہزار ستون اور سلطانی محل سرائے میں ہندو ہی ہندو نظر آنے لگے۔ دہلی میں پہلے ہی سے چالیس ہزار ہندو سواروں کی مسلح فوج موجود تھی۔ مسلمانوں کی کوئی طاقت دہلی میں باقی نہیں رکھی گئی تھی جو مسلمان موجود تھے اُن کو خسرو خاں نے اپنا ہم نوا بنا لیا تھا۔ اب بادشاہ ہو کر اُس نے ہندوؤں کی بھرتی شروع کر دی۔ ہندوؤں میں جا بجا خوشیاں منائی گئیں کہ دہلی پھر ہندوؤں کے قبضہ میں آگئی۔ دیول دیوی جو خضر خاں کے بعد سلطان قطب الدین مبارک شاہ کی بیوی بن گئی تھی اب سلطان کے قتل ہونے پر اُس کو خسرو خاں نے اپنی بیوی بنا لیا۔

اسلامی سلطنت کو ہندو سلطنت بنانے کے منصوبے

خسرو خاں کو اسلام سے پہلے ہی کوئی تعلق نہ تھا اب بادشاہ بننے کے بعد اُس نے اپنے نام کا تبدیل کرنا اس لئے مناسب نہ سمجھا کہ ملک میں بہت سے ایسے مسلمان، سردار موجود تھے جن کو وہ فریب دے کر اپنی مخالفت سے باز رکھنے کا خواہاں اور بتدریج اسلامی سلطنت کو خالص ہندو سلطنت بنانا چاہتا تھا۔ باوجود ان تمام احتیاطوں کے خسرو اور حامیان خسرو کی پست فطرتی اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ چنانچہ دہلی کی مسجدوں کو ہندوؤں نے مسلمانوں سے چھین لیا۔ مسجدوں کی محرابوں میں بُت رکھے گئے اور مسجدوں کو مندر بنا کر اُن میں گھنٹے بجنے اور بُت پجنے لگے۔ اذان کی آوازیں بلند ہونی موقوف ہوئیں پھر اس سے بھی بڑھ کر پاجی پن کی یہ حرکت ہوئی کہ مسلمانوں سے قرآن شریف زبردستی چھین چھین کر جمع کئے گئے۔ ان قرآن شریفوں کو ایک دوسرے پر رکھ کر خسرو خاں کے دربار میں چھوٹے چھوٹے چبوترے بنائے گئے اور اُن پر ہندو درباری بیٹھے۔ غرض ایسی ایسی کمینہ حرکات سرزد ہوئیں جن کے لکھنے کی تاب زبان قلم نہیں لا سکتی۔ خزانوں کے منہ ہندوؤں

کے لئے کھول دیئے گئے اور لاتعداد ہندو روزانہ آآکر فوج میں بھرتی ہونے لگے ملک جوناخاں ابن غازی ملک ڈھائی مہینے تک تو مجبوراً اس ہندوگردی کو دیکھتا اور برداشت کرتا رہا ایک روز موقعہ پاکر اور گھوڑوں کی ڈاک بٹھا کر وہ دہلی سے دیبال پور کی طرف بھاگا۔ چند گھنٹے کے بعد ملک جوناخاں کے فرار ہونے کا حال خسرو خاں کو معلوم ہوا، اُس نے تعاقب میں سوار بھیجے مگر وہ ملک جوناخاں کی گرد کو بھی نہ پاسکے۔

خسرو خاں کا قتل

ملک جوناخاں جب اپنے باپ غازی ملک کے پاس پہنچ گیا تو اُس نے خدا کا شکر ادا کیا اور اپنے ولی نعمت سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی کے خون کا انتقام لینے کے لئے تیار ہوا۔ ملتان کے امیر کو لکھا کہ فوج لے کر میرے شریک ہوجاؤ، تاکہ ہم دونوں مل کر خسرو خاں سے سلطان قطب الدین کا انتقام لیں۔ امیر ملتان نے لکھا کہ جو شخص دہلی کا پادشاہ ہو چکا ہے اُس کا مقابلہ ہم جیسے چھوٹے امیروں سے کہاں ہو سکتا ہے۔ غازی ملک نے ملتان کے ایک رئیس بہرام ایبہ نامی کو ایک خط لکھا کہ امیر ملتان امارت کے قابل نہیں رہا تم اُس کو قتل کرکے ملتان کی حکومت اپنے قبضہ میں لاؤ اور وہاں کی فوج لے کر میرے پاس چلے آؤ۔ بہرام ایبہ نے بآسانی حاکم ملتان کو قتل کیا اور فوج لے کر غازی ملک کے پاس دیبال پور چلا آیا۔ غازی ملک نے فوج لے کر دہلی کی طرف کوچ کیا۔ خسرو خاں نے یہ خبر سُن کر ایک زبردست فوج اپنے بھائی کی سرداری میں روانہ کی، سرستی کے قریب لڑائی ہوئی۔ خسرو خاں کی فوج شکست کھا کر بھاگی۔ غازی ملک سرستی سے روانہ ہوکر اندرپرست کے خرابے میں پہنچ کر خیمہ زن ہوا۔ خسرو خاں ہندوؤں کا لاتعداد لشکر لے کر شہر سے نکلا۔ غازی ملک نے مٹھی بھر مسلمانوں کے مقابلے میں یہ بے شمار ہندو فوج زود خورد کا ہنگامہ گرم ہونے پر کچھ بھی نہ کرسکی اور حواس باختہ ہوکر بھاگی۔ خسرو خاں جب دہلی سے غازی ملک کے مقابلہ کو نکلا تھا تو اُس نے تمام شاہی خزانے کو جو سلطان قطب الدین ایبک کے زمانے سے اب تک جمع ہوتا چلا آیا تھا نکلوا کر ہندوؤں کو تقسیم کرکے خزانہ میں جھاڑو دلوادی تھی اُس کو

غازی ملک کا خوف تھا اس لئے اُس نے یہ کہکر خزانہ ہندوؤں کو تقسیم کر دیا تھا کہ اگر ہماری فتح ہوئی تو تم اس روپیہ کو اپنی سہ سالہ پیشگی تنخواہ سمجھو اور اگر ہم مارے گئے تو کم ازکم روپیہ تو مسلمانوں کے ہاتھ نہ آسکے گا۔ خسرو خاں شکست خوردہ میدان سے فرار ہوکر ایک مقبرہ میں پناہ گزیں ہوا اور وہاں سے گرفتار کرکے قتل کیا گیا۔ غازی ملک نے دہلی میں آکر تلاش کیا کہ شاہی خاندان کا کوئی فرد چھوٹی یا بڑی عمر کا ملے تو اُس کو تخت پر بٹھائے مگر خسرو خاں پہلے ہی شاہی خاندان کو تخم سوختہ کرچکا تھا۔ لہٰذا غازی ملک نے تمام مسلمان سرداروں کو جمع کرکے کہا کہ بھائیو میں تو صرف سلطان قطب الدین خلجی کا انتقام لینے آیا تھا اپنا کام پورا کرچکا اب تم جس کو مناسب سمجھو پادشاہ بنالو۔ میں اُس کی فرماں برداری کے لئے کمربستہ ہوں۔ سب نے بالاتفاق غازی ملک ہی کو اپنا سلطان منتخب کیا اور وہ سلطان غیاث الدین تغلق کے نام سے دہلی کے تخت پر بیٹھ کر برّاعظم ہندوستان کا شہنشاہ بنا۔

قابل توجہ

سلطان قطب الدین ایبک کی وفات سے قریباً سو برس کے بعد سلطان علاء الدین خلجی کے زمانے میں مسلمان برّاعظم ہندوستان کے پورے رقبہ پر حاکم و فرماں روا اور قابض و متسلط ہو گئے۔ اس تکمیل فتوحات کے ساتھ ہی اُنھوں نے اپنی محکوم ہندو قوم کے افراد کو صدارت عظمیٰ اور سلطنت کی مدارالمہامی کا بلند ترین عہدہ عطا کر دیا۔ ہندو قوم میں ایسے بزرگ وجلیل عہدے کی قابلیت مفقود تھی۔ تاہم مسلمانوں نے فتوحات سے فارغ ہوتے ہی ہندو قوم کو اپنی سیرچشمی و فیاضی اور خوش اعتقادی کا جو عملی ثبوت دیا وہ ہندوؤں نے کیا دنیا کی کسی محکوم قوم نے کبھی اپنے فاتحین سے نہ دیکھا ہوگا۔ یہ رواداری اور یہ مساوات مسلمانوں کے سوا دنیا کی کسی قوم میں تلاش نہیں کی جا سکتی۔ ہندوؤں نے اس اعتماد اور اس فیاضی کے معاوضے میں جو چیز پیش کی اُس کی تفصیل ابھی اس باب کے آخری حصہ میں قارئین کرام ملاحظہ فرما چکے ہیں مسلمانوں نے تمام برّاعظم ہند پر قابض ومتصرف اور فرماں روا ہونے کے بعد کبھی ہندوؤں کو اپنے

مندروں میں عبادت کرنے اور گھنٹے بجانے سے نہیں روکا۔ لیکن خسرو خاں مرتد کی پنج ماہہ سلطنت میں ہندوؤں نے چیرہ دست ہوکر مسلمانوں کے معبدوں یعنے مسجدوں اور ان کی مذہبی کتاب قرآن مجید کے ساتھ جو سلوک کیا وہ ۱۲۷۴ھ تک کے ہندو حوصلوں کی بخوبی خبر دیتا ہے۔ سبحان رائے بھی چونکہ ہندو تھا لہٰذا اُس کو اپنے ہم مذہبوں کی اِس سفلہ مزاجی اور رذیلانہ حرکات کا حال معلوم کرکے ضرور شرم آئی ہوگی اسی شرم وندامت کے تقاضے سے اُس کو اپنی تاریخ میں خسرو خاں کی نسبت یہ اشعار درج کرنا پڑے کہ ؎

کسے را کہ نبود شرف در نہاد   نباشد عجب گر بود بدنہاد
سرِ ناکساں را برافراشتن   وزایشاں اُمید بہی داشتن
سررشتۂ خویش گم کردنست   بجیب اندروں مار پروردنست
دگر زندگانی توقع مدار   کہ در جیب و دامن وہی جائے مار

"آئینہ حقیقت نما"

جلد دوم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

جلد دوم

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا أَنْتَ مَوْلَانَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ۝

اللّٰھم صل علی سیدنا و مولٰنا محمد و آلہ وازواجہ واصحابہ اجمعین

امّا بعد

اس کتاب کی پہلی جلد کے شائع ہوتے ہی دوسری جلد کے لئے تقاضے شروع ہو گئے اور شاید ہی کوئی شخص ایسا ہو جو پہلی جلد پڑھ کر دوسری جلد کے جلد شائع ہونے کا خواہاں نہ ہوا ہو۔ میرے نام اور منیجر مکتبہ عبرت کے نام اس خواہش کو ظاہر کرنے والے خطوط اس کثرت سے آئے کہ اُن کی تعداد سیکڑوں سے گذر کر شاید ہزاروں تک پہنچ چکی ہے، اور ماہانہ رسالوں نے پہلی جلد کے متعلق جو شاندار تقریظیں شایع کیں وہ بھی میری توقع سے بہت بڑھ کر تھیں۔ ہندوستان کے عالی مقام اہلِ نظر اور مشاہیر علما نے بھی پہلی جلد کو ملاحظہ فرما کر جو گرامی نامے مجھ کو لکھے اُن سے میری ہمت میں طاقت اور حوصلہ میں رفعت پیدا ہوئی لہٰذا مجھ کو اقرار کرنا چاہیے کہ میں نے خونِ جگر پینے، آنکھوں کا تیل نکالنے اور بہت سی راتوں کو دن بنانے کا کافی بلکہ امید و استحقاق سے

زیادہ معاوضہ پالیا۔ مجھ کو اس بات کا بھی یقین ہو گیا کہ جو کام میں نے شروع کیا ہے وہ ملک و ملت کے لئے مفید اور نفع رساں ہے اور یہ سب کچھ خدائے تعالیٰ ہی کے رحم و کرم کا نتیجہ ہے۔ فالحمد للّٰہ رب العالمین

دوسری جلد کی اشاعت میں اس قدر طویل و صبر آزما توقف کیوں ہوا؟ اس کے جواب میں اپنی بے گناہی کی داستان سناتے اور اہمال و توقف کا اصل سبب بتاتے ہوئے شرم و حجاب مانع ہے آسانی اسی میں معلوم ہوتی ہے کہ مجرموں کی طرح عفو تقصیر کی درخواست کروں اور خدائے تعالیٰ پر بھروسہ کرکے احباب کی توقع دلاؤں کہ تیسری جلد کی اشاعت میں زیادہ توقف نہ ہوگا اور اس کے ساتھ ہی تاریخ ہند کی اشاعت کا سلسلہ بھی انشاء اللہ تعالیٰ ہو جائے گا۔

اس دوسری جلد میں سلطان محمد تغلق کے حالات نے زیادہ جگہ لے لی ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ کتاب کی ترتیب اور مضامین کے توازن و تناسب میں سقم پیدا ہو گیا ہے لیکن میں کسی غیبی تحریک سے مجبور اور سلطان ممدوح کے متعلق اس سے کم کلام کئے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔ میں نے صفحات کتاب میں بھی بار بار اس کی معذرت اور اپنی مجبوری ظاہر کی ہے ؎

دریں کتاب پریشاں نہ بینی از ترتیب ۔۔۔ عجب مدار کہ چوں حال من پریشاں ست
ہزار شکر کہ بایک جہاں پریشانی ۔۔۔ چو تار طرۂ دل دار عنبر افشاں ست

مجھ کو بے حد افسوس اس بات کا ہے کہ ضیائے برنی پر بہت کچھ گستاخانہ جرح و قدح کرنی پڑی اور ایک مرحوم (سلطان محمد تغلق) کے لئے دوسرے مرحوم (ضیائے برنی) کو میں نے آزردہ کیا۔ لیکن احقاق حق کے سبب مجبوراً فاش گفتاری سے کام لینا پڑا میں ضیائے برنی کو اپنا محسن سمجھتا اور اس کی کتاب تاریخ فیروز شاہی سے بہت کچھ بصائر و فوائد حاصل کرنے کا اقرار کرتا ہوں۔ الٰہی ضیائے برنی کی روح پر رحمتیں نازل کر اور اس کے گناہوں کو معاف فرما۔ آمین یارب العالمین۔ تاریخ فیروز شاہی ہندوستان کی تاریخوں میں بہت ہی بلند مرتبہ اور قابل قدر کتاب ہے اس کا صرف ایک حصہ جو سلطان محمد تغلق سے تعلق رکھتا ہے محل کلام اور پایۂ اعتبار سے ساقط ہے تاہم اس سے اس بات کا ثبوت ضرور بہم پہنچ جاتا ہے کہ آج کل گوری چٹی رنگت والے مورخین

اپنے سفید جھوٹ کو سچ کا جامہ پہنانے میں جس طرح کمال رکھتے ہیں اس طرح ضیائے برنی دروغ بافی کے فن میں کامیاب نہ ہوسکا۔ ضیائے برنی سخت مخالفت اور ناراضی کے باوجود محمد تغلق کے خلاف جو کچھ لکھ سکا اس کا اندازہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ میں اس کتاب میں خود ضیائے برنی ہی کے بیان سے اس کی تردید کرسکا اور کسی دوسرے کو بطور گواہ پیش کرنے کی بہت ہی کم ضرورت پیش آئی گویا کہ ؎

روز جزا جو قاتل دلجو خطاب تھا
میرا سوال ہی مرے خوں کا جواب تھا

کیا ضیائے برنی کے لئے یہ قابل فخر بات نہیں کہ اُس نے جب کسی نفرت یا عداوت کے جذبہ سے متاثر ہو کر ایک خاص موقع پر جھوٹ یا فریب سے کام لینا چاہا تو نئی روشنی کے چالاک مورخین کی طرح کامیاب نہ ہوسکا بلکہ اس کی کتاب کا وہ خاص حصہ کتاب کے باقی حصوں سے الگ اور عجیب نظر آنے لگا۔

میں اس جلد دوم کی تصنیف و ترتیب کے زمانے میں بھی حسب عادت خدائے تعالےٰ سے مسلسل دعائیں مانگتا اور اپنے کام میں امداد الٰہی طلب کرتا رہا ہوں اس وقت بھی جب کہ کتاب شائع ہونے والی ہے خدائے تعالیٰ ہی سے مدد کا طالب ہوں کہ میری یہ کوشش مثمر ثمرات خیر ہو۔ آمین۔

الٰہی مجھ کو، میرے والدین کو۔ میرے اعزہ واحباب اور اس کتاب کے پڑھنے والوں کو حسنات دارین عطا کر اللھم ربنا اٰتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الاخرۃ حسنۃ وقنا عذاب النار۔

اکبر شاہ خاں
نجیب آباد

آئینہ حقیقت نما

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ وآلہ واصحابہ اجمعین برحمتک یا ارحم الراحمین ۔

باب پنجم

سلطان غیاث الدین تغلق

جیسا کہ چوتھے باب میں ذکر ہو چکا ہے سلطان غیاث الدین تغلق سراسر جائز اور بجا طور پر ہندوستان کے تخت سلطنت پر بیٹھا اور کہا جا سکتا ہے کہ حق بحق دار رسید غیاث الدین تغلق کی قابلیت ملکداری کا اندازہ اس طرح بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے تخت نشین ہونے کے بعد بہت جلد حدودِ سلطنت میں ہر جگہ امن وامان قائم ہو گیا اور سلطنت کی ہر تبدیلی پر صوبوں اور دور دراز کے شہروں میں جو چل چل اور بدامنی پھیل جایا کرتی تھی اس کا صرف چند ہفتوں کے اندر کہیں نام ونشان بھی باقی نہ تھا۔ سلطان غیاث الدین تغلق نے خزانے کو بالکل خالی اور ملک کو سرکشی و بدامنی سے پُر پایا تھا لیکن اس کی خداداد قابلیت نے جس قدر جلد ملک میں امن وامان قائم کر دیا اسی قدر جلد خزانہ بھی معمور ہو گیا اور کسی پر کسی قسم کا کوئی ظلم وستم روا نہ رکھا گیا۔ سلطان تغلق کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ ہر کام میں اعتدال اور میانہ روی کو ملحوظ رکھتا اور رعایا کے آباد و خوش حال اور فارغ البال رکھنے میں بے حد ساعی رہتا تھا۔

ہندوؤں نے مسلمانوں کے احسان عظیم اور نوازش ہائے بے پایاں کے معاوضے میں اپنی احسان فراموشی اور محسن کشی کا جو ثبوت پیش کیا تھا وہ چوتھے باب کے آخری حصے میں بالتفصیل بیان ہو چکا ہے لہٰذا سلطان غیاث الدین تغلق اگر ہندوؤں پر ظلم و تشدد روا رکھتا اور اُن کے درپئے تخریب ہوتا تو کوئی موقع شکایت کا نہ تھا۔ لیکن سلطان ممدوح نے ہندوؤں پر کسی قسم کا کوئی ظلم و ستم قطعاً نہیں کیا۔ خسرو خاں نمک حرام کی خطا کو اس کی ذات تک محدود رکھ کر اُس کی قوم پروار کو بھی جو غالباً راجپوتوں کی قوم پنوار تھی کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچایا۔ عام ہندوؤں کو ہندو ہونے کی وجہ سے تو بھلا کیوں نقصان پہنچاتا ؟

ابھی تک زراعت پیشہ لوگ تقریباً سب ہندو تھے۔ ہر ایک گاؤں کا مقدم یا نمبردار بھی ہندو ہوتا تھا۔ کئی کئی گاؤں کے ذیلدار جو فوطہ دار کہلاتے تھے اور اپنے حلقے کے دیہات کا زر مال گذاری فراہم کرکے خزانہ شاہی یا خزانہ امارت میں داخل کرتے تھے وہ بھی سب ہندو ہی ہوتے تھے۔ ان فوطہ داروں کو وزیر اعظم کے دربار میں حاضر ہو کر عرض معروض کرنے کا حق حاصل تھا اور کبھی کبھی کسی امیر کے توسط سے دربار شاہی میں بھی اُن کو باریاب ہونے موقع مل جاتا تھا۔ بادشاہ جب کہ دارالسلطنت سے باہر دورہ پہ ہوتا تو ہر ایک نمبردار اور فوطہ دار بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور سب کچھ عرض کر سکتا تھا۔ چونکہ فوطہ دار کی رسائی دربار شاہی تک تھی اس لئے اُس کو سر پہ پگڑی اور کمر سے پٹکا باندھنا پڑتا تھا۔ کئی کئی فوطہ داروں کے علاقے ملاکر پرگنے اور عملے کہلاتے تھے ان پرگنوں یا عملوں کا تعلق اگر براہِ راست دفتر وزارت سے ہوتا تو اُن پر شاہی اہل کار عامل یا شقدار وغیرہ ناموں سے مامور و منصوب ہوتے اور اگر یہ پرگنے کسی شخص کی جاگیر ہوتے تو وہ جاگیردار امیر یا مقطع کہلاتا تھا۔ عاملوں اور شقداروں میں بھی اکثر ہندو ہوتے تھے اس پرگنے کے مرکزی مقام میں ایک مسلمان قاضی جو شاہی نوکر ہوتا انفصالِ خصومات اور مسلمانوں پر حدودِ شرعیہ جاری کرنے کے لئے رہتا تھا۔ لیکن جہاں مسلمانوں کی آبادی نہ تھی وہاں قاضی کی ضرورت نہ تھی۔ امارتیں اکثر مسلمانوں کو دی جاتی تھیں، یہی امیر بادشاہ کے فوجی افسر تھے۔ اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد سلطان غیاث الدین تغلق کے متعلق اس بات کا اندازہ کرنا کہ اس کا برتاؤ ہندوؤں کے ساتھ کیسا تھا۔ بہت آسان ہو جاتا ہے۔

سلطان تغلق نے قاعدہ مقرر کر دیا تھا کہ ہر فوطہ دار جس قدر زمین خود کاشت کر سکے

اس پر کوئی لگان سرکاری عائد نہ کیا جائے۔ کاشت کار کے معاملات بلا توسط مقدم اور مقدم کے معاملات بلا توسط فوطہ دار طے نہیں کئے جاتے تھے۔ مقدموں اور فوطہ داروں کو اس قسم کے حقوق و اختیارات حاصل تھے کہ ہر ایک مقدم اپنے گاؤں میں اور ہر فوطہ دار اپنے حلقے میں بادشاہت کرتے اور نہایت خوش حالی و فارغ البالی کے ساتھ رہتے تھے۔

سلطان اپنے امیروں کو بھی ہمیشہ یہی نصیحت کرتا رہتا تھا کہ اپنی جاگیروں میں زیادہ ستانی ہرگز نہ کرو بلکہ اپنے واجبی حق میں سے بھی کچھ چھوڑ دیا کرو۔ اسی طرح وہ سپاہیوں کے حقوق اور تنخواہوں میں بھی کسی کمی کا روادار نہ تھا۔ ایک مرتبہ اس نے اپنے امیروں اور سپہ سالاروں کو مخاطب کر کے کہا۔

"از اقطاعات خود طمعہائے اندک بکنید واز اں اندک چیزے برکناں خود مسلم دا بید واز مواجب حشم دانگ و درم طمع ندارید اگر از اں خود چیزے حشم را بدہید و یا ندہید آں بدست شما ست فاما آں مقدار کہ بنام حشم مجرئی شود و از اں چیزے شما توقع کنید نام امیرے و ملکے شمارا بزبان نباید راند امیرے کہ از مواجب چاکر چیزے بخورد خاک خورد بہتر از اں باشد۔ (ضیائے برنی)

سلطان غیاث الدین تغلق اپنی رعایا میں ہندو اور مسلمان دونوں کو خوش حال اور فارغ البال دیکھنے کا بے حد خواہشمند تھا۔ ضیاء الدین برنی کے الفاظ یہ ہیں:۔

"و عجب نیک خواہی عام کہ در ذات سلطان تغلق شاہ مجبول بودہ است کہ ہم اہل مملکت خود را آسودہ و غنی خواستے و محتاج و بے نوا نتوانستے دید در آں کوششے کہ رعایا و لشکرے و کل طوائف دیگر ہمیشہ در فراغ باشند و باراحت زیند و ایں عادت قدیم و عادت خوب سلطان تغلق شاہ بودہ است کہ رعایائے ولایت او و ملک او مسلمان و ہندو کارے و کسبے ورزیدتے و حراثتے کنند کہ از اں کار کسب آسودہ شوند و از احتیاج سوال و بیچارگی و درماندگی مضطر نشوند۔۔ در قسم مطالبات دیوانی آسان گیرتر از سلطان تغلق شاہ ہیچ پادشاہے در دہلی نبودہ است۔ و سلطان تغلق شاہ در قسم رعیت پروری گوئے سبقت از رعیت پروراں سلف و خلف ربودہ بود"

ہندؤوں کی بغاوتیں

جیسا کہ چوتھے باب میں بیان ہو چکا ہے ورنگل کے راجہ لدر دیو (رودر دیو) نے ۹۰۸ھ کے آخر ۷۱۰ھ کے شروع میں اطاعت و فرماں برداری کا اقرار نامہ لکھ کر تین سو ہاتھی سات سو گھوڑے بطور نذرانہ پیش کئے اور خراج سالانہ قبول کر کے اُس کی ادائیگی کا اقرار کیا تھا۔ ۷۱۰ھ میں اسلامی حکومت راس کماری تک تمام سعد ہندوستان پر مسلم و مستحکم ہو چکی تھی ۷۱۲ھ میں لدر دیو (رودر دیو) والی ورنگل کی عرضی دربار دہلی میں پہنچی کہ اپنا تین سال کا دنگی خراج اگر حکم ہو تو دیوگیر بھجوا دوں اس پر سلطان علاؤ الدین خلجی نے ایلچ پور کو دکن کا مستقر حکومت قرار دے کر وہاں اپنا ایک نائب السلطنت مقرر کرنا ضروری سمجھا۔ یہ تمام حالات باب چہارم میں بیان ہو چکے ہیں۔ سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی کے بعد خسرو نمک حرام کی وجہ سے ملک میں جو ابتری پھیل چکی تھی۔ اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رُدر دیو دس گیارہ سال کی اطاعت و فرماں برداری کے بعد سلطنت دہلی سے منحرف ہو گیا اور سلطان غیاث الدین تغلق کے تخت نشین ہونے کی خبر سن کر بھی اُس نے خود سری اور بغاوت پر قائم رہ کر مخالفت کا علم بلند کیا۔ قطب الدین ایبک کے زمانے سے اس علاقہ میں جو بعد کو علاقہ جون پور کہلایا ہندؤوں کی ایک ریاست کا دارالریاست مقام مینپھ (متصل جون پور) تھا اس وقت تک جون پور آباد نہیں ہوا تھا۔ اس ریاست کا راجہ جے چند والی قنوج کے خاندان سے تھا۔ قطب الدین ایبک نے جے چند کے مقتول ہونے کے بعد اس کے وزیر اور رشتہ دار جیت سنگھ کو ۵۹۱ھ میں یہ ریاست عطا کر دی تھی اسی وقت سے اس خاندان میں مینپھ (منبج) کی حکومت چلی آتی تھی اس وقت جو راجہ موجود تھا اُس کا نام سُکیت سنگھ تھا۔ سکیت سنگھ نے خسرو خاں کے دہلی پر قابض ہونے کی خبر سن کر ارد گرد کے علاقے کو بھی اپنی حکومت میں شامل کر لیا اور جب سلطان غیاث الدین تغلق کے تخت نشین ہونے کی خبر سنی تو علمِ بغاوت بلند کر کے اس نواح کے ہزارہا مسلمانوں کو محض مسلمان ہونے کی وجہ سے قتل کر ڈالا اور سیکڑوں برس کے اسلامی حقوق کو جو اُس پر ثابت تھے فراموش کر دیا۔ سلطان تغلق نے رُدر دیو اور سکیت سنگھ دونوں کی بغاوتوں کا حال سُن کر رُدر دیو کی تادیب کے لئے اپنے بڑے بیٹے الغ خاں (محمد تغلق) کو دکن کی جانب اور چھوٹے بیٹے ظفر خاں کو سکیت سنگھ کی سرکوبی کے لئے مشرق کی جانب روانہ کیا۔ ظفر خاں ابھی سکیت سنگھ تک پہنچنے نہ پایا تھا کہ اس نواح کے ایک

بزرگ شیخ صدر الدین قریشی نے سکیت سنگھ کو مبارزہ کی جنگ کے لئے دعوت دی اور یہ پیغام بھی بھیجا کہ ہم مباحثے اور مناظرے کے ذریعہ بھی تجھکو اسلام کی صداقت تسلیم کرا سکتے ہیں۔ سکیت سنگھ اس چیلنج کو منظور کر کے شمشیر اور تقریر دونوں مقابلوں میں ہار گیا اور اسلام کی صداقت کا قائل ہوکر اپنے کئے پر پشیمان ہوا تنے میں ظفر خاں بھی چھ ہزار کا لشکر لئے ہوئے پہنچ گیا اور اس باغی راجہ کو جو ہزارہا بے گناہ مسلمانوں کا خون بہا چکا تھا۔ صرف اسی قدر سزا دی کہ اس علاقے سے بے دخل کر کے ضلع مرزا پور میں ایک جاگیر عطا کردی اور پنیچھ یا پنج کا نام ظفر آباد رکھا۔ سکیت سنگھ کی اولاد میں جو شیخ ممدوح کے ذریعہ اسلامی صداقت کو تسلیم کر چکا تھا آج تک ضلع مرزا پور کے خان ناموے موجود ہیں۔ اس بغاوت کا تو یہ انجام ہوا اب دکن کی بغاوت کا حال سنو۔

مہم دکن کی ناکامی

محمد تغلق دکن پہنچا۔ ردر دیو بھی غافل نہ تھا اس نے اردگرد کے راجاؤں کو اپنے ساتھ ملاکر بغاوت پر آمادہ کرلیا جب اسلامی لشکر پہنچا تو ردر دیو سے میدانی جنگ میں کچھ نہ ہو سکا۔ آخر قلعہ ورنگل میں جہاں پہلے سے کافی سامان رسد جمع کرلیا گیا تھا دوسرے راجاؤں کو بھی ہمراہ لے کر محصور ہو گیا۔ محمد تغلق نے سختی سے قلعہ کا محاصرہ کیا۔ قلعہ میں جنگجو ہندوؤں کی زبردست اور عظیم الشان فوج موجود تھی۔ روزانہ اندرونی و بیرونی فوجوں کی آویزش اور زد و خورد کا ہنگامہ برپا رہنے لگا چند روزہ کوشش سے ورنگل کے قلعہ کی بیرونی فصیل پر جو مٹی کی بنی ہوئی تھی اسلامی لشکر کا قبضہ ہو گیا۔ اور ردر دیو نے یہ دیکھ کر کہ مسلمان اندرونی پختہ فصیل کو بھی ضرور فتح کرلیں گے محمد تغلق کے پاس اپنے ماتحت راجاؤں اور بڑے بڑے زبان آور سیٹھوں کی ایک جماعت بطور پیغام رساں بھیجی۔ اُن لوگوں نے ردر دیو کی طرف سے پیغام پہنچایا کہ میں جس طرح پہلے سلطنت دہلی کو باج و خراج ادا کرتا تھا اب بھی ادا کروں گا آپ خراج کا تعین فرماکر اور مجھ سے مصارف جنگ اور نذرانے کر واپس چلے جائیں میں جسب سابق مطیع و فرمانبردار رہوں گا۔

"رائے ارنگل و مقدمان او بصلح پیش آمدند و سیٹھاں باخدمت ہا بخدمت سلطان محمد فرستادند و مال و پیل و جواہر و نفائس قبول می کردند و خواستند چنانکہ ملک نائب ما در عہد علائی مال و پیل و جواہر دادہ بودند د

خراج قبول کردہ و باز گردانیدند سلطان محمد راہم بدہند و باز گردانند"

(ضیائے برنی)

محمد تغلق نے کہا کہ پہلے بھی سلطان علاء الدین خلجی کے زمانے میں ورنگل کے قلعہ کو فتح نہیں کیا گیا تھا صرف اقرار اطاعت اور باج وخراج کا وعدہ لے کر لشکر اسلام واپس ہو گیا تھا۔ لہٰذا اب اس قلعہ کا فتح کر لینا ضروری ہے تاکہ پھر یہ خیال خام موجب بغاوت نہ ہو سکے کہ ورنگل کا قلعہ ناقابل فتح ہے۔ اس جواب کو سن کر ایلچی واپس گئے مگر کوئی ایسی چھچھوندر چھوڑتے گئے کہ لشکر اسلام میں بغاوت کے شرارے بلند ہونے لگے۔ محمد تغلق کے لشکر میں ضیاء برنی۔ فرشتہ خواجہ نظام الدین احمد وغیرہ مورخین کے بیان سے ثابت ہے۔ اکثر امرا ایسے تھے جو خاندان خلجیہ کے عہد میں بھی برسر اقتدار تھے اور سلطان غیاث الدین تغلق نے اُن کے عہدوں اور مرتبوں کو برقرار رکھا تھا۔ رودردیو مدت سے برابر سلطنت خلجیہ کا مطیع وخراج گذار چلا آتا تھا۔ سلطان علاء الدین خلجی نے ملک نائب (ملک کافور) کو حکم دیا تھا کہ رودردیو کو اسیر و دستگیر یا قتل کرنا ہرگز ضروری نہیں ہے اگر وہ اپنے اوپر خراج قبول کرکے فرماں بردار رہنے کا اقرار کرے تو اس سے کوئی تعرض نہ کیا جائے چنانچہ ایسا ہی ہوا اور رودردیو دولت خلجیہ کے فرماں برداروں اور وفاداروں میں شامل رہا۔ اب جو سلطان تغلق سے باغی ہو کر محصور ہوا تو محاصرہ فوج میں خاندان خلجی کے وفادار سردار موجود تھے جو رودردیو کے خواجہ تاش کہے جا سکتے تھے ان سرداروں پر ڈورے ڈالنے میں اس کو کامیابی حاصل ہوئی اور ان سیٹھوں اور ایلچیوں نے جو پیغام صلح لے کر آتے تھے مخالف جواب پاکر محمد تغلق کی فوج کے مذکورہ سرداروں سے جو کچھ کہنا تھا کہہ دیا چنانچہ ملک تیمور، ملک تگین، ملک کافور مہردار، ملک مل افغان وغیرہ اپنی اپنی جمعیت کو لے کر اور محمد تغلق سے جدا ہو کر چل دیئے جو تھوڑے سے آدمی محمد تغلق کے رہ گئے وہ بھی یہ رنگ دیکھ کر ہمت ہار گئے۔ محمد تغلق بھی مجبوراً محاصرہ اٹھا کر دیو گیر کی طرف چلا۔ رودردیو نے اس مناسب موقع سے فائدہ اٹھانے میں تامل نہیں کیا فوراً اپنی پوری طاقت کے ساتھ قلعہ سے نکل کر محاصرہ فوج پر جو پہلے ہی محاصرہ چھوڑ کر جا رہی تھی حملہ آور ہوا۔ محمد تغلق نے نہایت پریشان وخستہ حالت میں دیو گیر جا کر دم لیا۔ اُس کے وفادار جو راستے میں پریشان و آوارہ ہو گئے تھے۔ دیو گیر میں آکر اس کے پاس جمع ہو گئے۔ ضیاء برنی

محمد تغلق کے فوجی سرداروں کا جدا ہونا اور لشکر اسلام میں خرابی کا پیدا ہونا ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

"باجمعیتہائے خود از لشکر بیروں آمدند و از بیروں آمدن ایشاں در تمامی لشکر ہوئے افتادہ و غوغا شدہ و در ہر خیلے شور و شغب پیدا آمدہ و بہ لشکر روئے نمود کہ یکے بدیگرے نمی پرداخت و ہندواں درونی را ہمی می بایست کہ در لشکر حادثہ افتد و ایشاں از جان خلاص یا بند و ہندواں از دروں حصار ہجوم کردہ بیروں آمدند و بنگاہ را بتمامی غارت کردند و بہ غنیمت بردند و سلطان محمد با خاصان خود راہ دیوگیر گرفت و خلق لشکر در ہم ریز شد و ہر طرف افتادند"

ملک تیمور و ملک تگین وغیرہ سرداران علائی محمد تغلق سے جدا ہو کر ادلیسہ و بنگالہ کی طرف جانا چاہتے تھے کہ راستے میں گونڈوانہ کے ہندوؤں نے جو رو ردیو کے ہمدرد و شریک بغاوت تھے اپنے ان محسنوں کا کام تمام کیا اور اس طرح ان سرداروں کو نمک حرامی کی سزا بہت جلد مل گئی۔ ضیائے برنی کے الفاظ یہ ہیں۔

"و ملک تمر با چند سوار معدود سر جہاں گرفت و خود را در ہندواں انداخت وہما بجا نقل کردہ و ملک تگین امیر اودھ را ہندواں بکشتند"

فرشتہ کے بیان سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ جب چاروں سردار لشکر کا بڑا حصہ لے کر محمد تغلق سے ہندوؤں کے حسب منشا جدا ہوئے تو ان کے ماتحت لشکر نے یہ دیکھ کر کہ ہندوؤں کی حمایت اور مسلمانوں کی مخالفت میں ہم سے کام لیا جاتا ہے اپنے ان سرداروں سے سرتابی اختیار کی اور ان کو خود اپنے سپاہیوں سے جان بچانی مشکل ہو گئی چنانچہ اپنی جان بچانے کے لئے اِدھر اُدھر آوارہ ہوئے اور ہندوؤں نے اس پریشانی کے عالم میں ان کو اور اُن کے لشکر کو لوٹا اور اس طرح وہ خود برباد ہو کر ہندوؤں کو اور زیادہ فائدہ نہیں پہنچا سکے فرشتہ کے الفاظ یہ ہیں۔

"و آں چہار سردار کہ باہم اتفاق نمودہ از لشکر برآمدہ بودند از ہم جدا افتادہ حشم و خدم از ایشاں برگشت و اسباب و اسلحہ ایشاں بدست کفار افتادہ و ملک تیمور با چند کس در میان زمینداران تلنگ رفتہ ہما بجا درگذشت"

فرشتہ کے بیان سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ ملک تیمور وغیرہ سرداروں کا ہندوؤں

کے ساتھ پہلے سے کوئی سازشی تعلق ضرور تھا۔ رور دیو کے معاونین میں گونڈوانہ اڑلیسہ اور جاجنگر (نہراری باغ وچپنار) کے راجہ بھی تھے۔ خلجیہ خاندان کی بربادی کے بعد سرکشی و بغاوت کا علم بلند کرنے سے پہلے رور دیو کا تلنگانہ و بنگالہ کے درمیانی راجاؤں کو خصوصیت سے اپنی سازش میں شریک کرنا بے معنی نہ تھا۔ بنگالہ میں ناصرالدین ابن بلبن حکمراں تھا۔ اس بغاوت کی کامیابی کے لئے رور دیو نے ناصرالدین کی خاندانی اہمیت سے فائدہ اٹھانا چاہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ باغی امیروں نے محمد تغلق سے جدا ہوکر بنگالہ کا رخ کیا۔ بعض راستے ہی میں ختم ہو گئے اور بعض بنگالے کے ہندو اور مسلمان رئیسوں تک پہنچ کر ان کو اس بغاوت کی کامیابی کا یقین دلا سکے۔ چنانچہ ابن بطوطہ صاف الفاظ میں لکھتا ہے کہ باغی لوگ محمد تغلق سے جدا ہوکر بنگالے کی طرف گئے تھے۔

سرداران لشکر کی بغاوت کے متعلق غلط فہمی

اس سلسلے میں ایک خاص بات بیان ہونے سے رہ گئی ہے وہ یہ کہ ضیاء برنی نے مذکورہ امیروں کے باغی ہونے کا ایک عجیب وغریب سبب بیان کیا اور اُسی کو بعد کے تمام مورخین نے آنکھیں بند کرکے اپنی اپنی کتابوں میں نقل کر دیا ہے وہ یہ کہ عبید شاعر اور شیخ زادہ دمشقی دو شخص تھے۔ جو شہزادہ محمد تغلق کے مصاحبوں میں شامل تھے۔ ایک مہینے سے کوئی ڈاک دلی سے نہیں پہنچی تھی حالانکہ اس سے پہلے دوران محاصرہ میں ہر ہفتے دو مرتبہ دلی سے ڈاک پہنچتی رہتی تھی اس ڈاک کے نہ پہنچنے کا یہ سبب تھا کہ راستے میں کسی جگہ ڈاک کا سلسلہ منقطع ہوگیا تھا یعنی ڈاک کے ہرکاروں کی آمد و رفت مسدود کر دی گئی تھی اور وہ ڈاک لے کر لشکر تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اس حالت سے فائدہ اُٹھا کر عبید شاعر اور شیخ زادہ دمشقی نے لشکر میں یہ غلط خبر مشہور کر دی کہ سلطان غیاث الدین تغلق کا دہلی میں انتقال ہوگیا اور وہاں کوئی دوسرا شخص تخت نشین ہو چکا ہے ساتھ ہی یہ دونوں شخص مذکورہ چہار سرداروں کے پاس پہنچے اور کہا کہ آپ لوگ چونکہ علاء الدین خلجی کے زمانے کے سردار ہیں اس لئے محمد تغلق آپ کو قتل کرنے کی فکر میں ہے اور اس نے ایک فہرست میں سب کے نام لکھ لئے ہیں جن کو بیک وقت قتل کیا جائے گا آپ کو اپنی جان بچانی ہے تو بچا لیجئے۔ عبید شاعر اور شیخ زادہ دمشقی کی یہ دونوں تدبیریں کارگر ہوئیں اور وہ صورت جس کا اوپر ذکر

ہوا وقوع میں آئی۔ ضیاء برنی عبید شاعر اور شیخ زادہ دمشقی کی نسبت یہ الفاظ استعمال کرتا ہے،

"عبید شاعر و شیخ زادہ دمشقی کہ بس بدبخت و خبیث و فتان و مشلط بودند و بنوے پیش سلطان محمد مدخل کردہ فتنہ انگیختند و آوازہ دروغ درمیان لشکر درانداختند کہ سلطان غیاث الدین تغلق در شہر نقل کردد کا۔ ہائے ملک در دہلی بگشت و غیرے بر تخت گاہ دہلی متمکن گشت و راہ الاغ و دہاؤ بکلی منقطع شد و ہر کس سر خود گرفت و ہمیں عبید بدبخت و شیخ زادہ دمشقی کہ بس خبیث و فتنہ انگیز و حرام خور و کافر نعمت بودند مشلطے دیگر انگیختند و در پیش ملک تمر و ملک تگین و ملک کل افغان و ملک کافور مہردار گفتند کہ سلطان محمد شمارا کہ اکابر ملوک علائی اند و سران لشکرند مزاحم ملک شریک می داند و از یگان یگان می شمارد و در تذکرہ کشتنیاں نام شما نوشتہ است ہر چہار را در یک روز بیک کرت خواہد گرفت و گردن خواہد زد۔"

اس جگہ یہ خدشہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر عبید شاعر اور شیخ زادہ دمشقی ایسے ہی خبیث فتان۔ مشلط۔ فتنہ انگیز۔ حرام خوار۔ کافر نعمت اور اپنی ان صفات میں شہرۂ آفاق تھے تو ان نصف درجن صفات مذمومہ کے موصوفوں کو محمد تغلق نے اپنی مصاحبت میں کیوں جگہ دی تھی اور اس کے باپ سلطان غیاث الدین تغلق نے بیٹے کی مصاحبت میں ایسے لوگوں کو کیوں رہنے دیا تھا۔ اگر وہ پہلے سے ایسی شرارتوں اور نالائقیوں کے عادی نہ تھے اور بھلے آدمی تھے اور شہزادہ کی مصاحبت کے اہل سمجھے گئے تھے تو انھوں نے آخر کس لئے سلطنت اسلامیہ کو ایسا عظیم الشان نقصان پہنچانے کی کوشش کی جس میں ان کے لئے کسی فلاح و بہبود کی کوئی توقع نہ تھی اس خدشہ کا جواب آئندہ صفحات یعنی محمد تغلق کے حالات میں آنے والا ہے جس سے ثابت ہو جائے گا کہ عبید شاعر اور شیخ زادہ دمشقی کی کوئی خطا نہ تھی اور اُن کو خواہ مخواہ مجرم قرار دیا گیا تھا۔ آخر عبید شاعر اور ملک کافور مہردار گرفتار ہو کر دہلی آئے اور غیاث الدین تغلق نے عبید شاعر کو معمولی طور پر قتل کرا کر ملک کافور مہردار کو ابن بطوطہ کی روایت کے موافق ہیبت انگیز طریقے سے قتل یعنی پیل مال کرایا۔

- - -

بابا رتن ہندی

مذکورہ تمام واقعات سلطان غیاث الدین تغلق کی تخت نشینی کے پہلے ہی سال وقوع پذیر ہوئے۔ اسی سال بابا رتن ہندی جنھوں نے افواہِ عام کے موافق بہت طویل عمر پائی اور جو خود تحقیق مذہب کے لیے ملک عرب میں گئے اور وہاں سے مسلمان ہو کر واپس آئے تھے اور عرصۂ دراز سے تبلیغ اسلام میں مصروف تھے ۷۲۲ھ میں بمقام بھٹنڈہ فوت ہوئے ان کے پاس آنحضرت صلعم کی ایک کنگھی تھی جو ان کو سفر عرب میں کسی سے دستیاب ہوئی ہو گی۔ لوگوں نے غلطی سے یہ خیال کر لیا کہ اُن کو خود آنحضرت صلعم نے یہ کنگھی دی تھی اور وہ آنحضرت صلعم کے زمانے میں ملک عرب گئے اور یہ کنگھی لے کر آئے اور سات سو سال کی عمر پائی حالانکہ یہ غلط ہے (دیکھو تقصار جیود الاحرار من تذکار جنود الابرار)

دکن کی دوسری کامیاب مہم

سلطان غیاث الدین تغلق نے اسی سال ایک فوج دہلی سے محمد تغلق کے پاس دیوگیر بھیجی اور حکم دیا کہ دوبارہ ورنگل پر فوج کشی کر کے وہاں کے راجہ رودردیو کے غرور کو توڑا جائے۔ فرشتہ کا بیان یہ ہے کہ محمد تغلق فوج کی بغاوت و سرکشی کے بعد ورنگل سے دیوگیر اور دیوگیر سے دہلی آیا اور دہلی سے فوج لے کر ورنگل پر دوبارہ حملہ کرنے کے لئے روانہ ہوا لیکن ضیاء برنی کے بیان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ محمد تغلق دیوگیر ہی میں مقیم رہا دہلی نہیں آیا دہلی سے کمکی فوج اور حکم سلطانی کے پہنچنے پر ورنگل کی جانب روانہ ہوا۔ محمد تغلق نے اول بیدر کے راجہ کو جو رودردیو کے ساتھ بغاوت میں شریک اور اس کا ماتحت تھا۔ سزا دینی مناسب سمجھی اور شہر بیدر کو باسانی فتح کر لیا اس کے بعد ورنگل پر حملہ آور ہوا۔ ورنگل کے راجہ نے جو پہلے سے زیادہ مضبوطی کے ساتھ مقابلہ پر آمادہ تھا بے جگری سے مقابلہ کیا۔ لیکن محمد تغلق نے اُس کو شکست دے کر محصور ہونے پر مجبور کیا پھر قلعہ کا محاصرہ کر کے ورنگل کو فتح اور رودردیو کو اسیر کر لیا۔ اس کے بعد بلا توقف گونڈوانہ اور اڑیسہ کے راجاؤں کی سرکوبی کے لئے جنھوں نے رودردیو کو مدد دی تھی روانہ ہوا وہاں سے بعد سزا دہی سالمًا غانمًا ورنگل واپس آ کر راجہ رودردیو۔ اس کے بیٹے کشنا اور اس کے نوکر کنو کو مع تحائف باپ کی خدمت میں ملک بیدار کے ہمراہ دہلی کی جانب روانہ کیا۔ تاریخ فیروز شاہی مصنفہ شمس سراج عفیف میں لکھا ہے کہ راجہ رودردیو دہلی پہنچنے سے پہلے راستہ ہی میں

مرگیا تھا۔ ضیا برنی کہتا ہے کہ رودردیو کو گرفتار کرکے دہلی کی جانب پہلے روانہ کر دیا تھا اور گونڈوانہ کی فتح سے فارغ ہوکر ہاتھی اور تحائف بعد میں بھیجے تھے۔ ان فتوحات میں قریباً ایک سال صرف ہوا۔ انھیں ایام میں مغلوں نے دریائے سندھ کو عبور کرکے پنجاب پر حملہ کیا مگر غیاث الدین تغلق کی فوج سے شکست کھا کر پسپا ہوئے اور مغلوں کے دو سرداروں کو سلطان دہلی کی فوج نے گرفتار کیا ۷۲۲ھ کے شروع میں دکن سے ورنگل کے راجہ رودردیو کا بیٹا کشنا اور اس کا لوکر کنو دہلی پہنچے اور اسی وقت پنجاب کی طرف سے مغلوں کے دونوں سردار گرفتار شدہ دہلی میں داخل ہوئے ؎

زیک سو بوئے گل وز یک طرف پیغام یار آمد
من آں دیوانہ ام کز ہر دو سوئے من بہار آمد

سلطان غیاث الدین تغلق نے تخت نشین ہوتے ہی دہلی کے متصل تغلق آباد کی تعمیر کا کام شروع کر دیا تھا۔ یہ وہی تغلق آباد ہے جس کے قلعہ کو مشہور سیاح ابن بطوطہ نے دنیا کا سب سے زیادہ مضبوط و بے نظیر قلعہ بتایا ہے اور جس کی فصیل کے بعض حصے جواب تک باقی ہیں سیاحانِ عالم کو دریائے حیرت میں غرق کر دیتے ہیں۔ ان فتوحات کی خوشی میں سلطان غیاث الدین تغلق نے حصار تغلق آباد میں سکونت تبدیل کی اور اُمرائے بھی اپنے مکانات وہیں تعمیر کرائے۔ محمد تغلق نے ورنگل میں قیام کرکے تلنگانہ کا انتظام کیا اور اس علاقے کو چھوٹے چھو[...] تقسیم کرکے شق دا[...] جاگیردار اپنی طرف سے مقرر کئے۔ رعایا کو کسی قسم کی زحمت و اذیت نہیں پہنچائی بلکہ ان ملکوں کی ہندو رعایا براہِ راست اسلامی حکومت اور سلطانی انتظام میں آکر زیادہ آزاد اور خوش نظر آنے لگی۔

مہم بنگال ملک بنگال کسی ایک حاکم کے ماتحت نہ تھا بلکہ چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم ہوکر بہت سے رئیسوں کے زیر حکومت تھا لکھنوتی (متصل مالدہ) میں ناصر الدین ابن سلطان بلبن دربار دہلی کے ماتحت فرماں روائی کر رہا تھا۔ سنارگاؤں (ڈھاکہ) میں بہادر شاہ حاکم تھا۔ ان دو مسلمان حاکموں کے علاوہ بہت سے چھوٹے چھوٹے ہندو راجہ بنگال کے مختلف حصوں پر حاکم تھے۔ سب کو سلطنت دہلی کی سیادت تسلیم اور اطاعت و فرماں برداری کا اقرار تھا۔ بنگال کے ہندو راجاؤں میں

ترہت کا راجہ سب سے زیادہ طاقت ور اور بڑا راجہ سمجھا جاتا تھا۔ آج کل ترہت کا علاقہ صوبۂ بہار میں شامل ہے۔ ترہت کو آج کل غالباً درتھبنگا کہا جاتا ہے۔ اڑلیسہ وگونڈوانہ و جاجنگر (جنار و ہزاری باغ) کے راجاؤں کا اثر بنگال کے ہندو راجاؤں نے بھی قبول کیا اور وہ دہلی کے نئے سلطان کو اپنے آپ سے دور سمجھ کر خود مختاری کا دم بھرنے لگے ان ہندو راجاؤں بالخصوص ترہت کے راجہ نے ڈھاکہ کے حاکم بہادر شاہ کو بغاوت کی ترغیب دینے اور باغی بنانے میں کامیابی حاصل کی۔ ناصر الدین ابن بلبن حاکم لکھنوتی کو بھی ان باغیوں نے بہت اکسایا اور اس کو سلطنت دہلی کا حق دار قرار دے کر اپنی حمایت و اعانت کا یقین دلایا لیکن ناصر الدین اپنی فطری سلامت روی کے سبب نیز اپنے باپ غیاث الدین بلبن کی وصیت کو یاد کر کے کہ جو شخص دہلی پر متمکن ہو اس کا کبھی مقابلہ نہ کرنا، بغاوت پر آمادہ نہ ہوا تاہم اپنے آپ کو ان باغیوں کا ہمسایہ دیکھ کر خاموش رہا اور اُن کی کوئی مزاحمت نہ کر سکا۔ سلطان غیاث الدین تغلق کو جب بنگالے کی بغاوت و سرکشی کا حال معلوم ہوا تو اُس نے ورنگل کی جانب ایلچی روانہ کیا اور ولیعہد سلطنت شہزادہ محمد تغلق کو لکھا کہ تم اس ملک کا انتظام امیروں کے سپرد کر کے فوراً دہلی کی جانب روانہ ہو جاؤ کیونکہ یہاں تمہاری سخت ضرورت ہے محمد تغلق باپ کے حکم کی تعمیل میں دکن کے علاقے کا انتظام امرا کے سپرد کر کے عازم دہلی ہوا۔ سلطان غیاث الدین تغلق محمد تغلق کو دہلی میں بطور نائب السلطنت مامور کر کے بنگالہ کی بغاوت فرو کرنے کے لئے ۷۲۴ھ میں دہلی سے روانہ ہوا۔ بنگالہ کی بغاوت کو سلطان غیاث الدین تغلق نے اس لئے زیادہ اہم خیال کیا اور خود اس طرف جانا ضروری سمجھا کہ بنگالے میں سلطان غیاث الدین بلبن مرحوم کا بیٹا ناصر الدین موجود تھا چونکہ وہ ہندوستان کے پرانے شاہی خاندان کا شہزادہ اور سلطنت کا استحقاق رکھتا تھا اس لئے ہنگامے کی یہ بغاوت۔ ناصر الدین ابن بلبن حاکم لکھنوتی کو تخت دہلی کا مدعی بنا کر سلطان تغلق کے لئے عرصہ تنگ کر سکتی تھی۔ رودر دیو کی بغاوت میں بھی ناصر الدین ہی کے تصور نے اہمیت اور طاقت پیدا کر دی تھی حالانکہ ناصر الدین ابن بلبن کے وہم و گمان میں بھی سرکشی و معرکہ آرائی کا ارادہ نہ تھا۔ سلطان تغلق بڑے اہتمام و انتظام کے ساتھ روانہ ہوا اول مقام ظفر آباد (موجودہ علاقہ جون پور) میں پہنچا۔ ظفر آباد کا صوبہ دار تاتار خان جس کو سلطان نے اپنا منہ بولا بیٹا بنایا تھا معہ اپنی فوج کے سلطان کے ہمراہ ہوا اس کو سلطان نے اپنے

لشکر کا ہراول بنایا۔ ناصرالدین حاکم لکھنوتی نے سلطان غیاث الدین تغلق کے آنے کی خبر سنی تو وہ فوراً لکھنوتی سے سلطان کے استقبال کو روانہ ہوا۔ سلطانی لشکر علاقہ ترہت میں پہنچا تھا کہ ناصرالدین نے سلطان کی خدمت میں حاضر ہوکر اپنی اطاعت وفرماں برداری کا یقین دلایا۔ ناصرالدین ابن بلبن کی اطاعت ووفاداری سے سلطان تغلق بہت خوش اور مطمئن ہوا۔ تاتارخاں کو بہادر شاہ کی سرکوبی وتادیب کے لئے سنارگاؤں (ڈھاکہ) کی جانب بھیج کر خود بھی اس کے پیچھے معہ ناصرالدین آہستہ آہستہ روانہ ہوا بہادرشاہ کو تاتارخاں نے شکست دے کر گرفتار کرلیا اور سلطان کی خدمت میں لے آیا۔ یہ دیکھ کر بنگال کے تمام چھوٹے چھوٹے ہندو راجاؤں نے معافی کی درخواستیں بھیجنی شروع کیں اور سب نے آئندہ مطیع وفرماں بردار رہنے کا اقرار کیا۔ سلطان نے سب کی خطاؤں کو معاف کرکے ان کی ریاستیں برقرار رکھیں۔ ترہت کے راجہ نے اپنے دشوار گذار جنگلوں اور قلعہ کی مضبوطی پر اعتماد کرکے سرکشی میں اصرار اور اطاعت سے انکار کیا۔ سلطان نے جنگل کو کٹوا کر صاف کرادیا اور قلعہ تک پہنچ کر اس کو فتح اور راجہ کو گرفتار کیا۔ ترہت کی حکومت ایک معتمد کو سپرد کرکے تاتارخاں حاکم ظفرآباد کو مشرقی بنگال وبہار کا نگراں اور وایسرائے مقرر کیا۔ سنارگاؤں کا تمام علاقہ ریاست لکھنوتی میں شامل کرکے لکھنوتی وسنارگاؤں کی حکومت ناصرالدین کو سپرد کی اور چتر ودورباش وغیرہ علامات بادشاہت عطا کرکے لکھنوتی کی جانب رخصت کیا۔ مغربی بنگال کے چھوٹے چھوٹے ہندو راجاؤں کی نگرانی بھی اسی کو سپرد کی۔ اس طرح ناصرالدین نائب بنگالہ کا فرماں روا اور سلطان تغلق کا باج گذار درشاہ قرار پایا۔ لیکن اس توسیع مملکت اور ترقی اقتدار سے وہ زیادہ متمتع نہ ہوسکا یعنی ڈیڑھ یا دو سال کے بعد فوت ہوگیا تھا۔ ترہت کے راجہ اور سنارگاؤں کے حاکم بہادر شاہ کو جو دونوں گرفتار ومقید تھے معہ ان ہاتھیوں کے جو بہادر شاہ نے فراہم کیے تھے اور اب ضبط ہوکر سلطانی مال غنیمت میں شامل ہو چکے تھے، دہلی کی جانب روانہ کیا اور اس نواح کے انتظام سے فارغ ہوکر خود بھی معہ لشکر دہلی کی جانب روانہ ہوا اس طرح چند منزل سفر کرنے کے بعد بڑے لشکر کو پیچھے چھوڑ کر تھوڑے سے چیدہ سواروں کے ساتھ بطریق یلغار روزانہ دو دو اور تین تین منزلیں طے کرتا ہوا چلا۔

کشمیر میں اسلام کس طرح پہنچا

سلطان جب بنگالے کی جانب سرکش صوبہ دار بہادر شاہ اور ترہت کے باغی راجہ کی سزا دہی میں مصروف تھا تو ۹ رماہ رمضان المبارک کو حضرت شیخ شرف الدین بو علی شاہ قلندر نے سو برس کی عمر میں بمقام پانی پت وفات پائی۔ یہ دراصل عراقی تھے اور اُن کی فیض توجہ سے بھی بہت سے ہندو قبائل نے راہ ہدایت پاکر دولت اسلام حاصل کی تھی۔ حضرت شاہ نظام الدین اولیا رحمہ اُن کا ذکر بڑی عزت اور محبت سے کیا کرتے تھے۔ ۷۲۴ھ کے حالات بیان کرتے ہوئے یہ تذکرہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ۷۲۳ھ میں جب کہ محمد تغلق دکن کے باغی راجہ رودر دیو کی سزا دہی اور گرفتاری میں مصروف تھا تو سلطان غیاث الدین تغلق نے مولانا شمس الدین یحیٰی سے جو حضرت نظام الدین اولیاؒ کے مرید با اخلاص تھے۔ کہا کہ تم یہاں دہلی میں بیٹھے ہوئے کیا کر رہے ہو، کشمیر میں جاؤ اور وہاں کے لوگوں کو اسلام سے واقف کرو۔ مولانا ممدوح نے کہا بہت اچھا میں کشمیر جاتا ہوں چنانچہ تہیۂ سفر میں مصروف ہوئے۔ ابھی روانہ نہ ہوئے تھے کہ اُن کے سینے میں دُنبل نکلا اور فوت ہوگئے۔ یہ وہی مولانا شمس الدین یحیٰی ہیں جن کی شان میں حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلی نے یہ شعر لکھا تھا کہ ؎

سألت العلم من احیاك حقاً
فقال العلم شمس الدین یحیی

دہلی کی طرف سے کشمیر میں تبلیغ اسلام کا کام تو ملتوی رہ گیا مگر قدرت نے دوسری طرف سے سامان کر دیا یعنی ترکستان کے ایک امیر ذوالقدر خاں نے کشمیر کی ریاست پر شمال کی جانب سے حملہ کیا۔ کشمیر کا راجہ سمھا دیو مقابلے کی تاب نہ لاکر علاقہ کشتوار کی طرف بھاگ گیا۔ اس زمانے میں تبت کے راجہ لہاچن مورو پ کا بیٹا رنچن نامی باپ سے ناراض ہوکر کشمیر میں آیا ہوا تھا۔ ذوالقدر خاں چند مہینے کشمیر میں قیام کرکے ترکستان کی طرف روانہ ہوا تو تبتی شہزادے رنچن نے علاقہ سوات کے ایک سردار شاہ میر سے امداد طلب کی اور اس کی مدد سے کشمیر کا راجہ بن گیا اور شاہ میر سواتی کو اپنی وزارت کا عہدہ عطا کیا۔ اپنی تخت نشینی کے سال بھر بعد ۷۲۴ھ کے آخر یا ۷۲۵ھ کے شروع میں اس نے مسلمانوں کے مذہب کو سب سے بہتر اور سچا مذہب تسلیم کرکے دین اسلام قبول کرلیا

اور اپنا اسلامی نام صدرالدین رکھا۔ تاریخ فرشتہ میں شاہ میر کا نام شاہ میرزا لکھا ہے اور اس کی نسبت بیان کیا ہے کہ وہ فقیری لباس میں ۷۱۵ھ میں وارد کشمیر ہوا تھا اور ایک نومسلم خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ جس کا سلسلۂ نسب ارجن مہاراج تک پہنچتا ہے۔ فرشتہ کی روایت میں کشمیر کے راجہ سبھا دیو کا نام سیہ دیو لکھا ہے یہ اختلاف غالباً کتابت کی غلطی کا نتیجہ ہے۔ فرشتہ کا بیان ہے کہ شاہ میرزا کو راجہ سیہ دیو کی خدمت میں بہت رسوخ حاصل ہو گیا تھا اور وہ مصاحبت و وزارت کے درجہ پر فائز تھا۔
فرشتہ کی روایت میں راجہ رنچن راجہ سیہ دیو کا بیٹا بیان کیا گیا ہے۔ جو محل تامل ہے۔
بہرحال کشمیر کے راجہ رنچن کو شاہ میرزا یا شاہ میر نومسلم کی صحبت سے اسلام کی طرف توجہ ہو گئی تھی کہ اس کی تخت نشینی کے سال بھر بعد ۷۲۵ھ میں ترکستان سے ایک درویش سید عبدالرحمٰن شرف الدین نامی جو بلبل شاہ کے نام سے مشہور تھے کشمیر میں وارد ہوئے اور راجہ رنچن اُن کے ہاتھ پر باقاعدہ مسلمان ہوا اور اس طرح ملک کشمیر کی غیر مسلم سلطنت ایک قطرۂ خون بہے بغیر اسلامی سلطنت بن گئی۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ مغل سردار چین سے لے کر ہنگری تک تمام ممالک پر چھائے ہوئے تھے۔ بعض مردان باخدا کی بدولت اسلام کی خوبیوں سے واقف ہو ہو کر اسی طرح مسلمان ہو رہے تھے جس طرح کشمیر کا راجہ مسلمان ہوا ان مردانِ باخدا یعنی مبلغینِ اسلام میں حضرت امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا نام خصوصیت سے اس لئے قابل تذکرہ ہے کہ انھوں نے تبلیغ اسلام کے متعلق ایسی معقول و زبردست کوشش فرمائی کہ روئے زمین کی سیاسی حالت حیرت انگیز طور پر اس سے متغیر و متاثر ہوئی۔

سلطان تغلق کی وفات، تبلیغ اسلام اور ہندو نوازی

جہاں تک ہندوستان اور ہندوؤں کا تعلق ہے سلطان غیاث الدین تغلق کا مفصل حال بیان ہو چکا بنگال سے واپس ہو کر سلطان دہلی کے قریب پہنچ چکا تھا کہ ایک اتفاقی حادثہ سے یعنی مکان کے نیچے دب کر مر گیا۔ سلطان کے حادثۂ وفات کی تفصیل اور اس کے متعلقہ مباحث پر غور کرنا اس کتاب کے موضوع سے چونکہ متعلق نہیں ہے، لہٰذا اُس کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ چار سال اور چند ماہ حکومت کرنے کے بعد بماہ ربیع الاول ۷۲۵ھ مطابق فروری ۱۳۲۵ء سلطان غیاث الدین تغلق

فوت ہوا۔ اس مختصر مدت میں جو اہم اور قابل تذکرہ واقعات تھے سب اوپر بیان ہو چکے ہیں۔ ہندوؤں کی بے وفائی، محسن کشی اور اسلام دشمنی کے زبردست مظاہرے ہو چکے تھے ہندوؤں ہی کی سازش سے خاندان خلجیہ کا چراغ گل اور اُن کی سلطنت کا خاتمہ ہوا تھا۔ غیاث الدین تغلق کی آنکھوں کے سامنے یہ تمام واقعات گذرے تھے۔ وہ ہندوستان کا شہنشاہ بن جانے کے بعد اگر ہندوؤں کو فنا کرنے اور مٹانے پر آمادہ ہو جاتا تو کوئی تعجب کا مقام نہ تھا۔ لیکن کوئی شخص ثابت نہیں کر سکتا کہ اُس نے کسی ایک ہندو کو بھی ہندو ہونے کی وجہ سے قتل کیا ہو۔ ورنگل کے راجہ رودر دیو اور ترہت کے راجہ کو اپنی بغاوت وسرکشی اور بدعہدی کا خمیازہ صرف اسیری و دستگیری کی شکل میں بھگتنا پڑا۔ لیکن اس سے زیادہ سخت سزا ملک کافور دہوا ور بہادر شاہ کو دی گئی جو مسلمان تھے اُس نے کسی ہندو باغی کو ہاتھی کے پاؤں سے نہیں کچلوایا۔ لیکن مسلمان باغیوں کو اس نے فیل مال بھی کرایا ہم کو اس بات کا اقرار ہے کہ اس زمانے میں بھی ہندو بکثرت دائرہ اسلام میں داخل ہوئے لیکن اُن کے دائرہ اسلام میں داخل ہونے کا سبب سلطنت اسلامیہ کی کوئی کوشش نہ تھی بلکہ حضرت بابا فرید شکر گنج رحمہ حضرت شاہ نظام الدین اولیا رحمہ، حضرت خواجہ برہان الدین رحمہ، حضرت خواجہ نصیر الدین اودھی رحمہ، حضرت سید یوسف عرف سید راجو قتال حسینی رحمہ، حضرت شیخ صدر الدین قریشی رحمہ، حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی رحمہ، حضرت شیخ رکن الدین ملتانی رحمہ، حضرت مولانا ظہیر الدین بھکری رحمہ، حضرت مولانا فخر الدین ہانسوی رحمہ، سید تاج الدین بہاری رحمہ، شیخ وحید الدین عثمانی رحمہ مولانا حسام الدین رحمہ، حضرت شمس الدین شیرازی بھکری رحمہ وغیرہم۔ جو سب کے سب درویش اور فاقہ مست عالم تھے۔ تبلیغ اسلام میں معروف اور ہندوؤں کو اسلام کی دولت سے مالا مال کر رہے تھے جس کی تفصیل کسی مستقل باب میں علیحدہ بیان کی جائے گی ساتھ ہی یہ تصور بھی قائم رہنا چاہیے کہ سلاطین اسلام جنھوں نے ہندوستان میں حکومت کی ان عالموں اور درویشوں کو اکثر مخالفت کی نظر سے بھی دیکھتے تھے حتیٰ کہ حضرت شاہ نظام الدین اولیا رحمہ جو صرف صوفی ہی نہیں بلکہ عالم تبحر بھی تھے اور دہلی میں معروف درس وتلقین تھے اُن کے ساتھ سلطان غیاث الدین تغلق کے تعلقات کشیدہ تھے اور اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ انھیں کی بددعا سے سلطان تغلق مرگ مفاجات

کاشتکار ہوا ان کے مرید مولانا شمس الدین یحیٰی کو بھی کشمیر جانے کے لئے کہنا اس لئے نہ تھا کہ سلطان غیاث الدین تغلق کو ملک کشمیر میں اشاعت اسلام کا اہتمام مدنظر تھا بلکہ وہ مولانا ممدوح سے ناراض اور اُن کو دارالسلطنت دہلی سے نکالنا چاہتا تھا اُس نے دراصل ان کو جلا وطنی کا حکم ان الفاظ میں (جو اوپر مذکور ہوئے) دیا تھا اور وہ مولانا موصوف کی تبلیغی و اشاعتی سرگرمیوں سے ناخوش تھا لہذا ہم مسلمانوں کو سلطان تغلق سے شکوہ ہو سکتا ہے کہ اس نے جس طرح ملک کے سرسبز و آباد کرنے زراعت پیشہ لوگوں کو (جو سب ہندو تھے) خوش حال و فارغ البال بنانے، ملک میں امن و امان قائم کرنے، بیرونی حملوں سے ملک کو محفوظ رکھنے، عدل و انصاف کے لئے بہترین قوانین نافذ کرنے اور اچھا نظم و نسق قائم رکھنے میں جس ہمت و مستعدی اور قابلِ تعریف طرزِ عمل کا اظہار کیا اسی قسم کی سرگرمی تبلیغ اسلام اور ہندوؤں کو مسلمان بنانے میں کیوں ظاہر نہیں کی اور علمائے مبلغین اسلام کی جانب سے کیوں سرگراں ہوا لیکن کسی ہندو کو تو اس سے شکایت ہی نہیں ہو سکتی ہندوستان کے موجودہ [illegible] ہندوؤں میں باہمی [illegible] بتائے جا سکتے [illegible] سلطان تغلق یعنی غیاث الدین تغلق کے دائرہ حکومت [illegible] مسلمانوں کے محکوم [illegible] تھے [illegible] اپنے عہد [illegible] تبلیغ اسلام کے لئے [illegible] نہیں کیا [illegible] لوگوں کو [illegible] اسلام کی تعلیم [illegible]

ہندوؤں کے ساتھ رشتہ داری

سلطان غیاث الدین تغلق کا باپ اگرچہ افغانستان یا ترکستان سے ہندوستان میں آیا تھا لیکن غیاث الدین تغلق ہندوستان ہی میں پیدا ہوا تھا غیاث الدین تغلق کی ماں تاریخ فرشتہ کی روایت کے مطابق پنجاب کے کسی جاٹ کی بیٹی تھی غیاث الدین تغلق ہندوستان ہی کو اپنا وطن سمجھتا تھا۔ وہ فاتح اور مفتوح کے امتیاز کو مٹا کر ہندو مسلم اتحاد و مساوات کا خواہاں اور قومیت متحدہ ہندی کی تعمیر کا جس میں کوشاں تھا۔ چنانچہ اس نے [illegible] جب کہ وہ دیپالپور کا صوبہ دار یا عامل تھا اپنے بھائی سالار رجب کی شادی ابوہر علاقہ دیپالپور کے ایک راجپوت زمیندار رانامل بھٹی

کی بیٹی کی رانا مل بھٹی کے پاس اُس کی بیٹی کی خواستگاری کے لئے شمس سراج عفیف مصنف تاریخ فیروز شاہی کے پردادا کی معرفت پیغام پہنچایا گیا۔ رانا مل بھٹی نے اختلافِ مذہب و قوم کی وجہ سے اس پیغام کی تعمیل و تسلیم میں تامل کیا۔ لیکن لڑکی نے رانا مل کی ماں یعنی اپنی دادی سے اس پیغام کا حال سُن کر اور غازی ملک (غیاث الدین تغلق) کی ناراضگی کے اندیشے سے پریشان دیکھ کر کہا کہ تم حاکم دیپالپور کے پیغام کو قبول کر لو اور اسے ناراض نہ کرو۔ رہی یہ بات کہ میں تم سے جدا ہو کر ایک مسلمان کی بیوی بن جاؤں گی تو اس کے متعلق تم یہ تصور کر لینا کہ ہماری ایک لڑکی کو مغل لے گئے۔

"دبابد دانست کہ یک دختر را مغلاں بردند"

(تاریخ فیروز شاہی از شمس سراج عفیف)

چنانچہ رانا مل اپنی ماں سے لڑکی کے الفاظ سن کر فوراً آمادہ ہو گیا اور سالار رجب کے ساتھ لڑکی کی شادی کر دی۔ اس واقعہ کو شمس سراج عفیف نے اپنی تاریخ میں بالتفصیل بیان کیا ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

اس موقع پر یہ بات قابل غور ہے کہ اس زمانے سے پہلے پنجاب و ملتان کے علاقوں میں مغل بار بار حملہ آور ہوتے رہتے تھے جیسا کہ تاریخوں سے ثابت ہے اور اس کتاب کے گذشتہ باب میں بھی ذکر آ چکا ہے۔ لڑکی کے بے ساختہ الفاظ بتا رہے ہیں کہ مغل حملہ آور ہو کر مال و دولت کے ساتھ ہندوؤں کی خوبصورت لڑکیوں کو بھی چھین کر لے جاتے تھے۔ اور اس زمانے میں مغلوں کی اس دست درازی کی خاص طور پر شہرت تھی۔ یہ مغل کون تھے؟ یہ وہ مغل تھے جنھوں نے خلافت بغداد کو برباد کیا جو انسانوں بالخصوص مسلمانوں کا خون بہانے میں لذت محسوس کرتے تھے۔ غرضکہ کافر غیر مسلم اور چنگیزی آئین کے پیرو تھے۔ ہندوستان کو ان کے حملوں سے بچانا اور باشندگان ہندوستان کی حفاظت کرنا مسلمان نوابوں کا کام جانتے تھے۔ غیاث الدین تغلق نے سلطنت حاصل کرنے سے پہلے دیپالپور کا حاکم ہونے کی حیثیت سے قریباً تیس مرتبہ مغلوں کے حملوں کو روکا اور ان کو شکست دے دے کر بھگایا تھا اسی لئے وہ غازی ملک کے نام سے مشہور تھا اور اسی لئے رانا مل کی بیٹی نے وہ الفاظ کہے تھے جن کا اوپر ذکر ہوا۔ چونکہ اسی زمانے سے مغلوں کے بادشاہ

جو ماوراء النہر، خراسان، بلخ، ایران، منگولیا، آذربائیجان، دشت قبچاق وغیرہ میں حکمران تھے۔ مذہب اسلام سے واقف ہونے کے لئے اسلام کی طرف متوجہ ہونے اور اسلام قبول کرنے لگے تھے۔ اُن نومسلم مغل سلاطین کو دیکھ کر ان کی قوم بھی اسلام میں داخل ہونے لگی تھی جس کی وجہ سے اُن میں تہذیب اور ہمدردی نوع انسان پیدا ہونی شروع ہوئی۔ سوچنے اور سمجھنے کے قابل بات یہ ہے کہ جب تک مغل اسلام سے بیگانہ اور قتل و غارت پر آمادہ رہے تو ہندوستان کے مسلمانوں نے سینہ سپر ہو کر اُن کے حملوں کو روکا اور ہندوؤں کی قوم کو جو مغلوں کے لئے بڑا تر لقمہ تھا، بچایا۔ سلطان بلبنؔ کا ولی عہد بیٹا خاں شہیدؔ انھیں کافر مغلوں کے مقابلہ میں شہید ہوا۔ سلطان بلبنؔ کے بھائی شیر خاںؔ نے جو دنیا کے مشہور بہادر سپہ سالاروں میں شمار ہوتا ہے اپنی عمر کا بڑا حصہ انھیں مغلوں کے روکنے میں صرف کیا۔ سلطان جلال الدین خلجی نے بادشاہ ہونے سے پہلے اپنی ساری عمر بحالت سپہ سالاری انھیں مغلوں کی معرکہ آرائیوں میں گذاری۔ سلطان غیاث الدین تغلق بھی بادشاہ ہونے سے پہلے انھیں مغلوں کے مقابلے میں سدِ سکندری بنا ہوا تھا۔ آخر اسلام نے خود مغلوں کے اندر داخل ہو کر ان کو شائستہ بنایا اور ہندوستان ان کے حملوں سے محفوظ و مطمئن ہوا۔ غرض کہ اسلام اور مسلمانوں نے اس عظیم الشان خطرہ کا خاتمہ کر کے ہندوؤں کو بچایا لیکن کس قدر افسوس اور حسرت کا مقام ہے کہ آج ہمارے ہندو دوست ہم کو سناتے ہیں کہ ہم میں لڑکیوں کی چھوٹی عمر میں شادی کرنے کا رواج اس لئے ہوا کہ مسلمان ہماری جوان اور خوبصورت لڑکیوں کو اٹھا کر لے جایا کرتے تھے اس جہالت اور نالائقی کا کیا علاج ہو سکتا ہے کہ غیر مسلم اور کافر مغلوں کو جنھیں اسلام اور مسلمانوں سے کسی قسم کا بھی تعلق نہ تھا مسلمان سمجھ کر مسلمانوں کو الزام دیا جا رہا ہے۔ بات کسی قدر طویل ہو گئی تذکرہ یہ تھا کہ سلطان غیاث الدین تغلق نے اپنے بھائی کی شادی ہندوؤں میں محض اس لئے کی تھی کہ ہندو مسلمانوں میں اُنس اور تعلق پیدا ہو کر یگانگی بڑھے۔ عدنہ سالار رجب کی شادی اس سے پہلے مسلمانوں میں ہو چکی تھی اور اس پہلی بیوی سے سالار رجب کے بیٹے بھی پیدا ہو چکے تھے جو موجود تھے۔ سالار رجب کی اس دوسری ہندو بیوی کا نام نائلہ یا نالہ دیبی تھا۔ شادی ہونے کے بعد غیاث الدین تغلق نے اس کا نام بی بی کدبانو رکھا۔ اس بیوی سے سالار رجب کے ایک بیٹا پیدا ہوا جس

کا نام فیروز خاں رکھا گیا۔ فیروز خاں کی عمر چھ یا سات سال کی تھی کہ سالار رجب کا انتقال ہوا۔ بی بی کدبانو کے صرف یہی ایک لڑکا پیدا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ سالار رجب کی وفات پر بی بی کدبانو رونے اور جیسا کہ عورتوں کا دستور ہے کہنے لگی کہ اب اس لڑکے کو کون پرورش کرے گا۔ یہ الفاظ سن کر غازی ملک (سلطان غیاث الدین تغلق) نے کہا کہ تو مطلق فکر نہ کریں اس کو اپنے بیٹوں کی طرح پرورش کروں گا۔ چنانچہ غیاث الدین تغلق نے فیروز خاں کی پرورش اور تعلیم و تربیت میں اپنے بیٹوں کی تربیت سے زیادہ اہتمام ملحوظ رکھا (دیکھو تاریخ فیروز شاہی شمس سراج عفیف) یہی فیروز خاں تھا جو سلطان محمد تغلق ابن غیاث الدین تغلق کے بعد فیروز شاہ تغلق کے نام سے ہندوستان کا شہنشاہ ہوا۔

سلطان محمد تغلق

اپنے باپ غیاث الدین تغلق کی وفات کے بعد سلطان محمد شاہ تغلق تخت نشین ہوا یہ وہی محمد شاہ تغلق ہے جو خسرو خاں نمک حرام ہندو زادہ کے عہد حکومت میں دہلی کے اندر بچشم خود موجود تھا اور اپنی آنکھوں سے ہندوؤں کی ان نا لائقیوں کو جن کا ذکر باب چہارم کے آخری حصے میں ہو چکا ہے دیکھ چکا تھا۔ بعد ازاں بعہد ذ دکن میں ہندو راجاؤں سے جو معاملات پیش آ چکے تھے وہ بھی ہندوؤں سے تنفر پیدا کرنے کے لئے کافی تھے لیکن اس سلطان نے تخت نشین ہو کر اپنے باپ کی مانند ہندوؤں سے قطعاً کوئی انتقام لینا نہیں چاہا۔ خلیج بنگال سے افغانستان و گجرات تک اور کوہ ہمالیہ سے راس کماری تک تمام بر اعظم ہندوستان اس کے زیر نگیں اور گجرات، مالوہ، دیپگیر، مرہٹہ، تلنگ، کرناٹک، کنپلہ، دھور سمندر، معبر، لکھنوتی، ستگاؤں، سنارگاؤں، ترہت، ظفر آباد، میان دوآب، پنجاب، ملتان، سندھ، دیپالپور وغیرہ صوبوں میں منقسم تھا۔ عہد خلجیہ ہی میں جنوبی ہند کی فتح کے بعد سلطنت اسلامیہ تمام بر اعظم ہند پر چھا گئی تھی۔ لیکن دکن کے اکثر راجاؤں کو خراج گذاری اور اطاعت کا وعدہ لے کر ان کے مقبوضہ علاقوں پر بدستور حکمراں چھوڑ دیا گیا تھا۔ ان راجاؤں نے دارالسلطنت دہلی کے تغیرات کا حال سنتے ہی پھر سرکشی و بغاوت پر

متعدی ظاہر کی اور محمد تغلق نے باپ کے حکم کے موافق ان راجاؤں کے سرگروہ رودر دیو کو معہ اس کے بیٹے کشنا نایک کے گرفتار کر کے دہلی بھیج دیا۔ اس کے ملک پر اپنی طرف سے عامل اور حاکم مقرر کر دیئے۔ باقی راجاؤں نے معافی مانگی اور پھر از سر نو باج گذاری اور فرماں برداری کے اقراروں کی تجدید کی اور سلطنت اسلامیہ نے اسلامی عفو و درگذر کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کو پھر معاف کر دیا تھا۔ محمد تغلق کی تخت نشینی کے وقت کل بر اعظم ہند مسلمانوں کا مغلوب و محکوم تھا اور یہ توقع ہرگز نہ تھی کہ سلطان محمد کسی ہندو کو برسر اقتدار بنائے گا۔

محمد تغلق کی ہندو نوازی

خاندان غلامان کے آخری سلطان کو شاہد و شراب کے ذریعہ گمراہ کر کے راہ روی پر آمادہ کیا گیا تھا خاندان خلجیہ کی بربادی میں بھی سلطان قطب الدین مبارک شاہ کی اسی قسم کی کمزوریوں نے ہندوؤں کو دہلی اور تخت سلطنت پر مسلط اور مستولی کر دیا تھا۔ سلطان محمد تغلق نہ زانی تھا نہ شرابی۔ اس کے اخلاق میں اس قسم کی کوئی کمزوری نہ تھی۔ لیکن چونکہ وہ مسلمان تھا اور اپنا سینہ فراخ رکھتا تھا لہذا اس نے تخت نشین ہوتے ہی رودر دیو کے بیٹے کو انعامات سے تلنگانہ کی ریاست پر بحال کر کے بھیج دیا۔ الفنسٹن صاحب اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں کہ:

"ورنگل کو قلعہ فتح کیا اور راجا کو پکڑ کر دہلی لایا مگر تھوڑے دنوں بعد اس کی رہائی ہوئی اور وہ اپنے راج پر دوبارہ قائم ہوا"

الفنسٹن کی تحقیق ناقص ہے۔ رودر دیو دہلی آتے ہوئے راستے ہی میں بیمار ہو کر فوت ہو گیا تھا۔ شمس سراج عفیف نے اس کی وفات کو واضح الفاظ میں بیان کیا ہے۔ محمد تغلق نے کشنا نایک ابن رودر دیو کو اس کے آبائی علاقہ کا حاکم بنا کر دہلی سے رخصت کیا مگر قلعہ ورنگل کو اپنے اہل کاروں کے قبضہ میں رکھا تا کہ کشنا نایک کو قلعہ ورنگل کی حفاظت و مضبوطی کی وجہ سے قدرت پائے اور وہ باغی ہو کر اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈال سکے۔ کشنا نایک نے تلنگانہ کا راجہ بن کر مقام کولاس کو اپنا دار الریاست بنایا۔ محمد تغلق جب کشنا نایک کو تلنگانہ کا راجہ بنا کر دہلی سے رخصت کرنے لگا تو رودر دیو کے نوکر مسمی کنہو نے کشنا نایک کے ساتھ جانے سے انکار کیا اور شاہی غلاموں میں شامل ہو

رہنا پسند کیا جس کا سبب یہ تھا کہ وہ قیام دہلی کے زمانے میں ملک احمد ایاز کے ہمراہ جو حضرت نظام الدین اولیاء رحمہ کا مرید با اخلاص تھا۔ حضرت ممدوح کی خدمت میں اکثر حاضر ہوتا رہتا اور کرشنا نایک کے دکن کی جانب رخصت ہونے کے بعد مسلمان ہو گیا تھا۔ سلطان محمد تغلق نے کرناٹک کا علاقہ بھی باج و خراج کا اقرار لے کر وہاں کے قدیمی ہندو رایوں اور راجاؤں کو سپرد کر دیا جن میں رائے کنپلہ اور بلال دیو خصوصیت سے قابل تذکرہ ہیں۔ گندھانہ اور جنیر کا علاقہ ناگ نایک یا ناگدیو کو سپرد کیا۔ پنجاب کے دوآبہ رچنا کا بڑا حصہ تلک چند گکھڑ یا تلک چند کھوکھر کی حکومت میں دے دیا۔ اودھ اور بہار کے بعض اضلاع میں بھی اس نے وہاں کے ہندو سرداروں کے سند حکومت عطا کر دی۔ صوبۂ گجرات کا بہت بڑا حصہ ہندو رایوں اور راجاؤں میں تقسیم کر کے وہاں ایک سلطانی امیر مقرر کیا کہ وہ باج و خراج کی وصولی اور ہندو راجاؤں کی نگرانی کرتا رہے۔ ان راجاؤں میں رانا منڈل کچھ کا راجہ اور کنگار کرناٹی (جوناگڑھ) کا راجہ خاص طور پر قابل تذکرہ ہیں۔ مانڈیو کو بگلانہ کا حاکم بنایا۔ رائے بہار دیب کو بھی گجرات ہی کے علاقے میں ایک تعلقہ عطا کیا گیا۔ نہروالہ میں حوض سہسلنگ کے مہنتوں کو بھی عاملانہ اختیارات اور جاگیریں عطا کیں۔ ٹھٹھہ کی حکومت بھی ایک ہندو مسمی رائے آنڑ کو جو قوم سومرہ سے تعلق رکھتا تھا عطا کی۔ مقام گونڈل متصل ٹھٹھہ میں بھی ایک ہندو حکمراں تھا۔ گلبرگہ کی حکومت پر بھی ایک ہندو کو مامور کیا گیا۔ گورکھپور کا علاقہ بھی ایک ہندو کی حکومت میں دے دیا گیا۔ میوات کی حکومت بھی ایک ہندو کو عطا کی گئی۔ سامانہ کی نظامت میں جو ان راجپوتوں اور دوسرے ہندوؤں کو حکومتیں عطا کیں۔ کوہ پایہ کا علاقہ (موجودہ ضلع سہارنپور، دہرہ دون) بھی راجپوتوں اور گوجروں کے سپرد کر دیا گیا۔ سانورہ کا علاقہ (موجودہ ضلع انبالہ) پرواری راجپوتوں کو عطا ہوا کیتھل اور سنام میں منڈاہر اور بھٹی راجپوتوں کو برسر اقتدار بنایا گیا۔ برن کی نظامت میں بھی ہندو ریاستیں موجود تھیں (مستفاد از تاریخ فرشتہ، تاریخ فیروز شاہی و طبقات اکبری و منتخب التواریخ وغیرہ)

ہندوؤں نے منوشاستر کی رو سے شودر قوموں کی جو مٹی پلید کی ہے معلوم عوام ہے تین اونچی ذاتوں کے علاوہ باقی تمام اقوام شودروں میں شامل اور کسی ترقی کی آرزو ہی نہیں کر سکتی تھیں۔ محمد تغلق نے ہندوؤں کی کئی شودر قوموں کو ترقی دے کر حکومت

کے مرتبے تک پہنچایا اور ہندوستان کی مشہور و قابل تذکرہ اقوام میں شامل ہوجانے کا اُن کو موقعہ دیا۔ گکھڑ، میواتی، مینے وغیرہ اگرچہ چوری، ڈکیتی اور راہ زنی میں ممتاز تھے۔ لیکن حکومت و سرداری اور امارت و سروری ان میں کبھی نہیں پائی گئی تھی محمد تغلق نے ان لوگوں کو باقاعدہ حکومتیں عطا کرکے مہذب و شائستہ بنایا۔ بعد میں خاندان تغلقیہ کے آخری بادشاہوں کے لئے یہ لوگ اگرچہ باعث تکلیف ہوئے۔ مگر بہت جلد اپنی حاصل کی ہوئی شائستگی کی بدولت اسلام میں داخل ہوگئے۔ سلطان محمد تغلق اور اس کے با اقتدار امراء، وزرا، مصاحبین اور اس زمانے کے تمام مسلمان اگر اسی قسم کی پست ہمتی اور تنگ خیالی میں مبتلا ہوتے جیسی کہ ہندوؤں سے ظاہر ہوتی رہی تھی، اور وہ لوگ ہندوؤں کو اس ملک سے فنا کرنے پر آمادہ ہوتے تو اس زمانہ میں کوئی چیز بھی مانع نہ تھی کہ ہندوؤں کو اس طرح اختیار و اقتدار عطا نہ کیا جاتا اور ہندو قوم کو کس مپرسی کے عالم میں فنا ہونے کے لئے چھوڑ دیا جاتا۔ مسلمانوں کو ہندوؤں کے مذہب سے واقف ہونے کا بھی ہمیشہ شوق رہا۔ ابن بطوطہ اپنے سفرنامے میں لکھتا ہے کہ میں نے بارہا سلطان محمد تغلق کو ہندو فقیروں اور جوگیوں کے پاس بیٹھے اور اُن سے باتیں کرتے ہوئے دیکھا۔ سلطان محمد تغلق ایک پابند صوم و صلوٰۃ اور عباسی خلیفہ کی غلامی کا دم بھرنے والا شخص تھا۔ اگر اسلام محکوم قوموں پر ظلم و ستم کی اجازت دیتا تو محمد تغلق کبھی ہندوؤں کے ساتھ درگذر اور احسان کا برتاؤ نہ کرتا۔ لیکن اُس نے کسی ہندو کو اس کے ہندو ہونے کی وجہ سے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ اس جگہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پروفیسر گارڈنر براؤن آنجہانی کے مضمون سے جو یوپی ہسٹاریکل سوسائٹی جرنل میں اور اس کے بعد مشہور علمی رسالہ معارف اعظم گڈھ کی جلد چہارم و پنجم میں شائع ہوا پروفیسر مذکور کے وہ الفاظ جو محمد تغلق کی ہندو نوازی پر روشنی ڈالتے ہیں نقل کر دیئے جائیں مجھ کو پروفیسر صاحب مذکور سے ایک اہم نظریہ سے سخت اختلاف ہے جس کا ذکر آگے آتا ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ پروفیسر مذکور نے اس مضمون کے لکھنے سے پہلے محمد تغلق کے حالات تاریخوں میں غور و تامل کے ساتھ مطالعہ کئے تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ۔

"رہا ہندو رعایا کے ساتھ برتاؤ سو اُن پر سختی و سخت گیری کیسی اس نے تو اکبر سے پہلے ہی ایک طرف ستی کی رسم کو مسدود کرایا دوسری طرف

ہندو راجاؤں کو اعلیٰ جنگی مناصب اور دیگر قابل ہندوؤں کو اعلیٰ ملکی خدمات پر فائز کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس نے دولت مند ہندوؤں کی دولت و ثروت میں مطلق دست اندازی نہیں کی برنی کا زور فرضی پر سب سے بڑا اعتراض یہی ہے کہ اس سے ہندوؤں کی دولت مندی و تونگری میں ترقی ہوتی رہی اس نے (محمد تغلق نے) قدیم و جدید ہندو ریاستوں کو نیم خود مختاری کی حالت میں چھوڑے رکھا۔ اس کے طرز عمل کی دانشمندی سے وہ لوگ تو انکار کر ہی نہیں سکتے جو اکبر کے طرز حکومت کے مداح ہیں"

پھر اس مضمون میں آگے چل کر [illegible] لکھتے ہیں کہ مسلمان مورخوں نے محمد تغلق کو صرف اس لئے برا کہا اور اس کی خوبیوں کو چھپایا ہے کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ بے تعصبی اور رواداری کا برتاؤ کرتا تھا۔ محمد تغلق کی نسبت ہندو مسلمان مورخوں کے [illegible] طرز عمل کی نسبت [illegible] خلاف سمجھا یا غلط بیان کیا ہے [illegible] ہو جائے گا لیکن [illegible] محمد تغلق ہندوؤں کی اس قدر زیادہ [illegible] کرتا تھا [illegible] کے لئے [illegible] موجب ملال ہو سکتی تھی۔

عیسائی مورخوں کی چالاکی عیسائی مورخوں نے ہندوستان کی تاریخیں لکھنے میں [illegible] اصول وضع کر [illegible] اصول [illegible] ہندوستان کے جو مسلمان بادشاہ [illegible] اس [illegible] ہو [illegible] اور [illegible] سرگرمی اور انتہائی چالاکی کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کو [illegible] شاہ کا مذہب [illegible] ثابت ہو جائے [illegible] چالاکی کا ایک خاص پہلو [illegible] ہے کہ وہ [illegible] رہنے والے سلطان کو پابند شریعت [illegible] اور ہر ایک بادشاہ کو پابندی شرع قرار دیتے ہیں۔ عیسائی مورخوں کا [illegible] ایک الگ حیثیت رکھتا ہے۔ ہم کو اس وقت [illegible] بالخصوص [illegible] ہندو [illegible] محمد تغلق کے معاملے میں [illegible] طور پر [illegible] ہے کہ [illegible] تحقیق پر [illegible] اور [illegible] نکالیاں [illegible] محمد تغلق کے دربار میں ہندوؤں کی کثرت اس بات کا سب سے بڑا

ثبوت ہے کہ اس عاقل و عادل بادشاہ نے خسرو خاں نمک حرام اور خسرو خانی ہندوؤں کی شرارت کو انہیں کی ذات تک محدود رکھ کر ساری ہندو قوم کو ذمہ دار نہیں بنایا تھا۔ خواجہ نظام الدین احمد طبقات اکبری میں محمد تغلق کے دربار کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتے ہیں۔

"وجمیع رایان و زمینداران مملکت کمر خدمت بستہ دائم بدرگاہ او حاضر بودند"

ضیاء برنی لکھتا ہے کہ:

"از کثرت طوائف مختلف و اطاعت و بندگی رایان و رانگان و مقدمان بر در درگاہ سلطان محمد رونقے بس شگرف پیدا آمدہ بود کہ آنچناں رونق در سرا و کثرت خلق در عہود ماضیہ مشاہدہ نشدہ است۔"

محمد تغلق کی فرضی حماقتیں بھی ہندوؤں کے لئے مضر نہ تھیں

محمد تغلق نے ایک لاکھ اور بروایت دیگر اسی ہزار سواروں کا لشکر خسرو ملک کی سرداری میں کوہ ہمالیہ کی فتح کے لئے بھیجا اور یہ لشکر تباہ ہو گیا۔

"از اندیشہ ہائے فاسد او این بود کہ خواست کہ کوہ ہماچل کہ مابین ممالک ہند و دیار چین حائل است ضبط نماید و بایں تقریب امرا نامدار و سرلشکران آزمودہ را بالشکرہائے گراں نامزد فرمودہ تا ہمہ بدرون آں کوہ در آمدہ در گرفتن آں کمال سعی بجا آرند چوں لشکر تمام در کوہ در آمد ہندوان کوہ ہماچل تنگیہائے راہ مضبوط کردہ راہ بازگشت لشکر را فرو گرفتہ اکثر را بقتل آوردند" (طبقات اکبری)

یہ محمد تغلق کی غلطی یا حماقت کہی جاتی ہے لیکن اس حماقت سے ہندوؤں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ ایک لاکھ جنگجو مسلمانوں کا ہندوؤں کی شرارت سے ہمالیہ کے درون میں تباہ و برباد ہو جانا مسلمانوں کا عظیم الشان نقصان تھا ہندوؤں کو تو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا نہ بعد میں ان سے کوئی انتقام لیا گیا۔ بجز اس کے کہ چند روز کے بعد ہمالیہ کے اس حصے کو قبضے میں لا کر وہاں امن و امان قائم کر دیا گیا۔

محمد تغلق نے چاندی کے سکوں کی جگہ تانبے کے سکے جاری کئے۔ یہ بھی محمد تغلق کی بہت بڑی خطا بتائی جاتی ہے لیکن اس کی اس حماقت سے مسلمانوں کی سلطنت کا شاہی

خزانہ خالی ہوا ۔ اور ہندوؤں کو حد سے زیادہ نفع پہنچا ۔ جس کو دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹ پڑا ۔ یعنی ہندوؤں نے تانبے کے سکے ڈھالنے شروع کر دیئے ۔ سلطان محمد تغلق سے اس حماقت کے سلسلے میں ایک اور حماقت یہ ہوئی کہ اُس نے تانبے کے سکے کا اعتبار بڑھانے کے لئے یہ اعلان کر دیا کہ جس کا جی چاہے تانبے کے سکے شاہی خزانہ میں داخل کر کے اُن کے عوض چاندی سونے کے سکے لے جائے چنانچہ اس اعلان کو سنتے ہی ہندوؤں نے تانبے کے مصنوعی سکوں کے انبار شاہی خزانے میں لگا دیئے اور چاندی سونے کے انبار شاہی خزانے سے لے گئے ۔

ضیا برنی کہتا ہے کہ

"ہر خانہ از خانہائے ہندواں دار الضرب سدا آمد و ہندوانِ بلاد و ممالک کرورہا و لکھہا از مہر مس ضرب کنانید ند و ہم ازاں خراج میدادند و ہم ازاں اسپ و اسلحہ و نفائس گوناگوں می خریدند و ہوا لگان و مقدمان و خوطان از مہر مس باقوت و شوکت شدند و بہ زرگرے درخانہ خود مہر مس می زدو از مہر مس خزانہ پر می شد سلطان محمد حکم خود را در بابت سکہ مس فسق کرد و فرمان داد تا ہر کہ سکہ مس موجود باشد در خزانہ رسانند و عوض آں مہر زر قدیم از خزانہ ببرند"

غرض کہ سکہ مس والی حماقت نے ہندوستان کے ہندوؤں کو مال دار بنا کر سلطنت اسلامیہ کے خزانے کو خالی کر دیا اس معاملے میں ہندوؤں کو سلطان محمد تغلق کا دعا گو ہونا چاہیے نہ یہ کہ اس کو گالیاں دی جائیں ۔

محمد تغلق نے بجائے دہلی کے دیو گڑھ کو دولت آباد کے نام سے دار السلطنت بنانا چاہا اور باشندگان دہلی کو یہ تکلیف مالا یطاق دی کہ وہ دولت آباد میں جا کر آباد ہوں اس سے دہلی والوں کو بڑی اذیت پہنچی ۔ یہ بھی اس کی بہت بڑی حماقت بتائی جاتی ہے لیکن اس حماقت نے بھی مسلمانوں ہی کو زیادہ نقصان پہنچایا ہندوؤں کو نقصان پہنچنے کا کوئی ثبوت کسی تاریخ سے نہیں ملتا ۔ دہلی جس کو اُس نے ویران کرنا چاہا تھا زیادہ تر مسلمانوں ہی سے آباد تھی ۔ مسلمان وزرا ۔ مسلمان امرا ۔ مسلمان سپہ سالار ۔ مسلمان اہل کار ہی سب سے پہلے اور سب سے زیادہ اس کے اس حکم کا نشانہ تھے کیونکہ یہی لوگ دار السلطنت کے لازم تھے انھیں کے مکانات دہلی میں ویران ہوئے انھیں کو دیو گیر (دولت آباد)

میں اپنے مکانات بنانے پڑے یہاں تک کہ ایک نہایت عظیم الشان سپہ سالار اور سلطنت اسلامیہ کا زبردست بازو یعنی ملتان کا صوبہ دار ملک بہرام ایبہ جو غیاث الدین تغلق کا منہ بولا بھائی ہونے کی وجہ سے سلطان محمد تغلق کا چچا بھی تھا اسی تبدیل سکونت اور دولت آباد میں مکان کی تعمیر کو لیت و لعل میں ڈالنے کے سبب ہلاک و برباد ہوا جس سے سلطنت کی طاقت و قوت میں کمی آئی ہندو دوکانداروں اور دہلی کے تلیل ہندو باشندوں کی قائم مقامی کے لئے دولت آباد میں ہندوؤں کی کمی نہ تھی۔ بہرحال اس معاملے میں بھی ہندوؤں کو اس بات کا حق حاصل نہیں کہ وہ سلطان محمد تغلق کو گالیاں دیں۔

سلطان محمد تغلق نے ایک بہت بڑی فوج ایران و خراسان کی فتح کے لئے جمع کی اور سال یا دو سال تک اُس کے مصارف برداشت کئے مگر خراسان پر چڑھائی نہ کی اور کوئی کام لئے بغیر اُس فوج کو منتشر کر دیا۔ اس سے خزانہ شاہی کو سخت نقصان پہنچا یہ بھی اُس کی حماقتوں میں سے ایک حماقت ہے لیکن اس حماقت سے بھی ہندوؤں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا کیونکہ ضیا برنی اور فرشتہ کی روایت کے موافق اس جدید فوج کی تعداد تین لاکھ ستر ہزار تھی جس میں کئی ہزار مغل بھی شامل تھے یعنی امیر نوروز مغل جو ترمشیرین خاں مغل کا داماد تھا کئی ہزار مغلوں کو لے کر آیا اور سلطان محمد تغلق کی فوج میں نوکر ہو گیا تھا۔ بہت سے افغان بھی افغانستان سے آکر اس فوج میں بھرتی ہوئے تھے۔ اگر سلطان کو ہندوؤں کے برباد کرنے کا کچھ ذرا سا بھی شوق ہوتا تو اس حالت میں کہ وہ خراسان پر حملہ آور نہیں ہو سکا تھا اس پونے چار لاکھ فوج کو جو سال بھر سے زیادہ بیکار رہ کر شاہی خزانے سے تنخواہ پاتی رہی تھی اسی کام پر لگا دیتا کہ ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سب کو نہیں تو موٹے موٹے ہندوؤں کو قتل کر کے اور اُن کے مال و دولت کو جمع کر کے شاہی خزانہ میں شامل کرتے چلے جاؤ۔ لیکن کسی مسلمان کے وہم و گمان میں بھی اس قسم کا بیہودہ خیال نہیں آسکتا تھا۔ ہاں اُن لوگوں کے لئے جو بدھوں کو ہندوستان سے تخم سوختہ کر چکے تھے یا جو مسلمانوں کو ہندوستان سے معدوم کرنے کا ارادہ و خواہش رکھتے ہیں یا ان لوگوں کے لئے جنھوں نے اندلس سے مسلمانوں کے فنا کرنے میں اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کی سنگ دلی و سفاکی کے نمونے پیش کئے ایسا خیال اور ایسا ارادہ

موجب تعجب نہیں ہو سکتا تھا۔

اطناب وطوالت کلام کی معذرت

محمد تغلق کی حماقتوں میں سے ایک یہ حماقت بھی بیان کی جاتی ہے کہ اس نے آدمیوں کا شکار کیا اور بے گناہ مخلوق کو گھیر گھیر کر اس طرح قتل کیا جیسے جنگل کے درندوں کا محاصرہ کرکے ان کا شکار کیا جاتا ہے۔ محمد تغلق کے جرائم کی فہرست میں اس جرم کو بہت زیادہ نمک مرچ لگا کر بیان کیا جاتا ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ اسی جرم نے اس کو سب سے زیادہ کشتنی وگردن زدنی قرار دیا ہے۔ چونکہ محمد تغلق کے جرائم میں یہ سب سے بڑا اور آخری جرم ہے لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اس بے بنیاد جرم کی حقیقت بتانے اور سمجھانے سے پیشتر ان اسباب کو مفصل بیان کر دیا جائے جن کی وجہ سے اس روشن خیال سلطان پر مورخین کے ہاتھوں بے حد ظلم ہوا ہے۔ چونکہ اس کے اس سب سے بڑے نام نہاد گناہ سے سرسری طور پر اس لئے نہیں گذرا جا سکتا کہ ہمارے ہندو دوستوں کی تسکین نہیں ہو سکے گی۔ وہ چونکہ ان شکار ہونے والوں میں بے زبان اور بے دست و پا ہندوؤں کی کثرت کا یقین رکھتے ہیں لہٰذا مجبوراً اس کی تفحص و تفتیش میں زیادہ توجہ سے کام لینا پڑے گا اور اسی سلسلے میں باقی جرائم کی حقیقت اصلیہ بھی کما حقہٗ منکشف ہو جائے گی۔ اگر یہ ایک آخری اور سب سے بڑا جرم اس کی فہرست جرائم میں نہ ہوتا تو محمد تغلق کا بیان، جو اس تصنیف کے لئے ضروری تھا ختم ہو چکا تھا اور اس سے آگے ایک سطر بھی لکھنے کی ضرورت نہ تھی لیکن میں محمد تغلق کے مفصل حالات اور اس کے عہد حکومت کی مکمل تاریخ اسی سلسلہ تصنیف میں درج کرنے پر مجبور ہوں۔ میں نے اس جگہ محمد تغلق کے تفصیلی حالات حکومت کو اس لئے بھی درج کرنا ضروری سمجھا ہے کہ صرف یہی ایک سلطان ایسا ہے جس کے متعلق مسلمان بھی عام طور پر مبتلائے غلط فہمی ہیں۔ نہ صرف اسی زمانے کے مسلمان بلکہ متقدمین میں بھی اس غلط فہمی کا وجود موجود پایا جاتا ہے۔ اس تصنیف کا اصل مقصد ہندو مسلم تعلقات کو بے پردہ کرکے ہندوؤں کی غلط فہمیوں کے دور کرنے کا سامان فراہم کرتا ہے۔ لیکن محمد تغلق کے معاملے میں مسلمانوں کی غلط فہمیوں کا رفع کرنا چونکہ ہندوؤں کی غلط فہمیوں کے رفع کرنے سے بھی زیادہ ضروری ہے اور بغیر اس کے اول الذکر اصل مقصد بھی حاصل نہیں ہو سکتا لہٰذا

محمد تغلق کا مفصل حال درج کر کے اس ضروری کام کو اسی سلسلے میں ختم کر دینا میں نے مناسب سمجھا۔ قارئین کرام سے توقع ہے کہ وہ ضرورت اور مجبوری کا اندازہ کرنے میں غلطی نہ کر کے مجھ کو زیادہ موردِ الزام نہ بنائیں گے۔

محمد تغلق کے مفصل حالات

محمد تغلق کے معاملے میں میں نے تن آسانی اور سہل انکاری سے مطلق کام نہیں لیا۔ محمد تغلق کے حالات کو ہر ممکن مقام سے تلاش کیا۔ اس کے ہم عہد اور قریب العہد مورخین کی کتابوں میں اس کے حالات کو کئی کئی مرتبہ پڑھا۔ میں اپنے غور و فکر اور وسیع مطالعہ کے بعد ایک ایسے نتیجے پر پہنچا جس پر پہنچنے کو میرا جی نہیں چاہتا تھا یعنی ضیاء برنی کے دانستہ یا نادانستہ طرزِ عمل سے اس عظیم الشان سلطان پر بہت بڑا ظلم ہوا ہے۔ اور عجیب تر یہ کہ بعد کے بعض مورخین نے ضیاء برنی پر یہ اُلٹا الزام لگایا کہ اس نے فیروز شاہ تغلق کی وجہ سے محمد تغلق کی رعایت کی۔ حالانکہ ضیاء برنی ہی کی تاریخ ہے جس نے اس سلطان کو ظالمانہ طور پر بدنام اور رسوائے عام کیا ہے۔

محمد تغلق پر ضیاء برنی کا ظلم

ضیاء برنی نے سلطان غیاث الدین بلبن کے ابتدائے عہد حکومت سے لے کر سلطان محمد تغلق کی وفات کے چند سال بعد تک کے حالات اپنی ذاتی تحقیق کی بنا پر لکھے ہیں ضیاء برنی بہت معتبر مورخ مانا جاتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تاریخ نویسی کے معاملے میں اس کا مرتبہ بہت ہی بلند ہے۔ اس نے جو کچھ لکھا ہے بڑی احتیاط اور کامل تحقیق کے بعد لکھا ہے جس کے لئے اس کی تاریخ خود شاہدِ عدل ہے لیکن محمد تغلق کے متعلق اس کی تاریخ کا جو حصہ ہے وہ تاریخ کے باقی حصص سے بالکل جدا اور ایک الگ حیثیت رکھتا ہے۔ ضیاء برنی نے ۷۵۸ھ میں جب کہ اس کی عمر چوہتر سال کی تھی اپنی تاریخ ختم کی۔ سلطان محمد تغلق کی وفات ماہ محرم ۷۵۲ھ میں ہوئی۔ جب کہ ضیاء برنی کی عمر ۶۸ یا ۶۷ سال کی تھی سلطان محمد تغلق کی تخت نشینی کے وقت ضیاء برنی کی عمر چالیس سال کی تھی۔ غیاث الدین بلبن کی وفات کے وقت ضیاء برنی کی عمر ایک سال اور چند مہینے کی تھی۔ یعنی غیاث الدین بلبن کا عہدِ حکومت ضیاء برنی نے بالکل نہیں دیکھا اور سلطان محمد تغلق کا عہدِ حکومت

از ابتدا تا انتہا اس کی آنکھوں کے سامنے گذرا جب کہ وہ اچھی طرح عاقل بالغ اور صاحبِ منصب تھا۔ غیاث الدین بلبن نے بائیس سال اور محمد تغلق نے ستائیس سال حکومت کی غیاث الدین بلبن کے عہدِ حکومت میں اہم اور قابلِ تذکرہ حوادث کی تعداد بہت ہی کم اور محمد تغلق کا عہدِ حکومت غیر معمولی طور پر عجیب و اہم واقعات کی کثرت سے لبریز ہے۔ لیکن ضیاء برنی نے سلطان بلبن کے بائیس سالہ حالات میں اپنی کتاب کے جس قدر صفحات وقف کئے ہیں محمد تغلق کے ستائیس سالہ عہدِ حکومت کو اتنے صفحات نہیں دے سکا اس سے بھی زیادہ عجیب یہ کہ علاء الدین خلجی جس نے ۱۹ یا ۲۰ سال حکومت کی اس کے حالات کو محمد تغلق کی نسبت دُگنے صفحات میں بیان کیا ہے۔ محمد تغلق کی نسبت یہ اختصار بجائے خود معنی خیز اور قابلِ توجہ ہے۔ لیکن جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ محمد تغلق والے صفحات میں تاریخی شان مفقود اور معاندانہ اسلوب بیان ہر جگہ موجود ہے تو حیرت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ ضیاء برنی اپنی تاریخ میں اکثر ترتیبِ زمانی کو ملحوظ رکھتا اور واقعات کو بقیدِ سن و سال بیان کرتا ہے۔ لیکن محمد تغلق کے حالات میں یہ چیز بالکل غائب ہو جاتی ہے اور ستائیس سال کے حوادث کو بالکل گڈ مڈ کرکے اور باعتبار نوع چند فصلوں میں منقسم کرنے کے بعد اس طرح بیان کرتا ہے کہ پہلے سال کا ایک واقعہ بیسویں سال کے کسی واقعہ سے متعلق نظر آتا ہے اور پڑھنے والا ترتیبِ زمانی کے غائب ہو جانے کی وجہ سے اپنی فہم و فراست کو بالکل بیکار و معطل پاتا اور اسی نتیجے کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے جو ضیاء برنی نے برآمد کرنا چاہا ہے۔

ضیاء برنی کی تاریخ کو سامنے رکھ کر کوئی شخص ہندوستان کے قابلِ تذکرہ واقعات کی بطور اشارات ایک فہرست بقیدِ سن و سال مرتب کرنا چاہے تو وہ سلطان غیاث الدین بلبن کے شروع عہدِ حکومت سے لے کر غیاث الدین تغلق کے آخر عہدِ حکومت تک اس فہرست کو باسانی لکھتا چلا جائے گا۔ لیکن محمد تغلق کے تذکرہ پر پہنچ کر وہ دیکھے گا کہ قابلِ تذکرہ واقعات تو ہیں لیکن فہرست میں اُن کی ترتیب قائم نہیں ہو سکتی ضیاء برنی محمد تغلق کے معاملے میں اس مخصوص طرزِ عمل کا خود بھی مقر ہے وہ کہتا ہے کہ

"من دریں تاریخ کلیات مصالح جہانداری و اُمہات امور ملک رانی سلطان محمد نبشتہ و در تقدیم و تاخیر ہر فتحے و اول و آخر ہر سرگذشتے و فتنہ و حادثۂ نظر

نیند اختہ وترتیب نسق مراعات ننمودہ کہ اہل دانش را ازمطالعۂ کلیات مصالح جہاں داری ومہمات امور ملک رانی اعتبار واستبصار حاصل شدہ نیست ":

پھر ایک دوسری جگہ فتن وحوادث کے زیرعنوان لکھتا ہے کہ

"واگرچہ حوادث وفتن وبغی وشطط کہ در ملکِ سلطان محمد زاد برحسب ترتیب وتعیین تاریخ درقلم نیامدہ است وتشریح تمام نشدہ فاما جملۂ کردار کہ محصل غرض مطالعہ کنندہ بود نوشتہ ام":

تعجب کی بات یہ ہے کہ بے چارہ محمد تغلق ہی کے حالات میں کلیات واہمات کا انتخاب بلالحاظ تقدیم وتاخیر کیوں ضروری سمجھا گیا اور دوسرے بادشاہوں کے حال پر یہ مہربانی کیوں نہیں فرمائی گئی ؎

برزم ننں غیروں کی پہلے سب سے ہم پر التفات
کچھ نہ کچھ آمیزہ ساقی تیرے پیمانے میں ہے

محمد تغلق کے ساتھ ضیاء برنی کی یہ خصوصیت ایسی نہیں کہ اس کو نظر انداز کردیا جائے۔

ضیاء برنی کی چالاکی

ضیا برنی محمد تغلق کی اُن خوبیوں سے جو معلوم عوام اور بطور ضرب المثل زبانوں پر جاری تھیں انکار نہیں کرتا کیونکہ اس انکار سے وہ خود اور اس کی تاریخ ذلیل ہوسکتی تھی۔ اس سے اُس کی دانائی اور ہوشیاری کا ایک ثبوت بہم پہنچتا ہے وہ محمد تغلق کے کسی چھوٹے سے چھوٹے عیب کو بھی ذکر کئے بغیر نہیں چھوڑتا بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس کے عیبوں کے تلاش کرنے اور اس کی برائیوں کے بیان کرنے میں نہایت ہوشیاری کے ساتھ پُراثر الفاظ اور یقین دلانے والا لہجہ اختیار کرتا ہے۔ ساتھ ہی واقعات اور حوادث کی ترتیب زمانی کو بگاڑ کر اس نے اس طرح مرتب کردیا ہے کہ پڑھنے والا خواہ مخواہ اس سلطان سے بدعقیدہ ہوجاتا ہے۔ ضیاء برنی نے محمد تغلق کے معاملہ میں بڑی ہی چالاکی سے کام لے کر خود ہی اس کو جامع اضداد قرار دے دیا ہے۔ ضیاء برنی نے سلطان محمد تغلق کے کارناموں کا تذکرہ تو حد سے زیادہ مختصر کردیا ہے لیکن اس کے اخلاق وعادات کا بیان کرنے میں بہت تفصیل اور غیر ضروری طوالت سے کام لے کر اوراق رنگتا چلا گیا ہے۔

اس کی خوبیاں بیان کرنے ہوئے مبالغہ آمیز الفاظ جو اثر سے بالکل خالی ہوتے ہیں بکثرت استعمال کرتا ہے اور بیچ بیچ میں ایسے فقرات لکھ جاتا ہے جس سے تمام مذکورہ مدحیہ الفاظ کا اثر زائل ہو کر اس کی برائی کا یقین مستحکم ہو جاتا ہے مثلاً وہ لکھتا ہے کہ

"باری تعالٰی وتقدس اسمائہ سلطان مغفور محمد بن تغلق شاہ را از عجائب آفرینش ولوادر آفریدگان آفریدہ بود و بہتے کہ تشبیہ وتمثیل آں نہ در آسمان گنبد و نہ زمین احتمال کند متصف گردانیدہ و در جبلت او خاص اوصاف جہانگیری ولوازم اخلاقِ جہانداری منظور گردانید و در رگ رگ و موئے موئے او جمشیدی و کیخسروی سررشتہ دبہتے کہ بے فرماں روائی ربع مسکوں قرارنمی گرفت و او را آراستہ و سینۂ او را بہ تمنائے کہ بر جن و انس آمر شود پیراستہ"

اسی قسم کے الفاظ لکھتے لکھتے بطور طنز کہتا ہے کہ

"و در ازمنۂ اخیر جمشیدی وفریدونی ظاہر شدہ و در اعصار و اپسیں سلیمانی و سکندری ظاہر گشتہ"

آگے چل کر کہتا ہے کہ

"خواستے کہ در جہان کیومرثی وفریدونی کند و بر عالمیاں بجمشیدی وکیخسروی سرافرازی ورزد و بمرتبۂ سکندری کفایت نماید و مرتبہت سلیمانی متعالی گردد و امرا و بر جن وانس نفاذ باید و احکام نبوت وسلطنت از دار السلطنت او معاور شود و پادشاہی را باپیغمبری جمع کند و من در مشاہدۂ علو ہمت کہ او اعجب العجائب آفرینش بود حیراں و سراسیمہ می گشتم کہ اگر ہمت آں پادشاہ را بہمت فرعونی و نمرودی تشبیہ کنم کہ علو ہمت ایشاں جز خدائے کردن وبندگانِ خدائے را در رقبۂ بندگی خود درآوردن در دل مقام نکردہ است و در حصول ہیچ دیگر جز خدائے متفوق نگشتہ نتوانم زیرا کہ ادائے صلوٰۃ خمسہ و اعتقاد اسلامی موروث و سائر طاعات وعبادات سلطانی محمد مانع ایں چنیں اعتقادے می شود"

ضیاء برنی کے ان الفاظ کو سلطان محمد تغلق کی مدح وثنا سمجھ لو یا اس کی نسبت

گالیاں تصور کرلو۔ اسی قسم کی دو معنین عبارت میں ضیا۔ برنی نے مسلسل آٹھ دس صفحے رنگ ڈالے ہیں جن میں سلطان محمد تغلق کی ہجو یا ہجو ملیح کے سوا کوئی مضمون نہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے سینہ میں انتقام کا ایک سمندر موج زن ہے جس میں کسی طرح سکون پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے بعد دوسرے باب میں وہ سلطان محمد تغلق کی حماقتیں اور غلط کاریاں گنوانی شروع کردیتا ہے اور اسی قسم کا مخصوص ادائے بیان اختیار کرتا ہے۔ ایک سب سے بڑا ظلم ضیار برنی نے محمد تغلق پر یہ کیا ہے کہ جا بجا اس بات کی شکایت کرتا ہے کہ سلطان محمد تغلق نے پرانے زمانے کے اکثر ضوابط وآئین منسوخ کرکے نئے ضوابط جن کا نام اُس نے اسلوب رکھا تھا ایجاد کئے اور سلطنت کا کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جس کے متعلق نئے اسلوب جاری نہ کئے ہوں وہ ان اسالیب جدیدہ کے جاری کرنے کو بُرا تو بار بار بتاتا ہے لیکن ان جدید ضوابط کو پیش نہیں کرتا۔ ایک جگہ کہتا ہے کہ یہ سنئے ضوابط عقلی اور منطقی طور پر تو بڑے اچھے تھے۔ لیکن ان پر عمل کرنا اور ان کا رائج ہونا دشوار تھا۔ یہاں کبھی کسی ایسے ضابطے کو بطور مثال نقل نہیں کیا تاکہ کتاب کے پڑھنے والے کو کچھ تو اندازہ ہوجاتا کہ وہ نئے قوانین کس قسم کے تھے اور جو منسوخ کئے گئے تھے وہ کیسے تھے۔ یہ تذکرہ آگے بھی آنے والا ہے۔

بہرحال ضیار برنی کی تاریخ کا پُرغور مطالعہ کرنے والے کو اس بات کا اقرار کرنا پڑے گا کہ مولانا ضیاءالدین برنی کو سلطان محمد تغلق سے نفرت تھی اور اُنھوں نے بڑی قابلیت اور ہوشیاری کے ساتھ واقعہ نگاری میں دروغ بیانی کو دخل دیئے بغیر اور اپنے مرتبہ تاریخ نگاری کی بظاہر حفاظت کرتے ہوئے ایسا طرزِ عمل اختیار کیا اور اس کے حالات کو اس طرح ترتیب دیا کہ اس کی خوبیاں زیر حجاب آگئیں۔

محمد تغلق کا جامع اضداد ہونا

محمد تغلق کے حالات معلوم کرنے کے لئے ضیار برنی جیسے لائق اور ہم عہد مورخ سے بہتر دوسرا شخص نہیں مل سکتا تھا لہذا بعد کے ہر ایک مورخ نے ضیار برنی کی تاریخ کو محمد تغلق کے لئے سب سے بہتر اور مستند تاریخ سمجھا۔ جو کچھ اور جس طرح وہ لکھ گیا تھا اسی کی نقل سب نے اپنے اپنے الفاظ میں کردی اور اس طرح تاریخ کا ایک مسلمہ مسئلہ یہ بن گیا کہ سلاطین عالم میں محمد تغلق بہت بڑا عقلمند اور بہت بڑا بیوقوف بہت بڑا خوش اخلاق اور بہت

بڑا بدخلق ۔ بہت بڑا متواضع و منکسرالمزاج اور بہت بڑا جابر و متکبر۔ بہت بڑا ارحم دل اور بہت بڑا ظالم و سفاک۔ مختصر یہ کہ جامع اضداد سلطان گذرا ہے۔ مانا کہ خوارق عادات کا ظہور دنیا میں وقتاً فوقتاً ہوتا رہا ہے لیکن فہم و فراست سے کام لینے اور واقعات کی چھان بین میں خوب سوچنے سمجھنے والوں کو اپنے دل کی تسکین حاصل کرنے اور امکانی کوشش کو انتہا تک پہنچانے سے روکنے کا حق غالباً کسی کو حاصل نہیں۔ تعجب ہے کہ اضداد کے جمع ہونے کو محال قرار دے کر دنیا کے بڑے بڑے پیچیدہ معقولی و منطقی مسائل توڑے کئے جائیں لیکن محمد تغلق کے معاملے میں ضیا برنی کی تاریخ فیروز شاہی کو پیش کر کے اس محال کو ممکن و موجود بلکہ محسوس و مشہود کا جامہ پہنا دیا جائے۔

ضیا برنی محمد تغلق سے کیوں ناراض تھا

ہم کو تاریخی مطالعہ کرنے والے طالب علم کے اس سوال کا جواب ضرور دینا چاہیئے کہ ضیا برنی کو محمد تغلق سے نفرت کیوں تھی اور محمد تغلق کی اصل تصویر جس کو ضیا برنی نے چھپا دیا ہے کیسی تھی؟

اس سوال کے پہلے حصے کا جواب جو پروفیسر گارڈنر براؤن کے متذکرۂ بالا مضمون میں موجود ہے اس کا حاصل مطلب یہ ہے کہ "ضیا برنی ایک مذہبی خیال کا شخص تھا وہ مسلمان مولویوں کے اقتدار کا خواہاں تھا۔ محمد تغلق علمائے دین کی ماتحتی میں رہنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ ہندوؤں کے ساتھ بڑی بڑی رعایتیں اور احسانات کرتا اور ان کے اقتدار کو بڑھاتا تھا اس لئے ضیا برنی محمد تغلق سے خوش نہ تھا"۔ پروفیسر صاحب ممدوح کے نزدیک محمد تغلق اسی قسم کا وسیع المشرب بلکہ لامذہب شخص تھا۔ جیسا کہ اس سے دو سو سال کے بعد ہندوستان کا بادشاہ اکبر تھا۔ جس طرح اکبر کی ہندو نوازی سے بعض مسلمان ناخوش ہوئے اسی طرح ضیا برنی محمد تغلق سے ناخوش ہوا۔ میں اس جواب کو صحیح اور غلطی سے پاک نہیں سمجھتا۔ محمد تغلق کی ہندو نوازی لامذہبیت کی وجہ سے ہرگز نہ تھی وہ سچا پکا مسلمان۔ پابندِ صوم و صلوٰۃ اور انتہا درجہ کا متبع شریعت تھا۔ اس نے ساری عمر کبھی شراب کو ہاتھ نہیں لگایا کبھی زنا کے پاس نہیں پھٹکا۔ حضرت شاہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہوا تو اُن کے جنازے کو اس سلطان نے خود کاندھا دیا اور کفن دفن میں آخر تک معمولی آدمیوں کی طرح شریک رہا۔ خود ضیا برنی کو سلطان

کی پابندی شرع کا اقرار ہے وہ کہتا ہے کہ

"باری تعالیٰ سلطان محمد را از عجائبات آفرینش در وجود آوردہ و او را از کمالات و اوصاف متضادہ او در حوصلۂ علم علما و عقل عقلائی گنجد و حیرت العقول ثمرہ می دہد و چگونہ در اوصاف او حیرت و سراسیمگی بارنیا رد کہ شخصے را کہ اسلام موروثی بود و پنج وقت نماز فرائض ادا کند و ہیچ مسکرے از مسکرات نہ چشیدہ و از زنا و لواطت و نظر بحرام و خیانت لو رزد و ہیچ قمارے نباز دو از فسق و فجور معتاد اجتناب و احتراز نماید و باایں ہمہ خون مسلمانان سنی و مومنان صافی اعتقاد چوں جوئے آب بر طریق سیاست پیش دا خول سلطانی رواں گرداند و آنچناں لبسیاری سیاست اہل اسلام کہ قطرۂ خون ایشاں عند اللہ عزیز تر از دنیا و مافیہا ست دل او نہ ہراسد"

دیکھو سلطان کی وہ تمام خوبیاں جو اس کے سچے پکے مسلمان ہونے کی دلیل ہیں بیان کرنے کے بعد اس بات کی شکایت کرتا ہے کہ وہ اپنے دروازے کے سامنے مسلمانوں کا خون بہانے میں ذرا تامل نہیں کرتا۔

ناراضگی کی وجہ ہندو نوازی نہ تھی ضیاء برنی اس بات کا شکوہ نہیں کرتا کہ سلطان ہندوؤں پر کیوں مہربان ہے یا ہندوؤں پر سختی کیوں نہیں کرتا بلکہ وہ بار بار اور بڑے جوش و غضب کے لہجے میں یہی کہتا ہے کہ محمد تغلق کو مسلمانوں کے قتل کرنے اور مسلمانوں کو اذیت پہنچانے میں ذرا تامل نہیں۔ اول سے آخر تک محمد تغلق کا تمام حال تاریخ برنی میں پڑھ جاؤ۔ بیسیوں جگہ اس کو اسی بات کا شاکی پاؤ گے کہ محمد تغلق مسلمانوں کے قتل کرنے اور سزا دینے میں بہت بے باک ہے۔ لیکن ہندو نوازی کا شکوہ کہیں نظر نہ آئے گا۔ اوپر کے اقتباس میں بھی ضیاء برنی کے آخری الفاظ کو دیکھو کس موثر پیرائے میں لکھے ہیں۔ ضیاء برنی نے صرف ایک جگہ ہندوؤں کے معاملے میں محمد تغلق کی شکایت کی ہے۔ جہاں یہ ذکر کیا ہے کہ ہندوؤں نے دھوکا اور فریب دے کر چاندی سونے کے سکے تانبے کے سکوں کے عوض جمع کر لئے اور خوب مال دار ہو گئے۔ لیکن سلطان نے کوئی تدارک نہیں کیا اور ناجائز طور پر فراہم کیا ہوا روپیہ ہندوؤں سے واپس نہیں مانگا۔ یہ ایک بہت ہی

معمولی سی بات ہے۔ جو بالکل بے ساختگی کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔ ضیاء برنی محمد تغلق سے اس لئے ناراض نہ تھا کہ وہ ہندو نواز کیوں ہے اگر ایسا ہوتا تو وہ ہندو نوازی کی ہجو میں دریا بہا دیتا اور خوب آزادی سے لکھتا لیکن وہ زمانہ آج کل کا زمانہ نہ تھا جب کہ مسلمانوں کی سلطنت ہندوستان سے مٹ جانے کے بعد ہندو مسلمانوں کے درمیان رقابت اور مخالفت کے طوفان برپا ہیں۔ اسلام نے غیر مسلم رعایا کے ساتھ بے انصافی کرنے اور ان پر ظلم وستم روا رکھنے کی ہرگز ہرگز اجازت نہیں دی اور مسلمانوں نے اپنے عہدِ حکومت میں کبھی بھول کر بھی اس کا خیال نہیں کیا۔ محمد تغلق کی ہندو نوازی کا سبب اس کا مسلمان اور پابند شرع ہونا تھا نہ لا مذہب ہونا۔ جیسا کہ پروفیسر گارڈنر براؤن نے سمجھا ہے۔ ضیاء برنی کا محمد تغلق سے ناراض ہونا بھی اس لئے نہیں تھا کہ وہ ہندو نواز تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ وجہ ناراضگی کسی طرح چھپ نہیں سکتی تھی۔

ضیاء برنی کی مذہبیت

پروفیسر موصوف کا یہ کہنا بھی کہ ضیاء برنی ایک مذہبی شخص تھا کسی قدر تشریح طلب ہے۔ ضیاء برنی نے اور اسی قریبی زمانے کے دوسرے مورخ شمس سراج عفیف نے جو تاریخیں لکھی ہیں وہ دونوں ایک ہی نام یعنی تاریخ فیروز شاہی کے نام سے موسوم ہیں میرے سامنے اس وقت دونوں کتابیں موجود ہیں، میں نے دونوں کا بار بار بغور مطالعہ کیا ہے۔ شمس سراج عفیف بھی اگرچہ گور پرستی اور بدعات کی جانب بہت مائل ہے تاہم اس میں مذہبیت زیادہ ہے اس کے مقابلے میں ضیاء برنی کو مذہبی شخص کہتے ہوئے دل ہچکچاتا ہے۔ ضیاء برنی نے خاندانِ غلامان کے آخری بادشاہ کیقباد کی امرد پرستی و شراب خواری وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے اپنی قابلیت انشا پردازی اور شاعرانہ مضمون آفرینی کا اظہار جس طرح مزے لے لے کر کیا ہے اور بڑھاپے میں (کیونکہ اس نے محمد تغلق کی وفات کے بعد تاریخ لکھنی شروع کی تھی) جس حسرت کے ساتھ اپنی رند مشربی کا پتہ دیا ہے وہ پڑھنے اور دیکھنے ہی سے تعلق رکھتا ہے اور پڑھنے والے کو مجبوراً یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ ضیاء برنی ایک منشی، امیرزادہ، ذی عزت، ہوشیار، سلیقہ شعار، عالموں اور صوفیوں کا صحبت یافتہ سب کچھ سہی۔ لیکن علم دین کا عالم نہ تھا نہ پابندیٔ شرع کا اس کو خیال تھا۔ عام پڑھے لکھے مسلمانوں کو جس قدر دینی واقفیت ہوا کرتی ہے وہی اس کو بھی

حاصل تھی۔ دینی معلومات اور دینی مسائل میں غور و انہماک اس کو میسر نہ تھا۔ شمس سراج عفیف اپنی کتاب میں جابجا آیات قرآن و احادیث نبوی کو نہایت بے ساختگی اور سلیقہ سے نقل کرتا ہے۔ لیکن ضیاء برنی کے یہاں یہ چیز بہت ہی شاذ ہے۔ شمس سراج عفیف نے کسی جگہ بھی متانت و سنجیدگی کو ہاتھ سے نہیں دیا۔ لیکن ضیاء برنی کی تاریخ کے بعض صفحات جہاں وہ کسی جشن یا مجلسِ عیش کا ذکر کرتے ہوئے اپنی جادو نگاری کا اظہار کرتا ہے اس قابل نہیں ہیں کہ کوئی بیٹا اپنے باپ کو یا کوئی باپ اپنے بیٹے کو پڑھ کر سنا سکے۔ لہٰذا جس طرح محمد تغلق کو مذہب سے بے پروا کہنا اور اس کی ہندو نوازی کا سبب لامذہبیت بتانا غلط ہے اسی طرح ضیاء برنی کی مذہبیت کو ضیاء برنی کی ناراضگی کا سبب قرار دینا بھی سراسر غلط ہے۔

بدعات مراسم و اوہام پرستی کا طوفان

محمد تغلق کے ساتھ ضیاء برنی کی ناراضگی و نفرت کے اسباب تلاش کرنے میں اس زمانے کے ممالکِ اسلامیہ کی حالت پر بھی پُرغور نظر ڈالنی از بس ضروری ہے ورنہ اصل حقیقت سمجھ میں نہیں آسکے گی۔ ساتویں صدی ہجری کے وسط میں فتنۂ تاتار نے بغداد کے اندر خلافتِ عباسیہ کا چراغ گل کر دیا اور عالمِ اسلامیہ میں سخت ہلچل اور افراتفری برپا ہوئی تو ہزارہا مسلمانوں نے دنیوی کاموں اور اس مادی دنیا کی سرگرمیوں سے متنفر مایوس ہو کر گوشہ نشینی اور ترکِ علایق کے بعد خاموش زندگی شروع کی۔ جابجا صوفیوں کی خانقاہیں آباد نظر آنے لگیں۔ یہی خانقاہیں مسلمانوں کا قبلۂ توجہ بن گئیں اور اس قسم کے نغمے سنائی دینے لگے۔

بہ گردِ کعبہ کے گردم کہ روئے یارِ من کعبہ
طوافِ یارِ خود کردم بوسم پائے مستاں را

تبت، منگولیا، ترکستان، خراسان، ایران، عراق، شام، آذربائیجان سب مغلوں کے زیر نگیں تھے جو غیر مسلم اور مسلم کش تھے۔ بعض عالموں اور بعض صوفیوں نے ان کافر مغلوں کو اسلام کی خوبیوں سے واقف کرنے کی مبارک کوششیں کیں۔ غیر مسلم فرماں رواؤں کو مسلمان بنانے اور اسلام کی طرف متوجہ کرنے کی مشکلات کے ساتھ ایران و خراسان کی اس مخصوص آب و ہوا نے جو ابو مسلم خراسانی اور عباسیوں کی خفیہ سازشوں کے زمانے

سے موجود اور حسن بن صباح اور اس کے جانشینوں کی مسلسل کوششوں کے سبب طوفان الحاد بن چکی تھی مل کر تصوف کی خانقاہوں کو ایک ایسے قالب میں ڈھال دیا کہ بمشکل ان کو نیم مذہبی ادارات کہا جاسکتا تھا۔ حکومت کے چھن جانے کے بعد جیسا کہ ہر ایک قوم کے اخلاق معاشرت، تمدن، خیالات اور ہمت و حوصلہ پر گہرا اثر پڑا کرتا ہے اسی طرح مسلمانوں کی قوم بھی متاثر ہوئی۔ وسعتِ حوصلہ کی جگہ تنگ دلی اور کوتاہ نظری پیدا ہونے لگی، مذہب پر یہ اثر پڑا کہ بات بات پر کفر و الحاد کے فتوے عالم نما جاہلوں کی طرف سے صادر ہونے لگے۔ حکمتِ شریعت جس کا نام تصوف تھا وہ بھی ایک عجیب و غریب قالب میں ڈھل گئی اور تصوف اپنے اصل مفہوم سے بالکل جدا ہوگیا۔ جاہ پرستی و دنیا طلبی کے جذبے نے بیدار ہوکر مسلمانوں میں دین کو دنیا پر قربان کرنے کا طوفان برپا کردیا۔

ہندوستان میں جن مسلمانوں نے اسلامی شہنشاہی قائم کی تھی وہ سب جنگی خاندان اور سپاہی پیشہ لوگ تھے نومسلموں کی ایک بڑی تعداد مبلغین اسلام اور صوفیائے کرام کی کوششوں سے موجود ہوگئی تھی جن میں وہ نومسلم بھی شامل تھے جو عہد خلجیہ میں مسلمان ہوکر اسی ملک میں رہ پڑے تھے اور ان کو مغلہ یا مولا یا نومسلم کہا جاتا تھا محمد تغلق بغداد کی تباہی سے ساٹھ ستر سال بعد تخت نشین ہوا تھا۔ اس ساٹھ یا ستر سال میں سادات و شیوخ کی ایک بہت بڑی تعداد خراسان و ایران و عراق سے پہلی مرتبہ ہندوستان میں آئی۔ ہندوستان کی اسلامی سلطنت نے چونکہ مغلوں کو ہندوستان میں ذرا بھی قدم جمانے کا موقع نہیں دیا اور ہر مرتبہ اُن کو شکست دے دے کر بھگا دیا تھا۔ لہٰذا سادات و شیوخ کا مذکورہ سیلاب ہندوستان کی طرف متوجہ ہوگیا ان باہر سے آنے والے مسلمانوں میں بڑی تعداد انھیں لوگوں کی تھی جو خراسان و ایران کی خانقاہوں سے متاثر اور اُن کی عظمت کے قائل تھے۔ ساتھ ہی ملاحدۂ الموت بھی جن کی سلطنت بغداد کی تباہی سے ایک سال پہلے برباد ہوچکی تھی۔ قہستان سے ہندوستان ہی میں بھاگ آئے تھے اور یہاں آکر ہندوستان کے مختلف حصوں میں تصوف کی اکثر خانقاہوں کے بانی بن گئے تھے غرضکہ جس طرح ایران و خراسان و عراق اور دوسرے اسلامی ممالک میں قرآن و حدیث کے درس کا رواج کم ہوجانے سے ہزار ہا بدعات کے مجموعہ کو اسلام سمجھ لیا گیا تھا اسی طرح ہندوستان میں بھی بہت سے افعالِ شرکیہ و بدعیہ نے رواج پاکر اعمالِ اسلامیہ کا جامہ

پہن لیا اور وحدت وجود کے عقیدے نے ہندو تصوف کو اپنے موافق اور موید پاکر ہندوستان میں ایک عالمگیر طوفان الحاد برپا کرکے تصوف کے نام سے جاہل مسلمانوں کی عقیدت و تعظیم کو بآسانی اپنی طرف جذب کرلیا۔ سلطان ناصرالدین محمود اور سلطان غیاث الدین بلبن کے عہدِ حکومت میں مغلوں کے ستائے ہوئے بہت سے امرا خراسان و عراق و ایران سے فرار ہو ہوکر ہندوستان آگئے تھے جیسا کہ پہلی جلد یعنی گذشتہ باب میں بیان ہوچکا ہے ان لوگوں کے ساتھ ہی مذکورہ ملکوں کے صوفیوں اور مذہبی لوگوں کا سیلاب بھی ہندوستان میں داخل ہوگیا تھا۔ ناصرالدین محمود اور غیاث الدین بلبن کی زبردست اور منظم سلطنت کے زمانے میں اس جدید سیلاب کا کوئی نمایاں اثر ظاہر نہ ہوا۔ معزالدین کیقباد کی چہار سالہ سلطنت میں جو فسق و فجور اور سخت گمراہی و لامذہبی کا زمانہ تھا باطل کی تمام قوتوں نے عملی جامہ پہن کر اپنے آپ کو نمایاں کردیا اور اسی زمانے میں ایران کے ان مزدکی اعمال نے جو ملاحدۂ الموت کے ذریعہ ہندوستان میں آئے ہندوستان کے شاکت مت اور بام مارگی عقائد و اعمال کے ساتھ ممتزج ہوکر وہ صورت اختیار کی جس کو افواہاً بعض مسلمان کہلانے والے قلیل التعداد فرقوں کی مخصوص عید کی طرف منسوب کردیا جاتا ہے۔ پہلی جلد میں سلطان علاءالدین خلجی کے حالات میں ان بے حیاؤں کے مٹائے جانے کا ذکر ہوچکا ہے۔ سلطان جلال الدین خلجی بہت نیک نیت اور پاک باطن سلطان تھا مگر بڑھاپے کی وجہ سے نرم دلی، عفو اور درگذری صفت اس کے مزاج میں بہت بڑھ گئی تھی۔ اور اسی لئے گذشتہ چہار سالہ بدتمیزیوں کی شکایت سلطان جلال الدین خلجی ان الفاظ میں کرتا ہے کہ

"ہرروز ہندوان مندل زنان و بوق زنان در زیر کوشک من می گذارند و درجون رجمن، می آیند و بت پرستی می کنند و احکام شرک و کفر رادر نظر ما قوادکان بے حمیت کہ خود را پادشاہ مسلمان می خوانانیم و بادشاہ اسلام می گویانیم رواج می دہند۔"

سلطان علاءالدین خلجی کے عہدِ حکومت میں ملکی انتظام تو بہت اچھا رہا لیکن مسلمانوں کی اصلاح اور پابندیٔ کتاب و سنت کی جانب قطعاً کوئی توجہ کسی نے نہیں کی اور بدعات و لغویات کا طوفان برابر ترقی پذیر اور مسلمانوں کے عقائد و اعمال کو مسلسل ماؤف کرتا رہا غرض

۶۸۵ھ سے ۷۲۵ھ تک چالیس سال کا زمانہ ہندوستان پر ایسا گذرا کہ الحاد و بے دینی اور شرک و بدعت کو شایع ہونے اور رواج پانے کا خوب موقع ملا۔ اس تاریکی میں اگر کسی جگہ دین و ملت کی روشنی موجود تھی تو وہ دہلی میں حضرت شاہ نظام الدین اولیاء رحمہ اور ان کے تربیت کردہ بزرگوں کے طفیل تھی یا ملتان میں حضرت شیخ بہاءالدین زکریا کے خاندان اور ان کے مریدین کے ذریعہ موجود پائی جاتی تھی۔ انھیں دونوں مرکزوں سے جو لوگ وابستہ تھے وہ جہاں کہیں بھی تھے صراط مستقیم سے نہیں بہکے تھے۔ افسوس اور حسرت کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان ہر دو بزرگوں کے متعلق آج کل جو عام تصور ہے وہ نہایت مسخ شدہ اور اصلیت سے بہت کچھ مختلف ہے۔ انھیں مذکورہ چالیس سال میں قاضی القضاۃ اور شیخ الاسلام کے مناصب بالکل بیکار و معطل اور محض برائے نام رہے سلطان شمس الدین التمش، سلطان ناصرالدین محمود اور سلطان غیاث الدین بلبن کے زمانے میں امور مذہبی کی حفاظت و نگرانی اور اجرائے احکام شرع کا کام قاضی القضاۃ اور شیخ الاسلام سے متعلق اور یہ محکمہ نہایت زبردست اور با اثر سمجھا جاتا تھا اور اس محکمہ کے ذریعہ شرک و بدعت اور الحاد و بے دینی کے انسداد اور روک تھام کا ضروری اہتمام تھا۔ معزالدین کیقباد کے زمانے سے محکمۂ امور مذہبی ایک کھیل اور تمسخر سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ شہروں اور قصبوں سے مذہبی عدالتیں بالکل برطرف ہو گئیں اور کسی بادشاہ یا صوبہ دار یا عامل کو صدور احکام کے لئے مذہبی مشورہ اور احکام شرع کے معلوم کرنے کی قطعاً ضرورت نہ رہی۔ سلطان محمد تغلق نے پھر از سر نو محکمہ امور مذہبی کو نہایت احتیاط اور مضبوطی کے ساتھ قائم کیا تھا لیکن ابھی تلافی مافات نہ ہونے پائی تھی کہ فتنے برپا ہوئے اور سلطان فیروز تغلق کے زمانے میں وہی خراب حالت پورے جوش کے ساتھ پھر عود کر آئی۔ اس زمانے میں ہندوستان کے اندر اسلام کی صورت عام طور پر کس قدر مسخ ہو چکی تھی اس کا اندازہ کسی قدر سلطان فیروز تغلق کے مندرجہ ذیل الفاظ سے بھی کیا جا سکتا ہے۔

قومے بلباس دہریہ و ترک و تجرید مردماں را گمراہ می کردند و مریدی ساختند و کلمات کفر می گفتند طائفہ ملحدان و اباحتیان جمع شدہ بودند و خلق را بالحاد و اباحت دعوت می کردند و در شبے بمقامے معین جمع می شدند از مردمان

محرم وغیر محرم وطعام وشراب درمیان می آوردند و می گفتند این عبادت ست وزنان وبادران و خواہران یک دیگر در آں شب جمع می آوردند جامۂ ہر کہ بدوست کسے از ایشاں می افتاد وے باو زنا کردے پیران ایشاں شیعہ بودند، شیعی مذہباں کہ ایشاں را روافض می گویند بسبب رفض شیعہ مرداں را دعوت می کردند و رسالہ ہا و کتاب ہا دریں مذہب پرداختہ و تعلیم و تدریس پیشہ ساختہ بودند و جناب خلفائے راشدین و اُم المومنین عائشہ صدیقہ و جمیع صوفیائے کبار رضی اللہ عنہم را سب صریح و شتم قبیح می گفتند و لواطت می کردند و قرآن مجید را ملحقات عثمانی می خواندند، رسم و عادتے کہ در دین اسلام جائز نیست در شہر مسلمانان جبلت شدہ بود کہ عورات در ایام متبرکہ جماعت جماعت پالکی سوار و گردوں سوار و ڈولہ سوار و اسپ سوار دستور سوار فوج فوج و جوق جوق پیادہ از شہر بیروں می آمدند و بمزارہا می رفتند ؎

(مقتبس از فتوحات فیروز شاہی)

ہندوستان میں جس طرح شرک وبدعت والحاد کا طوفان برپا تھا اسی طرح ایران خراسان وعراق وشام وغیرہ دوسرے ممالک اسلامیہ میں بھی علیٰ قدر مراتب دوسری مختلف رنگتوں اور مختلف حالتوں میں اسی زمانے میں شرک وبدعت کا زور شور پایا جاتا تھا۔

مردانِ باخدا

اس دورِ فتن میں جس شخص نے امتِ مسلمہ کی سب سے زیادہ رہبری اور خدمت تجدد اصلاح کا کام انجام دیا وہ حضرت شیخ الاسلام تقی الدین امام ابن تیمیہ حرانی رحمۃ اللہ علیہ تھے جو مسلمانوں میں آٹھویں صدی ہجری کے مجدد تسلیم کئے گئے اور جنھوں نے حدیث نبوی اِنَّ اللّٰہَ یبعث لھٰذہ الامۃ علی راس کل مائۃ سنۃ من یجدد لھا دینھا (ابوداؤد بروایت ابی ہریرہ) کے موافق آٹھویں صدی ہجری کی ابتدا میں اپنے فرائض مجددیت کو بڑی خوبی کے ساتھ انجام دے کر شرک وبدعت کے طوفان کا بڑی بہادری کے ساتھ مقابلہ کیا۔ آپ نے ایک بہادر سپہ سالار کی حیثیت سے بھی کافروں کے مقابلے میں تلوار چلا کر صفِ قتال میں دشمنوں کی گردنیں اُڑائیں۔ وعظ و پند اور درس و تدریس کے ذریعہ بھی علم و

حکمت کی روشنی پھیلائی تحریر و تصنیف کے ذریعہ بھی وہ سامان فراہم کر دیا جو آج تک شرک و بدعت کے آہنی قلعوں کو ریزہ ریزہ کر دینے کے لئے کام میں لایا جا رہا ہے۔ آپ نے مسلمانوں کی تنگ دلی اور کافر سازی یعنی کفریہ فتووں کے نامعقول رواج کو رد کرنے میں بھی بڑی مؤثر کوششیں فرمائیں اور عالمِ اسلام کی عام بیماریوں کی صحیح تشخیص کے بعد درپئے علاج ہوئے۔ آپ نے وحدت وجود کے عقیدے کی تردید میں حضرت شیخ الاکبر محی الدین ابن عربی کے معتقدین کی ناراضگی کا بھی مطلق خیال نہیں کیا۔ تبلیغِ دینِ حنیفی کے لئے بادشاہوں کے درباروں اور دور و دراز ملکوں میں آپ کے شاگردوں خادموں اور آپ کے خطوط نے بڑے بڑے عظیم الشان کام انجام دیئے اس جگہ امام ممدوح کی عظیم الشان کوششوں کو بالتفصیل بیان کرنے کا موقعہ نہیں ہے۔

جیسا کہ ہر ایک حامیِ حق کی مخالفت دنیا میں ضرور ہوا کرتی ہے حضرت امام ابن تیمیہؒ کی بھی مخالفت ہوئی اور ان کی زندگی کا ایک حصہ سنتِ یوسفی کے پورا کرنے یعنی جیل خانہ کی سختیاں سہنے میں گذرا مگر وہ اپنے کام سے غافل نہیں ہوئے اور اُن آخری چند سال میں جب کہ وہ دمشق کے قلعے میں محبوس و نظر بند تھے اُن کے مشن کو سب سے زیادہ کامیابی اور وسعت حاصل ہوئی۔ ۷۲۶ھ میں ابن بطوطہ بھی دمشق پہنچ کر اُن کے وعظ و درس سے مستفیض ہوا۔ ذیقعدہ ۷۲۸ھ میں امام ممدوح نے بحالتِ قید وفات پائی تو دمشق میں ڈھائی لاکھ اور ایک دوسری روایت کے مطابق پانچ لاکھ آدمی اُن کے جنازے کے ہمراہ تھے۔ ملک چین میں بھی مسلمانوں نے ان کی وفات کا حال سُن کر نمازِ جنازہ غائبانہ ادا کی اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان کی اور ان کے مشن کی شہرت و کامیابی کس قدر وسیع تھی۔ اب بڑی آسانی سے یہ بات سمجھ میں آ سکتی ہے کہ ہندوستان جہاں ایک اسلامی سلطنت قائم تھی حضرت امام ممدوح کے دائرۂ اصلاح و تجدید سے باہر اور بے نصیب نہیں رہ سکتا تھا۔ اُس زمانے میں مصر و شام کے اندر یہاں کے لوگوں کا موجود ہونا اور وہاں کے لوگوں کا ہندوستان میں آنا جب کہ تاریخوں اور علماء کے تذکروں سے ثابت ہے تو شرک و بدعت اور اوہام پرستی کے استیصال کی تحریک کا ہندوستان تک پہنچنا نہ صرف توقع نہیں بلکہ اس خالص دینی تحریک کا ہندوستان تک جہاں وہ وفات [illegible] سرپرستی سے محروم [illegible] تھے نہ پہنچنا سخت حیرت انگیز ہوتا چنانچہ

ہندوستان میں کتاب وسنت کے داعی ضرور آئے جن کے مقاصد میں اشاعت علم حدیث کے ساتھ تنظیم بین المسلین اور مفید اسلام سیاسی امور بھی شامل تھے انھیں لوگوں میں سے مولانا شمس الدین ابن الحویری جو مصر کے حنفی قاضی اور حضرت امام ابن تیمیہ رحمہ کی حمایت کے سبب عہدہ قضا سے معزول کردیئے گئے تھے ۷۰۰ھ بعہد سلطان علاء الدین خلجی ہندوستان آئے اور حدیث کی چار سو کتابیں اپنے ہمراہ لائے۔ غالبًا یہ سب سے پہلا قابل تذکرہ ذخیرہ احادیث تھا جو ہندوستان میں آیا اُنھوں نے ملتان میں اپنے ہم نام شیخ شمس الدین فضل اللہ رحمہ کے پاس قیام کیا۔ اُن کے مرید بھی ہوئے اور یہاں مولانا شمس الدین ترک کے نام سے مشہور ہوئے (اس زمانے میں ہندوستان کے اندر مصری اور رومی لوگوں کو حکومت سلجوقیہ کی وجہ سے عام طور پہ ترک کہا جاتا تھا مثلاً خواجہ احمد ایاز کو بھی اس زمانے کے مورخین خواجہ احمد ایاز ترک لکھتے ہیں حالانکہ خواجہ احمد ایاز رومی تھا اور بھی کئی مصری اشخاص اس زمانے میں ہندوستان کے اندر ترک کہلاتے تھے) دینی معاملات میں سلطان علاء الدین خلجی کی غفلت وبے راہ روی کا حال سن کر اُس کے پاس اشاعت علم حدیث کی ضرورت واہمیت پر ایک رسالہ لکھ کر دہلی بھیجا اور خود یہاں کے حالات سے واقف ہوکر ملتان ہی سے واپس چلے گئے۔ ضیاء برنی نے اُن کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے کہ۔

> محدثے بے نظیر عالم کہ او را مولانا شمس الدین ترک می گفتند ودر ملتان چہار صد کتاب حدیث برابر آوردہ بود چوں شنید کہ سلطان علاء الدین نماز نمی گذارد و در جمعہ نمی آید بیشتر نیامد و مرید شیخ شمس الدین فضل اللہ پسہ شیخ الاسلام صدر الدین شد وازانجا کتابے در علم حدیث شرح کردہ ودر سلطان مبالغت نمودہ بایکرسالۂ پارسی بر سلطان فرستاد ودر آں رسالہ نوشتہ کہ من از مصر قصدِ خدمت پادشاہ وشہر دہلی کردہ بودم تا از برائے خدائے ومصطفٰے را مذہب علم حدیث در دہلی ثابت کنم ومسلمانان را از عمل کردن روایت دانشمندان بے دیانت برہانم ولیکن چون شنیدم کہ پادشاہ نماز نمی گذارد وجمعہ حاضر نمی شود ہم از ملتان بازگشتم "

آگے چل کر اسی سلسلے میں مولانا شمس الدین ترک سلطان خلجی کو لکھتے ہیں کہ:۔

شنیدہ ام کہ در شہر تو احادیث مصطفےٰ ترک می آرند ونمی دانم کہ دراں شہر کہ با وجود حدیث عمل بروایت کنند آں شہر چگونہ خشت نشود و بلائے آسمانی دراں شہر نبارد و شنیدہ ام کہ در شہر تو دانشمند اں بدبخت سیاہ روئے کتابہا وفتاوا ہائے شقاوت در مسجد ہا پیش نہادہ نشستہ اند وجُعل می ستانند وبتاویل وتزویر وحیلہ ہائے گوناگوں حقِ مسلمانان باطل می کنند وخود ہم غرق می شوند۔“

مبلغین احادیث نبوی نیز متکلمین کی آمد کا سلسلہ اس کے بعد بھی جاری رہا چنانچہ قاضی عضدالدین بن عبدالرحمن مصنف متن مواقف جو علم کلام کے امام سمجھے جاتے ہیں۔ عہد علائی کے آخری ایام میں ہندوستان تشریف لائے اور دیپالپور میں قیام فرما کر محمد تغلق کو کئی سال تعلیم دیتے رہے۔ انھیں کے فیض صحبت کا نتیجہ تھا کہ محمد تغلق میں انتہائی روشن خیالی پیدا ہو گئی تھی۔ قاضی عضدالدین یہاں سے شیراز پہنچے اور چند روز کے بعد ابواسحٰق والیِ شیراز کی مصاحبت میں داخل ہوئے اس کے بعد اور بھی روشن خیال علماء ہندوستان میں آتے رہے ملتان میں حضرت شیخ بہاءالدین زکریا رحمہ ایسے بزرگ تھے جن کے تعلقات شام ومصر وعراق وغیرہ کے عالموں سے ہمیشہ قائم رہے اُن کی خدمت میں دوسرے ممالک کے طلباء اور علماء آتے رہتے تھے۔ خود ان کے داماد حضرت فخرالدین عراقی رحمہ جو مشہور شاعر بھی تھے دمشق جاکر ۷۰۹ھ میں فوت ہوئے اُن کے بیٹے اور پوتے بھی حجاز وشام وعراق ومصر جا جاکر رہتے اور ہندوستان واپس آتے رہے۔ خود حضرت شیخ بہاءالدین زکریا ملتانی رح وہ بزرگ تھے جنھوں نے شام وعراق وغیرہ میں پندرہ سال مسلسل علم حدیث کی تحصیل مختلف اساتذہ سے کی پھر حضرت شیخ کمال الدین یمنی سے جن کا شمار محدثین کبار میں ہے مدینہ منورہ میں ترپن سال تک حدیث پڑھتے اور دوسروں کو پڑھاتے رہے اس کے بعد مدینہ سے بغداد آکر شیخ الشیوخ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی رحمہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور صرف سترہ روز کی صحبت کے بعد خرقۂ خلافت حاصل کرکے شیخ الشیوخ ممدوح کے حکم کے موافق ملتان آئے اور یہاں درس وتدریس کا سلسلہ جاری کیا۔ اُن کے بیٹے حضرت شیخ صدرالدین عارف رحمتہ رات دن قرآن کریم کے پڑھنے اور اس پر تدبر کرنے

یں خاص طور پر مصروف رہتے تھے۔ اُن کو فہم قرآن میں وہ اعلیٰ مرتبہ حاصل تھا کہ اس زمانے میں اپنا نظیر نہ رکھتے، اور اسی لئے عارف کے لقب سے مشہور تھے۔ مولانا علم الدینؒ نبیرۂ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا رحمہ، حضرت امام ابن تیمیہ رحمہ کے صحبت یافتہ اور سلطان محمد تغلقؒ کو سب سے زیادہ بدعات و اوہام پرستی کے قلع قمع پر آمادہ کرنے والے شخص تھے۔ بعد کے لوگوں نے ملتان کے اس محترم خاندان کے ساتھ جو جو باتیں اور جو جو حکایتیں اپنی جاہلانہ خوش عقیدگی کی راہ سے چسپاں کیں اُن کی وجہ سے آج کل اس بات کا تسلیم کرنا بھی دشوار ہوگیا ہے کہ ان بزرگوں کو قرآن و حدیث سے بھی کوئی تعلق تھا یا نہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ بالکل یہی حالت حضرت شیخ نظام الدین اولیاء رحمہ کی ہے جنھوں نے اوّل مولانا علاء الدین اصولی سے علم دین پڑھا اور پچیس سال کی عمر تک بدایوں میں مصروف تحصیل علم رہ کر دہلی آئے اور دہلی کے سب سے بڑے عالم علم دین خواجہ شمس الدین خوارزمی کی خدمت میں انتہائے شوق و التفات کے ساتھ مقامات حریری ختم کی، پھر علم حدیث کی تحصیل میں خصوصیت سے مصروف ہوئے پھر منہاج سراج مصنف طبقات ناصری کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے پھر مولانا نجیب الدین متوکل برادر شیخ فرید الدین مسعود گنج شکر رحمہ سے کسب علوم کے بعد انھیں کی رہبری سے حضرت خواجہ گنج شکر رحمہ کی خدمت میں حاضر ہوئے جن کی مجلس میں مولانا بدر الدین اسحٰق بخاری جامع معقول و منقول اور مولانا شیخ جمال الدین ہانسوی وغیرہ متبحر علما پہلے سے موجود تھے۔ وہاں سے فیض روحانی حاصل کرنے کے بعد دہلی آکر مخلوق خدا کی تعلیم و تربیت میں مصروف ہوئے۔ کوئی بے علم یا کم علم شخص آپ کے پاس مرید ہونے کو آتا تو آپ حکم دیتے کہ اوّل علم دین حاصل کرو۔ آپ اپنے مریدوں اور شاگردوں کو نصیحت فرماتے کہ

زاہد بے علم مسخرۂ شیطاں باشد

آج اگر حضرت شاہ نظام الدین اولیاء رحمہ کے نام لیواؤں کی خدمت میں کسی حدیث صحیح کو پیش کر کے کسی غیر مشروع بات کے ترک کرنے کی فرمائش کی جاتی ہے تو وہ اپنی آبائی تقلید جامد کی دلدل سے نکلنے پر ہرگز رضامند نہیں ہوتے۔ لیکن سلطان غیاث الدین تغلقؒ نے آپ کے خلاف ترپیّن[۵۳] مولویوں کو جمع کیا اور اُن سب مولویوں نے آپ کو مجرم

و گنہگار قرار دیا۔ سلطان نے حضرت نظام اولیا رحمہ کو ان مولویوں کے روبرو بُلا کر جواب طلب کیا۔ قاضی رکن الدین قاضی شہر جو آپ کا سخت مخالف تھا، ان ترپین مولویوں کی طرف سے آپ کے ساتھ گفتگو اور مباحثہ کرنے کے لئے منتخب ہوا۔ آپ نے اپنے طرزِ عمل کی تائید میں حدیث نبوی پیش کی۔ قاضی رکن الدین نے کہا کہ تم جب کہ مقلد ہو تو حدیث کیوں پیش کرتے ہو، امام ابو حنیفہ رحمہ کا کوئی قول پیش کرو۔ حضرت نظام اولیاء رحمہ نے فرمایا کہ او نادان! تو قول مصطفیٰ کو سُن کر بھی مجھ سے قول ابو حنیفہ کا مطالبہ کرتا ہے۔؟ فرشتہ کے الفاظ یہ ہیں:۔

الغرض پادشاہ قاضی رکن الدین را کہ حاکم شہر بود و لعد اوت شیخ (نظام اولیا) تفاخر داشت بہ بحث اشارت کرد و او روبہ شیخ کردہ گفت در بابت سرود سماع چہ حجت داری شیخ بحدیث نبوی السماع لاھلہ ستمسک گشت۔ قاضی گفت ترا با حدیث چہ کار تو مرد مقلدی و روایتے از ابو حنیفہ بیار تا بمعرض قبول افتد شیخ گفت سبحان اللہ من حدیث صحیح مصطفوی نقل می کنم و تو از من روایت ابو حنیفہ می خواہی شاید کہ ترا رعونت حکومت بریں می دارد۔

وپادشاہ چوں حدیث پیغمبر شنید متفکر شدہ ہیچ نگفت۔

اس جگہ یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ آج کل کے جاہلوں میں یہ بھی مشہور ہے کہ حضرت امام ابن تیمیہؒ تصوف اور صوفیوں کے دشمن تھے۔ اس خیال غلط کو صحیح مان لینے سے یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ حضرت امام ابن تیمیہ کے شاگردوں اور ہم خیال لوگوں کو نظام اولیا اور ملتان کے سہروردی خاندان سے کیا حمایت حاصل ہوسکتی تھی۔ لیکن اس خیال خام کو دور کرنے کے لئے کتاب تقصار جیود الاحرار من تذکار جنود الابرار مصنفہ حضرت نواب صاحب مرحوم کے یہ الفاظ جو امام ابن تیمیہ کی شان میں لکھے ہیں کافی ہیں۔

" در سلوک شانے عظیم داشت حکایات کرامات و روایات برکات او بیش از حصر است "

اسی کتاب میں آگے چل کر دوسری جگہ کتاب مناقب الاولیا کے حوالہ سے مسئلہ سماع کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

" شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ تعالیٰ درین باب موافق نظام المیاست"

غرض کہ ہندوستان میں ملتان کا محترم خاندان اور حضرت شاہ نظام الدین اولیار رحمہ کی ذات بابرکات دو ایسے مرکز تھے جہاں کتاب و سنت کے داعیوں کو ہر قسم کی مدد مل سکتی اور سہولت بہم پہنچ سکتی تھی۔ شیخ زادہ دمشقی جس کا اصل نام کسی مورخ نے نہیں لکھا یقیناً انھیں لوگوں میں سے ایک ہے جو تبلیغ حق کے لئے ہندوستان آئے تھے۔ فرشتہ کے الفاظ یہ ہیں کہ

> شیخ زادۂ دمشقی و عبید شاعر کہ درآں حین بہندوستان آمدہ ملازمت الغ خاں (محمد تغلق) بسر می بردند و کمال تقرب داشتند۔

عبید شاعر جس کو عبید حکیم بھی کہا گیا ہے ہندوستان میں نووارد نہ تھا کیونکہ عہد خلجیہ میں بھی اس کا یہاں موجود ہونا ثابت ہے چونکہ عبید شاعر اور شیخ زادۂ دمشقی کا نام ساتھ ساتھ لیا گیا ہے۔ اس لئے فرشتہ کو دھوکا لگا ہے کہ عبید شاعر بھی نووارد تھا حالانکہ نووارد صرف شیخ زادۂ دمشقی تھا اور وہ غالباً حضرت نظام اولیار رحمہ ہی کے ذریعہ شاہزادۂ محمد تغلق کی مصاحبت میں داخل ہوا تھا۔

ریاکار مولوں اور باخدا لوگوں کا مقابلہ

اس زمانے میں مسلمان مولویوں کی کیا حالت تھی اس کا نقشہ ان الفاظ میں موجود ہے جو شیخ شمس الدین رحمہ نے سلطان علار الدین خلجی کو مخاطب کرکے لکھے ہیں اور جو اوپر درج ہو چکے ہیں۔ دہلی کے مفتیوں قاضیوں اور مولویوں کے کتاب و سنت کے وعظ اور بدعات کی مخالفت کو زندقہ والحاد و فلسفہ کے خطابات دیئے۔ جامد مقلدین اور اوہام پرست جاہلوں نے جو بدعیہ و شرکیہ مراسم کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے ہمارے زمانے کے ان لوگوں کی طرح جو فقہ حنفی سے بھی ناواقف ہیں اور علمائے دیوبند کو بھی وہابی۔ غیر مقلد اور کافر تک کہدیتے ہیں مخالفت کا شور مچایا۔ حضرت نظام اولیار رحمہ بہت بڑے آدمی تھے انھوں نے نہ کبھی پہلے ان مفتیوں اور مولویوں کی پرواہ کی تھی نہ اب ان کے شور مچانے سے ان عاملانِ حدیث اور مبلغین کتاب و سنت کی حمایت ترک کی۔ صوفی کبھی مقلد اور مراسم پرست نہیں ہوا کرتا۔ آج اس بات کا سمجھنا بے حد دشوار ہو گیا ہے کہ حضرت شاہ نظام الدین اولیار کس قدر وسیع الخیال اور کیسے باخبر بزرگ تھے۔ ان کے مریدین اور خلفا میں اکثر شافعی مذہب کے پابند علمار بھی تھے چنانچہ مولانا علار الدین انہیں

میں سے تھے۔ مولانا ضیاء الدین سنامی پابندی شرع اور عمل با لحدیث کے معاملے میں خصوصی شہرت رکھتے تھے۔ شیخ شرف الدین بو علی شاہ قلندرؒ کی مونچھیں بہت بڑھی ہوئی تھیں۔ کسی کی یہ مجال نہ تھی کہ ان سے مونچھوں کے کٹوانے کی فرمائش کرتا۔ مولانا ضیاء الدین سنامی کو معلوم ہوا تو قینچی لے کر پہنچے اور اپنے ہاتھ سے ان کی مونچھیں کاٹ دیں اس کے بعد قلندر صاحب ہمیشہ اپنی مونچھیں کتواتے رہتے تھے۔ یہی مولانا ضیاء الدین سماع کے معاملے میں ہمیشہ نظام اولیاء پر اعتراض کرتے اور یہ درشتی پیش آتے حضرت نظام اولیاء ہمیشہ اُن سے معذرت کے سوا اور کچھ نہ کہتے۔ جب مولانا ضیاء الدین کو مرض الموت لاحق ہوا تو سلطان المشائخ عیادت کے لئے گئے۔ مولانا نے اپنی پگڑی سلطان المشائخ کے پاؤں میں ڈال دی اور اپنی درشتی وسخت گیری کی معافی چاہی۔ سلطان المشائخ نے پگڑی اٹھا کر اپنی آنکھوں سے لگائی اور فرمایا کہ "یکذات بود حامیٔ شریعت حیف کہ آں نیز نماند" اسی طرح ایک مرتبہ سلطان المشائخ نظام اولیاء کے اکثر مرید کسی مجلس میں موجود تھے، وہاں گانا شروع ہوا تو شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی مجلس سے فوراً اٹھ کھڑے ہوئے ان کے دوستوں نے باصرار روکنا اور بٹھانا چاہا۔ اُنھوں نے جواب دیا کہ یہ خلاف سنت ہے دوستوں نے کہا کہ جب تمھارے شیخ گانا سُن لیتے ہیں تو تم کیوں نہیں سنتے کیا تم شیخ سے منحرف ہوگئے ہو شیخ نصیر الدین نے جواب دیا کہ "مشرب پیر حجت نمی شود دلیل از کتاب وحدیث باشد" بعض لوگوں نے یہ واقعہ حضرت سلطان المشائخ کی خدمت میں عرض کیا آپ نے سُن کر فرمایا "محمود راست می گوید حق آنست کہ اُوی گوید" فوائد الفواد میں خواجہ حسنؒ حضرت نظام اولیاء رحمہ کی مجلس کا حال لکھتے ہیں کہ "سخن در سماع افتاد یکے از حاضران گفت کہ مگر دریں وقت حکم شدہ است کہ خدمت مخدوم را ہر وقت کہ باید سماع بشنود او را حلال است خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر (نظام اولیاء) فرمود کہ چیزے کہ حرام است بحکم کسے حلال نشود وچیزے کہ حلال است بحکم کسے حرام نشود" لیکن نظام اولیاء رحمہ عالم نما جاہلوں، مراسم پرست مولویوں، قاضیوں اور ریاکار مفتیوں کی جو حدیث نبوی ان من العلم جھلا کے مصداق تھے ذرا بھی پرواہ نہ کرتے تھے۔ ایسے ہی مولویوں اور فقیہوں کی شان میں مولانا جامی نے فرمایا ہے کہ

عارفے از کوہ بصحرا گذشت | دیدۂ ازیل بدامانِ دشت
دل زغم و سوسہ پرداختہ | دیدہ زنیرنگ تہی ساختہ
گفت باو عارفِ صحرا نورد | کز چہ دریں بادیہ ہرزہ گرد
کارتو در صومعہ و خانقاہ | بازچرا ماندۂ از کارگاہ
تفرقہ بخشِ صفِ طاعت شُد | رخنہ گرِ سلکِ جماعت شُد
رہزنِ دورانِ بدلِ بدسگال | طنز کناں داد جوابِ سوال!
کز برکاتِ علمائے زماں | فارغم از کشمکشِ این و آں
داشت مرا باز ازیں جدّ و جہد | حیلہ گریہائے فقیہانِ عہد
یک تن ازیں طائفۂ بوالہوس | از پئے گمراہی کونین بس

انھیں لوگوں نے حضرت سلطان المشائخ نظام اولیاء رحمہ سے سلطان غیاث الدین تغلق کو بدظن کیا اور اس سے جب کہ وہ بنگالے کے سفر میں تھا حضرت ممدوح کے نام تہدیدی حکم بھجوایا۔ جس کے جواب میں نظام اولیاء رحمہ کی زبانِ مبارک سے " ہنوز دلی دور است " کا مشہور جملہ نکلا۔

"چوں سلطان تغلق از خدمت شیخ نظام الدین اولیا رنجیدہ بود بشیخ پیغام نمود کہ چوں من بدہلی برسم شیخ از شہر بدر رود۔ شیخ گفت ہنوز دہلی دور است واین لفظ درمیان اہل ہند مثل شدہ است ومشہور است کہ سلطان محمد تغلق را بشیخ ارادت تمام بود و نہایت اعتقاد داشت ۔"

(طبقات اکبری)

ضیائے برنی کے بعض بزرگوں اور اس کے ممدوح علاء الدین خلجی کو حضرت نظام اولیاء سے چونکہ عقیدت و ارادت تھی اس لئے وہ بھی اُن سے عقیدت کا اظہار کرتا تھا۔ لیکن اُس نے غیاث الدین تغلق اور حضرت نظام اولیا رحمہ کے تعلقات کی کشیدگی اور غیاث الدین تغلق کے مذکورہ گستاخانہ پیغام کا تذکرہ اپنی تاریخ میں اس لئے نہیں کیا کہ یہ پیغام اُن لوگوں کی سعی و کوشش کا نتیجہ تھا جن کو ضیاء برنی علمائے دین اور مفتیان شرع متین یقین کرتا اور اُن سے دلی ہمدردی رکھتا تھا۔ بالکل اسی طرح مصر کے قاضیوں اور مفتیوں نے حضرت امام ابن تیمیہ رحمہ کے خلاف سلطان مصر کو بھڑکا تے۔

کی کوششیں کی تھیں۔

ضیاء برنی کس عقیدہ کا آدمی تھا

خواجہ خطیر و ملک الور جنیدی۔ خواجہ مہذب بزرگ۔ قاضی رکن الدین۔ قاضی سما الدین وغیرہ وہ لوگ تھے جو حکومت تغلقیہ سے پہلے بھی دینی عالم سمجھے جاتے تھے ان لوگوں کو سلطان غیاث الدین تغلق نے اپنی مصاحبت کا فخر عطا کر کے دربار میں بیٹھنے کی اجازت دے رکھی تھی اور اکثر معاملات میں اُن سے مشورے لیتا تھا۔

"خواجہ خطیر و ملک الور جنیدی و خواجہ مہذب بزرگ کہ دائم نزد بادشاہانِ سابق اعتماد داشتند بنواخت و بمواجب و انعام سرفراز گردانیدہ رخصت نشستن در مجلس ارزانی فرمودہ قوانین و ضوابط سلاطین سابق کہ در باب استقامت ملک و انتظام احوال خلق وضع کردہ بودند از ایشان پرسیدے و تبعیت آں نمودے" (فرشتہ)

سلطان غیاث الدین تغلق انھیں مذکورہ حضرات سے مشورے لیتا تھا اور یہ سب کے سب مراسم پرست تھے۔ ضیاء برنی سلطان غیاث الدین تغلق کی نسبت لکھتا ہے کہ

"قاضیان و مفتیان دو او یک و محتسبانِ عہد اورا آمدوئے لیس بسیار و آشنائے تمام پیدا آمدہ بود"

پھر آگے چل کر لکھتا ہے کہ:-

"سلطان غیاث الدین تغلق باعتقاد پاکیزہ آراستہ بود"

پھر آگے چل کر لکھتا ہے کہ:-

"واعتقاد مسلمانی سلطان تغلق شاہ از کلمات بد مذہباں و معقولیاں و راہ درویشِ بددیناں ملوث نہ گشت"

غور کرنے کے قابل بات یہ ہے کہ ضیاء برنی نے سلطان غیاث الدین تغلق کے عقیدے کی خوبی اور معقولیوں یعنی بد مذہبوں اور بد دینوں کی باتوں سے مجتنب رہنے کا تذکرہ اس خصوصی اہتمام سے کیوں کیا ہے؟ محمد تغلق کی نسبت بھی ضیاء برنی کے ارشادات سُن لیجئے

"باسعد منطقی بد مذہب و عبید شاعر بد اعتقاد و بجُم انتشار فلسفی صحبت و

مجالست افتاد آمد و شد مولانا علم الدین کہ اعلم فلا سفہ بود در خلوت او بسیار شد و آں نا جوانمرداں کہ مستغرق و مبتلا و معتقد معقولات بودند در مباحثہ و مکالمہ و نشست و بوخاست علم معقولات را کہ واسطہ بداعتقادیٔ مذہب سنت و جماعت و وسیلت نا استواری تنبیہات و تحذیرات صد بیست و چہار ہزار نقطۂ نبوت است در خاطر سلطان محمد چناں بنشادند کہ منقولات کتب سماوی و احادیث انبیا کہ عمدۂ ایمان و ستون اسلام و معدن مسلمانی و منبع نجات و درجات است چنانچہ باید و شاید جاے نماند و ہرچہ برخلاف معقول بود نشنیدی بہ یقین در خاطر مبارک او نہ نشستے کہ اگر در دل سلطان معقولات فلا سفہ احاطت نہ کردے ودر منقولات آسمانی شوقے و رسوخے بودے باچنداں فضیلت جمیلہ و اوصاف سنیہ کہ ذات او بداں متحلی بود ہرگز نتوانستے کہ برخلاف قال اللہ وقال رسول اللہ وقال انبیاء وقال العلماء در کشتن مومنے موحد حکم کند فاما از جہت آنکہ معقولات فلا سفہ کہ مایہ قساوت و سنگ دلی ست تمامی دل او را فرو گرفتہ بود و سیاست مسلماناں و قتل موحداں خوئے و طبیعت او گشتہ و چندیں علماء و مشائخ و سادات و صوفیان و قلندراں و نویسندگان و لشکریان را سیاست فرمود۔"

ضیا برنی کے ان الفاظ کو دو مرتبہ پڑھو اور غور کرو کہ اس زمانہ میں معقولات فلسفہ کو کیا سمجھا جاتا تھا اور قال العلماء کو کس طرح قال اللہ وقال رسول اللہ کا ہم مرتبہ اور جزو لازم قرار دیا جاتا تھا۔ ضیا برنی قساوت و سنگ دلی اور قتل مسلم کو حقیقت ثابتہ اور علوم متعارفہ کے طور پر معقولات فلا سفہ کا نتیجہ سمجھتا ہے۔ اس بات پر بھی غور کرو کہ ضیا برنی اوپر کے اقتباس میں ملک سعد الدین کو سعد منطقی بدمذہب کا خطاب کس غیظ و غضب کے ساتھ دے رہا ہے۔ یہ وہی سعد منطقی ہے جو حضرت شاہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کا شاگرد رشید اور مرید با اخلاص ہے جس کو سلطان جلال الدین فیروز خلجی نے حضرت امیر خسرو کے ساتھ شاہ صاحب ممدوح کی اجازت سے اپنی مصاحبت میں داخل کیا تھا اور جس کا ذکر سلطان جلال الدین کے حالات میں ضیاء برنی خود ان الفاظ میں کر چکا ہے کہ:۔

"امیر خسرو از مقربان درگاہ او شد و شغل مصحف داری فرمود و جامۂ کہ ملوک کبار یافتندے امیر خسرو ہم چناں جامہ یافکر بعد سپید یافتے و ملک سعد الدین منطقی را کہ در مجلس شکرستانی بود (یعنی حضرت نظام اولیار رحمہ کی مجلس میں رہتا تھا) از جامۂ پلاس قلندری بیروں آوردہ در خیل امرا گردانید"

یہی ملک سعد الدین یا سعد منطقی ہے جسے مولانا شمس الدین ترک کے مذکورہ فارسی رسالہ کو جب بعض امیروں نے سلطان علاء الدین کے پاس پہنچنے سے روک لیا تو اس نے سلطان کو اس کی اطلاع دی اور سلطان علاء الدین نے اس رسالہ کو طلب کیا۔ ضیاء برنی کے الفاظ ہیں۔

"و ازاں محدث ایں کتاب و ایں رسالہ بر بہاء الدین دبیر رسیدہ بہاء الدین کتاب پیش سلطان علاء الدین رسانید و از طرف قاضی حمید پنہاں داشت و من از ملک قرابیگ شنیدہ ام کہ سلطان از سعد منطقی شنید کہ ایں چنیں رسالہ رسیدہ است آں رسالہ را طلبید"

یہی سعد منطقی ہیں جن کی تصنیف مراۃ العارفین ہے اور جو بعد میں حضرت خواجہ رکن الدین ملتانی کے مرید ہوئے۔ اولیائے کرام میں ان کا شمار ہے۔ ضیاء برنی نے سلطان علاء الدین خلجی کے حالات بیان کرتے ہوئے ایک جگہ اپنے اُستادوں کی فہرست لکھی ہے جن کے سامنے اس نے زانوئے شاگردی تہ کیا تھا۔ اس فہرستِ اساتذہ میں "مولانا نجم الدین انتشار" کا نام بھی ہے۔ لیکن یہاں محمد تغلق کے مصاحبین کا نام لیتے ہوئے حقارت کے ساتھ اپنے استاد کو وہ صرف "نجم انتشار" کہتا ہے۔ عہد علائی کے شعرا کی فہرست میں وہ عبید شاعر کو "عبید حکیم" لکھتا ہے لیکن اس عبید حکیم کو وہ اب "عبید شاعر بد اعتقاد" کے نام سے یاد کر رہا ہے کسی خاص وجہ سے اُس نے مولانا علم الدین نبیرۂ حضرت شیخ بہاء الدین ذکریا ملتانی رحمہ کا نام حقارت سے نہیں لیا لیکن اپنے نزدیک اس نے ان کو بھی "اعلم فلاسفہ" کہکر بہت بڑی گالی دی ہے اور آگے چل کر ان سب کو "ناجوانمرداں" کہکر اپنا دل ٹھنڈا کیا ہے۔

علم الدین نبیرۂ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی رحمہ وہ بزرگ ہیں جو مکہ و مدینہ و مصر و شام وغیرہ میں عرصہ دراز تک رہ آئے تھے۔

"مولانا علم الدین کہ علامۂ دہر بود گفت من سفر مکہ و مدینہ و مصر و شام کردہ ام" (ذرشتہ)

اور انھوں ہی نے دہلی کے ترپیپن مولویوں اور سلطان غیاث الدین تغلق کے منشا کے خلاف حضرت شاہ نظام الدین اولیاء رحمہ کی نہایت موثر تائید و حمایت کرکے حضرت شاہ صاحب ممدوح کو مولویوں اور مفتیوں کے حملے سے بچایا تھا اور یہی وہ مولانا علم الدین ہیں جو حضرت امام ابن تیمیہؒ کی صحبتوں میں شریک رہ کر ان کی مصیبتوں مباحثوں واستقامتوں کو بخوبی دیکھ کر ۷۲۱ھ میں ہندوستان واپس آئے تھے۔

غالبًا اب بآسانی سمجھ میں آجائے گا کہ ضیاء برنی کی نگاہ مذہب کے معاملے میں کس قدر تنگ اور کج واقع ہوئی تھی وہ بدعیہ و شرکیہ مراسم کے مجموعہ کو جن کا طوفان مصر و شام سے لے کر دہلی و بخارا تک اُمڈا ہوا تھا اور جن کی تفصیل اس زمانے کی تصانیف بالخصوص حضرت امام ابن تیمیہ کی تصنیف میں موجود ہے جزو اسلام اور عین اسلام یقین کرتا تھا وہ تقلید جامد میں شور بور اور ہر معقولی بات کو کفر و الحاد سمجھتا تھا۔ یہ خصوصیت کچھ ضیاء برنی ہی کو حاصل نہ تھی بلکہ اس زمانے کے عام مسلمانوں کی یہی حالت تھی۔ ضیاء برنی بڑے سے بڑے عالم اور اپنے بڑے سے بڑے محسن اور عزیز کو فلسفہ اور معقولات سے تعلق رکھنے کے الزام میں مردود اور لعنتی قرار دینے کے لئے تیار ہے۔ علم حدیث اور عمل بالحدیث کو وہ معقولات و فلسفہ کہتا ہے۔ حدیث اور علم حدیث کے صرف نام کی اس کے دل میں عزت ہے لیکن جب مراسم بدعیہ و شرکیہ کو ترک کراکر حدیث پر عمل کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے اور اس کے لئے دلائل پیش کئے جاتے ہیں تو وہ اپنے مراسم کو اصلِ شریعت کہکر ترویج احادیث نبوی کی کوشش کا نام معقولات و فلسفہ رکھتا اور آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ یہ بھی غور کرنے کے قابل بات ہے کہ مولانا شمس الدین ترک ملتان سے سلطان علاء الدین خلجی کے پاس عمل بالحدیث کی ترغیب میں رسالہ لکھکر بھیجتے ہیں۔ اس زمانے کے مولوی اور مفتی اس کو اپنے عقائد اور مقاصد کے خلاف سمجھ کر سلطان تک نہیں پہنچنے دیتے لیکن ملک سعد الدین سلطان سے ذکر کرکے اس رسالے کو سلطان تک پہنچانے کی کوشش کرتا ہے (جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے) جس سے صاف ثابت ہے کہ ملک سعد الدین عمل

بالحدیث کا بہت بڑا حامی ہے اور عمل بالحدیث کے مقابلے میں وہ مولویوں قاضیوں، اور مفتیوں کے ناراض ہونے کی پرواہ نہیں کرتا اسی لئے سعدالدین کو ضیاء برنی "سعد منطقی بد مذہب" کا خطاب دیتا ہے۔ نعتدبرو!۔

ضیاء برنی کے دل ہی دل میں پیچ وتاب کھاتے رہنے اور سلطان محمد تغلق کے عہد حکومت میں کچھ بھی بس نہ چلنے کا اندازہ اس کے ان الفاظ سے جو وہ محمد تغلق کی نسبت لکھتا ہے بخوبی ہو سکتا ہے۔

"ودر معقولات فلاسفہ رغبتے تمام داشت و چیزے از علم معقول خواندہ بود و در طبیعت او چناں جائے گرفتہ کہ ہر چہ خبر معقول بشنیدے بہ یقین باور نہ کردے دفی الجملہ کدام فاضل و عالم و شاعر و دبیر و ندیم و طبیب را زہرۂ آں نبودے کہ در خلوت سلطان محمد مقدمہ در علم خود بحسب دانش خود تقریر تواند کرد و بزعم و ظن خود از بسیاری سوالات گلوگیر سلطان محمد سخن خود را بپایاں تواند رسانید۔"

پھر آگے چل کر کہتا ہے کہ

"وما چنداں کافر نعمت کہ سیہ سپید ی خواندہ بودم وانسے علمے کہ ازاں شرف دارد چیزے داشتیم و از طمع و حرص دنیا نفاقہا ورزیدہ و مقرب سلطان شدہ در تضیۂ سیاست کہ نامشروع بودے حق پیش سلطان نمی گفتیم۔"

محمد تغلق کی سب سے بڑی خطا اُس کی روشن خیالی تھی

غیاث الدین تغلق ایک تجربہ کار سپہ سالار اور ہوشیار فرماں روا تھا اُس کو علم وفضل اور درس وتدریس سے کوئی خصوصی واسطہ نہ تھا اُس کی ساری عمر شمشیرزنی اور مغلوں کو شکستیں دینے میں گذری تھی۔ محمد تغلق کو سپہ سالاری وشمشیرزنی کے ساتھ علم وفضل اور کتب بینی میں بھی بہرہ وافی حاصل تھا وہ پیدائشی طور پر بھی بڑا ذہین و باریک بین تھا جس طرح ہندوستان کے بعض دوسرے علماء نے کتاب وسنت اور احادیث نبوی کے مقابلے میں رسم ورواج کو بیہودہ چیز قرار دے کر بد مذہب، بے دین فلسفی وغیرہ خطابات حاصل کئے۔ اسی طرح محمد تغلق بھی دباصطلاح ضیائے برنی) بد مذہب اور بے دین ہوگیا تھا اور اسی لئے ضیاء برنی اس کے

معاملے میں از خود رفتہ ہو کر اپنے مرتبہ تاریخ نویسی کو قائم نہیں رکھ سکا اور اسی لئے ورنگل کے راجہ اور امرائے علائی کی سازباز کو بے چارے عبید شاعر اور شیخ زادہ دمشقی کے سر تھوپا گیا اور یہی وجہ تھی کہ عبید شاعر کے خلاف مفتیانِ دہلی نے قتل کا فتوے دے کر غیاث الدین تغلق کے ہاتھ سے قتل کرایا۔ شیخ زادہ دمشقی خوش قسمت تھا کہ ان لوگوں کے پنجے میں گرفتار ہونے سے بچ گیا۔ اور ہندوستان سے اپنی جان بچا کر لے گیا یہی سبب تھا کہ محمد تغلق کی سلطنت کو ناکام رکھنے اور فسادات برپا کرنے کی مسلسل کوششیں اس گروہ نے جاری رکھیں اور اس خوش خصال و پاک طینت سلطان کو دیوانہ بنا کر چھوڑا۔ محمد تغلق کی روشن خیالی اس زمانے کے مفتیوں کے لئے کس قدر باعث تکلیف واذیت ہوگی اس کا اندازہ یوں بھی ہو سکتا ہے کہ حضرت امام ابن تیمیہؒ کے خلاف مصر کے اٹھارہ مفتیوں نے ملحد اور واجب القتل ہونے کا فتویٰ دیا تھا اور مصر کا سلطان باوجود اس کے کہ امام ممدوح کو بے گناہ جانتا تھا مفتیوں کے اثر اور بغاوت کے خوف سے ان کو قید کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ بڑی خیر ہوئی کہ شیخ الاسلام حضرت شاہ نظام الدین اولیاء رحمہ سلطان غیاث الدین تغلق کی وفات سے چند ماہ بعد فوت ہو گئے تھے ورنہ سلطان محمد تغلق کے عقائد کی ذمہ داری حضرت ممدوح کے فیض یافتہ و تربیت کردہ لوگوں مثلاً ملک سعد الدین وغیرہ پر عائد کر کے جس طرح ان کو گالیاں دی گئی ہیں۔ اسی طرح حضرت ممدوحؒ کی شان میں بھی گستاخی کرنے پر ضیاء برنی مجبور ہو جاتا۔ خواجہ جہان ملک احمد ایاز رومی سلطان محمد تغلق کا وزیر اعظم اور ہمہ صفت موصوف شخص تھا اُس کی نیکی اور پاکی کا اندازہ اس طرح بھی ہو سکتا ہے کہ حضرت نظام اولیاء ؒ نے اپنی دستار خاص اس کو عنایت کی تھی۔ کس قدر حیرت اور حسرت کا مقام ہے کہ ایسے برگزیدہ شخص کو محض اس خطا پر کہ وہ سلطان محمد تغلق کا وزیر اعظم اور سلطان کا ہم خیال و ہم عقیدہ تھا ضیاء برنی اپنی تنگ خیالی کی وجہ سے گالیاں دیتا ہے ہم کو شمس سراج عفیف کا شکر گذار ہونا چاہیئے کہ اُس نے ملک احمد ایاز کے دینی مرتبے کے متعلق صحیح واقفیت بہم پہنچائی ورنہ ممکن تھا کہ ہم بھی اس باخدا انسان کی شان میں ضیاء برنی کے ہم نوا ہو کر گستاخی کے مرتکب ہوتے۔

محمد تغلق کی داستان در حقیقت کتاب وسنت اور بدعات و مراسم کی معرکہ آرائی کا

ایک جنگ نامہ ہے۔ محمد تغلق کے متعلق یہ باتیں جہالت وبے خبری کی وجہ سے بڑی عجیب سمجھی جائیں گی اور ہندوستان میں آج بھی ایک بڑی تعداد مسلمانوں کے اندر ایسی موجود ہے، جو اس موحد اور دشمن شرک وبدعت سلطان کو متبع سنت معلوم کرنے کے بعد گالیاں دینے پر آمادہ ہو جائے گی اور جو کمی ضیا برنی سے رہ گئی ہے یہ لوگ اسے پورا کرنے کی کوشش کریں گے۔ لیکن مدعا یہ ہے کہ سمجھدار اور روشن خیال مسلمان اس عادل وباخدا اور علم دوست سلطان کو اس کے اصل لباس میں دیکھیں اور اس کی شان میں کوئی گستاخانہ کلام کرتے ہوئے احتیاط سے کام لیں۔ محمد تغلق کی علم دوستی کا اندازہ اس واقعہ سے بھی ہو سکتا ہے کہ اس نے تخت نشین ہونے کے بعد دہلی کے ایک مشہور عالم مولانا معین الدین عمرانی مصنف حسامی ومفتاح وحواشی کنز کو چالیس لاکھ روپیہ دے کر اپنے استاد مولانا عضد الدین مصنف متن مواقف کے پاس بھیجا کہ میری طرف سے بطور ہدیہ ونذرانہ پیش کرو اور اُن کو شیراز سے ہندوستان لانے کی کوشش کرو۔ مولانا عضد الدین نے مواقف لکھ کر محمد تغلق کے نام سے معنون کرنے کا قصد کیا تھا۔ وہ جب ہندوستان کو روانہ ہونے لگے تو شیراز کے حاکم ابواسحٰق نے بڑی منت سماجت کے ساتھ ان کو روک لیا اور وہ ہندوستان نہ آسکے۔ بالآخر انھوں نے ابواسحٰق کی خواہش کے موافق مواقف کو اسی کے نام سے معنون کیا۔ فرشتہ کے ان الفاظ سے کہ "مولانا عضد الدین اُستاد خودرا چہل لک بنکہ دریک روز بخشیدے"۔ یہ مترشح ہوتا ہے کہ مولانا عضد الدین محمد تغلق کی تخت نشینی کے بعد ہندوستان تشریف لائے اور محمد تغلق نے ان کو چالیس لاکھ عطا کئے مگر یہ صحیح نہیں، وہ سلطان غیاث الدین تغلق کے بادشاہ ہونے سے بھی پہلے ہندوستان آکر محمد تغلق کے اُستاد رہے تھے۔

معذرت اور التجا

مجھ کو ہر ہر قدم پر اس بات کا خیال آرہا ہے کہ میں اس کتاب کے اصل موضوع سے بالکل جدا ہو گیا ہوں کیونکہ اس کتاب کا موضوع ہندو مسلمانوں کے تعلقات کو واضح طور پر بے پردہ کر دینا ہے اور محمد تغلق کے متعلق یہ بات صرف چند صفحات میں بیان ہو سکتی تھی۔ لیکن میں کسی غیبی تحریک سے مجبور ہو کر لکھ رہا ہوں۔

میروم اما عنانِ من بدست خویش نیست
ہم چو کشتی ساخت سیل گریہ دریائے مرا

اس کتاب کے پڑھنے والوں سے مودبانہ ملتجی ہوں کہ وہ آیندہ صفحات بھی غور و اطمینان اور صبر و سکون کے ساتھ ملاحظہ فرمائیں اور اپنی تھوڑی سی تضیع اوقات کو میری وجہ سے گوارا کرلیں۔

ضیا،برنی کی ناراضی کا دوسرا سبب

ضیا،برنی محمد تغلق سے کیوں ناراض تھا اس کا ایک سبب تو اوپر بیان ہو چکا ہے اب دوسری وجہ بھی سن لیجئے۔ پہلی وجہ کے بیان کرنے میں بھی میں نے اکثر ضیا،برنی ہی کو بطور گواہ پیش کیا ہے۔ دوسری وجہ بیان کرنے میں بھی میرا ارادہ ہے کہ ضیا،برنی ہی کے الفاظ سے ثبوت بہم پہنچاؤں۔

ضیا،برنی کے خاندان اور اُس کے بزرگوں کا کوئی ذکر خاندان غلامان کے عہد حکومت میں نہیں آتا اس زمانے میں اُس کا خاندان غالبًا بہت ہی معمولی حالت میں ہوگا۔ ملک فخرالدین سلطان غیاث الدین بلبن کے زمانے میں شہر دہلی کا کوتوال تھا۔ معزالدین کیقباد کے عہد حکومت میں وہ بڑھاپے کی وجہ سے خانہ نشین اور اس کا داماد ملک نظام الدین وزارت کے مرتبہ پر فائز تھا۔ اسی ملک نظام الدین نے کیقباد اور اُس کے باپ ناصرالدین حاکم بنگالہ کے درمیان وہ ناگوار صورت پیدا کردی تھی جو ناصرالدین کی سلامت روی کے سبب صلح و آشتی پر ختم ہوئی اور امیرخسروؔ کو مثنوی قران السعدین لکھنی پڑی۔ آخر ملک نظام الدین کی بداطواریوں سے تنگ آکر جب کہ کیقباد فالج میں مبتلا ہوچکا تھا۔ امرائے دہلی نے ملک نظام الدین کو ہلاک کیا اور جلال الدین خلجی کو جو سامانہ کا نائب ناظم تھا سامانہ سے بلاکر کاروبار وزارت سپرد کیا اور بجائے سامانہ کے برن کا علاقہ اس کی جاگیر مقرر ہوا۔ چند ہی روز کے بعد جلال الدین خلجی تخت دہلی کا مالک ہوا تو اُس نے تخت نشین ہوتے ہی ملک فخرالدین مذکور کو زمرۂ وزرا میں شامل کیا۔ ملک فخرالدین کی دوسری بیٹی کی شادی ملک نظام الدین مذکور کے بھائی ملک حسام الدین سے ہوئی تھی جو عہد بلبنی میں باڈی گارڈ کے رسالہ کا رسالدار تھا۔ ملک حسام الدین کی بیٹی کی شادی ضیا،برنی کے باپ سے ہوئی اور اسی رشتہ داری کے سبب ضیا،برنی کے

خاندان میں امارت وعزت نے دخل پایا۔ ضیاء برنی کی ماں ملک فخرالدین کی نواسی تھی۔ ملک فخرالدین کی حویلی شاہی مکانات کے متصل بہت شان دار تھی۔ ضیاء برنی نے وہیں پرورش پائی۔ ملک فخرالدین اور اس کے خاندان پر جلال الدین خلجی نے بڑی مہربانیاں کیں۔ ضیاء برنی کے باپ کو جلال الدین خلجی نے اپنے منجھلے بیٹے ارکلی خان کی نیابت پر مامور کرکے موید الملک کا خطاب دیا۔ ضیاء برنی کا چچا علاء الملک کے خطاب سے مخاطب ہوکر سلطان جلال الدین کے بھتیجے علاء الدین خلجی کی نیابت پر فائز ہوا۔ غرض سلطنت خلجیہ کے شروع ہوتے ہی ضیاء برنی کے خاندان میں امارت شروع ہوئی۔ جب علاء الدین خلجی نے دیوگیر کا قصد کیا تو وہ اپنی غیر موجودگی کے ایام میں ضیاء برنی کے چچا علاء الملک کو کڑہ اور اودھ کی حکومت سپرد کر گیا تھا۔ جب علاء الدین خلجی ہندوستان کا بادشاہ ہوا تو اس نے تخت نشین ہوتے ہی کڑہ اور اودھ کا علاقہ جس پر وہ خود عہد جلالی میں مامور تھا علاء الملک کو بطور جاگیر عطا فرمایا اور ضیاء برنی کے باپ موید الملک کو برن کا علاقہ جاگیر میں دیا، یہ وہی برن ہے جو سلطان جلال الدین خلجی کی جاگیر رہ چکا تھا علاء الملک کے ساتھ علاء الدین خلجی کو بڑی محبت تھی، اسے دہلی سے باہر نہیں جانے دیا۔ کڑہ اور اودھ کا انتظام اس کے نائب کرتے تھے اور اس کو (علاء الملک کو) دہلی کی کوتوالی کا عہدہ جو بڑی عزت اور ذمہ داری کا عہدہ تھا اعزازی طور پر عطا کیا گیا تھا۔ علاء الملک مٹاپے کی وجہ سے زیادہ چل پھر نہیں سکتا تھا۔ اس لئے دربار سلطانی میں وہ مہینہ میں ایک مرتبہ حاضر ہوتا تھا۔ اب بآسانی اس بات کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ کہ عہد خلجیہ میں ضیاء برنی کے خاندان کو کیسا عروج حاصل تھا۔ سلطان محمد تغلق نے تخت نشین ہو کر سب سے بڑا جرم یہ کیا کہ دوسرے مستحق لوگوں کو تو بڑی بڑی جاگیریں اور مناصب عطا کئے۔ لیکن ضیاء برنی اور اس کے خاندان والوں کو ان کی توقع کے خلاف کوئی بڑا عہدہ یا منصب عطا نہیں کیا اور سب سے زیادہ غضب یہ ہوا کہ برن کی جاگیر جس کی ضیاء برنی کو مرتے دم تک آرزو رہی محمد تغلق نے صوبہ میان دوآب کا ایک جزو ہونے کی وجہ سے خالصہ یعنی شاہی جاگیر میں شامل کرلی۔ محمد تغلق نے ضیاء برنی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا اور اس کی قابلیت کا صحیح اندازہ کرکے زمرۂ نویسندگان میں ایک اعلیٰ عہدے پر مامور کیا اور وہ برابر سترہ برس اہل کاروں میں اس کا شمار رہا۔ وہ کبھی میر حسن اجی میر مہران المخاطب

بہ قتلغ خاں غلیمی کی پیشی میں کام کرتا تھا اور کبھی ملک احمد ایاز رومی خواجہ جہان کا میر منشی رہا۔ کبھی ان امراکی طرف سے پادشاہ کی خدمت میں پیغام پہنچانے پر مامور ہوا۔ کبھی جبکہ بادشاہ سفر میں ہوتا تو بطور مصاحب سلطان کی بے تکلف صحبتوں میں شریک ہوتا تھا لیکن وہ ہمیشہ دل تنگ اور سلطان محمد تغلق سے بدل ناخوش رہا کیونکہ اس کو بر آن کی جاگیر سلطان نے نہیں دی۔ خود اُسی کی تاریخ کے مندرجہ ذیل اقتباسات سے بہت سی مذکورہ باتوں کا ثبوت بہم پہنچتا ہے عہد بلبنی کے تذکرہ میں وہ ایک جگہ لکھتا ہے :۔

"منکہ مولف تاریخ فیروز شاہیم از جد مادرین خود سپہ سالار حسام الدین وکیلدر شنیدہ ام"

جلال الدین فیروز خلجی کے تذکرہ میں ایک جگہ کہتا ہے کہ :۔

"منکہ مولف تاریخ فیروز شاہیم در عہد جلالی قرآن تمام کردہ بودم واز مفردات گذشتہ وخط آموختہ از خدا ترساں و دانایان کہ بر پدرم موید الملک آمدوشد داشتند شنیدہ بودم کہ در مجلس مختلف پیش پدر من بگفتندے کہ عہد جلالی از لو ادر عہود است"

چند صفحات آگے چل کر کہتا ہے کہ :۔

"منکہ مولفم در عہد جلالی پدرم نائب ارکلی خاں بود خانہ در کیلوکھری بس بلند در فیج بر آوردہ من از انجا با استادان و رفیقان بزیارت سیدی مولہ آمدم"

علاء الدین خلجی کے حملہ دیوگیر کا حال لکھتے ہوئے کہتا ہے کہ جب علاء الدین کڑہ سے دیوگیر کی جانب روانہ ہونے لگا تو۔

"در غیبت خود نیابت کڑہ وادوہ بعم مولف ملک علاء الملک کہ از مختصان او بود تفویض کردہ کوچ بکوچ ودایلچپور رفت"

سلطان علاء الدین خلجی کے حالات میں لکھتا ہے کہ :۔

"و بعم علاء الملک عم مولف در سال اول جلوس کڑہ وادوہ مقرر داشتند و موید الملک پدر مولف را نیابت وخواجگی برن دادند و اشغال خطیر و اقطاعات بزرگ بر نیکاں و نیک نامان و کاردانان و کارگذاران مفوض گشتہ و دہلی و تمامی بلاد و ممالک گلستانی و بوستانی شدہ"

آگے چل کر ایک جگہ کہتا ہے کہ:۔

"دعم من علاء الملک کوتوالِ دہلی از سبب غایت فربہی خود در غرۃ ہر ماہے بسلام سلطان علاء الدین رفتے وحریف شراب او شدے۔"

اپنے چچا علاء الملک اور سلطان علاء الدین خلجی کے ایک مکالمے کا حال لکھکر اپنے چچا کے الفاظ نقل کرتا ہے کہ:۔

"ومارا حیات بادشاہ واستقامت ملک پادشاہ مطلوب است کہ حیات ما وخیل وتبع ما بحیات پادشاہ واستقامت ملک پادشاہ متعلق است واگر نعوذ باللہ منہا این ملک بدست دیگرے افتد نہ مارا وزن وبچۂ مارا ونہ خیل تبع مارا زندہ بگذارد۔"

ان اقتباسات سے بخوبی ثابت ہوجاتا ہے کہ ضیائے برنی کے خاندان کو عہد خلجیہ میں بڑا عروج حاصل تھا۔ لیکن سلطان محمد تغلق کے عہدِ سلطنت میں اس کے خاندان کی عزت وشوکت پر اوس سی پڑگئی اور یہ خاندان گمنامی کی تاریکی میں روپوش ہوگیا۔ ایسی حالت میں ضیاء برنی کے دل پر کیسے کیسے سانپ لوٹتے ہوں گے اور وہ کس طرح دوسرے لوگوں کو صاحب اقتدار اور اپنے آپ کو معمولی حالت میں دیکھکر پیچ وتاب کھاتا ہوگا۔ چنانچہ اس نے اپنی تاریخ میں سلطان محمد تغلق کا حال لکھتے ہوئے اس طرح اپنے دل کا بخار نکالا ہے۔

ضیاء برنی کے دل کا بخار

وہ کہتا ہے کہ:۔

"وبدست پیرامالی کہ سفلہ ترین ورزالہ ترین سفلگان ورزالگان ہند وسند است دیوان وزارت داد وبر سر ملوک وامراء والیان ومقطعان امیر گردانید۔"

ملک زین الدین المخاطب بہ مخلص الملک اور ملک مجد الدین المخاطب بہ مجد الملک پسران مولانا رکن الدین تھانیسری کی شان میں کہتا ہے کہ:۔

"چندیں شریران کہ از گاہ آدم الی یومنا مثل آں شریران آفریدہ نشدہ اند حجاج یوسف بغلامی وچاکری ایشاں در شرارت نشاید در کار شدہ بودند چنانکہ زند..... ولپسران میانگی رکن تھانیسری کہ شریران زمانہ را پیشوا بودند وشریر تر از شریران عالم واخبث الناس بود۔ آں چناں بد بختے کا فر صفتے را مجد الملک

می گویند۔"

اپنی اور اپنے خاندان کی کس مپرسی کو دیکھ کر کہتا ہے کہ:۔

"وچگونہ تفویض معاظم اشغال وتولیت عرصات وولایات بزرگ بلئیان وسفلکن وبہ کہ تعجب نماید از پادشاہے کہ از نہایت سروری ومہتری ہمسر جمشید وموازی کیخسرو بود وشایان خدمت درگاہ خود بزرجمہران روزگار وعالی نسبان عصرانہ پسندو بجا ہیر بداصل شغلہا واقطاعہا داد۔"

آگے چل کر اور بھی زیادہ بے قابو ہو جاتا ہے۔

"واگر تفویضات اشغال بزرگ واقطاعات بزرگ کہ آں پادشاہ بناکساں وناکس بچگاں ارزانی داشتے وتنازادگان درزانہ یگان یا سری وسروری وادے دعاے را محتاج سخن ایشان وبہانے را نیاز مند ورایشان گرداشیدے بر دعوے خدائے ودرانار بکم الاعلی زدن او حمل می کنم۔

جن لوگوں کو ضیاء برنی اس طرح دل کھول کر گالیاں دے رہا ہے وہ سب شریف اور ذی علم لوگ تھے، اُن سے بہتر مدبر اور کارکن لوگ اس زمانے میں نہیں مل سکتے تھے۔ محمد تغلق سے زیادہ مردم شناس شاید ہی کوئی بادشاہ ہندوستان کے تخت پر بیٹھا ہو، اس نے ہر شخص کو اُس کی قابلیت اور استحقاق کے موافق عہدے اور مرتبے عطا کئے۔ ضیاء برنی اپنی خواری ولاچاری کا حال ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

"درپیرانِ سالی ودردنیاخوار وزار وبے مقدار ولا اعتبار شدہ ام وور در ہا محتاج شدہ ورسوا می شوم ودرعقبی نمی دانم کہ حال من چہ خواہد شد وبرمن از عقوبات چہ خواہد رفت۔"

اپنی تاریخ کی نسبت ضیاء برنی خود کہتا ہے کہ:۔

"در ہر سطرے بلکہ در ہر کلمہ لطائف وغرائب احکام انتظامی درضمن اخبار وآثار سلاطین درج کردم ومنافع ومضار جہانداری بہا نداران چہ بصرتح وچہ بکنایت وچہ بعبارت وچہ باشارت وچہ کشادہ وچہ برمز آوردہ۔"

تاریخ فیروز شاہی گواہی دے رہی ہے کہ ضیائے برنی کو کنایہ، اشارہ اور رمز کی ضرورت سلطان محمد تغلق ہی کے متعلق پیش آئی ہے غالباً سوال کے اس حصے کا جواب، کہ ضیاء برنی کو محمد تغلق سے نفرت کیوں تھی کافی ہو چکا ہے۔

باب ششم

محمدؐ تغلق کی صحیح تصویر

مورخین کی مجبوریاں اور بے احتیاطیاں

ضیاء برنی نے اپنے ذاتی عناد کی وجہ سے اس سلطان کے ستائیس سالہ عہدِ حکومت کے واقعات میں اس کی تخت نشینی اور وفات کی صحیح تاریخوں کے علاوہ سن و سال کا حوالہ صرف ایک جگہ دیا ہے کہ ۷۴۴ھ میں مصر سے حاجی سعید حرمزی خلیفہ کا فرمان لے کر آیا تھا۔ ضیاء برنی کی اس فروگذاشت یا چالاکی کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعد کے مورخین میں سے کسی کو بھی محمد تغلق کے صحیح حالات لکھنے اور صحیح رائے قائم کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔ ہندوستان کی سیکڑوں تاریخیں (جو ضیاء برنی کے بعد لکھی گئی ہیں) مطالعہ کر ڈالئے۔ لیکن محمد تغلق کے متعلق صحیح تصور اور صحیح اندازہ ذہن میں ہرگز قائم نہ ہو سکے گا اور مجبور ہو کر آپ کو ضیاء برنی ہی پر غصہ آئے گا۔ بعد کے مورخین کو کیسی کیسی ٹھوکریں لگی ہیں اس کا اندازہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ ملا عبد القادر بدایونی اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں کہ ترم شیرین خاں مغل ۷۲۰ھ میں ہندوستان آیا۔ اسی کو فرشتہ ۷۲۳ھ کا واقعہ بتاتا ہے بدایونی گرشاسپ کی بغاوت کو ۷۲۷ھ کا واقعہ بتاتا ہے۔ اور الفنسٹن اسی واقعہ کو ۷۳۹ھ سے منسوب کرتا ہے۔ ملا صاحب بدایونی کہتے ہیں کہ بہرام ایبہ ۷۲۸ھ میں مقتول ہوا اور الفنسٹن اور ذکاء اللہ اسے ۷۳۹ھ اور ۷۳۰ھ کا حادثہ بتاتے ہیں۔ محمد تغلق کے بہت سے حالات

معلوم کرنیکے لئے آجکل کے مورخ بالخصوص انگریزی مورخ سفرنامہ ابن بطوطہ کو سب سے زیادہ معتبر تصور کرتے ہیں، اس میں شک نہیں کہ سفرنامہ ابن بطوطہ ایک ایسی کتاب ہے جس میں کسی بے جا حمایت یا نفرت کو دخل نہیں ہے، اور یہ کتاب ابن بطوطہ نے ہندوستان سے باہر اس وقت لکھی تھی جب کہ اس کو دوبارہ ہندوستان آنے اور محمد تغلق سے ملنے کی توقع نہ تھی لیکن سفرنامہ ابن بطوطہ سے فائدہ حاصل کرنے میں ان باتوں کا خیال کوئی نہیں کرتا کہ ابن بطوطہ ۷۳۴ھ میں ہندوستان آیا اور ۷۴۸ھ میں ہندوستان سے رخصت ہوگیا۔ قریباً ۱۴ سال اس نے ہندوستان میں گذارے۔ ملتان، دہلی، گوالیار، دیوگیر، کرناٹک، ملابار وغیرہ ہندوستان کے تمام صوبوں میں پہنچا، نہ اس کے پاس کوئی روزنامچہ تھا، نہ وہ یہاں سے کوئی یادداشت لکھ کرلے گیا تھا۔ کیونکہ اس کا تمام سامان واسباب ہندوستان سے روانہ ہونے کے بعد کئی مرتبہ ضائع ہوہوگیا ہے، اور وہ صرف اپنی جان ہی سلامت بچا سکا ہے۔ ۷۴۸ھ کے بعد یعنی ہندوستان سے روانہ ہونے کے بائیس سال بعد اُس نے اپنا سفرنامہ لکھا ہے۔ یہ بائیس سال بھی اس کے سفر ہی میں گذرے ہیں۔ لہٰذا تاریخی واقعات کی صحیح ترتیب قائم کرنے میں اس سے بھی بہت کم مدد مل سکتی ہے۔ خود اس کے سفر کی بھی زمانی ومکانی ترتیب صحیح نہیں ہے مثلاً وہ اپنے ایک سفر میں دہلی سے چل کر علی گڑھ اور علی گڑھ سے چل کر اول برن اس کے بعد علی گڑھ پہنچا ہوگا اتنے دنوں کے بعد سفرنامہ لکھتے وقت وہ ہرایک شہر کے محل وقوع اور واقعات پیش آمدہ کی ترتیب کو یاد نہیں رکھ سکا۔ اسی طرح لوگوں کے ناموں، عہدوں اور ان کے متعلقہ کاموں میں بھی بہت بے ترتیبی پائی جاتی ہے ان تمام باتوں کو ملحوظ رکھ کر سفرنامہ ابن بطوطہ سے فائدہ اٹھانا چاہیئے تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ محمد تغلق کے معاملے میں ضیاء برنی کی ارادۃً پیدا کی ہوئی بے ترتیبی کو جس طرح کسی نے ملحوظ نہیں رکھا، اسی طرح ابن بطوطہ کی غیرارادی بے ترتیبی کا بھی کسی نے لحاظ نہیں کیا۔ بہرحال قدیم وجدید تمام تاریخوں میں سلطان محمد تغلق کے حالات کو مطالعہ کرنے کے بعد میں پھر ضیاء برنی ہی کی تاریخ کو سامنے رکھکر محمد تغلق کے عہدِ حکومت کا ایک خاکہ مرتب کرنا چاہتا ہوں لیکن اس زمانہ کے ہندوستان کی تاریخ کا سمجھنا بہت کچھ اس بات پر منحصر ہے کہ چین وتبت وترکستان وخراسان وافغانستان وعراق وشام کے حالات بھی پیش نظر رہیں، لہٰذا سب سے پہلے ذیل کی چند باتوں کو بغور ملاحظہ کیجیے۔

داستانِ خُراسان

ساتویں صدی ہجری کے آخر میں چنگیز خاں کے دارالسلطنت قراقرم میں اُس کے بیٹے اکتائی خاں کی اولاد کے بعد تولی خاں چنگیزی کی اولاد فرماں روا تھی۔ اسی زمانے میں ان کے قبضے میں مشرقی ترکستان اور منگولیا کے قدیمی ملک کے علاوہ چین کا تمام ملک بھی آگیا تھا۔ چین کی مشہور شہر انھیں لوگوں کی یادگار ہے چین کو فتح کر کے ان لوگوں نے ایک نیا شہر خان بالیغ کے نام سے آباد کیا اور قراقرم کی بجائے اس کو اپنا دارالسلطنت بنایا تھا یہ لوگ اس وقت تک جبکہ ۷۷۰ھ میں چینیوں نے ان کی حکومت کا خاتمہ کر کے اپنی حکومت قائم کی دوسرے چنگیزی قبیلوں سے بے تعلق رہے۔ ان لوگوں کے دربار میں امیر احمد بناکتی۔ مولانا بہاء الدین بخاری قاضی علاء الدین طوسی، مولانا بدرالدین بیہقی، مولانا سعیدالدین سمرقندی وغیرہ اکثر مسلمان سرکاری عہدوں پر مامور رہے لیکن چنگیزی قبائل کی یہ شاخ دولت ایمان واسلام سے محروم رہی اور ان میں کوئی بادشاہ مسلمان نہ ہوا۔

ہرات میں چنگیزی مغلوں کا رشتہ دار ایک مغل خاندان حکمران تھا۔ قندھار و غزنین کے علاقے میں بھی چنگیزی مغلوں کا ایک قبیلہ فرماں روا تھا۔ ہرات وغزنی کے دونوں خاندان فرماں روائے ایران کے ماتحت تھے۔ ماوراء النہر یعنی سمرقند و بخارا کے علاقے میں چنگیز خاں کے بیٹے چغتائی خاں کی اولاد برسرِ حکومت تھی۔

ایران، خراسان وعراق و آذربائیجان و کردستان کی زبردست سلطنت تولی خاں ابن چنگیز خاں کے بیٹے ہلاکو خاں کی اولاد کے قبضے میں تھی اور اسی کو سلطنت ایران کہا جاتا تھا۔ اس سلطنت میں ایشیائے کوچک کا مشرقی حصہ بھی شامل تھا جو صوبہ روم کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

مشرقی ترکستان کے بعض اضلاع دشت قبچاق، روس اور ماسکو تک کے علاقے جن میں کبھی کبھی آذربائیجان کا صوبہ بھی شامل ہو جاتا تھا۔ چنگیز خاں کے بیٹے جوجی خاں کی اولاد کے قبضے میں تھے۔

ایشیائے کوچک کے مغربی حصے کو ساتویں صدی ہجری کے آخری زمانے تک سلجوقی ترکوں نے مغلوں سے بچایا پھر سلجوقی ریاست کی جگہ ۶۹۹ھ میں عثمانی حکومت شروع ہوئی جو بہت جلد ایک طاقتور سلطنت بن کر یورپ کے وسطی حصے تک وسیع

ہو گئی۔ شام کے علاقے پر ہلاکو خاں کی اولاد بار بار حملے کرتی رہی اور جس طرح ہلاکو خاں مصر کی مملوکی سلطنت کے مقابلے میں ناکام رہا تھا۔ اسی طرح اس کی اولاد بھی ہمیشہ مصریوں سے شکست کھاتی رہی۔ ہندوستان کی غلجیہ سلطنت اور مغلوں کی سلطنت کے درمیان دریائے سندھ حد فاصل تھا۔ ہندوستان پر ہرات اور غزنی کی مغلیہ سلطنتوں کے حملے ہوتے رہتے تھے۔ ہندوستان میں بھی مغلوں کو ہمیشہ ناکامی سے واسطہ پڑا۔ ہلاکو خاں کی اولاد میں سب سے پہلے اس کا بیٹا نکودار المعروف بہ احمد خاں ۶۸۱ھ میں مسلمان ہوا اس کے مسلمان ہوتے ہی اس کے بھتیجے ارغون خاں نے جو صوبہ خراسان کا حاکم تھا اس کے خلاف سازش شروع کی اور مغل سردار محض اس لئے کہ احمد خاں (نکودار بن ہلاکو) نے مسلمان ہو کر تورہ چنگیزی پر عمل کرنا چھوڑ دیا تھا ارغون کے شریک ہو گئے اور ماہ جمادی الآخر ۶۸۳ھ میں احمد خاں کو اسلام قبول کرنے کے جرم میں شہید کر کے اس کی جگہ ارغون خان ابن اباقان ابن ہلاکو خاں کو ایران کے تخت پر بٹھایا۔ ارغون خاں نے تخت نشین ہو کر احمد خاں نکودار کے وزیر اعظم خواجہ شمس الدین کو قتل کیا اور (بوقا نامی) ایک شخص کو وزیر بنایا۔ اس وزیر کی شرارتوں سے واقف ہو کر اس کو بھی قتل کیا اور ایک یہودی کو سعد الدولہ کا خطاب دے کر وزیر اعظم بنایا جس نے جا بجا شہروں اور قصبوں میں مسلمان علماء کو قتل کرایا۔ سعد الدولہ کہنے کو یہودی مگر دراصل عیسائی اور عیسائیوں کا بے حد طرفدار تھا۔ مغل چونکہ مسلمانوں کا خون بہانے میں بہت حریص تھے اس لئے عیسائی اور یہودی ان جاہل مغلوں کا تقرب حاصل کرنے کے لئے ان کے درباروں میں پہنچے۔ اسی طرح گجرات ودکن کے ہندو بھی ان کو اپنا نجات دہندہ بنانے اور سلطنت اسلامیہ کو ان کے ہاتھوں سے برباد کرانے کے لئے ان کے پاس پہنچ گئے تھے۔ یہ بجائے خود ایک دلچسپ داستان ہے کہ مسلمانوں، عیسائیوں، یہودیوں، ہندوؤں وغیرہ نے کس طرح مغلوں کو اپنی اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کی جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ بہرحال ارغون خاں ہندوؤں کی جانب بھی بہت مائل تھا کتاب اریماق مغول کے الفاظ یہ ہیں:

"وارغون اعتقاد سے بہ جوگیان ہندو طریقۂ ایشاں پیدا کرده بود جوگی آمده اور اگفت کہ معجونے می سازم کہ از اثر او عمر دراز شود وارغون خان ورزیدن

آمدہ آں معجون بو قلموں خوردو مدتے مداومت نمود مرضے پیدا کرد وخواجہ
امین الدین طبیب مداوائے او نمود مرض رو بانحطاط آورد جوگی مذکور سہ
جام شراب بوے دادو مرض باردگر عود نمود "۔

ارغون خان حجاز پر حملہ کرکے خانہ کعبہ کو (نعوذ باللہ) منہدم کرنے کا ارادہ کرچکا تھا کہ بیمار ہوکر ہفت سالہ حکومت کے بعد ۶۹۰ھ میں فوت ہوا۔ ملکم صاحب اپنی تاریخ ایران میں ارغون خان کے یہودی وزیر سعد الدولہ کی نسبت لکھتے ہیں کہ:-

"اس وزیر کو بادشاہ کی طرف سے بہت بڑا اختیار حاصل تھا عیسائی قوم جو وہاں رہتی تھی یہ وزیر اس قوم کی حد سے زیادہ رعایت کرتا تھا اور اس کی حمایت، وحفاظت میں شب و روز بجان ودل حاضر رہتا تھا مگر مسلمانوں سے نہایت بغض و عداوت رکھتا تھا اور اکثر ان کو رنج و ایذا پہنچاتا رہتا تھا یہاں تک کہ تمام اہل اسلام کو عہدوں سے معزول و برخاست کر دیا اور مسلمانوں کی نسبت یہ حکم جاری کیا گیا کہ ان میں سے کوئی دربارِ شاہی میں نہ آنے پائے بادشاہ کی طرف سے عیسائی قوم کی نسبت اس قسم کی مراعات ظہور میں آئیں تو پوپ نکلسن چہارم نے بذریعہ ایلچی اس بات کا بہت بڑا لمبا چوڑا شکریہ ادا کیا مسلمانوں کو اس بات کا بہت بڑا اندیشہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو خانہ کعبہ کو ایک گرجا گھر بنا دیا جائے۔ (ترجمہ از تاریخ ملکم)

ارغون خاں کے بعد اس کا بھائی گیختا تو خاں ممالک ایران وخراسان وغیرہ کا فرمانروا ہوا اس نے ۶۹۳ھ میں کاغذ کا سکہ یعنی نوٹ جاری کیا مگر اگلے ہی سال منسوخ کرنا پڑا۔

سُنّیوں کے مصائب

ارغون خان کا بیٹا غازان خاں باپ کے زمانے سے خراسان کا گورنر تھا ۶۹۴ھ میں ایک مغل سردار جس کا نام امیر نوروز تھا حضرت شیخ صدر الدین حموی کی تحریک و تبلیغ سے مسلمان ہوا۔ اسی زمانے میں ماوراء النہر کے مغلوں میں بھی اسلام کو رسوخ حاصل ہونے لگا تھا اور چند روز کے بعد ان کے حکمران طبقے نے بھی اسلام قبول کرلیا تھا۔ امیر نوروز کی تحریک و ترغیب سے غازان خان بھی دائرہ اسلام میں داخل ہوگیا۔ اسی سال غازان خاں کو تختِ سلطنت ملا۔ غازان خان نے امیر نوروز کو خراسان کی گورنری عطا کی۔ غازان خان

چونکہ خود بھی عرصہ دراز سے خراسان کا گورنر رہا تھا اور یہاں خصوصیت سے شیعیت کا زور رہ چکا تھا لہٰذا وہ تخت نشین ہونے کے بعد صحبت مصاحبین اور بعض مصالح ملکی کی بنا پر کیونکہ ایران میں شیعہ خیالات کے لوگوں کی کثرت تھی شیعیت کی جانب زیادہ مائل ہوگیا اور اہلِ سنت وجماعت کے خلاف اُس نے وہ تمام مظالم پورے کئے جو ہلاکو خاں اور دوسرے مغلوں نے عام مسلمانوں پر روا رکھے تھے۔

اگرچہ مغلوں کی قوم عام طور پر کافر اور غیر مسلم تھی اور غازان خان بھی برائے نام ہی مسلمان تھا کیونکہ وہ نہ ارکان اسلام کا پابند تھا نہ تورۂ چنگیزی کے خلاف کچھ کرتا تھا مگر غازان خان کے برائے نام مسلمان ہونے سے ایران وخراسان کے شیعوں کو بہت اطمینان حاصل ہوا لیکن سنیوں کے لئے مغلوں کی تلواریں پہلے سے بھی زیادہ تیز ہوگئیں امیر نوروز گورنر خراساں سنی تھا اس کا داماد فخرالدین کرت ہرات میں حکمران تھا امیر نوروز کو محض سنی ہونے کی وجہ سے یہ الزام لگا کر کہ وہ عباسی خلیفۂ مصر اور ملک الناصر سلطان مصر سے خط وکتابت کرتا ہے بحکم غازان خاں قتل کیا گیا۔ اور حکم عام جاری ہوا کہ مغلوں کے سوا کوئی شخص اپنے پاس کسی قسم کا کوئی ہتھیار نہ رکھے۔ شیخ صدرالدین حموی بھی سُنی ہونے کی وجہ سے شہید کئے گئے۔ غازان خاں کی عداوت سنیوں کے خلاف یہاں تک ترقی کرگئی کہ اُس نے مغلوں کے دو لاکھ جرار لشکر کے ساتھ قتلغ خواجہ کو ہندوستان کی اسلامی سلطنت پر حملہ کرنے کے لئے روانہ کیا اور اتنا ہی بڑا لشکر لے کر خود ملک شام پر جو سلطان مصر کے قبضے میں تھا حملہ آور ہوا۔ یہاں ہندوستان میں سلطان علاءالدین خلجی نے قتلغ خواجہ کو شکست دے کر بھگایا۔ وہاں غازاں خان بھی سلطان مصر کے مقابلے میں ہزیمت پاکر بھاگا۔ یہ ۶۹۸ھ اور ۶۹۹ھ کے واقعات ہیں۔ ملکم صاحب کا بیان یہ ہے کہ غازان خان نے تورۂ چنگیزی کو از سرِ نو رواج دیا۔ غازان خان نہایت بدصورت کریہہ منظر اور پست قد شخص تھا۔ اسلام سے اس کو دلی نفرت تھی بظاہر ایران کے شیعوں کو اپنی جانب مائل کرنے کے لئے شیعہ مذہب قبول کر لیا تھا۔ مصر وشام پر اس کے حملے محض اس لئے تھے کہ مسلمانوں کے مذہب کو ان ملکوں سے ہٹا دے اسی لئے اس نے پوپ بانیفس ہشتم سے مدد طلب کی اور پوپ نے عیسائی بادشاہوں کو اس کی مدد پر آمادہ کیا اور شام کے حملوں میں عیسائی قوم اور عیسائی سلاطین نے اس کی مدد کی۔ غازان خان اور پوپ کے درمیان محبت

اسی لئے تھی کہ دونوں اسلام کے یکساں دشمن تھے ملکم صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ غازان بظاہر مسلمان اور شیعہ تھا لیکن در اصل وہ عیسائی تھا آخر میں ان کے الفاظ، یہ ہیں کہ:-

"اگر ہم مغربی مورخوں کا اعتبار کریں تو ہم کو یقین کرنا چاہیئے کہ وہ اپنے زمانۂ حیات تک عیسوی مذہب کا معتقد رہا مگر یہ بات بھی ثابت نہیں ہوتی کہ اس مذہب کے مسائل کی نسبت اس نے اپنا اعتقاد بر سرِ عام کبھی ظاہر کیا ہو۔"

غازان خان نے ۷۰۲ھ میں پھر شام و مصر پر حملہ آور ہونے کی پہلے سے زیادہ زبردست تیاری کی۔ مغلیہ فوج حلب تک پہنچ گئی۔ لیکن عباسی خلیفہ ابوالربیع مستکفی باللہ اور ملک الناصر سلطان مصر دونوں مغلوں کے مقابلے کو آئے اور شکست فاش دے کر ان حملہ آوروں کو بھگایا۔ اس شکست کی ندامت و شرمندگی سے غازان خان ۷۰۳ھ میں مرگیا اور اس کا بھائی الجی ایتو جو غازان خان کی طرح برائے نام مسلمان تھا اور جو محمد خدا بندہ کے نام سے مشہور ہے تخت نشین ہوا۔ الجی ایتو (خدا بندہ) غازان خان کا شیعی اور سنیوں کی مخالفت میں غازان خان سے بھی دو قدم آگے تھا۔ یہ ۷۱۶ھ تک فرماں روا رہا۔ اس نے ایک شیعہ مسمی جمال الدین مطہر کو اپنا مقرب بنا رکھا تھا۔ شیراز کے قاضی مجدالدین کو صرف اس لئے شکاری کتوں سے ہلاک کرانے کا حکم دیا کہ وہ سنی تھے۔ غازان خان اور الجائیتو (خدا بندہ) کی حکومت کو ابومسلم خراسانی، استاجبیس آذربائیجانی ابن مقنع بدخشانی، حسن بن صباح قہستانی کی کوششوں کا نتیجۂ آخر اور ثمرۂ کامل سمجھنا چاہیئے۔ حسن بن صباح اور استاجبیس وغیرہ نے اسلام کے چشمے کو مکدر کرنے میں جو سعی کی تھی اس کو مغلوں کی خون آشامی نے آمیختہ ہوکر پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا۔ اس عطرِ مجموعہ کو ناواقف لوگ قابلِ فخر اسلامی سلطنت قرار دیتے ہیں حالانکہ اسلام اور مسلمانوں کی مصیبتوں میں جو چنگیز و ہلاکو کی قیادت میں وارد ہوئی تھیں ابھی تک کچھ زیادہ کمی نہ ہوئی تھی۔ ہاں، جوجی خاں ابن چنگیز خاں کی اولاد جو ازبک کے نام سے مشہور ہے مسلمان ہو کر اسلام اور مسلمانوں کے لئے باعثِ تقویت بن چکی تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ خراسان و ایران کی زہریلی ہوا سے قطعًا متاثر نہ ہوسکی تھی اور اسلام کے سیدھے سادھے احکام

پر عامل تھی۔ قراقرم اور خان بالیغ والے مغلوں کی طرح قندھار و غزنی کے چغتائی مغل ابھی تک اسلام سے نا آشنا اور اپنی چنگیزی حالت پر قائم تھے۔ ۷۰۹ھ میں الجایتو (خدا بندہ) نے حکم عام جاری کیا کہ ہمارے زیر حکومت ملکوں میں کوئی شخص خطبۂ جمعہ کے اندر حضرت علی اور اہل بیت کے سوا کسی صحابی کا نام نہ لے اور کوئی متنفس اہل سنت و جماعت کے طریقے پر قائم نہ رہے ورنہ قتل کر دیا جائے گا۔ اس حکم پر اُس کی وفات کے بہت دنوں بعد تک بھی نہایت سختی سے عمل درآمد ہوتا رہا اور ایران و خراسان و فارس و آذربائیجان و کردستان و عراق و سیستان وغیرہ میں مغلوں کی خون آشامی کے خوف سے سنیوں کا بکلی استیصال ہو گیا۔ بہت سے لوگ شہید ہوئے۔ بہت سوں نے مذہب تبدیل کر کے اپنی جان بچائی۔ اور مذکورہ ممالک میں انواع واقسام کے بدعات نے رواج پایا۔ ملکم صاحب اپنی تاریخ میں الجایتو (خدا بندہ) کی نسبت لکھتے ہیں کہ :-

> ایران کے بادشاہوں میں شیعوں کے مذہب کو ظاہر کرنے والا اور ترقی دینے والا سب سے پہلے یہی بادشاہ تھا جو سکہ اُس نے مضروب کرایا تھا اُس پر بارہ اماموں کے نام کندہ تھے۔“

۷۱۲ھ میں سلطان الجایتو (خدا بندہ) نے بلا وجہ محض مسلم کشی کے شوق میں سلطان مصر کے خلاف ایک عظیم الشان فوج فراہم کی اور شام و مصر پر حملہ آور ہوا اس حملہ کی تیاریوں کا حال کتاب اوساق مغول کے ان الفاظ سے سمجھ میں آ سکتا ہے۔

> ”نوشتہ اند کہ دریں یورش پنجاہ ہزار دینار درکار تیاری مجانیق صرف شدہ بود و ہزار و پانصد زرہ از دیار فرنگ آوردہ بودند و دو بیست و شصت سراسپ با جلہائے اطلس و زینہائے زریں و دو ہزار و پانصد اشتر جہت تعمیر سامان ولوذ چرخ دور انداز و یازدہ ہزار خروار تیر و پولاد و صد خروار قارورہ نفت و صد خروار کوس و سی صد و شصت مرد نقاب با کلہائے تیز منقار و پنجاہ ہزار پوست جہت گذرانیدن احمال و اثقال از دریا مرتب شدہ بودند۔“

ان تیاریوں کا حال سن کر ملک شام میں بڑی ہل چل مچی۔ ملک الناصر سلطان مصر

جو سلطان ملک المظفر کو قتل کرکے دوبارہ سلطان مصر بنا تھا اور اپنے سرداران فوج اور امرائے ملک سے مشتبہ ہو رہا تھا مغلوں کے مقابلے پر تیار نہ ہو کر ملک شام کی حکومت سے دست برداری اختیار کرنے پر آمادہ تھا۔ اس زمانے میں براعظم ایشیا کی کوئی سلطنت سلطان الجایتو کی ٹکر سنبھالنے کے قابل نہیں سمجھی جاتی تھی۔

حضرت امام ابن تیمیہ کی تدبیر و شمشیر

اس نازک اور خطرناک حالت کا صحیح احساس فرما کر اور عالم اسلام کو سخت خطرے کی حالت میں دیکھ کر جس مردِ باخدا نے اپنے حواس بجا رکھے اور ضلالت و گمراہی کے امڈے ہوئے طوفان کا مقابلہ کرنے کے لئے مردِ نبرد بن کر میدان میں نکلا وہ حضرت امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ تھے وہ سلطان ملک الناصر کے دربار میں پہنچے۔ اس کو سردربار غیرتیں دلاکر اور ہمت بندھاکر جس طرح ممکن ہوا مقابلہ پر آمادہ کیا۔ پھر دمشق واپس آکر اہل دمشق کو مرد بننے اور جنگ میں حصہ لینے کی ترغیب دی، سلطان کیک خاں مغل (جو مسلمان تھا) کے پاس ماوراءالنہر میں قاصد بھیجے اور اسلام کا واسطہ دے کر سلطان الجایتو (خدا بندہ) کے فتنے کو فرو کرنے اور اسلام کی حمایت پر آمادہ ہونے کی ترغیب دی۔ دوسری طرف سلطان طغرل خاں ابن توقتائی خاں (از اولاد جوجی خاں) کے پاس بمقام سرائے (سیرادارد) ایلچی روانہ کرکے خطرے سے آگاہ کیا۔ آخر الجایتو خان (خدا بندہ) نے دریائے فرات کو عبور کرکے ملک شام کو غارت کرنا شروع کیا۔ حضرت امام ابن تیمیہ شام و مصر کی فوجوں کے آگے آگے مقدمۃ الجیش دستہ کی سپہ سالاری کرتے ہوئے مغلیہ لشکر پر حملہ آور ہوئے اور اپنی صف شکنی و شمشیر زنی کے وہ جوہر دکھائے کہ مصری فوج میں جان پڑ گئی اور مغلیہ لشکر کو اس مرتبہ بھی بھاگنا پڑا اور عالم اسلام کا سب سے بڑا خطرہ آئندہ عرصۂ دراز تک کے لئے مٹ گیا۔ الجایتو کے شکست کھانے اور بعد شکست ملک شام میں نہ ٹھہرنے اور سراسیمگی کے ساتھ فرار ہونے کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہوا کہ کیک خاں چغتائی کے حدود خراسان میں داخل ہونے کی خبر الجایتو کے پاس ملک شام میں لڑائی سے قبل پہنچ چکی تھی اور وہ کیک خاں کے حملے کو روکنا اپنی اور اپنی سلطنت کی حفاظت کے لئے زیادہ ضروری سمجھتا تھا۔ بہرحال امام ممدوح کی تدبیر و شمشیر دونوں نے بڑا کام کیا۔

مغلیہ سلطنت کا زوال

الجایتو کو یہ اتنا بڑا دھکا لگا کہ آئندہ کے لیے خراسان کے بعض حصے اور قندھار و غزنی وغیرہ کے علاقے بھی چغتائیوں کے قبضے میں آگئے اور ہرات کی ماتحت ریاست بھی ایرانی سلطنت کی سیادت سے خارج ہوگئی ۷۱۶ھ میں الجایتو کا انتقال ہوا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا سلطان ابوسعید بہادر خاں جس کی عمر صرف بارہ سال کی تھی، باپ کی جگہ دارالسلطنت شہر سلطانیہ میں تخت نشین ہوا۔ الجایتو خاں کے امرا میں امیر چوپان سلدوز بہت قابو یافتہ تھا۔ وہی شام کے حملوں میں سپہ سالاری کی خدمات انجام دیتا رہا۔ امیر چوپان سلدوز ہی کی کوشش سے شہزادہ ابوسعید بہادر خاں کو چونکہ تخت حکومت نصیب ہوا تھا لہٰذا اس کو وزارت عظمیٰ اور مدارالمہامی کا مرتبہ عطا ہوا یسور اغلن چغتائی جو سلطان کیک خان کا بھائی تھا امیر چوپان سلدوز کا خراسان میں بار بار مقابلہ کرتا رہا آخر ۷۲۱ھ میں امیر چوپان سلدوز کی چالاکیوں سے یسور اغلن کا کام تمام ہوا اور امیر چوپان بلاخدشہ حکومت کے مزے اڑانے لگا۔ اس وقت تک ایران کی سلطنت کا مزاج وہی تھا جو سلطان الجایتو کے وقت میں تھا۔ بظاہر ابوسعید بادشاہ تھا لیکن درحقیقت امیر چوپان سلدوز سلطنت کرتا تھا۔ امیر چوپان سلدوز سلطان ابوسعید کا بہنوئی بھی تھا اور اس کے اسلام کا اندازہ صرف اس بات سے بھی ہو سکتا ہے کہ اُس نے سلطان الجایتو کی دو بیٹیوں دوندی خانم اور سانتیبک خاتون سے شادی کی اور دونوں بہنیں بیک وقت اس کی بیویاں تھیں۔ امیر چوپان اور ایران و خراسان کے مغلوں کو اسلام سے کوئی تعلق نہ تھا البتہ اکثر مغل نام مسلمانوں کے سے رکھنے لگے تھے۔ امیر چوپان کے ایک بیٹے مسمی تیمور تاش نے جو صوبہ روم کا گورنر تھا اسی زمانے میں نبوت و مہدویت کا دعویٰ بھی کیا تھا۔ اس کے بعد ۷۲۵ھ میں امیر چوپان سلدوز وزیر اعظم کی بیٹی بغداد خاتون کی وجہ سے جس کی شادی امیر حسن جلائر سے ہوئی تھی اور جس پر سلطان ابوسعید عاشق ہو گیا تھا۔ ایسی باتیں وقوع میں آئیں کہ امیر چوپان اور سلطان ابوسعید بہادر خاں میں ناچاقی پیدا ہوئی ۷۲۵ھ کا پورا سال اس حالت میں گذرا کہ سلطان و وزیر کے دل ایک دوسرے سے صاف نہ تھے۔ ترمشیرین خاں ابن دوا خاں چغتائی نے جو کیک خاں اور یسور اغلن کا بھائی اور چغتائیوں کا سلطان اور خوش عقیدہ مسلمان (نو مسلم) تھا غزنی میں فوجیں جمع کیں اور خراسان اور ایران پر حملہ آوری کا قصد کیا۔

اس کا حال امیر چوپان سلدوز کو معلوم ہوا تو اس نے سلطان ابوسعید کو خوش اور اپنے دشمن ترمشیریں خان کو برباد کرنے کے لئے ایک زبردست فوج اپنے بیٹے امیر حسن سلدوز کی سرداری میں روانہ کی۔ ترمشیریں خاں ابھی اپنی جنگی تیاریوں کو مکمل نہ کرنے پایا تھا کہ یکایک اُس پر حملہ ہوا۔ غزنی کے قریب ۷۲۶ھ میں لڑائی ہوئی ترمشیریں خاں نے شکست پائی شکست کھا کر وہ سیدھا سلطان محمد تغلق کے پاس ہندوستان آیا۔ امیر حسن سلدوز نے شہر غزنی کو تباہ و برباد کر کے سلطان محمود غزنوی کے مقبرے اور شہر کی مسجدوں کو بھی تباہ کر ڈالا

"در حوالی غزنین امیر حسن ظفر یافتہ در غزنین قتل و غارت بسیار نمودہ حتی
که مجاوران مقبرہ سلطان محمود غزنوی را نیز اسیر کردو لشکرا د بے ادبی
ہائے بسیار با معابد و مساجد کردہ در سنہ ست وعشرین وسبعمائہ واپس
بخراسان رفت۔ (اوبماق مغول)

سلطان ابوسعید کی ناراضی بجائے کم ہونے کے اور بڑھی اور اس واقعہ کے بعد امیر چوپان وزارت سے معزول اور خواجہ غیاث الدین محمد ابن خواجہ رشید الدین کو منصب وزارت عطا ہوا۔

خواجہ غیاث الدین کے وزیر ہوتے ہی ایران میں وہ ظالمانہ حکم جو سنیوں کے خلاف سلطان الجایتو کے زمانے سے نافذ تھا اٹھ گیا۔ لیکن امیر چوپان باغی ہو کر خراسان پر قابض ہو گیا اور ۷۲۸ھ میں مارا گیا۔ ۱۳ ربیع الآخر ۷۳۶ھ کو سلطان ابوسعید کا انتقال ہوا اور اس کا انتقال ہوتے ہی ایران و خراسان و عراق وغیرہ میں طائف الملوکی برپا ہوئی جو تیمور لنگ کے زمانے تک قائم رہی یہاں تک مغلوں کی نسبت اور ایران و خراسان کے تعلق جو کچھ لکھا گیا ہے زیادہ اوبماق مغول اور کمتر تاریخ الخلفاء و تاریخ ملکم وغیرہ سے ماخوذ ہے اس مذکورہ داستان خراسان کو ذہن میں رکھ کر سلطان محمد تغلق کے حالات جو آگے بیان ہوتے ہیں بآسانی اور بخوبی سمجھ میں آسکیں گے۔

سلطان محمد تغلق اور ترمشیریں خاں

محمد تغلق ۷۲۵ھ میں تخت نشین ہوا اس وقت تک ایران و خراسان میں عرصہ دراز سے مسلمانوں پر بڑے ظلم ہو رہے تھے جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ اسی زمانے میں امیر چوپان سلدوز اور سلطان ابوسعید میں شکر رنجی پیدا ہو گئی تھی۔ سلطان دوا خان چغتائی

اور اس کے بیٹے کبک خان و ترمشیرین خان ماوراالنہر میں مسلمان ہو چکے تھے اور ان لوگوں کو سلطان الجایتو کے خلاف جب کہ وہ شام پر حملہ آور ہوا تھا آمادہ کیا جا چکا تھا۔ شیخ زادۂ دمشقی جس کا ذکر ضیاء برنی اور فرشتہ وغیرہ نے کیا ہے سنہ ۷۲۱ھ میں ہندوستان پہنچ کر محمد تغلق کی مصاحبت میں داخل ہو چکا تھا۔ محمد تغلق کی تخت نشینی کے بعد سلطان ترمشیرین خان کا غزنی میں فوجیں جمع کرنا اور خلاف توقع یعنی قبل از وقت جنگ چھیڑنے پر شکست کھا کر غزنی سے سیدھا سلطان محمد تغلق کے پاس دہلی آنا اور پھر یہاں سے کسی مناسب قرارداد کے بعد واپس اپنے ملک کو چلا جانا اور سلطان محمد تغلق کا آئندہ ہمیشہ غزنی کے عامل اور قاضی کے پاس بکثرت روپیہ بھیجتے رہنا ایسی باتیں نہیں ہیں جن پر سے سرسری طور پر گذرا جا سکے۔ ضیاء برنی ترمشیرین خاں کے ہندوستان آنے کا کوئی ذکر نہیں کرتا۔ فرشتہ اس کے ذکر نہ کرنے کو اس بات پر محمول کرتا ہے کہ ضیاء برنی نے محمد تغلق کی حمایت کی ہے اور اس کی بے عزتی کو چھپایا ہے۔ یعنی ترمشیرین خاں فاتحانہ ہندوستان میں داخل ہوا تھا اور محمد تغلق نے اس کو باج و خراج دے کر اور خوشامد کر کے واپس کیا تھا۔ فرشتہ کے الفاظ یہ ہیں:۔

"ترمشیرین خان بن دوا خان حاکم الوس چغتائی کہ شجاعت رستم و عدالت کسریٰ در وے جمع بود و پادشاہ مسلمانان بود با سپاہ افزوں از اقطار و امطار و اوراق اشجار قاصد تسخیر ہندوستان شدہ در شہور سبع و عشرین و سبعمائہ داخل ایں مملکت شد و از لمغان و ملتان تا دروازۂ دہلی تاختہ و غارت کردہ نصف آں بلدہ را معسکر خود ساخت و سلطان محمد تغلق شاہ چوں طرفہ در مقابلہ و مقاتلہ ندیدہ از راہ عجز و نیاز در آمد و جمع از اہل اعتبار را واسطہ ساختہ از نقود و جواہر آں مقدار را کہ موجب تسلی خاطر ترمشیرین خان شود پیش کش کرد ضیاء برنی از ملاحظۂ روزگار ایں واقعہ را در تاریخ نویش مرقوم نساختہ۔"

فرشتہ کا یہ بیان از سرتا پا غلط بے بنیاد، واقعات اصلیہ کے بالکل خلاف اور کذب واقعی کی ایک پوٹ ہے۔ فرشتہ نے ترمشیرین خاں کی آمد کا سال بھی غلط لکھا ہے۔ کیونکہ وہ سنہ ۷۲۶ھ میں ہندوستان آکر اسی سال بلا توقف واپس چلا گیا تھا۔ فرشتہ نے اس کا آنا ۷۲۹ھ میں بیان کیا ہے اور یہ صحیح نہیں۔ ضیاء برنی نے محمد تغلق کے عیوب اور برائیوں

کو نمایاں کرنے اور اس کی خوبیوں پر پردہ ڈالنے میں سرگرم ہے اور باغی غلام طغی نمک حرام کے مقابلے میں محمد تغلق کی آخری زمانے کی سرگردانیوں اور مجبوریوں کو باتفصیل مزے لے لے کر بیان کرتا ہے اتنے بڑے حادثے یعنی ترمشیریں خاں کے حملے کو محمد تغلق کی بے عزتی پر پردہ ڈالنے کے لئے تو ہرگز نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ترمشیریں خاں امیر حسن ابن امیر حسن چوپان سلدوز سے شکست کھا کر محمد تغلق کے پاس خراسان و ایران کے مسلمانوں کو نجات دلانے اور متفقہ کوشش سے اس دشوار کام کے انجام تک پہنچانے کے متعلق مشورہ کرنے آیا تھا۔ ترمشیریں خاں ایک دوست اور مہمان کی حیثیت سے آیا تھا، نہ کہ دشمن اور حملہ آور کی حیثیت سے اگر وہ حملہ آور ہوا تھا اور لوٹ مار کرتا ہوا دہلی تک پہنچا تھا تو ملتان سے بہرام ایبہ کہاں چلا گیا اور مقابلہ کئے بغیر کس خلاء میں چھپ گیا تھا۔ سلطان محمد تغلق سلطان غیاث الدین تغلق کا بیٹا تھا، جس کے نام سے مغل لرزتے تھے وہ اس آسانی سے ترمشیریں خاں کے آگے جو خود ہی پریشانی اور تباہ حالی میں گرفتار رہتا، بلا مقابلہ کئے ذلت کے ساتھ ہتھیار نہیں ڈال سکتا تھا۔ ترمشیریں خاں چونکہ نومسلم تھا اس لئے وہ محمد تغلق کی نگاہ میں ضرور عزیز و مکرم تھا۔ محمد تغلق نے یقیناً اُس کو ہر قسم کی دلاسا و تسلی دی اور روپیہ سے بھی اس کی مدد کی اور دوستی و یک جہتی کے عہد و اقرار استوار اور آئندہ منصوبوں کو طے اور متعین کر کے ہندوستان سے رخصت کیا۔ اس کا ایک بڑا ثبوت یہ بھی ہے کہ ترمشیریں خاں نے ہندوستان سے واپس جا کر اپنے داماد امیر لوزروز کو بہت سے سرداروں اور سپاہیوں کے ساتھ سلطان محمد تغلق کی فوج میں شامل ہونے کے لئے بھیج دیا تھا جس کا ذکر خود فرشتہ ان الفاظ میں کرتا ہے کہ :-

"امیر لوزروز داماد ترمشیریں خاں کہ پادشاہزادہ چغتائی بود با بسیارے از امرائے ہزارہ و صد بہندوستان آمدہ نوکری سلطان محمد شاہ اختیار کرد۔"

غرض ترمشیریں خاں کا ۷۲۶ھ میں ہندوستان آنا ایران و خراسان وغیرہ کو ہلاکو خاں کی اولاد کے قبضے سے نکالنے کی تجویزوں کو پختہ کرنے اور محمد تغلق کو اس کام کا ذمہ دار بنانے کے لئے تھا اور محمد تغلق اس ضروری کام کے لئے بدل و جان آمادہ ہوگیا تھا۔ تاریخوں میں بظاہر صاف الفاظ نہیں ملتے۔ لیکن اس بات کو تسلیم کر لینے کے

لئے زبردست قرائن موجود ہیں کہ یہ سارا کام حضرت امام ابن تیمیہ کی تجاویز کے مطابق ہوا تھا۔ جن کی ترمشیریں خاں سے خط و کتابت ہو چکی تھی۔ اُدھر محمد تغلق کے دربار میں بھی امام ممدوح کے فرستادے یقیناً موجود تھے اور محمد تغلق کو ترمشیریں خاں کے خراسان پر حملہ آور ہونے کی تیاریوں سے ضرور کوئی تعلق تھا اور اسی لئے ترمشیریں خاں غزنی سے سیدھا ہندوستان آیا۔ ترمشیریں خاں کے ہندوستان آکر سلطان محمد تغلق سے ملاقات کرنے کا ایک نمایاں نتیجہ برآمد ہوا کہ غزنی کا شہر اور اس کا نواحی علاقہ چغتائیوں نے محمد تغلق کے زیر سیادت چھوڑ دیا تھا۔ اس بات کو بھی صاف الفاظ میں کسی مورخ نے نہیں لکھا۔ لیکن ضیاء برنی کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ غزنی پر محمد تغلق کی سیادت قائم تھی اور محمد تغلق، قاضی غزنی ہی کے ذریعے خراسان و ایران کے حالات و تغیرات سے واقف و آگاہ رہتا تھا۔ سلطان فیروز تغلق کے زمانے تک بھی غزنی ہندوستان کی سلطنت میں شامل تھا۔ چنانچہ ملتان سے غزنی تک کا علاقہ ایک صوبہ دار کے ماتحت رہتا تھا جس کا ذکر شمس سراج عفیف کی تاریخ میں موجود ہے۔ سلطان محمد تغلق کی تمامتر توجہ اس طرف منعطف ہو چکی تھی کہ ہلاکو خانیوں کو ایران و خراسان سے بے دخل کرے اور اسی لئے اُس کو غزنی کے عامل کی خاطر بہت عزیز تھی جس کا ذکر ضیاء برنی نے بار بار کیا ہے۔ چغتائی چونکہ ایران و خراسان کو خود فتح نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا وہ محمد تغلق کے آمادہ ہو جانے سے بہت خوش اور اُس کے ہر طرح ممد و معاون بن گئے۔ ضیاء برنی بار بار اس بات کی شکایت کرتا ہے کہ محمد تغلق خراسان و ایران و عراق کے لوگوں کی جو ہندوستان میں آتے ہیں بڑی خاطر کرتا اور اُن کو خوب انعام و اکرام دیتا تھا۔ یہ بالکل صاف اور غیر مشتبہ حقیقت ہے کہ جو پادشاہ کسی ملک پر حملہ آوری کا قصد رکھتا ہو وہ اس ملک کے باشندوں کو اپنی جانب مائل کرنے کی ضرور کوشش کیا کرتا ہے۔ اسی زمانے میں حضرت سلطان المشائخ نظام اولیاء کے مرید و خلیفہ حضرت مولانا فخر الدین زرادی جو حج بیت اللہ کے بعد شام و بغداد میں علم حدیث کی تحصیل سے فارغ ہو کر دہلی واپس آئے تھے۔ سلطان محمد تغلق نے ان سے جو گفتگو کی وہ تقصار جیود الاحرار میں اس طرح درج ہے۔

"سلطان محمد تغلق می خواست کہ ملک ترکستان و خراسان راضبط کند

و آل چنگیز را ازاں دیار براند۔ مولانا را گفت شما دریں کارہا موافقت خواہید کرد۔ مولانا گفت انشا ء اللہ تعالیٰ سلطان گفت ایں کلمہ شک است مولانا گفت در مستقبل ہم چنیں آید۔"

دارالسلطنت کی تبدیلی اور حملہ خراسان کی حقیقت

محمد تغلق اپنی تخت نشینی کے دوسرے ہی سال سے جب کہ ترمشیریں خاں ہندوستان آیا تھا خراسان کی فتح کا مصمم ارادہ کر چکا تھا۔ ساتھ ہی وہ اس بات سے بھی بے خبر نہ تھا کہ جنوبی ہند چند ہی روز سے سلطنت اسلامیہ میں شامل ہوا ہے۔ شمالی ہند میں سلطنت اسلامیہ کو بظاہر کسی اندرونی دشمن کا خطرہ نہ تھا۔ شمالی ہند کے ہندو سوا سو سال سے مسلمانوں کے محکوم اور رعایا بن چکے تھے۔ لیکن دکن کی حالت ایسی نہ تھی اس پر اسلامی حکومت نئی نئی قائم ہوئی تھی۔۔۔ مسلمانوں نے سو برس تک دکن کی فتح کا ارادہ اس لئے ملتوی رکھا تھا کہ شمالی ہند پر مغلوں کے حملے پیہم ہو رہے تھے اور مغلوں کے حملے سے شمالی ہند کا بچانا ضروری تھا۔ محمد تغلق کو مغلوں کے حملوں کا کوئی خطرہ اب باقی نہ رہا تھا۔ دکن بھی اس کے قبضے میں تھا۔ لیکن دکن کی جانب سے اس کو ایسا اطمینان حاصل نہ تھا جیسا کہ شمالی ہند سے وہ مطمئن تھا۔ خراسان کی فتح کا ارادہ بھی وہ کر چکا لہٰذا اس نے دیوگیر (دولت آباد) کو دارالسلطنت بنانا چاہا۔ اس کا ہرگز یہ ارادہ نہ تھا کہ دہلی کی مرکزیت کو مٹا دے اس نے صاف طور پر اظہار کر دیا تھا کہ میرا نائب السلطنت دہلی میں رہے گا۔ دیوگیر پہلے ہی یعنی علاؤالدین خلجی کے زمانے سے جب کہ دکن سلطنت اسلامیہ میں شامل ہوا مرکز سلطنت تھا اور وہاں دکن کا حاکم نائب السلطنت یا ملک نائب کے نام سے رہتا تھا۔ دکن کی فتح سے پہلے دہلی کے بعد ملتان کا مرتبہ تھا یعنی ملتان میں سلطان دہلی کا سب سے بڑا معتمد وایسرائے رہتا تھا کیونکہ وہی مغلوں کے حملوں کو روکتا تھا۔ فتح دکن کے بعد محمد تغلق کی تخت نشینی تک دیوگیر اور ملتان دونوں کا مرتبہ مساوی تھا اور یہ دونوں مقام دوم درجے کے دارالسلطنت سمجھے جاتے تھے ترمشیریں خاں کی آمد کے بعد چونکہ مغلوں کے حملوں کا کوئی اندیشہ نہ تھا۔ لہٰذا ملتان کی اہمیت جاتی رہی اور صرف دیوگیر دوم درجہ کا دارالسلطنت رہ گیا۔ دہلی اس لئے اوّل درجہ کا دارالسلطنت تھا کہ وہاں بادشاہ رہتا

تھا اور دیوگیر اس لئے دوم درجہ کا دارالسلطنت تھا۔ کہ وہاں کا وائسرائے سلطان دہلی کی خدمت میں دکن کے انتظام کا جواب دہ تھا۔ محمد تغلق کی تجویز یہ تھی کہ دہلی اور دیوگیر کی حیثیتوں کو ایک دوسرے سے تبدیل کر دیا جائے یعنی وائسرائے دہلی میں رہے اور بادشاہ دیوگیر میں مقیم ہو کر دکن کی حالت کو جلد قابل اطمینان بنا سکے اور حملۂ خراسان کے لئے دریائے سندھ کے کنارے دہلی اور دیوگیر دونوں جانب سے طاقت فراہم کر دی جائے اگر دہلی میں بیٹھ کر وہ حملۂ خراسان کی تیاری کرتا تو دکن کا بے قابو ہو جانا بالکل یقینی تھا جہاں کے ہندو ہلاکو خانیوں سے پہلے ہی ساز باز رکھتے تھے۔ اگر وہ دہلی کو بالکل ویران ہی کرنا چاہتا تو ۷۲۷ھ میں جب کہ دیوگیر جا رہا تھا۔ دہلی میں ایک قصر شاہی کی تعمیر کا حکم نہ دیتا جو ۷۲۸ھ میں تعمیر ہو کر پایہ تکمیل کو پہنچا اور بدر چاچ المخاطب بہ فخر زماں نے اس کی تاریخ فادخلوها نکالی۔ فتدبروا۔

اب ذرا ہندوستان کے نقشے میں دہلی اور دیوگیر کے مقاموں کو دیکھو اور سوچو کہ محمد تغلق نے دیوگیر کو دارالسلطنت بنانے میں کون سی حماقت کی تھی اور اس کے سوا اس کو اور کیا کرنا چاہئے تھا اور اگر تم محمد تغلق کی جگہ ہوتے اور تمہارے وہی عزائم ہوتے جو محمد تغلق کے تھے تو تم کیا کرتے۔ محمد تغلق کا دارالسلطنت کو تبدیل کرنا ہرگز اس سے زیادہ اہم نہ تھا جس قدر انگریزوں کا کلکتہ کی جگہ دہلی کو دارالسلطنت بنانا تھا۔ اس جگہ یہ بھی یاد دلا دینا ضروری ہے کہ حضرت شاہ نظام الدین اولیا سلطان محمد تغلق کی تخت نشینی سے پہلے اپنے سب سے بڑے خلیفہ حضرت شیخ برہان الدین کو معہ اپنے چار سو مریدوں کے دیوگیر کی طرف بھیج چکے تھے اور انھوں نے پہلے ہی دیوگیر (دیوگڑھ) کو تبلیغ اسلام کا مرکز بنانا تجویز کر لیا تھا۔ پس جس مقام کو حضرت نظام اولیا مرکزیت عطا کر چکے تھے اس مقام کو اگر سلطان محمد تغلق نے بھی مرکز حکومت بنانا چاہا تو یہ ایک مرد خدا آگاہ کے منشاء کو پورا کرتا تھا لہذا کم از کم اُن لوگوں کی زبان اعتراض تو بالکل بند ہو جانی چاہئیے جو حضرت ممدوح کے علوئے مراتب کا اعتقاد رکھتے ہیں۔ ضیاء برنی بھی اگر دل سے ان لوگوں میں شامل ہوتا تو بجائے اعتراض کے تحسین و آفرین پر مجبور ہوتا۔

ضیاء برنی تو سن و سال اور واقعات کی ترتیب زمانی کو ترک ہی کر چکا ہے عبدالقادر بدایونی منتخب التواریخ میں لکھتے ہیں کہ محمد تغلق ۷۲۷ھ میں دیوگیر (دیوگڑھ) گیا اور اپنی

والدہ مخدومۂ جہان کو بھی دیوگیر لے گیا۔ دہلی سے دیوگڑھ تک راستے میں جا بجا مسافرخانے اور مسافروں کی حفاظت کے لئے چوکیاں قائم کیں اور مسافروں کے لئے ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائیں۔ منتخب التواریخ کا یہ بیان صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ ترمشیرین خاں کے جاتے ہی محمد تغلق دکن کی جانب سے جلد از جلد مطمئن ہونا اور خراسان پر حملہ کرنا چاہتا تھا۔ تاریخ مبارک شاہی سے بھی منتخب التواریخ کے بیان کی تائید ہوتی ہے۔ علاء الدین خلجی نے ہندوستان کا نظام سلطنت اور قانون ملکداری بہت اچھا مرتب کردیا تھا۔ لیکن قطب الدین مبارک شاہ خلجی کے عہد حکومت میں وہ تمام آئین و قوانین درہم برہم ہوگئے تھے۔ ضیاء برنی اور ملا عبدالقادر بدایونی صاف الفاظ میں اس کا تذکرہ کرتے ہیں۔ محمد تغلق نے سلطنت کے ہر ایک شعبے اور ہر ایک محکمے کے لئے جدید آئین نافذ کئے جو ضیاء برنی کی روایت کے موافق اسلوب یا اسالیب کہلاتے تھے ساتھ ہی دارالسلطنت کی تبدیلی کا بندوبست کیا۔ دہلی اور دیوگیر کے درمیان آمد و رفت کی سہولت اور راستے کا امن و امان صرف اسی لئے ضروری نہ تھا کہ دہلی کے شاہی محکمے اور شاہی اہل کار دیوگیر جانے والے تھے بلکہ انتظام ملکی اور سلطنت کی مضبوطی کے لئے ہمیشہ ان دونوں صدر مقاموں کے درمیان سفر کی سہولت اور آمدورفت کی آسانی ازبس ضروری تھی اور اس کام کو محمد تغلق نے سب سے پہلے کیا۔ جب کہ بادشاہ خود دیوگیر میں قیام کرنا چاہتا تھا تو اس کی یہ خواہش کہ اس کے مصاحبین، وزراء، امراء اور دفتروں کے تجربہ کار و کارگذار اہل کار نیز علما و فقہا و صوفیا بھی اس کے ساتھ دیوگیر کی سکونت اختیار کریں کچھ بے جا نہ تھی اور اس میں سب سے بڑی مصلحت یہ تھی کہ اہل دکن کو معلوم ہوجائے کہ اب مستقل طور پر دیوگیر سلطنت اسلامیہ کا دارالسلطنت بن گیا ہے اور دہلی کی سکونت کو سلطان نے ترک کردیا ہے۔ اہل دکن کو اس بات کا یقین ہوجانا ہی دکن کی تمام آئندہ بغاوتوں اور سرکشیوں کے ختم اور مسدود ہوجانے کے لئے کافی تھا۔ اور یہی مصلحت تھی کہ دیوگیر یا دیوگڑھ کا نام تبدیل کرکے دولت آباد کے نام سے اُسے موسوم کیا گیا تا اصل مقصد پورے طور پر حاصل ہوجائے۔ اس زمانے کی دنیا میں کوئی بادشاہ ایسا نہیں ہوسکتا تھا جو اپنی کسی ایسی مصلحت کو اشتہار دے کر لوگوں کو سمجھاتا۔ محمد تغلق نے حکم دیا کہ تمام شاہی کارخانے اور اُن کارخانوں کے متوسلین دہلی سے دولت آباد کی جانب منتقل ہوجائیں۔

اس کے لیے اُس نے لوگوں کی مجبوریوں اور سفر کی دقتوں کو بخوبی ملحوظ رکھا۔ دولت آباد میں اپنے خرچ سے مکانات بنواتے۔ دہلی کے مکانوں اور دہلی کی جائدادوں سے زیادہ اچھے مکانات اور زیادہ قیمتی جائدادیں عطا کیں۔ ملا صاحب بدایونی کی روایت کے موافق دولت آباد میں روزینے اور تنخواہیں دہلی کی نسبت سہ چند کردیں، باربرداری اور سواری کا خود انتظام کیا۔ باوجود اس کے لوگوں کو نہایت سیرچشمی کے ساتھ مصارف سفر کے نام سے روپیہ دیا اور لطف یہ کہ دہلی کے مکانات کی قیمتیں الگ عطا کیں۔ ضیاء برنی بھی اس قدر اقرار کرتا ہے کہ

"در باب خلق روانی سلطان اکرامات وانعامات بسیار کرد چہ در وقت روان کردن وچہ ہنگام رسیدن دلگیر مبذول فرمود"

اسی زمانے میں نہیں ہر زمانے میں اور آج کل بھی اگر ایسی صورت پیش آئے تو کچھ لوگ ضرور ایسے نکل آئیں گے جو ہر قسم کی سہولت ہر قسم کے منافع اور ہر قسم کی بہترین اُمیدوں کے ہوتے ہوئے کبھی ترک سکونت پر آمادہ نہ ہوں گے۔ چنانچہ بعض لوگوں نے سلطان کے اس حکم کو تکلیف مالایطاق قرار دے کر تعمیل سے انکار و اعراض کیا اور انکار کرنے والوں کی جرأت دیکھکر دوسروں میں بھی جو سفر پر آمادہ ہوچکے تھے انکار کی ہمت پیدا ہوگئی۔ ایسی حالت میں ایک پادشاہ، ایک سلطان ایک شہنشاہ جو خراسان وایران کے فتح کرنیکا حوصلہ رکھتا ہو اپنی بات منوانے کے لئے لوگوں کو خوشامد درآمد اور منت سماجت ہی سے آمادہ نہیں کرسکتا تھا اس کو اپنے حکم کی تعمیل میں یہ تغافل وانکار دیکھکر شاہانہ شوکت وسطوت سے کام لینا پڑا۔ اس اظہار شوکت میں بھی اس نے انسانی کمزوریوں کا پورا لحاظ رکھا اور نہایت وسیع مہلتیں تعمیل حکم کے لئے عطا کیں۔ جو مکانات دہلی میں اس طرح خالی ہوئے اُن کو دوسرے شہروں اور قصبوں کے مستحق اور باکمال لوگوں سے آباد کیا۔

سلطان محمد علما و اکابر و معارف خطط و قصبات معروف بلاد ممالک را در شہر آورد و متوطن گردانیدہ بود (ضیا، برنی)

جن لوگوں کو بادل ناخواستہ دہلی کی سکونت ترک کرنی پڑی تھی وہ جب کچھ مدت کے بعد دہلی واپس آئے تو اُنھوں نے جیسا کہ عوام کا دستور اور مخلوق کی عادت ہے عجیب عجیب افسانے تراشے اور بعد میں یہی جھوٹے افسانے لوگوں کی زبان پر جاری

رہ کر تاریخی روایات کی صورت پکڑ گئے۔ مثلاً یہ کہ دہلی بالکل ویران ہو گئی تھی۔ دہلی میں ایک کتا اور ایک بلی بھی باقی نہ رہی تھی وغیرہ وغیرہ، نہ کسی تاریخ سے ثابت ہوتا ہے نہ عقل اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ دہلی کے سارے باشندے دولت آباد کو منتقل کئے گئے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہی لوگ جو دربار سلطنت اور کارخانہ جات سلطنت سے تعلق رکھتے تھے منتقل ہوئے تھے۔ سلطان محمد تغلق کی دانائی اور نکتہ رسی کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ۷۲۷ھ کے شروع میں جب کہ بعض اہل دہلی کو دولت آباد منتقل ہونے کا حکم دیا تو سب سے پہلے اس نے اپنا نمونہ پیش کیا کہ ملک احمد ایاز کو دہلی کا والیسرائے بنا کر اپنے اہل وعیال اور اپنی والدہ مخدومۂ جہاں کو دولت آباد لے گیا۔ مخدومۂ جہاں کے متوسلین میں بہت سے درویش اور صوفی لوگ تھے جن کو مخدومۂ جہاں کی سرکار سے وظیفے ملتے تھے یہ لوگ بھی مخدومۂ جہاں کے ساتھ دہلی سے دولت آباد چلے گئے۔ دہلی سے دولت آباد کی طرف جانے والا یہ سب سے پہلا شاہی قافلہ درویشوں کی کثیر التعداد جماعت پر مشتمل تھا۔ انھیں میں حضرت شیخ حسن دہلوی بھی تھے جنھوں نے دولت آباد ہی میں وفات پائی۔ ان تمام کاموں کے ساتھ ہی سلطان نے فوجی بھرتی بھی جاری کر رکھی تھی چنانچہ ماوراءالنہر اور افغانستان سے مغل اور پٹھان آ آ کر فوج شاہی میں بھرتی ہوتے تھے۔ اسی زمانے میں ترمشیریں خاں کا داماد امیر نوروز مغلوں کی ایک فوج لے کر آیا جس کا اوپر تذکرہ ہو چکا ہے۔ اسی زمانے میں اسمٰعیل افغان گل افغان، شاہو افغان وغیرہ افاغنہ اپنی اپنی جمعیتیں لے کر آئے اور سلطان محمد تغلق نے ان کو بڑے بڑے عہدے عطا کئے ضیاء برنی ان لوگوں کے ہندوستان آنے اور عہدے پانے سے بہت ناراض ہے اور بار بار حرف شکایت زبان پر لاتا ہے۔ لیکن جس فوج کو خراسان پر حملہ کرنا تھا اس میں یہی افغان اور مغل زیادہ کار آمد اور مفید ثابت ہو سکتے تھے۔ اور اسی لئے سلطان ان لوگوں کی ہمت افزائی اور قدر کرتا تھا۔

محمد تغلق کی مستعدی غور کرنے اور سوچنے کا مقام ہے کہ زیادہ سے زیادہ تین سال کے عرصہ میں یعنی ۷۲۵ھ سے ۷۲۷ھ کے آخر تک محمد تغلق نے کس قدر کام انجام دیئے۔

(۱) ہر محکمے کے متعلق آئین وضوابط جاری کئے۔

"ہر روز صد حدیث و دویست حدیث فرمائش بخط توقیع در دیوان خریطہ دار کہ آں دیوان را دیوان طلب احکام توقیع نام شدہ بود می رسید و بر حکم آں احکام محدد نفاذ امراز والیان ومقطعان ومتصرفان اقرب و ابعد اقالیم طلب می شد ودر تفسیر دا ہمال تغیرات وتشدیدات جاری می گشت (ضیا برنی)

(۲) شہر دولت آباد (دیوگیر) اور وہاں کے قلعہ کی تعمیر۔

(۳) دولت آباد اور دہلی کے درمیان مسافروں کے آرام اور راستے کے امن و امان کا انتظام کیا۔

(۴) ملک کے ہر صوبے اور ہر حصے میں مناسب اہل کاروں اور صوبہ داروں کو مقرر کیا۔

(۵) ملک کے خراج کی وصولی اور آمد وخرچ کے حسابات میں کسی قسم کا نقص اور سقم باقی نہ چھوڑا۔

"ودر چند سال اول جلوس سلطان محمد خراج بلاد ممالک دہلی و گجرات و مالوہ و دیوگیر و تلنگ و کنپلہ و دھور سمدر و معبر و ترہت و لکھنوتی و سنار گاؤں و ستگاؤں چناں مضبوط شد کہ مجملات اقالیم و عرصات مذکور بآں دوری و بعد مسافت چناں کہ حساب کرو قصبات و دیہائے میاں دو آب می شود در دیوان وزارت دہلی ہم چناں می شد ..... و درآں چند سال محمد شاہی عجب ضبطے و استقامتے روئے نمود" (ضیا برنی)

(۶) خود معہ مخدومہ جہاں دیوگیر اور تمام شاہی دفتروں اور کارخانوں کو بھی دہلی سے لے گیا دہلی والوں کے لئے سفر کی سہولتیں بہم پہنچائیں۔

(۷) پونے چار لاکھ جدید فوج فتح خراسان کے لئے بھرتی کی اور اس جدید فوج کے لئے ہر قسم کا سامان فراہم کیا۔

"ودرآں سال سہ لک و ہفتاد ہزار سوار را تذکرہ دیوان عرض پیش تخت گذرانیدہ بودند" (ضیا برنی)

ایسے مستعد، جفاکش، عقلمند، دوربین، مستقل مزاج اور اولوالعزم سلطان کا تصور کرتے ہوئے یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ وہ خود جید عالم تھا اور دربار میں ہمیشہ اپنے سامنے قرآن مجید اور کتب احادیث موجود رکھتا تھا۔ قرآن مجید کے خلاف کوئی حکم

اور کوئی فیصلہ صادر نہ کرتا تھا۔ اس نے انفصالِ خصومات اور اجرائے احکام شرعیہ کے لئے قاضی اور مفتی ہر شہر و قصبے میں حسب دستور سابق قائم رکھے تھے لیکن وہ ان کی تنگ نظری و مراسم پرستی کو مٹانا اور شریعت کے صاف و سادہ احکام کا پابند بنانا چاہتا تھا اس نے پُرانے نظامِ قضا کو تبدیل کر کے قاضی کمال الدین کو کمال الملک صدر جہاں کا خطاب دے کر مہتمم امور شرعیہ کا عہدہ عطا کیا تھا۔ کمال الملک صدر جہاں سلطان کے ہم خیال اور متبع کتاب و سنت بزرگ تھے۔ اس انتظام اور تغیر و تبدل کا ملک پر بہت اثر ہوا۔ تعجب ہے کہ سلطان کی اس روشن خیالی اور راست روی کو شریعت اسلام سے منحرف اور خلاف شرع امور کا مرتکب ہونا قرار دیا گیا۔ تمام وہ لوگ جو محکمۂ شرعیہ کے مذکورہ تغیر و اصلاح سے اپنا سابقہ اقتدار کھو چکے تھے سلطان کے بدخواہ اور اس کے کاموں میں مشکلات پیدا کرنے کا موجب تھے۔ یہ حقیقت اگر ہندوؤں اور عیسائیوں کی سمجھ میں نہ آئے تو تعجب نہیں لیکن مسلمانوں کی سمجھ میں ضرور آجانی چاہیے کیونکہ اُن کی قومی تاریخ اس قسم کی صدہا مثالیں اپنے اندر رکھتی ہے اور وہ واقف ہیں کہ اکبر کو مولویوں سے متنفر بنانے کا موجب خود بعض تنگ نظر تشقق مولوی ہی ہوئے جن میں اس زمانے کے مشہور و معتبر مورخ ملّا عبدالقادر بدایونی کو بھی ایک حد تک شامل سمجھا جاتا ہے۔ محمد تغلق کے ابتدائی عہدِ حکومت سے ایک ایسی مخالف طاقت ہندوستان میں موجود ہو گئی تھی جس کا وجود فی الخارج بعد کے مورخین کی نگاہ سے قطعاً پوشیدہ رہا۔ ہمارا سب سے زیادہ قیمتی مورخ ضیا برنی بھی اسی مذکورہ مخالف اور دل شکستہ گروہ میں شامل تھا۔

گرشاسپ اور بہرام ایبہ کی بغاوت

ملا صاحب بدایونی کی روایت کے بموجب ۷۲۷ھ کے آخر ایام میں ملک بہادر گرشاسپ نے دہلی میں فتنہ برپا کیا جب کہ سلطان محمد تغلق دولت آباد (دیوگیر) میں اور ملک احمد ایاز دہلی میں نائب السلطنت تھا۔ ملک سلطان کے حکم سے قتل کیا گیا۔ بدایونی نے گرشاسپ کی سرکشی و بغاوت کے اسباب بیان نہیں کئے۔ فرشتہ گرشاسپ کا پورا نام اس طرح لکھتا ہے "بہاء الدین عم زادہ سلطان محمد شاہ المخاطب بہ گرشاسپ کہ از امرائے کبار بود"۔ لیکن فرشتہ نے گرشاسپ کی بغاوت کو ۷۳۹ھ سے متعلق کیا ہے اور اس کو ولایت ساغر (دکن) کا صوبہ دار بنا کر دکن ہی میں بلال دیو کی

تحریک سے اس کا باغی ہونا بیان کیا ہے ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ وہ جب گرفتار ہوکر سلطان کی خدمت میں آیا تو سلطان نے اس کی کھال کھچوانے کا حکم دیا۔ فرشتہ ہی کی تقلید میں الفنسٹن صاحب بھی گرشاسپ کی بغاوت کو ۷۳۹ھ کا واقعہ بتاتے اور اس کو سلطان کا بھتیجا لکھتے ہیں۔ ضیاء برنی اس کا کوئی ذکر نہیں کرتا۔ مگر ابن بطوطہ جو کئی سال کے بعد ہندوستان آیا تھا۔ اپنی سنی ہوئی افواہوں کی بموجب ملک بہرام ایبہ کی بغاوت کو گرشاسپ کے قتل کا نتیجہ بتاتا ہے جس سے اس بات کا ثبوت بہم پہنچتا ہے کہ ملک بہرام کی بغاوت کو گرشاسپ کی بغاوت کے بعد بتاتے۔ مگر سن و سال کے تعین میں غلطی کرتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ فرشتہ نے گرشاسپ کی بغاوت کو نصرت خاں صوبہ دار ساغر کی بغاوت سمجھ لیا ہے جس کا ذکر آگے آتا ہے اور اسی طرح بہرام ایبہ کے حادثہ کو تاتار خاں المخاطب بہ بہرام خاں حاکم بنگالہ کی تاریخ وفات سے متعلق کر دیا ہے۔ فرشتہ ہی کے بیان سے الفنسٹن اور دوسرے مورخین نے دھوکا کھایا ہے گرشاسپ کی بغاوت یقیناً دہلی میں ہوئی اور جیسا کہ بدایونی کا بیان ہے ۷۲۷ھ کے آخر ایام میں ہوئی اس بغاوت کا سبب بجز اس کے اور کچھ نہ تھا کہ ملک احمد ایاز گورنر دہلی سلطان محمد تغلق کے دولت آباد پہنچنے کے بعد دہلی کے ان لوگوں کو جنھیں اپنی سکونت دولت آباد میں منتقل کرنے کا حکم تھا دہلی سے روانہ ہونے پر زور دے رہا تھا اور اس کو خاص طور پر اس کام کے لئے تاکید تھی گرشاسپ نے سلطان کی غیر موجودگی میں دہلی کے اکثر باشندوں اور مولویوں سے امداد پاکر علم بغاوت بلند کیا۔ دہلی کے اندر کوئی شخص عوام اور مذہبی پیشواؤں کی شرکت کے بغیر بغاوت کی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔ آخر ملک احمد ایاز اور گرشاسپ کا دہلی میں معرکہ ہوا۔ گرشاسپ گرفتار ہوکر سلطان کے پاس پہنچا اور اپنی غلط کاری کی سزا پائی۔ بہرام ایبہ جو غیاث الدین تغلق کے زمانے سے ملتان و پنجاب کا حاکم چلا آتا تھا اور محمد تغلق کو ایک ناتجربہ کار لڑکا سمجھ کر کچھ زیادہ خاطر میں نہ لاتا تھا۔ گرشاسپ کے قتل سے متاثر اور ناخوش ہوکر سرکشی پر آمادہ ہوا۔ بہرام ایبہ کی بغاوت کوئی معمولی بغاوت نہ تھی اور سلطان کے حرکت کئے بغیر اس کا فرو ہونا آسان نہ تھا۔ بہرام ایبہ کی بغاوت کا ذکر ضیاء برنی نے کیا اور اس کو اولین بغاوت بتایا ہے۔ ضیاء برنی نے جس طرح ترمشیرین خاں کا ذکر نہیں کیا، اسی طرح گرشاسپ کی بغاوت کو بھی نظر انداز کر دیا ہے۔ لہٰذا بہرام ایبہ کی بغاوت کو پہلی بغاوت

بتانا تعجب نہیں۔

"اول فتنہ یعنی بہرام ایبہ بود کہ در ملتان زاد و سلطان محمد در آں ایام کہ او در ملتان باغی شد در دیوگیر بود۔" (ضیاء برنی)

بہرام ایبہ کی بغاوت کا سبب فرشتہ اور بعض دوسرے مورخین نے یہ لکھا ہے کہ سلطان محمد تغلق نے اس سے بھی یہ فرمائش کی تھی کہ اپنے اہل وعیال کو دولت آباد میں بھیج دے، اس پر وہ شاہی ایلچی کو قتل کر کے باغی ہو گیا۔ اس بیان سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ گرشاسپ اور بہرام ایبہ کی بغاوتوں کا سبب ایک ہی تھا اور بہرام ایبہ کو گرشاسپ کے ساتھ ہمدردی تھی اور گرشاسپ کے بعد جلد ہی بہرام ایبہ بھی باغی ہوا لہٰذا بہرام ایبہ کی بغاوت کو جیسا کہ ملا بدایونی کے بیان سے ثابت ہوتا ہے ۷۲۸ھ کا واقعہ سمجھنا چاہیئے۔ سلطان دولت آباد سے سیدھا دہلی آیا۔ دہلی سے ملتان پر حملہ آور ہوا۔ بہرام ایبہ شکست کھا کر مارا گیا۔ ملتانی چونکہ بہرام ایبہ کے لشکر میں شامل تھے۔ لہٰذا سلطان نے ملتان کے قتل عام کا ارادہ کیا۔ لیکن حضرت شیخ رکن الدین نے سلطان کی خدمت میں خود تشریف لا کر اہلِ شہر کی سفارش کی اور سلطان نے ملتانیوں کو معاف کر کے منتخب التواریخ کی روایت کے موافق قوام الملک مقبول کو ملتان کی صوبہ داری عطا کی۔ اس جگہ یہ بتا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوام الملک کون شخص ہے؟ یہ قوام الملک وہی کنو۔ رور دیو کا نو کرنو مسلم ہے جو حضرت شاہ نظام الدین اولیاء کے ہاتھ پر مسلمان ہوا اور حضرت ممدوح کی وفات کے بعد سلطان محمد تغلق نے اس کی تربیت کی جانب خصوصی توجہ مبذول فرما کر اس کا مرتبہ یہاں تک بلند کیا کہ قوام الملک کا خطاب دے کر ملتان کا صوبہ دار بنایا۔ بہزاد خاں کو قوام الملک کی امداد کے لئے ملتان کا سپہ سالار اور شاہو افغان کو بہزاد خاں کا نائب مقرر کیا۔ ملتان میں جب قوام الملک کے بیٹا پیدا ہوا تو اُس نے سلطان محمد تغلق کو اطلاع دی سلطان نے قوام الملک کو لکھا کہ اس لڑکے کو میرا ہم نام بناؤ یعنی اس کا نام جونا خان رکھو چنانچہ اس کا نام جونا خاں رکھا گیا (سلطان محمد تغلق کا اصل نام جونا خاں تھا) دہلی اور ملتان کی بغاوتیں ایسی نہ تھیں کہ سلطان محمد تغلق اُن سے متاثر نہ ہو کر اور معمولی واقعہ قرار دے کر تحقیق وتفتیش کے درپے نہ ہوتا اس نے ملتان سے دہلی آ کر باغیوں اور باغیانہ خیالات پھیلانے والوں کا کھوج لگایا تو بہت سے علما وسادات وشیوخ مجرم ثابت ہوئے جن کو بغاوت کی سزائیں

علی قدر مراتب دی گئیں۔ جو قتل کے مستحق تھے۔ بے دریغ قتل کیے گئے۔ یہی وہ قتل ہے جس کی شکایت ضیاء برنی بار بار کرتا ہے مگر اس موقعہ پر یہ بات صاف اڑا جاتا ہے اور مطلق نہیں بتاتا کہ اُس کے احباب و رشتہ دار کون کون جرم بغاوت میں قتل ہوتے۔ دوسرے موقعہ پر کہتا ہے کہ:۔

"خون مسلماناں سنی و مومناں صافی اعتقاد چوں جوئے آب برطریق سیاست پیش داخول سلطانی رواں گرداند وآں چناں بسیار ئی سیاست اہلِ اسلام کہ قطرہ خون ایشاں عند اللہ عزیز تر از دنیا و مافیہاست دل او نہ راسد۔"

ضیائے برنی کی روایت کے موافق ملتان سے واپس آکر سلطان دو سال تک دہلی ہی رہا۔

"از ملتان مظفر و منصور بازگشت و در دہلی آمد و در دیوگیر کہ خلق شہر دہلی، بازن و بچہ آنجا روانی شدہ بود نرفت دہم در دہلی ساکن گشت و در آں دو سال کہ سلطان در دہلی ماند امراو ملوک وحشم برابر سلطان در دہلی بودند۔ و زن و بچہ ایشاں در دیوگیر بود" (برنی)

پس ثابت ہوا کہ سلطان دولت آباد میں پورا ایک سال بھی گذارنے نہ پایا تھا کہ گزشتہ اور بہرام ایبہ کی بغاوتوں کے سبب اس کو ۷۲۹ھ میں دہلی آنا پڑا اور ۷۳۰ھ تک دکن کی جانب نہیں گیا۔ دہلی کے لوگ جو دیوگیر جانے پر مستعد تھے رُک گئے اور اُن کو دولت آباد کا ارادہ فسخ کرنے اور دہلی میں حسب سابق آباد رہنے کی اجازت مل گئی

حملۂ خراسان کا عزم کیوں فسخ ہوا؟

شروع ۷۲۸ھ میں امیر چوپان سلدوز کے مارے جانے سے خراسان و ایران کی حالت میں بہت تغیر واقع ہو چکا تھا اور سلطان ابو سعید نے وہ حکم جو عرصہ دراز یعنی الجایتو (خدا بندہ) کے زمانے سے سُنیوں کے قتل و غارت کا آلہ بنا ہوا تھا منسوخ قرار دے کر اپنے سنی ہونے کا اعلان کر کے خطبوں میں خلفائے راشدین کے اسمائے گرامی داخل کرنے کا حکم دے دیا تھا اور مسلمانوں کو سلطان ابو سعید کے سُنی ہونے کی اس قدر خوشی ہوئی کہ اگلے سال یعنی ۷۲۹ھ کے حج میں اول سلطان ابو سعید کے لئے اس کے بعد ملک الناصر سلطان مصر کے لئے دعا کی گئی۔ اس حج میں ابنِ بطوطہ شامل تھا اور اس

بات کا اُس نے اپنے سفرنامہ میں تذکرہ کیا ہے۔ لہٰذا خراسان پر حملہ کرنے کی جو اصل وجہ تھی وہ مطلق باقی نہ رہی اور بہرام ایبہ کی بغاوت سے فارغ ہونے کے بعد ہی ۷۲۸ھ سلطان نے حملۂ خراسان کا ارادہ ترک کرکے جدید فوج کے ایک بڑے حصے کو جو غیر ضروری ہوگیا تھا موقوف کردیا۔ اس جدید فوج میں ایک حصہ ان لوگوں کا بھی تھا جو دوسرے ملکوں سے آکر نوکر ہوئے تھے۔ سلطان کی غیرت نے تقاضا نہ کیا کہ ان غیر ملک والوں کو اپنے ملک سے مایوس واپس نکال دے، چنانچہ اس نے امیر نوروز مغل سردار کو دکن یا مالوہ میں ایک جاگیر عطا کی۔ بہزاد خاں افغان اور شاہو افغان کو قوام الملک کے ساتھ ملتان میں مامور کیا اور اسی طرح سب کو مختلف صوبوں میں جاگیریں عطا فرماکر کسی غیر ملکی سردار کو واپس نہ جانے دیا۔ ہندوستانی سپاہیوں میں سے بھی ایک مختصر حصہ باقی رکھا اور اس کو دکن کے انتظام کی مضبوطی کے لئے زائد فوج کے طور پر کرناٹک اور ملابار کے علاقوں میں بھیج دیا۔ غرض اس جدید زاید فوج کے موقوف کرنے کا اثر ہندوستان ہی کے باشندوں پر زیادہ پڑا اور غیر ملکوں کی کامرانی و مقصدوری نے پرانے بیکاروں اور ناکام رہنے والے ہندوستانیوں کی آتش حسد کو اور بھی زیادہ مشتعل کردیا اور اس آتش حسد کے شعلے بعض اُن بڑے بڑے سرداروں اور عہدے داروں کے قلوب تک بھی پہنچ گئے جو کسی مذہبی اختلاف اور ترک مراسم کی تحریک سے متاثر نہ تھے۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ مولانا عضدالدین، قاضی مجدالدین شیرازی، مولانا برہان الدین واعظ۔ مولانا ناصرالدین واعظ ترمذی۔ مولانا شمس الدین اندکانی، ملک سنجر بدخشانی، ملک عمادالدین وغیرہ علمائے ممالک غیر کے بڑے بڑے وظیفے ان کے علم و فضل کی قدردانی کے طور پر اور تبلیغ و اشاعت دین متین کے لئے سہولت بہم پہنچانے کی غرض سے مقرر کئے گئے۔ ہندوستان میں ایک بڑی تعداد عالموں اور مولویوں کی ایسی تھی جو سلطان کی روشن خیالی اور اس کے عقائد مذہبی سے اختلاف رکھتی تھی۔ وہ غیروں پر اس سلطانی بخشش کو ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتی تھی۔ بس اسی کو سلطان محمد تغلق کی سب سے بڑی حماقت اور ظلم سمجھ لو۔ اور اسی کو ضیا برنی سلطان محمد تغلق کی غلطیوں میں سے ایک بڑی غلطی اور بے راہ روی قرار دیتا ہے۔

آدمیوں کو شکار کرنے کا افسانہ جو اہل کار حکم سلطانی کی تعمیل میں اپنے اہل و عیال کو دولت آباد لے گئے تھے ان میں سے

اکثر ۷۲۸ھ میں جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے اپنے فرائض منصبی کے سبب دولت آباد سے سلطانی لشکر کے ہمراہ دہلی آئے اور اُن کے اہل و عیال دولت آباد میں رہے۔ یہاں دہلی میں سلطان کو باغیوں کی سزا دہی اور دوسری ضرورتوں کے سبب ٹھہرنا پڑا اور اسی زمانے میں جدید فوج موقوف ہو کر غیر ملکی سرداروں کو بڑے بڑے عہدے اور جاگیریں عطا ہوئیں۔ جدید فوج میں جس کی تعداد پونے چار لاکھ تک پہنچ گئی تھی ہندوستان کی ہندو جنگجو قومیں یعنی راجپوت وغیرہ بھی بکثرت بھرتی کر لئے گئے تھے کیونکہ اتنی بڑی فوج کا صرف ہندوستان کے مسلمانوں ہی سے پورا کرنا نہ ممکن تھا، نہ مناسب تھا بلکہ حملۂ خراسان کے لئے ہندوؤں کی فوج کو ہمراہ لے جانا ہندوستان کے قیام امن کی ضمانت تھا۔ مغل اور افغان جو باہر سے آ کر بھرتی ہوئے تھے اُن کی تعداد بہت زیادہ نہ تھی۔ ہندو جو فوج میں بھرتی ہوئے تھے وہ علاقہ میاں دوآب کے راجپوت منڈاہر، چوہان، بھٹی، تنگے اور گوجر وغیرہ تھے جن کی زمینوں کا لگان فوجی خدمت کی عوض بطور جاگیر معاف کر کے یک خمس (۱/۵) کی جگہ صرف یک بیست (۱/۲۰) برائے نام قائم رکھا گیا تھا۔ اور دو سال تک یہ لوگ خوب گلچھرے اڑا چکے تھے اب ان لوگوں نے فوج سے خارج اور بیکار ہو کر بجائے اس کے کہ کھیتی باڑی کے کام میں حسب دستور سابق مصروف ہو جاتے شرارت اور بدامنی پھیلانی شروع کی اور شاہی محصلوں کو لگان ادا کرنے یعنی بٹائی کے وقت غلہ تقسیم کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ چونکہ یہ علاقہ سلطان کی ذاتی جاگیر اور حضور صوبہ سمجھا جاتا تھا لہٰذا اس کی شکایت سلطان تک پہنچائی گئی، سلطان نے اپنے اہلکاروں کے نام فوراً تاکیدی احکام جاری کئے اور سال رواں کا حسب دستور سابق پورا لگان وصول کرنے کی ہدایت کی۔ اپنی جبلی شرارت سے یا بعض بد دل شدہ اہلکاروں کی شہ پا کر ان لوگوں نے یہ نالائق حرکت کی کہ غلہ کے تیار شدہ کھلیانوں کو آگ لگا دی اور جنگلوں میں جا کر پناہ گزیں ہوئے۔

اس جگہ یہ بتا دینا ضروری ہے کہ آج کل میاں دوآب سے دوابہ گنگ و جمن مراد لیا جاتا ہے لیکن صوبۂ میاں دوآب کا مفہوم ہر زمانے میں تبدیل ہوتا رہا ہے، اس زمانے میں صوبۂ میاں دوآب وہ وسیع علاقہ کہلاتا تھا جو پورب کی جانب گنگا اور پچھم کی جانب ستلج سے محدود تھا اس کی شمالی حد کوہ ہمالیہ اور جنوبی حد وہ خط تھا جو قنوج سے آگرہ ہوتا ہوا راجپوتانہ کے ریگستان تک پہنچتا ہے۔ راجپوتانہ کا ریگستان صوبہ میاں دوآب کے جنوبی و

مغربی گوشہ کا احاطہ کئے ہوئے تھا۔ اس صوبہ میں ہندو راجپوتوں یعنی مذکورہ جنگجو قوموں کی آبادی زیادہ تھی ان ہندو قبیلوں کی مذکورہ شرارت سے صوبہ میان دواب کا وہ خطہ جو دہلی سے جنوب و مشرق کی جانب برن (بلند شہر) قنوج و دلمئو تک پھیلا ہوا ہے زیادہ ماؤف ہوا۔ خرمنوں کو آگ لگانے اور جنگلوں میں بھاگ جانے کی نامعقول اور متمردانہ حرکت سب سے پہلے اسی خطہ کے لوگوں نے کی ضیاء برنی کے الفاظ یہ ہیں:-

"و ہندوان خرمنہائے غلہ را آتش می زدند و می سوختند و مواشی را از خانہ ہا بیروں می کردند و سلطان شقداران و فوج داران را فرمود تا دست در نہب و تاراج زدند و بعضے قوطان و مقدمان رامی کشتند و بعضے را کور می کردند و آنانکہ خلاص می یافتند جمعیتہا می کردند و در جنگلہا می خزیدند و لایت خراب می شد و ہم دراں ایام سلطان محمد بن طغلق شکار ولایت برن رفت۔"

اس بات کے تفصیلی اسباب و وجوہ کہ سب سے پہلے برن ہی میں شرارت کے شعلے کیوں برپا ہوتے اور ضیاء برنی یا اس کے رشتہ داروں کا بھی اس شرارت سے کوئی تعلق تھا یا نہیں کچھ نہیں بتائے جا سکتے۔ برن کے علاقے کی یہ بدامنی و سرکشی یقیناً بماہ جمادی الثانی ۷۲۹ھ رونما ہوئی۔ کیونکہ ۷۲۹ھ کا جمادی الثانی ماہ اپریل کے مساوی و متوازی تھا اور اپریل ہی میں فصل ربیع کا غلہ تیار رہوتا ہے۔ اس سرکشی و شرارت کا حال سن کر سلطان نے شقداروں اور فوج داروں کو سزا دہی کا حکم دیا لیکن جب شرارت کم نہ ہوئی اور اصلاح کی کوئی صورت نہ نکلی تو غالباً بماہ رجب یا شعبان ۷۲۹ھ میں سلطان برسم شکار خود دہلی سے اس طرف چلا۔

شکار کی مٹی پلید

اوپر کے اقتباس میں لفظ شکار موجود ہے۔ ضیاء برنی کے اسی لفظ شکار نے اُن لوگوں کو جن کی نظر محاورات زبان اور تاریخ ہندیر بہت ہی کوتاہ اور سطحی ہے دھوکا دیا۔ فرشتہ بھی یہی لفظ استعمال کرتا اور کہتا ہے۔

"خود برسم شکار بیروں رفت و چندیں ہزار رعیت راکشتہ۔"

خواجہ نظام الدین احمد اپنی طبقات میں لکھتے ہیں:-

"ہم دریں ایام سلطان برسم شکار در برن رفت۔"

ہندوستان کی تمام فارسی تاریخیں "برسم شکار رفتن" کے محاورے سے لبریز ہیں

شاید ہی کوئی پادشاہ ایسا ہو کہ اُس کے تذکرہ میں "برسم شکار رفتن" کا محاورہ استعمال نہ ہوا ہو۔ بادشاہ جب خود کسی سے لڑنے، کسی پر حملہ کرنے، کسی کو سزا دینے، کسی کی فرمانبرداری کا امتحان لینے، کسی سے نذرانہ یا خراج وصول کرنے یا کسی بغاوت کو فرو کرنے کے لئے روانہ ہوتا ہے تو پادشاہ کی اس روانگی کو مورخین ہمیشہ اس طرح لکھتے ہیں "برسم شکار رواں شد" "برسم شکار بیروں رفت" "برسم شکار کوکبۂ خسروی در حرکت آمد" "خیالم سلطانی برسم شکار بیروں زدند" وغیرہ وغیرہ۔ ضیاء برنی سے بھی یہی خطا ہوئی کہ اُس نے لکھ دیا کہ سلطان محمد بطریق شکار در ولایت برن رفت" چونکہ سلطان کے اس سفر میں باغیوں کو گرفتار کیا گیا۔ قتل کیا گیا۔ جو جنگلوں میں جا کر چھپ گئے تھے ان کو وہاں سے گرفتار کرا کر منگایا گیا۔ لہذا دوسرا جنگل کا لفظ بھی آ گیا۔ پس جنگل اور شکار کے دونوں لفظوں نے مل کر اچھا خاصہ شکار قمرغہ یا کھیدے کا شکار بنا دیا اور الفنسٹن صاحب نے تاریخ فیروز شاہی کے انگریزی ترجمے میں شکار اور جنگل کے الفاظ دیکھ کر اول جنگل کا اثر قبول کیا پھر جنگل کو ملک کی آبادیوں سے تبدیل فرما کر تاریخ کے مطالعہ کرنے والوں پر اس دلچسپ اور پُرلطف حادثہ کی ایجاد سے احسان فرمایا کہ :۔

> ایسی تدبیر سے اس نے انتقام لیا کہ جو تمام ظلموں سے بڑھ کر تھی یعنی اُس نے اپنی فوج کو شکار کی تیاری کا حکم دیا اور شکار کے دستور کے موافق ہندوستان کے ایک بڑے خطے کو رمنہ کی طرح سے گھیر لیا اور بعد اُس کے یہ حکم عام دیا کہ جو شخص اس گھیرے میں پاؤ شکار کی مانند اس کو قتل کر دو اور چاروں طرف سے قتل کرتے ہوئے بیچا بیچ میں جمع ہو جاؤ۔ چنانچہ جو لوگ اس میں مارے گئے اکثر گنوار اور بے گناہ تھے۔ غرض اس قسم کا شکار کئی مرتبہ کھیلا گیا اور پچھلا شکار یہ ہوا کہ قنوج کے باشندوں کا قتل عام کیا"
>
> (ترجمہ از تاریخ الفنسٹن)

ضیاء برنی صرف اس قدر لکھتا ہے کہ برن پہنچ کر وہاں کے سرکشوں کو قتل کیا اور ان کے سر قلعۂ برن کے کنگروں پر لٹکائے۔ اُس کے بعد بنگلے کی بغاوت کا ذکر شروع کر دیا ہے۔ لیکن الفنسٹن صاحب کی ایجاد ایک ثابت شدہ حقیقت کی حیثیت سے ہندوستان کے ہر تعلیم یافتہ شخص کے دماغ میں منقوش ہے اور محمد تغلق کا نام آتے ہی سب سے پہلے

اس کے اس عجیب وغریب بے بنیاد شکار کا تصور ذہن میں آجاتا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

برن کے باغیوں کو سزا دے کر سلطان قنوج کی طرف متوجہ ہوا کیونکہ قنوج کی شرارت برن کی شرارت سے کم نہ تھی۔ سلطان کی آمد اور برن والوں کی سزا دہی کا حال علاقۂ قنوج کے شریروں کو پہلے سے معلوم ہو چکا تھا۔ لہٰذا وہ سب جنگلوں میں جا کر چھپ گئے۔ ظاہر ہے کہ اس علاقہ کے شہروں، قصبوں اور گاؤں کی تمام وکمال آبادی تو جنگلوں میں جا کر پوشیدہ ہو ہی نہیں سکتی تھی نہ بے گناہوں کو بھاگنے اور چھپنے کی ضرورت تھی۔ صرف وہی لوگ جو شرارت کے امام اور فساد کے بانی ومجرم تھے بھاگ کر جنگلوں میں چھپے ہوں گے انھیں کو سزا دینا اصل مقصود تھا۔ سلطان نے قنوج پہنچ کر جب باغیوں اور شریروں کو غائب دیکھا اور ان کے جنگل میں پناہ گزیں ہونے کا حال سنا تو فوج کو جنگل کے محاصرے کا حکم دیا۔ جنگل میں جو ملا مارا گیا۔ قنوج سے دلمئو تک باغیوں کی دار وگیر کا ہنگامہ برپا ہوا۔ سلطان باغیوں کی سزا دہی سے فارغ ہو کر اور امن وانتظام قائم کر کے دہلی کی جانب واپس ہوا۔ اس معمولی واقعہ کو جس میں برن کے مفسد اور قنوج ودلمئو کے درمیانی علاقے کے شریر سزایاب ہوئے بار بار آدمیوں کا شکار کہا جاتا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ محمد تغلق اور کیا کرتا اور مفسدوں کو کس طرح سزا دیتا۔ آج اس انگریزی دور حکومت میں بھی ڈاکوؤں اور مجرموں کے جتھے جنگلوں میں پناہ گزیں ہوتے ہیں اور اُن کی گرفتاری کے لئے فوج اور پولیس کے دستے جنگلوں کا محاصرہ کر کے مجرموں کو قتل یا گرفتار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تھوڑے ہی دن ہوئے کہ سہارنپور، بجنور اور مراد آباد کے ضلعوں میں جو دامن کوہ ہمالیہ کے جنگل سے ملحق ہیں، سلطانا ڈاکو کی جمعیت نے رعایا کے امن واطمینان کو خطرہ میں ڈال رکھا تھا اور سلطانا کی جمعیت کو گرفتار کرنے کے لئے محکمۂ پولیس کارخاص کے ایک مشہور انگریز افسر مسٹر ینگ صاحب نے بڑی جمعیت کے ساتھ بار بار جنگلوں کا محاصرہ کیا اور بالآخر سلطانا کا کام تمام کر کے چھوڑا۔ کوئی شخص ثابت نہیں کر سکتا کہ محمد تغلق کی فوج کا قنوج ودلمئو کے درمیانی علاقے میں مفسدوں کا جنگلوں میں محاصرہ کرنا اور ینگ صاحب مہتمم کارخاص کی جمعیت کا بجنور ومراد آباد کے جنگلوں میں مفسدوں کا محاصرہ کرنا کوئی فرق رکھتا ہے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ اول الذکر ظلم اور موخر الذکر کو رحم

کیوں کہا جاتا ہے ۔ قیاس چاہتا ہے کہ ماہ جون مطابق ماہ شعبان ۷۲۹ھ میں قنوج و دلمئو کے شریروں کی سزا دہی سے سلطان محمد تغلق فارغ ہوا ہوگا ۔

دکن کا سفر اور وہاں کا انتظام

سلطان ابھی قنوج ہی میں مقیم تھا کہ اُس کے پاس ملا بار (معبر) میں بغاوت ہونے کی خبر پہنچی ۔ برن و قنوج کے فساد اور ملا بار کی بغاوت کا سبب ایک ہی تھا اور سلطان اس سے واقف تھا ۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے ضرورت ہے کہ تاریخ فیروز شاہی اور تاریخ فرشتہ کے دو اقتباس پہلے سے ذہن میں رکھ لئے جائیں ۔ ضیاء برنی تاریخ فیروز شاہی میں کہتا ہے کہ :-

"سلطان محمد در نہب متمردان در حدود قنوج مشغول بود کہ فتنہ در معبر زاد و پدر ابراہیم خریطہ دار سید احسن در معبر بود بلغاک کرد و امرائے آنجا ئے را بکشت و آں ملک را فرو گرفت و حشمے کہ از دہلی برائے ضبط معبر نامزد بود ہماں جا ماند و ایں خبر بسلطان رسید ۔ ابراہیم خریطہ دار را و اقربائے او را بگرفتند و سلطان محمد در شہر (دہلی) آمد و از شہر استعداد کرد و بترتیب لشکر کشی معبر جانب دیوگیر رواں شد"

فرشتہ برن و قنوج کے مفسدوں کی سزا دہی کا ذکر کرتے ہوئے سلطان کی فوج کے متعلق یہ فقرہ لکھتا ہے کہ :-

"و لشکریان کہ زن و فرزند ایشاں در دولت آباد ماندہ بود حیران و سرگرداں شدند"

جو لوگ علم النفس اور فطرت انسانی کے پر غور مطالعہ کا شوق رکھتے ہیں وہ بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ کوئی بادشاہ کتنی ہی بڑی فوج بھرتی کرے رعایا اس بھرتی سے زیادہ متاثر نہیں ہوتی نہ کوئی نمایاں تغیر محسوس ہوتا ہے لیکن کسی بڑی فوج کا یکایک موقوف اور برخاست کر دینا لوگوں کی توجہ کو بہت زیادہ اپنی طرف منعطف کر لیتا ہے اور ان لوگوں میں جو اپنے باغیانہ و مفسدانہ خیالات کو دبائے اور چھپائے ہوئے ہوتے ہیں، جان سی پڑنے لگتی اور باغیانہ عزائم میں ایک نئی طاقت نمایاں ہو جاتی ہے ۔ محمد تغلق کا تین لاکھ سے زیادہ فوج کو برطرف کر دینا باوجود اس کے کہ حسب ضرورت فوج پہلے سے موجود تھی، باغیانہ خیالات کی تقویت

کا موجب ہوا۔ سلطان کی خاص رکابی فوج کے سرداروں کی وہ حالت تھی جو فرشتہ کے مندرجہ بالا الفاظ سے ظاہر ہے یعنی وہ لوگ سلطان کو جلد دولت آباد کی جانب لے جانا چاہتے تھے تاکہ اپنے اہل وعیال کی خبر لے سکیں جن سے جدا ہوئے اُن کو تقریبًا دو سال ہو چکے تھے۔ سلطان کو دکن کی جانب متوجہ کرنے اور دولت آباد لے جانے کے لئے جو کوشش بھی وہ کر سکتے ہوں گے ضرور کی ہوگی۔ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ برخاست ہونے والی جدید فوج میں سے کچھ حصہ دکن کی جانب بھیج دیا گیا تھا۔ ملابار کا عامل سید احسن کیتھلی تھا۔ کیتھل صوبہ میان دوآ کا ایک مقام ہے جو دہلی سے شمال ومغرب کی جانب واقع ہے۔ سلطان نے جو زائد فوج ملابار بھیجی تھی وہ یقینًا انھیں لوگوں پر مشتمل ہوگی جو کیتھل، سنام اور سامانہ وغیرہ کے رہنے والے ہوں گے کیونکہ اس زمانے میں قومی و وطنی تعلقات کی بنا پر ہی کوئی شخص کسی فوج کا افسر ہو سکتا تھا اور فوج کے ہر ایک افسر کو اپنی ماتحت فوج خود ہی فراہم کرنی پڑتی تھی جو عمومًا اس کے رشتہ داروں، ہم قوموں اور ہم وطنوں پر مشتمل ہوتی تھی اور اسی قومی و وطنی عصبیت میں فوجوں کی بہادری اور طاقت کا راز مضمر تھا۔ لہٰذا جو فوج سید احسن کیتھلی صوبہ دار ملابار کو تقویت پہنچانے اور اس کے ماتحت کام کرنے کے لئے بھیجی گئی ہوگی قیاس چاہتا ہے کہ وہ ضرور کیتھل اور اطراف کیتھل کے باشندوں پر مشتمل ہوگی۔ اس قیاس کی صحت کا ثبوت اُن واقعات سے بہم پہنچے گا جو آگے چل کر بیان ہونے والے ہیں۔ ایک غیر ملکی مغل امیر نوروز کا دکن یا مالوہ میں جاگیر پانا اُن ہندوستانی سرداروں کے لئے جو اپنے آپ کو فاتح دکن اور فاتح مالوہ سمجھتے تھے یقینًا موجب رشک تھا۔ اس جدید فوج کے پہنچنے سے سید احسن کیتھلی کی طاقت تو بڑھ گئی مگر جدید فوج کی تنخواہ اسی علاقے پر پڑی جس کا انتظام پہلے سے اُس کے سپرد تھا۔ تاریخ فیروز شاہی سے ثابت ہے کہ محمد تغلق کے زمانے میں دور و دراز کے علاقوں پر جب صوبہ دار یا گورنر مقرر ہوتے تھے تو کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ صوبے کے شاہی محاصل کی ایک رقم متعین کرکے اس صوبہ دار پر عائد کر دی جاتی تھی کہ سالانہ اس قدر رقم وصول کی جائے گی اس کو ایک قسم کی ٹھیکہ داری یا جاگیر داری کہنا چاہیے نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کے اور ملکوں میں بھی یہ رسم جاری تھی۔ ہندو راجاؤں سے عمومًا اسی قسم کا معاملہ ہوتا تھا اور اس طرح مرکزی شاہی دفتر اس صوبہ کے حساب کتاب کی جزئیات سے سبکدوش ہو جاتا تھا۔ بنگال، دکن اور گجرات کے علاقوں میں عمومًا

یہی انتظام تھا۔ سید احسن کیتھلی کے متعلقہ علاقے میں گنجایش محسوس کرلی گئی تھی اور جدید فوج کے عوض کوئی نیا علاقہ نہیں دیا گیا۔ لہذا اُس نے گرانی محسوس کی اور باغیانہ تحریکوں سے متاثر ہوکر اردگرد کے ملحقہ اضلاع پر ہاتھ مارا اور ان نووارد ہم وطنوں کو اپنے حسب منشا کام میں لایا۔ ضیاء برنی نے اوپر کے اقتباس میں اسی کی طرف اشارہ کیا ہے کہ :-

"وحشمے کہ از دہلی برائے ضبط معبر نامزد بود ہما نجا ماند"۔

ملا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں کہ :-

"واکثر از حشم دہلی را کہ دراں حدود نامزد بودند بجود کشید و سرداران مخالف را بقتل رسانید"

سلطان اس خبر کو سنتے ہی قنوج سے روانہ ہوا دہلی کا راستہ چھوڑ کر میرٹھ اور کرنال ہوتا ہوا اول کیتھل پہنچا سید احسن کے رشتہ داروں کو گرفتار کیا اور یہیں اس کا بیٹا ابراہیم خریطہ دار جو شاہی اہل کاروں میں شامل اور سلطان کے ہمراہ تھا گرفتار کیا گیا۔ کیتھل سے دہلی آیا اور یہاں سے دکن کی جانب روانہ ہوا۔ بعد کے بعض مورخین نے غلطی سے سید احسن کیتھلی کو حسن گانگوی بہمنی بانی سلطنت بہمنیہ سمجھ لیا ہے حالانکہ یہ سراسر غلط ہے حسن بہمنی کا ذکر آگے آئے گا۔

دہلی سے سلطان سنہ ۷۴۲ھ کے شروع میں روانہ ہوا جب کہ موسم سرما شروع ہو چکا تھا اور برسات کے نہ ہونے سے فصل خریف کی پیداوار بہت کم ہوئی تھی۔ فصل ربیع کے لئے بھی کاشت کار زمینوں کو تیار نہیں کر سکے تھے۔ دولت آباد پہنچ کر سلطان نے ملک احمد ایاز گورنر دہلی کو جو اس سفر میں دہلی سے دولت آباد تک سلطان کے ہمراہ آیا تھا دہلی کی جانب روانہ اور دولت آباد کے لوگوں کو جو دہلی سے آکر آباد ہو چکے تھے اجازت دی کہ جس کا جی چاہے دہلی چلا جائے اور جو چاہے یہیں رہے چنانچہ ایک بڑا قافلہ اُن لوگوں کا ملک احمد ایاز کے ہمراہ دہلی کی جانب روانہ ہوا۔ سلطان نے برن و قنوج کے ہندوؤں کی شرارت کو دیکھ کر دارالسلطنت کی تبدیلی کا ارادہ فسخ کر دیا تھا۔ اس کو محسوس ہو چکا تھا کہ ہندوستان کے سلطان کا دہلی میں رہنا ضروری ہے ورنہ شمالی ہند کا قابو میں رہنا دشوار ہے اور دارالسلطنت کی تبدیلی کا تجربہ خطرات سے خالی نہیں ہے۔ اسی لئے

وہ ملک احمد ایاز کو اپنے ہمراہ لے گیا تھا کہ اس کی حفاظت و نگرانی میں دہلی والوں کا قافلہ کو رخصت کرکے خود دولت آباد سے سید احسن کو سزا دینے کے لئے روانہ ہوا اور ادلی ورنگل پہنچا۔ ورنگل میں جب شاہی لشکر پہنچا تو وہاں وبا پھیلی ہوئی تھی۔ شاہی لشکر میں بھی وبا نمودار ہوئی اور خود سلطان بھی بیمار ہوگیا۔ اس بیماری کی وجہ سے سلطان کو دولت آباد کی جانب واپس ہونا پڑا۔ مگر اس نے واپس ہونے سے پہلے ملک مقبول نائب وزیر کو ورنگل میں متعین کرکے تلنگانہ کا انتظام اور نگرانی اس کے سپرد کی۔ دولت آباد میں بیماری کی حالت میں پہنچا۔ یہاں پہنچ کر ایک نومسلم سردار کو جس کا اسلامی نام شہاب سلطان یعنی شہاب الدین تھا۔ ملک نصرت کا خطاب دے کر ولایت بیدر کی حکومت سپرد کی اور دولت آباد کا صوبہ معہ ولایت مرہٹ میر حسن ابن میر میران المخاطب بہ ملک کبیر قتلغ خاں کو سپرد کرکے اسی بیماری کی حالت میں بسواری پالکی معہ اپنی والدہ مخدومہ جہان کے دہلی کو روانہ ہوا اور دہلی جانے والے کچھ لوگ جو دولت آباد میں باقی تھے ان کا قافلہ بھی اپنے ہمراہ لیا۔ اس ایاب وذہاب میں زیادہ دن صرف نہیں ہوئے ۷۳۰ھ کے آخری مہینوں میں سلطان دہلی پہنچ گیا۔ قتلغ خاں مذکور شیعی یا تفضیلی عقائد رکھتا تھا لیکن چونکہ محمد تغلق کا استاد رہ چکا تھا اور محمد تغلق نے اس سے قرآن شریف کے علاوہ کوئی فارسی کی ابتدائی کتاب بھی پڑھی تھی۔ اس لئے اس کا بہت ادب اور لحاظ کرتا تھا۔ قتلغ خاں کا دولت آباد کی حکومت پر مامور کرنا آئندہ محمد تغلق کے لئے بے حد مضر ثابت ہوا اس کی تفصیل آئندہ صفحات میں آنے والی ہے۔

تبصرہ | اس جگہ سوچنے اور غور کرنے کے قابل بات یہ ہے کہ سلطان محمد تغلق نے شمالی ہند کے مضبوط و مستحکم ہونے کا یقین کرکے دکن کو بھی مضبوط و مستحکم بنانے اور خراسان پر حملہ کرنے کا شروع میں مصمم ارادہ کیا تھا اور اس کا ایسا ارادہ کچھ بے جا اور قابل اعتراض نہ تھا۔ لیکن خراسان کے حملہ کی ضرورت کا باقی نہ رہنا اور ہبی لوگوں کے ایک بڑے طبقے کے مایوس اور ناراض ہو جانے سے مشکلات کا پیدا ہونا محمد تغلق کے اختیار و ارادے کی باتیں نہ تھیں جس طرح حملۂ خراسان کی ضرورت کا باقی نہ رہنا ایک قدرتی اور غیر اختیاری بات تھی۔ اسی طرح اپنی مذہبی روشن خیالی اور کتاب و سنت کی پابندی کو بھی وہ کسی طرح ترک نہیں کر سکتا تھا۔ تین چار لاکھ

فوج کا نوکر رکھنا بھی بے جا نہ تھا اور ضرورت باقی نہ رہنے پر اس کا موقوف کر دینا بھی نامناسب نہ تھا۔ غیر ملکی لوگوں کی جنھوں نے ضرورت کے وقت اس کی خواہش کے موافق اپنے آپ کو پیش کر دیا تھا۔ رعایت کرنا شریفانہ اخلاق کا تقاضا تھا۔ شمالی ہند کی ہندو جنگ جو قوموں کی غیر شریفانہ اور بزدلانہ بے وفائی کا اگر وہ صحیح اندازہ نہیں کر سکا تھا۔ تو اس سے بھی اس کی شرافت اخلاق کا ایک ثبوت بہم پہنچتا ہے۔ اب تجربہ کے بعد اس نے دہلی ہی کو دارالسلطنت رکھنا ضروری سمجھا اور شمالی ہند کو دکن سے زیادہ قیمتی خیال کیا تو اس پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہو سکتا۔

بہرحال ۷۳۷ھ میں جب کہ سلطان محمد تغلق دولت آباد سے دہلی کی جانب روانہ ہوا ہے تو اس نے دولت آباد کو دارالسلطنت بنانے کا خیال بالکل ترک کر کے دکن کا انتظام اپنے امیروں اور گورنروں کے سپرد مستقل طور پر کر دیا تھا۔ صرف ورنگل کے علاوہ تلنگانہ کا تمام علاقہ رودر دیو (لدر دیو) کے بیٹے کو دے رکھا تھا۔ کرناٹک بلال دیو کے سپرد تھا۔ ان دونوں ہندو راجاؤں سے ورنگل کے گورنر کی معرفت خراج وصول ہوتا تھا۔ معبر میں سید احسن کیتھلی کی بغاوت وسرکشی کا انجام کیا ہوا اس کا مفصل حال کسی تاریخ میں نہیں ملتا۔ لیکن قیاس چاہتا ہے کہ بلال دیو اور نصرت خاں صوبہ دار بیدر کے ذریعہ اسے کیفر کردار کو پہنچا کر معبر کے علاقے میں ضرور کوئی دوسرا سردار مقرر کر دیا گیا ہوگا۔ کنپلا اور دھور سمدر اور کرناٹک میں موجودہ ریاست میسور اور صوبہ مدراس کا جنوبی حصہ شامل سمجھنا چاہیے۔ اس میں تلنگانہ اور معبر کو بھی شامل کر لیا جائے تو موجودہ صوبہ مدراس معہ ریاست میسور کا علاقہ تقریباً پورا ہو جاتا ہے اور یہ تمام علاقہ ہندو باج گذار رئیسوں کو سلطان محمد تغلق نے سپرد کر رکھا تھا۔ گجرات کے علاقے کا بڑا حصہ بھی ہندو راجاؤں کے سپرد تھا ملک نصرت خاں نومسلم گورنر بیدر کو وہ علاقہ سپرد تھا جو آج کل حکومت نظام کا جنوبی حصہ ہے دولت آباد اور مرہٹ کے صوبے قتلغ خاں کے سپرد تھے جس کو آج کل کا جنوبی صوبہ بمبئی سمجھنا چاہیے۔ غرض یہ انتظام جو محمد تغلق نے کیا تھا ہر طرح قابل اطمینان تھا اور بظاہر اس کی سلطنت میں جو تمام براعظم ہند پر پھیلی ہوئی تھی کسی خطرے اور اندیشہ کا کوئی امکان نہ تھا اور وہ ملک کے انتظام کو قابو میں رکھنے اور ترقی دینے کی پوری طاقت اور قابلیت رکھتا تھا۔

قحط عظیم اور سلطان کی رحم دلی و فرض شناسی

۷۲۹ھ کے موسم برسات میں میان دواب اور مالوے کے علاقوں میں بارش نہیں ہوئی تھی جس سے ۷۳۰ھ کی فصل ربیع کو سخت نقصان پہنچا۔ راستے میں صوبہ مالوہ کو سلطان نے قحط اور خشک سالی کی وجہ سے بہت خراب حالت میں دیکھا۔ دہلی پہنچا تو صوبہ میان دواب کی حالت کو مالوہ سے بھی زیادہ خراب پایا سب سے زیادہ دہلی اور نواح دہلی میں قحط کی شدت تھی۔ دہلی آکر پادشاہ جلد صحت یاب وتندرست ہو گیا اور مخلوق خدا کو قحط کے حملے سے بچانے میں ہمہ تن مصروف ہوا۔ خدائے تعالےٰ کی طرف سے لوگوں کی شرارتوں، مفسدہ پردازیوں اور بداعمالیوں کی سزا قحط کی شکل میں وارد ہوئی۔ پادشاہ اور سلطان ہونے کی حیثیت سے محمد تغلق نے لوگوں کو ہلاکت سے بچانے کی جس قدر کوشش کی اور جس قدر ہمت واستقلال کے ساتھ برسوں اس کام میں مصروف رہا وہ محمد تغلق کو دنیا کے تمام سلاطین سے زیادہ بلند مرتبہ، زیادہ رحم دل اور زیادہ شفیق علی خلق اللہ ثابت کرنے کے لئے بہت کافی ہے اور محمد تغلق کی مانند شاید ہی کوئی دوسرا پاک طینت اور نیک دل سلطان پیش کیا جا سکے۔ ضیا برنی کہتا ہے۔

"چوں سلطان محمد بازحمت از دیوگیر بسوئے دہلی مراجعت فرمود و در دھار رسید و چند روز وقفہ فرمود و ازانجا جانب دہلی رواں شد و در مالوہ ہم قحط افتادہ بود و دہادہ بکلی از تمامی راہ برخاستہ وقصبات وولایات سرراہ پریشان وابتر شدہ سلطان در دہلی رسید و چندگاہ در ترتیب آبادانی وزراعت مشغول شد و دراں سال باراں ہم امساک کرد و ہیچ ترتیبے نہ شد وگاہ وسیاہ دمواشی نماند و غلہ بشانزدہ وہفدہ جیتل سیرے رسید وخلق مستہلک می شد وسلطان محمد برسبیل سوندہار برائے زراعت مال از خزانہ می داد و خلق درماندہ و عاجز گشتہ می شدہ و زراعت از امساک باراں میسر نہ شد وخلق کشتہ می شد وسلطان محمد در آمدہ در دہلی صحت یافت وزود تریں تندرست شد۔"

غرض ۷۳۰ھ سے شروع ہو کر ۷۳۶ھ تک متواتر سات سال ہندوستان بالخصوص صوبہ میان دواب میں بارش نہیں ہوئی اور ایسا عظیم الشان قحط پڑا جس کی نظیر دنیا کی

تاریخ میں نہیں ملتی۔ تاریخ مبارک شاہی میں لکھا ہے کہ:۔

"قحط عام و گرانی غلہ ہفت سال چناں شد کہ قطرہ از آسمان نہ بارید"

فرشتہ لکھتا ہے کہ:۔

"در عہد آں پادشاہ دو مرتبہ امساک باراں شد و در ہر کرت قریب سہ سال مردم اوقات بعسرت گذرانید"

فرشتہ کی بیان کردہ دونوں خشک سالیوں کے درمیان صرف ایک سال ایسا گذرا تھا جس میں بارش ہوئی تاریخ مبارک شاہی میں اس درمیان کے ایک سال کو بھی خشک سالی ہی میں شمار کرکے سات سال لکھدیئے اور ملا عبدالقادر بدایونی نے بھی تاریخ مبارک شاہی میں اس درمیان کے ایک سال کو بھی خشک سالی ہی میں شمار کرکے سات سال لکھدیئے اور ملا عبدالقادر بدایونی نے بھی تاریخ مبارک شاہی کی روایت کو نقل کیا ہے۔ بہرحال ۷۳۸ھ کا ایک سال، درمیان میں بارش کا سال تھا۔ ۱۷ھ اور ۱۸ھ میں ملک عرب کے اندر قحط نمودار ہوا تھا تو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ اسلام نے صوبہ جات ممالک اسلامیہ کے حاکموں کو حکم دیا تھا کہ اپنے اپنے علاقوں سے جس قدر غلہ باسانی بھجوا سکیں اہل عرب کی مصیبت کم کرنے کے لئے بھجوائیں۔ چنانچہ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ حاکم مصر نے بیس جہاز غلہ سے لدے ہوئے بھجوائے اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ضرورت مندوں کی فہرستیں مرتب کرا کر غلہ تقسیم کرایا اسی اسوۂ فاروقی کو مدنظر رکھ کر سلطان محمد تغلق نے بھی بنگالہ اور بہار سے جہاں قحط کا اثر نہ تھا اور غلہ کی ارزانی تھی غلہ منگوانے کا انتظام کیا اور جہاں جہاں قحط کی شدت تھی وہاں اپنے عاملوں اور اہل کاروں کے ذریعہ غلہ کو ارزاں نرخ پر فروخت کرایا۔ لوگوں کو روپیہ تقسیم کیا۔ محتاج خانے قائم کئے۔ غربا کو غلہ اور کھانا بہم پہنچانے کے لئے سرکاری طور پر باقاعدہ انتظام کیا۔ اس کے لئے احکام و اسالیب نافذ کئے۔ کاشت کاروں کو زر تقاوی دے کر زراعت کی ترغیب دی۔ اسی سال مصر سے سلطان ملک الناصر اور خلیفہ ابوالربیع مستکفی باللہ عباسی کے فرستادہ ایلچی سلطان محمد تغلق کے پاس آئے اور سلطان نے تحف و ہدایا نے ساتھ ان کو واپس کیا، راستے میں حاکم یمن نے سلطان محمد تغلق کے تحفے اور ہدیے چھین لئے سلطان مصر نے اس کے جواب میں یمن کے سفیروں کو قید کر لیا۔ کئی سال کے بعد ملک المجاہد

فرماں روائے یمن نے خود سلطان محمد تغلق کے ساتھ رسم وراہ اور دوستانہ تعلقات پیدا کر لئے تھے سلطان محمد تغلق قحط کے کاموں میں مصروف رہا اور ۷۴۳ھ کا پورا سال اس حالت میں بسر ہوا کہ سلطان محمد تغلق قحط کے مقابلے میں اپنی رعایا کے لئے سپر بنا ہوا تھا۔ ۷۴۴ھ میں جب کہ قحط کی شدت اور بھی ترقی کر گئی تو اس نے اودھ اور بنگال سے جس قدر زیادہ سے زیادہ غلہ آ سکتا تھا منگوایا قحط زدہ علاقے یعنی صوبہ میاں دوآبہ کے غریب اور محتاج لوگوں کو ترغیب دی کہ وہ دہلی چلے آئیں تاکہ آسانی سے ان کی خبر گیری ہو سکے اور اضلاع کے عاملوں اور تحصیلداروں کا کام ہلکا ہو جائے اور ان کی غفلت سے لوگ ہلاک نہ ہونے پائیں چنانچہ دہلی اور نواح دہلی میں قحط زدہ لوگوں کا انبوہ عظیم فراہم ہو گیا۔ سلطان نے ڈیڑھ رطل روزانہ یعنی ڈیڑھ سیر فی کس کے حساب سے ہر شخص کو غلہ تقسیم کرانا شروع کر دیا … اودھ بنگالہ کے علاوہ اس نے سندھ گجرات دولت آباد اور مالابار سے بھی غلہ کے منگوانے کا انتظام کیا … غلہ زیادہ مقدار میں آ گیا تو چھ مہینے کا غلہ ہر شخص کو دے دیا گیا اور سلطان نے صوبہ میاں دوآبہ کے دورے کے لئے کمر ہمت باندھی … ان کو جو روپیہ تقاوی گزشتہ سال دیا گیا تھا وہ سب کا سب چونکہ … کا کوئی نتیجہ نہ نکلا تھا اب اس سے وہ روپیہ معاف کر دیا … پھر ان کو روپیہ دیا … کہ اپنے اپنے کھیتوں میں آب پاشی کے لئے کنوئیں کھودیں کنوؤں کی کھدائی کے کام کو سب سے زیادہ ضروری اور … زمینداروں اور عاملوں کو … ساتھ حکم دیا کہ کنوؤں کی کھدائی کے کام کی خاص طور پر نگرانی کریں اور اس کام کو جلد تمام تک پہنچوائیں … چونکہ صوبہ ملتان میں بھی قحط کا سخت اثر تھا اس لئے پنجاب سے اگرچہ غلہ میاں دوآب کو نہ آ سکتا تاہم پنجاب نے اپنی حالت کو خود سنبھال لیا … پنجاب سے موجودہ ملک پنجاب نہیں سمجھنا چاہیئے جس میں اس زمانے کے صوبہ میاں دوآب اور صوبہ ملتان کے اکثر حصے بھی شامل ہیں۔ تاریخ عالم میں سلطان محمد تغلق سے پہلے کوئی نظیر ایسی نہیں ملتی کہ کسی بادشاہ نے قحط کے مقابلے میں مخلوق خدا کو محفوظ رکھنے کے لئے اس قسم کے وسیع اور زبردست انتظامات کئے ہوں جیسے کہ محمد تغلق نے کئے۔

محکمۂ زراعت

سلطان نے زراعت کا ایک خاص محکمہ قائم کیا جو ہندوستان کی تاریخ میں بالکل نئی چیز تھی۔ اس نے دریاؤں سے نہریں نکالنے کے

لئے اہل کار مامور کئے کہ وہ نہریں نکالنے کے موقعوں کو انتخاب کریں۔ ملک تاتار خاں حاکم پنجاب کے نام احکام صادر ہوئے کہ اپنے صوبہ میں بذریعہ چاہات آب پاشی اور زراعت کے کام کو ترقی دے۔ ہر ضلع اور تحصیل میں تخمینے تیار کرائے گئے کہ آب پاشی کے ایک کنوئیں میں کس قدر لاگت بیٹھتی ہے اور کتنی دور پانی نکلتا ہے۔ نہریں کن کن راستوں میں ہو کر بہہ سکتی ہیں۔ غرض پوری مستعدی و جفاکشی کے ساتھ سلطان اسی طرف ہمہ تن متوجہ ہو گیا۔

پنجاب اور صوبجات متحدہ کے اضلاع میں سفر کرنے والے مسافر کو جابجا کھیتوں میں کنوئیں نظر آتے ہیں اور وہ کاشت کاروں کو کنوؤں سے پانی نکالتے ہوئے دیکھتا ہے لیکن وہ اس حقیقت سے بے خبر ہوتا ہے کہ یہ سلطان محمد تغلق کی یادگار ہفت سالہ قحط کی نشانی ہے پنجاب کے دولابی کنوئیں تو ممکن ہے کہ محمد تغلق سے پہلے کی چیز ہوں لیکن چرس کے کنوئیں جو یو۔پی کے اضلاع میں بکثرت مروج اور موجود ہیں محمد تغلق ہی کی ایجاد ہیں۔ ہندوستان کی تاریخ میں ان آب پاشی کے کنوؤں کا محمد تغلق سے پہلے کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ ہاں دریاؤں یا ندیوں کے کنارے فالیزوں کو پانی دینے کے لئے ڈھینکلی کے کنوئیں ضرور پرانی چیز ہیں لیکن ڈھینکلی کے کنوئیں زراعت کی ضرورت کو ہرگز کہاں پورا کر سکتے تھے۔ نہروں کی اسکیم اگرچہ سلطان محمد تغلق کی مرتب کردہ تھی لیکن ارادے سے فعل میں لانے کا کما حقہ اس کو موقع نہیں ملا۔ اسی مرتب شدہ اسکیم سے فائدہ اٹھا کر سلطان فیروز تغلق نے سلطان محمد تغلق کی مجوزہ بہت سی نہریں نکالیں۔ ضیا برنی محمد تغلق کی ان زرعی کوششوں کے متعلق لکھتا ہے کہ:۔

> "سلطان در دیوان زراعت اسلوبہا اختراع می کرد ہرچہ در دیوان زراعت در تصور سلطان می گذشتے و در قلم می آمد آں را اسلوب نام می شد کہ اگر آں اسالیب منصورہ واقع شدے از دیوان زراعت و حیثیت زراعت جہان پر از نعمتہائے گوناگوں گشتے و در خزائن گنجہا جمع آمدے۔ و در معاملہ دیوان زراعت دیوانے وضع شد و آں دیوان را دیوان امیر کوہی نام کردند و بہمہ دیاران نصب شدند"

جن کاشت کاروں کو کنوئیں کھودنے کے لئے روپیہ شاہی خزانے سے دیا گیا تھا ان میں سے بعض نے حسب سابق روپیہ کھا پی لیا اور کنوئیں نہ کھودے۔ چونکہ لوگ کام کرنا نہیں چاہتے تھے اور ہمت ہار بیٹھے تھے اس لئے ایک کوشش دیکھ کر دوسرے نے بھی غفلت سے

کام لیا اور اس کی اطلاعیں سلطان کے پاس پہنچیں۔ سلطان نے لوگوں کو کام پر لگانے اور بُرے نمونے کا انسداد کرنے کے لئے نافرمانوں کو گرفتار کرایا اور بعض کو عبرت کے لئے سخت سزائیں دیں ان سزاؤں کا رونا آج تک رویا جا رہا ہے اور اس رحم دل ونافع الناس سلطان کو ظالم وخوں ریز بتایا جاتا ہے۔ سلطان مخلوق خدا کو بچانے کے لئے چاہات کی کھدائی کا کام جاری کرنا چاہتا تھا جو لوگ اس کام میں رکاوٹ پیدا کرنے والے تھے وہ درحقیقت مخلوق خدا کے دشمن تھے ان کو عبرت ناک سزائیں دینا اور قتل کرنا رحم تھا نہ کہ ظلم ضیا برنی کہتا ہے کہ :۔

"ہر چند سلطان محمد در باب زراعت جہد می فرمود وچاہہا کا دانیدن فرمان شد وخلق نمی توانست و از زبان مردمان چیزے بیروں می آمد وتقصیر واہمال می رفت بسیاراں بسیارت می پیوستند"

سلطان دہلی میں واپس آکر چند روز اپنے اسی محبوب شغل یعنی قحط زدہ لوگوں کی غور ر د پرداخت اور فراہمی غلہ کے کاموں میں مصروف رہا اور اس طرح ۷۴۲ھ ختم ہوگیا۔

ہندوؤں کی بغاوت ورہزنی

۷۴۳ھ میں ملک چند کھوکر یا تلک چند گکھڑ نے اپنے ہم قوموں کی جمعیت کثیر فراہم کرکے لاہور کے صوبہ دار ملک تاتارخاں پر اچانک حملہ کیا۔ ملک تاتار خاں لڑائی میں شہید ہوا سلطان نے ملک احمد ایاز الخاطب بہ خواجہ جہاں کو اس فتنہ کے فرو کرنے کے لئے روانہ کیا خواجہ جہاں نے تلک چند کو گرفتار کرکے اس فتنے کو مٹایا اور لاہور کی حکومت کسی لائق افسر کو سپرد کرکے جلد دہلی واپس آگیا۔ ۷۴۳ھ میں بارش ہوئی اور پیداوار زراعت سے لوگوں کو سانس لینے کا موقعہ ملا۔ سنام سامانہ اور کیتھل کے علاقے میں ہندوؤں نے بغاوت وسرکشی پر کمر باندھی اور بڑے بڑے گھنے جنگلوں میں گڑھیاں جن کو اس زمانے میں منڈل کہتے تھے تیار کرکے لوٹ مار اور راہ زنی شروع کی۔ قافلوں کی آمد ورفت اور ملک کا امن وامان خطرے میں پڑگیا۔ یہ لوگ عموماً جاگیردار وشقدار وخوطہ دار تھے۔ گذشتہ تین سال کی خشک سالی میں صوبہ میان دوآب سے سرکاری مالگذاری مطلق وصول نہیں کی گئی، بلکہ معاف کردی گئی تھی اب جو فصل کے پیدا ہونے پر سرکاری محصل زراعت کی نگرانی اور اس فصل کی بٹائی کے لئے مامور ہوئے تو انھوں نے بَرن اور قنوج کے مفسدوں کی طرح شرارت پر کمر باندھی، یہ لوگ

عموماً وہی تھے جنھوں نے خسرو نمک حرام کی فوج میں شامل ہو کر خاندان خلجیہ کی بربادی میں حصہ لیا تھا اور خسرو نمک حرام نے اپنی ہلاکت یقینی دیکھکر جب شاہی خزانہ لٹایا تو وہ زیادہ تر انھیں کے حصے میں آیا تھا۔ سلطان کو خود اس طرف جانا پڑا منڈلوں اور گڑھیوں کو جنگلوں میں جاکر مسمار کیا اور اُن کے سرداروں کو گرفتار کرکے دہلی لے آیا۔ یہاں لاکر ان کو دہلی میں آباد کیا اور اُن کی سوحشت دور کرنے کے لئے اُن کی عزتیں بڑھا کر زمرۂ اُمرا میں شامل کیا چنانچہ اُن لوگوں کی کچھ کچھ اصلاح ہوئی۔ بعض ان میں سے خود ہی مسلمان بھی ہوگئے اس طرح سنام وسامانہ وغیرہ کے علاقہ کی بدامنی وراہ زنی کا انسداد ہوا۔ اس سے بڑھکر اور کیا بے حیائی اور دروغ بافی ہوسکتی ہے کہ سلطان محمد تغلق کی اس عاقلانہ اور رحم دلانہ کارروائی کو بھی بعض مورخین نے صوبۂ میان دواب میں آدمیوں کا شکار کرنا بیان کیا ہے۔

ضیاء برنی کہتا ہے کہ :-

"سلطان در ولایت سنام و سامانہ لشکر کشید و متمردان و سرتابان آنجائے کہ مندلہا کردہ بودند و خراج نمی دادند و فساد ہا می کردند و راہ می زدند سلطان آن مندلہائے ایشان را نہب و تاراج فرمود و جمعیت ہائے ایشان را متفرق گردانید و مقدمان و سران ایشان را در شہر (دہلی) آورد و بعضے از ایشاں مسلمان شدند و گردہ گروہ را داخل امرا گردانید و با زن و بچہ در شہر سکونت گرفتند و از زمینہائے قدیم ایشان ایشان را بگسلانید و شر ایشان از آں دیار رفع شد و آیندگان و روندگان از راہ زنی خلاص یافتند"

فرشتہ کہتا ہے کہ :-

"دریں وقت طائفۂ مندا ہران وچوہانان ومنہیان وبھتیان کہ در ولایت سنام وسامانہ بودند تمرد ورزیدہ بجنگلہائے عظیم درآمدہ خانہا ساختند و دست از مال گذاری کشیدند پادشاہ بدفع ایشاں لشکر کشیدہ محلہائے ایشاں را کہ باصطلاح ہند مندل گویند منہدم گردانید و جمعیتہائے ایشان را پریشان ساختہ وسرداران ایشان را ہمراہ آوردہ درشہر جائے داد"

یہ واقعہ ۷۳۳ھ کے آخری ایام سے تعلق رکھتا ہے۔

دوبارہ قحط عظیم | ۷۳۴ھ میں پھر قحط نمودار ہوا اور خشک سالی سے مخلوق خدا پریشان

ہونے لگی۔ یہ قحط نہ صرف ہندوستان بلکہ چین کے ملک میں بھی ایسی ہی شدت سے تھا۔ چین کی تاریخ میں ۱۳۴۲ء کے قحط کی نسبت لکھا ہے کہ آدمیوں نے آدمیوں کا گوشت کھایا اس مرتبہ سلطان نے گذشتہ قحط سالی کے تجربے سے فائدہ اٹھا کر زیادہ مستحکم اور زیادہ اچھا انتظام کیا۔ اس نے اپنے امیروں اور وزیروں کو شہر دہلی کے محلے مضافات دہلی کے حلقے اور میان دواب کے اضلاع تقسیم کر دیئے مفلس اور تہی دست رعایا کی فہرستیں تیار کرائیں۔ تاکید ی احکام جاری کئے کہ ہر امیر آدمی غریبوں کی ایک مناسب تعداد کو اپنے ذمے لے اور ان کے لئے غلہ یا خوراک بہم پہنچائے۔ ابن بطوطہ جو ۱۳۳۴ء میں دہلی پہنچ کر عرصہ دراز تک دہلی کا قاضی رہا تھا اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے کہ پانسو محتاجوں کا میں بھی کفیل تھا۔ دونوں وقت ان کو کھانا کھلانا اور ان کے رہنے کے لئے بھی مجھ کو ایک بڑا مکان لینا پڑا تھا۔ سلطان اپنے احکام کی تعمیل اور کنوؤں کی تیاری وغیرہ زراعت کے متعلقہ کاموں کی دیکھ بھال کے لئے خود دورے پر نکل کھڑا ہوا۔ دارالسلطنت کے اہل کاروں کو تاکید کر گیا کہ شہر کی مخلوق کو کوئی آزار نہ پہنچنے دیا جائے نہ کوئی شخص شہر سے نکلنے پائے۔ شہر سے باہر جانے کی ممانعت اس لئے تھی کہ کہیں سنام وسامانہ کے لوگ جو شہر میں لا کر آباد کئے گئے تھے موقع پا کر پھر اپنے علاقوں میں جا کر بدامنی نہ پھیلائیں۔ اسی زمانے میں جب کہ سلطان ملک کا دورہ کر رہا تھا مراقش کا مشہور سیاح شیخ ابن بطوطہ جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے دہلی میں آیا۔ ۱۳۴۳ء کے درمیانی حصے میں میان دواب کے کاشتکاروں کو کنوئیں کھودنے اور دریاؤں یا تالابوں سے پانی حاصل کرنے کے لئے ستر لاکھ روپیہ پھر تقسیم کر کے سلطان دورے سے واپس ہوا۔ دارالسلطنت کے کاموں کا معائنہ کر کے اور ابن بطوطہ کو شہر دہلی کا قاضی بنا کر پھر روانہ ہو گیا۔ شہر دہلی میں اس لئے زیادہ دن نہ ٹھہرا کہ لشکر سلطانی کے قیام سے جس میں اس کی رکابی فوج شامل تھی غلہ کی کمی واقع نہ ہو جائے مگر قحط دگرانی دم بدم بڑھتی ہی گئی۔ باوجود ان تمام کوششوں کے نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ آدمی آدمی کو کھانے لگا چونکہ مخلوق خدا پہلے ہی تین چار سال تک قحط کے شدائد برداشت کر چکی اور اچھی طرح اطمینان کا سانس نہ لینے پائی تھی کہ پھر مبتلا ئے قحط ہو گئی لہٰذا یہ دوسرا حملہ بڑا خطرناک اور ناقابل برداشت ثابت ہوا۔ سلطان بھی اس بات کو سمجھ گیا کہ اب آب پاشی اور کنوؤں کی کھدائی کی تجویزوں پر عمل درآمد

نہیں ہو سکتا اور فاقہ زدہ لوگوں سے احکام کی تعمیل کرانا دشوار ہے۔ لہٰذا وہ اپنی تمام فوج اور دہلی کی آبادی کا اکثر حصہ ہمراہ لے کر قنوج کے قریب گنگا کے کنارے جا پڑا۔ دہلی سے ذخائر غلہ دہلی کی بقیہ آبادی کے لئے چھوڑ دیئے اور وہاں کے اہل کاروں کو حسب ہدایات کر دیں کہ غربا کو تکلیف نہ ہونے پائے۔

محمد تغلق سرگدواری میں

قنوج کے قریب بانس اور پھوس کے چھپروں سے ایک بستی منظم آباد کرکے اس کا نام سرگدواری رکھا اور اودھ کے صوبہ دار عین الملک کو جو ایک روشن خیال اور نہایت قابل شخص تھا حکم دیا کہ غلہ یہاں بھجوایا جائے۔ سرگدواری کے قیام میں مصلحت یہ بھی تھی کہ غلہ یہاں با سانی بحفاظت اور جلد پہنچ سکتا تھا۔ سلطان کے سرگدواری میں مقیم ہو جانے کے بعد دہلی کے اہل کاروں نے زیادہ حصہ غلہ کو تقسیم کرنے میں کوتاہی سے کام لیا اور سلطان کے پاس اس کی شکایتیں پہنچیں ان میں ہرگز قابل رعایت نہیں ہوتا۔ جو شخص قحط زدہ اور غریبوں کا پیٹ نہ کاٹ کر اپنا پیٹ بھرتا ہے اور ایسے شدید قحط کے زمانہ میں بھی اس کو فاقہ زدہ لوگوں پر رحم نہ آئے اس سے زیادہ سنگدل کون ہو سکتا ہے۔ سلطان محمد تغلق نے دہلی کے محتاج لوگوں کو کہ نان شبینہ کے محتاج تھے اور بھوک سے مر رہے تھے خائنوں کو عبرتناک سزائیں دیئے بغیر ہرگز نہیں رہ سکتا تھا چنانچہ اس کے حکم سے اس قسم کے لوگوں کو عبرتناک سزائیں دی گئیں اور ان سزاؤں کو مؤرخین نے بد ظرافت سے بھی دیکھا اور انھیں سزاؤں کو بھی بے رحمی سے تعبیر کیا سلطان محمد تغلق کے ظالم و سفاک ہونے کی دلیل ٹھہرایا۔ زبان حال سے،

خوبے نہ کردہ ایم و لیکن بد گشتہ ایم
جرمے ہمیں کہ عاشق روئے تو گشتہ ایم

اسی زمانہ میں کڑہ کے صوبہ دار نظام مائیں نے سلطان کو مصیبتوں میں مبتلا دیکھ کر علم بغاوت بلند کیا لیکن عین الملک اور اس کے بھائیوں نے بلا توقف حملہ کرکے اس کو کام تمام کیا۔ اور بہت جلد یہ فتنہ فرو ہو گیا۔ سلطان نے دہلی کی بد انتظامی اور مخلوق خدا کی پریشانی کا اندازہ کرکے سرگدواری سے حکم بھیج دیا کہ لوگوں کو اذن عام ہے جس کا جی چاہے اپنی جان بچانے کے لئے اودھ اور بہار کے علاقوں میں چلا جائے۔ جو لوگ ہر قسم

کے راحت و آرام اور بڑے بڑے انعام و اکرام کے وعدوں پر دولت آباد نہیں گئے تھے اس کفران نعمت کی سزا میں ان کو اب پیٹ بھرنے کے لئے خود دہلی کو چھوڑنا پڑا اور انھوں نے دہلی کے چھوڑ دینے کی اجازت کو اپنے لئے بڑا بھاری انعام تصور کیا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

اس حکم کے سنتے ہی عام لوگوں کے ساتھ بہت سے خائن اہل کار بھی جن کو ابھی سزا نہیں دی گئی تھی اپنی جان بچانے کے لئے دہلی سے بہار و اودھ کی طرف چلے گئے حالانکہ اہل کاروں کے لئے ضروری تھا کہ وہ ہر حالت میں سلطان سے خصوصی اجازت حاصل کئے بغیر دہلی کو نہ چھوڑتے۔ اس طرح دہلی سے فرار ہو کر انھوں نے اپنے خائن اور خطا کار ہونے کا خود ایک زبردست ثبوت بہم پہنچا دیا ان شاہی مجرموں کی عین الملک کے بھائیوں نے خوب خاطر مدارات کی اور ان کو اودھ میں جاگیریں عطا کیں۔

دکن کی چھوٹی چھوٹی بغاوتیں

اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ ملک نصرت خاں نومسلم کو بیدر کا علاقہ سنہ ۷۳۳ھ میں سپرد ہوا تھا۔ اس علاقے کا خراج تین سال کے لئے بالمقطع ایک کروڑ مقرر کیا گیا تھا۔ تین سال ختم ہو چکے تھے اور اس نے خراج سلطانی کے ادا کرنے کا کوئی بندوبست نہیں کیا تھا اب جب کہ اس سے مطالبہ کیا گیا تو اس نے بھی نظام مائیں حاکم کٹرہ کی طرح علم بغاوت بلند کیا۔ قتلغ خاں حاکم دولت آباد نے بیدر پر حملہ کیا اور ملک نصرت خاں کو گرفتار کر کے بادشاہ کی خدمت میں بھیج دیا۔ یہ فتنہ بھی بہ فرو ہو گیا۔ ضیاء برنی ملک نصرت خاں کے صفات ان الفاظ میں بیان کرتا ہے کہ:۔

"مردے بقال پیشہ دترسندہ و عاجز بود۔"

کچھ عرصہ کے بعد ۷۳۵ھ میں علی شیر یا علی شاہ نامی ایک شخص نے جو ظفر خاں علائی کا بھانجا اور قتلغ خاں گورنر دولت آباد کا ماتحت سردار تھا علم بغاوت بلند کیا۔ اس کے باغی ہونے کی کیفیت اس طرح ہے کہ قتلغ خاں نے اس کو سرکاری مال گذاری وصول کرنے کے لئے گلبرگہ کی جانب روانہ کیا۔ اس نے گلبرگہ کے عامل کو قتل کر کے خود گلبرگہ پر قبضہ کیا اس علاقے میں علی شیر کے بھائی بند بعہدہ امیران صدہ مامور تھے اُن سب کو متفق کر کے فوراً بیدر پر حملہ آور ہوا اور بیدر کے حاکم کو جو نصرت خاں کے بعد ابھی مامور ہوا تھا شکست

دے کر قتل کیا اور قلعہ بیدر کو تصرف میں لا کر اپنی خود مختاری کا علم بلند کیا۔ قتلغ خاں نے بیدر پر پھر حملہ کیا۔ علی شیر نے خوب ڈٹ کر شیروں کی طرح مقابلہ کیا اور کئی لڑائیوں میں کامیاب رہنے کے بعد۔ بالآخر جان کی امان لے کر خود ہی اپنے آپ کو قتلغ خاں کے حوالے کیا قتلغ خاں نے علی شیر اور اس کے بھائیوں کو سلطان کے پاس سرگدواری میں بھیج دیا۔ سلطان نے اُن کو غزنی کی جانب جلا وطن کر دیا لیکن یہ لوگ غزنی سے جب بلا اجازت ہندوستان میں واپس آئے تو نافرمانی کے جرم میں گرفتار ہو کر قتل ہوئے۔ علی شیر کی گرفتاری و جلا وطنی کے بعد سلطان کو قحط کی مشکلات میں مبتلا دیکھ کر خود قتلغ حاکم دولت آباد کی نیت بدلی اور سلطان کے پاس دکن سے شکایتیں آنی شروع ہوئیں کہ قتلغ خاں نے نہایت سخت گیر عامل و محصل پرگنات میں مقرر کر رکھے ہیں۔ لیکن روپیہ جو وصول ہوتا ہے شاہی خزانے میں داخل نہیں کیا جاتا اور سلطان کے پاس روپیہ کے وصول نہ ہونے کی معذرتیں پہنچائی جاتی ہیں۔ سلطان کو روپیہ پانی کی طرح بہانا پڑ رہا تھا۔ شاہی خزانے میں روپیہ کی سخت ضرورت تھی۔ قتلغ خاں کی اس خیانت اور بے راہ روی کا علم ہو کر سلطان کو سخت ملال ہوا چونکہ استاد ہونے کی وجہ سے سلطان کو قتلغ خان کی رعایت بہت منظور تھی اس لئے اس نے قتلغ خاں کو زیر مواخذہ لانا نامناسب نہ سمجھ کر صرف اس قدر ضروری سمجھا کہ اُسے دولت آباد سے الگ کیا جائے۔ چنانچہ اُس نے قتلغ خاں کو عین الملک کی جگہ اور عین الملک کو قتلغ خاں کی جگہ تبدیل کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ عین الملک کی کارگذاری کو جو اُس نے قحط کے ایام میں انجام دی تھی سلطان دیکھ چکا تھا اور اس سے بہت خوش تھا۔ دولت آباد کا وائسرائے چونکہ سب یادہ معتبر اور معزز سمجھا جاتا تھا اس لئے سلطان نے عین الملک کا مرتبہ بڑھانا چاہا۔

عین الملک اور اُس کے بھائیوں کی بغاوت

سرگدواری میں سلطان کو دو سال گذر گئے اور ۷۳۶ھ کے رمضان و شوال میں برسات اور بارش شروع ہوئی آئندہ قحط کے دور ہونے کی اُمید بندھی سلطان نے عین الملک سے کہا کہ تمہارے علاقے میں دہلی سے بعض خائن اور مجرم اہل کار بھاگ کر آتے ہوتے ہیں اور تم نے یا تمہارے بھائیوں نے اُن کو جاگیریں دے کر اپنے یہاں پناہ دے رکھی ہے۔ اب مناسب یہ ہے کہ تم اُن کو جس

طرح ممکن ہو دہلی کی طرف روانہ کردو۔ عین الملک اور اس کے بھائی اس تصور سے اپنے دل میں خوف زدہ ہوئے کہ سلطان کے علم میں ہم خائن اور شاہی مجرموں کے پناہ دہندہ ہیں عین الملک نے تعمیل حکم پر بسروچشم آمادگی ظاہر کی اور سلطان مطمئن ہوگیا۔ انھیں ایام میں چند روز کے بعد سلطان نے عین الملک سے جب کہ وہ کسی ضرورت سے سلطان کی خدمت میں آیا ہوا تھا اپنے اس ارادے کا اظہار کیا کہ میں تم کو دولت آباد یعنی دکن کی نیابت پر تبدیل کرنے والا ہوں اس ارادے کا اظہار سلطان نے تو اس خیال سے کیا کہ عین الملک اپنے مرتبہ کی ترقی کا حال سن کر خوش ہوگا۔ لیکن عین الملک اور اس کے بھائی چونکہ اپنے آپ کو مجرم محسوس کئے ہوئے تھے انھوں نے سلطان کے ارادے سے مطلع ہوکر یہ سمجھا کہ سلطان ہم کو اس ملک سے جدا اور بے دخل کرکے سزا دینا چاہتا ہے یہ حال جب ان مجرم اہل کاروں کو جو دہلی سے بھاگے ہوئے اور عین الملک کے بھائیوں کی مصاحبت میں تھے معلوم ہوا تو انھوں نے اور بھی زیادہ ان کو بہکایا نتیجہ یہ ہوا کہ عین الملک اور اس کے بھائیوں نے اودھ میں علم بغاوت بلند کیا۔ سلطان نے یہ غیر مترقبہ بغاوت دیکھ کر باغیوں پر حملہ کیا۔ بانگرمئو کے قریب لڑائی ہوئی۔ عین الملک کے بھائی لڑائی میں کام آئے اور عین الملک گرفتار ہوکر سلطان کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ سلطان نے عین الملک کے علم و فضل کا لحاظ کرکے فوراً اس کو رہا کیا اور خلعت عطا کرکے اپنے دربار میں تخت کی برابر نہایت بر جو سب سے زیادہ عزت کا مقام تھا بٹھایا اور کہا کہ مجرموں نے بہکایا اور فریب خوردہ بنایا ہے ورنہ اس کی طینت میں فساد و بغاوت مطلق نہیں اس طرح عین الملک کی خطا بغیر اس کے کہ وہ معذرت کرے سلطان نے معاف کردی عین الملک کے علم وفضل اور اس کی عزت افزائی کا مفصل حال شمس سراج عفیف نے اپنی کتاب میں لکھا ہے۔ ضیاء برنی چونکہ عین الملک سے کبھی اس کی روشن خیالی کے سبب خوش نہیں ہے لہٰذا اس نے بہت ہی مجمل الفاظ استعمال کئے ہیں۔ اس کے بعد سلطان ان مجرم اہل کاروں کے تعاقب میں بہرائچ تک گیا اور مجرموں کی سراغ رسانی و گرفتاری کے لئے خواجہ جہاں احمد ایاز کو چھوڑ کر خود براہِ راست دو منزلہ یلغار کرتا ہوا دہلی کی جانب روانہ ہوا اور ۷۳۶ھ کے آخری ایام میں دہلی پہنچ گیا۔

سپہ سالار ملتان کا قتل اور مخدومۂ جہان کی وفات

سلطان کو دہلی جلد پہنچنے کا خیال اس لئے تھا کہ اس نے اپنی والدہ مخدومۂ جہان کی بیماری کا حال سن لیا تھا۔ یہاں آکر مخدومۂ جہان کی زیارت سے مشرف ہوا۔ اور کاشت کاروں کو زرتقاوی تقسیم کرنا شروع کیا۔ عین الملک اور اُس کے بھائیوں کی بغاوت کا ایک یہ نتیجہ نکلا کہ تغلق خاں کے دولت آباد سے تبدیل کرنے کا معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا۔ کیونکہ اب عین الملک کا جس کے بھائی لڑائی میں مارے جا چکے تھے اور جس کی وفاداری پر پہلا سا اعتماد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ دولت آباد اُس کی خواہش کے خلاف بھیجنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ چند روز کے بعد ملک احمد ایاز بھی مجرموں کو گرفتار کر کے دہلی لے آیا اور اُن کی خیانتوں اور شرارتوں کے ثبوت بہم پہنچنے کے بعد انھیں سزائیں دی گئیں۔ اسی حالت میں خبر پہنچی کہ شاہو افغان نے بہزاد خاں کو قتل کر کے خود ملتان پر قبضہ کر لیا اور قوام الملک نو مسلم صوبہ دار کو ملتان سے بھگا دیا۔ یہ خبر سن کر سلطان ملتان کی طرف روانہ ہوا۔ ابھی ملتان کئی منزل رہ گیا تھا کہ شاہو افغان کی درخواست سلطان کی خدمت میں پہنچی کہ میں آپ کا وفادار ہوں باغی نہیں ہوں۔ میں نے بہزاد خاں کو ضرور قتل کیا ہے۔ لیکن میرا ارادہ ملتان پر قابض رہنے کا نہیں میں اپنے افغانوں کی جمعیت کے ساتھ اپنے وطن کو جا رہا ہوں آپ جس کو چاہیں ملتان کا عامل بنا کر بھیج دیں۔ اس تحریر کو پڑھ کر سلطان راستے ہی سے لوٹ آیا۔ شاہو افغان اپنے افغانوں کو لے کر افغانستان چلا گیا جب کہ سلطان ملتان کی طرف جا رہا تھا دہلی میں اس کی والدہ مخدومۂ جہان کا انتقال ہوا۔

"سلطان محمد در ترتیب زراعت و دادن سوندھار مشغول بود کہ از ملتان خبر رسید کہ شاہو افغان بلغاک کرد و بہزاد نائب ملتان را بکشت (ضیاء برنی)"

فرشتہ کے الفاظ ہیں کہ:۔

"پادشاہ از دہلی سامان لشکر نمودہ بجانب ملتان نہضت فرمودہ یک منزل پیش برفتہ بود کہ والدۂ او مخدومۂ جہان کہ نظام و التیام تمام خاندان تغلق شاہیہ باو وابستہ بود در دہلی برحمت حق پیوست سلطان متالم و محزون شدہ بفرمود تا در شہر دہلی، بروح او طعام و صدقات دادند و خود روانہ شد

چوں نزدیک ملتان رسید شاہوے افغان عریضہ مشتمل بر ندامت و بازگشت فرستاد و خود ملتان راگذشتہ با فغانستان رفت "

ترقی زراعت کے انتظامات

چونکہ بارش کے ہونے سے قحط کی بلا مخلوق خدا کے سر سے ٹل گئی تھی لہذا سلطان محمد تغلق نے ۷۴۳ھ کا پورا سال محکمہ زراعت کے استحکام اور ترقی زراعت کے کاموں میں گذارا۔ اس نے صوبہ میان دواب کے تمام قابلِ زراعت رقبہ کو سو مساوی مربعوں میں تقسیم کیا ایک مربع کو ایک ضلع سمجھنا چاہیے۔ ہر مربع کی لمبائی چوڑائی تیس تیس کوس تھی۔ اس تیس کوس مربع رقبہ کے لئے ایک افسر نہایت وسیع اختیارات کے ساتھ مامور کیا گیا اس طرح سو افسر مامور ہوئے ان کو حکم دیا گیا تھا کہ بنجر زمینوں کو مزروعہ اور جو مزروعہ ہیں اُن میں ادنیٰ جنس کی جگہ اعلیٰ جنس کی کاشت کرائیں۔

"سی کردہ درسی کردہ دائرہ گرد از قیاس گر فتند بشرطِ آنکہ یک بالشت زمین درمسافت چندین کردہ بے زراعت نماند وہر چہ زراعت شود آنرا تبدیل کنند چنانچہ حنطہ بجائے جو کارند و بجائے حنطہ نیشکر کارند و بجائے نیشکر انگور و رطب نہال کنند و قریب صد شقدار در زمین منصور نصب شد (ضیا برنی)

کس قدر حیرت اور حسرت کا مقام ہے کہ ہندوستان کے جس سلطان نے اپنے عہد حکومت کا ایک بڑا حصہ زراعت کی ترقی اور ملک کو سرسبز بنانے کی کوششوں میں صرف کیا اور قحط عظیم میں مخلوقِ خدا کی جانیں بچانے کے لئے فرشتۂ رحمت ثابت ہوا آج جبکہ علمی انجمنوں اور کالجوں میں ہندوستان کی زرعی تاریخ پر لکچر ہوتے ہیں تو علاء الدین خلجی شیر شاہ اعظم اور اکبر کا ذکر تو آجاتا ہے لیکن محمد تغلق کا نام کوئی نہیں لیتا جس کی اصلاحات اور مفید ایجادات کا مرتبہ سب سے بڑھا ہوا ہے اور جس کے احسانات ہندوستان کی تمام مخلوق پر ثابت ہیں۔

نام نہاد یورش چین یا تسخیر ہمالہ

اوپر ذکر آچکا ہے کہ منگولیا و چین میں جو چنگیزی خاندان حکمراں تھا اس کو دولت اسلام نصیب نہیں ہوئی۔ اس خاندان کو چغتائی خاندان سے جو ماوراء النہر و افغانستان پر حکمران تھا نفرت تھی جس کا تفصیلی تذکرہ مغلوں کی تاریخ میں موجود ہے۔ یہ چغتائی خاندان ۷۲۶ھ سے

جب کہ سلطان ترمشیریں خاں چغتائی خود ہندوستان آیا تھا محمد تغلق کی وفات تک محمد تغلق کا وفادار و خیر خواہ اور حلیف رہا۔ لہذا چین کے چنگیزی مغلوں کو محمد تغلق سے نفرت ہونا لازمی بات تھی۔ ۷۲۹ھ میں اس چینی چنگیزی خاندان کا پادشاہ توقتمور خاں تبت کے لامہ گرو کا مرید ہو گیا تھا اُس وقت سے چین کے چنگیزی فرماں رواؤں کی نگاہ میں تبت کی اہمیت بہت بڑھ گئی تھی مغلوں اور تبتیوں نے کوہ ہمالہ کی بعض پہاڑی ریاستوں یا بعض پہاڑی قبائل کو جو آزادی اور خود مختاری کی حالت میں تھے اپنی جانب مائل کر لیا اور کوئی جدید شوالہ بھی بنانا چاہا جس کو مرکزی حیثیت حاصل ہو سکتی تھی۔ محمد تغلق ان تمام باتوں سے واقف ہونے پر خاموش اور بے فکر نہیں رہ سکتا تھا اس نے کوہ ہمالہ میں اپنے مخالف چنگیزیلوں کے رسوخ اور پیش قدمی کو ہندوستان پر حملہ آوری کا پیش خیمہ محسوس کیا اور ع۔

"سرِ چشمہ شاید گرفتن بمیل"

پر عمل کر کے اس پہاڑی علاقے پر قبضہ کر کے حملہ آوری کے امکان کو مٹانا چاہا۔ چنانچہ ۷۳۸ھ میں اسی ہزار سپاہیوں کا ایک لشکر کوہ ہمالہ کے اس حصے پر قبضہ کرنے کے لئے خسرو ملک کی سرداری میں روانہ ہوا۔ کوہ ہمالہ کے کسی حصے پر قبضہ کرنے کے لئے اسی ہزار سپاہیوں کی تعداد زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ لیکن محمد تغلق جو بچپن سے بڑی بڑی لڑائیوں کا تماشا دیکھتا رہا تھا اور ایک اعلیٰ درجہ کا تجربہ کار سپہ سالار مآل اندیش ملک دار تھا وہ کوہ ہمالہ پر قبضہ کرنے کی مشکلات کو پہلے ہی سمجھ چکا تھا۔ اس نے خسرو ملک کو حکم دیا کہ پہاڑ میں داخل ہوتے ہی تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر فوجی چوکیاں قائم کرتے چلے جاؤ تاکہ کسی مصیبت کے پیش آنے پر تم کو واپس ہونے یا فوراً مدد منگانے میں کسی قسم کی دقت نہ ہو۔۔ اس طرح فوج کا ایک بڑا حصہ راستے کی حفاظت کے لئے فوجی چوکیوں میں تقسیم ہو گیا۔ باقی فوج نے کوہ ہمالہ کی اس ریاست یا ان قبائل کو مطیع و منقاد بنا کر وہاں اسلامی حکومت قائم کر دی، خسرو ملک جس مہم پر مامور ہوا تھا وہ پوری ہو چکی تھی لیکن اُس نے اولو العزمی اور ناعاقبت اندیشی کی راہ سے کوہ ہمالہ کو طے کر کے تبت کے میدان تک جانا چاہا اور فوج کو ہمالیہ سے گذار کر دوسری طرف کے شمالی دامن کوہ میں لے گیا۔ وہاں سیلاب اور بارش کی مصیبتوں کے علاوہ لشکر میں بیماری بھی پھیل گئی۔ اگرچہ مغلوں یا تبتیوں کی کسی فوج سے مقابلہ نہیں ہوا لیکن سیلاب اور وبا کے قدرتی حملوں سے مجبور ہو کر بڑی سراسیمگی کے ساتھ واپس ہونا پڑا۔ فوج

کے بعض سردار جو کوہ ہمالہ سے گذر کر تبت کے میدانوں تک جانے کے مخالف تھے اپنے سپہ سالار کی نالائقی اور بے تدبیری کی علانیہ شکایتیں زبان پر لاتے جس سے سپاہیوں میں بھی ناراضی اور نافرمانی کی علامات نمایاں ہوئیں اور فوج کا نظام و انتظام درہم برہم ہو گیا۔ کچھ سیلاب کی نذر ہوئے، کچھ بیماری میں مرے۔ جو باقی رہے اُن میں پھوٹ پڑ گئی یہ حالت دیکھکر پہاڑیوں نے پہلو بدلا اور سامان رسد پر چھاپے مارنے شروع کیئے۔ پہاڑی راستوں اور گھاٹیوں کی دشوار گذاری، پہاڑی علاقے کے حالات سے بے خبری، ان تمام چیزوں نے مل کر لوگوں میں بدحواسی پیدا کردی۔ راستے کی چوکیاں جن پر بے خطر واپسی کا انحصار تھا ٹوٹ گئیں۔ پہاڑی ہر طرف سے ٹوٹ پڑے اور جا بجا پہاڑ کی تنگ گذرگاہوں میں چوٹیوں پر سے لُڑکائے ہوئے پتھروں نے وہ کام کیا جو آج کل میدانوں میں توپ کے گولوں سے بھی ممکن نہیں۔ غرض تمام لشکر پہاڑ میں بکھر گیا اور اس کا اکثر حصہ پہاڑ ہی میں ختم ہوا۔ بہت تھوڑے آدمی معہ خسرو ملک بچ کر واپس آسکے۔ اس طرح اتنے بڑے لشکر کا برباد ہونا یقیناً ہندوستان والوں کے غم و غصہ کا موجب ہوا ہوگا اور اس بربادی کے قصے لوگوں کی زبان پہ دیر تک جاری رہے ہوں گے۔ جن لوگوں کو سلطان سے نفرت یا شکایت تھی اُنھوں نے اس بربادی کا ذمہ دار سلطان ہی کو بنایا حالانکہ سلطان سے کوئی غلطی نہیں ہوئی۔ جن لوگوں کی بے تدبیری اور نالائقی سے یہ نقصان ہوا تھا جب وہ واپس آئے تو سلطان نے ان کو سزائیں دیں۔ خسرو ملک اس جرم میں کہ اُس نے کیوں بلا اجازت آگے بڑھ کر مملکتِ چین میں قدم رکھا۔ زیر عتاب آیا۔ ضیا برنی نے اس سزا دہی کو بھی سلطان کے مظالم کی فہرست میں شامل کیا ہے۔ سلطان نے اُس کے بعد ہی فوراً دوسری فوج بھیج کر اُس پہاڑی علاقے پر جس کا قبضے میں لانا ضروری تھا قبضہ کر لیا اور وہ آئندہ سلطانی قبضے میں رہا۔ چین کی مغلیہ سلطنت کو کئی سال کے بعد مجبوراً سلطان کے پاس قاصد بھیج کر اُسے رضامند کرنا پڑا اور شوالہ بنانے کی اجازت حاصل کرنے کے لئے سلطنت چین کی طرف سے مودبانہ التجا سلطان محمد تغلق کی خدمت میں پیش ہوئی جس کا ذکر ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں مفصل کیا ہے۔

اس مذکورہ کوہی مہم کی نسبت آج کل کی متداول تاریخوں میں بیان کیا جاتا ہے۔ کہ سلطان محمد تغلق نے چین کی فتح کے لئے فوج بھیجی تھی اور یہ اس کی سب سے بڑی

حماقت تھی حالانکہ چین کے فتح کرنے کا خیال تک بھی اس بے چارے کو نہ تھا اُس نے تو اپنے سپہ سالار خسرو ملک کو جو اس کا قریبی رشتہ دار بھی تھا اسی لئے عہدے اور منصب سے معزول کرکے ذلیل اور نظر بند کیا کہ وہ فوج کو چین کی حدود میں کیوں لے گیا۔ خود ضیاء برنی نے اس مہم کو ملکِ چین کی مہم نہیں لکھا وہ کہتا ہے کہ:

"سلطان محمد را درخاطر گذشت کہ کوہ قراجل کہ درراہ نزدیک میانِ ممالک ہند و ممالک چین حائل وحجاب شدہ مضبوط علم اسلام گردد"

یہ بات بالکل مشتبہ ہے کہ ہمالیہ پہاڑ کا وہ کون سا حصہ تھا جس پر سلطان نے قبضہ کرنا ضروری سمجھا۔ کسی نے کوہ قراجل کو کوہ قراجل اور قراچیل اور کراجل وغیرہ پڑھا۔ کسی نے کراجل یا قراجل کو کلو کا پہاڑی علاقہ قرار دیا۔ کوئی اس فوج کو الموڑہ کے راستے پہاڑ میں اور کمایوں کے ضلع کو کوہ قراجل یا قراجل کہتا ہے۔ کوئی ضلع گڈھوال اور ریاست ٹیری میں اس مہم کے علامات تلاش کرتا ہے۔ کسی نے کشمیر کا علاقہ اور کسی نے نیپال کا علاقہ منتخب کیا ہے۔ زیادہ قرینِ قیاس یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ فوج دریائے جمنا کے کنارے کنارے پہاڑ میں داخل ہوکر پہاڑ کے دوسری طرف میدان میں دریائے ستلج کے کنارے پہنچ گئی ہوگی۔ بہرحال سلطان محمد تغلق جس مقصد کو حاصل کرنا چاہتا تھا وہ اس نے حاصل کرلیا۔ اگرچہ ایک اتفاقی حادثہ یا سپہ سالار کی بے تدبیری سے فوج کا ایک بڑا حصہ ضائع ہوا۔ فوج اس طرح اگر ضائع نہ ہوتی تو یہ مہم ایک ایسا معمولی واقعہ تھا کہ شاید تاریخوں میں کوئی اس کا ذکر بھی نہ کرتا۔ ؏

عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ'

بنگالہ کا سفر

۷۲۹ھ میں بنگالہ کے اندر ہلچل مچی جس کی مختصر کیفیت یہ ہے کہ ملک بنگالہ دو حصوں میں تقسیم تھا ایک حصہ کا دارالحکومت لکھنوتی تھا اس پر سلطان غیاث الدین بلبن کا بیٹا ناصرالدین حکومت کرتا تھا اور سلطان غیاث الدین تغلق نے اس کو چتر دورباش وغیرہ شاہی علامات دے کر لکھنوتی کے تخت پر قائم رکھا تھا۔ دوسرے حصے کا دارالحکومت سنارگام یا سنارگاؤں (ڈھاکہ) تھا۔ یہ حصہ سلطنت دہلی کا صوبہ سمجھا جاتا تھا اور یہاں سلطان دہلی کی طرف سے ایک صوبہ دار حکومت کرتا تھا سلطان محمد تغلق کی تخت نشینی کے بعد جب ناصرالدین ابن سلطان بلبن کا لکھنوتی میں انتقال ہوا تو سلطان نے ملک بیدار خلجی کو قدر خاں کا خطاب دے کر لکھنوتی کی حکومت پر مامور کیا اور

بہرام خاں کو سنار گاؤں کی حکومت عطا کی۔ اس طرح بنگالے کے دونوں صوبوں پر قدر خاں اور بہرام خاں دو گورنر حکومت کر رہے تھے اور بنگالہ کا انتظام ہر طرح قابل اطمینان تھا۔

۷۳۹ھ میں بہرام خاں حاکم سنار گاؤں کا انتقال ہوا اور بہرام خاں کے سپہ سالار ملک فخرالدین نے سنار گاؤں کی حکومت اپنے ہاتھ میں لے کر خود سری و خود مختاری کی علامات کا اظہار کیا۔ قدر خاں حاکم لکھنوتی نے حملہ کر کے فخرالدین کو شکست دی اور سنار گاؤں سے تمام مال و اسباب اور خزانہ لکھنوتی لے گیا اور سلطان محمد تغلق کی خدمت میں زرِ خراج اور تحف و ہدایا بھیجنے کا بندوبست کیا۔ قدر خاں کی فوج کے بعض سردار قدر خاں سے اس لئے ناراض ہو گئے کہ اُس نے اُن کو سُنار گاؤں کے مالِ غنیمت میں سے حصہ نہیں دیا۔ فخرالدین نے پھر جمعیت فراہم کی اور قدر خاں کی فوج کے مذکورہ ناراض سرداروں سے سازش کر کے حملہ آور ہوا۔ قدر خاں لڑائی میں مارا گیا۔ فخرالدین نے لکھنوتی میں اپنی طرف سے ایک حاکم مقرر کیا اور سُنار گاؤں میں آ کر بطور خود مختار فرماں روا حکومت کرنے لگا۔ قدر خاں کی فوج کے ایک سردار علی مبارک نے فخرالدین کے نائب کو جو لکھنوتی کی حکومت پر اس نے مامور کیا تھا قتل کر کے خود لکھنوتی کی حکومت سنبھال لی اور فخرالدین کی طرح خود مختاری کا اعلان کر کے اپنا لقب سلطان علاء الدین مقرر کیا۔ اس طرح ایک یا دو مہینے کی کشمکش کے بعد لکھنوتی میں علی مبارک الملقب بہ علاء الدین اور سنار گاؤں میں فخرالدین دو خود مختار بادشاہ بن گئے۔ ملک الیاس حاجی جو سلطان محمد تغلق کے چچا زاد بھائی فیروز تغلق کے نوکروں میں شامل تھا کسی جرم کے سرزد ہونے پر دہلی سے بھاگ کر اور لکھنوتی پہنچ کر قدر خاں کے نوکروں میں شامل ہو گیا تھا۔ اُس نے لکھنوتی کے امیروں کو متفق کر کے علی مبارک الملقب بہ علاء الدین کے خلاف خروج کیا اُس کو قتل کر کے لکھنوتی پر قابض ہوا اور سلطان محمد تغلق کو ان تمام حالات سے اطلاع دی سلطان نے ۷۴۰ھ میں بنگالہ کی جانب کوچ کیا۔ سُنار گاؤں پہنچ کر فخرالدین کو گرفتار کیا پھر لکھنوتی پہنچا یہاں فخرالدین کو قتل کیا اور حاجی الیاس کو شمس الدین کا خطاب دے کر تمام ملک بنگالہ کی حکومت اسے سپرد کی اور دہلی واپس آیا۔

بنگالہ کے واقعات کا یہ خلاصہ زیادہ تر منتخب التواریخ اور ریاض السلاطین کی رو سے ترتیب دے کر درج کیا گیا ہے۔ مورخین نے عام طور پر ان واقعات کو خلط کر کے اس طرح لکھا ہے کہ پڑھنے والے کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا اور وہ کوئی صحیح تصور اپنے ذہن میں قائم

نہیں کر سکتا۔ میں نے بہت تھوڑے الفاظ میں واقعات کو قریب الفہم بنا کر درج کیا ہے سلطان کو بنگال سے اس لئے جلد آنا پڑا کہ مالوہ میں بعض ہندوؤں کی سرکشی کے ارادے کی خبر پہنچ چکی تھی چنانچہ سلطان نے بنگال سے آکر بھیلسہ اور رائسین کے سرکشوں کی سرکوبی کی اور ان دونوں علاقوں کو ساغر کے صوبے میں شامل کر دیا۔ اس طرح تمام فتنے فرو ہو گئے۔

جدید سکے کی حقیقت

قحط و خشک سالی کا زمانہ بھی نہ تھا ملک میں ہر طرح امن و امان اور فارغ البالی کا دور دورہ تھا۔ بغاوتوں کا بھی بظاہر کوئی خطرہ نہ رہا تھا۔ سلطان محمد تغلق نہ عیش پسند اور کاہل تھا نہ شراب و ساقی سے واقف تھا اس کی ساری عمر گھوڑے کی پشت پر یا علما کی صحبتوں میں گذری تھی۔ وہ رفاہِ رعایا اور قیامِ امن و امان کا بے حد خواہاں اور مفید آئین و نفع رسان اسالیب نافذ کرنے کا شایق تھا۔ اب مطمئن ہو کر جب کہ تمام برِ اعظم ہند پر اس کی حکومت و سلطنت چھائی ہوئی تھی اور سلطنت کا کاروبار عمدگی سے چل رہا تھا اس کا موجد و مخترع دماغ سکے کی اصلاح کی جانب متوجہ ہوا۔ سکہ کا مسئلہ اس لئے قابل توجہ ہو گیا تھا کہ سلطان علاء الدین خلجی کے زمانے سے فوج کے ایک بڑے حصے کو جو خاص شاہی فوج سمجھی جاتی تھی شاہی خزانے سے نقد تنخواہ دینے کا رواج چلا آتا تھا اور بجائے جاگیروں کے نقد تنخواہ کا دستور مفید بھی ثابت ہوا تھا۔ کاشتکاروں سے زرِ لگان نقدی کی شکل میں وصول کرنے کا رواج نہ تھا بلکہ مقاسمہ (بٹائی)، کا قاعدہ عام طور پر جاری تھا اس لئے سلطان علاء الدین خلجی نے جب فوج کو زرِ نقد کی شکل میں تنخواہ دینے کا قاعدہ مقرر کیا تو ساتھ ہی جا بجا اس غلہ کے جو بٹائی میں وصول ہوتا تھا سرکاری ذخائر قائم کر دیئے تھے اور اسی لئے سرکاری طور پر غلہ کا نرخ مقرر کیا جاتا تھا۔ صوبہ میان دوآب ہی میں جس کو حضور صوبہ کہنا چاہیے یہ دستور جاری کیا گیا تھا اور اسی صوبہ کی آمدنی پر شاہی فوج کی تنخواہوں کا بار تھا۔ دوسرے صوبوں کا خراج عموماً سلطان کے انعام و بخشش قلعوں کی تعمیر، فوج کشیوں کے مخصوص ہنگامی اخراجات، نہروں، کنووں، سرایوں، سڑکوں، وظائف وغیرہ مصارف خیر اور اسی قسم کے دوسرے کاموں میں خرچ ہوتا تھا۔ سلطان محمد تغلق نے عہد علائی کے اس انتظام کو مفید پاکر از سرِ نو ترقی دی تھی (محمد تغلق کے بعد اس کے جانشین فیروز تغلق نے اس دستور

کو منسوخ کرکے فوج کو جاگیریں عطا کرنے کا پرانا قاعدہ پھر جاری کردیا تھا) غلہ کے سرکاری ذخیروں نے گذشتہ قحط عظیم میں بہت کچھ امداد پہنچائی تھی۔ لہذا سلطان نے زراعت کی ترقی کے لئے خاص طور پر انتظام واہتمام کیا۔ گذشتہ ہفت سالہ قحط میں شاہی خزانے کو زرِ تقاوی، غربا کی دستگیری چاہ کاوی وغیرہ کاموں میں وہ بے دریغ لٹاتا اور روپیہ کو پانی کی طرح بہاتا رہا تھا۔ اس طرح چاندی کے سکوں کی بڑی مقدار شاہی خزانے سے نکل کر رعایا کے قبضے میں پہنچ چکی تھی محمد تغلق فوج کو موقوف نہیں کرسکتا تھا۔ فوج کو زر نقد کی شکل میں تنخواہ کا دینا بھی ضروری تھا۔ توفیر و تکثیر زراعت کے لئے اس نے جو انتظامات کئے تھے وہ صرف زر کے محتاج تھے ان کو بھی وہ ملتوی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس دشواری کو رفع کرنے کے لئے اس نے دوسرے صوبوں کے مقررہ خراج کو بھی بڑھانا نہیں چاہا اگر ایسا کرتا تو بغاوتوں اور سرکشیوں کے پھوٹ پڑنے کا قوی احتمال تھا۔ وہ رعایا پر کوئی جدید ٹیکس قائم کرسکتا تھا لیکن اس نے یہ بھی گوارا نہ کیا۔ وہ نقد تنخواہیں دینے کے عوض پرانے زمانے کے دستور کے موافق جاگیریں سپاہیوں کے نام کرسکتا تھا مگر سپاہیوں کا معاملہ کاشت کاروں سے وابستہ ہوجانے کی حالت میں ترقی زراعت کا وہ اہتمام جو اس نے کیا تھا سب درہم برہم ہوجاتا، لہذا یہ بھی گوارا نہ ہوا۔ جس سلطان نے سات سال تک قحط کا مقابلہ کیا ہو اور اب اس کی تمام تر توجہ کسی ایسے ہی آئندہ قحط کے قبل از وقت انسداد اور روک تھام کی تدبیروں میں مصروف ہو اور اس کا دل مخلوق خدا کی ہمدردی کے جوش میں پگھلا جاتا ہو اس کے سامنے جب روپیہ کی کمی کا مسئلہ پیش ہوا تو اس نے رعایا اور زراعت پیشہ لوگوں پر بار ڈالنا مناسب نہ سمجھ کر اپنی فوج اور سپاہیوں کو ایک نئے آئین کی تکلیف دی۔ سلطان علاء الدین خلجی نے سپاہیوں کی نقد تنخواہیں مقرر کرکے نہ صرف غلہ بلکہ ترکاری لباس، سواری اور تمام ضروریات زندگی کے سرکاری نرخ مقرر کردیئے تھے اور فوج کے سپاہیوں کو تنخواہ کی کمی کا کوئی شکوہ نہ رہا تھا۔ سلطان محمد تغلق نے ہزار ہا اشیاء کے سرکاری نرخ مقرر کرنے کا قاعدہ پہلے ہی منسوخ قرار دے دیا تھا۔ اب ایک اہم ضرورت پیش آنے پر اس نے سب سے زیادہ قرین انصاف راستہ اختیار کیا اور وہ یہ تھا کہ تانبے کے سکے کی اعتباری قیمت قائم کی۔ محمد تغلق کی ذہانت اور نکتہ رسی اس بات کے سمجھنے سے عاجز نہ تھی کہ لین دین اور بیع وشرا کی آسانی کے لئے انسان نے چاندی سونے کی اعتباری قیمتیں

متعین کرلی ہیں فی نفسہ یہ دھاتیں انسانی زندگی قائم رکھنے کی ذمہ دار نہیں۔ جب انسانی تمدن اور معاشرت میں ترقی ہوئی اور بڑے بڑے ملکوں میں بادشاہتیں اور شہنشاہیاں قائم ہوگئیں تو مبادلہ اور بیع وشرا میں زیادہ سہولت پیدا کرنے کے لئے بادشاہوں نے چاندی سونے کے ہم وزن ٹکڑوں کو مسکوک کرکے درہم و دینار یعنی روپیہ اور اشرفی کی قیمتیں متعین کردیں اس سے یہ فائدہ ہوا کہ چاندی اور سونے کی قیمتیں اگر کسی خاص سبب سے چند روز کے لئے کم یا زیادہ بھی ہو جاتیں تو محض مسکوک ہونے کی وجہ سے روپیہ یا اشرفی کی قیمت کم و زیادہ نہیں ہو سکتی اور لوگوں کے کاروبار میں کوئی دقت پیش نہیں آسکتی۔ کیونکہ سلطنت کا سکہ بجائے خود ایک مستقل قیمت رکھتا ہے اور چاندی یا سونے کا ٹکڑا جس پر وہ سکہ مسکوک ہے اپنی ذاتی قیمت کے اثر سے ایک حد تک سبکدوش اور جدا ہوتا ہے۔ پس جب کہ سلطنت کے محض سکہ کی بھی بجائے خود ایک مستقل قیمت اس زمانے کے تمام متمدن ممالک میں تسلیم کی جاتی تھی۔ ایران میں کاغذ کا سکہ بھی چند روز کے لئے رائج رہ چکا تھا۔ چین میں بھی اسی قسم کا سکہ جاری کیا جا چکا تھا۔ یونان میں ہزاروں سال پیشتر لائی کرگس مشہور مقنن پادشاہ لوہے کا سکہ رائج کرچکا تھا تو محمد تغلق کا تانبے کے سکے کو چاندی کے سکہ کی اعتباری قیمت عطا کرنا اور فوج کو بجائے چاندی کے تانبے کے سکے تنخواہوں میں دینا ایک بہترین تدبیر تھی جو اُس نے اختیار کی۔ اس کی یہ تدبیر سلطان علاءالدین خلجی کی اس تدبیر سے کہ اس نے تمام اشیاء کے سرکاری نرخ مقرر کر دیئے تھے زیادہ عجیب نہ تھی بلکہ اسی کی ایک اصلاح شدہ حالت تھی۔ اس سکہ کا رواج صرف صوبہ میان دواب کی حدود تک محدود رکھا گیا تھا کیونکہ شاہی فوج سب اسی صوبہ کی رہنے والی اور اپنی تنخواہ کے روپیہ کو اسی صوبہ کے حدود میں صرف کرسکتی تھی۔ ساتھ ہی اس بات کا بھی اعلان کر دیا گیا تھا کہ یہ انتظام مدامی اور دوامی نہیں ہے اور تانبے کے سکے کو شاہی خزانے سے چاندی کے سکے میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ یہ تدبیر زیر عمل آئی اور تانبے کے سکے چاندی کے سکوں کی مانند استعمال ہونے لگے اور فوج نے تانبے کے روپیوں کو تنخواہ میں لینا بخوشی منظور کرلیا کیونکہ اُس میں اُن کا کوئی ہرج نہ تھا۔ پروفیسر گارڈنر براؤن کہتے ہیں کہ اس زمانے میں عام طور پر ساری دنیا میں چاندی کی کمی محسوس کی جا رہی تھی اور چاندی کے قائم مقام کی لوگوں کو تلاش تھی۔ بہر حال جو صورت بھی ہو صوبہ میان دواب

میں اس جدید سکے نے رواج پایا۔ چاندی کے سکے کو سلطان نے منسوخ نہیں کیا تھا۔ دور دراز کے صوبوں کو بھی اس جدید سکے کے رواج پر مجبور نہیں کیا گیا تھا۔

آج کل جس طرح چاندی اور نکل دونوں دھاتوں کی الگ الگ اٹھنیاں چونیاں اور دونیاں مساوی قیمت پر رائج ہیں اسی طرح چاندی اور تانبے کے روپے اس زمانے میں مساوی قیمت پر رائج تھے۔ سلطان کا منشا اس تدبیر سے فوجی مصارف کے مسئلہ کو بآسانی حل کر دینا اور ترقی زراعت کے لئے زیادہ سے زیادہ سہولت بہم پہنچانا تھا چونکہ سلطان نے اس تانبے کے سکے کو اسی مقررہ قیمت پر خود بھی قبول کرنے سے انکار نہیں کیا تھا۔ لہٰذا اس کو اس قسم کا قرضہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ جو آج کل کے متمدن ممالک میں سلطنتوں کو رعایا سے اکثر لینا پڑتا ہے اور اس کے لئے کاغذ کے نوٹ جاری کئے جاتے ہیں۔ تعجب ہے کہ جس ایجاد سے آج ساری دنیا فائدہ اٹھا رہی ہے اسی کو موجد کی نالائقی قرار دیا جا رہا ہے۔ اس بات کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ محمد تغلق نے یہ جدید سکہ اس زمانہ میں ایجاد و جاری کیا تھا۔ جب کہ ملک میں ہر طرح امن وامان قائم اور سلطنت کی عظمت ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں چھائی ہوئی تھی۔ اگر یہ کام وہ ایسی حالت میں کرتا کہ ملک میں ہر طرف بغاوتیں برپا ہوتیں اور سلطنت کا اعتبار و اعتماد متزلزل ہوتا تو اس ایجاد کو حماقت کہا جا سکتا تھا۔

جدید سکہ کیوں منسوخ کیا گیا؟

چونکہ سرکاری ٹکسالوں کے اہل کار عام طور پر ہندو اور سکوں کے مسکوک کرنے والے سنار بھی سب ہندو ہی تھے اور نہ صرف سلطان محمد تغلق بلکہ سلطان فیروز تغلق کے زمانے میں بھی شمس سراج عفیف کے بیان کے موافق ٹکسالوں کا محکمہ تمام وکمال ہندوؤں اور ہندو سناروں ہی کے ہاتھ میں تھا۔ لہٰذا ہندی پست فطرتی کا اظہار اس طرح ہوا کہ بعض ہندوؤں نے سناروں سے مل کر سرکاری ٹکسالوں میں بطور خود سکے مضروب کرانے شروع کر دیئے اول اول سرکاری ٹکسالوں کے ہندو اہل کاروں نے مذکورہ طریق پر خیانت کی پھر سناروں نے اپنے گھروں میں بھی تانبے کے روپے ڈھالنے شروع کر دیئے اور سرکاری سکے کی حفاظت معرض خطر میں پڑ گئی۔

سلطان کو جب ہندوؤں کی اس شرارت کا حال معلوم ہوا تو اس نے یہ نہیں کیا کہ تانبے کے اس جدید سکے کو منسوخ قرار دے کر خاموش ہو جاتا یا ہندوؤں کے قتل وگرفتاری کا حکم دیتا۔ بلکہ اس نے انتہائی شرافت، انتہائی بردباری اور انتہائی ایمان داری کا ثبوت پیش کیا۔ اُس

نے اعلان کرا دیا کہ جدید سکہ منسوخ قرار دیا جاتا ہے مقررہ میعاد کے اندر کے تانبے کے تمام جدید سکے شاہی خزانے میں داخل کر کے اُن کے عوض چاندی کے سکے خزانے سے لے جاؤ اس طرح شاہی خزانے کو نقصان برداشت کرنا پڑا گویا سلطان نے اس قرضہ کا بڑے سے بڑا سود بخندہ پیشانی ادا کر دیا مگر اپنی ساکھ اور اپنے شاہانہ مرتبے کو قائم رکھا۔ یہ واقعہ صرف چند روزہ تھا۔ غالباً اس جدید سکے کے جاری ہونے سے منسوخ ہونے تک پورے ایک سال کی مدت بھی نہیں گذری اور قیاس چاہتا ہے کہ چند ہی مہینوں کے بعد اس تجربے میں ناکامی کا احساس سلطان کو ہو گیا اور اس نے جلد از جلد اپنی تجویز کو واپس لے کر معاملہ صاف کر دیا۔ ضیاء برنی نے سلطان کی مفروضہ غلط کاریوں میں ایک کا اضافہ کر کے خوب آب و تاب کے ساتھ بیان کیا اور بعد کے مورخین نے اس کو بلا غور و تامل اور بھی چمکا دیا۔ خود ضیاء برنی کی تاریخ میں کسی دوسرے واقعہ کے ذیل میں اس کا کوئی ذرا ساحدت کا پہلو نکلتا ہو عام سیاحوں کی طرح ضرور بیان کرتا ہے لیکن وہ اپنے سفرنامے میں اس تانبے کے سکے کا کوئی تذکرہ نہیں کرتا جو دلیل اس بات کی ہے کہ خود محمد تغلق کے زمانے میں بھی یہ کوئی عجیب اور زیادہ قابلِ تذکرہ بات نہیں سمجھی گئی تھی۔ اور یہ ایسی معمولی بات تھی کہ کسی نے اس کو کوئی اہمیت نہیں دی سرکاری خزانے کا نقصان جو سکوں کے واپس لینے میں ہوا وہ بھی بہت زیادہ اور غیر معمولی نہ ہوگا۔ ہندوؤں نے جو سکے اپنے گھروں میں ڈھالے یا سرکاری دارالضرب میں چوری سے مضروب کرائے ہوں گے وہ زیادہ نہ ہوں گے اور ایسے واقعات تھوڑے ہی ہوں گے کہ خبر لگنے پر فوراً ہی منسوخی اور سکوں کی واپسی کے احکام نافذ ہو گئے۔ ضیاء برنی کے مبالغہ آمیز الفاظ کو سب سے زیادہ تقویت تقریباً سو سال بعد کی ایک تصنیف تاریخ مبارک شاہی کی اس روایت سے پہنچی کہ سو برس بعد تک تانبے کے ان واپس شدہ سکوں کے ڈھیر قلعہ دہلی میں موجود تھے۔ یہ بات کسی طرح عقل و فہم میں نہیں آتی کہ اس قدر طویل مدت تک جس میں تیمور کا حملہ، تیموری مغلوں کی دست درازی اور فیروز تغلق کی پرسکون سلطنت سب کچھ گذر چکا تھا۔ ان سکوں کے انباروں کو کس غرض سے محفوظ رکھا گیا تھا۔ وہ سکے آخر دھات کے تھے مٹی یا پتھر کے نہ تھے جن کے انبار کو آثار قدیمہ کے طور پر محفوظ رکھنا اور کسی دوسرے کام میں نہ لانا ضروری سمجھا گیا تھا۔ فیروز تغلق کے بعد دہلی پر ایسے ایسے حوادث مبارک شاہ کے عہد تک آ چکے تھے کہ ان تانبوں کے سکوں کے انبار علی حالہٖ کی طرح

محفوظ نہیں کر سکتے تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ محمد تغلق جس نے ان سکوں کو منسوخ قرار دیا تھا ان کو باقی نہیں رکھ سکتا تھا۔ اُس نے یقیناً ان کو گلوا کر تانبے کے دوسرے مروّج سکے یا تانبے کے ظروف تیار کرا لئے ہوں گے۔ تاریخ مبارک شاہی تو بہت دنوں بعد کی تصنیف ہے شمس سراج عفیف جو ضیاء برنی اور سلطان محمد تغلق کی وفات کے تھوڑے ہی دنوں بعد اور تاریخ مبارک شاہی کی تصنیف سے بہت دنوں پہلے اپنی کتاب تاریخ فیروز شاہی میں لکھتا ہے کہ اس میں بار بار محمد تغلق کا تذکرہ بھی آتا ہے۔ ایک باب میں چاندی سونے کی مہروں یعنی شاہی سکوں اور چاندی کے کھرے کھوٹے ہونے کا ذکر خاص طور پر کرتا ہے وہ سلطان محمد تغلق کے اس جدید تانبے کے سکے کا کوئی تذکرہ نہیں کرتا۔ ابن بطوطہ اور شمس سراج عفیف صرف دو ہی ایسے شخص ہیں جو ضیاء برنی کی تقلید کے محتاج نہ تھے اور جنھوں نے ضیاء برنی کی تاریخ سے قطعاً کوئی فائدہ نہیں اٹھایا یہی دونوں اس سکے کے معاملے میں خاموش ہیں۔ بعد کے مورخین نے ضیاء برنی کے بیان کو روغن قاز مل کر نقل کرنا شروع کر دیا۔ ابن بطوطہ تو ضیاء برنی کی کتاب کے لکھے جانے سے بہت دنوں پہلے ہندوستان سے رخصت ہو چکا تھا۔ شمس سراج عفیف کی کتاب خود اس بات کی شاہد ہے کہ وہ ہر واقعہ کو اپنی ذمہ داری پر درج کرتا اور ضیاء برنی کی تاریخ سے قطعاً کوئی بات بھی قسم کھانے کو نقل نہیں کرتا کیونکہ اس کے زمانے میں سلطان محمد تغلق کا عہد حکومت دیکھنے والے لوگ بکثرت موجود تھے۔ بہرحال اس جدید سکے کی حیثیت اس سے زیادہ اور کچھ نہیں جو اوپر مذکور ہوئی۔

عباسی خلیفہ اور سلطان محمد تغلق

۷۴۲ھ سے ۷۴۳ھ تک کا زمانہ یقینی طور پر امن وامان اور اطمینان کا زمانہ تھا۔ ۷۴۲ھ کے آخر یا ۷۴۳ھ کے شروع میں سلطان نے اس خیال کی بنا پر کہ شریعت اسلام اس مکمل نظام کا نام ہے جس کے اوامر و نواہی معاد و معاش اور دین و دنیا دونوں پر حاوی ہیں اور اسی لئے خلفائے راشدین پیشوایانِ دین اور فرمانروایانِ دنیا دونوں حیثیتوں کے جامع تھے لہٰذا کوئی مسلمان پادشاہ جو خلیفہ اسلام کی مرکزیت سے وابستہ نہ ہو اور خلافتِ اسلامیہ سے متعلق نہ ہو اور خلیفۂ اسلام نے اس کو سند حکومت عطا نہ کی ہو اس کی سلطنت اسلامی سلطنت نہیں کہلا سکتی خلیفہ عباسی کی خدمت میں ایلچی معہ درخواست

روانہ کیا۔ ہم کو اس وقت اس مسئلہ میں اُلجھنے کی مطلق ضرورت نہیں کہ سلطان محمد تغلق کا اجتہاد اس زمانے اور اُن حالات میں شرعی نقطۂ نظر سے صحیح تھا یا غلط مگر یہ یقینی ہے کہ سلطان محمد تغلق نے عباسی خلیفہ سے جن کا قیام مصر میں تھا اسی طرح سند حکومت حاصل کرنی پڑتی تھی۔ اگرچہ مصر کی حکومت سلاطین مصر کے ہاتھ میں تھی لیکن تباہی بغداد کے بعد جب سے خلفائے عباسیہ کا سلسلہ مصر میں شروع ہوا تھا سلاطین مصر خلیفہ کی اجازت اور منظوری کے بعد تخت نشین کیے جاتے تھے۔ خلیفہ کی سیاسی اہمیت معمولی نہ تھی مصر ہی میں نہیں بلکہ تمام عالم اسلام میں ان کا اقتدار واثر بہت کافی اور مسلم تھا ہندوستان میں بھی اب تک تمام مسلمان سلاطین اپنے آپ کو عباسی خلیفہ کا نائب کہتے اور سکّوں پر اپنے نام کے ساتھ خلیفہ کا نام کندہ کرنا ضروری سمجھتے تھے یعنی کوئی سکہ بغیر خلیفہ کے نام کے جاری ہی نہیں ہوسکتا تھا یہاں تک کہ خسرو نمک حرام کو بھی اپنے سکّے میں اپنے نام کے ساتھ خلیفہ کا نام کندہ کرانا پڑا تھا مگر سکّوں اور خطبوں میں خلیفہ کے نام کو ضروری سمجھنے کے سوا اور کوئی تعلق خلیفہ سے نہ تھا یہی وجہ تھی کہ مستعصم باللہ عباسی خلیفہ کو بغداد میں شہید ہوئے کئی سال گذر چکے تھے اور ہندوستان میں ان کے نام کے سکے مضروب ہو رہے تھے سلطان محمد تغلق نے عملی اور حقیقی طور پر اپنے آپ کو خلیفہ کا فرماں پذیر بنانا چاہا۔ خلیفہ ابوالربیع مستکفی باللہ عباسی اور سلطان ملک الناصر جنھوں نے ۷۳۱ھ میں سفارت بھیجی تھی اور جو بڑے ذی ہوش اور ذی حوصلہ تھے دونوں فوت ہو چکے تھے ۷۳۱ھ میں جو سفارت آئی تھی اس کو کوئی غیر معمولی اہمیت نہیں دی گئی تھی لیکن اب سلطان نے خود اظہار عقیدت اور اقرار اطاعت کی درخواست خلیفہ کی خدمت میں بھیجی اور سندِ حکومت کی استدعا کی سلطان کی یہ درخواست اور سفارت خلیفہ ابو العباس حاکم بامر اللہ کی خدمت میں پہنچی خلیفہ نے چند روز اس سفارت کو مصر میں ٹھہرایا پھر اس کے ساتھ اپنے سفیر حاجی سعید حرمزی کو سلطان محمد تغلق کے لئے فرمان۔ علم اور خلعت دے کر روانہ کیا۔

خلیفہ کے سفیر کی آمد اور سلطان کا اظہار عقیدت

۷۴۴ھ میں حاجی سعید حرمزی ہندوستان آئے اور سلطان محمد تغلق نے اُن کا بڑا شاندار استقبال کیا جس کا اندازہ قصائد بدر چاچ سے بخوبی ہو سکتا ہے جو چھپے ہوئے ہر کتب فروش سے دستیاب ہو سکتے ہیں ضیاء برنی کے الفاظ یہ ہیں۔

"سرانِ قوم حاجی سعید حرمزی آرندہ منشور و خلعت خلیفہ را استقبال کردہ شرائط تعظیم منشور و خلعت خلیفہ را بالغًا ما بلغ و فوق الحد والوصف بجائے آوردہ و چند تیر پرتاب پیادہ پائے برہنہ پیش رفت و منشور و خلعت را بر سر نہادہ بر پائے سعید حرمزی بوسہ ہا زد و در شہر قبہ ہا بستند و بر منشور و خلعت زر ریزہا کردند"

سلطان نے تمام خلفائے عباسیہ کے ناموں کو خطبے میں شامل کیا اور اپنے نام کے ساتھ تعظیمی الفاظ و القاب استعمال کرنے کی ممانعت کرکے صرف "سلطان محمد" لکھنا کافی قرار دیا۔ سلطان محمد کی تخت نشینی کے وقت جو سکہ مضروب ہوا تھا اس کی عبارت جو دونوں طرف پوری ہوتی ہے یہ ہے۔

" ضرب فی زمن العبد الراجی لرحمۃ اللہ الصمد بن السلطان السعید الشہید تغلق شاہ غازی"

۷۲۷ھ میں سکوں پر یہ عبارت کندہ ہوتی۔

فی زمن السلطان العادل محمد بن تغلق شاہ دامت سلطنتہٗ

۷۲۹ھ میں سکہ کی عبارت یہ تھی۔

" الملک والعظمۃ للہ عبدہ الراجی محمد تغلق"

۷۳۰ھ میں جب کہ قحط کی بلائے عظیم رفع ہو چکی تھی سکہ میں یہ الفاظ درج ہوئے ۷۴۳ھ میں اس نے سکوں پر سے اپنا نام بالکل اڑا دیا اور صرف خلیفہ کا نام اس طرح منقوش کرایا۔

خلیفۃ اللہ المستکفی باللہ

۷۴۴ھ میں حاجی سعید حرمزی کے آنے سے پہلے خلیفہ کا نام سکوں پر اس طرح منقوش ہوا۔

الامام الاعظم خلیفۃ اللہ فی العالمین المستکفی باللہ امیر المومنین

حاجی سعید حرمزی کے آنے کے بعد جو سکے مضروب ہوئے ان پر المستکفی للہ کی جگہ ابو العباس حاکم بامر اللہ کا نام درج ہوا۔ میرے پاس سلطان محمد تغلق کے عہد حکومت اور اس سے پہلے کے بھی سکے موجود ہیں سکوں کی مذکورہ عبارتیں میں نے

اصل سکوں سے نقل کی ہیں ۔ سکوں کے الفاظ کی تبدیلیوں کا بخوبی پتہ چل رہا ہے ۷۴۴ھ میں دولت آباد (دیوگیر) کی ٹکسال میں جب مذکورہ سکے سلطانی حکم کے موافق مضروب ہوئے تو قتلغ خاں حاکم دولت آباد نے سکوں پر خلیفہ کے نام کا ہونا سخت ناپسند کیا اور سلطان کے نام کا سکے سے جدا ہونا سلطان کا تخت سلطنت سے جدا ہونا قرار دے کر فاسد ارادوں کو دل میں راہ دی۔ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ قتلغ خاں شیعی خیالات کا آدمی تھا اس لئے عباسی خلیفہ سے اس کا متنفر ہونا اور سلطان محمد تغلق کی مذکورہ حرکت سے ناراض ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ سلطان نے اپنے آپ کو خلیفہ کا نائب قرار دے کر اپنی ہر ایک چیز کو خلیفہ کی طرف منسوب اور خلیفہ کی ملکیت قرار دیا۔ یہاں تک کہ شاہی عمارتوں پر، علموں پر، اور ہر ایک قیمتی چیز پر خلیفہ کا نام کھدوایا، جواہرات قیمتی ہدیئے حاجی سعید حرمزی کی معرفت خلیفہ کی خدمت میں بھجوائے۔ پھر خود ایک نہایت طویل عرضداشت بزبان عربی لکھ کر حاجی رجب کے ہاتھ خلیفہ کی خدمت میں روانہ کی اور اس بات کی استدعا کی کہ مصر کے شیخ الاسلام کو ہندوستان بھیجا جائے۔ دو سال کے بعد ۷۴۹ھ میں حاجی رجب اور شیخ الشیوخ مصری خلیفہ کا فرمان اور خلعت لے کر آئے۔ اس مرتبہ پہلے سے بھی زیادہ شان دار استقبال کیا گیا اور سلطان نے تمام ارکانِ سلطنت، تمام سردارانِ لشکر، اور ملوک و امرا کو خلیفہ کی غائبانہ بیعت کی ترغیب دی۔ سلطان کے وزیر اعظم خواجہ جہان، ملک احمد ایاز، ایران و ترکستان کے سفیروں اور بیگمات نے بھی بیعت کی۔ سب نے اپنے بیعت نامے پیش کئے اور سلطان نے ان بیعت والوں کو انعامات دیئے۔

"و فرماں داد تا ہر کہ از امرا و امیر تمنان مغلستان و خراسان در بندگی سلطان محمدی رسیدند و فرمان شد کہ مامنشور امیرالمومنین بیعت کنند و مصحف و مشارق و منشور امیرالمومنین پیش می نہادند و بیعت می کنانیدند و خطوط و عہود و مواثیق بنام امیرالمومنین می ستدند و چندیں اعلیان و امیران ہزارہ و امیران صدہ و معارف مغل و خاتونان بزرگ ایشاں کہ بدرگاہ سلطان می رسیدند اول از ایشاں بیعت نامہ بنام امیرالمومنین می ستدند۔"
(ضیائے برنی)

سوائے ایک قتلغ خان حاکم دولت آباد کے تمام ملوک و امرائے بیعت نامے داخل کئے اور سلطان نے وہ تمام بیعت نامے معہ تحف و ہدایا شیخ الشیوخ مصری کے ہاتھ خلیفہ کی خدمت میں بھیج دیئے۔ اس کے بعد دو مرتبہ اور جب کہ سلطان اپنے آخری ایام حکومت میں گجرات کی جانب بغاوتوں کو فرو کرنے میں مصروف تھا خلیفہ کے پاس سے ایلچی آئے اور ہر مرتبہ ان کی ایسی ہی تعظیم و تکریم کی گئی۔

"در یک کرت نیز بعد چندگاہ شیخ الشیوخ مصری را و آنانکہ برابر ایشاں آمدہ بودند انعامات و اکرامات وافر داد و باصد ہزار نوازش باز گردانید و چندیں مال و جواہر برسم خدمتے بدست ایشاں در بندگی خلیفہ از نہروالہ و کنبہات در مصر رواں کرد و دو کرت دیگر منشور امیرالمومنین در نہروالہ و کنبہات رسید در ہر کرتے سلطان محمد چنداں تعظیم کرد و افراط نمود" (ضیاء برنی)

استیصال بدعات اور قتلغ خاں کی مخالفت

قحط کی مصیبتوں سے فارغ ہونے کے بعد جب سلطان کو ملک کی بہبودی اور زراعت کی ترقی کے کاموں میں مصروف ہونے کا پر اطمینان موقع ملا تو ساتھ ہی وہ مسلمانوں کو مراسم پرستی سے بچانے اور دین اسلام پر صحیح معنی میں عامل بنانے سے غافل نہیں رہا۔ جیسا کہ اوپر مفصل ذکر آچکا ہے مراسم پرست طبقہ اور تنگ نظر مولوی پہلے ہی اس سے کبیدہ خاطر اور رنجیدہ تھے۔ اب انھوں نے سلطان کی توجہ کو خصوصیت سے اس طرف مائل دیکھ کر مخالفتوں اور ریشہ دوانیوں میں ہمت صرف کرنا شروع کی۔ اگرچہ تاریخوں میں اس کی تفصیل موجود نہیں ہے لیکن اس بات کو تسلیم کر لینا زیادہ دشوار نہیں ہے کہ سلطان کے آخر عہد حکومت میں جس قدر بغاوتیں اور فتنے نمودار ہوئے ان سب میں ان تنگ نظر مذہبی لوگوں کی مخالفتوں کو ضرور دخل تھا اور باغیوں کی ہمت افزائی در پردہ ان لوگوں نے ضرور کی تھی۔ قتلغ خاں اگرچہ بظاہر خیر خواہ سمجھا جاتا تھا لیکن مذہبی خیالات اور پابندی مراسم کے معاملے میں وہ سلطان کا ہم خیال نہ تھا۔ قتلغ خاں کو شیعی یا تفضیلی ہونے کی وجہ سے اگرچہ مراسم پرست اور بدعتی سنیوں سے بھی کوئی خصوصی ہمدردی نہ تھی۔ لیکن خلیفہ عباسی کی سفارت کے آگئے اور سکہ پر صرف خلیفہ ہی کا نام باقی رہنے سے قتلغ خاں کی نفرت سلطان کے ساتھ عداوت سے

تبدیل ہوگئی اور اس نے پوری سرگرمی سے مذکورہ مراسم پرست بدعتی گروہ کی حمایت و سرپرستی شروع کردی۔ وہ سلطان کے نافذ کردہ ان احکام کو جن کا تعلق دینی اصلاح سے تھا پہلے ہی قابل عمل نہ جانتا تھا۔ سلطان اُستاد ہونے کی وجہ سے چونکہ اب تک اس کا ادب کرتا تھا لہٰذا اپنے احکام کی تعمیل میں اس کو زیادہ مجبور نہیں کر سکا یہی سلطان محمد تغلق کی سب سے بڑی حماقت اور سب سے بڑی کمزوری تھی۔ قتلغ خاں کا خلیفہ عباسی کی بیعت نہ کرنا اگرچہ سلطان کو سخت ناگوار تھا۔ لیکن اُس نے اغماض نظر ہی سے کام لینا مناسب سمجھا۔ ظاہر ہے کہ کوتاہ فہم مراسم پرست اور بدعتی لوگوں کو قتلغ خاں کے پاس دولت آباد میں زیادہ امن مل سکتی تھی اور یہی خاص وجہ ہے کہ دکن کے عالموں اور مسلمان اہل کاروں کی وفاداری سلطان محمد تغلق کے ساتھ بہت کمزور ثابت ہوئی جیسا کہ آئندہ ذکر آتا ہے سلطان نے اس تنگ نظر بدعتی طبقہ کو اول اول سختی اور درشتی سے خاموش کرنا چاہا اور جن کی شرارتوں کو حد سے متجاوز اور ناقابل اصلاح دیکھا انھیں قتل بھی کیا۔ لیکن جب اس کو ان لوگوں کی کثرت اور زبردست طاقت کا صحیح اندازہ ہوگیا تو اُس نے ایک نہایت نفیس اور عاقلانہ تدبیر سوچی وہ تدبیر یہ ہے کہ اس نے خلیفہ عباسی سے جس کو تمام مسلمان خلیفۂ برحق یقین کرتے تھے خصوصی تعلق پیدا کیا جس کا ابھی اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ سلطان نے اپنے آپ کو نائب خلیفہ بنا کر اور شیخ الشیوخ مصر کو ہندوستان بلا کر اپنے عقاید و اعمال و احکام و انتظام کی ان سے تصدیق و تحسین کرائی اور اس نیم ملا گروہ کی زبانیں بند کیں، ان لوگوں کا عوام پر زیادہ اثر تھا اور عوام، جن کو کالانعام کہا جاتا ہے۔ کسی ایسی ہی دلیل کو مان سکتے تھے جیسی کہ خلیفہ عباسی کے ایلچیوں اور فرستادوں کے آنے سے اُن کے سامنے پیش ہوئی۔ جو لوگ سلطان محمد تغلق کی مجبوریوں اور دقتوں کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے اُنھوں نے اس کی حماقتوں کی فہرست میں ایک یہ حماقت بھی شامل کردی ہے کہ اُس نے حاجی سعید حرمزی اور شیخ الشیوخ مصری کے سامنے اپنے آپ کو بے حد ذلیل کیا اور اُن کی حد سے زیادہ تعظیم و توقیر کی مگر جو لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ:۔

"THE WORLD IS THICKLY POPULATED WITH FOOLS"

وہ خوب جانتے ہیں کہ اس احمقوں کی دنیا میں عاقلوں کو مجبوراً کیسی کیسی حماقتوں کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے۔

محمد تغلق کے خلاف سازشیں اور مسلسل بغاوتیں

جس زمانے میں مصر سے حاجی سعید حرمزی خلیفہ کا فرمان۔ علم اور خلعت لے کر دہلی آئے اور اندرونی مخالفوں کی زبانیں بند ہوئیں تو عناد وعداوت کا مادہ دوسری طرف کو پھوٹ نکلا یعنی ان لوگوں نے سلطان کے خلاف خطرناک سیاسی سازشیں شروع کیں۔ پروفیسر گارڈنر براؤن اپنے مضمون میں لکھتے ہیں کہ سلطان کو معزول کر کے اس کے چچازاد بھائی فیروز تغلق کو تخت نشین کرنے کی سازش بھی مکمل ہو چکی تھی۔ ضیاء برنی اس سازش کا کوئی نمایاں اور صاف پتہ نہیں دیتا صرف اس قدر کہتا ہے کہ:۔

"سلطان محمد درآں چند سال کہ در دہلی ساکن بود بر سبیل مبالغت در کار سیاست بود وبداں سبب دیار ہائے مضبوط گشتہ از دست رفتہ وآنچہ مضبوط ماند دراں تخلل وتشتت افتاد واخبار بغاۃ وشطط ایشاں بسمع سلطان می رسید ودر شہر سیاست بر مزید می گشت واز بہر ہر کلمہ کہ براست ودروغ دیفسادو عناد از شخصے روایت می کردند آنکس بسیاست می پیوست ... وچند معتبر مسلماں در تتبع وتفحص اہل سیاست مشغول می بودند وخلق رامی کشانیدند وہر چند کہ سیاست در شہر بیشتر می شد خلق اطراف متنفر تر می گشت وفتنہا وبغی ہا بیشتر می زاد ودر ملک نقص ونقصان بیشتر بار می آورد وہر کرا سیاست می کردند او را شریر نام می نہادند"

چونکہ ہم اس بات سے واقف ہو چکے ہیں کہ ضیائے برنی کے خیالات سلطان محمد تغلق کی نسبت کس قسم کے تھے لہٰذا ہم کو اس کے مذکورہ ادائے بیان سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے بلکہ اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ دہلی میں باغیانہ خیالات پھیلانے اور بغاوت کی سازشیں کرنے والوں کی ایک جماعت ضرور موجود تھی جن کو شریروں کا خطاب دیا گیا تھا۔ ان شریروں اور باغیوں کا دور و دراز کے صوبہ داروں سے بھی ضرور کوئی تعلق تھا اور جب اُن کو دہلی میں سزا دی جاتی تھی تو صوبوں کے عامل سُن کر ناراض ہوتے تھے۔ ضیاء برنی کے ان الفاظ میں "می کشانیدند" مصدر کشودن سے مشتق اور بمعنی "می رہانیدند" یا "آزاد کنانیدند" استعمال ہوا ہے جس سے ثابت ہے کہ ان شریروں کی شرارتوں اور بغاوتوں کا حال معلوم ہونے پر

جب ان کو سزا دی جاتی تھی تو چند لوگ ایسے بھی تھے جو ان باغیوں کو سزا سے بچانے اور آزادی دلانے کی کوشش کرتے تھے یہ لوگ ضرور بااثر اور بڑے بڑے شاہی اہل کار اور شریروں کے ہمدرد ہوں گے۔ ان کو ضیاء برنی "معتبر مسلمان" کا خطاب دیتا ہے۔ ضیائے برنی نے ان شریروں یا ان پر عائد کئے ہوئے الزاموں کا مطلق پتہ نہیں دیا۔ وہ ان کو سزا دینے کی شکایت تو کرتا اور اس سزادہی کے بُرے نتائج بھی بتاتا ہے لیکن یہ نہیں بتاتا کہ ان کو کس جرم میں ماخوذ کرکے سزادی جاتی تھی اور ان پر کون سا جھوٹا الزام لگایا جاتا تھا۔ ضیا برنی کی اسی مشکوک طرز عمل سے شبہ گذرتا ہے کہ ان چند معتبر مسلمانوں میں ممکن ہے کہ فیروز تغلق بھی ہو۔ ایک سب سے بڑا قرینہ یہ بھی موجود ہے کہ سلطان محمد تغلق نے جب خواجہ نصیر الدین رحمہ اودھی المعروف بہ چراغ دہلی کو اپنی مصاحبت کے لئے مخصوص کیا تو انھوں نے سلطان کے پاس جانے سے انکار کیا۔ اس انکار کے لئے چونکہ وہ کوئی دلیل شرعی پیش نہیں کرسکے لہٰذا سلطان نے اصرار کیا۔ سلطان کا وزیر اعظم خواجہ احمد ایاز بھی حضرت نظام اولیاء سے اسی طرح خرقۂ خلافت حاصل کئے ہوئے تھا جس طرح کہ خواجہ نصیر الدین رحمہ کو خرقۂ خلافت حاصل ہوا تھا۔ نیز سلطان کے دربار میں شیخ الاسلام حضرت مولانا رکن الدین ملتانی رحمہ، مولانا علم الدین رحمہ ملک سعد الدین وغیرہ بہت سے ایسے لوگ موجود تھے جو حضرت نظام المشائخ رحمہ کے مخصوص دوستوں اور مریدوں میں تھے اور خواجہ نصیر الدین رحمہ سے کم مرتبہ نہیں سمجھے جاتے تھے، آخر خواجہ نصیر الدین رحمہ نے اپنے انکار کو مناسب سمجھکر سلطان کی خدمت میں جانا قبول کرلیا، چنانچہ ۷۵۲ھ کے سفر میں جبکہ سلطان محمد تغلق کا انتقال ہوا وہ سلطان کے ہمراہ موجود تھے، سلطان محمد تغلق کے مخالفوں نے خواجہ نصیر الدین رحمہ چراغ دہلی کا سلطان کے پاس جانا انکی توہین قرار دیکر حضرت نظام المشائخ رحمہ کے اکثر معتقدین کو سلطان کے خلاف بھڑکا دیا اور اس طرح صوفیوں کے بڑے طبقے نے تنگدل اور تنگ نظر مولویوں کے شریک ہوکر سلطان کی مخالفت میں سازشی جماعت کو بے حد طاقتور بنا دیا اس صوفی طبقہ کی فیروز تغلق نے تخت نشین ہوکر جو حد سے زیادہ مدارات کی ہے تنگ خیال اور بدعتی مولویوں کو جو حد سے زیادہ آزادیاں عطا فرمائی ہیں وہ فیروز تغلق کے شریک سازش ہونےکی دلیل ضرور بن سکتی ہے۔ اس قوی قرینے کے علاوہ ملا عبدالقادر بدایونی کا بیان صاف اور غیر مشکوک الفاظ میں اس سازش کے وجود پر مُہر تصدیق ثبت کردیتا ہے۔

بہرحال دارالسلطنت دہلی کے معزول شدہ فتوے گر اور انکے قدامت پسند ومراسم پرست معتقدین کا گروہ بیکار نہیں بیٹھا اور اب اسکی کوششوں نے بڑی خطرناک صورت اختیار کرلی سلطان محمد تغلق ان باتوں سے بے خبر نہ تھا اس نے ان

لوگوں کو جن پر جرم بغاوت ثابت ہوا سزائیں دیں اور ضیا برنی نے خوب دل کھول کر ماتم کیا اور اس کے گریہ ماتم نے لوگوں کو محمد تغلق کے ظالم بلکہ اظلم ہونے کا یقین دلایا۔ ان سازشوں اور سازشی لوگوں کے لئے دکن اور گجرات کے صوبوں کی آب و ہوا زیادہ موافق تھی سلطان کو بھی اب دولت آباد اور گجرات ہی کا زیادہ خیال تھا اُس نے ۷۴۲ھ میں قوام الملک نومسلم کو جو ملتان کی صوبہ داری کے بعد اب بدایوں کا عامل تھا۔ خانجہاں کا خطاب دے کر گجرات کی صوبہ داری پر مامور کیا۔ دولت آباد میں قتلغ خاں کا طرزِ عمل ان باغیانہ سازشوں کے لئے نشوونمائی کا موجب ثابت ہورہا تھا۔ سلطان کو قتلغ خاں کی بہت ہی رعایت مد نظر تھی جیسا کہ ضیاء برنی بھی لکھتا ہے کہ :-

شرائط تعظیم قتلغ خاں کہ پیش او در عنفوانِ شباب چیزے خواندہ بود چناں محافظت نمودے و مبالغت کردے کہ ہیچ شاگردے را از ہیچ استاد میسر نشود ۔

اب جب کہ معاملہ حد سے تجاوز کرنے لگا تو سلطان نے مجبور ہوکر ۷۴۲ھ میں قتلغ خاں کو دولت آباد سے معزول کرکے دہلی بلالیا اور قتلغ خاں کے ماتحت جو کئی چھوٹے چھوٹے صوبہ دار مقرر تھے ان کو بھی معزول کرکے دوسرے معتمد سرداروں کو اُن کی جگہ بھیج دیا۔ مذکورہ حالات میں یہ کوئی تعجب کی بات نہ تھی کہ سلطان محمد تغلق کو نومسلم سرداروں پر جو اس سازشی جماعت میں زیادہ رسوخ نہ رکھنے کی وجہ سے شامل نہ ہو سکے تھے زیادہ اعتماد تھا۔ بعض خاندانی مسلمان سردار بھی محمد تغلق کے ہم خیال اور معتمد تھے۔ ضیاء برنی ہر ایک نومسلم اور سلطان کے ہر ایک ہم خیال و وفادار سردار کو بُرا کہتا اور حقارت آمیز الفاظ سے یاد کرتا ہے۔ قوام الملک خانجہاں کی نسبت کہتا ہے کہ

"مطربہ بچہ بداصل راچناں برکشید کہ درجۂ او از درجات بسیاران ازملوک گذشت و گجرات و ملتان و بدایوں بدو داد"

اسی طرح تمام ان سرداروں کو جو قتلغ خاں کے مقرر کردہ صوبہ داروں کی جگہ مقرر ہوئے تھے بڑے جوش و طیش کے ساتھ گالیاں دیتا ہے۔ قتلغ خاں کا دولت آباد سے جدا ہونا اور وہاں نئے سرداروں کا مقرر ہونا بلاشبہ ضروری تھا لیکن یہ کام بہت دیر کے بعد ہوا حالانکہ اس تبدیلی کی بہت پہلے ضرورت تھی۔ سلطان نے قتلغ خاں کی اُستادی

کے ادب کو ملحوظ رکھ کر اس قدر زیادہ عرصہ تک تامل کیا کہ شرارت پیشہ لوگوں کی شرارت کا زہر بہت کچھ اثر کر چکا تھا۔ آئندہ پیش آنے والے واقعات سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس سازشی گروہ نے ہندو راجاؤں سے بھی جو جابجا ملک کے علاقہ جات پر قابض و حکمراں تھے سازباز کر لیا تھا اور ہندو اس باغیانہ سازش کو کامیاب بنانے اور اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے بخوشی آمادہ ہو چکے تھے۔

نومسلموں کی عزت افزائی اسلام چونکہ قوموں اور قبیلوں کے امتیاز کو تسلیم کرتے ہوئے بھی کسی کی ذاتی عزت و ذلت پر اثر انداز نہیں ہونے دیتا اور صرف تقوے یعنی اعمال صالحہ ہی کو موجب عزت قرار دیتا اور ترقی کی راہیں ہر قوم اور ہر قبیلہ کے لئے کھلی ہوئی چھوڑتا ہے لہذا مسلمانوں نے کبھی کسی قوم اور قبیلے کے لئے ترقی کے راستے بند نہیں کئے چنانچہ سلطان محمود غزنوی نے ایک ہندو حجام کو راجہ کا خطاب دے کر سپہ سالاری کا عہدہ عطا کیا جیسا کہ پہلی جلد میں ذکر آچکا ہے سلطان محمد تغلق نے بھی تلنگانہ کے راجہ رودر دیو کے ایک ہندو نوکر کو جو اپنی خوشی سے مسلمان ہو گیا تھا اول قوام الملک کا خطاب دے کر ملتان پھر بدایوں کا گورنر بنایا اور آخر میں خانجہاں کا خطاب دے کر صوبہ گجرات کا نائب السلطنت مقرر کیا۔ عہد غلاماں اور عہد خلجیہ میں ہندوؤں کی قوم کلال کے بعض افراد مسلمان ہو چکے تھے۔ ہندوؤں کی اس قوم کا مخصوص پیشہ چونکہ شراب فروشی تھا لہذا اُن کے اسلام قبول کر لینے کے بعد بھی عام مسلمان ان نومسلم کلالوں کو محض اس لئے حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے کہ ان کا آبائی پیشہ شراب فروشی تھا لیکن سلطان محمد تغلق جو قرآن و حدیث کا ایک متبحر عالم تھا کسی نومسلم کلال کو اس کی ذاتی قابلیتوں کے نتائج سے مایوس اور ترقیات سے محروم نہیں رکھ سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے عزیز الدین نامی نومسلم کلال کو اس کی ذاتی قابلیتوں کے نتائج سے مایوس اور ترقیات سے محروم نہیں رکھا تھا ــــ اور اسی عزیز الدین نامی نومسلم کلال کو اس کی دینی و دنیوی قابلیتوں کا اندازہ کر کے عزیز الملک کا خطاب دیا اور قتلغ خاں کو دولت آباد سے معزول کر دینے کے بعد مجد الملک تھانیسری کو اس کی جگہ دولت آباد کا وائسرائے مقرر کر کے اس کے ماتحت صوبوں میں زین الدین المخاطب بہ مخلص الملک۔ یوسف بغرا آخور بیگی عزیز الدین المخاطب بہ عزیز الملک اور عماد الملک وغیرہ کو مامور کیا۔ مخلص الملک،

اور یوسف بغرا تو مرہٹ کے صوبوں میں مقرر ہوئے اور عزیز الملک کو دہار کی حکومت سپرد کی۔ ان تمام صوبوں میں جہاں قتلغ خاں کی وجہ سے باغیانہ خیالات خوب نشو و نما پا چکے تھے ان جدید صوبہ داروں کا مقرر کرنا اور پُرانے صوبہ داروں کا یک لخت وہاں سے جدا کرنا اگرچہ نہایت ضروری بھی تھا مگر خطرہ سے خالی بھی نہ تھا۔ سلطان نے قتلغ خاں کی اُستادی کے مرتبہ کو اپنی جبلی شرافت کی وجہ سے ملحوظ رکھ کر اسے دولت آباد کی نیابت پر مسلسل سترہ سال تک مامور رکھا اور یہی سب سے بڑی غلطی تھی جو محمد تغلق سے ظہور میں آئی . . . عین الملک کی بغاوت معرض ظہور میں نہ آتی اور ۷۳۶ھ میں قتلغ خاں دولت آباد سے تبدیل ہو جاتا تو دکن اور گجرات میں وہ فتنے جنھوں نے سلطان محمد تغلق کو اس کے آخر ایام حیات میں پریشان کیا ہرگز برپا نہ ہوتے سلطان کے اصلاحی احکام اور علمی و دماغی نشو و نمائی کی کوششوں کا کوئی اثر قتلغ خاں کے ماتحت علاقے میں ظاہر نہ ہوا مخالفوں کی کوششوں کو سرسبز ہونے کا وہاں بخوبی موقعہ ملتا رہا اور سلطان سے نفرت پیدا کرنے والے خیالات لوگوں میں خوب شائع ہوتے رہے۔ اب جب کہ ۷۴۷ھ میں قتلغ خاں اور اس کے ماتحت صوبہ دار وہاں سے معزول کئے گئے تو امیران صدہ میں جن کو موجودہ زمانے کے تحصیل داروں یا تھانے داروں کا ہم رتبہ اہل کار سمجھنا چاہیے بڑی ہل چل پیدا ہوئی اور مالوہ و مرہٹ سے لے کر گجرات تک کے صوبہ داروں کا یک لخت اور یکایک معزول ہو جانا ان صوبوں کے امیران صدہ کی انتہائی تشویش کا موجب ہوا کیونکہ وہ ان معزول ہونے والے گورنروں کے سازباز میں شریک اور نئے آنے والے گورنروں سے نامانوس بلکہ متنفر تھے۔ ان مقرر ہونے والے صوبہ داروں میں چونکہ عزیز الملک (نو مسلم کلال) بھی تھا اور صدر گجرات کی نیابت پر قوام الملک کو پہلے بھیج دیا گیا تھا . . . . . . لہٰذا نہ صرف دہلی بلکہ دہلی کے ذریعہ تمام ملک میں اس مخالف جماعت نے جس کی سرپرستی قتلغ خاں اختیار کر چکا تھا اس بات کو شہرت دی کہ سلطان نے سفلہ پرستی پر کمر باندھ لی اور ایک کلال کو دہار کی گورنری عطا کی ہے۔ سلطان کو جس طرح اور باتوں کی اصلاح کا خیال تھا اسی طرح وہ اس قومی امتیاز کی ضرورت سے زیادہ اہمیت دینے کو بھی مراسم پرستی ہی کا ایک جزو سمجھتا تھا جس کا وہ جانی دشمن تھا۔ ضیائے برنی عزیز الملک کے مامور ہونے کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتا ہے کہ:۔

درآخر آں سال کہ قتلغ خاں را از دیوگیر در دہلی آوردند سلطان محمد عزیز خمار (کلال) کم اصل را ولایت دہار داد و تمامی مالوہ بدو تفویض کرد و چند لک تنکہ از جہت آنکہ او با قوت و شوکت شود در حق او مرحمت شد و در وقت رواں شدن آں بدبخت بے سعادت در پرداخت مصالح آں ولایت کہ بس طویل و عریض است سلطان او را ہر چیزے بدراہ می کرد و می فرمود و در آں معرض از زبان سلطان بیروں آمد کہ اے عزیز می بینی کہ ہر طرفے چہ گونہ بلغاک ہا پیدا می آید و فتنہ ہا می زاید و من می شنوم کہ ہر کہ بلغاک می کند از قوت امیر صدگان می کند و امیر صدگان از برائے غضب و غارت یار او می شوند آنگاہ بلغاکی را بلغاک کردن میسر گردد و تو دانی و امیر صدگان دہار کہ را میان ایشان شریر و فتنہ انگیز بینی چنانچہ دانی و توانی دفع کنی تا چنانچہ در کلہا ے آن عرصہ بدراہ شدہ بفراغ دل آں را بپرداخت توانی رسانید" و آں خاکسار بچہ از دہلی بہ تمشیت تمام رواں شدہ و بار زائے چند کہ بر وے آمدہ بودند و مقرب و کاردار اوشدہ بودند در دہار رفت و با جہاے اشرار مادر زاد در پرداخت مصالح دہار مشغول شد و روزے آں بد اصل زانیہ زادہ را در خاطر افتاد و بقیاس ہشتاد و اند نفر امیران صدہ و معارف حشم دہار را بگرانید۔

سلطان نے عزیز سے مخاطب ہو کر جو الفاظ کہے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ صوبہ دار اور قتلغ خاں محض اسی لیے معزول کیے گئے تھے کہ انھوں نے بغاوت کی تیاریاں مکمل کرلی تھیں اور امیرانِ صدہ کو بغاوت پر آمادہ کرچکے تھے۔ قتلغ خاں کے معزول ہو کر دہلی آنے کے بعد سلطان نے جو انتظام مذکورہ صوبوں کا کیا تھا اس انتظام کو ناکام رکھنے کے لئے ایک طرف تو خود ان صوبوں کے امیرانِ صدہ تھے جن کے قبضے اور اثر میں فوج اور رعایا دونوں تھیں دوسری طرف وہ مخالف جماعت تھی جو دہلی اور اور ملک کے دوسرے شہروں میں پھیلی ہوئی تھی جس میں مذہبی طبقہ کے تنگ نظر لوگ شامل تھے۔ اگرچہ سلطان کے بروقت خبردار ہوجانے سے بغاوت کا برپا ہونے والا طوفان قلیل عرصہ کے لئے رُک گیا لیکن یہ فاسد مادہ ہمیشہ کے لئے دبا نہیں رہ سکتا تھا۔ نہ آسانی سے تحلیل ہوسکتا تھا۔

جس طرح بعض پھوڑوں میں شگاف دینے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔ سلطان بھی اسی طرح عزیز الملک سے مذکورہ الفاظ کہنے کے لئے مجبور ہو گیا تھا۔

عزیز الملک کی بے احتیاطی

عزیز الملک جس کو ضیاء برنی ہر جگہ عزیز خمار یا عزیز کلال لکھتا ہے جب دھار پہنچا تو اُس نے وہاں کے امیرانِ صدہ کو بے حد سرکش اور نافرمان پایا۔ چونکہ اس کو رعب سلطنت قائم رکھنے اور سیاست وشوکت سے کام لینے کی اجازت اور ہدایت تھی لہذا اُس نے بلا تامل امیرانِ صدہ کی ایک بڑی اور سرکش جماعت کو کسی بہانے سے ایک جگہ بُلا کر تہ تیغ کردیا۔ یہ خبر ملک میں مشہور ہوئی۔ مخالف سازشی جماعت نے ساتھ ہی اس بات کو بھی شہرت دے دی کہ گجرات و دولت آباد و مرہٹ وغیرہ کے امیران صدہ کو بھی چن چن کر اسی طرح ہلاک کیا جائے گا اور کوئی بھی اپنی جان نہ بچا سکے گا اگرچہ مذکورہ صوبوں کے امیرانِ صدہ خطاوار ضرور تھے اور بغاوت پر آمادہ ہو چکے تھے۔ لیکن سلطان ہرگز یہ نہیں چاہتا تھا کہ سبھی کو ہلاک کیا جائے بلکہ اس کی خواہش یہ تھی کہ جو راہ راست پر آکر خیالاتِ فاسدہ سے باز رہے اسے کچھ نہ کہا جائے۔ عزیز خمار کی ناتجربہ کاری میں کوئی شک نہیں امیرانِ صدہ کی ایک بڑی جماعت کو جاتے ہی بیک وقت قتل کرنا احتیاط کے خلاف تھا لیکن اب جبکہ اس سے ایک فعل سرزد ہو چکا تھا۔ اس کو ملامت کرنا بھی قرین مصلحت نہ تھا۔ سلطان کی اس غلطی کو بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس نے ایک ناتجربہ کار شخص کو جس سے اب تک کوئی بڑا کارنامہ ظہور میں نہیں آیا تھا اتنا بڑا عہدہ سپرد کیا۔ سلطان بھی اپنی اس غلطی کو محسوس کر چکا تھا کیونکہ گجرات کے بعض امیران صدہ نے جب دھار کے امیرانِ صدہ کی ہلاکت کا حال سنا اور علم بغاوت بلند کرکے شاہی خزانے کو جو دہلی کی جانب آرہا تھا لوٹ لیا اور اس خبر کو سُن کر عزیز خمار دھار سے گجرات کے امیران صدہ کی سرکوبی کے لئے روانہ ہوا تو سلطان نے ناپسند کیا اور کہا کہ عزیز ناتجربہ کار ہے اسے گجرات کی طرف نہیں جانا چاہیے تھا۔ سلطان نے عزیز خمار کی ناتجربہ کاری اور بے احتیاطی کا اندازہ کرکے اس خوف سے کہ گجرات کے وائسرائے خانجہان سے بھی جو عزیز کی طرح نومسلم ہے کوئی ایسی ہی کارروائی سرزد نہ ہو اس کو اپنے پاس دہلی طلب کیا اور اس کی جگہ شیخ معزالدین پسر شیخ علاءالدین اجودھنی کے بھیجنے کا ارادہ کیا۔

دہار کے اس واقعہ نے ماؤف علاقے کے تمام باغیوں کو جو ابھی تک خفیہ تیاریوں میں مصروف تھے بے پردہ ہو کر میدان میں نکل آنے کا موقع دے دیا۔

باب ہفتم
محمد تغلق کا آخر عہد حیات

سفر گجرات گجرات سے خان جہان خزانہ اور گھوڑے لے کر دہلی کو آتا تھا۔ اُس کے ساتھ گجرات کے بہت سے سوداگر بھی اپنا قیمتی مال لئے ہوئے دہلی کو آرہے تھے دبھوئی اور برودہ کے امیرانِ صدہ نے بغاوت کرکے چھاپہ مارا۔ سوداگروں کا تمام مال اور شاہی خزانہ لوٹ لیا۔ خان جہان نے بمشکل اپنی جان بچا کر نہروالہ میں پناہ لی ان باغی امیران صدہ نے اس لوٹ کے مال سے اپنے آپ کو خوب طاقتور بنا کر کنبہات وغیرہ پر قبضہ کیا اور تمام ملک گجرات میں شورش و بدامنی پھیلادی۔ یہ خبر بماہ رمضان ۷۴۵ھ سلطان کے پاس دہلی پہنچی۔ سلطان نے شیخ معزالدین کو ایک ہزار سوار دے کر فوراً گجرات کی جانب روانہ کردیا اور دوسرے روز خود بھی یہ سمجھ کر کہ بغیر میرے جائے سرکشی کا سدباب نہ ہوگا مع فوج گجرات کی جانب روانہ ہوگیا۔ ۱۶ رمضان ۷۴۵ھ کو جب کہ سلطان دہلی سے صرف پندرہ کوس کے فاصلے پر پہنچا تھا عزیزالملک صوبہ دار دھار کا عریضہ پہنچا کہ گجرات کے امیرانِ صدہ نے بغاوت و سرکشی کا اظہار کیا ہے، میں چونکہ نسبتاً گجرات کے قریب ہوں، لہذا گجرات کے امیرانِ صدہ کو سزا دینے کے لئے بلا تامل روانہ ہورہا ہوں، سلطان نے عزیزالملک کا عریضہ پڑھکر فرمایا کہ

"عزیز طریقۂ حرب نداند عجب نباشد کہ از دست آن باغیان تلف شود"

یہ بات بھی قابل تذکرہ ہے کہ جب سلطان دہلی سے روانہ ہونے لگا تو قتلغ خاں نے ضیاء برنی کے ذریعہ سلطان کے پاس پیغام بھیجا کہ گجرات کے سرکشوں کو سزا دینے کے لئے سلطان کے تکلیف فرمانے کی ضرورت نہیں مجھے حکم دیا جائے کہ میں وہاں جاکر سب کو گرفتار کرکے لے آؤں۔ ضیاء برنی کہتا ہے کہ اس پیغام کو سن کر سلطان نے کوئی جواب نہیں دیا اور خود فوج لے کر روانہ ہوگیا اور خواجہ جہاں ملک احمد ایاز وزیر اعظم اور اپنے چچا زاد بھائی فیروز تغلق کو دہلی میں چھوڑ گیا۔ سلطان کا قتلغ خاں کے پیغام کو سن کر خاموش رہنا اور کوئی جواب نہ دینا صاف اس بات کو ظاہر کر رہا ہے کہ وہ قتلغ خاں سے سخت ناراض تھا مگر چونکہ قتلغ خاں استادرہ چکا تھا اس لئے اس کو معزول کرنے کے سوا اور کوئی سزا نہ دے سکا اور اس کی پیدا کی ہوئی مصیبتوں کو دور کرنے کے لئے خود دہلی سے روانہ ہوا قتلغ خاں کو اب دہلی کے افسردہ خاطر مولویوں اور صوفیوں یعنی مراسم پرستوں کے سر جوڑ کر خود اُن کی رہنمائی اور رہبرواری کا آزاد موقعہ مل گیا۔ عزیز کلال دہار سے گجرات پہنچا اور وہاں باغیوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔ سلطان نہر والہ میں پہنچا جہاں خان جہاں سلطان کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔ سلطان نے شیخ معزالدین کو باغیوں کی گرفتاری اور سزادہی کے کنبھات کی جانب روانہ کیا۔ خود بہروچ جاکر وہاں کے امیرانِ صدہ کا لشکر فراہم کرکے خان جہان کے سپرد کیا اور حکم دیا کہ دولت آباد اور گجرات کی سرحد پر پہنچ کر گجرات کے باغیوں کو دولت آباد کے علاقے میں داخل ہونے سے روکو۔ باغیوں نے جو عزیز الملک کو قتل کرکے بہت دلیر ہوگئے تھے مقابلہ کیا مگر شیخ معزالدین نے سب کو شکست دی بعض گرفتار ہوکر قتل ہوئے بہت سے فرار ہوکر حسب توقع دولت آباد کی جانب بھاگے۔ دریائے نربدا کے کنارے خان جہان نے ان مفروروں کو روکا کچھ تو گرفتار ہوسکے کچھ دیوگیر (دولت آباد) کے علاقے میں پہنچ کر وہاں کے امیران صدہ سے جاکر مل جانے میں کامیاب ہوگئے۔

دیوگیر (دولت آباد) کی بغاوت

گجرات کے ان باغیوں نے دولت آباد پہنچ کر وہاں کے امیران صدہ کو جو پہلے ہی سے بغاوت پر آمادہ تھے اور زیادہ تیز کر دیا گجرات میں تو سلطان نے امن وامان قائم کر دیا لیکن اب دولت آباد کی حالت خطرناک ہوگئی اور باغیوں نے دولت آباد کے گورنر مجیدالملک کو قتل کر دیا۔ سلطان نے بہروچ کے عامل امیر حسین المخاطب بہ نظام الملک

کو جو امیر حسن المخاطب بہ قتلغ خاں مذکور کا بھائی تھا دیو گیر بھیجا نظام الملک سے بھی وہاں کچھ نہ ہو سکا۔ نظام الملک چونکہ قتلغ خاں کا بھائی تھا اس لئے باغیوں نے اس کے ساتھ بہت رعایت کا معاملہ کیا یعنی اس کو گرفتار کر کے نظر بند تو کیا مگر جان سے نہ مارا۔ باقی ان تمام سرداروں کو جو سلطان نے اس علاقہ میں جدید انتظام کے ماتحت مقرر کئے تھے اور جو سلطان کے وفادار تھے چن چن کر قتل کیا اور امیران صدہ میں سے ایک امیر مسمی اسمٰعیل خاں کو اپنا سرگروہ یا بادشاہ بنا کر دولت آباد کے متعلقہ تمام علاقے کو آپس میں تقسیم کر لیا۔ یہ خبر سن کر سلطان بھروچ سے معہ لشکر دولت آباد کی جانب روانہ ہوا۔ باغیوں نے جو خوب طاقت ور ہو چکے تھے جم کر مقابلہ کیا آخر شکست کھا کر دو حصوں میں تقسیم ہو گئے ایک حصہ تو اسمٰعیل خاں کی ماتحتی میں شہر دولت آباد کے متصل قلعہ دولت آباد میں محصور ہوا۔ دوسرا حصہ جس میں حسن گانگو بھی شامل تھا ملک میں منتشر ہو کر موجب مشکلات بنا یعنی تمام امیران صدہ اپنے اپنے متعلقہ پرگنوں میں جا کر مضبوط ہو بیٹھے۔ نظام الملک باغیوں کی قید سے نکل کر سلطان کی خدمت میں پہنچ گیا۔ سلطان نے شہر دولت آباد میں مقیم ہو کر ملک میں امن و امان اور نظام حکومت قائم کرنے اور باغیوں کو گرفتار و قتل کرنے کا انتظام شروع کیا۔ عماد الملک کو ایک لشکر دے کر گلبرگہ کی جانب روانہ کیا اور حکم دیا کہ وہاں مقیم ہو کر مفرور باغیوں کی گرفتاری کا بندوبست اور اس نواح کے شریروں کا قلع قمع کرو اسی طرح مرہٹ وغیرہ علاقوں میں جدید امرا مقرر کئے۔ دیو گیر کے اکثر امیران صدہ ابھی تک گرفتار نہیں ہو چکے تھے کچھ بھاگ کر گجرات کی طرف چلے گئے تھے۔

طغی نمک حرام سلطان ملک کے بندوبست اور باغیوں کے تدارک میں مصروف تھا اسی حالت میں خبر پہنچی کہ طغی نامی غلام دہلی سے اوباشوں اور بدمعاشوں کا ایک لشکر لے کر گجرات پہنچ گیا۔ گجرات کے شریروں اور دیو گیر و مرہٹ کے مفروروں کو بھی اپنے ساتھ شامل کر کے گجرات میں علم بغاوت بلند کر دیا اور گجرات کے امیران صدہ ہی نہیں بلکہ وہاں کے ہندو راجہ بھی اس کے شریک و معاون ہو گئے اور اس نے گجرات کے صوبہ دار شیخ معز الدین کو گرفتار کر لیا۔ یہ طغی نمک حرام سلطان کا غلام اور دربار سلطانی کے چوب داروں اور نقیبوں کا افسر تھا جو قتلغ خاں کی سازش میں شریک

ہوکر دہلی میں اس کا دستِ راست بن چکا تھا اور قتلغ خاں کی ہدایت اور تجویز کے موافق دہلی سے ایک جمعیت لے کر گجرات کی طرف روانہ ہوا تھا۔ دولت آباد کے صوبہ کا انتظام مکمل نہ ہونے پایا تھا اور اسمٰعیل خاں بھی جو قلعہ دولت آباد میں محصور تھا ابھی گرفتار نہ ہو چکا تھا کہ طغی نمک حرام کی اس شرارت اور گجرات کی بغاوت کا حال سُن کر دولت آباد میں چند امیروں کو انتظام کے لئے چھوڑ کر خود سلطان دولت آباد سے بھروچ کی جانب روانہ ہوا جہاں طغی اپنی جمعیت کو لئے ہوئے پڑا تھا۔ پادشاہ کی آمد کا حال سُن کر وہ بھروچ سے کنبھات کی جانب فرار اور سلطان بھروچ میں داخل ہوا۔ اسی زمانے میں دہلی سے ضیاء برنی بطور ایلچی سلطان کی خدمت میں پہنچا اور فتح دیوگیر کی مبارکباد پیش کی۔ اب حالت یہ تھی کہ سلطان کی فوج میں، سلطان کے مصاحبوں میں سلطان کے سرداروں میں، اور گجرات و دیوگیر کے ہر ایک شہر میں کوئی نہ کوئی شریر اور کوئی نہ کوئی باغی پوشیدہ یا علانیہ ضرور موجود تھا باغیوں کی یہ کثرت اور سازشوں کا جال اسی گروہ کی کوششوں کا نتیجہ تھا جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے اور جس کا لیڈر قتلغ خاں اور جس کا سرگرم رکن ہمارا مایۂ ناز مورخ ضیاء برنی تھا۔

طغی نمک حرام کا سلطان دہلی سے روانہ ہونے کے بعد جمعیت کثیر بہم پہنچانا اور اس وقت جب کہ سلطان دولت آباد کے انتظام میں مصروف تھا گجرات میں پہنچ کر از سرِ نو فتنہ برپا کرنا اور دیوگیر کے باغیوں میں اس طرح دوبارہ جان ڈال دینا صاف اس بات کو ثابت کر رہا ہے کہ گجرات و دیوگیر کی بغاوتوں کا سلسلہ دہلی سے وابستہ تھا جہاں قتلغ خاں دیوگیر سے معزول شدہ پہنچا ہوا تھا۔ اور سلطان کی روانگی کے وقت اس بات کی کوشش ضیاء برنی کے ذریعہ کر چکا تھا کہ کسی طرح دہلی سے گجرات پہنچ جائے۔ سلطان یقیناً اس کے مافی الضمیر کا صحیح اندازہ کر چکا تھا اور اسی لئے جواب میں ایک لفظ بھی کہے بغیر روانہ ہو گیا تھا۔ دہلی میں معزول و مردود شدہ تنگ ظرف مفتیوں حسد پیشہ اور دوزخ در بغل مولویوں اور صوفیوں اور ان کے جاہل معتقدوں کی کافی جمعیت موجود تھی قتلغ خاں کے لئے یہ کچھ بھی دشوار نہ تھا کہ طغی نمک حرام کو اس طرح دہلی سے گجرات کی طرف روانہ کر کے سلطان کے بنے بنائے کام کو بگاڑ دے۔ یہ قتلغ خاں ہی کی تدبیر و سعی کا نتیجہ تھا کہ طغی نمک حرام کے گجرات پہنچتے ہی وہاں کے شریر اور ہندو راجہ اس کے ہمدرد ہوا خواہ بن گئے۔ ضیاء برنی کی انتہائی چالاکی یہ ہے کہ وہ طغی کو باغی اور نمک حرام سب کچھ کہتا ہے لیکن طغی نمک حرام کے دہلی سے

بعزم فساد گجرات آنے کو صاف اُڑا جاتا ہے اس کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ طغی پہلے ہی سے گجرات میں موجود تھا اور سلطان کی غیر موجودگی میں موقع پاکر اس نے علم بغاوت بلند کیا تھا۔ طغی گجرات میں کب آیا اور کس تقریب سے وہاں موجود تھا اس کا کچھ پتہ نہیں دیتا۔ ضیاء برنی کا یہ مہمل بیان صاف بتلا رہا ہے کہ ضیاء برنی طغی نمک حرام کے دہلی سے اس نازک وقت میں بعزم فساد آنے کو خاص طور پر چھپانا چاہتا ہے۔ مگر فرشتہ اپنی تاریخ میں سلطان علاء الدین حسن گانگو بہمنی کے تذکرہ میں صاف لکھتا ہے کہ:-

"دریں اثنا از دہلی خبر رسید کہ طغی نام غلامے جماعتے از اوباش واجلاف برخود جمع آوردہ و راہ مخالفت و طغیان سپردہ بعزم گجرات بتعجیل ہرچہ تمامتر روانہ شدہ است سلطان محمد تغلق شاہ چوں ایں خبر شنید خود متوجہ گجرات شد۔"

یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ طغی نمک حرام دہلی سے اوباشوں کو ہمراہ لے کر بجانب گجرات جس طرف کہ سلطان خود موجود ہے روانہ ہوتا ہے حالانکہ اگر اس کا منشا بغاوت سے خود حکومت و سلطنت حاصل کرنا ہوتا تو وہ بنگالہ یا پنجاب یا بندیل کھنڈ یا کسی ایسی ہی سمت جاتا، جہاں سلطان سے زیادہ دور ہو جاتا اور سلطان وہاں بہت دنوں کے بعد پہنچ سکتا لیکن وہ تو دیدہ و دانستہ گویا موت کے منھ میں جا رہا تھا پس اس میں کیا شک کیا جا سکتا ہے کہ طغی نمک حرام ایک فدائی کی حیثیت سے سازشی مشن کو کامیاب بنانے کی کوشش میں شہید یا غازی بننے کے لئے دہلی سے روانہ ہوا تھا اور اس کے جاہل ہمراہی بھی سب بخیال خویش اپنی جانیں قربان کرنے اور شہید ہونے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ انھیں ایام میں ضیاء برنی بھی ایلچی بن کر سلطان کی خدمت میں پہنچ چکا تھا۔ سلطان نے ایک روز ضیاء برنی سے جو گفتگو کی اس کو ضیاء برنی ان الفاظ میں نقل کرتا ہے کہ:-

"وسلطان مراگفت کہ می بینی کہ امیران صدہ حرام خوار چہ گونہ فتنہ ہا می انگیزند اگر من یک جانب فراہم می آرم و سرِ ایشاں رفع می کنم از طرف دیگر بلا می انگیزند کہ اگر من دراول نفر موودے کہ یکبارگی امیران صدہ دیوگیر

وگجرات را از میان بردارند چند بن در ماندگیہا از ایشاں مرا پیش نیامدے
وہمیں طغی حرام خوار را کہ غلام من ست اگر من سیاست فرمودے یا او را
بیادگار بر بادشاہ عدن بفرستادے ایں فتنہ وبغی ازو در وجود نیامدے"

شاید سلطان کو اس کا وہم وگمان بھی نہ تھا کہ میں جس شخص کو اپنا دردِ دل سنا رہا ہوں وہ خود شریروں اور باغیوں کو کامیاب بنانے کی کوشش میں دہلی سے چل کر لشکر شاہی میں پہنچا ہے۔ سلطان نے بھروچ میں پہنچ کر ملک یوسف بغرا کو طغی کے تعاقب میں روانہ کیا۔ کنبہات میں مقابلہ ہوا۔ ملک یوسف بغرا معرکۂ جنگ میں کام آیا۔ اس کے بعد طغی نے شیخ معزالدین کو بھی جو اس کی قید میں تھا قتل کر دیا۔ یہ سن کر سلطان خود بھروچ سے کنبہات کی جانب روانہ ہوا طغی کنبہات سے بھاگ کر اساول پہنچا۔ سلطان اساول کی جانب متوجہ ہوا تو وہ وہاں سے فرار ہوکر نہروالہ پہنچا۔ غرض طغی نے کہیں بھی جم کر سلطانی فوج کا مقابلہ نہیں کیا۔ تھوڑے سے سواروں کے ساتھ جنگ وجدال میں مصروف تھا۔ چونکہ ہر شہر اور ہر قصبے میں اس کو امداد دینے والے شریر موجود تھے لہٰذا سلطانی لشکر کی نقل وحرکت سے بروقت واقف ہو جانے اور خود ایک مقام سے دوسرے مقام پر بآسانی بھاگ جانے کی سہولت اُسے میسر تھی اور اسی لئے اس کی گرفتاری دشوار ثابت ہوئی ؎

مگس را کے تواں کشتن بشمشیر
چگونہ پشہ را سیلی زند شیر

گجرات کا انتظام اور بغاوت کا استیصال

سلطان نے بارش کی وجہ سے چند روز اساول میں قیام کیا طغی نمک حرام نے نہروالہ میں باغیوں کی زبردست جمعیت فراہم کی اور نہروالہ سے نکل کر اساول کی طرف چلا۔ یہ خبر سن کر سلطان فوراً اساول سے جب کہ خوب بارش ہو رہی تھی طغی کی سزادہی کے لئے روانہ ہوا۔ آخر مقابلہ ہوا اور طغی شکست کھا کر نہروالہ کی طرف بھاگا۔ پالنو کے قریب باغی سلطانی لشکر کے ہاتھ میں گرفتار ہو کر مقتول ہوئے طغی نہروالہ سے اپنا ساز وسامان لے کر بھاگا اور گرنار کے راجہ رائے کھنگار کے پاس جو اس کا ہمدرد وحلیف بن چکا تھا چلا گیا۔ سلطان طغی کے فرار ہو جانے کے بعد

نہروالہ میں پہنچا اور حوض سہسلنگ کے چبوترے پر قیام کرکے گجرات کے انتظام میں مصروف ہوا۔ چند ہی روز میں گجرات کے اندر امن و امان قائم ہو گیا۔

"سلطان در نہروالہ آمد و در چوترہ حوض سہسلنگ نزول فرمود و در پرداخت مصالح ولایت گجرات مشغول شد و مقدمان درانگان و مہتگان گجرات در بندگی درگاہ درمی آمدند و خدمت ہا می آوردند و جامہ وانعام می یافتند چنانکہ در مدت نزدیک خلق فراہم آمد و از تشمت و از تفرق برست و رعایا از غصب و غارت طغاۃ خلاص شد۔" (برنی)

طغی نمک حرام کے کچھ ساتھی جو دہلی سے ہمراہ آئے تھے مندل اور ٹیری کے راجہ کی خدمت میں پہنچے کیونکہ وہ بھی ان باغیوں کا حلیف تھا۔ راناے مندل وٹیری نے یہ دیکھکر کہ سلطان محمد تغلق کے مقابلے میں باغیوں کا کامیاب ہونا دشوار ہے۔ ان باغیوں کے سر کاٹ کر سلطان کی خدمت میں بھجوا دیتے اور خود بھی اپنے گناہوں کی معافی کے لئے حاضر ہو گیا۔ سلطان نے اس کو خلعت و انعام دے کر اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔ سلطان کے پاس نہروالہ میں خبر پہنچی کہ عماد الملک کو بے دخل کرکے باغیوں نے گلبرگہ پر قبضہ اور حسن گانگو کو اپنا بادشاہ بنا لیا اور حسن گانگو نے دولت آباد آکر دولت آباد سے بھی سلطانی اہل کاروں کو بے دخل کر دیا۔ غرض دیوگیر و مرہٹ کا تمام علاقہ سلطانی قبضے سے نکل گیا۔ یہ خبر سن کر سلطان نے ملک احمد ایاز وزیر اعظم کو جو سلطان کا بڑا خیر خواہ اور مدبر سردار تھا دہلی سے اس لئے طلب کیا کہ اسے دولت آباد کی جانب بھیجے اور خود گجرات کا بندوبست کرے جہاں طغی نمک حرام گرنار کے راجہ کی حمایت میں ابھی تک سلامت موجود تھا اور گرنار کی جانب فوج کشی ہونی ضروری تھی۔

دکن کی خودمختاری اور وہاں کے ہندوؤں کی خوش نصیبی

اس جگہ یہ بتادینا نہایت ضروری ہے کہ دکن کے ہندو راجاؤں نے جو سلطنتِ اسلامیہ کی غلامی و فرماں برداری کا حلقہ اپنی گردن میں ڈالے ہوئے تھے جب یہ دیکھا کہ مرہٹ و دولت آباد وغیرہ کے مسلمان سردار اور مسلمان امیرانِ صدہ ہی سلطان کے خلاف علم بغاوت بلند کر رہے ہیں تو کرشنا نایک ابن رُدر دیو اور بلال دلو وغیرہ کے زیر اہتمام ایک جگہ جمع ہو کر اپنی

خودمختاری کے لئے تجاویز سوچیں اور بیجانگر کے آباد کرنے اور دکن کے جنوبی حصہ سے مسلمان کا عمل دخل اٹھا دینے کا تہیہ کر کے حسن گانگو بہمنی کے ساتھ ہی اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ اس کے متعلق فرشتہ کی تحریر کو سب سے زیادہ مستند سمجھنا چاہیے کیونکہ وہ دکن کا باشندہ اور وہاں کے تاریخی حالات سے بخوبی واقفیت رکھتا تھا۔ فرشتہ لکھتا ہے کہ:۔

"دریں وقت کشنا نایک پسر ردر دیو کہ در نواحی ورنگل می بود جریدہ نزد بلال دیو کہ رائے عظیم الشان کرناٹک بود رفتہ گفت مسلمانان در دیار تلنگ و کرناٹک داخل شدہ ارادہ دارند کہ یکبارہ مارا مستاصل سازند دریں باب فکرے باید نمود بلال دیو جمیع اعیان مملکت را حاضر ساختہ مشورت طلبید و بعد از تفکر و امعان نظر قرار یافت کہ بلال دیو جمیع ممالک خویش را درعقب گذاشتہ خود را در سرحد راہ سپاہ اسلام تخت گاہ سازد و معبر و دھور سمدر و کنپلہ از تصرف مسلمانان درآوردہ و کشنا نایک تصرف نمودہ ورنگل را نیز دریں ایام کہ فرصت است از حوزۂ دیوان دہلی درآوردہ بلال دیو در کوہستان سرحد خود درجائے صعب شہرے بنام پسر خود بیجن رائے بنا کرد کہ مشہور بہ بیجن نگر گشت و رفتہ رفتہ از کثرت استعمال بیجانگر شد و پیادہ و سوار بسیار ہمراہ کشنا نایک کردہ نخست ورنگل را قابض شدہ و ملک عماد الملک و زیر گریختہ بہ دولت آباد آمد بعدہ بلال دیو کشنا نایک را کمک دادہ از دو طرف رایان معبر و دھور اسمدر را کہ از قدیم الایام باج گذار عالم کرناٹک بودند از تصرف مسلمانان برآوردند و از ہر طرف فتنہ خفتہ بیدار گشت"

یوں سمجھنا چاہیئے کہ بدبخت مسلمانوں یعنی نفس پرست شریروں کی سازشوں نے دکن کے وسیع ملک کو ہندوستان کی اسلامی شہنشاہی سے جدا کر کے بیک وقت دکن میں دو خودمختار حکومتیں قایم ہونے کا سامان بہم پہنچایا جن میں سے ایک اسلامی اور دوسری ہندو حکومت تھی جس کا مفصل تذکرہ آگے اپنے مقام پر آئے گا۔ ہندؤں کو حسن گانگوی کے خودمختار ہونے سے بے حد فائدہ پہنچا۔ اسی لئے ہندؤں نے حسن گانگوی کو

علم بغاوت بلند کرنے میں بخوبی مدد دی۔

"راجہ مملکت تلنگ (کشنا نایک) کہ از دست سلطان محمد تغلق شاہ خونین دل بود از کولاس پانزدہ ہزار پیادہ بمدد حسن کانگوی بہمنی فرستادہ" (فرشتہ)

دکن میں بہمنی سلطنت کا ضرور قایم ہونا مقصد اسلامی کے لئے تو بے حد مضر تھا لیکن بیجانگر کی ہندو ریاست خود مختار ہو کر آئندہ عرصہ دراز تک کے لئے مسلمانوں کے حملوں سے محفوظ اور محکوم بننے سے بے خوف ہو گئی اور یہ سب نتیجہ تھا مسلمانوں کی اس نا عاقبت اندیشی کا جس میں وہ آج بھی مبتلا پائے جاتے ہیں۔

ملک احمد ایاز جب دہلی سے روانہ ہو کر سلطان کی خدمت میں پہنچ گیا تو معلوم ہوا کہ حسن گانگو کے پاس باغیوں کی بہت بڑی جمعیت فراہم ہو چکی ہے اور دکن کے تمام ہندو راجاؤں نے بھی متفق ہو کر حسن گانگوی کو مدد دینے اور سلطان دہلی کے مقابلے میں بغاوت اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ یہ حالات معلوم ہونے کے بعد سلطان نے ملک احمد ایاز کو اس طرف بھیجنا مناسب نہ سمجھکر مصلحت اسی میں سمجھی کہ گجرات کا بندوبست مکمل اور مضبوط کرنے کے بعد خود ہی دولت آباد کی طرف جا کر دکن کے فتنے کو مٹائے اور وہاں کے باغیوں کا مکمل استیصال کرے۔ چنانچہ دولت آباد کی مہم کو سلطان نے ملتوی کر دیا اور گرنار کی طرف متوجہ ہوا۔ رانائے کھنگھار۔ اور رانائے گرنار اور طغی نے مل کر مقابلہ اور مدافعہ کی کوشش کی اور جا بجا ہر قسم کی مضبوطی کر لی۔ افواج سلطانی نے ان باغیوں کو شکستیں دیں۔ گرنار کے راجہ نے اپنی ہلاکت یقینی دیکھکر چاہا کہ طغی کو گرفتار کر کے سلطان کے پاس بھیج دے اور اس طرح سلطان کو رضامند کرے طغی کو راجہ کا یہ ارادہ قبل از وقت معلوم ہو گیا۔ اور اس نے اپنے لئے حفاظت اور فرار کی راہیں تلاش کیں۔ آخر آخر طغی تو بھاگ کر جام ٹھٹھہ کے پاس چلا گیا۔ کھنگھار اور گرنار کے رانا گرفتار ہو کر سلطان کی خدمت میں آئے اور سلطان نے ایک دوسرا ہندو راجہ اپنی طرف سے گرنار میں مقرر کیا جس کو ضیاء برنی منڈلہ گرنار کے نام سے یاد کرتا ہے۔ سلطان نے گرنار فتح کرنے کے بعد اس طرف کے جزیروں کو بھی سلطانی علاقے میں شامل کیا۔ اس طرح تمام ملک گجرات کا انتظام درست ہو گیا اور اس انتظام و اہتمام میں ایک سال گذر کر ۷۵۱ھ شروع ہوا۔ اسی عرصہ میں خبر پہنچی کہ دہلی میں تتلغ خاں کا انتقال ہو گیا، اپنے اس نا مہربان

استاد کے مرنے کی خبر سُن کر سلطان نے اظہارِ ملال کیا اور واپس ہو کر مقام کوندل میں جو ٹھٹھہ کے راستے میں ہے مقیم ہوا۔ وزیر اعظم خواجہ جہان ملک احمد ایاز اور خاقِ جہان دونوں کو دہلی کی جانب رخصت کیا۔ جس کا سبب غالباً یہ تھا کہ اس کے پاس دہلی میں سازشوں کے نشو و نما پانے اور فیروز تغلق کو تخت نشین کرنے کی تجویزوں کے حالات پہنچ چکے تھے۔ چنانچہ اس نے ملک احمد ایاز کو حکم دیا کہ دہلی جاتے ہی فیروز تغلق، بعض مشائخ خداوند زادہ بنت تغلق شاہ اور بعض علماء کو لشکر سلطانی کی جانب روانہ کر دو چنانچہ دہلی سے یہ لوگ روانہ ہو کر سلطانی لشکر میں پہنچ گئے۔ ملا عبدالقادر بدایونی منتخب التواریخ میں یہ روایت لکھتے ہیں کہ محمد تغلق کے پاس یہ خبر پہنچی تھی کہ دہلی میں حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلی نے فیروز تغلق کو تخت نشین کرنے کی تیاری کر لی ہے اس خبر کے سنتے ہی محمد تغلق نے فیروز تغلق اور شیخ نصیر الدین رحمہ کو دہلی سے بلوایا اور خواجہ احمد ایاز کو دہلی بھیجا۔ یہ روایت اکبر کے زمانہ تک لوگوں میں مشہور اور عام زبانوں پر جاری تھی لہٰذا اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ قتلغ خاں نے سلطان محمد تغلق کے قتل کرانے اور فیروز تغلق کو تخت سلطنت پر بٹھانے کی سازش میں صوفیوں، مولویوں اور ملک کے اکثر امیروں کو آمادہ و مستعد کر لیا تھا اور اس کی سب سے بڑی چالاکی اور دور اندیشی یہ تھی کہ اس نے حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی کو بظاہر اپنا پیشوا اور رہنما بنا لیا اور ایسی غلط فہمیاں ہوشیاری کے ساتھ پیدا کیں کہ خواجہ ممدوح محمد تغلق کو بُرا اور فیروز تغلق کو اچھا سمجھنے لگے۔ یہ بات بھی فراموش نہ ہونی چاہیے کہ خواجہ ممدوح محمد تغلق سے اس کے علاوہ بھی ایک اور وجہ سرگرانی کی رکھتے تھے جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے چنانچہ قتلغ خاں کی وفات کے بعد اس سازشی جماعت کے تمام سرگرم ارکان نے حضرت خواجہ ممدوح ہی کو اپنے کاموں کا مہتمم اور آمر قرار دیا۔

محمد تغلق کی وفات

سلطان کوندل میں بہت دنوں مقیم رہا ملتان دیپالپور اور اُچ وغیرہ سے لشکر اور کشتیاں وغیرہ طلب کیں اور تمام سامان فراہم ہو گیا اب ٹھٹھہ پر حملہ کر کے وہاں کے جام اور طغی باغی کو جو ٹھٹھہ میں پناہ گزیں تھا سزا دینی باقی تھی اور یہ بہت ہی معمولی کام تھا کیونکہ گجرات کا سلطان نے ایسا مستحکم انتظام کر دیا تھا کہ وہاں اب کسی بغاوت کے نشو و نما پانے کا موقعہ باقی نہیں رہا تھا۔

طغی نمک حرام کو سزا دینے کے بعد سلطان کو دولت آباد اور دکن کی جانب متوجہ ہونا تھا اور دکن ہی کے لئے اس نے کوندل میں لشکر جمع کیا تھا۔ مغلوں کا چغتائی سلطان بیان قتلغ خان برادر زادہ ترم شیریں خان برائے نام سلطان تھا اس کا وزیر اعظم امیر قزغن در حقیقت فرماں روائی کرتا تھا اور سلطان محمد تغلق کے ساتھ اس کے تعلقات بہت مخلصانہ تھے۔ سلطان محمد تغلق اس بات سے واقف ہو چکا تھا کہ اس کے لشکر کے ایک بڑے حصے کی وفاداری کو صوفیوں اور بدعتی شہریوں کے سازشی گروہ نے متزلزل کر دیا ہے لہذا اس نے احتیاطاً امیر قزغن کو لکھا کہ مغلوں کی ایک امدادی فوج بھیج دو۔ چنانچہ امیر قزغن نے پانچ ہزار مغلوں کی ایک فوج التون بہادر نامی سردار کی ماتحتی میں روانہ کی۔ مغلوں کی یہ فوج سلطان کی خدمت میں اس وقت پہنچی جب کہ وہ کوندل سے روانہ ہو کر ٹھٹھہ پہنچنے کے لئے دریائے سندھ کو عبور کر رہا تھا۔ مغلوں کی اس فوج کے پہنچنے سے سلطان خوش ہوا اور مہمان فوج کی خوب خاطر مدارات کی۔

سلطان محمد تغلق چونکہ اس عظیم الشان سازش سے جس میں بہت سے ارکان سلطنت اور مراسم پرست مذہبی لوگ شامل تھے بے خبر نہ تھا وہ ایک طرف میدان جنگ میں باغیوں کی گرفتاری و سزادہی کا کام انجام دے رہا تھا دوسری طرف اس کا دماغ اس سازش کے عواقب و نتائج کو سوچ رہا تھا۔ دہلی سے فیروز تغلق، اپنی بہن خداوندزادہ اور بعض علما و مشائخ کا جن میں خواجہ نصیر الدین رحمہ چراغ دہلی بھی شامل تھے اپنے پاس بلوا لینا اور اپنے وزیر اعظم ملک احمد ایاز اور خان جہاں کو دہلی کی طرف بھیجنا بلا سبب اور بے معنی نہ تھا۔ اس کو فیروز تغلق سے محبت تھی۔ فیروز تغلق کو ہمیشہ مصروف شکار اور آوارہ و بیکار رہنے سے منع کرتا رہتا تھا فیروز تغلق کی شراب خوری کا بھی اس کو حال معلوم ہو چکا تھا۔ فیروز تغلق نماز روزہ کا پابند نہ تھا، سلطان ان بری عادتوں کے چھڑانے کے لئے اس پر کبھی کبھی تشدد بھی کرتا تھا اور زیادہ دنوں اپنے آپ سے جدا رکھنا نہ چاہتا تھا کہ لہو و لعب میں ترقی نہ کر جائے اور سازشی گروہ کے فریب میں آکر ان کا آلہ کار نہ بن جائے۔ اس کو اپنی بہن خداوندزادہ اور اپنے بہنوئی خسرو ملک کی طرف سے بھی اسی قسم کا اندیشہ تھا۔ سلطان کی ایک بیٹی تھی جس کی شادی عماد الملک سے ہوئی تھی عماد الملک ہر طرح قابل اعتماد اور سلطان کا ہم خیال و وفادار

تھا۔ ایک بیٹا تھا۔ جس کی عمر صرف چھ سات سال کی تھی وہ دہلی ہی میں زیر تعلیم تھا۔ ایسی حالت میں کہ گجرات اور سندھ کی طرف سے مطمئن ہو کر دکن کی طرف جانا ضروری تھا اُس نے ملک احمد ایاز کو دہلی بھیج کر اور وہاں سے مذکورہ شاہی خاندان کے لوگوں اور باا ثر مشائخ و علما کو اپنے پاس بلا کر دہلی کی جانب سے اطمینان حاصل کیا۔ غرض سلطان اپنے عظیم الشان لشکر کے ساتھ دریائے سندھ کو عبور کر کے ٹھٹہ کی جانب روانہ ہوا۔ ۱۰ محرم ۷۵۲ھ کو سلطان نے عاشورہ محرم کا روزہ رکھا اور افطار کے وقت مچھلی کھائی جس سے بخار ہو گیا ایک دو روز اس علالت کے سبب قیام کیا اور جب ہر طرح تندرست ہو گیا تو ٹھٹہ کی جانب کوچ کیا۔ ٹھٹھہ سے چودہ کوس کے فاصلہ پر قیام ہوا اب صرف حکم کی دیر تھی اور ایک ہی روز میں فوج حملہ آور ہو کر ٹھٹھہ کے باغیوں اور طغی نمک حرام کا خاتمہ کر سکتی تھی مگر کسی غیر معلوم وجہ سے یکایک سلطان کی حالت متغیر ہو گئی اور وہ قبل اس کے کہ فوج کو حملہ کا حکم دے ۲۱ محرم ۷۵۲ھ کو فوت ہو گیا (اس حادثہ وفات پر سلطان فیروز تغلق کے ابتدائی حالات سے جو آگے آنے والے ہیں روشنی پڑے گی)

سلطان محمد تغلق کے خصائل بطور خلاصہ

اگر محمد تغلق کی مدت حیات ختم نہ ہو گئی ہوتی تو وہ طغی نمک حرام حرام کے فتنے سے فارغ ہوتے ہی دکن کے تمام فتنوں کو بھی فرو کر دیتا اور ہندوستان میں بے امنی، جہالت، بغاوت، ظلم، بے جا عصبیت اور مراسم بدعات کا نام و نشان باقی نہ چھوڑتا اس نے اپنی ستائیس سالہ حکومت میں ایسی ایسی عظیم الشان مشکلات کا میاب مقابلہ کیا کہ اگر اس کی جگہ کوئی دوسرا شخص مثلاً فیروز تغلق ہوتا تو اس کی نسبت بہ کامیابی حاصل نہ کر سکتا۔ اس کی زندگی از ابتدا تا انتہا لہو و لعب، بدکاری، تن آسانی اور غفلت سے جس طرح پاک و صاف ہے اسی طرح پاک بازی، دانائی، رحم دلی، عدل و انصاف، علم دوستی، معارف پروری، روشن خیالی اور ارتقا سے لبریز و منور ہے۔

وہ صاحب السیف والقلم اور وارث ہمم و حکم تھا۔ اس کی زندگی انتہائی مصروفیت اور شفقت علی خلق اللہ میں بسر ہوئی۔ اگر مروت کی صفت اس میں حد سے زیادہ بڑھی ہوئی نہ ہوتی تو وہ قتلغ خان کو اپنی سلطنت کی خرابی کے لئے اس قدر آزادی اور وسیع مہلت کبھی عطا نہ کرتا، محمد تغلق کی زندگی میں ایک بھی مثال ایسی دستیاب

نہیں ہو سکتی کہ اس نے اپنی ذات کے آرام اور اپنے نفس کی لذت کے لئے رعایا کا مال خرچ کیا یا کسی کو آزار پہنچایا ہو ایک سلطان کے لئے کیا یہ قابل فخر بات نہیں ہے کہ اس کی نظر کبھی کسی غیر محرم عورت پر نہیں پڑی۔ وہ جب اپنے مکان میں داخل ہوتا تو دروازے میں رک کر کھڑا ہو جاتا اور آگے کسی کو بھیج کر اپنے آنے کی اطلاع بھجواتا تاکہ اگر بادشاہ بیگم کے پاس کوئی دوسری عورت آئی ہوئی ہو تو پردے کا انتظام ہو جائے اور سلطان کی نگاہ ایسی غیر عورت پر نہ پڑنے پائے کسی سلطان کی سب سے بڑی خوبی اس کا عادل ہونا ہے سلطان محمد تغلق کے نام کے ساتھ لفظ "عادل" بطور جزو اسم علم اس کی وفات کے تین سو سال بعد تک عام زبانوں پر جاری تھا۔ چنانچہ ملا عبدالقادر بدایونی نے اپنی کتاب منتخب التواریخ میں اس سلطان کا ذکر شروع کرتے ہوئے عنوان میں اس کا نام "سلطان محمد عادل" لکھا ہے۔ ملا محمد قاسم فرشتہ اپنی تاریخ فرشتہ میں لکھتے ہیں کہ سلطان محمد تغلق کی خدمت میں جو مفلوک الحال آتا مالا مال ہو جاتا۔ بیواؤں، محتاجوں اور ضعیفوں کی خبر گیری اور پرورش کا اس کو خاص طور پر خیال رہتا۔ فارسی اور عربی میں ایسے مکاتیب لکھتا کہ بڑے بڑے منشی اور ادیب حیران رہ جاتے فصاحت اور شیریں کلامی میں اپنا نظیر نہ رکھتا تھا۔ جودت فہم اور حدت ذہن میں خاص طور پر ممتاز تھا۔ مردم شناسی کا ملکہ حدِ کمال کو پہنچا ہوا تھا۔ قوت حافظہ اس قدر قوی تھی کہ جو ایک مرتبہ سنا ساری عمر یاد رہا۔ تاریخ، ریاضی، طب، نجوم، فلسفہ منطق میں دستگاہ کامل رکھتا اور شعر خوب کہتا تھا اس نے حالتِ نزع میں یہ شعر کہے تھے۔

بسیار در یں جہاں چمیدیم — بسیار نعیم و ناز دیدیم
اسپانِ بلند بر نشستیم — ترکانِ گراں بہا خریدیم
گر دیم بسے نشاط آخر — چوں قامتِ ماہِ نو خمیدیم

شمس سراج عفیف کہتا ہے کہ "سلطان محمد پادشاہے با جاہے صاحب دستگاہے باکیاست فراواں و فراست بے پایاں بود"۔ الفنسٹن صاحب اس سلطان کی نسبت لکھتے ہیں کہ عالموں فاضلوں پر ایسی ایسی بخششیں کیں اور ایسے ایسے وظیفے مقرر کئے کہ پہلے کسی بادشاہ نے مقرر نہ کئے تھے اس نے طرح طرح کی فیاضی اور دریا دلی

سے شفا خانے بنائے اور محتاج خانے جاری کئے اور قلمرو کے تمام عالموں فاضلوں سے ایسے ایسے سلوک کئے کہ اس کے مناقب اور محامد کے چرچے جا بجا ہوئے۔ تمام لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ یہ بادشاہ اپنے زمانے میں نہایت قابل اور بلاغت نوش بیان تھا۔ یہاں تک کہ اس کے بعد بھی اس کی عربی و فارسی تحریروں کی خوبی بیان کی جاتی تھی۔ روزہ نماز کا پابند اور مے نوشی سے نہایت محترز تھا۔ ذاتی کاموں میں اپنے مذہب کے اصولوں کی پابندی کو مقدم رکھتا تھا۔ ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ "سلطان کو اقامت صلوٰۃ کا بڑا خیال تھا۔ تمام ملازموں کو جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا حکم تھا۔ جو تارک صلوٰۃ ہوتا اُس کو سخت سزا دی جاتی تھی۔ اُس نے بازاروں میں آدمی متعین کر رکھے تھے کہ نماز کے وقت جو جماعت میں شریک نہ ہو اُس کو سزا دیں۔ اُس نے حکم دے رکھا تھا کہ آدمیوں کو بُلا بُلا کر وضو اور نماز کے فرائض بتائیں اور شرائط اسلام سکھائیں۔ ہر گلی کوچہ میں احکام شرعی عوام الناس کو سکھائے جاتے تھے۔ نماز کے ساتھ دوسرے احکام شرع کی پابندی کے لئے بھی خاص اہتمام سے کام لیا جاتا تھا کسی ہندو امیر نے قاضی کے یہاں نالش کی کہ سلطان نے میرے بھائی کو بے سبب قتل کیا ہے قاضی نے سلطان کی طلبی کا حکم نامہ جاری کیا۔ سلطان قاضی کی مجلس میں حاضر ہوا اور کوئی ہتھیار ساتھ نہ لے گیا۔ اُس نے قاضی کو سلام کیا اور جب تک قاضی نے بیٹھنے کا حکم نہ دیا برابر کھڑا رہا۔ قاضی نے فریقین کے بیانات سُنے آخر وہ ہندو امیر اپنے بھائی کے خون پر دلائل سننے کے بعد راضی ہو گیا۔ جب تک قاضی نے جانے کی اجازت نہ دی سلطان قاضی کی مجلس میں ٹھہرا رہا سلطان کے دربار میں جب کوئی شخص آتا اور سلام کرنے کی جگہ پر پہنچتا تو نقیب بلند آواز سے کہتا۔ بسم اللہ" اور اگر یہ شخص ہندو ہوتا تو نقیب بجائے بسم اللہ کے "ہداک اللہ" کہتا اس سلطان کی سخاوت تمام صفات پر غالب ہے" میں نے اس کی سخاوت کی برابر کسی پہلے سلطان کی سخاوت کا حال نہیں سُنا۔ تمام اشخاص سے زیادہ یہ سلطان منکسر و متواضع ہے اور سب سے زیادہ یہ عدل کو ملحوظ رکھتا ہے۔" انتہا۔۔۔۔۔۔۔

میں آخر میں اپنے ہندو دوستوں کو صرف ایک بات کی طرف اور توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں وہ یہ کہ سلطان محمد تغلق نے دیوگیر کو دارالسلطنت بنانے کے ارادے سے وہاں نہ صرف دولت آباد کا بے نظیر قلعہ پہاڑ کو تراش کر بنایا بلکہ شہریت اور دارالسلطنت کے تمام لوازم فراہم کئے اور وہاں رہنے کے ارادے سے چلا بھی گیا۔ محمد تغلق مذہب کا پابند اور سچا پکا مسلمان تھا۔ ایلوراکے مشہور و معروف مندر دولت آباد سے کچھ دور نہ تھے۔ ہندروں کے مسمار کرانے کا الزام جو مسلمان سلاطین کے سر تھوپا جارہا ہے اگر اس میں رتی برابر بھی صداقت ہوتی اور اسلام دوسری قوموں کے معابد کو منہدم کرنے کی اجازت دیتا تو محمد تغلق جیسا پابند شرع سلطان اپنے بغل میں ایلورا کے مندروں کو کسی طرح باقی نہ رہنے دیتا۔ خوب سوچو اور بہت غور کرو۔

سُلطان فیروز تغلق

سلطان علاءالدین خلجی کے حالات میں اوپر بیان ہوچکا ہے کہ ۷۰۸ھ میں دکن بھی فتح ہو کر سلطنت اسلامیہ میں شامل ہوچکا تھا اور مسلمانوں نے راس کماری میں مسجد بنواکر کل براعظم ہندوستان پر اسلامی حکومت کے قایم ہو جانے کی مہر لگا دی تھی۔ تقریبًا چالیس سال تک پورے براعظم ہندوستان کی اسلامی سلطنت کا ایک ہی مرکز رہا۔ سلطان محمد تغلق کے آخر عہد حکومت میں بعض مسلمان گورنروں کی بغاوت اور ناعاقبت اندیشی سے دکن میں بغاوتیں برپا ہوئیں۔ سلطان محمد تغلق گجرات کی بغاوت فرو کرنے کے بعد دکن کی بغاوت دور کرنے کے لئے اُس طرف روانہ ہونے کو تھا کہ پیغام اجل کے پہنچنے پر عالم جاودانی کو روانہ ہوگیا اس کے جانشین فیروز تغلق نے دکن کی جانب کوئی توجہ نہیں کی اور غالبًا فیروز تغلق کی رضامندی سے دکن کی سلطنت بہمنی کے نام سے ایک خودمختار اسلامی سلطنت جدا قائم ہوگئی۔ اس کے بعد حضرت اورنگ عالمگیر کے عہد حکومت تک کل براعظم ہندوستان کی حکومت ایک مرکز سلطنت سے وابستہ نہ ہو سکی بلکہ جدا جدا متعدد اسلامی سلطنتیں ہندوستان میں قائم رہیں۔ مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ دورِ افغانیہ کے خاتمہ تک مسلسل شمالی ہند کی سلطنت دہلی کے سلاطین کا تذکرہ جاری رکھا جائے اس کے بعد دکن، گجرات

بنگال، کشمیر وغیرہ کے حالات بیان کرکے پھر سلطنت مغلیہ کو زیر بحث لایا جائے چنانچہ دکن کے حالات کو ملتوی رکھ کر فیروز تغلق کے مختصر اور ضروری حالات جو اس تصنیف کے موضوع سے مناسبت رکھتے ہیں عرض کئے جاتے ہیں۔ مسلمانوں کا ہندو قوم کی تہذیب، تمدن، اخلاق، اور معاشرت پر کس تدریج و ترتیب سے کیا کیا اثر پڑا؟ یہ ضروری مضمون ابھی تک ملتوی اور میرے ذہن میں ہے۔ آئندہ کسی مناسب موقع پر اس کو بالتفصیل بیان کیا جائے گا۔ غلط مبحث سے بچنے کے لئے اس مضمون کو فی الحال ملتوی رکھنا اور سلسلۂ سلاطین کو ایک مناسب حد تک پہنچا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

مسلمانوں کا ذات پات کی قید سے آزاد رہنا

فیروز تغلق کی ماں کا ذکر اوپر آچکا ہے کہ وہ ایک راجپوت زمیں دار مسمی رانا مل بھٹی کی بیٹی تھی۔ فیروز تغلق کی دادی بھی پنجاب کی ایک جاٹنی تھی۔ اگر اسلام اور مسلمانوں میں ذات پات کو ایسی ہی اہمیت دی گئی ہوتی جیسی کہ منوسمرتی میں تعلیم کی گئی ہے اور ہندوؤں میں رائج ہے تو مسلمان اول تو غیاث الدین ہی کو کبھی اپنا پادشاہ اور سلطان نہ بناتے اور اگر کسی مجبوری سے اس کو سلطان تسلیم کرلیا تھا تو فیروز تغلق کو جس کے جسم میں ہندوانی خون دو آتشہ ہوکر موجود تھا کبھی تخت سلطنت کا مستحق قرار نہ دیتے۔ فیروز تغلق کا بھائی ملک قطب الدین ابن سالار رجب جو پہلی مسلمان بیوی کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا لشکر میں موجود تھا۔ دوسرا بھائی ملک ابراہیم ابن سالار رجب جو وزارت اور نیابت سلطنت کی خدمات انجام دینے کی وجہ سے ملک نائب باربک کے خطاب سے مخاطب ہوا موجود تھا۔ خود سلطان محمد تغلق کا ہفت سالہ بیٹا موجود تھا۔ سلطان غیاث الدین تغلق کا نواسا داور الملک جو نائب امیر حاجب تھا، امیدوار سلطنت تھا اور اس کی ماں یعنی سلطان محمد تغلق کی بہن خداوند زادہ اپنے بیٹے کو بادشاہ بنانا چاہتی تھی۔ سلطان محمد تغلق کی وفات کے بعد اُس نے امیروں کے پاس اس غرض کے لئے پیغام بھیجے تھے۔ خسرو ملک یعنی سلطان غیاث الدین تغلق کا داماد بھی شاہی خاندان کا آدمی تھا۔ ملک تاتار خاں جو سلطان غیاث الدین تغلق کا منہ بولا بیٹا اور سلطان محمد تغلق کا بھائی سمجھا جاتا تھا اور بڑا بہادر سپہ سالار تھا سلطانی لشکر میں موجود تھا۔ ان سب کے موجود ہوتے ہوئے فیروز تغلق کو تخت سلطنت پر بٹھانا سب سے بڑی دلیل

اس بات کی ہے کہ مسلمانوں نے اپنی مذہبی تعلیمات کو پیش نظر رکھ کر ذات پات کو کبھی زیادہ اہمیت نہیں دی اور ہندو قوم کو جو ان کی مفتوح و مغلوب و محکوم قوم تھی ذلیل ٹھہرانے اور ذلیل کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔

خواجہ جہان ملک احمد ایاز کا مقتول ہونا

سلطان محمد تغلق کا ٹھٹھہ کے قریب ۲۱ محرم ۷۵۲ھ کو انتقال ہوا۔ چونکہ یہ حادثہ دریائے سندھ کے کنارے بحالت مسافرت وقوع پذیر ہوا لہذا لشکر میں بدنظمی اور ہلچل کا پیدا ہونا ذرا بھی خلاف توقع نہ تھا، پانچ ہزار مغل جو التون بہادر مغل سردار کی ماتحتی میں بطور امدادی لشکر کے آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے یہ رنگ دیکھ کر اور اپنے ہم قوم امیر نوروز داماد ترم شیریں خاں سے جو سلطان محمد تغلق کا پرانا اور وفادار سردار تھا اکثر ہندوستانی افسروں کی بے وفائی اور محسن کشی کے حالات سن کر سلطان کی وفات کے بعد اپنے ملک کو واپس جانے کا قصد کیا اور چلتے وقت جو سامان ملا لوٹ لیا۔ امیر نوروز نے کبھی سلطان کے ساتھ کوئی بے وفائی نہیں کی تھی اور وہ سلطان محمد تغلق کے مخصوص تربیت کردہ لوگوں میں سے تھا اس کا سلطان کی وفات کے بعد مذکورہ مغل فوج کے ساتھ اپنے ملک کو واپس چلا جانا اور مغلوں کو لوٹ مار یا لڑائی کی ترغیب دینا فیروز شاہی مورخین کے نزدیک مغلوں کی جبلی غارت گری کا نتیجہ تھا۔ لیکن اس سے یہ بھی ثبوت ملتا ہے کہ سلطان محمد تغلق کے اکثر سرداران لشکر نیز فیروز تغلق کے خیالات سلطان مرحوم کی نسبت اچھے نہ تھے اور اسی لئے سلطان مرحوم کے ایک قدیم وفادار خادم نے سلطان کے بعد یہاں رہنا گوارا نہ کیا ؎

بلبل چو تاب رشک رقابت بخود نہ دید
از باغ و بوستان و گل و گلستاں گذشت

غرض اس لوٹ مار کے ہنگامے میں کسی کو کسی کا ہوش نہ رہا۔ وزیر اعظم ملک احمد ایاز کا غلام جس کا نام ملیح تون تون تھا دہلی سے سلطان لشکر میں آیا ہوا تھا۔ اس افراتفری اور لوٹ مار کے ہنگامے میں بہت سے آدمی آوارہ ہو کر ادھر ادھر چل دیئے۔ ملیح تون تون بھی وہاں سے بھاگا اور سیدھا دہلی کا رخ کیا۔ جلد از جلد دہلی پہنچ کر اپنے آقا ملک احمد ایاز کو سلطان کی وفات کا حال سنایا۔ ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ مغلوں نے حملہ کرکے لشکر کو لوٹا

اور بہت سے سردار مارے گئے۔ بعض مغلوں کے ہاتھ میں گرفتار اور بعض مفقود الخبر ہیں فیروز تغلق اور ملک تاتار خاں کی نسبت کہا کہ وہ دونوں بھی مقتول یا اسیر ہو چکے ہیں۔ شمس سراج عفیف کے الفاظ یہ ہیں:-

"در روز غارت بنگاہ خلق لشکر متفرق افتادہ ہر یکے کہ دراں انجمن بود بہ سمتے رُخ نہاد ہنوز سلطان فیروز کہ بپادشاہی نہ نشستہ ہمدراں لحظہ ملیح تون تون نام غلامے بود ازاں خواجہ کہ خواجہ جہاں پیش ازاں بر سلطان محمد فرستادہ بود ملیح مذکور درعین شور شہور از لشکر جانب دہلی رواں شدو سلامت در دہلی رسیدہ پیش خواجہ جہاں تقریر کرد کہ سلطان محمد از جہاں خرامید طائفہ مغل برلشکر و بیدہ خلائق بازار بزرگ را نہب و غارت کردہ میاں لشکر فساد بسیار و خوں ریزی بے شمار شد ملیح مذکور ایں تقریر نیز کردہ کہ تاتار خاں و ملک امیر حاجب یعنی سلطان فیروز غائب شدند و معلوم نیست کہ ایشاں بدست مغلاں افتادند و یا کشتہ شدند و بیشتر ملوک دراں جنگ سعادت شہادت یافتہ"

ملک احمد ایاز اس خبر کو سُن کر سخت پریشان ہوا۔ سلطان محمد تغلق کی وفات کا حال اگرچہ ایک سانحہ عظیم تھا لیکن فیروز تغلق اور تاتار خاں کے مقتول یا اسیر ہونے کی خبر اور بھی زیادہ موجب تشویش ہوئی۔ ملک احمد ایاز کی بیوی نے فیروز تغلق کو اپنا منہ بولا بیٹا بنایا تھا اور فیروز تغلق ملک احمد ایاز کو باپ کہتا تھا۔ ملک احمد ایاز ہی نے سلطان محمد تغلق کو فیروز تغلق کی جانب ہمیشہ محبت کے ساتھ متوجہ رکھا اور اب محمد تغلق کے بعد وہی سب سے زیادہ اس کو سلطان بنانے میں کوشاں ہوتا۔ لیکن جب اس کو اپنے غلام ملیح تون تون کی زبانی فیروز تغلق کے مقتول یا اسیر ہونے کا حال معلوم ہوا تو اُس نے سلطان محمد تغلق کے ہفت سالہ بیٹے محمود کو قوام الملک خان جہاں۔ سید جلال الدین ترندی۔ ملک حمید الدین کچھی، مولانا نجم الدین۔ ملک حسام الدین ازبک وغیرہ کے مشورے سے پادشاہ بنا کر دہلی کے موجودہ سرداروں سے بیعت لے لی اور ملک کے نظم ونسق کو قائم رکھنے کے لئے جدید فوج بھی بھرتی کی۔

سلطان محمد تغلق نے کسی خاص شخص کو اپنا ولی عہد نہیں بنایا تھا۔ فیروز تغلق کے

عہد حکومت میں جو تاریخیں لکھی گئیں اُن میں یہ ذکر ضرور موجود ہے کہ محمد تغلق نے فوت ہوتے وقت فیروز تغلق کو اپنا جانشین تجویز کر دیا تھا۔ لیکن یہ سراسر غلط اور محض فیروز تغلق کی خوشنودی مزاج کے لئے غالباً لکھا گیا ہے کیونکہ محمد تغلق کی وفات کے کئی روز بعد تک تخت نشینی اور محمد تغلق کی جانشینی کا معاملہ بالکل مہمل رہا اور محمد تغلق کی بہن کو بمشکل رضامند کرکے فیروز تغلق کو اس دلیل کی بنا پر تخت نشین کیا گیا تھا کہ اگر جلدی بادشاہ نامزد نہ کیا گیا تو اس لشکر کا انتظام واہتمام کے ساتھ دہلی پہنچنا دشوار ہے۔ خود شمس سراج عفیف نے فیروز تغلق کی تخت نشینی کے جو حالات لکھے ہیں اُن سے ثابت ہو رہا ہے کہ محمد تغلق نے کسی کو اپنا ولی عہد نہیں بنایا تھا۔ نہ فیروز تغلق کے حامیوں نے تخت نشینی کے وقت کسی سے بطور دلیل اس بات کا ذکر کیا کہ فیروز تغلق کو ولی عہد نامزد کیا جا چکا ہے۔ اگر سلطان محمد تغلق فیروز تغلق کو ولی عہد مقرر کرجاتا تو تین چار روز تک فیروز تغلق کی تخت نشینی معرض التوا میں نہ رہتی اور کسی کو مخالفت کرنے یا خداوندزادہ ہمشیرہ محمد تغلق کو فیروز تغلق کے خلاف کوشش کرنے کا قطعاً موقعہ نہ ملتا۔ اگر بطور فرض محال اس بات کو تسلیم بھی کر لیا جائے کہ مرتے وقت سلطان محمد تغلق نے فیروز تغلق کو ولی عہد بنایا تھا تو خواجہ جہان ملک احمد ایاز تو اس سے واقف نہ تھا۔ ملک احمد ایاز کی نیک نیتی اور پاک باطنی میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ اُس نے اپنے آقا اور اُس کے خاندان سے ہرگز کسی قسم کی بے وفائی نہیں کی اور جو کچھ کیا وقت کی مصلحت کے موافق کیا۔ شمس سراج عفیف کے الفاظ یہ ہیں :۔

"چوں بعد از شرط عزا خواجہ جہان از ماتم برخاست گفتار بلیغ راست پنداشت دریں محل خواجہ جہان اجتہاد کردہ پسر سلطان محمد را بپادشاہی نشان دہ بتقدیر اللہ تبارک وتعالیٰ دراجتہاد خواجہ جہان غلط افتاد چوں خواجہ جہان شنید کہ ملک امیر حاجب (فیروز تغلق) سلامت است ودر ملک نشستہ برغلط اجتہاد واقف شد۔"

ادھر دریائے سندھ کے کنارے سلطانی لشکر میں یہ صورت پیش آئی کہ ۲۴ محرم ۷۵۲ھ کو خواجہ نصیر الدین رحمہ چراغ دہلی کی کوشش سے فیروز تغلق کی تخت نشینی کے مراسم ادا کئے گئے۔ فیروز تغلق تخت نشین ہونے کے بعد مغلوں کو بھگا کر اور عماد الملک

اور امیر علی غوری کو طغی نمک حرام کی سرکوبی پر مصلحتاً مامور کرکے معہ لشکر دہلی کی جانب روانہ ہوا۔ طغی نمک حرام ٹھٹھہ سے نکل کر گجرات کی طرف جا رہا تھا کہ عماد الملک کے ہاتھ سے مارا گیا۔ اور عماد الملک جلد واپس آکر لشکر فیروز شاہی میں شامل ہو گیا۔ چند روز کے بعد سفر کی کسی منزل میں فیروز تغلق نے یہ خبر سنی کہ دہلی میں سلطان محمد تغلق کے بیٹے کو خواجہ جہاں ملک احمد ایاز نے تخت سلطنت پر بٹھا دیا ہے۔ ادھر ملک احمد ایاز کو معلوم ہوا کہ فیروز تغلق زندہ وسلامت موجود اور بادشاہ بن کر دہلی کی جانب آرہا ہے۔ شمس سراج عفیف کہتا ہے کہ:۔

"چوں خواجہ جہان اخبار دولت سلطان فیروز شنید بر غلط خود تاسف بسیار خورد"

چونکہ تمام گروہ صوفیا قدامت پسند اور مراسم پرست علما اور اکثر امرا مذکورہ سازش میں شریک اور خواجہ جہان کے مخالف تھے اس لئے خواجہ جہان کو فیروز تغلق کی مخالفت میں کامیابی کی کوئی توقع نہیں ہو سکتی تھی بلکہ اس کو اپنی سلامتی کی اُمید بھی صرف اس لئے تھی کہ فیروز تغلق پر اس کے احسانات ثابت تھے اور معمولی انسانی شرافت کا تقاضا بھی یہی تھا کہ فیروز تغلق خواجہ جہان ملک احمد ایاز کو کسی قسم کا کوئی نقصان نہ پہنچنے دے۔ چنانچہ ملک احمد ایاز کو اطمینان تھا کہ فیروز تغلق جب اصل حقیقت اور واقعہ کی اصل نوعیت سے واقف ہوگا تو میرے ساتھ کوئی برائی نہ کرے گا۔ اسی طرح فیروز تغلق کو بھی اس بات کا یقین تھا کہ ملک احمد ایاز میرا بدخواہ نہیں ہے۔ قوام الملک خان جہان نو مسلم نے جب یہ سُنا کہ فیروز تغلق معہ لشکر سرستی کے مقام پر پہنچ گیا ہے تو عجیب چالاکی سے کام لیا کہ خواجہ جہان کو خبر کئے بغیر تنہا دہلی سے چلا یا اور فیروز تغلق سے آملا ....

....

....

....

....

....

.... فیروز تغلق اُس کے آنے سے بہت خوش ہوا اور وزارت کا وعدہ دیا۔ اسی روز شہزادہ فتح خاں فیروز تغلق

کی گوجری بیوی کے پیٹ سے پیدا ہوا۔ شمس سراج عفیف کی روایت کے موافق اگلے دن خواجہ جہان ملک احمد ایاز بھی فیروز شاہ کی خدمت میں پہنچ گیا اور اپنی غلطی اور غلط فہمی کا حال سنا کر معافی چاہی۔ ضیا برنی کہتا ہے کہ ملک احمد ایاز قوام الملک خان جہاں کے پہنچنے سے کئی روز کے بعد پہنچا لیکن شمس سراج عفیف کا بیان صحیح معلوم ہوتا ہے کہ اگلے ہی دن پہنچ گیا تھا۔ شمس سراج عفیف کی روایت کے موافق فیروز تغلق ملک احمد ایاز کے ساتھ عزت و مرحمت کا برتاؤ کرنا چاہتا تھا مگر اکثر سرداران لشکر اور امرا نے متفق ہو کر اس بات پر زور دیا کہ ملک احمد ایاز کو قتل کیا جائے۔ فیروز تغلق رضامند نہ ہوتا تھا مگر جب اس کو یہ معلوم ہوا کہ اکثر امرا بغاوت پر تلے ہوئے ہیں تو اس نے حکومت و بادشاہت کو بچانا ضروری سمجھ کر خواجہ جہان کے متعلق امیروں کو اختیار دے دیا کہ جو تمھارا جی چاہے اس کے ساتھ سلوک کرو۔ شمس سراج عفیف کہتا ہے کہ:-

"حضرت فیروز شاہ چوں دید کہ ایشاں سرہمہ بہ ہندسہ فراست و زمرۂ کیاست برائے تلف کرد خواجہ جہان بیک زبان متفق شدہ اند سلطان فیروز از غایت فکر و نہایت اندیشہ سپید گونہ شد و چند روز ہمراں اندوہ بود و دروں دریائے دل خویش از تاثیر تامل بیش ابواب تفکر می کشود بعد از فکر بسیار و تامل بے شمار حضرت جہاں دار ملک عماد الملک را در محل خلوت طلبید اسرار نہانی بہ پنہانی بگوش او رسانید، فرمان فرمود بسود بر مقربان درگاہ و دولت خواہان بارگاہ بگو کہ اختیار کار خواجہ جہاں بدست شما دادم ہر چہ ایشاں را مصلحت آں چنیں بر خواجہ جہاں کنند از سر خواجہ جہاں باز آمدم واز سر شما باز آمدن نتوانم"۔

ان ظالموں نے اس مرد با خدا کو شہید کر کے دم لیا۔ شہادت کے وقت خواجہ جہاں نے وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھی اور حضرت شاہ نظام الدین اولیا رحمہ کی دستار سر سے باندھ کر سجدہ میں سر رکھا اور کلمۂ طیبہ پڑھا اسی حالت میں سر تن سے جدا کیا گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

خواجہ جہان ملک احمد ایاز نے کسی شخص کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا لیکن اس کی روشن خیالی اور پابندی کتاب و سنت نے اوہام پرستوں کو اس کا دشمن بنا دیا تھا اور

امیر خسرو علیہ الرحمہ کی وفات کے وقت سے اس دشمنی کا سلسلہ جاری تھا شیخ نصیرالدین چراغ دہلی اور دوسرے لوگوں نے یہ چاہا تھا کہ حضرت امیر خسروؒ کو حضرت نظام اولیا رحمہ کے پہلو میں دفن کریں۔ خواجہ احمد ایاز نے مانع ہوکر شیخ رحمہ کے پائیں دفن کرایا اسی وقت سے خواجہ جہان کے ساتھ اکثر مریدین شیخ کو ملال اور نقار چلا آتا تھا۔ شمس سراج عفیف نے ملک احمد ایاز کے شہید ہونے کا حال نہایت رقت انگیز الفاظ میں مفصل لکھا ہے لیکن ضیا برنی ملک احمد ایاز کو برا کہنے، تحقیر کرنے اور گالیاں دینے میں تو صفحات رنگتا چلا گیا ہے یہ بھی بتا دیا ہے کہ وہ اور اس کے ساتھ چھ سات آدمی اور فیروز شاہ کے حکم سے قتل ہوئے لیکن ملک احمد ایاز کس طرح شہید یا قتل کیا گیا۔ اس کی نسبت ایک لفظ زبان پر نہیں لاتا۔ سلطان محمد تغلق کے ہفت سالہ بیٹے کو بھی، بماہ جمادی الآخر دہلی پہنچ کر فیروز تغلق نے یقیناً قتل کرایا لیکن اس کے قتل کا کوئی تذکرہ تاریخوں میں موجود نہیں۔

سلطان محمد تغلق کی وفات کا سبب بہت مشکوک ہے

اسی سلسلے میں یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ ضیاء برنی، شمس سراج عفیف خواجہ نظام الدین احمد، محمد قاسم اور فرشتہ وغیرہ میں سے کوئی بھی اس بات کا اقرار نہیں کرتا کہ سلطان محمد تغلق کی زندگی میں اس کو معزول یا مقتول کرنے اور فیروز تغلق کو بادشاہ بنانے کی کوشش یا سازش میں کسی مولوی یا کسی صوفی نے کوئی حصہ لیا تھا لیکن ملا عبدالقادر بدایونی صاف لکھتے ہیں کہ عوام میں یہ مشہور ہے کہ بادشاہ کی زندگی ہی میں حضرت شیخ نصیرالدینؒ چراغ دہلی نے فیروز شاہ کو بادشاہ بنانے کی کوشش کی تھی اور اسی لئے شیخ اور فیروز تغلق دونوں دہلی سے گرفتار کراکر طلب کئے گئے تھے۔ محمد تغلق ان دونوں کو قتل کراتا لیکن جس روز یہ لشکر میں پہنچے اسی روز سلطان کا انتقال ہوا اور لوگوں نے فیروز تغلق کو بادشاہ بنایا اور اس نے تخت نشین ہوکر صوفیوں کے نام بڑی بڑی جاگیریں مقرر کیں۔ اس روایت کو صحیح تسلیم کر لینے کے بعد معاملہ بالکل صاف ہوجاتا ہے اور فیروز تغلق کے طرف دار مورخین کے ڈالے ہوئے تمام پردے جنھوں نے اصل واقعات کو سخت پیچیدہ و ژولیدہ بنا رکھا ہے اٹھ جاتے ہیں۔ ایک طرف خواجہ جہان کا واقعۂ قتل صاف نظر آجاتا ہے تو دوسری طرف

سلطان محمد تغلق کا حادثۂ وفات ہی بہت مشتبہ اور مشکوک ہو جاتا ہے اور خواہ مخواہ ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ سلطان محمد تغلق کو زہر دے کر قتل کیا گیا اور اس واقعہ کو چھپانے کے لئے کئی دوسری باتیں بنالی گئیں۔ ضیاء برنی اور اُس کے مقلد مؤرخین نے سلطان محمد تغلق کے بیٹے کا وجود بھی تسلیم نہیں کیا۔ لیکن شمس سراج عفیف سلطان محمد تغلق کے بیٹے کا موجود ہونا تسلیم کرتا اور دلیل میں قاضی کمال الدین کا بیان پیش کرتا ہے۔ ملا عبدالقادر بدایونی کی روایت میں سلطان کے ایک بیٹے کا سلطان کے ہمراہ لشکر میں موجود ہونا بیان کیا گیا ہے جو سلطان کے حادثۂ وفات کے وقت شکار میں گیا ہوا تھا۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ جوان اور بادشاہت کے قابل تھا۔ اُس کو یقیناً قتل کر کے فیروز تغلق کو تخت نشین کیا گیا ہوگا۔ اس طرح سلطان محمد تغلق کا ایک ہی بیٹا نہیں بلکہ دو بیٹے ثابت ہو جاتے ہیں۔ جس قدر روایات اور حالات فراہم ہو سکے سب قارئین کرام کے روبرو ہیں۔ جو چاہیں فیصلہ کریں۔

تنگ نظر مراسم پرستوں کا دور دورہ

سلطان فیروز تغلق کو علم و فضل میں وہ درجہ حاصل نہ تھا جو سلطان محمد تغلق کو حاصل نہ تھا نہ اس کی نظر علوم دینیہ میں وسیع تھی نہ وہ سلطان محمد تغلق کی طرح قوی القلب اور عالی حوصلہ تھا۔ سلطان محمد تغلق پابندیٔ شرع کا خاص اہتمام رکھتا اور غیرت دینی کا ہمیشہ اظہار کرتا تھا فیروز تغلق اس معاملے میں بہت کمزور اور امرائے سلطنت سے مرعوب تھا۔ ان کی منشا کے خلاف کسی کام کے کرنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔ ملک احمد ایاز وزیر اعظم کے سوا اور کوئی شخص اُمرائے سلطنت میں ایسا نہ تھا جو محمد تغلق کی طرح دل سے مسلمانوں کو کتاب و سنت کا عامل بنا کر بدعات و مراسم کی پابندی سے بچانا ضروری کام سمجھتا ہو ملک احمد ایاز اور اُس کے ہم خیال سب قتل کر دیئے گئے۔ قتلغ خاں کے بیٹے کو الپ خاں کا خطاب دے کر زمرۂ امرائے کبار میں شامل کیا گیا۔ قتلغ خاں کے بھائی نظام الملک امیر حسین کو گجرات کی حکومت سپرد کی گئی۔ قوام الملک خان جہاں نومسلم ملک احمد ایاز کو دھوکہ دے کر اور فیروز تغلق کے پاس پہلے پہنچ کر اپنی سرخ روئی کا سامان کر چکا تھا اور وہی ان تمام امرا کا سرگروہ بنا جنھوں نے ملک احمد ایاز کے قتل پر فیروز تغلق کو مجبور کیا اس طرح خان جہاں کے لئے وزارت عظمےٰ کا عہدہ

خالی ہوا۔ باقی تمام امراء قتلغ خاں کی سازش میں شریک یا کم از کم بدل اس سازش کے ہمدرد اور بظاہر سلطان محمد تغلق کے خیر خواہ تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فیروز تغلق نے تخت نشین ہوتے ہی ان تمام مولویوں، مفتیوں، قاضیوں اور پیروں کے بڑے بڑے روزینے مقرر کردیئے جو سلطان محمد تغلق کے زمانے میں معزول و مطرود و بے شغل ہو گئے تھے۔ محمد تغلق کے زمانے کا تمام انتظام درہم کر دیا گیا۔ مولانا قاضی کمال الدین قاضی القضاۃ کو معزول کرکے سید جلال الدین کرمانی کو نیا قاضی القضاۃ بنایا گیا اور اس کو صدر صدور جہاں کا خطاب دے کر تمام شرعی محکموں کا مطلق العنان حاکم بنا دیا گیا۔ ضیائے برنی کے الفاظ یہ ہیں:-

"در بادشاہ اسلام خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ اور ادامور احکام شرع محمدی کلاً جملۃً مطلق العنان گردانیدہ و تعین ادرارات و انعامات جماہیر علما دار الملک و تمامی بلاد ممالک بصدر صدور جہاں مفوض گشتہ"

اسی طرح مخدوم جہانیاں شیخ جلال الدین رحمہ کو شیخ الاسلامی دی گئی اور حضرت ابو الفتح شیخ رکن الدین ملتانیؒ کو شیخ الاسلامی سے اس لئے برطرف کیا گیا کہ وہ شرکیہ و بدعیہ مراسم کے دشمن اور سلطان محمد تغلق کے ہم خیال و مؤید تھے۔ فیروز تغلق نے ۷۴۴ھ میں جب کہ وہ سلطان محمد تغلق کی غیر موجودگی میں بطور نائب السلطنت دہلی میں مقیم تھا ایک ہندو گوجر کی لڑکی سے شادی کرکے اپنے باپ کی سنت کو پورا کیا تھا۔ اس ہندو خاندان کے اکثر افراد اس کی مصاحبت میں داخل تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بتدریج اُن خیالات اور ان بدعات و مراسم کی طرف مائل ہو گیا تھا جو اس ملک کی آب و ہوا سے نشو و نما پاکر مسلمانوں میں داخل اور رائج ہو چکے تھے اور جن کو محمد تغلق نے مٹانے کی زبردست کوشش کی تھی۔ غرض سلطان فیروز تغلق کی کمزوری سمجھ لو یا اس کی کم علمی قرار دے لو کہ اس کے تخت نشین ہوتے ہی سب سے پہلا اور سب سے بڑا تغیر یہ ہوا کہ عالم نما جاہلوں، شکم پرور کاہلوں، نام نہاد صوفیوں اور مشائخ زادوں کے بھاگ کھل گئے اور کتاب و سنت کی ترویج و اشاعت کا نظام بکلی درہم برہم ہو گیا۔ مولانا عبد القادر بدایونی لکھتے ہیں کہ ایک صاحب نے جن کا نام مولانا داؤد تھا ہندی زبان میں ایک مثنوی لکھی جس میں ایک عشقیہ قصہ بیان کیا گیا تھا۔ عہد فیروزی کے ایک دوسرے مولانا جن کا نام

تقی الدین واعظ تھا اس ہندی مثنوی کو منبر پہ پڑھا کرتے تھے۔ کسی عالم نے ان سے پوچھا کہ ہندی مثنوی کے منبر پہ پڑھنے کی کیا ضرورت ہے تو واعظ صاحب نے جواب دیا کہ اس کا مضمون اقوالِ تصوف کے موافق ہے۔

اسلام ملک عرب سے شایع ہوکر شام، عراق، مصر، ایشیائے کوچک، ایران، خراسان، ترکستان، طرابلس، الجیریا، مراقش، اندلس، سندھ، پنجاب، شمالی ہند، دکن، چین، روس، بلقان، بحر الکاہل کے جزائر اور بر اعظم افریقہ کے علاقوں میں پہنچا ان ملکوں کے قدیم مذاہب، قدیم تمدن، اور قدیم معاشرت کو یکساں طور پر اسلام کے اثر سے مغلوب ہونا پڑا، لیکن ہر جگہ اسلام کو بھی عارضی طور پہ جدا جدا مشکلات کا سامنا پڑا۔ ایران و خراسان و عراق عجم میں مجوسی عقائد و مجوسی اخلاق کا اثر تادیر وہاں کے نومسلموں میں باقی رہا اور وہاں جدا قسم کی مشکلات پیش آئیں، شام و مصر وغیرہ میں مسیحیت کی باقیات نے وہاں کے نومسلموں کو عرصۂ دراز تک متاثر رکھا اور اسرائیلیات کا ایک بیہودہ ذخیرہ اسلامی تصنیفات میں شامل ہوگیا۔ ہندوستان کے اندر سندھ و ملا بار وغیرہ میں اگرچہ عربوں کے ذریعہ اسلام آیا لیکن چند روز کے بعد عربوں نے اس طرف سے توجہ ہٹا لی اور پھر افغانوں کے ذریعہ تمام بر اعظم ہندوستان میں اسلام شایع ہوا۔ ان افغانی یا ترکستانی قبائل کو جنھوں نے ہندوستان میں اسلامی حکومت قایم کی تھی علوم دینیہ کی طرف زیادہ توجہ کا موقع نہیں ملا تھا۔ یہ لوگ زیادہ تر ایرانیوں اور خراسانیوں کے مقلد تھے لہٰذا ہندوستانی قومیں جو اسلام میں داخل ہوئیں اُن کو ہندوستان کے قدیم مذاہب یعنی بدھ مذہب، برہمنی مذہب، غیر آریائی عقائد، لاتعداد سمپروائے اور مروجہ پرانوں سے تعلق رکھنے والے اعمال و عقائد کے کچھ کچھ مٹے مٹائے خاکے باقی رکھنے کا موقع مل گیا اور سیکڑوں غیر اسلامی مراسم اور غیر اسلامی اعمال نے اسلامی جامہ پہن کر تصوف کے مختلف خانوادوں اور پیری مریدی کے سلسلوں، اور غیر علمی خانقاہوں میں پناہ لے لی، حتیٰ کہ ابن بطوطہ اپنے سفرنامے میں صاف طور پہ لکھتا ہے کہ میں نے ہندوستان میں بعض مسلمانوں کو دیکھا کہ وہ جوگیوں کے چیلے تھے۔

میں اس موضوع پہ کہ کس کس زمانے اور کس کس مقام میں کن کن اسباب کے ماتحت کون کون سی غیر اسلامی مراسم اور بدعات مسلمانوں میں رائج ہوکر ہندوستان میں اسلام

کو کیا کیا مشکلات پیش آئیں اور کس کس مرد باخدا نے اسلام کو اُس کے اصلی رنگ میں پیش کرنے کی کیسی کیسی کوشش کی ایک مستقل تصنیف کا عزم رکھتا ہوں وباللہ التوفیق۔
سلطان محمد تغلق کے تذکرے میں بعض باتیں ضرورتاً اور مجبوراً بیان کرنی پڑیں اب ملک احمد ایاز کی شہادت کے بعد اس خاص قسم کی باتوں کو جو اتفاقاً شروع ہو گئی تھیں اس تصنیف میں ختم سمجھنا چاہیئے۔

عہدِ فیروز تغلق کے قابلِ تذکرہ حالات

فیروز تغلق دریائے سندھ کے کنارے مراسم تخت نشینی ادا کرنے کے بعد دہلی کی جانب روانہ ہوا اور پانچ مہینے کے بعد اس سفر کو ختم کر کے دہلی پہنچا۔ راستے میں سیوستان بھکر، اُچ، ملتان، دیپالپور، پاک پٹن، تھانیسر، سرستی، ہانسی وغیرہ ہر ایک مقام پر مقیم ہوتا، وہاں کے پیروں سے نیاز مندانہ منت نذرانے پیش کرتا اور مزاروں پر حاضری دیتا ہوا آیا۔ ملک احمد ایاز کا خون بہایا، قوام الملک خان جہاں نومسلم کو وزیر اعظم بنا کر سلطنت کا تمام وکمال اختیار اُس کے سپرد کیا۔ سید جلال الدین کو صدر صدور جہاں بنا کر دینی و مذہبی کاموں کا تمام وکمال اختیار اُن کے ہاتھ میں دیا۔ پہلے فوج کو نقد تنخواہیں شاہی خزانے سے دی جاتی تھیں اور جاگیرداری کا قاعدہ منسوخ کر دیا گیا تھا۔ سلطان فیروز تغلق نے دہلی آتے ہی پھر جاگیروں کا قاعدہ جاری کر دیا۔

سرمور کے ہندو راجہ کی نسبت سرکشی و بغاوت کی شکایت پہنچی اور فیروز شاہ نے ۵ ماہ صفر ۷۵۳ھ کو دہلی سے سرمور کی جانب کوچ کر کے اس بغاوت کو فرو کیا اور اس نواح کے تمام راجاؤں سے اقرار اطاعت لیا۔ ۳ جمادی الاول ۷۵۳ھ کو دہلی میں شہزادہ محمد خاں پہلی بیوی کے پیٹ سے پیدا ہوا۔

بنگالہ پر چڑھائی اوپر بیان ہو چکا ہے کہ ۷۴۰ھ میں سلطان محمد تغلق حاجی الیاس کو شمس الدین کا خطاب دے کر بنگالہ کی حکومت سپرد کر آیا تھا۔ حاجی الیاس نے جب سلطان محمد تغلق کی وفات اور ملک احمد ایاز کے شہید ہونے کا حال سُنا تو وہ اپنی خود مختاری کا اعلان اور باج وخراج سے قطعاً انکار کر کے بنارس تک کے علاقے پر قابض و متصرف ہو گیا۔ سلطان فیروز تغلق دہلی میں اپنے وزیر اعظم خان جہان کو بطور نائب السلطنت

چھوڑ کر خود معہ فوج ۱۰ ر شوال ۷۵۴ھ کو دہلی سے بنگالہ کی جانب روانہ ہوا۔ جب گورکھپور اور کھروسہ کے علاقے میں پہنچا تو گورکھپور کے راجہ جیارن نامی نے حاضر خدمت ہو کر نذرانہ پیش کیا اور معہ فوج شاہی لشکر کے ساتھ ہوا۔ یہی طریقہ کھروسہ کے راجہ اودے سنگھ نے بھی اختیار کیا۔ یہ دونوں راجہ صوبہ اودھ سے متعلق اور صوبہ دار اودھ کو خراج ادا کرتے تھے۔ سلطان نے خوش ہوکر راجہ جیارن اور اودے سنگھ کو اودھ کے صوبہ دار کی ماتحتی سے آزاد کر کے خود اختیاری و استقلال کے نشانات عطا کیے اور اُن کو براہِ راست شاہی خزانے میں اپنا خراج بھیجنے کا امتیاز عطا ہوا۔ شمس سراج عفیف کہتا ہے کہ :-

"بعضے راویان بدیں مورخ ضعیف گفتہ در آں وقت کہ لشکر سلطان گذار می شد سلطان فیروز شاہ را رائے جیارن را چتر دادہ"

ضیاء برنی کہتا ہے کہ:

"چوں رایات اعلیٰ در دیار گورکھپور و کھروسہ در آمد رائے گورکھپور کہ بس بزرگ رائے ست و رائے کھروسہ پیش از فترتہا و تنفرہا و پریشانیہا خراج گذارِ شق اودھ بودند کہ سالہا تمرد ورزیدہ و خراج باز گرفتہ بودند چوں رایات اعلیٰ آنجا رسید رایانِ مذکور در بندگی داخول خدایگانی آمدند و با خدمتیات خود زنجیر پیل گذرانید و عواطف خسروانہ چتر و تاج و قبائے مکلل و مرصع و اسپان تنگ بست یافت و چند مقدمان دیگر کہ در ولایت او بزرگ و رانا بودند با او جامہ پوشیدند و رائے کھروسہ نیز باندازہ ولایت خود خدمتیات گذرانید و با مقدمان ولایت خود جامہ یافت و کسوت مرحمت پوشید و رایان مذکور از سر اخلاص حلقہ بگوش کشیدند و منقاد و مطیع درگاہ اعلیٰ شدند و چند لک تنکہ نقرہ از بقایائے سنوات ماضیہ در خزانہ لشکر رسانیدند و در سنوات مستقبل خراج معین پذیرفتند و وثیقہ ہائے خراج بدرگاہ اعلیٰ دادند و از پیش تخت اعلیٰ محصلانِ خراج نامزد شدند و رایان مذکور با جمیع سوار و پیادہ خود در دنبال رایات اعلیٰ بر سمت لکھنوتی و پنڈوہ روان شدند"

شمس الدین حاکم بنگالہ فیروز شاہ تغلق کے آنے کی خبر سن کر ترہت سے پنڈوہ پہنچا۔ پنڈوہ میں بھی قیام مناسب نہ سمجھ کر تمام ساز و سامان اور لشکر و اہل شہر کو ہمراہ لے کر

پنڈوہ سے سات کوس کے فاصلے پر مقام اکدالہ میں جا کر محصور ہوا۔ مقام اکدالہ ایک طرف دریا اور دوسری طرف جنگل سے محصور اور زیادہ مضبوط مقام تھا۔ فیروز تغلق گورکھپور سے روانہ ہو کر مقام جگت میں پہنچا۔ جگت سے روانہ ہو کر جب ترہت میں گیا تو ترہت کا راجہ اور اس علاقے کے ہندو زمیندار جو شمس الدین کے ماتحت تھے سب فیروز تغلق کی خدمت میں حاضر ہو کر مورد الطاف خسروانہ ہوئے۔

رایات عالی از گورکھپور در جگت رسید و از جگت بر طریق تماشا در ترہت سایہ انداخت رائے ترہت و رانگان و زمینداران آں عرصہ بدرگاہ پیوستند و خدمتیات گذرانیدند و خلعت ہا و نوازشہا یافتند و عرصہ ترہت مطیع و منقاد گشت و از لشکر اسلام در عرصہ ترہت نکلتے نرسید۔ (برنی)

فیروز تغلق اکدالہ کے قریب دریا کے اس طرف قیام کر کے کئی ہفتے تک مقیم اور حاجی الیاس شمس الدین اکدالہ میں اس طرف متحصن رہا۔ اس عرصہ میں بنگالہ کے تمام ہندو امرا جو شمس الدین کے ماتحت تھے فیروز تغلق سے آملے۔

"از طائفہ راوان و رانگان و زمینداران ولایت بنگالہ بحضرت سلطان فیروز می پیوستند و امان می دادند۔" (شمس عفیف)

فیروز تغلق کی فوج میں گورکھپور اور کھردسہ کے راجہ مع اپنی جمعیتوں کے پہلے ہی شامل تھے اب بنگالے کے تمام ہندو بھی اس سے آملے لہٰذا اس کے لشکر میں ہندوؤں کی کثرت ہو گئی آخر شمس الدین خود ہی فوج لے کر اس طرف آیا اور ۵ ربیع الاول ۷۵۴ھ کو سخت مقابلہ ہوا شمس الدین میدان جنگ سے شکست خوردہ فرار ہو کر پھر اکدالہ کے قلعہ میں واپس چلا گیا۔ ضیاء برنی کی روایت کے موافق چوالیس ہاتھی اور شمس سراج عفیف کی روایت کے موافق سینتالیس ہاتھی اس لڑائی میں بطور مال غنیمت ہاتھ آئے۔ فیروز تغلق انھیں ہاتھیوں کو کافی سمجھ کر اور اکدالہ کا نام آزاد پور اور پنڈوہ کا نام فیروز آباد رکھ کر بنگالہ سے واپس چلا آیا۔ اس مہم سے بجز ان چند ہاتھیوں کے اور کوئی فائدہ حاصل نہ ہوا۔ حاجی الیاس المخاطب بہ شمس الدین اب پہلے سے بھی زیادہ مضبوطی اور شان و شوکت کے ساتھ بنگالہ کا خود مختار اور مطلق العنان بادشاہ ہو کر حکومت کرنے لگا۔ اکدالہ کو فتح اور حاجی الیاس کو گرفتار یا قتل کئے بغیر فیروز تغلق اس لئے واپس چلا آیا کہ اس کی فوج میں ہندوؤں

کی کثرت تھی اور اکدالہ میں حاجی الیاس کے ساتھ جو لوگ محصور تھے وہ سب مسلمان تھے ہندوؤں نے قطعاً اس کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ فیروز تغلق کو اپنے ہمراہی ہندو لشکر کا اشتیاق لوٹ مار کی نسبت معلوم ہو چکا تھا۔ اس کی غیرت اسلامی نے گوارا نہ کیا کہ جاہل لشکریوں سے شرفا کے ناموس کو برباد کرائے۔ ضیاء برنی نے اس کو صاف الفاظ میں اس طرح بیان کیا ہے۔

"از باعثِ ایمانی در خاطر مبارک گذشت چوں لشکر از آب عبرہ کنند و بہ میل سلطانی اکدالہ را تاراج کنند ہمراہ آنہ درچنیں ہجوم کثیر گناہگار و بے گناہ بزیر تیغ آیند و بواسطہ تغلب الیاس مشطط خون چندیں مسلمانان بے گناہ ریختہ شود و محارم مسلمانان شود و محارم مسلمانان سنی بدست اوباش خلق پایک و دھانک و مشرک و کافر خواہد افتاد و سفاحہا آشکار خواہد شد و علویان و دانشمندان و صوفیان و متعلمان درویشان و گوشہ نشینان و غریبان و مسافران تلف خواہند شد"

ضیاء برنی کے مذکورہ الفاظ سے اس امر کا سراغ بخوبی چل جاتا ہے کہ فیروز تغلق کے لشکر میں کن لوگوں کی کثرت تھی اور حاجی الیاس شمس الدین کے ہمراہیوں میں کون لوگ تھے شمس سراج عفیف اس موقع پر فیروز تغلق کے الفاظ اس طرح نقل کرتا ہے کہ

"چوں من درون ایں حصار درآیم و بدست مسلمانان توت نمایم چندیں عورات مستورات مخدرات بدست نااہلاں گرفتار گردند فردائے قیامت آمنا و صدقنا پیش کرسی قضا چہ روئے نمایم پس میان من و طائفہ مغل چہ فرق باشد"

فیروز تغلق کی ہندو بیوی

فیروز تغلق دس مہینے کے بعد ۱۲ شعبان ۷۵۵ھ کو بنگالہ کے سفر سے واپس ہو کر دہلی میں داخل ہوا۔ دہلی آتے ہی اُس نے موضع لراس بزرگ اور موضع لراس خورد کے مقام پر حصار فیروزہ (جو آج کل شہر حصار کے نام سے مشہور اور ضلع حصار کا دارالصدر ہے) کی آبادی و تعمیر کی طرف توجہ کی۔ یہ تمام علاقہ غیر آباد اور جنگل تھا، دور دور تک آبادی کا نام و نشان نہ تھا صرف مذکورہ دو موضع پاس پاس آباد تھے اور ان میں گوجر رہتے تھے جو اس زمانے میں عموماً قطاع الطریق اور جرائم پیشہ تھے۔ ڈھائی سال کے عرصہ میں سلطان فصیل شہر

کوشک شاہی اور جامع مسجد وغیرہ کی تعمیر سے فارغ ہوا۔ اسی عرصہ میں فتح آباد کو بھی آباد کیا۔ جمنا سے نہر لایا۔ ان دونوں شہروں کو گلزار سدا بہار بنا کر ان کے درمیانی علاقے میں بکثرت گاؤں اور قصبے آباد کر دیئے۔ پانی کی نایابی سے یہ خطہ ویران اور ناقابل زراعت سمجھا جاتا تھا۔ جمنا اور ستلج سے نہریں نکال کر اس علاقے کو آباد و سرسبز بنانا درحقیقت سلطان محمد تغلق کی مجوزہ اسکیم کو عملی جامہ پہنانا تھا مگر شہر حصار فیروزہ کی تعمیر و آبادی کے متعلق مجھ کو ایک خاص بات کی طرف جو آگے آتی ہے توجہ دلانی ہے اور اس لئے مذکورہ الفاظ بطور تمہید لکھنے پڑے ہیں۔ شمس عفیف کہتا ہے کہ

"این مورخ از زبان خدمت والد خود شنید کہ سلطان فیروز شاہ بعد از آمدن از مملکت بنگالہ دو نیم سال طرف حصار فیروزہ بود و برائے استقامت مملکت الزاع جدی نمود و ابواب احسان بسوئے ایشاں می کشود و بنائے شہر حصار فیروزہ ہدراں ایام بود ہر بار کہ سلطان فیروز در شہر (دہلی) آمدے چند روز معدود ماندے باز ہما نجا رفتے۔ چوں شاہ فیروز را اتفاق بنائے شہر حصار فیروزہ در دل افتاد در محلیکہ شہر حصار فیروزہ آباد داشت پیش ازیں بحکمت حضرت رب العالمین دراں مقام دو دیہہ بزرگ آباد ان بود یکے لراس بزرگ دوم لراس خورد"

شمس سراج عفیف کے بیان سے حصار فیروزہ کے مقام پر دو گاؤں کا پہلے سے آباد ہونا ثابت ہے۔ خواجہ نظام الدین احمد اپنی طبقات میں بجائے دو کے ایک ہی گاؤں بیان کرتے اور اس کا نام رالیس لکھتے ہیں۔ ملا عبدالقادر بدایونی اس گاؤں کا نام راس یا راسن بتاتے ہیں۔

حصار کی فصیل۔ جامع مسجد اور شاہی محل آج بھی موجود ہیں۔ آج کل بھی اور اس سے پہلے بھی حصار کا کوشک شاہی ہمیشہ گوجری   م سے مشہور رہا ہے۔ حصار کے اس گوجری محل کی نسبت شہر کے تمام قدیم خاندا   ں ضلع کے تمام قصبوں میں عظیم الشان تواتر کے ساتھ بلا اختلاف احدے یہ بات مشہور ہے کہ فیروز شاہ نے یہ محل اپنی گوجری بیوی کے لئے تیار کرایا تھا۔ اس محل کے توابعات مخصوصات اگرچہ سب منہدم اور ناپید ہو چکے ہیں لیکن اس کی خاص عمارت آج بھی بہت کچھ اپنی اصلی

حالت میں موجود اور باقی ہے۔ میں نے خود اسی تحقیق کے لئے حصار کا سفر اختیار کیا اور وہاں جاکر اس عمارت کو دیکھا۔ یہ عمارت خود اس بات کی گواہی دے رہی ہے کہ فیروز شاہ تغلق نے اپنی بیوی کی فرمایش سے یا اُس کو خوش کرنے کے لئے یہ محل تعمیر کرایا تھا۔ شمس سراج عفیف نے اس گوجری محل کا نقشہ جو الفاظ میں پیش کیا ہے اس طرح ہے کہ :۔

"و درون حصار یک کوشک برآوردند کہ در جہاں ہیچ کسے با تجسس بسے آنچناں کوشک را نشان ندادہ چندیں محل درآں کوشک محل نشستن بار جا نہادہ با تکلف بسیار رہبر آوردہ و حکمتہائے بے شمار درو داشتہ یک حکمت درآں کوشک ایں بود اگر کسے با فراست بسے درون کوشک محل فرود آمدے چوں محل گشتے درمیان آں رسیدے محل میانہ فرود کوشک بغایت تاریک با متقام باریک کہ اگر نگاہباناں آں کوشک رہبری نمی کردند ازاں تاریکی بیروں آمدن ممکن نبودے چنیں گویند وقتے فراشے تنہا درآں مقام درآمدہ بود چند روز غائب شدہ بعدہ ہماں نگاہباناں درآمدند وازاں تاریکی بیروں آوردند"

ملک گجرات کی مشہور تاریخ مراۃ سکندری میں سلطان فیروز تغلق کے ایک شکار کا واقعہ اس طرح درج ہے کہ فیروز تغلق سلطان محمد تغلق کے عہدِ حکومت میں ایک مرتبہ شکار کے لئے گیا اور کسی شکار کے پیچھے گھوڑا ڈال کر ہمراہیوں سے جدا ہوگیا۔ اس صحرا نوردی میں ایک گاؤں نظر آیا۔ فیروز تغلق نے دیکھا کہ گاؤں کے کچھ لوگ گاؤں سے باہر ایک جگہ بیٹھے ہوئے آپس میں باتیں کر رہے ہیں یہ گھوڑے سے اتر کر اُن کے پاس جا بیٹھا اور اُن میں سے ایک شخص سے مخاطب ہوکر کہا کہ ذرا میرے پاؤں کا موزہ کھینچنا۔ اُس نے موزہ پاؤں سے اُتارا اور علیحدہ ہوکر اپنے بھائی سے کہا کہ مجھے تو یہ شخص بادشاہ یا شاہی خاندان کا کوئی معزز آدمی معلوم ہوتا ہے۔ یہ دونوں بھائی جن کے نام سابجو اور سادھارن تھے اپنی قوم اور برادری کے سرگروہ اور بڑے آدمی سمجھے جاتے اور اسی گاؤں میں رہتے تھے۔ اُنھوں نے فیروز تغلق کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ گاؤں میں چلیئے اور آج رات کو ہماری مہمانی قبول کیجئے۔ مراۃ سکندری کے الفاظ یہ ہیں کہ :۔

شہر دو برادر زمین خدمت بوسیدہ استدعا نمودند کہ امشب اگر کلبہ مارا بنور مقدم خویش منور سازند ؎

از آں طرف نپذیرد کمالِ تو نقصان

ازیں طرف شرفِ روزگارِ ما باشد

سلطان قبول کرد تمام شب ہر دو برادر بپائے ایستادند و دادِ خدمتگاری دادند۔

جب فیروز تغلق سادھو اور سہارن کے مکان پر پہنچا تو سادھو کی بیوی جو بڑی ہوشیار اور چالاک عورت تھی اس نے کہا کہ اس اجنبی شخص کو اپنے گھر ٹھہرانا اور محض قیاس و قیافے سے اس کو شاہی خاندان کا آدمی خیال کر کے خاطر مدارات کرنا عقل کے خلاف ہے مناسب یہ ہے کہ اس کو شراب پلا کر اس کا حسب و نسب دریافت کیا جائے نشہ کی حالت میں وہ اپنا پتہ صاف صاف بتائے گا۔ چنانچہ سادھو کی نوجوان ہمشیرہ اور سادھو کی بیوی دونوں اس کمرے میں جہاں فیروز تغلق کو ٹھہرایا گیا تھا شراب لے کر پہنچیں سادھو کی ہمشیرہ جو نہایت خوبصورت تھی ساقی بنی فیروز تغلق پر جب سرور طاری ہوا تو۔

دل راغب بملاعبت و مائل بمخالطت گردید زوجہ سادھو چوں سلطان را صید ساقی دید زمینِ خدمت بلب حرمت بوسیدہ بکلام ادب آمیز و تکلم شوق انگیز متکلم شد از ہر درے سخن آغاز کردہ تا بجائے رسانید کہ از حسب ونسب سلطان سخن راند بمضمون آنکہ اگر ملازمان برکیفیت حسب و نسب خود اطلاع بخشند ایں دختر کہ بہتر از خواہر انور است معقود بزوجیت ایشاں گردانم سلطان فرمود نام من فیروز خاں است پسر عم سلطان محمد بن تغلق شاہم۔ زوجہ سادھو حقیقت را بشوہر خود ظاہر کرد و گفت کہ ہمائے دولت و عنقائے عزت بر فرق نامِ ماں سایہ انداز شدہ ایں شاہزادہ بدام جمال خواہرت گرفتار آمدہ اگر توانی خواہر را باوہ در صلتش ما مایۂ دولت مندی و سرافرازی داں۔ سادھو فی الحال خواہر را بنکاح آوردہ و بہ سلطان داد و آں شب را بعیش تمام و نشاط مالا کلام گذرانیدند چوں پردہ قیرگوں

شب ارتفاع یافت وعروس پردہ پوش آفتاب از حجلۂ افق نمایاں گشت سلطان بدل شاد از بستر ناز سر برداشت و سپاہ از ہر طرف پیدا شدہ سلطان بطرف شہر (دہلی) عزیمت فرمود سادھو و سہارن ہر دو برادر چوں سایہ ہمراہ رواں شدند و خود را در خدمت چناں قرار دادند کہ یک لحظہ از حضور بیروں قدم نمی نہادند سلطان را با خواہر ایشاں الفتے تمام پیدا شد آخر الامر در اندک مدت ہر دو برادر بشرفِ اسلام مشرف گشتند سلطان سہارن را بخطاب وجیہہ الملک مخاطب ساخت" (مراۃ سکندری)

یہی وہ گاؤں تھا جہاں شہر حصار آباد کیا گیا اور یہی فیروز تغلق کی وہ محبوب بیوی تھی جس کے لئے حصار کا گوجری محل تعمیر ہوا اور یہی وہ سہارن نو مسلم المخاطب بہ وجیہہ الملک تھا جو فیروز تغلق کی گوجری بیوی کا بھائی اور شاہانِ ملک گجرات کا مورث اعلیٰ تھا اور اپنی خوشی سے حضرت شیخ قطب الدین بانسوی کے ہاتھ پر مسلمان ہو گیا تھا

شاہانِ گجرات کا سلسلۂ نسب

مراۃ سکندری کے مصنف نے شاہانِ گجرات کا سلسلۂ نسب "ذکر سلسلۂ انساب عالی انتساب سلاطین گجرات" کا عنوان قائم کرکے اس طرح بیان کیا ہے کہ:-

"اول کسیکہ از ایشاں بشرف اسلام مشرف شد و بہ صفت ایمان موصوف گشت سہارن بودہ المخاطب بہ وجیہہ الملک مشائرٌ الیہ از قوم ٹانک است و در تاریخ ہنود مسطور است کہ ٹانک و کھتری برادران یک دیگر اند یکے از ایشاں بہ شرب شراب رغبت نمود او را کھتریان از قوم بر آوردہ شدہ ازیں رسم و آئین دینِ ٹانک امتیاز یافت و ہر کدام بطریق خویش سلوک پیش گرفتند و اسم پدر سہارن ہر جو پاست بن ہر پال بن کندر پال بن دھر پال بن کنور پال بن درمن بن مدسپ بن کنور بن تسلوک بن سلاہن بن مولاہن بن مندن بن بھوکت بن ناگت بن ولبھ بن دہمون آہنسو سلسلۂ نسب ایشاں بہ رامچندر کہ ہندواں بخدائے می پرستند می رسد"

وجیہہ الملک (سہارن) مذکور کا بیٹا ظفر خاں ملک گجرات کا پہلا خود مختار مسلمان بادشاہ تھا۔ اس خاندان میں اکبر کے زمانہ تک گجرات کی حکومت رہی یہ سلاطین گجرات اعلیٰ درجہ کے خدام اسلام اور اسلام کی بڑی غیرت رکھنے والے مسلمان تھے

حصار فیروزہ کی تعمیر و آبادی سے فارغ ہو کر ۵۵۵ھ میں سلطان فیروز تغلق نے دریائے جمنا کے کنارے دہلی سے پانچ میل شمال کی جانب شہر فیروز آباد کی بنیاد رکھی اور سب سے پہلے وہاں کی جامع مسجد تیار کرائی۔ آج کل اس شہر کا خرابہ موجودہ دہلی کے دہلی دروازے کے سامنے فیروز شاہ کے کوٹلہ کے نام سے مشہور ہے اور اسی میں جامع مسجد کے خرابے کے متصل فیروز شاہ کی لاٹ تصویر حسرت بنی ہوئی ہر سیاح کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔

بنگالہ پر دوسری چڑھائی

اسی زمانے میں ظفر خاں لودھی حاضر خدمت ہوا سنار گاؤں کے حاکم فخر الدین کے مارے جانے کا تذکرہ اوپر آچکا ہے فخر الدین کے گرفتار و مقتول ہونے کے بعد اُس کا داماد ظفر خاں لودھی فرار ہو کر جہاز میں سوار ہو گیا اس کا جہاز مختلف بندرگاہوں میں ہوتا اور جنوبی ہند کا طواف کرتا ہوا بندر دیبل میں پہنچا اور ظفر خاں بہزار وقت اپنے وطن افغانستان پہنچنے میں کامیاب ہوا وہاں سے اپنی حالت درست کر کے پٹھانوں کی ایک مختصر جمعیت لے کر ٹھٹھہ سے چل کر ۵۵۵ھ میں دہلی پہنچا۔ فیروز تغلق کو چونکہ بنگالہ کی مہم میں کوئی کامیابی نہ ہوئی تھی اور بنگالہ پر دوبارہ فوج کشی اور حاجی الیاس شمس الدین سے انتقام لینے کا خیال رکھتا تھا۔ لہٰذا اُس نے ظفر خاں لودھی کے آنے کو اس لئے بہت ہی غنیمت سمجھا کہ وہ شمس الدین حاکم بنگالہ کا مخالف تھا۔

آں شہریار بمراحم شاہی وعواطف بادشاہی ظفر خاں را لبسیار پرسیدہ و لبغایت لوا ختہ فرمان فرمود کہ ظفر خاں خاطر جمع دارد و اندیشہ را لبسوے خود مگمارد اگرچہ شدائید لبسیار و مکائد بے شمار دیدی و راہ ہائے مخالف و بیدا ہائے مخوف پیمودی المنۃ للہ بمقصود رسیدی ہرچہ در سنارگاؤں داشتی اضعاف آں بتو مفوض خواہد شد۔ (شمس سراج عفیف)

ظفر خاں کو فیروز تغلق نے نائب وزیر بنایا اور اس کے مرتبے کو دوسرے اکثر امراء سے بڑھایا۔ محمد قاسم فرشتہ شکوہ آمیز لہجہ میں کہتا ہے کہ فیروز تغلق نے افغانوں کے مراتب کو اپنے عہد حکومت میں بہت بلند کیا۔ فرشتہ کے الفاظ یہ ہیں:۔

و او اولیں بادشا ہیست از پادشاہان دہلی کہ در مقام تربیت افغانان شدہ برخلاف پادشاہان ماضی اعتمادے بر ایشان کردہ کسانیکہ درعہد

سلطان محمد تغلق از امیران صدہ بودند از امرائے کبار گردانید و سرحدہا را بہ ایشاں سپرد و قبل ازیں ایشاں را ایں مرتبہ و حالت نبود۔

حالانکہ ہندوستان کی تاریخ سے واقفیت رکھنے والے جانتے ہیں کہ خاندان غوری خود افغانی خاندان تھا۔ اس خاندان کے غلام جنھوں نے ہندوستان کی بادشاہت کی بلاشک ترکی النسل تھے۔ ان غلاموں کے بعد پھر افغانوں ہی کی حکومت شروع ہوگئی تھی اور اسی نے شہنشاہ اعظم وسلیم شاہ تک یعنی عہدِ مغلیہ سے پہلے کی اسلامی حکومت کو مورخین نے دورِ افغانیہ کے نام سے یاد کیا ہے کیونکہ ہندوستان کو افغانوں ہی نے فتح کیا اور افغانوں ہی کی قوم سلطنتِ اسلامیہ کی اصلی طاقت تھی۔ فرشتہ کے مذکورہ الفاظ کا مہمل ہونا کسی دلیل کا محتاج نہیں۔ ظفر خاں لودھی ہی وہ افغان تھا جس کے پوتوں یعنی ظفر خاں ثانی کے بیٹوں اقبال خاں، سارنگ خاں اور عادل خاں نے تیمور کا مقابلہ کیا تھا اور ظفر خاں لودھی ہی وہ افغان ہے جس کے پوتے دولت خاں ابن محمود خاں لودھی نے تیمور کے نائب اور دست گرفتہ خضر خاں کو عرصۂ دراز تک ولی پر قابض ہونے کی کوششوں میں ناکام رکھا تھا جس کا ذکر آگے آنے والا ہے۔ فرشتہ کا دادا ہندو شاہ چونکہ تیمور کا نوکر تھا لہذا فرشتہ ظفر خاں مذکور اور اس کے خاندان سے بہت ناراض ہے اور غالباً ظفر خاں ہی کی عزت افزائی اس کو سب سے زیادہ ناگوار گذری ہے کہ اس نے فیروز تغلق کو مذکورہ الفاظ میں مجرم قرار دیا ہے حالانکہ فیروز تغلق کے وہم وگمان میں بھی افغانوں کی قوم کو کوئی خصوصیت عطا کرنے کا خیال نہ آیا ہوگا۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ ساری عمر ایک ہندو خاندان کے نو مسلموں کو اپنی وزارت عظمی پر فائز نہ رکھتا۔ اس نے ظفر خاں لودھی کے ساتھ جو کچھ کیا اپنی ضرورت اور اس کی قابلیت کے موافق کیا۔

ماہ محرم ؁۷۶۰ھ میں فیروز تغلق ایک عظیم الشان لشکر ہمراہ لے کر معہ ظفر خاں بنگالہ کی طرف روانہ ہوا۔ حاجی الیاس الملقب بہ شاہ شمس الدین نے اگرچہ اپنے ایلچی معہ تحائف بھیج کر خراج گذاری کا وعدہ کر لیا تھا۔ لیکن ظفر خان کے آجانے کے بعد فیروز تغلق نے شاہ بنگال کو ایک مرتبہ نیچا دکھانا ضروری سمجھا۔

جونپور کا آباد ہونا قنوج اور اودھ کے درمیان جب ظفر آباد کے متصل پہنچا تو وہاں چھ مہینے مع لشکر مقیم رہ کر دریائے گومتی کے کنارے ایک

ایک شہر کی بنیاد رکھی اور اس کا نام جوناپور رکھا جو بعد میں جون پور مشہور ہوا عام طور پر تمام مورخین نے اس شہر کی وجہ تسمیہ یہی بیان کی ہے کہ سلطان محمد تغلق اصل نام چونکہ جوناخان تھا لہٰذا اسی سلطان مرحوم کے نام پر جونا پور نام رکھا گیا۔ لیکن اس حد بیت شہر کو آباد کرکے فوراً خان جہاں کی جاگیر قرار دینا اور خان جہاں کے بیٹے خان جہان ثانی کا نام بھی جوناخان ہونا یہ شبہ پیدا کرتا ہے کہ اپنے نومسلم وزیر اعظم خان جہان کے بیٹے جوناخان کے نام پر شہر کا نام رکھا گیا تھا۔ جب خان جہان قوام الملک نومسلم کا اٹھارہ سال کی وزارت عظمےٰ کے بعد ۷۷۰ھ میں انتقال ہوا تو فیروز تغلق نے اس کے بیٹے جوناخان کو خان جہان کا خطاب دے کر اپنا وزیر اعظم بنایا۔ اور بیس سال تک وہ وزیر اعظم رہا۔ اس کا نام جوناخان خود سلطان محمد تغلق نے اپنے نام پر رکھا تھا جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے۔

سلطان فیروز تغلق شش ماہ قیام کے بعد جونپور سے بنگالہ کی جانب روانہ ہوا۔ ابھی دو چار منزلیں طے ہوئی تھیں کہ شمس الدین پادشاہ بنگال کے فوت ہونے کی خبر پہنچی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کا بیٹا سکندر شاہ باپ کی جگہ تخت نشین ہوا ہے۔ سکندر شاہ نے ہر قسم کی جنگی تیاری کے بعد اپنے باپ کی تقلید میں مقام اکدالہ کے حصار میں محصور ہو کر فیروز تغلق کا انتظار کیا۔ لشکر دہلی نے حسب سابق اکدالہ کے قریب خیمہ زن ہو کر سلسلہ جنگ جاری کیا۔ دونوں لشکروں میں عرصہ دراز تک چھوٹی لڑائیوں کا سلسلہ جاری رہا۔ آخر طرفین کے امراء نے صلح کی سلسلہ جنبانی کی اور ہر دو بادشاہ صلح پر رضامند ہو گئے۔ سلطان فیروز تغلق نے اپنی ٹوپی بطور نشان صلح سکندر شاہ کے پاس بھیجی اور سکندر شاہ کو اپنا برادر زادہ کہا۔ سکندر شاہ نے بھی تحف و ہدایا اور چالیس ہاتھی فیروز تغلق کی خدمت میں بھیجے اور اس بات کا عہد نامہ لکھا گیا کہ آئندہ دہلی اور بنگالہ کے پادشاہوں میں کبھی جنگ نہ ہوگی اور ہمیشہ صلح رہے گی۔ اس صلح نامہ میں سکندر شاہ نے سنارگاؤں کی حکومت کا ظفر خاں لودھی کو سپرد کرنا منظور کر لیا تھا لیکن ظفر خاں نے خود ہی سنارگاؤں کی حکومت کو پسند نہ کیا۔ فیروز تغلق کے ہمراہ واپس آیا اور عہدہ نائب وزیر اعظم پر فائز رہا۔

جاجنگر اور اُڑلیسہ کا سفر فیروز تغلق جب واپس جونپور آیا تو اس کو معلوم ہوا کہ جاج نگر (چنار) کے جنگل میں جنگلی ہاتھی بہت ہیں۔ فیروز تغلق جون پور سے ہاتھیوں کے شکار کے لئے چنار کی جانب روانہ ہوا۔ جب بنارس کے قریب پہنچا تو شاہی لشکر کی آمد کا حال سُن کر راجہ دارالریاست چنار سے بھاگا۔ راجہ کی اس وحشت اور دہشت کو دیکھکر تھوڑی دور شاہی لشکر نے تعاقب کیا پھر ہاتھیوں کی گرفتاری میں مصروف ہو گیا۔ شمس سراج عفیف کہتا ہے کہ ؎

در جاج نگر چو بردہ لشکر — بگرفت اڑلیسہ را سراسر
جنگل کہ نگنجد شش سرمار — بشنید در آنست پیل بسیار
در رفتہ شکار پیل کردہ — پیلان ہزمیں ذلیل کردہ

ہاتھیوں کو ہزاری باغ کے جنگل میں گرفتار کرتا ہوا شاہی لشکر سمندر کے کنارے جگن ناتھ (پوری) کے مندر تک پہنچ گیا اور راجہ یہاں سے جہاز میں سوار ہو کر کسی جزیرہ میں چلا گیا۔ یہ وہی مندر تھا جو پنجاب کے راجہ جے پال کی خودکشی کے بعد ایک جدید مذہبی گروہ کے پیدا ہونے اور خودکشی کو ثواب یقین کرنے کے عقیدے کی بنا پر بنایا گیا تھا۔ یہاں انسانوں کی قربانی ہوتی تھی اور لوگ مکت حاصل کرنے کے لئے رتھ جاترا کے موقع پر اپنے آپ کو خود ہلاک کرتے تھے۔ ہندوؤں کے اس جدید سیاسی فرقہ کا تذکرہ دوسرے باب یعنی سلطان محمود غزنوی کے حالات میں آچکا ہے چنار (جاج نگر) کا راجہ اس مندر کا محافظ سمجھا جاتا تھا۔ جگن ناتھ کا بت پتھر کا تراشا ہوا تھا۔ اس بت کو وہاں سے اُٹھواکر دہلی بھجوایا گیا۔

زآنجا شدہ در کنار دریا — بت خانہ جدید برشد یا
جگن ناتھ لعین دیو و رشے — ہر جا کہ ہنود بندہ بروے
برکند ز بیخ شہر بردہ — در خاک بپیش خوار کردہ

(شمس سراج عفیف)

جگن ناتھ کے بت اور ہاتھیوں کی گرفتاری سے فارغ ہوکر فیروز تغلق نے راجہ کی گرفتاری کا بندوبست کیا۔ تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ رائے جاج نگر تلنگانہ کی

طرف بھاگا تھا مگر شمس سراج عفیف کا بیان یہ ہے کہ وہ کسی جزیرہ میں جاکر پناہ گزین ہوا تھا۔ فرشتہ اور ملا عبدالقادر بدایونی نے جاج نگر کے راجہ کے علاوہ ایک اور راجہ مسمی بیر بھان دیو کا ذکر کیا ہے جس نے سینتیس ہاتھی بادشاہ کی خدمت میں بھیج کر امان طلب کی اور اس کو امان دی گئی۔ شمس سراج عفیف صرف ایک ہی راجہ کا ذکر کرتا اور جاج نگر سے سمندر کے جزیروں تک اس کو بھگاتا ہے۔ تاریخوں کے مطالعہ کے بعد جہاں تک غور کیا جاتا ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرزاپور اور چنار سے لے کر اڑلیسہ کے ساحل یعنی خلیج بنگالہ تک دو یا تین راجہ حکمراں تھے۔ سب سے پہلے چنار کا راجہ فرار ہوا اور تلنگانہ میں جاکر پناہ گزین ہوا اس کے بعد شاہی لشکر آگے بڑھا تو ہزاری باغ کا راجہ فرار ہوا۔ اور آگے بڑھا تو اڑلیسہ کا راجہ سمندر کے جزیروں میں بھاگا۔ اڑلیسہ اور جاج نگر (چنار) کے راجاؤں کے نام نہیں لئے گئے ان کو صرف رائے جاج نگر اور رائے اڑلیسہ کہکر یاد کیا گیا۔ بیر بھان دیو جس نے سینتیس ہاتھی دے کر امان حاصل کی، غالباً ہزاری باغ کا راجہ تھا۔ اور ممکن ہے کہ یہی اڑلیسہ کا بھی راجہ ہو۔ شمس سراج عفیف نے اس بات کا لحاظ نہیں رکھا کہ اس سفر میں ایک ہی راجہ سے واسطہ پڑا تھا یا کئی راجاؤں سے۔ بہرحال جاج نگر کے راجہ سلطان دہلی کے مطیع و منقاد چلے آتے تھے۔ سلطان غیاث الدین تغلق کے عہد حکومت میں جاج نگر کے راجہ نے تلنگانہ کے راجہ کی بغاوت و سرکشی میں شرکت کی تھی مگر بہت جلد اس کو درست کر دیا گیا تھا۔ اس کے بعد جاج نگر کے راجہ سے کوئی ناشائستہ حرکت ظہور میں نہیں آئی تھی۔ اب جب کہ سلطان فیروز تغلق جنگلی ہاتھیوں کے پکڑنے کو اُس طرف آیا تو راجہ یہ سمجھا کہ سلطان نے میرے اوپر چڑھائی کی ہے چنانچہ وہ بے تحاشا بھاگ نکلا اور خواہ مخواہ اپنے آپ کو مجرم بنایا۔ اس کو چاہیئے تھا کہ سلطان کی آمد کا حال سُن کر استقبال کرتا اور نذرانہ پیش کرکے مورد الطاف خسروانہ ہوتا اب سلطان کو اپنے درپے دیکھ کر اس نے اپنے پانچ برہمن مصاحب یا فدیر جن کو پاتر اور مہتہ کہتے تھے سلطان کی خدمت میں بھیجے۔

رائے مذکور از غایت خوف و نہایت ہراس چند پاتر خود را بدرگاہ شاہ و بارگاہ شہنشاہ فرستادو زبان عجز کشاد۔ چنانچہ سلاطین و زرائے باریک بیں دارند ہم چناں رایان و راگان و زمینداران دارحرب مہتگان راپیش می

دارند و در زمین جاج نگر مہتہ را پاتر گویند۔ رائے مذکور نیز بیست نفر پاتر داشت کہ ایشاں را مہتگاں گفتند برائے وتدبیر ایشاں کار ہائے ولایت خود بیارست فی الحاصل رائے مذکور پنج نفر پاتر خود را بدرگاہ عالم پناہ حضرت فیروز شاہ فرستاد و از حال عجز کمال خود اعلام داد و ابواب لجاج چون بندگان مطیع کشاد۔ چوں مہتگاں رائے بحضرت شہنشاہ گیتی آرائے پائے بوس کردند وجبین عبودیت راچوں بندگان مطیع سودند و از حال احوال رائے باز نمودند والتماس کردند کہ رائے جاج نگر بندہ مطیع و بندہ زادۂ قدیم آں درگاہ است ہمیشہ فرماں بردار حضرت جہاں دارا ست بر بندہ مسکین و عاجز و غمگین چہ قصد می فرمانید چوں مہتگاں ازیں باب گفتند دریں محل حضرت شہنشاہ اکمل فرمود کہ ما را دریں حدود مصلحتے بخیر بود چوں مخبر بصدق باز نمود کہ متصل سکونت رائے جنگلے انبوہ یا کشتہائے چوں کوہ است و دراں جنگل پیلان دستی چوں کوہ سفنداں می گردند برائے شکار پیل ایں جانب قصد نمودہ شد رائے را چہ رو داد کہ از خوف ما روے در گریز نہادہ در مقامات جزائر بطا فتادہ۔ (شمس عفیف)

ان ایلچیوں کو عزت کے ساتھ رخصت کیا راجہ کی دلدہی و استمالت میں مطلق کوتاہی نہیں کی گئی اس کو بدستور سابق ریاست پر بحال رکھکر اور بیس ہاتھی سالانہ بھیجے رہنے کا وعدہ لے کر واپس ہوا۔ سلطان کو دہلی سے جدا ہوئے دو سال اور سات ماہ کا عرصہ گذر چکا تھا کہ ماہ رجب ۷۶۳ھ دہلی واپس آیا۔ ان ہاتھیوں کے علاوہ جو دہلی سے ہمراہ گئے تھے بنگالہ اور جاج نگر سے تہتر ہاتھی اور ہمراہ لایا اور جدید شہر فیروز آباد (کوٹلہ فیروز شاہ) کی شہر پناہ بنوانے میں معروف ہوا۔

فیروز پور کی تعمیر اور کانگڑہ پر چڑھائی

رعایا خوش حال اور ہر طرح فارغ البال تھی۔ شمس سراج عفیف کہتا ہے کہ

"واہل کفر از طائفہ ذمیاں و امانیاں زیر سایہ چتر فیروز شاہی از رعیت بادشاہی بر رفاہیت می گذرانیدند"

چند روز دہلی میں قیام کرنے کے بعد نہر سلیم اور سرستی ندی کے درمیان ایک

پہاڑی پشتہ کو کاٹنے پر پچاس ہزار بیل دار لگائے کہ اس کو کاٹ کر سرستی کا پانی نہر سلیم میں ڈال دیا جائے۔ اس پشتہ کو کاٹتے ہوئے ہاتھیوں اور آدمیوں کی بہت سی ہڈیاں نکلیں۔ آدمی کے ہاتھ کی ہڈی تین گز لانبی تھی جس کا کچھ حصہ پتھر کی شکل میں تبدیل ہو چکا تھا۔ انھیں ایام میں سرہند کو سامانہ کی ولایت سے جدا کرکے الگ کمشنری بنائی اور ایک قلعہ تعمیر کرکے اس کا نام فیروز پور رکھا جو آج کل "فیروز پور جھرکہ" کے نام سے مشہور ہے یہیں خبر پہنچی کہ نگرکوٹ یا کانگڑہ کا راجہ خود سری و بے راہ روی اختیار کر چکا ہے۔ چنانچہ سلطان بلا توقف اس طرف کو روانہ ہوا راجہ فرار ہو کر پہاڑ کے اندر محفوظ مقامات میں چلا گیا لیکن جب اس کا تعاقب جاری رہا تو مجبور ہو کر عاجزانہ فیروز تغلق کے قدموں میں آگرا اور عفو تقصیر کی التجا کی سلطان نے اس کی خطا معاف کرکے خلعت عطا کیا اور ریاست پر برقرار رکھا۔

"چوں بندگان مطیع فرود آمده درپائے سلطان فیروز شاہ گیتی آراست افتاد زبان یہن از عذر کشاد۔ حضرت شاہ چوں سلاطین اہل گاه به اوج جاه دست بر پشت رائے نہاده جامہ ہائے زرد وزی و زربفت داده ویک چتر عطا کرده ہماں زماں چو آئین جہانداران بازگردانید"

(شمس سراج عفیف)

یہاں بادشاہ کو معلوم ہوا کہ جب سکندر اس جگہ آیا تھا تو یہاں کے لوگوں نے اس کی منظور نظر نوشابہ کا بت بنا کر اس کی پرستش شروع کر دی تھی وہ بت آج تک یہاں کے ہندوؤں کا معبود ہے یہ سن کر سلطان نے نوشابہ کے بت کو وہاں کے بت خانہ سے اٹھوالیا اور اپنے ہمراہ لے آیا۔ اس واقعہ کو شمس سراج نے اپنی تاریخ میں نہیں لکھا لیکن تاریخ فرشتہ اور تاریخ بدایونی میں اس کا تذکرہ موجود ہے۔ سیر المتاخرین کے الفاظ یہ ہیں کہ:-

"درآں وقت کہ سلطان قصد مراجعت داشت کسے گفت کہ اسکندر رومی درزمان ورود خود دریں مکان صورت نوشابہ درست کرده دریں جا گذاشتہ بود اہل ہند بعد مرور دہور آں را بھوانی نامیده پرستش می نمایند"

اس جگہ فیروز تغلق کو یہ بھی معلوم ہوا کہ نگرکوٹ کے بت خانے میں تیرہ سو کتابیں

موجود ہیں۔ بادشاہ نے برہمنوں کو طلب کر کے ان کتابوں کا معائنہ کیا اور چند کتابوں کا ترجمہ کرایا منجملہ اُن کے ایک کتاب کا ترجمہ اُس زمانے کے مشہور شاعر اعزالدین خالد خانی نے نظم میں کیا اور اس کا نام دلائل فیروز شاہی رکھا۔

پادشاہ علمائے آں طائفہ را طلب کردہ بعضے از آں کتب را ترجمہ فرمود ازاں جملہ اعزالدین خالدخانی کہ شعرائے آں عصر بود کتابے در حکمت طبعی و شگون و تفاولات در سلک نظم کشیدہ دلائل فیروز شاہی نام کردہ است

(فرشتہ)

ملا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں کہ میں نے اس کتاب کو لاہور میں دیکھا تھا لیکن بہت ہی معمولی کتاب ہے اور چنداں قابل تعریف نہیں ہے۔ ملا صاحب کے الفاظ یہ ہیں کہ

"دریں حال بعرض سلطان رسانیدند وقتے کہ سلطان سکندر ذوالقرنین باینجا رسید ازآں باز مردم ایں شہر صورت نوشابہ ساختہ درخانہ داشتہ اند و معبود ایشان است و یک ہزار و سہ صد کتاب از برہمنان سابق درین بتخانہ است کہ بجوالا مکھی اشتہار دارد ہمیشہ آتشے سر بفلک کشیدہ ازآنجا می افروزد سلطان برہمنان را طلبید و بعد ازآں کتب را فرمود تا مترجمان بزبان فارسی ترجمہ نمایند ازآنجملہ عزیزالدین خالدخانی کہ از شعرائے و منشیان عصر فیروزی بود کتابے در بیان صعود ہبوط سیارات سبع و سعادت و نحوست آنہا و تفاول و شگون بنظم آوردہ دلائل فیروزی نام راندہ و فقیر جامع منتخب (ملا عبدالقادر بدایونی) درلاہور درسنہ ۱۰۰۰ھ آں را از اول تا آخر دیدہ خالی ہم نے و تعریف ہم نے و چند کتابے دیگر قبل ازیں ہم بنظر فقیر رسیدہ کہ بنام سلطان فیروز ترجمہ شدہ بعضے ازاں در علم سنگیت یعنی فن موسیقی و اقسام اکھاڑہ کہ آں را پاتر بازی می گویند و بعضے در غیرآں و اکثرا بے حاصل یافت غالبًا بے مزگی آں جہت مطلب و صعوبت تعبیر خواہد بود چنانچہ ظاہر است"

۷۶۵ھ میں فیروز تغلق نگرکوٹ کی مہم سے فارغ ہوا اسی زمانہ میں تاتار خاں جو حصار کا گورنر مقرر ہوا تھا اور سلطان فیروز تغلق کو ہمیشہ نصیحت کرتا اور پابندی شرع کی طرف توجہ دلاتا رہتا تھا فوت ہوا۔ تاتار خاں کے فوت ہونے کے بعد سلطان محمد تغلق کی پابندی شرع کا کوئی نمونہ اُمرا میں باقی نہ رہا۔

ٹھٹہ کی جانب فوج کشی اور امرا کی مخالفت

۷۶۶ھ میں سلطان فیروز تغلق نے ٹھٹہ کی جانب فوج کشی کی اس کے وزیر اعظم خان جہاں اور دوسرے امرا کی خواہش نہ تھی کہ ٹھٹھہ کی جانب فوج کشی کی جائے انھوں نے فیروز تغلق کو سمجھایا کہ جام ٹھٹھہ سے صرف یہ خطا ہوئی ہے کہ اس نے طغی نمک حرام کو اپنے یہاں پناہ دی تھی مگر اب جب کہ طغی کا کام تمام ہو چکا ہے اور جام ٹھٹھہ اطاعت و فرماں برداری کا اقرار کرتا ہے تو اس طرف فوج کشی کی مطلق ضرورت نہیں ہے۔ مگر فیروز تغلق نے کہا کہ سلطان محمد تغلق میرا بھائی اور مربی تھا وہ مرتے وقت جام ٹھٹھہ کی سزا دہی کا مصمم ارادہ رکھتا تھا لہذا میں جام ٹھٹھہ کو اب اور زیادہ مہلت نہیں دے سکتا۔ میں اس پر ضرور چڑھائی کروں گا۔ جب سلطان کو بار بار یہی ذکر کرتے ہوئے دیکھا تو امرا نے مخالفت چھوڑ کر خاموشی اختیار کی

> "ہر بار کہ ذکر ٹھٹہ افتادے دست بر محاسن مبارک فرود آوردے و فرمودے افسوس صد ہزار افسوس کہ یک آرزوئے در دل خداگان مغفور ماند یعنی محمد شاہ بن تغلق شاہ کہ ٹھٹہ فتح نشد ازیں دلائل مقابل مقربان درگاہ و امیران بارگاہ معلوم می شد کہ البتہ میل دل شاہ واندیشہ حضرت شہنشاہ برائے سواری وشکار سمت ٹھٹہ ماندہ است" (شمس سراج عفیف)

آگے چل کر لکھتا ہے کہ

> "سلطان فیروز شاہ بر خان جہاں بدیںساں گفتہ گوہر اسرار میسفت وزیر سفتہ کہ بتقدیر اللہ تعالیٰ سلطان مرحوم مغفور بجوار رحمت حضرت غفور آسودہ وایں آرزو دل ایشاں ماندہ چوں حضرت الٰہ مارا بجائے ایشاں نشاندہ انتقام ایشاں کشیدن شاید یا نہ دریں محل دستور مسطور در تامل افتاد دریائے قلب خویش چوں دستوران نیک اندیش ابواب فکر کشاد بعد زمانے برموازات کلمات احسن پرداختہ و گفتہ کہ ایں اندیشہ نیکو اندیشہ است"

آخر خان جہاں وزیر اعظم کو دہلی میں قائم مقام چھوڑ کر نوے ہزار سوار اور چار سو اسی ہاتھی ہمراہ لے کر سلطان فیروز تغلق ٹھٹہ کی جانب روانہ ہوا۔ راستے میں اجودھن (پاک پٹن)، ہوتا ہوا اور حضرت شیخ فرید الدین گنج شکر علیہ الرحمہ کی قبر پر حاضری دیتا ہوا، قصر پہنچا

ٹھٹہ دریائے سندھ کے دونوں جانب آباد تھا اور وہاں دو شخص حکومت کرتے تھے دریا کے ایک جانب رائے اُنڑ کا بھائی جام حکمراں تھا اور دوسری جانب رائے اُنڑ کا بیٹا بانبیہ فرماں روائی کرتا تھا۔ یہ دونوں چچا بھتیجے اتفاق و اتحاد کے ساتھ ٹھٹہ اور سندھ کے اکثر علاقے پر قابض و متصرف تھے۔ ان کی قوم سومرہ کہلاتی تھی اور یہ ان لوگوں کی اولاد میں تھے جو محمد بن قاسم کے زمانے میں مسلمانوں کے فرماں بردار و مطیع ہو کر بعد میں اکثر مسلمان بھی ہو گئے تھے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ بدھوں کی وہ قوم ہے جنھوں نے محمد بن قاسم کے ہندوستان سے رخصت ہونے کے بعد محمد بن قاسم کا بت بنا کر اس کو پوجنا شروع کر دیا تھا۔ جب عربوں کی حکومت سندھ سے جاتی رہی تو یہ ہندوؤں میں گھل مل کر ایک جدید ہندو قوم بن گئے تھے جو سومرہ کے نام سے پکاری جاتی تھی۔ اس قوم کی نسبت مختلف خیالات کا اظہار مختلف مورخین نے کیا ہے۔ اس بحث کے چھیڑنے کا یہ موقعہ نہیں۔

فیروز تغلق نے ٹھٹہ کا محاصرہ کیا اور لڑائیوں کا سلسلہ جاری ہوا مگر حسب منشا کوئی نتیجہ پیدا نہ ہوا سامان رسد کی فراہمی کا بھی کوئی بندوبست نہ ہو سکا۔ قحط و گرانی نے لشکر میں سخت ابتری پیدا کر دی مجبوراً سلطان کو ٹھٹہ کی مہم آئندہ سال کے لئے ملتوی کر کے گجرات کی طرف جانا پڑا۔ لشکر کے رہبروں نے شرارت سے کام لے کر سلطان کو معہ لشکر کوچھی رن میں سمندر کے کنارے پہنچا دیا جہاں سوائے آب شور اور نمک زار کے کسی درخت اور سرسبزی کا نام و نشان نہ تھا۔ غلہ کی نایابی۔ آب شیریں کا نہ ملنا۔ اور اس لق و دق صحرا سے نکلنے کا کوئی راستہ ہاتھ نہ آنا کئی مصیبتیں جمع ہو گئیں اور امید زیست منقطع ہونے لگی آخر بڑی دشواری اور بڑی ہینے کی خواری کے بعد سلطان گجرات پہنچا گجرات کی حکومت ملک نظام الملک کے سپرد تھی۔ سلطان نے گجرات پہنچ کر ملک نظام الملک کو بہت سخت سست کہا اور اس کو گجرات کی حکومت سے معزول کر دیا کیونکہ اس نے ٹھٹہ کے محاصرے میں سلطان کو کسی قسم کی مدد نہیں پہنچائی تھی۔ شمس سراج عفیف کے الفاظ یہ ہیں:۔

" دریں محل سلطان فیروز شاہ چوں سلاطین اہل نگاہ باوج جاہ بر ملک نظام الملک نصرت خواہ گرم مزاجی کردہ کلمات عفیف از زبان خویش

برآوردہ وآں گرم مزاجی را سبب چہ بود۔ سلطان فرمود اگر تو از گجرات بدفعات غلہ ہامی فرستادے وغم لشکرہا می خوردے خلق لشکر تلف نشدے نظام الملک از گجرات معزول شد"

گجرات پہنچ کر سلطان نے اپنے لشکر کی حالت کو کسی قدر درست کیا اور اپنے وزیر اعظم خان جہاں کے پاس پیغام بھیجا کہ دہلی سے گھوڑے اور ہتھیار وغیرہ بھیجو . . . سلطان کو دہلی سے جدا ہوئے ڈھائی سال کا عرصہ گذر چکا تھا۔ دہلی سے جدید لشکر معہ بہت سے سامان لشکر کے پہنچا۔ فیروز تغلق ۷۶۷ھ میں گجرات سے ٹھٹہ کی جانب روانہ ہوا۔ ظفر خاں لودھی کو گجرات کی حکومت سپرد کر کے نظام الملک کو اس کی جگہ نائب وزیر بنایا جوں ہی سلطان فیروز تغلق گجرات سے ٹھٹہ کی طرف روانہ ہوا اکثر سپاہی لشکر کو چھوڑ کر اپنے اپنے گھروں کو بھاگنا شروع ہوئے۔ سلطان کو جب یہ حال معلوم ہوا تو سرداران لشکر سے مشورہ کیا انھوں نے کہا کہ لشکر کے چاروں طرف چوکی پہرہ قائم کرنا چاہیے تاکہ کوئی جدا نہ ہو سکے۔ شمس سراج عفیف کہتا ہے کہ

"چوں ایں گفتار بسمع جہاں دار رسید فرمان شد بریں اشخاص چہ باید کرد مقربان درگاہ و مشیران بارگاہ عرضہ داشتند کہ در منزل گاہ ہا چوکی ہا می باید نشاندتا خلق را رفتن ندہند و ہر کہ برود اورا تدارک کنند"

سلطان کو یہ مشورہ پسند نہ آیا اور کہا کہ جو جدا ہونا چاہتا ہے اُسے جدا ہونے دو کیونکہ قیدیوں کی طرح سپاہیوں کو ساتھ رکھنے سے کوئی فائدہ نہیں اگر ٹھٹہ کا فتح ہونا خدا کو منظور نہیں ہے تو مشیت ایزدی کے سامنے ہم مجبور ہیں۔ سلطان نے اپنے وزیر خان جہاں کو لکھا کہ جو لوگ ہم سے جدا ہو کر دہلی پہنچیں اُن کو بلا کر تم صرف معمولی ملامت کرنا اور کوئی سخت سزا نہ دینا۔ آخر سلطان ٹھٹھہ کے قریب پہنچا اور معرکہ دار و گیر گرم ہوا چار ہزار سندھی گرفتار ہوئے۔ باقی فرار ہو گئے۔ یہ گرفتار ہونے والے سب مسلمان تھے۔ ٹھٹھہ کی فتح کو اب بھی دشوار دیکھ کر سلطان نے ٹھٹھہ کے قریب قیام کر کے لوگوں کو زراعت کے کاٹنے اور غلہ فراہم کرنے کا حکم دیا۔ سندھیوں کے کھیت پختہ کھڑے تھے اور وہ ابھی کھیتی کاٹنے نہ پائے تھے کہ سلطانی لشکر پہنچ گیا۔ ایک طرف غلہ کی فراہمی پر لوگوں کو مامور کیا دوسری طرف عماد الملک کو دہلی کی جانب

روانہ کر کے وزیر اعظم کے نام حکم بھیجا کہ جس قدر فوج فراہم ہو سکے ہمارے پاس بھیجو۔ عماد الملک دہلی پہنچا اور بدایوں، قنوج، سندیلہ، اودھ، جون پور، بہار، ترہت، مہوبہ، چندیری، دہار، دہلی، سامانہ، دیپالپور، لاہور وغیرہ کی فوجوں کو ہمراہ لے کر دہلی سے ٹھٹھہ کی جانب واپس ہوا۔ یہ عظیم الشان لشکر جب پادشاہ کی خدمت میں پہنچ گیا تو جام اور بانبیہ کو قدر عافیت معلوم ہونے لگی اور ہلاکت کو یقینی سمجھ کر جان بچانے کے درپے ہوئے انھوں نے مخدوم جہانیاں سید جلال الدین رحمہ کی خدمت میں بمقام اُچ پیغام بھیجا کہ اب ہم سے کچھ نہیں ہو سکتا آپ براہ مہربانی صلح کرا کر ہم کو امان دلوا دیجئے چنانچہ سید محمدوح اُچ سے چل کر سلطانی لشکر میں پہنچے۔

"چوں خدمت سید در لشکر رسید ند تمام خلق لشکر برائے پابوس سید بدل و جان کوشیدند و ہر کہ از طائفہ اہل در سرائے پابوس خدمت سید کردے خدمت سیدی فرمودند بابا انشاء اللہ تعالیٰ بعنایت اللہ میاں چند روز اصلاح خواہد شد خدمت سید چوں نزدیک تر رسید سلطان فیروز چوں معتقدان برائے ملاقات سید از دل و جان کوشید"۔ (شمس سراج عفیف)

غرض سلطان فیروز تغلق سید ممدوح کا استقبال کر کے خیمہ شاہی میں لایا اور عزت کے مقام پر بٹھایا۔ سید صاحب نے فرمایا کہ ٹھٹھہ میں ایک صالحہ و پارسا عورت تھی اس کی دعا کی برکت سے ٹھٹھہ اب تک فتح نہیں ہوا۔ میں جب کبھی تمھاری کامیابی و فتح کے لئے جناب الٰہی میں دعا کرتا وہ عورت قبولیت دعا میں حائل ہوتی۔ اب تین روز ہوئے کہ وہ فوت ہو گئی ہے اس لئے اُمید ہے کہ ٹھٹھہ جلد فتح ہو جائے گا اُدھر جام اور بانبیہ نے جن کی تحریک سے سید صاحب اُچ سے تشریف لائے تھے سید ممدوح کے پاس جلد جلد پیغامات بھیجنے شروع کئے۔

"چوں ٹھٹیان (جام و بانبیہ) شنیدند کہ حضرت سید جلال الدین در لشکر نزول فرمودند پیغامہا متواتر بخدمت سیدی فرستادند و کیفیت دشواری خویش باز نمودند خدمت سید نیز آنچہ مطلوب ایشان بود با سلطان سنت مدت داد آنچہ ایشاں از غایت خاطر پریشاں خود باز نمودند سلطان فیروز شاہ اضعاف آں از راہ مرحمت ارزانی فرمود"۔ (شمس سراج عفیف)

جام اور بانبیہ کے ساتھ رعایت

خلاصۂ کلام یہ کہ جام اور بانبیہ دونوں سلطان فیروز کی خدمت میں حاضر ہوئے سلطان نے ان کو خلعت اور ایک ایک تازی گھوڑا عنایت کر کے عزت و احترام کے ساتھ ملوک و امرا کی طرح اپنے پاس جگہ دی اور ٹھٹھہ کی حکومت پر جام کی جگہ جام کے بیٹے کو اور بانبیہ کی جگہ بانبیہ کے بھائی تماچی کو مقرر کر کے اُن سے سالانہ خراج کی ادائگی کا اقرار لیا اور جام و بانبیہ کو حکم دیا کہ مع متعلقین ہمارے ہمراہ دہلی کی جانب چلو۔ دونوں نے بخوشی منظور کیا۔ سلطان مع لشکر ملتان پہنچا۔ ملک مروان دولت کو حاکم مقرر کیا۔ وہاں سے روانہ ہو کر ۷۷۴ھ میں دہلی پہنچا جام اور بانبیہ دونوں کے لئے خزانہ شاہی سے دو دو لاکھ روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر کیا اور رہنے کے لئے دار السلطنت کے متصل ایک اچھی جگہ عطا کی جو سرائے ٹھٹھہ کے نام سے موسوم ہوئی دربار میں ان دونوں کو تخت شاہی کے داہنی جانب جگہ ملتی تھی۔

"جام و بانبیہ نیک نام با تمام خیل خانہ خویش در شہر دہلی رسیند فرمان شد تا خیل خانہ ایشاں را متصل سرائے ملک مقام دہند تا ایشاں بخاطر جمع در آں جائگاہ ساکن شوند چوں خیل خانہ ایشاں دراں محل جائے یافتند دراں مقام بافرحت تمام آباداں شدند و آں محل را سرائے ٹھٹھہ نام داشتندد حضرت فیروز شاہ مبلغ دو لک ٹنکہ برائے جام و دو لک ٹنکہ برائے بانبیہ نقد از خزانہ موفورہ در وجہ انعام سالینہ تعین کردہ و جز آن ہر روز جامہ ہا و اسباب و نعمت ہائے فراواں چنداں می یافتند کہ ٹھٹھہ را بالکلی فراموش کردند و بوقت دربارہا چوں سلطان فیروز تغلق نشستے جام و بانبیہ طرف بازوے راست در جامخانہ دوم نشستہ شدے" (عفیف)

چند سال کے بعد تماچی برادر بانبیہ نے ٹھٹھہ میں بغاوت کی تو سلطان نے جام کو اس طرف روانہ کیا اس نے تماچی کو دہلی کی جانب بھیج دیا اور خود ٹھٹھہ میں اس کی جگہ قیام کیا۔ بانبیہ اور تماچی دونوں دہلی میں رہے۔ جام اور اس کا بیٹا ٹھٹھہ میں حکومت کرتے اور سلطان دہلی کی غلامی کا دم بھرتے رہے۔ سلطان فیروز تغلق کے آخر ایام حیات یعنی ۷۸۹ھ میں جبکہ اُس نے اپنے بیٹے محمد خان الملقب بہ ناصر الدین محمد شاہ کے

حق میں تخت سلطنت کو چھوڑ دیا تھا با نبیہ کو چتر سفید دے کر ٹھٹھہ کی حکومت پر مامور کر کے دہلی سے رخصت کیا گیا مگر وہ راستہ ہی میں فوت ہو گیا شمس سراج عفیف نے سلطان فیروز شاہ کے ارکان سلطنت کی فہرست اور دربار میں ان کے مرتبے اور نشست کا مفصل تذکرہ کیا ہے۔ ان ارکان سلطنت میں جام۔ با نبیہ۔ رائے مدار دیو رائے سبیر۔ساونت ادھرن کا خاص طور پر ذکر کیا ہے جو زمرۂ ملوک دوزرا میں شامل اور دربار میں اعلیٰ مقام پر جگہ پاتے تھے۔

خان جہاں نومسلم اور متفرق حالات

۷۷۰ھ میں خان جہاں نے وفات پائی اور سلطان فیروز تغلق نے اس کے بیٹے جونا خان کو خان جہاں کا خطاب دے کر وزیر اعظم بنایا۔ یہ وہی خان جہاں تھا جس کا ہندوانی نام کنو اور جو تلنگانہ کا ایک ہندو تھا۔ دہلی آ کر حضرت شاہ نظام الدین اولیا رحمہ کی مجلس میں خواجہ جہاں ملک احمد ایاز کے ہمراہ آنے جانے لگا پھر حضرت ممدوح کے ہاتھ پر مسلمان ہوا ...... سلطان محمد تغلق نے اس کو تربیت دے کر زمرۂ امرا میں شامل کیا اوّل قوام الملک کا خطاب ملا پھر خان جہاں ہو گیا اور سلطان محمد تغلق کی وفات کے بعد سلطان فیروز تغلق کا وزیر اعظم بنا۔ اسلام ذات پات اور چھوت چھات کی بیہودہ تبودے کس قدر پاک ہے اور مسلمان اپنے محکوموں کو کس قدر ترقی کا موقع دے سکتے ہیں اس کا اندازہ کرنے کے لئے خان جہاں کے سوانح حیات پر غور کرنا کافی ہے۔ ہندوستان کے ہندو اور اس ملک کی اچھوت اقوام اگر صرف خان جہاں کے حالات سے بخوبی واقف ہوں تو وہ مسلمان کے عہد فرماں روائی کی نسبت غلط فہمیوں اور گمراہیوں سے نجات پا سکتے ہیں۔ خان جہاں کی وفات کے بعد اس کے بیٹے جونا خان خانجہان ثانی نے باپ کی قبر کے پاس امفتاح التواریخ کی روایت کے موافق ۷۸۹ھ میں، ایک مسجد بنوائی جو آج تک دہلی میں ترکمان دروازہ کے پاس کالی مسجد کے نام سے مشہور ہے۔

۷۷۲ھ میں سلطان فیروز تغلق نے ملک راجا فاروقی کو دو ہزاری منصب عطا کر کے خاندیس کے علاقے میں دو پرگنے عطا کئے۔ یہی ملک راجہ فاروقی سلاطین خاندیس کا مورث اعلیٰ ہے۔

۷۷۵ھ میں ظفر خاں لودھی حاکم گجرات کا انتقال ہوا اس کی جگہ اس کے بیٹے دریا خاں لودھی کو ظفر خاں کا خطاب دے کر گجرات کی حکومت سپرد کی گئی۔ اسی سال ملک مرداں دولت المخاطب بہ نصیر خاں حاکم ملتان کا انتقال ہوا اس کی جگہ اس کے بیٹے ملک شیخ کو حکومت ملتان سپرد ہوئی مگر وہ بھی چند روز بعد فوت ہوا۔ اُس کی جگہ مردان دولت نصیر خاں کے لے پالک (متبنیٰ) سلیمان کو ملتان کا حاکم بنا دیا گیا۔ اسی ملک سلیمان کا بیٹا خضر خاں تھا جو بعد میں سید خضر خاں کے نام سے دہلی کا بادشاہ ہوا۔

۷۷۶ھ میں سلطان فیروز تغلق کے بیٹے فتح خاں نے جو ولی عہد سلطنت تھا تقریباً پچیس سال کی عمر میں وفات پائی اور دو بیٹے اپنی یادگار چھوڑے۔ سلطان نے اس رنج و غم کے عالم میں بہرائچ جا کر مسعود سالار غازی کی قبر پر سر منڈوایا۔ جب سلطان نے بال منڈوائے تو اس کی تقلید تمام امرائے دربار نے بھی کی۔

۷۷۸ھ میں ظفر خاں ثانی کی جگہ شمس الدین دمغانی گجرات کا گورنر مقرر ہوا ظفر خاں ثانی کو صوبہ کی حکومت سپرد کی گئی۔ چند روز کے بعد شمس الدین باغی ہو کر مارا گیا اور اس کی جگہ ملک مفرح نو مسلم المخاطب بہ فرحت الملک گجرات کا حاکم بنایا گیا۔

۷۷۹ھ میں اٹاوہ کے ہندو زمینداروں نے سرکشی پر کمر باندھی اور سلطان نے خود اس طرف جا کر اس فتنہ کو فرو کیا۔

۷۸۱ھ میں دہلی سے سامانہ کی طرف گیا وہاں سے سہارنپور اور سرمور کی طرف آیا یہاں کے رایوں سے نذرانہ و خراج وصول کر کے دہلی واپس آیا۔ کٹھر کا علاقہ رائے کھرگو یا رائے نکھو کر نام ایک ہندو راجہ کو سپرد تھا رائے کھرگو نے بدایوں کے سید علاء الدین، سید محمد اور سید محمود سہ برادران کو ضیافت کے بہانے سے اپنے یہاں بلایا اور دھوکے سے تینوں بھائیوں کو شہید کر دیا۔ یہ خبر بادشاہ کو پہنچی تو وہ ۷۸۲ھ میں دہلی سے روانہ ہو کر کٹھر کے علاقے میں پہنچا۔ رائے کھرگو بدایوں سے بھاگ کر کوہ کمایوں میں چلا گیا اور وہاں پہاڑوں میں اس طرح چھپ گیا کہ اس کا کہیں پتہ نہ چلا۔ چونکہ برسات کا موسم آ گیا تھا۔ سلطان ملک داؤد افغان کو سنبھل کے علاقے کا حاکم بنا کر اور ملک قبول کو بدایوں کی حکومت پر نامزد کر کے دہلی کی جانب واپس آیا ملک داؤد کو تاکید کی گئی تھی کہ کھرگو کی دیکھ بھال رکھے اور کٹھر کے سرکش ہندوؤں

کی گوشمالی سے غافل نہ رہے اس کے بعد خود بھی ہر سال کٹھر آتا اور یہاں کے سرکشوں کو سزا دیتا رہا۔

۷۸۷ھ میں بدایوں سے سات کوس کے فاصلے پر موضع بسولی میں ایک قلعہ بنایا اور فیروز پور اس کا نام رکھا۔ چونکہ یہ سلطان فیروز تغلق کی بنوائی ہوئی آخری عمارت تھی یعنی اس کے بعد کسی قلعہ کی تعمیر کا اس کو موقع نہیں ملا، لہٰذا بعد میں لوگوں نے بسولی کے اس قلعہ کو فیروز پور کی جگہ آخرین پور کے نام سے پکارنا شروع کیا۔

خان جہان ثانی کی شرارت

۷۸۹ھ میں خان جہاں ابن خانجہاں وزیر اعظم نے سلطان فیروز تغلق اور اس کے بیٹے محمد خاں میں عداوت و نااتفاقی پیدا کرنے کی کوشش کی اور سلطان سے کہا کہ شہزادہ محمد خاں بغاوت کا قصد رکھتا ہے اور اُس نے ظفر خاں لودھی، ملک سماء الدین، ملک یعقوب اور ملک کمال الدین وغیرہ کو اپنا شریک کار بنا لیا ہے۔ الفنسٹن صاحب اس موقع پر لکھتے ہیں کہ

"جب کہ وزیر کو حکومت کی چاٹ لگی اور عمدہ اختیاروں کا مزہ پڑا تو اُس نے یہ بات چاہی کہ پادشاہ کو اس کے وارث کی جانب سے برہم کرے اور اپنے اختیاروں کو ہمیشہ کے لئے قائم و دائم رکھے چنانچہ اُس نے پادشاہ سے لگانا بجھانا شروع کیا اور قریب تھا کہ پادشاہ کے بیٹے کو خارج کر کے تخت نشینی حاصل کرے۔"

سلطان چونکہ خان جہاں کا بہت اعتبار کرتا تھا لہٰذا اس نے خاں جہاں کو حکم دیا کہ ان سب کو گرفتار کر لو۔ خان جہاں نے ظفر خاں کو حساب فہمی کے لئے مہوبہ سے طلب کیا جب وہ دہلی آیا تو دھوکے سے گرفتار کر کے اپنے مکان میں اس کو قید کر دیا۔ اس کے بعد شہزادہ محمد خاں کی گرفتاری کے درپے ہوا، شہزادے نے خبر پا کر اپنے مکان کی مضبوطی کر لی اور خان جہاں کے قابو میں نہ آیا۔ ایک دن موقع پا کر اور ڈولی میں بیٹھکر سلطان کے پاس زنان خانہ میں پہنچ گیا۔ پادشاہ کے قدموں پر سر رکھ کر خان جہاں کی شرارت۔ اپنی اور ظفر خاں کی بے گناہی کا تمام حال سُنایا سلطان نے اصل حالات سے واقف ہو کر شہزادہ کو حکم دیا کہ جاؤ خان جہاں کو قتل

کر کے ظفر خاں کو قید سے نکالو۔ شہزادہ بلاتوقف فوج لے کر خان جہاں کے مکان پر پہنچا۔ خان جہاں نے واقف ہو کر ظفر خاں لودھی کو جو اس کی قید میں تھا قتل کیا اور اپنے آدمی لے کر شہزادے کے مقابلے کو نکلا لیکن زخمی ہو کر پھر مکان میں چلا گیا اور چند رفیقوں کے ساتھ دوسرے دروازے سے نکل کر دہلی سے بھاگ گیا اور میوات پہنچ کر کوکا چوہان کے پاس پناہ گزیں ہوا۔ اس جگہ فرشتہ کے اس اقتباس کو جس میں اُس نے فیروز تغلق کی افغان پسندی کا تذکرہ کیا ہے یاد کرو اور سوچو کہ ظفر خاں ابن ظفر خاں لودھی جو بہترین سردار ثابت ہو چکا تھا اور صوبہ کے خطرناک سرکشوں کو راہ راست پر لانے کے لئے صوبہ کی حکومت پر تبدیل کیا گیا تھا۔ کس طرح فیروز تغلق کی بے پروائی سے خان جہاں کی نامعقول خواہش کا شکار ہوا۔ شہزادہ نے سلطان کی خدمت میں حاضر ہو کر ظفر خاں کے شہید ہونے اور خان جہاں کے بھاگ جانے کا حال سنایا۔

فیروز تغلق کی گوشہ نشینی اور وفات

سلطان چونکہ بہت ضعیف ہو چکا تھا اس لئے شہزادہ محمد خاں کو ماہ شعبان ۷۸۹ھ میں تخت نشین کر کے اُس کے لئے ناصرالدین محمد شاہ کا لقب تجویز کیا اور سلطنت سپرد کر کے خود گوشہ نشین ہو گیا۔ ناصرالدین محمد شاہ نے تخت نشین ہو کر حکم دیا کہ جمعہ کے خطبہ میں دونوں پادشاہوں کے نام لئے جائیں۔ تمام شاہی اہل کاروں کو بدستور قائم رکھ کر خلعت عطا کئے۔ ملک یعقوب کو سکندر خاں کا خطاب دے کر گجرات کی حکومت پر مامور کر کے روانہ کیا۔ ملک یعقوب سکندر خاں جب میوات کے قریب پہنچا تو کوکا چوہان نے ڈر کے مارے خان جہاں کو جو اس کی پناہ میں تھا پکڑ کر سکندر خاں کے پاس بھیج دیا۔ سکندر خاں نے خان جہاں کو قتل کر کے اس کی لاش دہلی بھجوادی اور خود گجرات کی طرف روانہ ہوا۔ خان جہاں کی لاش اس کے باپ خان جہاں اول کی قبر کے پاس کالی مسجد میں دفن کی گئی۔ کالی مسجد میں دونوں باپ بیٹوں کی قبریں اب بھی موجود ہیں لیکن اکثر سیاح جب اس مسجد کو دیکھتے ہیں تو ان کو بھول کر بھی اس بات کا خیال نہیں آتا کہ اس مسجد میں دکن کے ایک ہندو خاندان کے دو نومسلم باپ بیٹے مدفون ہیں جو ہندوستان کی وزارت عظمیٰ پر فائز تھے۔ سلطان ناصرالدین محمد شاہ سرمور کوہ پایہ کی طرف برائے شکار گیا وہاں اُس نے سنا کہ فرحت الملک اور امیران صدہ گجرات نے

متفق ہو کر ملک یعقوب سکندر خاں کو گجرات میں داخل ہونے نہیں دیا اور مقابلہ کر کے اُسے قتل کر دیا۔ یہ خبر سُن کر سلطان ناصرالدین محمد شاہ سرمور سے دہلی آیا مگر گجرات کے فتنے کو فرو کرنے میں غفلت و بے پروائی سے کام لیا۔ چونکہ ناصرالدین محمد شاہ سلطان فیروز تغلق کی پہلی بیوی کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا اور فتح خاں گوجری بیوی کے پیٹ سے تھا اس لئے وجیہہ الملک (سہارن) کی جماعت کو ناصرالدین محمد شاہ کے ساتھ کوئی ہمدردی نہ تھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فیروز تغلق کے غلاموں اور بعض امیروں نے علم بغاوت بلند کر کے فیروز تغلق کو گوشۂ عزلت سے نکال کر اپنے ساتھ لیا اور مقابلہ پر مستعد ہوئے۔ ناصرالدین محمد شاہ کے ہمراہیوں نے فیروز تغلق کو ان باغیوں کے ساتھ دیکھا تو سب اُس طرف جا ملے۔ ناصرالدین جب تنہا رہ گیا تو دہلی سے بھاگ کر سرمور چلا گیا اور اس کی جگہ دہلی میں تغلق شاہ ابن فتح خاں ابن فیروز تغلق تخت نشین کیا گیا۔

۱۸ رمضان ۷۹۰ھ مطابق ۲۳ راکتوبر ۱۳۸۸ء کو فیروز تغلق کا انتقال ہوا۔

فیروز تغلق پر ایک نظر

فیروز تغلق نے اپنے عہد حکومت میں چھوٹی بڑی سو نہریں آب پاشی کے لئے نکالیں جو سلطان محمد تغلق کے مجوزہ آئین کی تکمیل تھی۔ چالیس مسجدیں، تیس مدرسے۔ تیس خانقاہیں سو محل۔ دو سو سرائیں۔ پانچ سو شفا خانے۔ ڈیڑھ سو حمام۔ ڈیڑھ سو کنوئیں۔ سو پل اور بہت سے باغات تعمیر کرائے۔ تیس شہر آباد کئے۔ کئی سنگی منارے نصب کئے۔ اُس کے زمانے میں کوئی قحط نہیں پڑا۔ کاشت کار مالامال اور رعایا خوش حال رہی اُس کی حکومت کے تفصیلی واقعات کو اس جگہ بیان نہیں کیا گیا۔ اوپر جو کچھ بیان ہوا ہے اس سے بخوبی اندازہ ہو سکے گا کہ سلطان فیروز تغلق کے عہد حکومت میں ہندوؤں کے ساتھ مسلمانوں کا عام طور پر کیا سلوک رہا۔ سلطان فیروز تغلق نے اڑیسہ کے ایک مندر سے جگن ناتھ کی پتھر کی مورتی دہلی بھجوائی اور اسی طرح نگر کوٹ سے نوشابہ کی مورت اپنے ہمراہ لایا لہذا کہا جا سکتا ہے کہ فیروز تغلق محمد تغلق کی نسبت ہندوؤں کے لئے زیادہ سخت اور غیر ہمدرد تھا۔ لیکن فیروز تغلق کے جسم میں محمد تغلق کی نسبت ہندی خون کی کثرت تھی یعنی اس کی ماں ہندو قوم کی عورت تھی محل میں اُس کی محبوب بیوی، دربار اور سفر و حضر میں

ہر وقت ساتھ رہنے والا مصاحب وجیہہ الملک دونوں ہندو قوم سے تعلق رکھتے تھے اس کا با اختیار و ذی اقتدار وزیر اعظم بھی دکن کا ایک ہندو تھا۔ ان باتوں پر غور کرنے سے ساری ذمہ داری مسلمانوں کے سر سے اتر کر ہندو قوم کے سر پر آپڑتی ہے۔ تاہم یہ بات فراموش نہ ہونی چاہیئے کہ جاج نگر، اڑیسہ اور نگرکوٹ کے راجاؤں نے جن سے بت لیے گئے تھے ان بتوں کی مفارقت پر کوئی اظہار ملال نہیں کیا اور آئندہ ہمیشہ فیروز تغلق کے وفادار و فرماں بردار رہے۔ پس جب خود ان راجاؤں اور ان کے بعد ان کے جانشین ہندوؤں نے بھی ان واقعات کو کوئی اہمیت نہیں دی تو آج کے ہندوؤں کو جن کی نگاہوں کے سامنے اصل واقعات نہیں گزرے ان پتھر کے دو تراشیدہ ٹکڑوں کے لئے شور و غل مچانے کا کیا حق حاصل ہو سکتا ہے۔ سلطان فیروز تغلق کے عہد حکومت میں کس قدر ہندو کون کون سے علاقوں پر حکومت کرنے کے لئے مامور تھے اوپر کے بیان سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ہندو جن جن علاقوں پر مامور و متعین تھے وہ سب مسلمانوں کی مہربانی اور خوشی سے ہندوؤں کو عطا کئے گئے تھے کسی ہندو میں یہ طاقت نہ تھی کہ وہ زبردستی سلطان کی رضامندی کے خلاف کسی صوبہ یا کسی ضلع پر قابض و متصرف رہ سکے۔ جب کسی سے بے راہ روی معائنہ ہوتی تھی تو اس کو فوراً سزا دے کر درست کر دیا جاتا تھا۔ ایسی حالت میں جب کہ مسلمانوں پر ہندوؤں کا کوئی بھی دباؤ نہ تھا ہندوؤں کو اعلےٰ عہدے دینے اور صوبوں کی حکومتوں پر مامور کرنے، دربار میں مسلمانوں سے اونچی جگہ بٹھانے اور ہندو نژاد لوگوں کو وزارت عظمیٰ تک پہنچا دینے میں مسلمانوں نے قومی و مذہبی تفریق کو کبھی مد نظر نہیں رکھا اور کسی مسلمان کے دل میں بھول کر بھی یہ خیال نہیں پیدا ہوا کہ ہندوؤں کو جو ہر طرح مغلوب و محکوم ہیں کیوں ان کے استحقاق سے زیادہ مراتب دیئے جا رہے ہیں اس سے زیادہ دنیا کا کوئی حیرت انگیز واقعہ نہیں بتایا جا سکتا کہ آج ہندوستان کے ہندو مسلمانوں کی حکومت اور مسلمانوں کے سلاطین کو گالیاں دے دے کر اور جھوٹے افسانے ان کی ذات سے وابستہ کرکے مسرت حاصل کر رہے ہیں فیروز شاہ تغلق کے متعلق مجھ کو صرف دو تین باتیں اور بیان کرنی ہیں۔

ہندو بچوں کی پرورش اور افزونیٔ اقتدار

اوّل یہ کہ فیروز تغلق کو شروع سے اس بات کا شوق تھا کہ وہ لاوارث

اور یتیم و بے کس بچوں کو اپنی نگرانی میں لے کر شاہی اہتمام سے پرورش و تربیت کراتا اور اعلیٰ تعلیم دلاتا۔ جب وہ جوان اور تعلیم یافتہ و شایستہ ہو جاتے تو اُن کو اعلیٰ عہدوں پر مامور کرتا۔ صوبوں کی گورنری اور فوج کی سپہ سالاری تک پہنچاتا۔ یہ لوگ شاہی غلام کہلاتے ان میں زیادہ تعداد اودھ اور پوربی اضلاع کے ہندو بچوں کی تھی۔ ان لوگوں کی قدر و منزلت اور عیش و راحت کو دیکھ کر پوربی اضلاع کے اکثر ہندوؤں نے خود اپنے بچوں کو صوبیداروں اور عاملوں کے ذریعہ بادشاہ کی خدمت میں کوششیں کرکے بھجوانا شروع کیا۔ اس طرح ہندوؤں کی قوم کو شایستگی اور تعلیم میں ترقی کرنے کا خوب موقع ملا۔ سلطان فیروز تغلق ان عاملوں سے بہت خوش ہوتا تھا جو اس قسم کے بچے زیادہ لاکر پیش کرتے تھے۔ ان لڑکوں کی ایک بڑی تعداد سلطان اپنے ملوک وامرا کو تعلیم و تربیت کے لئے سپرد کردیتا اور وہ ان کو شایستہ و تعلیم یافتہ بنا کر سلطان کی خدمت میں پیش کرکے سرخ روئی حاصل کرتے۔

"بعضے بندگان بر حکم و فرمان سلطان تسلیم پیشے امرا و ملوک می شدند تا ایشان را ادب خدمت آموزند امرا و ملوک آن بندگان را بطریق فرزندان می پرورند وطعام و جامہ و سرجامہ شستن و ہنر آموختن و مقام خوردن و خفتن و غم خوارگی ایشان بواجبی نگاہ می داشتند و ہر سالے ایشان را پیش تخت می گذرانید وادب و خدمت و ہنرہائے ایشاں پیش تخت عرضہ می داشتند۔ سلطان فیروز شاہ در باب آن امرا و ملوک چنداں مرحمت می فرمودند کہ در تحریر نیاید"

(شمس عفیف)

اس سلسلے نے یہاں تک ترقی کی کہ سلطان فیروز تغلق کے آخر عہد حکومت میں یہی ساری سلطنت پر چھا گئے اور ان کی قوت یہاں تک بڑھ گئی کہ انھوں نے خاندان تغلقیہ کی بربادی کے تمام سامان فراہم کرکے امیر تیمور کو ہندوستان کی طرف آنے کا موقع دیا۔ اور ہندوستان کی سلطنت اسلامیہ کو سخت مصائب میں مبتلا کیا۔ شمس سراج عفیف اوپر کے مذکورہ الفاظ لکھنے کے بعد کہتا ہے کہ

"آخر الامر کار بندگان مذکور بجائے کشید کہ بعد از سلطان فیروز شاہ بہتے جگر گوشہ گان اور امید تیغ بریدند و پیش دربار آویختند کما قال اللہ تبارک تعالیٰ

وَعَسٰی اَن تُحِبُّوْا شَیْئًا وَّ هُوَ شَرٌّ لَّکُمْ

سلطان فیروز تغلق نے ان غلاموں اور ہندو بچوں کی طاقت و تعداد کے بڑھانے اور اُن کے اثر و اقتدار کو اعلیٰ مقام پر پہنچانے کا انتظام محض اس لئے کیا تھا کہ وجیہہ الملک کے زیر قیادت یہ لوگ اس کے بیٹے فتح خاں کو جو وجیہہ الملک (سہارن) کا ہمشیر زادہ تھا ہر قسم کی تقویت پہنچا سکیں فتح خاں جب باپ کے سامنے فوت ہو گیا تو اب سوائے محمد خاں کے دوسرا مستحق سلطنت نہ تھا لیکن وجیہہ الملک۔ اس کی بہن یعنی فیروز شاہ کی گوجری بیوی خان جہاں نومسلم وزیر اور ہندو امرا سب اس بات کے خواہاں تھے کہ محمد خاں الملقب بہ ناصرالدین محمد ابن فیروز تغلق کو محروم رکھ کر فتح خاں کے کم سن بیٹے کو تخت سلطنت کا مالک بنا یا جائے۔ یہ بالکل اسی قسم کی کوشش اور اسی قسم کی سازش تھی جیسا کہ اکبر کے مرض الموت میں مان سنگھ اور دوسرے ہندو سرداروں نے اکبر کے بیٹے جہانگیر کو محروم رکھنے اور اکبر کے پوتے خسرو کو تخت سلطنت پر بٹھانے کے لئے کی تھی۔ یہ کوشش بھی ہندنی ماں کے بیٹے کو وارث حکومت بنانے کے لئے تھی اور وہ کوشش بھی اسی لئے تھی کہ ہندنی ماں کے بیٹے کو تخت سلطنت کا مالک بنا یا جائے۔ خان جہاں ثانی کا محمد خاں اور اس کے ہمدرد سرداروں کے خلاف کوشش کرنا بھی اس بات کی دلیل ہے کہ فیروز تغلق کی گوجری بیوی اور اس کے نومسلم بھائی کی حمایت اس کو حاصل تھی۔ محمد خاں ابن فیروز تغلق کو تخت سلطنت سے محروم رکھکر فتح خاں ابن فیروز تغلق کی نسل میں بادشاہت کے قایم رکھنے پر ایک زبردست جماعت تلی ہوئی تھی جس کی کوششوں کا نتیجہ خاندان سلطنت کی تباہی ہوا۔ جیسا کہ آیندہ واقعات سے ثابت ہو جائے گا۔

فیروز تغلق کی مذہبی قابلیت اور اس کے عقائد

دوسری بات قابل گذارش یہ ہے کہ سلطان فیروز تغلق جیسا کہ اس کے مذکورہ حالات سے ثابت جنگ قابلیت اور شجاعت میں محمد تغلق کے پاسنگ بھی نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بنگالہ پر دو مرتبہ چڑھائی کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ چند ہاتھی ہاتھ آئے اور ان کے عوض بنگالہ کا ملک ہاتھ سے دے آئے۔ دکن کے ملک کو خود مختار و آزاد ہونے کا موقعہ دیا اور

اس وسیع ملک کے واپس لینے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اس کی اس کمزوری یا بے ہمتی کی طرف عام طور پر مورخین نے اشارہ کیا ہے لیکن سخت حیرت کی بات یہ ہے کہ اکثر مورخین نے محمد تغلق کو مذہب سے بے تعلق اور فیروز تغلق کو مذہبی آدمی بتایا ہے ع

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

حقیقت یہ ہے کہ محمد تغلق ایک عالم متبحر اور اعلیٰ درجہ کا پابند مذہب شخص تھا قسم کھانے کو اس کی کوئی کبھی ایک بات ایسی نہیں بتائی جا سکتی جو خلاف مذہب ہو۔ فیروز تغلق اگرچہ رسمی طور پر پڑھا لکھا آدمی تھا لیکن عالم علم دین ہرگز نہ تھا شمس سراج عفیف اس کا آخر ایام حیات میں نماز روزہ اور عبادات الٰہیہ کی طرف متوجہ ہونا بیان کرتا ہے جو دلیل اس بات کی ہے کہ اس کی عمر کا اکثر ابتدائی حصہ غفلت میں گذرا۔ ضیا برنی نے باوجود مخالفت محمد تغلق کی پابندی نماز اور گناہوں سے مجتنب رہنے کا کئی جگہ ذکر کیا ہے لیکن شمس سراج عفیف جو فیروز تغلق پر دل و جان سے قربان اور مدح و ثنا میں بے حد مبالغہ کرتا ہے فیروز تغلق کی نسبت ایک مرتبہ بھی اس قسم کی گواہی نہیں دے سکا۔ ہاں فیروز تغلق کی شراب خواری کا صاف الفاظ میں اس نے ضرور اقرار کیا ہے۔

ہندو مذہب کا اثر قبول کرنے کی وجہ سے گور پرستی اس میں موجود تھی۔ بیٹے فتح خاں کے مرنے پر بہرائچ جا کر سر منڈوانا صریح اس بات کا نتیجہ تھا کہ اس کی ماں ہندو خاندان کی عورت تھی۔ اس کی ہندو بیوی موجود تھی اور وہ خود شریعت اسلام سے کافی اور وسیع واقفیت نہیں رکھتا تھا بلکہ اُس کا اسلام وہی اسلام تھا جو شرکیہ و بدعیہ مراسم کے آمیختہ ہو جانے کے بعد اس زمانے کے جاہلوں اور مراسم پرست بدعتیوں کا اسلام تھا وہ جب کسی مہم پر روانہ ہوتا تو اول قبروں پر جاتا۔ قبروں کو سجدہ کرتا اور اپنے آپ کو بجائے خدا کے ان صاحب قبر بزرگوں کی پناہ میں دیتا تھا یہ اسی شرک اور گور پرستی کا نتیجہ تھا کہ اس کو کسی بڑی لڑائی میں کوئی نمایاں فتح حاصل نہیں ہوئی۔ شمس سراج عفیف کی چشم دید گواہی بھی سُن لو۔

"این سنت سنیہ و خصائل مرضیہ سلطان فیروز شاہ را بود ہر بار کہ

> خواستے از شہر دہلی جائے سواری کند اگرچہ یک ماہ یا دو ماہ سواری بودے عاقبت جمیع دین دار و سلاطین نام دار را زیارت کردے و از ہر یکے استمداد خواستے خود را در پناہ ایشاں انداختے ....
>
> تا آنکہ سلطان فیروز شاہ مدت چہل سال در پایہ جہانبانی باوج کامرانی بود ایں رسم پسندیدہ و شیوۂ گزیدۂ او تا آخر عہد او مستقیم ماند کہ بغیر زیارت بزرگاں و گشتن در مزار پاکان در سمت ہیچ طرفے سواری نہ کردے
>
> چوں سلطان فیروز شاہ در مزار بزرگے رسیدے باعتقاد تمام بسوے قبر او دویدے بتواضع تمام تواضع کردے و کلہ بر زمین آوردے بارہا دریں کارہا ایں مورخ ضعیف شمس سراج عفیف بچشم خود دیدہ .... دوسرا محل دیگر نیز سر بر زمین نہاد چوں معتقدان اخلاص می کشت و چوں نزدیک قبر شیخ می رسید بتواضع تمام ہمائے رضائے غلام نزدیک قبر نیز سر بر زمین میہاورد .... بعدہ چتری شد غلاف قبر خدمت شیخ می گرفت و اسرار و حاجات خود می گفت ۔

بھلا محمد تغلق سے اس قسم کی خلاف شرع حرکات کہاں سرزد ہو سکتی تھیں۔ محمد تغلق نے تو ایسی غیر مشروع باتوں کے مٹانے میں اپنی زندگی صرف کر دی! اسی لئے لوگ اُس کے دشمن ہو کر اس کے لئے مشکلات پیدا کرتے رہے چونکہ فیروز تغلق کمزور طبیعت کا آدمی تھا اور مذہب سے اچھی طرح واقف نہ تھا لہذا اُس نے تخت نشین ہوتے ہی اپنے آپ کو ان لوگوں کی نگاہ میں جو اُس کے اردگرد بکثرت موجود اور قابو یافتہ تھے ہر دل عزیز بنانے کی کوشش کی اور بزرگوں کی قبروں پر مذکورہ افعال و حرکات بجا لا کر اور مجاوروں کے بڑے بڑے روزینے مقرر کر کے عوام کے بڑے طبقہ کی ہمدردی و محبت کو خرید لیا۔ محمد تغلق کی طرح سلطان شمس الدین التمش، سلطان ناصر الدین محمود، سلطان غیاث الدین بلبن اور جلال الدین خلجی بھی بڑے مذہبی اور صوفی منش سلاطین تھے۔ صوفیوں اور بزرگوں کی بڑی عزت کرتے اور ان کی خدمت میں نیاز مندانہ حاضر ہوتے اور بتواضع پیش آتے لیکن کسی نے بھی گور پرستی کا یہ نمونہ نہیں دکھایا تھا جو فیروز تغلق سے ظہور میں آیا۔ اور اسی لئے کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان

میں فیروز تغلق ہی کے چہل سالہ طرزِ عمل نے گور پرستی کے مراسم کو ایسا پائدار و استوار بنایا کہ آج تک اس سے مسلمانوں کا پیچھا نہیں چھوٹا۔ فیروز تغلق سے یہ جو کچھ سرزد ہوا اس کا سبب اس کی کم علمی اور قرآن و حدیث سے ناواقفیت تھی۔ اس کی یہ شرافت ضرور قابل داد ہے کہ وہ اپنے محسن و مربی محمد تغلق کی وفات کے بعد اس سے محبت کا اظہار کرتا اور محمد تغلق کے اس احسان کو کہ اُس نے بیٹے کی طرح محبت کے ساتھ اسے پرورش کیا تھا مانتا تھا۔

انچہ بر ماست از ماست

تیسری بات جس کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے یہ ہے کہ فیروز تغلق کو محمد تغلق کے مخالفوں اور سازشی لوگوں نے جب تک ممکن ہوا ان لوگوں کی سزا دہی سے باز رکھا جنھوں نے محمد تغلق کے لئے مشکلات پیدا کر دی تھیں۔ ٹھٹھہ کی جانب فوج کشی کرنے سے فیروز تغلق کو روکنا پھر فوج کشی اور محاصرہ ہونے کے بعد کسی کامیابی کا حاصل نہ ہونا سامان رسد کا فراہم نہ ہونا۔ گجرات سے کسی قسم کی مدد کا نہ آنا۔ فیروز تغلق کا مجبوراً محاصرہ اٹھا کر گجرات کی طرف جانا۔ فیروز تغلق کو کوچی رن کے نمک زار صحرا میں پہنچا کر مہینوں آوارہ و پریشان رکھنا۔ گجرات پہنچ کر فیروز تغلق کا میر حسین نظام الملک کو گجرات کی حکومت سے برطرف کرنا۔ جب لشکر شاہی گجرات سے دوبارہ ٹھٹھہ کی جانب روانہ ہوا تو سپاہیوں کا لشکر سے جدا ہو کر بھاگنا۔ یہ تمام باتیں صاف اس بات پر دلالت کر رہی ہیں کہ فیروز تغلق کے امرا یہ نہیں چاہتے تھے کہ جام اور بابنیہ کو جنھوں نے سلطان محمد تغلق کے آخر ایام حیات میں طغی نمک حرام کو پناہ دے کر اور باغی ہو کر ان امیروں کے حسب منشا مشکلات پیدا کی تھیں کسی قسم کا نقصان پہنچے۔ سلطان محمد تغلق کے بیٹے اور وزیر اعظم خواجہ احمد ایاز کو قتل کرانا۔ تتلغ خاں کے بھائی نظام الملک کو گجرات کی صوبہ داری دلوانا بھی اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ جام اور بابنیہ کا مایوس ہو کر حضرت سید جلال الدین بخاری سے استمداد کرنا۔ ان کا خود فیروز تغلق کے پاس آ کر ان کی سفارش کرنا بھی بہت کچھ معنی خیز ہے اور اس بات کا صاف پتا دے رہا ہے کہ سلطان محمد تغلق کی مخالفت کرنے والی جماعت کا حلقہ کس قدر وسیع تھا اور ٹھٹھہ کے مفسدوں کی حمایت پر مسلمانوں کی کتنی بڑی طاقت کام کر رہی تھی ان باتوں کو

ذہن میں رکھ کر اور فیروز تغلق کی کمزوری و مجبوری کا اندازہ کر کے یہ حیرت باقی نہیں رہتی کہ فیروز تغلق نے دکن کو زیر نگیں لانے کی کیوں کوشش نہیں کی۔ یہ خیال کرنا کہ ہندوؤں نے اسلامی سلطنت کو کمزور کیا اور ہندوؤں کی طاقت ایسی تھی کہ ہندوستان کی اسلامی شہنشاہی کو کمزور کر سکی سراسر غلط اور حقیقت اصلیہ کے بالکل خلاف ہے بلکہ مسلمان ہندوؤں کو ابھارنے، طاقتور بنانے، تہذیب و شائستگی سکھانے اور اُن کے حوصلوں کو بلند کرنے میں ہمیشہ مسلسل مصروف رہے جیسا کہ واقعات سے ثبوت بہم پہنچتا ہے۔

باب ہشتم

غیاث الدّین تغلق ثانی

غیاث الدین ابن فتح خاں ابن فیروز تغلق اپنے دادا فیروز تغلق کی زندگی ہی میں تخت نشین ہو چکا تھا جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ اُس نے تخت نشین ہو کر اپنے بھائیوں سالار شاہ اور ابوبکر شاہ کو قید کیا۔ یہ تذکرہ آ چکا ہے کہ فیروز تغلق نے ہندو بچوں کو تعلیم و تربیت دلا کر اور اعلیٰ مناصب پر مامور کر کے اسی طرح ایک زبردست اور قابو یافتہ طاقت بنا دیا تھا جیسا کہ مصر میں مملوک برسر اقتدار ہو کر سلطنت کے مالک ہو گئے تھے یا سلطنت عثمانیہ میں ینگچیری فوج سیاہ و سپید کی مالک بن گئی تھی۔ غیاث الدین تغلق ثانی نے اپنے چچا ناصر الدین محمد شاہ تغلق کو سرمور میں قدم جمانے کا موقع نہیں دیا اور وہ وہاں سے بھاگ کر کانگڑہ کے پہاڑوں میں جا چھپا۔ غیاث الدین مطمئن ہو کر دہلی میں حکومت کرنے لگا۔ مذکورہ ہندو بچوں نے جو غلامانِ فیروز شاہی کہلاتے تھے چن چن کر لائق اور کار آزمودہ سرداروں اور امیروں کو قتل کرنا شروع کیا۔ شاہی خاندان کے اکثر لوگوں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا۔ غیاث الدین ثانی کو بھی اپنی توقعات کے موافق نہ پا کر گرفتار قتل کیا اور ابوبکر شاہ کو قید خانے سے نکال کر بتاریخ یکم ماہ صفر ۷۹۱ھ تخت سلطنت پر بٹھایا اسی سال وجیہہ الملک (سہارن) نے وفات پائی۔

ابو بکر شاہ تغلق

ابوبکر شاہ کو تخت نشین کرنے کے بعد غلامانِ فیروز شاہی نے اس کو بھی زیادہ دنوں

چین سے نہ بیٹھنے دیا اور ملک رکن الدین نائب وزیر کو بادشاہ بنانے کا قصد کیا۔ ابوبکر شاہ کو جب اس کا حال معلوم ہوا تو اس نے جرأت کر کے ملک رکن الدین اور اس کے ہوا خواہوں یعنی غلامانِ فیروز شاہی کی ایک جمعیت کو قتل کیا۔ جس سے دہلی میں غلامانِ فیروز شاہی کی طاقت ٹوٹ گئی۔ لیکن ان لوگوں نے فوراً ایک دوسری چال چلی سامانہ کے اکثر امیران صدہ انھیں غلامانِ فیروز شاہی میں سے تھے۔ انھوں نے سامانہ کے گورنر ملک سلطان شاہ خوش دل کو جو ابوبکر شاہ کا وفادار تھا قتل کر کے اس کا سر ناصر الدین محمد شاہ ابن فیروز تغلق کے پاس نگر کوٹ کی جانب اس ثبوت میں بھیجا کہ ہم لوگ اب آپ کے ہوا خواہ وطرف دار ہو گئے ہیں۔ ساتھ ہی ناصر الدین سے درخواست کی کہ آپ شوق سے تشریف لائیں اور تختِ سلطنت پر جلوس فرمائیں۔

ناصر الدین محمد فوراً کانگڑہ سے جالندھر ہوتا ہوا سامانہ پہنچا۔ وہاں مراسم تخت نشینی ادا کرنے کے بعد فوج فراہم کر کے دہلی کی جانب روانہ ہوا۔ ناصر الدین محمد شاہ اور ابوبکر شاہ میں لڑائیوں کا سلسلہ جاری ہوا۔ میوات کے نومسلم حاکم بہادر ناہر نے اول ابوبکر شاہ کی حمایت کی پھر ناصر الدین محمد شاہ کا طرف دار ہو گیا۔ غلامانِ فیروز شاہی کی شرارتوں نے عرصہ دراز تک دہلی کو دونوں بادشاہوں کا میدانِ جنگ بنائے رکھا آخر ابوبکر شاہ گرفتار ہو کر میرٹھ کے قلعہ میں قید کیا گیا اور ناصر الدین محمد شاہ ۷۹۳ھ میں مطمئن ہو کر دہلی کے تختِ سلطنت پر بیٹھا۔

ناصر الدین محمد شاہ تغلق

اسی سال گجرات کے شرفا وعلما کا ایک محضر نامہ ناصر الدین محمد شاہ کی خدمت میں پہنچا جس میں لکھا تھا کہ گجرات کا حاکم ملک مفرح المخاطب بہ فرحۃ الملک اپنے پرانے ہندو مذہب کی جانب مائل ہو کر مرتد اور سلطنت دہلی کی اطاعت سے آزاد ہو چکا ہے یہ فرحۃ الملک بھی فیروز شاہی غلاموں میں سے تھا۔ فرشتہ کہتا ہے کہ:-

"فرحۃ الملک چوں داعیہ مخالفت داشت با زمینداران وکافران حدود سلوک ہموار نمود جہت خوشامد ایشاں شعار کفر در رسوم بت پرستی رواج داد ازیں سبب علما وفضلائے گجرات در ۷۹۳ھ عریضہ سریر آسمان نظیر سلطان محمد شاہ مرسول داشتند۔

بمضمون آنکہ فرحت الملک بوساوس شیطانی و ہوا و ہوس جسمانی مرتکب اعمال ناشایستہ گشتہ چنداں در رواج اصنام و رونق اوثان می کوشد کہ بلدۂ سومنات قبلۂ اہل ضلال شدہ شعار و وثار مسلمانی روز بروز منخفض می گردد نہ منبر را از عزت و حرمت بخشے و نہ مسجد را از صوم و صلوٰۃ بہرۂ اگر دریں وقت اندیشۂ کہ موجب تقویت دین و رواج اسلام باشد بظہور رسد فہو المراد۔"

سلطان ناصر الدین محمد شاہ نے نہایت دوراندیشی سے کام لے کر ظفر خاں ابن وجیہہ الملک کو گجرات پر مامور کرکے روانہ کیا اور ظفر خاں کے بیٹے تاتار خاں کو اپنے مصاحبین و امرا میں شامل کرکے اپنے پاس رکھا (اس ظفر خاں کو ظفر خاں لودھی نہیں سمجھنا چاہیئے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے اور جو گجرات کا گورنر رہا تھا) ظفر خاں کو گجرات کی طرف روانہ کرنے میں ایک یہ مصلحت تھی کہ غلامانِ فیروز شاہی کی طاقت دارالسلطنت میں کمزور ہو جائے اور ترقی نہ کرنے پائے۔ دوسری مصلحت یہ تھی کہ ظفر خاں اگرچہ نومسلم تھا لیکن راسخ العقیدہ مسلمان تھا۔ فرحت الملک نومسلم کی پھیلائی ہوئی بدتمیزیوں کا بہترین علاج اسی کے ہاتھوں سے بخوبی ہوسکتا تھا۔ ظفر خاں جب گجرات کے قریب پہنچا تو ملک مفرح نے مقابلہ کیا آخر شکست کھائی اور گجرات پر ظفر خاں کا قبضہ و تسلط قائم ہوا۔ یہ ظفر خاں فیروز تغلق کی گوجری بیوی کا بھتیجا اور سلطان ناصر الدین محمد کے مخالفوں میں ممتاز حیثیت و اثر رکھتا تھا سلطان ناصر الدین محمد نے دانائی سے کام لے کر ظفر خاں کو اپنا ہمدرد و ہوا خواہ بنانے کی موثر کوشش کی اور احتیاطاً اس کے بیٹے تاتار خاں کو اپنے پاس رکھا تاکہ ظفر خاں کو بغاوت یا مخالفت کی جرأت نہ ہو سکے۔ سلطان نے ظفر خاں کو گجرات کا وائسرائے مقرر کرتے ہوئے جو فرمان عطا کیا اس کی پیشانی پر اپنے قلم سے نہایت شان دار القاب لکھا۔ فرشتہ کے الفاظ یہ ہیں کہ

"چوں وزرا منشور نوشتند و بفرمودۂ سلطان جائے القاب خالی گذاشتہ بودند سلطان بخط القاب چنیں نوشت کہ برادرم مجلس عالی خان معظم عادل باذل مجاہد سعد الملت والدین ظہیر الاسلام والمسلمین عضد السلطنت عین المملکت قامع الکفر والمشرکین قالع الفجرۃ والمتمردین قطب سما والمعالی نجم فلک الاعالی صفدر روز وغا تہمتن قلعہ کشا و کشور گیر آصف تدبیر ضابط امور ناظم مصالح جمہور

ذی الیامن والسعادات صاحب الرائے والکفایات ناشر العدل والاحسان
دستور صاحبقران الغ قتلغ اعظم ہمایوں ظفر خاں"۔

اس القاب کے الفاظ پر غور کرو جو سلطان ناصر الدین محمد شاہ نے اپنے قلم سے لکھے ساتھ ہی اس حالت کا تصور کرو جبکہ ظفر خاں کا باپ سہارن ایک معمولی دیہاتی ہونے کی حالت میں فیروز تغلق کے پاؤں سے موزہ اُتار رہا تھا۔ کیا یہ اسلام کی صداقت کا معجزہ نہیں ہے۔ اسی ظفر خاں کی اولاد میں گجرات کے مسلمان سلاطین تھے۔ چونکہ ظفر خاں سلطان فیروز تغلق کا شراب دار بھی رہ چکا تھا اس لئے بعض لوگوں نے سلاطین گجرات کی قوم کو کلال بتایا ہے لیکن یہ غلط ہے وہ کلال نہیں بلکہ گوجر یا کھتریوں کی ایک شاخ ٹانک سے تعلق رکھتے تھے۔ ہاں اگر کھتریوں کی اس شراب خوار قوم ٹانک ہی کا دوسرا نام کلال ہے تو شاہان گجرات کو بھی کلال کہا جا سکتا ہے۔ لیکن ہندوستان کے مسلمان گوجر جو شاہان گجرات کو اپنا ہم قوم بتاتے ہیں اپنے آپ کو کلال نہیں کہلواتے نہ کلالوں کے ساتھ اپنے کسی تعلق کو تسلیم کرتے ہیں۔ لہذا شاہان گجرات کو کلال کہنا صحیح نہیں۔

فیروز تغلق کے بعد چند سال تک فیروز شاہی غلاموں نے وہ اودھم مچائے رکھی کہ کوئی شریف اور معزز خاندان تباہی سے نہ بچا۔ تجربہ کار اور لائق سردار ایک ایک کر کے مارے گئے اور "مرداں بمیرند و نامرداں جائے ایشاں گیرند" کا نقشہ سب کے سامنے آگیا۔ سلطان ناصر الدین محمد شاہ کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ جو سب سے بہتر اور لائق سردار اس زمانے میں موجود رہ گئے تھے اُن کو اپنے گرد فراہم نہ رکھا بلکہ جن وفادار غلاموں اور ہمدرد سرداروں نے مصیبت کے ایام میں اس کا ساتھ دیا اُن سب کو شکر گذاری اور احسان شناسی کی راہ سے مختلف صوبوں کی حکومتوں پر مامور کر کے بھیج دیا۔ مثلاً ملک حسین غوری کو دلاور خاں غوری کا خطاب دے کر مالوہ کی حکومت پر روانہ کر دیا۔ حالانکہ اس کے دہلی میں رہنے کی سخت ضرورت تھی۔ وزراء امراء میں اسلام خاں، عادل خاں، بہادر ناہر، ملک سرور، کمال الدین وغیرہ تو مسلم تھے۔ یا ہر سنگھ، سرجودھن، بیر بھان، رائے رایان رائے سرور وغیرہ ہندو تھے۔ صرف ظفر خاں لودھی مقتول کے بیٹے اور بھتیجے معمولی حالت میں باقی رہ گئے تھے جنھوں نے بعد میں موقع پا کر دہلی کی اسلامی سلطنت کو کسی قدر سنبھالا لیکن اُن کا امرائے کبار میں شمار نہ تھا۔ اس فتنہ نے جو سلطان محمد تغلق کے آخر

عہد حکومت میں مسلمانوں نے برپا کیا تھا چالیس سال کے بعد یہ خطرناک نتیجہ پیدا کیا کہ سلطنت دہلی کا اسلامی دربار تمام و کمال ہندو نژاد نو مسلموں اور ہندوؤں کے قبضے میں آگیا۔ نہ شیخ الاسلامی کوئی چیز رہی نہ قاضی القضاۃ کی کوئی حیثیت و ہستی باقی تھی تمام شرعی ادارے اور اسلامی کاروبار درہم برہم ہوگئے ۷۹۲ھ میں موقع مناسب دیکھ کر ہندوؤں نے جا بجا بغاوتیں شروع کیں۔ رائے ہرسنگھ باغی ہوکر گرفتار ہوا۔ اٹاوہ کے ہندوؤں نے لوٹ مار مچا کر اس طرف کے پرگنوں کو ویران کیا تو اس فتنے کو مٹانے کے لئے سلطان کو خود اس طرف متوجہ ہونا پڑا۔ اس کے بعد قنوج کے ہندوؤں نے سر اٹھایا ان کی گوشمالی بھی سلطان نے خود ہی جا کر کی۔ مقام جالیسر میں سلطان نے ایک قلعہ تعمیر کرکے اس کا نام محمد آباد رکھا۔ ابھی سلطان جالیسر ہی میں مقیم تھا کہ دہلی سے خبر پہنچی کہ اسلام خاں نو مسلم لاہور جا کر علم بغاوت بلند کرنے کا قصد رکھتا ہے۔ یہ سنتے ہی بادشاہ دہلی پہنچا۔ اسلام خاں سے دریافت کیا تو اس نے انکار کیا لیکن اسلام خاں کے حقیقی بھائی جاجو نام ہندو نے اس کے خلاف گواہی دے کر اسلام خان کو قتل کرایا (الفنسٹن صاحب نے جاجو نام ہندو کو اسلام خاں کا بھتیجا لکھا ہے) ۷۹۵ھ میں سرجوداس اور بیربھان نے علم بغاوت بلند کیا۔ سلطان اس فتنہ کو فرو کرنے میں مصروف تھا کہ بہادر ناہر میواتی نو مسلم نے باغی ہوکر اطراف دہلی کو غارت کیا۔ سلطان بلا توقف اس کی طرف متوجہ ہوا بہادر ناہر شکست کھا کر میوات کے جنگلوں میں جا چھپا۔ سلطان جالیسر میں مقیم تھا کہ شیخا گکھڑ نے قلعہ لاہور پر قابض ہوکر علم بغاوت بلند کیا (یہ بات تحقیق طلب ہے کہ شیخا اور جسرت دونوں بھائیوں کی قوم گکھڑ تھی یا کھوکر پنجاب میں یہ دونوں قومیں موجود ہیں۔ فرشتہ گکھڑ اور ملا عبدالقادر بدایونی کھوکر لکھتے ہیں) سلطان نے اپنے بیٹے ہمایوں خاں کے پاس جو دہلی میں موجود تھا حکم بھیجا کہ لاہور جا کر شیخا گکھڑ کو سزا دو۔ ہمایوں خاں لاہور کی جانب روانہ ہونے کو تھا کہ جالیسر سے سلطان کے فوت ہونے کی خبر پہنچی۔ اس کا جنازہ دہلی میں لا کر باپ کے پاس دفن کیا گیا۔ سلطان ناصر الدین محمد شاہ نے ۱۷ ربیع الاول ۷۹۶ھ کو جالیسر میں وفات پائی۔ اگر لائق اور تجربہ کار اہل کار موجود ہوتے تو سلطان ناصر الدین محمد شاہ ضرور ایک اچھا اور کامیاب سلطان ثابت ہوتا لیکن چونکہ وہ کارگذار و وفادار اہل کاروں سے محروم تھا لہٰذا اس کا تمام عہد حکومت ہندوؤں کی بغاوتوں سے پُر رہا اور ان بغاوتوں

کے فرو کرنے میں کسی سردار سے اس کو کوئی مدد نہیں ملی۔

سکندر شاہ بن ناصر الدین محمد شاہ تغلق

ہمایوں خاں سکندر شاہ کے لقب سے ۱۹ ربیع الاول ۷۹۶ھ کو دہلی میں تخت نشین ہوا اور ڈیڑھ مہینے کی سلطنت کے بعد بیمار ہو کر فوت ہوا۔

ناصر الدین محمود شاہ بن ناصر الدین محمد شاہ تغلق

سکندر شاہ کی وفات کے بعد پندرہ روز تک امر سلطنت معطل رہا آخر ظفر خاں لودھی کے بیٹوں اور بھتیجوں نے خاندان شاہی کی حمایت پر کمر ہمت باندھی اور امرا و ارکان سلطنت ناصر الدین محمد شاہ کے دوسرے بیٹے محمود خاں کو ناصر الدین محمود شاہ کے لقب سے تخت سلطنت پر بٹھانے کے لیے مجبور ہوئے۔ تاتار خاں ابن ظفر خاں ابن وجیہ الملک (سہارن) چاہتا تھا کہ فتح خاں ابن فیروز تغلق کے بیٹے نصرت خاں کو تخت سلطنت پر بٹھایا جائے بعض فیروز شاہی غلام بھی اس کے شریک تھے لیکن ظفر خاں لودھی کے بیٹوں ... سارنگ خاں و ملو خاں اور اس کے بھتیجے دولت خاں ابن محمود خاں نے کسی کی نہ چلنے دی اور ناصر الدین محمود ہی کی سب کو بیعت کرنی پڑی۔ ظفر خاں لودھی اول اور اس کا بیٹا ظفر خاں لودھی ثانی دونوں گجرات کے گورنر رہ چکے تھے۔ ظفر خاں لودھی ثانی کو فتح خاں کے بیٹے غیاث الدین تغلق ثانی کی تخت نشینی میں حارج اور محمد خاں الملقب بہ ناصر الدین محمد شاہ کا ہمدرد و ہوا خواہ دیکھ کر خان جہاں ثانی وزیر اعظم نے صوبہ سے بلا کر گرفتار و قتل کیا اور یہ کام وجیہ الملک اور اس کی بہن کے منشا سے کیا گیا۔ اس کے بعد ظفر خاں ابن وجیہ الملک کو گجرات کی حکومت کا ملنا بھی ظفر خاں لودھی سابق گورنر گجرات کے وارثوں کو گراں گذر سکتا تھا۔ اب ناصر الدین محمود کی تخت نشینی کے وقت بھی تاتار خاں ابن ظفر خاں ابن وجیہ الملک اور سارنگ خاں ملو خاں پسران ظفر خاں ابن ظفر خاں لودھی کی مخالفت نے ان دونوں خاندانوں کی پشتینی مخالفت کو اور زیادہ بڑھا دیا۔ اس مخالفت نے آئندہ بھی بڑے بڑے اہم نتائج پیدا کئے۔

ناصر الدین محمود نے ماہ جمادی الاول ۷۹۶ھ میں تخت نشین ہو کر ایک ہندو زادہ

ملک سرور کو جو فیروز شاہی غلاموں میں سے تھا خواجہ جہاں کا خطاب دے کر وزیر اعظم بنایا۔ دولت خاں ابن محمود خاں لودھی کو کوتوالی اور مقرب خاں کو امیر الامرائی کا عہدہ عطا کیا سارنگ خاں ابن ظفر خاں لودھی کو دیپالپور کی حکومت ملی۔ سارنگ خاں کے بھائی ملوخاں کو اقبال خاں کا خطاب دے کر نائب وزیر بنایا۔ چونکہ دربار دہلی کا رعب جاتا رہا تھا اور سلطان کی ہیبت دلوں میں باقی نہیں رہی تھی لہذا سب سے پہلے جونپور اور بہار کے ہندوؤں نے سرکشی پر کمر باندھی ناصر الدین محمود نے اپنے وزیر اعظم خواجہ جہاں ملک سرور کو سلطان الشرق کا خطاب دے کر جونپور اور بہار کی طرف روانہ کیا۔ فرشتہ کہتا ہے کہ :-

"بنا برانکہ انقلاب در پادشاہی دہلی پدید آمدہ استقامت سلطنت دہلی زائل شدہ بود در ولایت ہرج مرج روئے نمودہ کفار اطراف سرکشی را پیشۂ خود ساختند خاصہ ہندوان شرقی ازاں سبب بادشاہ ناصر الدین محمود خواجہ جہاں را سلطان الشرق خطاب دادہ با بیست زنجیر فیل ولشکر بسیار بدفع ہندوان قنوج و بہار روانہ ساخت "۔

خواجہ جہاں ملک سرور نے جونپور پہنچ کر اس طرف کے تمام سرکشوں کو مطیع و منقاد بنا کر جونپور میں قیام کیا۔ خواجہ جہاں ملک سرور چونکہ خود اسی ملک کا ہندوزاد تھا لہذا اس کو وہاں اپنی حکومت قائم کرنے اور ہندو سرکشوں کو مطیع بنانے میں زیادہ دقت پیش نہیں آئی یہی خواجہ جہاں ملک سرور سلطنت شرقیہ جونپور کا بانی ہے۔

لاہور میں شیخا گکھڑ نے پہلے ہی سے علم بغاوت بلند کر رکھا تھا اس کی سرکوبی کے لئے سارنگ خاں لودھی حاکم دیپالپور نے لاہور پر چڑھائی کی شیخا گکھڑ شکست کھا کر جموں کے پہاڑوں میں جا چھپا اور سارنگ خاں لاہور میں اپنے بھائی عادل خاں لودھی کو حاکم بنا کر دیپالپور واپس آیا۔

"در ماہ ذیقعدہ شیخا کھوکر در نواحی موضع سامو نہلہ دوازدہ کروہی لاہور محاربۂ عظیم نمودہ از پیش سارنگ خاں ہزیمت یافتہ بکوہ جموں در آمد و سارنگ خاں لاہور را برادر خویش عادل خاں سپردہ بسمت دیپالپور مراجعت کرد"۔

(منتخب التواریخ ملا عبد القادر بدایونی)

سلطان ناصرالدین محمود کو معلوم ہوا کہ قلعہ گوالیار کے قلعہ دار راؤ بیرسنگھ نے علم بغاوت بلند کیا ہے۔ سلطان اس کی سرکوبی کے لئے روانہ ہوا۔ سلطان ابھی گوالیار نہیں پہنچا تھا۔ کہ دہلی میں تاتار خاں ابن ظفر خاں ابن وجیہ الملک شہاب ناہرا ور الماس خاں وغیرہ غلامان فیروز شاہی کی مدد سے نصرت خاں ابن فتح خاں ابن فیروز تغلق نے ناصرالدین نصرت شاہ کے لقب سے تخت نشین ہوکر اپنے نام کا سکہ وخطبہ جاری کر دیا۔ درحقیقت بیرسنگھ کی بغاوت نصرت شاہ کو بادشاہ بنانے کی سازش کا نتیجہ تھا جو تاتار خاں کی کوشش سے ظہور میں آئی اور یہ وہی پرانی رقابت اور فتح خاں کی اولاد میں تخت سلطنت کے لانے کی زبردست کوشش تھی۔ ناصرالدین محمود یہ سنتے ہی دہلی کی جانب واپس ہوا نصرت شاہ نے فیروز آباد میں اور ناصرالدین محمود نے دہلی میں قیام کیا۔ طرفین سے لڑائیوں کا سلسلہ جاری ہوا۔ امرا دو حصوں میں تقسیم ہوکر آدھے نصرت شاہ کے ساتھ شامل ہوئے اور آدھے ناصرالدین محمود کے شریک رہے۔ نصرت شاہ نے تاتار خاں ابن ظفر خاں وجیہ الملک کو اپنا وزیراعظم بنایا۔ غلامان فیروز شاہی کا اکثر حصہ نصرت شاہ کا طرف دار تھا۔ ناصرالدین محمود کے ساتھ صرف لودھی سردار تھے۔ روزانہ لڑائیاں ہوتی تھیں کبھی فیروز آباد والے دہلی والوں کو پسپا کر کے دہلی میں داخل کر دیتے۔ کبھی دہلی والے فیروز آباد والوں کو فیروز آباد میں بھگا دیتے۔ دہلی سے موجودہ زمانہ کی پرانی دہلی اور فیروز آباد سے فیروز شاہ کا کوٹلہ سمجھنا چاہیئے۔ ان دونوں کے درمیان کا رقبہ دونوں بادشاہوں کا میدان جنگ تھا اور یہ سلسلہ کئی سال یعنی سنہ ۸۰۱ھ تک جب کہ تیمور لنگ ہندوستان میں آیا جاری رہا۔

گجرات، خاندیس، مالوہ، ملتان، جونپور میں جو صوبہ دار مامور تھے۔ دہلی میں دو بادشاہوں کی موجودگی اور ان کی جنگ آزمائی کا حال سن کر خود مختارانہ حکومت کرنے لگے اور دربار دہلی کی اطاعت سے آزاد ہو گئے۔ صرف پنجاب و دیپالپور کا تعلق برائے نام سلطان ناصرالدین محمود سے رہا مگر چونکہ پنجاب میں شیخا گکھڑ موجود تھا اور دیپالپور کو خضر خاں لینا چاہتا تھا لہذا سارنگ خاں اور اس کا بھائی عادل خاں دونوں اپنی مصیبتوں میں گرفتار اور سلطان ناصرالدین محمود کو کوئی مدد نہیں پہنچا سکتے تھے۔ صوبۂ میان دواب کے بعض اضلاع میں نصرت شاہ نے اپنے عامل بھیج دیئے۔ بعض ناصرالدین محمود کے قبضے میں رہے۔ اس صوبہ کے اکثر اضلاع مثلاً کٹھر، قنوج، میوات اور سامانہ وغیرہ میں ہندو خود مختار ہو

بیٹھے کسی خودمختار ہونے والے کو اب کوئی خوف واندیشہ نہ تھا کیونکہ بجائے اس کے کہ بغاوت کی سزا ملتی دونوں بادشاہوں میں سے ہر ایک اُن سرکشوں کو دل جوئی کرکے اپنی طرف مائل کرنے پر آمادہ تھا۔

آٹھویں صدی ہجری کے وسط یعنی سلطان محمد تغلق کے آخر ایام حکومت تک تمام براعظم ہند ایک مرکزِ حکومت سے وابستہ اور سلطان دہلی کی سلطنت میں شامل تھا پچاس سال کے بعد یعنی آٹھویں صدی ہجری کے آخر میں یہ عظیم الشان سلطنت پاش پاش ہوکر بیسیوں خودمختار حکومتوں میں منقسم ہوگئی۔ اس تغیرِ عظیم کے اسباب ہر شخص کو مذکورہ حالات یعنی اس کتاب کے صفحات میں خود تلاش اور متعین کر لینے چاہئیں۔

حملۂ تیمور

مغلوں کا چنگیزی خاندان جب تک کافر اور اسلام سے ناآشنا رہا برابر ہندوستان پر مغلوں کے حملے جاری رہے ان حملوں کو خاندانِ غلامان، خاندان خلجیہ اور غیاث الدین تغلق نے ہمیشہ بڑی ہمت و مستعدی کے ساتھ رد کرکے مغلوں کو ہندوستان میں قدم جمانے کا موقع نہیں دیا۔ اس کے بعد چنگیزی مغل مسلمان ہوکر سلطان محمد تغلق کے حلیف بن گئے اور ہندوستان پر مسلمان ہوکر انھوں نے کوئی حملہ نہیں کیا۔ سلطان فیروز تغلق کے عہد حکومت میں جب ہندوستان کی اسلامی سلطنت پارہ پارہ ہونے کی استعداد پیدا کر رہی تھی۔ اُسی زمانے میں مغلوں کے چنگیزی خاندان کا قصر منہدم ہوکر اس کی بنیادوں پر مغلوں کے ایک دوسرے خاندان کے ایوان سلطنت کی تعمیر کا سامان ہو رہا تھا یہ دوسرا مغل خاندان چنگیزی خاندان کا رشتہ دار تھا جس کے بانی کا نام تیمور تھا۔ تیمور کو جنگ جوئی اور ملک گیری کے اعتبار سے چنگیز خاں کا مثنیٰ سمجھنا چاہیے۔ فرق یہ تھا کہ چنگیز خاں کافر اور تیمور مسلمان تھا۔ تیمور نے ۸۰۰ھ میں جب ہندوستان پر حملہ کیا تو تاتار خاں ابن ظفر خان جو نصرت شاہ کا وزیر اور پانی پت میں مقیم تھا اقبال خاں لودھی سے شکست فاش کھا کر اور نصرت شاہ کو تنہا چھوڑ کر اپنے باپ کے پاس گجرات کی طرف چلا گیا تھا۔ سارنگ خاں لودھی حاکم دیپالپور خضر خاں حاکم ملتان کو شکست دے کر ملتان سے بے دخل کر چکا تھا خضر خاں ملتان سے بھاگ کر اور میوات کی طرف آکر پہاڑوں اور

جنگلوں میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ اقبال خاں لودھی برادر سارنگ خاں نصرت شاہ کو دہلی سے میوات کی طرف بھگا کر ناصر الدین محمود کو دہلی کا تنہا سلطان بنا چکا تھا۔ تیمور کا حملہ مسلمان مغلوں کا ہندوستان پر پہلا حملہ تھا جس میں ان کو فتح اور کامیابی حاصل ہوئی۔ تیمور اپنی توزک میں لکھتا ہے کہ:-

"مجھے خبر نویسوں نے اطلاع پہنچائی کہ ہندوستان کے ہر حصے اور ہر گوشہ میں جدا جدا حاکم خود مختار ہو کر صاحب تخت و تاج بن گئے ہیں ملتان میں ملو خاں (اقبال خاں) کا بھائی سارنگ خاں حکومت کر رہا ہے اور اس نے لاہور کو فتح کر کے وہاں فوجیں جمع کی ہیں۔ ہندوستان کے ہر صوبہ میں کوئی نہ کوئی مدعی سلطنت موجود ہے"

اگر ہندوستان میں مسلمانوں کی سلطنت پاش پاش اور ریزہ ریزہ نہ ہو گئی ہوتی تو تیمور کو بھی اس حملہ میں اسی طرح ناکامی ہوتی جیسا کہ اس سے پہلے مغلوں کو ہندوستان کی اسلامی سلطنت کے مقابلے میں شکست ہوتی رہی تھی۔ تیمور نے اپنی توزک میں زیادہ تر اپنی سلطنت و حکومت کے آئین و ضوابط لکھے ہیں اپنی فتوحات اور واقعات زندگی تمام و کمال اسور خانہ انداز درج نہیں کئے۔ اسی لئے ہندوستان کی حملہ آوری کے مفصل حالات توزک تیمور سے معلوم نہیں ہو سکتے تاہم تیمور نے اپنی توزک میں اتنا ضرور لکھ دیا ہے کہ

"میں نے جب ہندوستان پر حملہ آور ہونے کا قصد کیا تو میری فوج اور اکثر سردارانِ فوج نے اس کو ناپسند کیا اور بڑی مشکل سے اُن کی مخالفت کو رضامندی یا خاموشی سے تبدیل کیا گیا۔"

تیمور حملۂ ہندوستان سے پہلے ایران و خراسان و ترکستان وغیرہ اکثر ممالک کو اپنے زیر نگین لا چکا تھا۔ باوجود اس کے اس کی فوج اور سردارانِ لشکر کا ہندوستان پر حملہ آور ہونے کو ناپسند کرنا یقیناً اسی لئے تھا کہ مغلوں کو ہندوستان کی اسلامی سلطنت کے مقابلے میں اس سے پہلے ہمیشہ شکستوں، ناکامیوں اور ذلتوں سے واسطہ پڑتا رہا تھا۔ تیمور اپنی توزک میں یہ بھی لکھتا ہے کہ ہندوستان پر حملہ آور ہونے میں راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ افغانی قبائل کی طاقت تھی جن کا سردار اُس زمانے میں موسٰی خاں نامی افغان تھا۔ تیمور نے اس رکاوٹ کو بڑی ہوشیاری اور چالاکی سے دور کیا۔ یعنی اس نے خود ہی اول اپنے

ایک سردار کو موسیٰ خاں افغان کی طرف روانہ کیا جو موسیٰ خاں کے مقابلے میں مارا گیا اس مقتول سردار کا بھائی جب تیمور کے پاس واپس آیا تو تیمور نے اس کو فوراً قید کر دینے کا حکم دیا اور اس مقتول سردار کی نسبت اپنی ناراضگی کا اظہار کیا کہ اس نے موسیٰ خاں پر ہماری منشا کے خلاف کیوں حملہ کیا حالانکہ موسیٰ خاں ہمارا دوست ہے اور ہم ہرگز اس سے لڑنا نہیں چاہتے۔ تیمور لکھتا ہے کہ "میرے یہ الفاظ میرے درباریوں کو بہت ہی ناگوار گذرے لیکن میرا مقصد جس سے میرے درباری ناواقف تھے حاصل ہو گیا یعنی موسیٰ خاں کو میرے ان الفاظ اور اس طرز عمل کا حال معلوم ہوا تو وہ خود بخود میری ملاقات کو چلا آیا۔" تیمور دوستانہ اُس کے قلعہ میں داخل ہوا۔ قلعہ میں داخل ہونے کے بعد جب کہ موسیٰ خاں میزبانانہ اس کے ہمراہ تھا کسی نے ایسا تیر مارا کہ موسیٰ خاں مارا گیا اور تیمور قلعہ پر قابض ہو گیا افغانستان کی طرف سے مطمئن ہو کر تیمور نے ہندوستان کا قصد کیا اپنے پوتے پیر محمد کو تیس ہزار سواروں کے ساتھ کوہ سلیمان کے راستے ملتان پر جہاں سارنگ خاں موجود تھا حملہ آور ہونے کے لئے روانہ کیا اور خود بانوے ہزار لشکر جرار کے ساتھ درہ خیبر کے راستے پنجاب میں داخل ہو کر لاہور پر جہاں عادل خاں برادر سارنگ خاں حاکم تھا حملہ آور ہوا۔ پیر محمد کوہ سلیمان کے لودی، لوحانی، اور نیازی وغیرہ پٹھانوں کے قبائل سے لڑتا بھڑتا ملتان پہنچا۔ سارنگ خاں لودھی نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا مگر میدانِ جنگ میں کام آیا۔ چونکہ اس کی لاش نہیں ملی اس لئے اُس کا مارا جانا بھی مشتبہ رہا۔ فوج بلا سردار کیسے لڑتی آخر پیر محمد کا ملتان پر قبضہ ہو گیا۔ تیمور پنجاب میں داخل ہوا تو عادل خاں برادر سارنگ خاں مقابلے پر آیا مگر تیمور کے لشکر کی کثرت پر غالب نہ آسکا چنانچہ تیمور لاہور پر قابض ہو گیا۔ شیخا گکھڑ اور اس کے بھائی حسرت گکھڑ نے جو سارنگ خاں کے ہاتھ سے نقصان اور ذلت اٹھائے ہوئے تھے حاضر ہو کر اظہار نیازمندی کیا۔ تیمور نے شیخا گکھڑ کی محض اس لئے کہ وہ لودھیوں کا دشمن تھا وہ عزت افزائی کی جو اپنی مدت العمر میں اُس نے شاید کسی کی بھی نہ کی ہوگی۔

"والتفات دربارۂ او بحدے رسید کہ اگر بخشتے یا حشرے می رسید ند کہ نسبت خود بہ شیخا گکھڑی کردند ہیچ یک از افراد عساکر منصورہ را بہرہ آن بنود کہ متعرض نشوند" (ظفر شبستان)

شیخا گکھڑ کو پنجاب کے بعض اضلاع کی حکومت دے کر اور لاہور کے قلعہ میں تاریخ فرشتہ کے مصنف محمد قاسم فرشتہ کے دادا ہندوشاہ کو اپنی طرف سے مامور کر کے تیمور ملتان کی جانب متوجہ ہوا جہاں اس کا پوتا مرزا پیر محمد پہلے سے قابض ہو چکا تھا۔ بماہ صفر ۸۰۱ھ تلنبہ کو غارت کرتا ہوا ملتان پہنچا۔ ملتان سے پیر محمد کو ہمراہ لے کر اجودھن (پاک پٹن) پھر اجودھن سے پچاس کوس (پنجاہ کروہ) چل کر قلعہ بھٹنیر پر حملہ آور ہوا۔ یہ وہی بھٹنیر کا مشہور قلعہ ہے جس کا ذکر سلطان محمود غزنوی کے حالات میں آ چکا ہے۔ یہاں ایک ہندو راجہ جس کا نام فرشتہ نے راؤ خلجی اور ملا عبدالقادر بدایونی نے راؤ خلچین بھٹی لکھا، حاکم تھا۔ فرشتہ کہتا ہے کہ:-

"راؤ خلجی کہ حاکم آنجا و از صنادید کفار ہند بود و در قواعد سرداری و قلعہ داری بہتر از وے در ہندوستان کسے نبود خود را بہادر می نامید چہ بزبان ہندی بہادر را راؤ می گویند از قلعہ بر آمدہ در کنار شہر صف آراست۔"

تیمور نے اس راجہ کو شکست دی اور وہ بھاگ کر قلعہ میں محصور ہو گیا۔ ایک سید کو تیمور کے پاس بھیج کر جان کی امان اور ایک روز کی مہلت طلب کی جو مل گئی۔ مہلت کے گذرنے پر بھی جب وہ حاضر نہ ہوا تو قلعہ کی دیواروں میں نقب زنی شروع کی گئی راجہ کو جب اپنی ہلاکت یقینی نظر آئی تو وہ شیخ سعدالدین نبیرہ شیخ فریدالدین گنج شکر رحمہ کو جو اجودھن سے اس کے پاس قلعہ میں آئے ہوئے تھے ہمراہ لے کر تیمور کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ تیمور نے شیخ ممدوح کی سفارش سے اس کا قصور معاف کر کے خلعت عطا کیا لیکن اسی حالت میں راجہ کے بھائی اور بیٹے نے تیمور کے آدمیوں پر حملہ کر کے ان کو قلعہ میں داخل ہونے سے روکا تیمور نے مجبوراً حکم دیا کہ قلعہ کو مسمار کر دیا جائے چنانچہ بھٹنیر کا مشہور و معروف قلعہ مسمار کر کے خاک کے برابر کر دیا گیا اور اسی روز سے شہر بھی ویران ہو گیا۔ بھٹنیر سے سرستی اور فتح آباد کے قلعوں کو مسمار کرتا ہوا سامانہ پہنچا یہاں کے سرکش جاٹوں اور راجپوتوں کو جو راہ زنی میں شہرۂ آفاق تھے گرفتار و قتل کیا۔ سامانہ کیتھل پہنچ کر لشکر کی موجودات لی پھر پانی پت پہنچ کر دریائے جمنا کو عبور کیا اور قلعہ لونی کے ہندوؤں کو شکست دے کر قلعہ پر قبضہ کیا۔ قلعہ لونی کی نسبت فرشتہ کہتا ہے کہ:-

"ایں قلعہ لونی میان آب ہنڈون و جمن واقع شدہ، ہنڈون آبیست عمیق

سلطان فیروز شاہ مرحوم از آب اکالی بریدہ ودریں محل آب جمن انصال داده واکثر متوطنان آنجا مجوس بودند۔

یہاں سے دریا کے کنارے کنارے دہلی کے مقابل پہنچا اور دریا کو عبور کر کے اقبال خاں برادر سارنگ خاں سے نبرد آزما ہوا۔ لڑائی سے پہلے ان قیدیوں کو جو اب تک کے سفر میں جا بجا سے گرفتار ہو کر لشکر کے ہمراہ تھے قتل کیا۔ ملا عبدالقادر بدایونی کی روایت کے مطابق ان قیدیوں میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔ قتل ہونے سے نہ ہندو بچے نہ مسلمان۔ ۷ ربیع الاول ۸۰۱ھ کو دہلی کے پاس معرکہ کارزار گرم ہوا اقبال خاں کے پاس چالیس ہزار فوج تھی جس میں آزمودہ کار جنگجو کم اور ناتجربہ کار شہری لوگ زیادہ تھے تیمور کی جنگ آزمودہ جرار فوج کی تعداد ایک لاکھ بائیس ہزار تھی چنانچہ لڑائی میں دہلی کی قلیل فوج نے شکست کھائی اور اقبال خاں واپس ہو کر دہلی میں محصور ہو گیا۔ رات ہوتے ہی ناصرالدین محمود نے فرار ہو کر گجرات کا رُخ کیا۔ اقبال خاں بھی مجبوراً دہلی چھوڑ کر برن (بلند شہر) پہنچا اور وہیں مقیم رہ کر کشود کار کی تدبیروں میں مصروف رہا۔ تیمور فاتحانہ دہلی میں داخل ہوا۔ اس طرح پہلی مرتبہ مغلوں کی فوج کو دہلی کے لوٹنے کا موقع ملا۔ لیکن مغلیہ لشکر کو برن پر حملہ آور ہونے کی جرأت نہ ہوئی جہاں اقبال خاں موجود تھا۔ دہلی کے ہندوؤں نے دہلی کی جامع مسجد کو بطور قلعہ اپنی حفاظت کے لئے استعمال کیا۔ تیمور پندرہ روز دہلی میں مقیم رہا۔ شاہی خزانہ حتیٰ کہ فیروز تغلق کے زمانہ کا چڑیا گھر تک بھی لوٹ لیا گیا۔ دہلی تقریباً ویران ہو گئی۔ تیمور دہلی سے چل کر فیروز آباد آیا یہاں بہادر ناہر کی میوات سے بھیجی ہوئی دو سفید طوطیاں اور اس کی درخواست جس میں اظہار اخلاص تھا پہنچی۔ تیمور نے سید شمس الدین ترمذی کو بھیج کر بہادر ناہر کو بلوایا۔ وہ حاضر خدمت ہوا اور اس کے ساتھ خضر خاں بھی جو سارنگ خاں سے شکست پا کر اور ملتان سے آوارہ ہو کر میوات کے پہاڑوں میں سرگرداں پھر رہا تھا حاضر ہوا۔ تیمور نے بہادر ناہر کو خلعت دے کر میوات کی طرف رخصت کیا اور خضر خاں کو ہمراہ لے کر فیروز آباد سے پانی پت کی جانب روانہ ہوا۔ پانی پت پہنچ کر امیر شاہ ملک کو فوج دے کر میرٹھ کی طرف بھیجا کہ وہاں سے جو مال ودولت ہاتھ لگے لے آئے۔ میرٹھ کے قلعہ دار ملک الیاس خاں اور ملک صفی نے قلعہ کی حصانت پر اعتماد کر کے مقابلہ کی تیاری کی۔ امیر شاہ ملک نے تیمور کو

اطلاع دی کہ قلعہ والے لڑائی پر مستعد ہیں اور قلعہ کا فتح کرنا دشوار ہے یہ سن کر تیمور خود میرٹھ آیا قلعہ کو فتح کر کے مذکورہ سرداراں کو قتل کیا اور قلعہ میرٹھ کو بھٹنیر کے قلعہ کی طرح مسمار کر کے زمین سے برابر کر دیا۔ اس کے بعد دامن کوہ سوالک (موجودہ ضلع سہارنپور) کو تاخت و تاراج کیا۔ پھر گنگا کو عبور کر کے موجودہ ضلع بجنور کے علاقے میں داخل ہوا یہاں کے ہندو رئیسوں اور ان کے زن و فرزند کو گرفتار کر کے واپس چلا گیا راستے میں رتن نامی ایک زمیندار کو مغلوب کر کے اس سے بہت ساز و مال وصول کیا اور کوہ ہمالیہ کے دامن میں سفر کرتا ہوا جموں پہنچا۔ جموں کے راجہ نے مقابلہ کیا مگر زخم دار و گرفتار ہو کر تیمور کی خدمت میں آیا تو کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گیا اور اسی وقت گائے کا گوشت کھایا۔ فرشتہ کہتا ہے کہ:-

"چوں بجموں رسید رائے آنجا بجنگ پیش آمدہ زخم دار و گرفتار گشت و
بتکلیف صاحب قران مسلمان شدہ گوشت گاو خورد"

شیخا گکھڑ کا ذکر اوپر آچکا ہے اس نے تیمور کے جاتے ہی لاہور کے قلعہ سے اس کے اہل کار ہندو شاہ کو بے دخل کر کے خود قبضہ کر لیا تھا۔ اب جب کہ تیمور واپسی میں جموں پہنچا تو وہ سرکشی پر آمادہ رہ کر تیمور کی خدمت میں سلام کے لیے حاضر نہ ہوا، یہ سن کر تیمور نے کچھ فوج لاہور کی جانب روانہ کی۔ شیخا گرفتار ہو کر آیا تیمور نے اس کو قتل کر کے خضر خاں کو جو ہمراہِ رکاب تھا اپنی طرف سے لاہور دیپالپور و ملتان کا حاکم مقرر کیا اور شیخا کے بھائی جسرت کو گرفتار کر کے کابل کے راستے سمرقند کا عازم ہوا۔ جہاں سے سامانِ جنگ کر کے اس کو بایزید یلدرم عثمانی کے مقابلے کو جانا اور قسطنطنیہ کے عیسائی قیصر کو جس کی درخواست استمداد ہندوستان ہی میں اس کے پاس پہنچ گئی تھی۔ بایزید یلدرم کے حملے سے بچانا تھا شیخا کا بھائی جسرت گکھڑ سمرقند میں موقع پا کر قید خانہ سے نکل بھاگا اور پنجاب میں واپس آکر اپنے بھائی شیخا کی جگہ اپنی قوم کا سردار بن گیا۔

یہ تھا تیمور کا حملہ جس کا مختصر اور ضروری حال اوپر بیان ہوا۔ تیمور بماہ رجب ۸۰۰ھ ہندوستان میں داخل ہوا تھا اور ایک سال سے کچھ زیادہ دنوں کے بعد حدود ہندوستان سے واپس چلا گیا۔ ہندوستان میں تیموری لشکر کا مقابلہ مسلمانوں کے صرف ایک ہی خاندان نے کیا اور کوئی قابل تذکرہ مقابلہ اس کا کسی مسلمان سے نہیں ہوا۔ لاہور میں عادل خاں

ملتان میں سارنگ خاں اور دہلی میں اقبال خاں یکساں بہادری کے ساتھ معرکہ آرا ہوئے یہ تینوں حقیقی بھائی ظفر خاں ابن ظفر خاں لودھی کے بیٹے تھے۔ تیمور نے ہر ایک اس شخص کو جو ان لودھی سرداروں کا دشمن تھا قطع نظر اس کے کہ وہ مسلمان ہے یا ہندو، اپنا دوست سمجھا۔ چونکہ تیمور مسلمان تھا اس لئے اس کے اس حملہ کو بھی ہمارے ہندو دوستوں نے ہندوستان کے مسلمان سلاطین کے فرضی مظالم کی فہرست میں شامل کر لیا ہے ہم اپنے دوستوں سے بجز اس کے اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ تیمور کو جس قدر جی چاہے بُرا کہہ لو لیکن اس کی بداعمالیوں کو اسلام اور تعلیمات اسلامیہ کا نتیجہ قرار نہ دو تم اگر تیمور سے ناراض ہو تو ہم تم سے بھی زیادہ اس کے شاکی ہیں۔ تیمور کے خاندان میں اس کا باپ تراغی سب سے پہلا مسلمان تھا جس نے کفر کو چھوڑ کر اسلام قبول کیا تھا۔ تیمور تعلیمات اسلامیہ سے پورے طور پر واقف نہ تھا یہی وجہ تھی کہ وہ خراسان کے خوشامدی لوگوں کی باتوں میں آکر اپنے آپ کو مجدد بھی یقین کرنے لگا تھا اور شیعیت کی جانب حد سے زیادہ مائل تھا جس کے ثبوت میں اس کی خود نوشت تو زک موجود ہے۔ یہ وہی تیمور ہے جس نے بایزید یلدرم کو جو تمام براعظم یورپ کو فتح کر کے عیسائی طاقت کا خاتمہ کر دینے والا تھا انگورہ کی مشہور آفاق خون ریز جنگ میں بلاوجہ مبتلا کر کے یورپ کو بچا دیا۔ یہی تیمور ہے جس نے ترکان عثمانی یعنی بہترین خادمان اسلام کی بڑھتی اور اُبھرتی ہوئی طاقت کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا۔ یہی تیمور ہے جس نے شام و عراق و آذربائیجان و ایشیائے کوچک کے مشہور اسلامی شہروں کو برباد کیا۔ اس کی فوج نے ہندوستان آکر سارنگ خاں اور اس کے بھائی عادل خاں کو جو دونوں مسلمان تھے تباہ کیا۔ اُس نے شیخا گکھڑ کی عزت کو بڑھایا پھر شیخا کو اس کی احسان ناشناسی اور بے وفائی کی وجہ سے قتل کیا۔ اور خضر خاں کو جو پہلے بھی ملتان کا حاکم اور سارنگ خاں لودھی کا دشمن تھا پنجاب و ملتان کا حاکم بنایا۔ اُس نے میرٹھ کے مسلمان کو بھی قتل کیا اور سہارنپور و بجنور کے ہندوؤں کو بھی اُس نے دہلی کے مسلمان بادشاہ کو خانہ خراب کیا۔ دہلی کو جہاں مسلمانوں کی کثرت تھی لوٹا۔ قیدیوں کو جن میں ہندو اور مسلمان دونوں تھے قتل کیا۔ غرض اس کے ہاتھ سے ہندوستان میں ہندوؤں کو جس طرح نقصان پہنچا اسی طرح مسلمانوں کو۔ وہ اس ملک سے جو کچھ لوٹ مار کر کے لے گیا اس میں مسلمانوں سے چھینی ہوئی دولت یقیناً ہندوؤں سے چھینی ہوئی دولت کے مقابلہ

ہیں بڑھا ہوا زیادہ تھی۔ لہذا ہم اور تم دونوں یہ کیوں نہ کہیں کہ تیمور کی آمد خدائے تعالیٰ کا ایک غضب تھا جو اس ملک کے نالائق باشندوں کی (جن میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے) بداعمالیوں کی وجہ سے نازل ہوا تھا۔ ایک قدرتی تازیانہ تھا جو اس طرف توجہ دلانے کے لئے آیا تھا کہ بدامنی پھیلانا اور خانہ جنگی برپا کرنا ہرگز نیک نتیجہ پیدا نہیں کرسکتا۔ پھر اس بات کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ تیمور اُسی اکبر کا دادا تھا جس نے پوری نصف صدی تک اپنے عہد حکومت میں ہندوؤں پر انواع و اقسام کے احسانات روا رکھے جو ہمارے دوستوں کو بھی تسلیم ہیں۔

اقبال خاں لودھی

تیمور کے بعد نصرت شاہ جسے تاتار خاں ابن ظفر خاں تنہا چھوڑ کر گجرات کی جانب چل دیا تھا اور جو اقبال خاں کے خوف سے دہلی چھوڑ کر بھاگا ہوا تھا پھر واپس آکر دہلی میں حکومت کرنے لگا۔ اقبال خاں برن سے دہلی آیا تو اس کے آنے کی خبر سُن کر نصرت شاہ بھاگ کر میوات چلا گیا۔ اقبال خاں نے دہلی اور اردگرد کے اضلاع میں اپنی حکومت و سلطنت قائم کر لی۔ صوبوں کے حاکم پہلے ہی سب اپنی اپنی جگہ خود مختار او مستقل بادشاہ بن بیٹھے تھے۔ گجرات میں ظفر خاں۔ مالوہ میں دلاور خاں، جونپور میں خواجہ جہاں ملک سرور ملتان میں خضر خاں، سامانہ میں غالب خاں، بیانہ میں شمس خاں، کالپی میں محمد خاں، دہلی میں اقبال خاں لودھی، میوات میں بہادر ناہر کٹھیر میں ہرسنگھ، گوالیار میں پرم دیوا بن بیر سنگھ، اٹاوہ میں رائے سبیر، پٹیالی میں رائے سبیر سنگھ سب اپنی اپنی جگہ خود مختار و مطلق العنان تھے۔ کوئی کسی کا محکوم نہ تھا۔ اقبال خاں نے اپنے آپ کو مضبوط بنا کر سب سے پہلے جمادی الاول ۸۰۲ھ میں بیانہ پر حملہ کیا اور شمس خاں کو شکست دینے کے بعد دو ہاتھی اور بہت سا مال و اسباب لے کر اس سے فرماں داری کا اقرار نامہ لکھایا۔ پھر کٹھیر پر حملہ آور ہو کر ہرسنگھ سے اقرار اطاعت اور خراج و نذرانہ وصول کیا۔ انھیں ایام میں سلطان الشرق خواجہ جہاں ملک سرور کے فوت ہونے کی خبر پہنچی ساتھ ہی یہ معلوم ہوا کہ اس کی جگہ اس کا متبنیٰ ملک قرنفل جونپور میں مبارک شاہ کے لقب سے تخت نشین ہوا ہے۔ اقبال خاں کٹھیر سے روانہ ہو کر قصبہ پٹیالی کے قریب پہنچا تو رائے سبیر سنگھ اور اس طرف کے ہندو زمینداروں نے مقابلہ کر کے

شکست کھائی۔ اقبال خاں قنوج کے قریب دریائے گنگا کے کنارے پہنچا تھا کہ مبارک شاہ جونپور سے چل کر مقابلہ کے لئے آگیا۔ دریا کے ایک طرف اقبال خاں کی فوج خیمہ زن تھی دوسری طرف مبارک شاہ کی۔ دو مہینے اسی حالت میں دونوں لشکر خیمہ زن رہے اور کسی کو دریا کے عبور کرنے کی جرأت نہ ہوئی آخر مبارک شاہ جونپور کی طرف چل دیا۔ اقبال خاں بھی دہلی کی جانب چلا آیا۔ راستے میں شمس خاں سے بعض نامناسب حرکات معائنہ ہوئیں لہذا شمس خاں قتل ہوا اور بیانہ کی حکومت اُس کے بھائی کریم خاں کو کریم الملک کا خطاب دے کر سپرد کی گئی۔

اب سلطان ناصر الدین محمود کا حال سنیئے۔ وہ دہلی سے فرار ہو کر گجرات کی جانب گیا۔ اس کا خیال تھا کہ ظفر خاں ابن وجیہہ الملک میرے ساتھ مروت اور رعایت کا برتاؤ کرے گا لیکن ظفر خاں نے ہر ایک اس شخص کی جو دہلی سے بھاگ کر گجرات پہنچا خوب خاطر مدارات کی تاکہ اس کی حکومت وسلطنت کو رونق واستواری حاصل ہو لیکن سلطان ناصر الدین محمود کو اپنے یہاں ٹھہرانا بھی گوارا نہ کیا اور نہایت بے مروتی کے ساتھ پیش آیا۔ ناصر الدین محمود اور ظفر خاں کی مخالفت اور رقابت یقینی تھی دوسرے ناصر الدین محمود کا وجود اس کی حکومت وخود مختاری کے لئے مضرت رساں ہو سکتا تھا۔ تیسرے تاتار خاں ابن ظفر خاں نصرت شاہ کو بادشاہ بنا کر ناصر الدین محمود کے خلاف معرکہ آرا رہ چکا تھا اور اب ناصر الدین محمود سے پہلے باپ کے پاس گجرات پہنچا ہوا تھا۔ چنانچہ ناصر الدین محمود گجرات سے پیچ وتاب کھاتا ہوا خفیف وذلیل ہو کر واپس لوٹا۔ یہ خبر سُن کر دلاور خاں غوری حاکم مالوہ نے اپنی جبلی شرافت کے تقاضے سے اپنے آدمی بھیج کر ناصر الدین محمود کو اپنے یہاں بلوایا اور بڑی تعظیم وتکریم کے ساتھ پیش آیا۔ ناصر الدین محمود مالوہ میں مقیم تھا کہ ۸۰۲ھ ہجری میں اقبال خاں کا پیغام پہنچا کہ آپ دہلی تشریف لے آیئے۔ ناصر الدین محمود مالوہ سے دہلی آکر تختِ سلطنت پر بیٹھا اور اقبال خاں بطور وزیر بدستور مہمات سلطنت میں مصروف رہا۔ اسی حالت میں خبر پہنچی کہ مبارک شاہ شرقی یک سالہ حکومت کے بعد جونپور میں فوت ہو گیا اور اس کی جگہ اس کا بھائی ابراہیم شاہ تخت نشین ہوا۔ یہ سُن کر اقبال خاں اور ناصر الدین محمود دونوں شاہ ووزیر جونپور کی طرف روانہ ہوئے۔ ابراہیم شاہ شرقی فوج لے کر مقابلہ پر آیا جب دونوں لشکر قریب ہو کر خیمہ زن ہوئے تو سلطان ناصر الدین محمود نے یہ حماقت کی

کہ اقبال خاں کو دھوکہ دے کر شکار کے بہانے اپنے غلاموں اور ہمراہیوں کی ایک جماعت کے ساتھ لشکر سے جدا ہوا اور ابراہیم شاہ کے لشکر میں اس امید پر چلا گیا کہ ابراہیم شاہ چونکہ ہمارے خاندان کا غلام ہے ضرور اطاعت سے پیش آئے گا اور مجھے دیکھتے ہی اپنا تخت میرے لئے چھوڑ دے گا لیکن وہ ظفر خاں گجراتی سے زیادہ حوصلہ نہ رکھتا تھا اور دولاور خاں غوری یا اقبال خاں لودھی کی نجابت اس میں موجود نہ تھی اس نے اپنے لشکر میں ناصرالدین محمود کے آنے کا حال سن کر ضیافت کا سامان بھی نہ بھجوایا تعظیم و تکریم کے ساتھ استقبال کرنا تو بڑی بات تھی۔ اب ناصرالدین محمود ازیں سو رانده و زاں سو درمانده ہو کر نہ ابراہیم شاہ کے لشکر میں رہ سکتا تھا نہ اقبال خاں کو منھ دکھلانے کے قابل تھا فوراً وہاں سے جدا ہو کر شہر قنوج کی طرف آیا۔ باشندگانِ قنوج نے اس کا استقبال کیا اور ابراہیم شاہ کے عامل کو وہاں سے بیک بینی دوگوش بھاگنا پڑا۔ ناصرالدین محمود کے قنوج پر قابض و متصرف ہونے کا حال سن کر ابراہیم شاہ جونپور کی طرف واپس چلا گیا اور اقبال خاں دہلی کی جانب واپس آکر مہمات سلطنت میں مصروف ہوا۔ ناصرالدین محمود کو قنوج میں اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ ۸۰۵ھ میں اقبال خاں نے قلعۂ گوالیار پر حملہ کیا۔ گوالیار کے حاکم پرم دیو نے میدان میں نکل کر مقابلہ کیا مگر شکست کھا کر قلعہ میں محصور ہو بیٹھا اقبال خاں نے علاقہ سے روپیہ تو وصول کیا مگر قلعہ فتح نہ کر سکا۔ دہلی واپس آگیا ۸۰۶ھ میں گوالیار کے راجہ پرم دیو۔ اٹاوہ کے راجہ سمیر سنگھ رائے جھالا۔ اور دوسرے کئی ہندو زمینداروں نے مل کر اٹاوہ میں ایک لشکر عظیم جمع کر کے ایک ہندو سلطنت قائم کرنے کی تجویز اور اقبال خاں کے مقابلہ کی زبردست تیاری کی۔ یہ سنتے ہی اقبال خاں بلا توقف اس طرف پہنچا اور چار مہینے مسلسل جنگ و پیکار کا سلسلہ جاری رہا۔ آخر تمام راجہ مغلوب و شکست خوردہ و اسیر ہوئے اور سب نے عاجزانہ عفو تقصیر کی التجا کر کے آئندہ کے لئے فرمانبرداری و خراج گذاری کا وعدہ کیا۔ اقبال خاں سب سے خراج و نذرانہ اور اقرار اطاعت لے کر واپس ہوا ۸۰۷ھ میں اقبال خاں نے دہلی میں دولت خاں اور اختیار خاں اپنے چچازاد بھائیوں کو قائم مقام چھوڑ کر اول سامانہ پر حملہ کیا۔ وہاں کے حاکم کو گرفتار کر کے ملتان کی جانب روانہ ہوا۔ راستہ میں بمقام تلونڈی رلئے داود اور رائے ہبو پسران رلئے رتی کو ہمراہ لیتا ہوا آگے بڑھا خضر خاں حاکم ملتان ہوا اپنے آپ کو تیمور کی جانب سے ملتان و

پنجاب کا حاکم سمجھتا تھا پنجاب وملتان کی عظیم الشان فوجیں جمع کر کے پہلے ہی سے اقبال خاں کے مقابلے کی تیاری کر چکا تھا نیز گجرات سے ظفر خاں ابن وجیہ الملک نے اپنے بیٹے فتح خاں کو ایک زبردست فوج کے ساتھ خضر خاں کی مدد کے لئے بھیج دیا ظفر خاں کا بیٹا تاتار خاں جو اقبال خاں سے شکست کھا کر اور ذلیل ہو کر گجرات کی طرف بھاگ آیا تھا اس نے گجرات میں جب تیمور کے واپس چلے جانے اور اقبال خاں کے پھر دہلی پر قابض ہونے کا حال سنا تو ظفر خاں اپنے باپ کو قید کر کے خود سلطنت سنبھالی اور اقبال خاں سے بدلہ لینے کے لئے فوجیں فراہم کر کے دہلی کی جانب چلا۔ ظفر خاں نے جو محبوس و مقید ہو چکا تھا تاتار خاں کو زہر دلوا کر ہلاک کرا یا اور پھر برسر حکومت ہوا اس کو مرتے دم تک اس بات کا افسوس رہا کہ اپنے بیٹے تاتار خاں کو خود ہلاک کرایا۔ اب اقبال خاں کی فوج کشی کا حال سن کر اس نے خضر خاں کو مدد دینا تاتار خاں کے دشمن اور اپنے خاندان کے پرانے مخالف اقبال خاں کو ہلاک کرانا ضروری سمجھا اور اسی لئے اپنے دوسرے بیٹے فتح خاں برادر تاتار خاں کو خضر خاں کی مدد کے لئے بھیجا خضر خاں نے فتح خاں کی بڑی خاطر مدارات کی۔ یہی وہ فتح خاں گجراتی ہے جو اپنے باپ ظفر خاں کی وفات کے بعد اپنے بھتیجے احمد خاں ابن تاتار خاں کی تخت نشینی اور سلطنت گجرات سے اپنی محرومی پر بددل ہو کر خضر خاں کے پاس دہلی چلا آیا تھا جبکہ خضر خاں دہلی کا بادشاہ بن چکا تھا، غرض خضر خاں کے پاس بہت بڑی فوج اور نہایت زبردست لشکر فراہم ہو چکا تھا۔ اقبال خاں اور خضر خاں کی عداوت و مخالفت بھی پرانی اور قدیمی تھی۔ تیمور لودھی خاندان کا دشمن اور خضر خاں تیمور کا دست گرفتہ تھا۔ تیمور نے خضر خاں کی عزت افزائی اسی لئے کی تھی کہ وہ سارنگ خاں لودھی کا ستایا ہوا تھا۔ اقبال خاں اپنے بھائی سارنگ خاں کا انتقام اب خضر خاں ہی سے لے سکتا تھا جو اپنے آپ کو ملازم اور مخبر تیمور کا خادم ظاہر کرتا تھا۔

۱۹ر جمادی الاولیٰ ۸۰۸ھ کو دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا عین معرکہ جنگ میں اقبال خاں کا گھوڑا زخمی ہو کر بیکار رہا اس کے پیدل ہوتے ہی لشکر دہلی کی جس کی تعداد بھی بہت تھوڑی تھی، ہمت پست ہو گئی اور لوگ میدان چھوڑ کر بھاگنے لگے اقبال خاں نے فرار کی عار گوارا نہ کی اور آخر دم تک مصروف شمشیر زنی رہا۔ بہت سے دشمنوں کو خاک

وخون میں ملاکر اپنے ہی ایک ہم قوم ملک شاہ لودھی ابن بہرام خاں لودھی کے ہاتھ سے میدانِ جنگ میں مارا گیا۔ خضر خاں کی فوج میں بہت سے لودھی موجود تھے لودھیوں کی آپس کی نااتفاقی اور برادر کشی بطور ضرب المثل مشہور اور معلوم عوام ہے اسی برادر کشی کا نتیجہ تھا کہ سواسو سال کے بعد ۹۳۲ھ میں دولت خاں لودھی صوبہ دار پنجاب نے بابر کو حملۂ ہند کی دعوت دے کر لودھیوں کی عظیم الشان سلطنت کو برباد اور سلطان ابراہیم لودھی کو قتل کرایا تھا۔ ملک شاہ لودھی کو اقبال خاں کے قتل کرنے کے صلہ میں خضر خاں نے اسلام خاں کا خطاب دیا اور اس کے بعد وہ اسلام خاں ہی کے نام سے مشہور رہا۔ اقبال خاں کی قابلیت ملک گیری میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں اس نے یکے بعد دیگرے ایک ایک شخص کو مغلوب ومحکوم بنا کر دہلی کی سلطنت کے اقتدار رفتہ کو واپس لانے کی جو قابل قدر کوشش کی وہ ضرور قابل تحسین ہے سلطان ناصر الدین محمود اگر کسی قابل ہوتا تو اقبال خاں جیسے با اقبال و باوفا سردار کے ہوتے ہوئے کم از کم شمالی ہند کی سلطنت جیسی کہ فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں قائم تھی پھر بآسانی قائم ہو سکتی تھی۔ لودھیوں کی آپس کی نااتفاقی کی تو وہ صورت تھی جو اوپر مذکور ہوئی لیکن شاہی خاندان کے ساتھ وفاداری کا یہ عالم تھا کہ دولت خاں اور اختیار خاں نے جب اقبال خاں کے مارے جانے کا حال سنا تو فوراً سلطان ناصر الدین محمود کے پاس قنوج میں پیغام بھیجا کہ اقبال خاں جس سے آپ کتراتے تھے مارا گیا اب دہلی تشریف لائیے۔ اور تخت سلطنت کو سنبھالیے۔ ناصر الدین محمود اس پیغام کے پہنچتے ہی قنوج سے دہلی کی جانب روانہ ہو گیا۔ ابراہیم شاہ شرقی نے یہ سن کر کہ قنوج خالی ہو گیا ہے بلا توقف حملہ کر کے قنوج کو لے لیا۔ دہلی آکر ناصر الدین محمود نے دولت خاں کو فوج دے کر سامانہ کی طرف بھیجا جہاں بہرام خاں نامی ترکی غلام اقبال خاں کے مارے جانے کی خبر سن کر خود مختار ہو بیٹھا تھا اور خود قنوج کو ابراہیم شاہ کے قبضے سے چھڑانے کے لئے چلا۔ قنوج میں شاہ شرقی کے مقابل جب کچھ نہ ہو سکا تو دہلی کو واپس آیا۔ دولت خاں لودھی بہرام خاں کو گرفتار کر کے دہلی لے آیا ۸۱۰ھ میں خضر خاں نے حملہ کر کے حصار تک کے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ ابراہیم شاہ شرقی دریائے جمنا کے کنارے تک پہنچ گیا مگر فوراً واپس چلا گیا۔ جنگی طاقت اور فوجوں کی افسری عموماً پٹھانوں ہی کے قبضے میں تھی جن میں لودھی اور نیازی پٹھان خاص طور پر پیش پیش تھے سلطان جونپور کی فوج میں کئی لودھی افسر موجود تھے۔ خضر خاں حاکم ملتان کی طاقت کا انحصار بھی پٹھانوں

پر تھا جن میں لودھی قوم کے کئی افسر خاص طور پر نمایاں تھے۔ دہلی میں سلطان ناصر الدین محمود کی فوج کے سپہ سالار اور وزیر اعظم بھی دولت خاں لودھی اور اختیار خاں لودھی تھے خضر خاں نے اُدھر حصار اور فتح آباد پر قبضہ کیا ادھر دولت خاں لودھی نے سنبھل کو ابراہیم شاہ شرقی کے آدمیوں سے چھین لیا۔ پھر سنبھل سے واپس آکر حصار اور فتح آباد کو بھی خضر خاں سے فتح کر لیا۔ غرض کئی سال تک یہ کیفیت رہی کہ مشرق کی جانب سے سلطان ابراہیم حملہ آور ہوتا تھا اور مغرب کی جانب سے خضر خاں یورش کرتا تھا۔ دولت خاں لودھی جو سلطان ناصر الدین محمود کا سپہ سالار تھا سلطان ابراہیم شرقی کو سنبھل اور قنوج تک بھگاتا ہوا اس کے متعاقب جاتا تو خضر خاں دہلی کی فصیل کے نیچے اپنا لشکر لے آتا تھا۔ دولت خاں واپس ہو کر خضر خاں کو شکست دیتا اُس کے تعاقب میں سرہند یا سامانہ یا دیپالپور تک چلا جاتا تو ابراہیم شرقی پھر دہلی کے قریب پہنچ جاتا غرض پانچ چھ سال تک دہلی کی سلطنت اسی مصیبت میں مبتلا رہی۔ ناصر الدین محمود کسی قسم کی لیاقت اور قابلیتِ سلطنت نہ رکھتا تھا۔ دولت خاں جو ایک سپاہی منش آدمی تھا محض اپنی شمشیر زنی اور صف شکنی کی بدولت دونوں حریفوں کو نیچا دکھاتا اور دہلی کو اُن کے چنگل سے بچاتا رہا۔ آخر ماہ ذیقعدہ ۸۱۵ھ سلطان ناصر الدین محمود بیمار ہو کر فوت اور خاندان تغلقیہ کا خاتمہ ہوا۔

دولت خاں لودھی

ناصر الدین محمود کی وفات کے بعد تمام امرا و شرفا نے متفق ہو کر دولت خاں کو جس کی شجاعت و شہامت سب کے دلوں میں اثر کر چکی تھی تخت سلطنت پر بٹھایا۔ کٹھر کے ہندو زمینداروں نے بخوشی اطاعت قبول کی اور سلطنت دہلی کے زیر نگین علاقہ میں امن و امان قائم ہوا۔ لیکن دولت خاں کو ایک سال اور چند مہینے سے زیادہ بادشاہت کا موقعہ نہ ملا۔ خضر خاں اور ابراہیم شاہ دونوں دولت خاں کی تخت نشینی کا حال سُنکر پہلے سے زیادہ مشتعل اور دولت خاں کے خلاف خصوصی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ خضر خاں نے لودھیوں کی مشہور برادر کشی سے فائدہ اٹھا کر اپنی ریشہ دوانیوں کے ذریعہ اختیار خاں برادر دولت خاں کو اپنی طرف توڑ لیا۔ آخر ماہ ربیع الاول ۸۱۶ھ جبکہ دولت خاں کا ایک بھائی قادر خاں ابن محمود خاں دہلی کی تمام زبردست فوج لیے ہوئے بمقام کالپی ابراہیم شاہ ....

شرقی سے مصروف جنگ تھا اور دوسرا بھائی اختیار خاں خضر خاں کے پاس پہنچ چکا تھا اور اپنے پاس کئی دوسرے سرداروں مثلاً قوام خاں لودھی کو بھی لے گیا تھا خضر خاں نے ساٹھ ہزار سواروں کے جرار لشکر سے دہلی پر حملہ کرکے دولت خاں کو محصور کر لیا۔ محاصرہ کی شدت اور غلہ کی نایابی سے تنگ آکر دولت خاں نے اپنے آپ کو خضر خاں کے حوالے کر دیا خضر خاں نے ازراہ ناجواں مردی اُس کو قلعہ حصار فیروزہ میں بھیج کر قوام خاں لودھی کے ہاتھ سے بتاریخ ۱۰ ربیع الاول ۸۱۷ھ قتل کرایا اور اختیار خاں نیز دوسرے لودھی سرداروں نے باطمینان یہ تماشا دیکھا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

دولت خاں کی سلطنت اگرچہ ایک سال اور چند ماہ بیان کی جاتی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اقبال خاں کے مارے جانے کے بعد سے دہلی میں اسی کی حکومت قائم تھی ناصرالدین محمود برائے نام دہلی کا سلطان تھا۔ تغلقیہ خاندان کا حقیقتاً حملۂ تیمور سے خاتمہ ہو چکا تھا۔ حملۂ تیمور کے نتیجے میں جس طرح دوسرے صوبوں میں جُدا جُدا خود مختار حکومتیں قائم ہو گئی تھیں اسی طرح دہلی میں بھی لودھیوں کی حکومت قائم ہو گئی تھی۔ ان لودھی سرداروں نے گجرات و جونپور کے فرماں رواؤں کی طرح اپنے قدیمی آقا کے ساتھ بے مروتی کا برتاؤ نہیں کیا اور باوجود اس کے کہ تمام باشندگان دہلی۔ تمام امرا اور تمام اہل کاران سلطنت سلطان ناصرالدین محمود سے سخت ناراض تھے لودھیوں نے اس کو تخت سلطنت پر قائم رکھا۔ بہرحال پندرہ سولہ سال کے بعد اس دولت لودھیہ کا خاتمہ ہو کر دہلی میں خضر خاں کی سلطنت شروع ہوئی جس کو عام طور پر سلطنت سادات بھی کہا جاتا ہے۔ تیمور کا مقابلہ ہندوستان میں لودھیوں ہی نے کیا جو خاندان تغلق کے وفادار تھے لہٰذا وہ خاندان تغلق کے وفاداروں اور تیموریوں کے مخالف اور دشمن سمجھے گئے۔ لودھیوں میں سے کسی شخص نے تیمور کی اطاعت اختیار نہیں کی اس کے جانے کے بعد لودھیوں ہی نے دہلی میں پھر سلطنت کا نقشہ جمایا۔ آخر سولہ سال کی کشمکش کے بعد خضر خاں جو تیمور کی غلامی کا دم بھرتا تھا دہلی پر قابض ہونے میں کامیاب ہوا سارنگ خاں، اقبال خاں۔ عادل، دولت خاں نے طائف الملوکی اور بدامنی کے زمانے میں خاندان تغلقیہ کی حکومت قائم رکھنے اور فیروز شاہی غلاموں کے برپا کئے ہوئے فتنوں کو فرو کرنے اور خاندان شاہی کو سہارا دینے کی بے حد کوشش کی آخر اپنا فرض ادا کرنے کے بعد ایک ایک کر کے تلوار کے گھاٹ اُتر گئے۔

خضر خاں ابن ملک سلیمان

خضر خاں سید نہ تھا خضر خاں اور اس کی اولاد کی سلطنت کو عام طور پر سلطنت سادات کہا جاتا ہے لیکن یہ بات حقیقت و اصلیت سے کوئی تعلق نہیں رکھتی جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ سلطان فیروز تغلق کے زمانے میں ملک مردان دولت المخاطب بہ نصیر خاں ملتان کا صوبہ دار تھا۔ اُس نے ایک مجہول النسب لڑکے کو پرورش کر کے اپنا بیٹا بنایا جس کا نام سلیمان تھا۔ نصیر خاں کی وفات کے بعد اس کا بیٹا ملک شیخ ملتان کا حاکم ہوا۔ اس کے مرنے کے بعد سلیمان کو ملک سلیمان بنا کر ملتان کی حکومت سپرد کی گئی۔ اس ملک سلیمان کا بیٹا خضر خاں تھا جو دہلی کا پادشاہ ہوا۔ تاریخ مبارک شاہی کا مصنف خضر خاں اور اس کی اولاد کا سب سے بڑا مداح اور خیر خواہ ہے۔ خضر خاں کے بیٹے مبارک شاہ کے نام پر ہی اُس نے تاریخ کا نام تاریخ مبارک شاہی رکھا ہے۔ فرشتہ نظام الدین احمد بخشی اور ملا عبدالقادر بدایونی نے اس خاندان کے تمام کے تمام و کمال حالات تاریخ مبارک شاہی سے لئے ہیں۔ تاریخ مبارک شاہی کے مصنف نے اپنے ممدوح کو سید ثابت کرتے ہوئے دو زبردست دلیلیں پیش کی ہیں، وہ دونوں زبردست دلیلیں یہ ہیں:۔

"دلیل اول آنکہ ملک سلیمان وقتے کہ در خدمت ملک مردان دولت می بود نوبتے سید السادات مخدوم سید جلال بخاری رحمۃ اللہ بمنزل ملک مردان دولت قدم رنجہ فرمود و چوں طعام آوردند ملک سلیمان کہ قبل ازیں ہرگز دعوی سیادت نمی کرد بطریق خدمت گاران دیگر طشت و آفتابہ بجہت دست شستن آورد۔ آں سید فرمود کہ ایں سید را بدیں خدمت داشتن گستاخی است و چوں ایں سخن بر زبان اہل صلاح گذشتہ یقیں کہ او سید خواہد بود۔ دلیل دوم آنکہ اخلاق و اطوار خضر خاں مثل سخاوت و شجاعت و حلم و تواضع و صلاح و تقوی و صدق و رحم با خلاق و اوصاف حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم شباہت تمام داشت و ایں نیز دلیل سیادت است۔"

یہ دونوں دلیلیں ایسی ہیں کہ ان کے پوچ اور لچر ہونے کے ثبوت میں کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ ہاں پہلی دلیل سے ملک سلیمان کے مجہول النسب ہونے کا زبردست ثبوت ضرور بہم پہنچتا

ہے ملک سلیمان نے خود اپنے آپ کو سید نہیں بتایا ملک مردان دولت جس نے ملک سلیمان کو پرورش کیا تھا اُسے بھی یہ معلوم نہ تھا کہ سلیمان کس قوم سے تعلق رکھتا ہے۔ سید جلال بخاری رحمہ کے اس جملہ سے کہ اس سید سے خدمت گاروں کا کام نہیں لینا چاہیے سلیمان کے سید ہونے کا یقین کرلینا نہایت مضحکہ انگیز ہے اس لئے کہ حضرت مخدوم جلال بخاری رحمہ سے سلیمان کی قوم کا حال دریافت نہیں کیا گیا تھا بلکہ اُن کو یہ پہلے سے معلوم تھا کہ ملک مردان دولت نے سلیمان کو بیٹے کی طرح پالا ہے اُنھوں نے سلیمان کو طشت و آفتابہ لاتے ہوئے دیکھ کر جو الفاظ فرمائے ان کا مطلب یہ تھا کہ سلیمان چونکہ ملک مردان دولت کے خاندان والوں اور بیٹوں میں شمار ہوتا ہے لہٰذا وہ سرداروں اور ملک زادوں میں شامل ہونا چاہیے اس سے خدمت گاروں کا کام لینا مناسب نہیں حضرت مخدوم جلال بخاری رحمہ جو عرصہ دراز تک مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں بھی قیام پذیر رہ چکے تھے ان کی زبان سے "سید" کا لفظ "فاطمی" کے معنی میں نکلنا بعید از قیاس اور محتاج دلیل ہے۔ سید بمعنی فاطمی صرف ہندوستان کا محاورہ ہے۔ دوسرے تمام اسلامی ممالک میں اور ہندوستان میں بھی ذی علم طبقہ میں ہمیشہ سید کا لفظ سردار کے معنی میں استعمال ہوتا رہا ہے اور اس زمانے کی تصانیف میں قریشی مغل ترک، پٹھان سب کے لئے جو سرداری کا مرتبہ رکھتے تھے سید کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

پس سید جلال بخاری رحمہ کی زبان مبارک کے لفظ سید کو دلیل ٹھہرا کر سلیمان کو صحیح النسب سید یعنی فاطمی یقین کرنا کسی طرح صحیح نہیں اسی سلسلے میں یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ تیمور شیعیت کی طرف بے حد مائل اور سادات کے ساتھ حد سے زیادہ رعایت کرتا تھا اس کا تذکرہ اس نے خود بھی اپنی توزک میں کیا ہے۔ تیموری خاندان کا مشہور مورخ محمد ہاشم المخاطب بہ خافی خاں اپنی تاریخ منتخب اللباب میں تیمور کی نسبت لکھتا ہے کہ

> حسن عقیدت و کمال اخلاص کہ صاحب قرآں را نسبت بہ اہل بیت بودہ اشہر و اظہر از اں است کہ بشرح و بیان محتاج باشد چنانچہ گویند کہ ایں بیت اکثر ورد زبان او بودہ
>
> فردا کہ ہر کسے بشفیعے زنند دست
>
> ماایم دوست و دامن آل نبا بدست

تیمور کے مفصل حالات تاریخوں میں پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی سادات نوازی

اور پیر پرستی کی شہرت نے بڑے بڑے تاریخی تغیرات ایشیائی ممالک میں پیدا کئے ہیں اگرچہ تیمور سے پہلے بھی بہت سے غیر فاطمی لوگوں نے اپنے آپ کو اولاد علی اور اولاد فاطمہ ظاہر کرکے اپنے نسب کو تبدیل کیا اور بہت سے دنیوی فائدے اٹھائے لیکن تیمور کے زمانے میں ایسی بہت کثیر التعداد لوگوں کی ہوئی۔ خضر خاں کا اپنے باپ کے مذکورہ واقعہ کو دلیل ٹھہرا کر تیمور کی خدمت میں اپنے آپ کو سید ظاہر کرنا اور اس طرح تیمور کی سادات پرستی سے بھی مدد حاصل کرکے ملتان و پنجاب کی حکومت حاصل کرلینا ذرا بھی تعجب وحیرت کی بات نہیں ہماری آنکھوں کے سامنے بالکل اسی قسم کا ایک واقعہ موجود ہے کہ ایک ہندوستانی بااختیار رئیس نے جس کا مورث اعلیٰ سلیمان مذکور کے حالات سے بہت مشابہت رکھتا تھا اپنے آپ کو سید بنالیا اور اس کے وابستگان دامن نے امنا و صدقنا کہا۔ خضر خاں تو دہلی کا بادشاہ بن چکا تھا اس کے لئے کیا مشکل تھا کہ لوگوں سے اپنے آپ کو سید کہلاتا جس طرح ہمارے زمانے کے مشارٌالیہ رئیس کے مورخ کو اپنے مخدوم کی قوم سید لکھنی پڑی اسی طرح تاریخ مبارک شاہی کے مصنف کو مجبور ہونا پڑا۔ لیکن خضر خاں کے سید ہونے کی دونوں دلیلیں جو وضع کی گئی ہیں، بہت ہی کمزور اور واضع کے ضعف تصنیف پر دال ہیں۔

خضر خاں کا عہد حکومت

خضر خاں ربیع الاول ۸۱۷ھ میں دہلی کا بادشاہ بن گیا لیکن اُس نے اپنے کو بادشاہ نہیں کہلوایا نہ بادشاہوں کا سا کوئی لقب اپنے لئے تجویز کیا بلکہ صرف "روایات عالی" یا "مسند عالی" کا خطاب پسند کرکے اپنے آپ کو تیمور کے بیٹے مرزا شاہ رخ فرماں روائے ایران کا نائب و فرماں بردار ظاہر کرتا اور سالانہ خراج یا نذرانہ اقرار فرمانبرداری کے ثبوت میں مرزا شاہ رخ کے پاس ایران بھیجتا رہا سکہ اور خطبہ میں بھی اپنا نام داخل نہیں کیا بلکہ مرزا شاہرخ کے نام کا سکہ مضروب کرایا خطبہ بھی مرزا شاہرخ کے نام کا مسجدوں میں پڑھا جاتا تھا۔ خطبہ کے آخر میں، خضر خاں کے لئے دعا کردی جاتی تھی۔ اس طرح دہلی کی سلطنت سات سال یعنی خضر خاں کی وفات تک خودبخود ہی سلطنت ایران کا صوبہ بنی رہی۔ خضر خاں کے سرداران لشکر اور ارکان سلطنت میں عموماً لودی تھے اور وہ لوگ شامل تھے جو اس سے پہلے کوئی شہرت اور عزت نہیں رکھتے تھے۔ لودھیوں کی جماعت بھی اچھی طاقتور اور بااثر تھی یہ

لودھی بھی دو حصوں میں منقسم تھے۔ ایک حصہ اُن لودھیوں کا تھا جو مردان دولت کے زمانے میں ملتان آکر نوکر ہوئے تھے ان میں ملک بہرام لودھی کے بیٹے ملک سلطان شاہ المخاطب بہ اسلام خاں۔ ملک کالا۔ ملک فیروز، ملک محمد، ملک خواجہ خاص طور پر نمایاں تھے۔ دوسرا حصہ ان لودھیوں کا جو خضر خاں کی ترغیب سے دولت خاں کو دھوکہ دے کر خضر خاں سے جا ملے تھے ان میں دولت خاں کا بھائی اختیار خاں اور قوام خاں لودھی خاص طور پر قابل تذکرہ تھے۔

خضر خاں نے ملک تحفہ کو تاج الملک کا خطاب دے کر اپنا وزیر و مدار المہام بنایا اور ملتان اس کی جاگیر میں عطا کیا۔ اختیار خاں کو برادر کشی کے صلہ میں وہ علاقہ دیا جو آج کل مظفر نگر اور میرٹھ کے ضلعوں پر مشتمل ہے۔ سید سالم نامی ایک سید کو وہ علاقہ ملا جو آج کل سہارنپور کا ضلع کہلاتا ہے۔ بدایوں میں مہابت خاں پہلے سے حاکم تھا اُس نے اطاعت قبول کی اور بدایوں کی حکومت پر قائم رہا۔ رام گنگا کے مشرق کی جانب کا علاقہ جو آج کل ریاست رام پور اور ضلع بریلی میں شامل ہے رائے ہر سنگھ کے قبضے میں تھا اُس نے باج و خراج کے ادا کرنے میں انکار یا لیت و لعل کیا تو تاج الملک نے جا کر اس کی گوشمالی کی اور وہ اظہار عجز اور اقرار فرمانبرداری کے بعد خراج ادا کر کے اپنے علاقہ پر بدستور قائم رہا چندواڑہ، اٹاوہ، اور جلیسر کے راجپوت راجاؤں کے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آیا۔ بالآخر سب مطیع و منقاد ہو گئے۔ سرہند کی حکومت پر خضر خاں نے رائے سادھو کو ملک سادھو کا خطاب دے کر بھیجا وہاں بیرم خاں نامی ایک ترک بچے نے علم بغاوت بلند کر کے ملک سادھو کو قتل کر دیا۔ یہ سُن کر خضر خاں نے ملک داؤد اور زیرک خاں نامی سرداروں کو بیرم خاں کی گوشمالی کے لئے دہلی سے روانہ کیا۔ بیرم خاں اور اُس کے ہمراہی سرہند سے بھاگ کر نگرکوٹ کے پہاڑوں میں جا چھپے ۸۱۹ھ میں خضر خاں نے گوالیار کے راجہ کی سرکشی کا حال سُن کر خود فوج کشی کی اس نے نذرانہ پیش کیا اور فرماں بردار رہنے کا اقرار کر کے اپنی جان اور اپنی ریاست کو بچایا ۸۲۰ھ میں رائے ہر سنگھ نے پھر بغاوت کی اور تاج الملک اس کی سرکوبی کے لئے روانہ ہوا۔ وہ بھاگ کر کمایوں کے پہاڑوں میں جا چھپا، اسی اثنا میں اٹاوہ کے راجہ رائے سمیر نے علم بغاوت بلند کیا۔ تاج الملک نے اس طرف جا کر بعد جنگ اسے گرفتار کیا مگر اقرار اطاعت لے کر پھر اٹاوہ

کی حکومت پر مامور کر آیا۔ بماہ ذیقعدہ ۸۲۱ھ خضر خاں نے خود بخود فوج لے کر بدایوں کا قصد کیا۔ بدایوں کے حاکم مہابت خاں سے کوئی علامت سرکشی کی ظاہر نہیں ہوئی تھی اس کی خطا صرف یہ تھی کہ وہ دولت خاں لودھی کا مامور کردہ تھا اور اسی زمانے سے بدایوں کا حاکم چلا آتا تھا۔ خضر خاں کے اس طرح آنے پر وہ بدایوں کے قلعہ میں محصور ہو بیٹھا۔ چھ مہینے تک خضر خاں نے کوشش کی مگر مہابت خاں کو زیر نہ کر سکا اور بدایوں کا قلعہ کسی طرح فتح نہ ہوا۔ خضر خاں کو مجبوراً بدایوں سے دہلی کی جانب واپس ہونا پڑا۔ اس ناکامی سے اس کو یہ شبہ گذرا کہ دولت خاں سے جدا ہو کر جو سردار مجھ سے آملے تھے ان کی وفاداری مشتبہ ہے اور انھوں نے مہابت خاں کے مقابلے میں پوری کوشش نہیں کی چنانچہ گنگا کے کنارے پہنچ کر اس نے ایک ضیافت کے بہانے سے اختیار خاں لودھی، قوام خاں لودھی اور اسی قسم کے دوسرے تمام سرداروں کو بتاریخ ۸ر جمادی الاول ۸۲۲ھ ایک مجلس میں بلا کر قتل کرا دیا ۸۲۳ھ میں خضر خاں نے میواتیوں کی سرکشی کا حال سن کر میوات پر چڑھائی کی۔ اسی عرصے میں تاج الملک وزیر فوت ہوا۔ اس کے بڑے بیٹے ملک الشرق سکندر کو وزارت عطا ہوئی۔ اسی عرصے میں رائے سمیر کے مرنے کی خبر پہنچی یہ سن کر خضر خاں خود اٹاوہ گیا اور رائے سمیر سنگھ کے بیٹے کو باپ کی جگہ اٹاوہ کا راجہ بنا کر واپس ہوا۔ راستے میں ۱۷ر جمادی الاول ۸۲۴ھ کو بیمار ہو کر فوت ہوا۔

مبارک شاہ ابن خضر خاں

خضر خاں نے مرنے سے تین روز پہلے اپنے بیٹے مبارک خاں کو اپنا ولی عہد بنایا تھا باپ کے فوت ہونے پر مبارک خاں نے تخت نشین ہو کر مبارک شاہ کے لقب سے اپنے نام کا سکہ و خطبہ جاری اور مرزا شاہرخ ابن تیمور کا نام سکہ و خطبہ سے خارج کر کے تیموریوں سے قطع تعلق کیا۔ ہندو اور مسلمان امرا کو ان کے عہدوں اور جاگیروں پر قایم رکھا۔ اس کی تخت نشینی کے وقت پنجاب میں جسرت گکھڑ نے فتنہ برپا کیا۔ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ جسرت گکھڑ سمرقند سے بھاگ کر پنجاب میں چلا آیا تھا جسرت نے دامن کوہ کے علاقے پر قبضہ و تصرف کر کے اپنی حکومت قائم کرلی

تھی اور خضر خاں اس کے استیصال کی طرف متوجہ نہیں ہو سکا تھا۔ خضر خاں کی وفات سے سال بھر پہلے ۸۲۳ھ میں جسرت گکھڑ غیر معمولی طور پر طاقتور ہو گیا تھا جس کی تفصیل یہ ہے کہ کشمیر کے پادشاہ سلطان سکندر بت شکن نے اپنے بیٹے میر خاں الملقب بہ علی شاہ کی شادی جموں کے راجہ مسمی رائے بھیم کی بیٹی سے کی تھی ۸۱۹ھ میں سلطان سکندر کی وفات کے بعد اس کا بیٹا میر خاں الملقب بہ سلطان علی شاہ کشمیر کے تخت پر بیٹھا ۸۲۳ھ میں سلطان علی شاہ اپنے بھائی شاہی خاں کو کشمیر میں اپنا قائم مقام بنا کر اور دوسرے بھائی محمد خاں کو اس کی اعانت کے لئے چھوڑ کر خود پنجاب کی فتح کے لئے روانہ ہوا اور اول اپنے خسر راجہ بھیم کی ملاقات کے لئے جموں آیا۔ راجہ بھیم نے اُس کو توجہ دلائی کہ شاہی خاں جس کو تم کشمیر کی حکومت سپرد کر آئے ہو اب تم کو کشمیر میں واپس داخل نہ ہونے دے گا۔ اس کو قائم مقام بنانے میں تم نے غلطی کی ہے علی شاہ یہ سُن کر پریشان اور راجہ بھیم کو معہ فوج ہمراہ لے کر کشمیر کی طرف واپس ہوا۔ شاہی خاں متوہم ہو کر اور تاب مقابلہ نہ لا کر دوسرے راستے سے جسرت گکھڑ کے پاس پنجاب چلا آیا۔ علی شاہ اور راجہ بھیم نے مل کر جسرت اور شاہی خاں پر حملہ کیا۔ جسرت اور شاہی خاں گھات میں بیٹھ گئے۔ شاہی خاں کی فوج۔ جو یلغار کئے ہوئے آ رہی تھی پہاڑ کے دروں میں جسرت اور شاہی خاں کے اچانک حملے سے پریشان ہو گئی۔ علی شاہ گرفتار ہوا۔ جسرت اور شاہی خاں کشمیر میں داخل ہوئے۔ شاہی خاں اپنے بھائی علی شاہ کی جگہ سلطان زین العابدین کے نام سے تخت نشین ہوا۔ جسرت گکھڑ کو سلطان زین العابدین نے بہت مال و دولت اور لشکر دے کر پنجاب کی فتح پر مامور کیا اور جسرت نے اضلاع پنجاب پر قبضہ کر کے زیرک خاں حاکم جالندھر کو قید کر لیا۔ اس کے بعد ۲ جمادی الآخر ۸۲۴ھ کو سرہند پر حملہ کر کے اسلام خاں لودھی حاکم سرہند کو محصور کیا۔ سلطان مبارک شاہ کو جب زیرک خاں کے گرفتار اور اسلام خاں کے محصور ہونے کا حال معلوم ہوا تو وہ باوجود برسات بماہ رجب ۸۲۴ھ دہلی سے روانہ ہو کر سرہند پہنچا۔ مبارک شاہ کے قریب پہنچنے کی خبر سُن کر جسرت قلعہ سرہند سے محاصرہ اٹھا کر بھاگا۔ ادھر زیرک خاں کو بھی جسرت کی قید سے نکل کر بھاگ آنے کا موقع مل گیا۔ مبارک شاہ نے جسرت کا تعاقب کیا اور کسی جگہ اسے دم لینے کا موقعہ نہ دیا۔ یہاں تک کہ جسرت اپنا تمام مال و اسباب لشکر دہلی کے ہاتھوں

لٹوا کر نہایت خستہ وخراب حالت میں پہاڑوں کے اندر جا چھپا۔ جموں کا راجہ بھیم سلطان مبارک شاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر مورد الطاف ہوا اور اسی کی رہبری میں پہاڑوں کے اندر دور تک جسرت کا تعاقب کیا گیا مگر وہ ہاتھ نہ آیا۔ آخر ماہ محرم ۸۲۵ھ مبارک شاہ لاہور آیا۔ لاہور کے قلعہ کو جسرت خراب کر چکا تھا۔ سلطان نے ملک محمود حسن کو لاہور کی حکومت سپرد کر کے قلعہ کی مرمت و درستی کا حکم دیا اور لاہور سے دہلی کی جانب معاودت کی۔ سلطان مبارک شاہ کی واپسی پر جسرت نے اپنی حالت پھر درست کر کے لاہور پر چڑھائی کی پینتیس روز تک لاہور کا محاصرہ کئے پڑا رہا۔ جب کچھ نہ ہو سکا تو لاہور سے لوٹ کر راجہ بھیم حاکم جموں پر بغرض انتقام حملہ آور ہوا۔ یہاں بھی کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ جسرت کے لاہور پر حملہ آور ہونے کی خبر سن کر دہلی سے ملک سکندر تحفہ وزیر اور سرہند سے اسلام خاں لودھی ملک محمود حسن کی امداد اور جسرت کے مقابلے کو روانہ ہو چکے تھے ملک سکندر تحفہ لاہور ہوتا ہوا جموں پہنچا۔ راجہ بھیم نے حاضر ہو کر جسرت کے تعاقب میں شاہی لشکر کی رہبری کی مگر وہ پہاڑوں میں داخل ہو کر غائب ہو چکا تھا۔ ہاتھ نہ آیا۔ مبارک شاہ نے دہلی سے حکم بھیجا کہ ملک سکندر تحفہ لاہور میں رہ کر وہاں کا انتظام کرے اور ملک محمود حسن دہلی آجائے ۸۲۶ھ میں مبارک شاہ نے وزارت عظمیٰ بجائے ملک سکندر تحفہ کے سردار الملک نومسلم کو عطا کی اور خود معہ وزیر گنگا کو عبور کر کے ولایت کٹھر میں وہاں کے ہندو سرکشوں کی تادیب کے لئے گیا۔ اٹاوہ کا راجہ جو راٹھور راجپوت تھا۔ سلطان کی خدمت میں گنگا کے گھاٹ پر سلام کے لئے حاضر ہو گیا تھا اور لشکر شاہی کے ہمراہ تھا۔ سلطان کٹھر سے اٹاوہ کی طرف گیا تو اٹاوہ کا راجہ بلا اطلاع سلطانی لشکر سے جدا ہو کر اٹاوہ کے قلعہ میں پہنچا اور مقابلہ پر آمادہ ہوا۔ سلطان نے قلعہ اٹاوہ کا محاصرہ کر کے راجہ کو عاجز کیا اور اس نے اپنا بیٹا بطور یرغمال اور بہت سا نذرانہ بھیج کر سلطان کو رضامند کیا۔ سلطان نے اٹاوہ سے دہلی واپس آکر سنا کہ جسرت نے جموں پر حملہ کر کے راجہ بھیم کو قتل کر دیا اور اس کے اموال واملاک پر قابض ہو کر اور اپنے آپ کو گکھڑوں کی فوج سے خوب طاقتور بنا کر پنجاب پر حملہ کا قصد کر رہا ہے دوسری خبر یہ پہنچی کہ شیخ علی مغل جو مرزا شاہرخ کی طرف سے امیر کابل ہے جسرت گکھڑ کی ترغیب و تحریص سے ملتان پر حملہ آور ہونے والا ہے۔ تیسری خبر یہ پہنچی کہ ہوشنگ شاہ والی مالوہ نے گوالیار کے قلعہ کا محاصرہ

کرلیا ہے اور گوالیار کا راجہ سخت مصیبت میں گرفتار ہے مبارک شاہ نے ملک محمود حسن کو ملتان کی طرف روانہ کیا اور حکم دیا کہ ملتان کا قلعہ جس کو تیمور مسمار کرگیا تھا فوراً درست کرکے امیر کابل شیخ علی مغل کے مقابل پر مستعد رہو۔ خود گوالیار کی جانب روانہ ہوا گوالیار کے قریب معمولی معرکہ ہوکر دونوں پادشاہوں میں صلح ہوگئی۔ ہوشنگ شاہ مالوہ چلا گیا۔ مبارک شاہ دریائے چمبل کے کنارے چند روز قیام کرنے اور وہاں کے زمینداروں اور رئیسوں سے خراج وصول ہوجانے کے بعد بماہ رجب ۸۲۵ھ دہلی واپس آیا ۸۲۶ھ میں سلطان کٹھر کی جانب اس لئے گیا کہ تین سال سے راجہ ہرسنگھ نے خراج نہیں بھیجا تھا۔ جب سلطانی لشکر گنگا کے کنارے پہنچا تو راجہ ہرسنگھ سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا اور خراج ادا نہ کرنے کے جرم میں چند روز نظر بند رہ کر سہ سالہ خراج ادا کرنے کے بعد رہا اور اپنے علاقے پر بحال ہوا۔ دہلی واپس آکر مبارک شاہ کو معلوم ہوا کہ میواتیوں نے لوٹ مار اور سرکشی پر کمر باندھ لی ہے سلطان خود میوات کی طرف گیا۔ میواتی لوگ علاقہ کو خالی چھوڑ کر پہاڑوں اور جنگلوں میں جا چھپے۔ چونکہ لشکر میں غلہ کی گرانی تھی۔ لہٰذا میوات میں بادشاہ زیادہ نہیں ٹھہرا دہلی واپس چلا آیا۔ ۸۲۹ھ میں پھر میوات گیا وہاں بہادر ناہر کے پوتوں نے قلعہ الور میں لشکر جمع کرکے مقابلہ کی تیاری کی آخر مغلوب ہوکر اسیر اور چند روز کے بعد رہا ہوکر پھر اپنی جاگیر پر بحال ہوئے ۸۳۰ھ میں مبارک شاہ میوات ہوتا اور بیانہ وسیکری کا انتظام کرتا ہوا گوالیار پہنچا۔ وہاں کے راجہ سے پیشکش وصول کرکے دہلی واپس آیا۔ اسی سال بیانہ ومیوات میں پھر بدامنی پیدا ہوئی سلطان کو وہاں جانا پڑا۔ اسی زمانے میں جونپور کے بادشاہ سلطان ابراہیم شرقی نے بدایوں پر قبضہ کرنا چاہا۔ مبارک شاہ مقابلہ کے لئے اپنے بڑے بڑے سرداروں کو ہمراہ لے کر روانہ ہوا۔ ملک محمود حسن جو ملتان سے واپس آگیا تھا، خان اعظم فتح خاں ابن ظفر خاں گجراتی۔ زیرک خاں اسلام خاں لودھی ملک چمن۔ ملک کالو شحنہ پیل۔ ملک احمد مقبل۔ سردار الملک وزیر سید السادات، سید سالم وغیرہ سب اس لشکر میں موجود تھے۔ آخر، جمادی الآخر ۸۳۰ھ کو دوپہر سے شام تک معرکہ کارزار گرم رہا اور فتح وشکست کا کوئی فیصلہ نہ ہوا۔ اگلے روز سلطان ابراہیم شرقی جونپور کو اور سلطان مبارک شاہ گوالیار کو روانہ ہوا۔ گوالیار سے بیانہ آکر ملک محمود حسن کو بیانہ کا حاکم بنا کر خود دہلی کی طرف آیا۔ ملک قدد میواتی نبیرۂ بہادر ناہر نے چوں کہ

سلطان شرقی سے پیام سلام کرکے اُس کو حملہ کی ترغیب دی تھی اور اب بھی وہ اسی کوشش اور سازش میں مصروف تھا لہذا ماہ شوال ۸۲۱ھ میں گرفتار ہو کر قتل ہوا۔ اور بہادر ناہر کے دوسرے پوتوں جلال خاں۔ احمد خاں اور فخر الدین نے قلعہ الور میں پناہ لی۔ بماہ ذیقعدہ ۸۲۳ھ خبر پہنچی کہ جسرت گکھڑ نے اس فرصت میں اچھی طرح تیاری کرکے ملک سکندر تحفہ حاکم لاہور کو کلانور کے میدان میں مقابلہ کرکے شکست فاش دی ملک سکندر تحفہ شکست کھا کر لاہور واپس آیا اور جسرت گکھڑ نے جالندھر کے علاقے میں لوٹ مار کرکے لوگوں کے دلوں میں اپنی ہیبت بٹھا دی۔ سلطان نے اسلام خاں لودھی حاکم سرہند کو ملک سکندر تحفہ کی مدد کے لئے حکم بھیجا۔ اسلام خاں نے پہنچ کر جسرت کو پہاڑوں میں بھگا دیا۔ بماہ محرم ۸۲۴ھ ملک محمود حسن بیانہ کے انتظام سے فارغ ہوکر دہلی آیا اور اس کو عماد الملک کا خطاب ملا۔ اس کے بعد سلطان مبارک شاہ میوات میں گیا۔ وہاں جلال خاں میواتی اور اس کے بھائیوں نے سلطان کی خدمت میں حاضر ہوکر معافی چاہی اور آئندہ ہمیشہ محکوم و فرماں بردار رہنے کا اقرار کرکے میوات کی حکومت پر مامور رہے۔ دہلی واپس ہوکر ملک محمود حسن عماد الملک کو سلطان نے ملتان کی حکومت پر مامور کرکے رخصت کیا۔ ۸۲۵ھ میں گوالیار اور نواح گوالیار کے زمینداروں نے پھر فتنہ برپا کیا۔ سلطان نے بلا توقف پہنچ کر اس فتنے کو فرو کیا۔ وہاں سے کوہ پایہ (دہردوار و دہرہ دون) کے سرکشوں کو ٹھیک کرکے دہلی آیا۔ اسی زمانے میں سید السادات سید سالم کے فوت ہونے پر اس کے بیٹوں کو اس کی جاگیر و اموال پر قابض رکھا۔ سید سالم کے پاس دولت بہت تھی لہذا سید سالم کے بیٹوں نے مغرور ہوکر خیال فاسد کو دل میں راہ دی۔ سید سالم کا ایک غلام فولاد خاں ترک بچہ سرہند پہنچا۔ سید سالم کے بیٹوں کی تجویز یہ تھی کہ بادشاہ فولاد خاں کی سرکوبی کے لئے جب سرہند کی طرف جائے گا تو ہم اپنے معاونین کی مدد سے بادشاہ پر جا پڑیں گے۔ اسلام خاں حاکم سرہند بادشاہ کی ہمراہی میں دہلی آیا ہوا تھا، فولاد خاں آسانی سے سرہند پر قابض و متصرف ہو گیا اور ہر قسم کا سامان قلعہ داری فراہم کرکے مضبوط ہو بیٹھا۔ مبارک کو اس منصوبے کا حال معلوم ہو گیا تھا اُس نے فولاد خاں کی طرف متوجہ ہونے سے پہلے سید سالم کے بیٹوں کو گرفتار کرکے تمام مال و اسباب اُن سے چھین لیا اور سرہند کی طرف فوج روانہ کی۔ مگر اس فوج کو فولاد خاں کے

مقابلہ میں کوئی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ آخر مبارک شاہ خود فوج لے کر گیا اور چھ مہینے تک محاصرہ کئے پڑا رہا لیکن قلعہ سرہند فتح نہ ہوا۔ آخر اسلام خاں لودھی وغیرہ چند امیروں کو سرہند کے محاصرے پر چھوڑ کر دہلی کی جانب آیا۔ فولاد خاں نے یہ چال چلی کہ سرہند سے ایک درخواست امیر کابل شیخ علی مغل کی خدمت میں بھیجی کہ آپ ہندوستان پر حملہ آور ہوجیئے علاوہ اس کے کہ آپ کی فتح یقینی ہے میں بہت بڑی رقم حاضر خدمت کروں گا۔ امیر شیخ علی جس کو جسرت گکھڑ بھی کئی مرتبہ حملہ کی ترغیب دے چکا تھا کابل سے روانہ ہوا پنجاب میں داخل ہوتے ہی گکھڑوں کی بہت بڑی جمعیت اس کے لشکر میں شامل ہو گئی لاہور کے حاکم ملک سکندر تحفہ نے لاہور کا تمام خزانہ نذر کر کے اپنی جان بچائی۔ شیخ علی جب سرہند کے قریب پہنچا تو جو امرا سرہند کا محاصرہ کئے پڑے تھے اپنے اندر مقابلہ کی طاقت نہ دیکھکر محاصرہ اٹھانے پر مجبور ہوئے اور اسلام خاں لودھی ملک محمود حسن الملقب بہ عماد الملک کے پاس ملتان چلا گیا۔ فولاد خاں نے قلعہ سے نکل کر شیخ علی سے ملاقات کی اور حسب وعدہ بہت سی دولت بطور نذرانہ پیش کی شیخ علی نے سرہند کے علاقے کو خوب لوٹا اور اس کی فوج کے سپاہی مالا مال ہو گئے۔ یہاں سے امیر شیخ علی فولاد خاں کو سرہند میں قابض ومتصرف چھوڑ کر ملتان کی جانب روانہ ہوا۔ سلطان مبارک شاہ اس کے سرہند آنے اور لوٹ مار مچانے کی خبر سُن کر مقابلہ کے لئے خود سرہند نہیں گیا۔ اب ملتان کی طرف اُس کے جانے کا حال سُن کر بھی اُس کو خود جانے کی ہمت نہیں ہوئی بلکہ فتح خاں ابن ظفر خاں گجراتی، زیرک خاں، ملک یوسف خاں، ملک کمال خاں، رائے ہبورا کو عماد الملک کی مدد کے لئے ملتان کی جانب روانہ کیا۔ امیر شیخ علی مغل لوٹ مار کرتا ہوا ملتان سے دس کوس کے فاصلہ پر پہنچا تو عماد الملک ملک محمود حسن نے اسلام خاں لودھی کو اس کے مقابلے کے لئے روانہ کیا۔ اسلام خاں نے سخت مقابلہ کیا آخر اسلام خاں کی فوج پارہ پارہ ہوکر منتشر ہوگئی اور اس کو خیرآباد کے قلعہ میں پناہ لینی پڑی۔ یہ سن کر عماد الملک بھی ملتان سے فوج لے کر نکلا اور اس بات کی کوشش کی کہ شیخ علی کی فوج خیرآباد میں اسلام خاں کو محصور نہ کرسکے۔ اسی اثنا میں ۲۲ شوال ۸۳۲ھ کو مذکورہ امرا جو دہلی سے روانہ ہوئے تھے، ملتان کے قریب پہنچ گئے۔ ان امرا کے پہنچنے پر عماد الملک نے میدان میں جم کر شیخ علی مغل کا مقابلہ کیا۔ اس لڑائی میں فتح خاں ابن ظفر خاں گجراتی مارا گیا مگر شیخ علی مغل کو

شکست فاش حاصل ہوئی اور جو کچھ اُس نے پنجاب و سرہند وغیرہ سے حاصل کیا تھا سب چھنوا کر بحال تباہ کابل کو واپس ہوا۔ جو امرا دہلی سے گئے تھے دہلی کو واپس آئے فتح خاں جو مذکورہ جنگ ملتان میں مارا گیا وہی فتح خاں برادر تاتارخاں ابن ظفرخاں ہے۔ جو گجرات کے تخت سے مایوس ہو کر خضر خاں کے پاس چلا آیا تھا۔ یہی فتح خاں ہے جس نے کمپل وٹپیالی (موجودہ ضلع فرخ آباد وایٹہ) کے راجہ رائے پرتاب کو ۸۲۲ھ میں اسیر و دست گیر کر کے اُس کی بیوی پر تصرف کیا تھا اور اسی فتح خاں کا بیٹا حمید خان تھا جو آئندہ سلطان محمد شاہ اور سلطان علاء الدین کا وزیر ہوا جس کا ذکر آگے آئے گا۔ فولاد خاں بدستور سرہند پر قابض تھا اس کا ابھی تک کوئی تدارک نہیں ہوا تھا۔ مبارک شاہ عماد الملک کی اس کامیابی سے جو اس کو امیر شیخ علی کے مقابل میں حاصل ہوئی تھی متوہم ہوا اور اُس نے عماد الملک کو ربیع الاوّل ۸۲۵ھ میں ملتان سے دہلی طلب کر لیا اور ملتان میں کوئی دوسرا امیر بھیج دیا جسرت گکھڑ نے موقعہ پاکر پھر ہاتھ پاؤں نکالے اور جالندھر و لاہور کو فتح کر کے ملک سکندر تحفہ حاکم لاہور کو گرفتار کر لیا اور امیر شیخ علی مغل کو لکھا کہ اب ملتان پر چڑھائی کرنے کا بہت اچھا موقع ہے کہ عماد الملک وہاں سے جدا ہو گیا ہے۔ امیر کابل نے یہ سنتے ہی ملتان پر حملہ کیا اور اس علاقے کو خوب لوٹا۔ فولاد خاں پنجاب اور ملتان میں اپنے حلیفوں کو چیرہ دست دیکھ کر سرہند سے نکلا اور رائے فیروز پر حملہ آور ہو کر اسے قتل کر دیا۔ یہ حالات سُن کر مبارک شاہ دہلی سے فوج لے کر نکلا اور ملک سردار الملک کو بطور مقدمۃ الجیش آگے روانہ کیا۔ سامانہ تک پہنچا تھا کہ بادشاہ کی آمد کا حال سُن کر جسرت گکھڑ پنجاب کے میدانوں کو چھوڑ کر پہاڑوں میں جا چھپا اور امیر شیخ علی بھی ملتان سے کابل کو چل دیا۔ فولاد خاں بھی سرہند میں آکر از قلعہ بند ہو کر مضبوط ہو بیٹھا۔ یہ سُن کر مبارک شاہ نے سردار الملک اسلام خاں اور زیرک خاں کو سرہند کے محاصرے پر مامور کیا اور لاہور کی حکومت نصرت خاں گرگ انداز کو سپرد کر کے دہلی کی جانب آیا۔ بماہ ذالحجہ ۸۲۵ھ میں جسرت نے پھر لاہور پر حملہ کر کے نصرت خاں گرگ انداز کو لاہور سے بھگا دیا۔ سلطان نے الہ داد خاں لودھی کو لاہور کی حکومت پر مامور کر کے بھیجا۔ الہ داد خاں لودھی نے جسرت کو بھگا کر لاہور پر قبضہ کیا ۸۲۶ھ میں امیر شیخ علی نے فولاد خاں کو محاصرہ سے آزاد کرانے کے لئے کابل سے ہندوستان کی طرف کوچ کیا جسرت بھی معہ فوج اس سے آملا۔ لاہور میں الہ داد خاں لودھی

اس متحدہ لشکر کے مقابلے کی تاب نہ لا سکا۔ شیخ علی نے لاہور پر قابض ہونے کے بعد دیپالپور کو فتح کیا۔ مبارک شاہ نے دہلی سے کوچ کر کے تلونڈی میں پہنچ کر اسلام خاں لودی اور عماد الملک کو سرہند سے اپنے پاس بلایا باقی امیروں کو جو سرہند کے محاصرے میں مصروف تھے اسی طرح مصروف رہنے کا حکم دیا۔ عماد الملک اور اسلام خاں کے شاہی لشکر میں پہنچنے اور شاہی لشکر کے آگے بڑھنے کا حال سُن کر شیخ علی کابل کو چل دیا اسی عرصہ میں ملک سکندر تحفہ جو جسرت گکھڑ کی قید میں تھا کسی طرح قید سے نکل کر سلطان کے پاس بھاگ آیا سلطان اس کے آنے سے خوش ہوا اور شمس الملک کا خطاب دے کر لاہور و جالندھر و دیپالپور کی حکومت پر اس کو مامور کیا اور خود ملتان جا کر وہاں سے شیخ علی مغل کے گماشتوں کو خارج کر کے دہلی کو واپس ہوا۔ اس واپسی میں شمس الملک سکندر تحفہ کو تبدیل کر کے اُس کی جگہ عماد الملک کو لاہور و جالندھر و دیپالپور کی حکومت پر مامور کیا۔ اور دہلی آ کر ملک سردار الملک کی وزارت میں ملک کمال الدین کو بھی شریک کر دیا۔ اس سے پہلے سردار الملک نو مسلم تنہا وزیر اعظم تھا اور اس کی ماتحتی میں سدھارن ابن گنگو کھتری محکمۂ مال و نظارت کا افسر اور نائب وزیر ہونے کی حیثیت سے اعلیٰ درجہ کے ملوک و امراء میں شمار ہوتا تھا۔ ملک کمال الدین کمال الملک نے وزارت کے عہدے پر فائز ہوتے ہی محکمۂ مال و نظارت کی بے عنوانیوں کو رفع کیا اور اس محکمہ کے ہندو اہل کاروں کی دست درازیوں کو روک کر سدھارن وغیرہ کو بے دست و پا بنا دیا۔ کمال الملک کی قابلیت نے شاہی کارخانوں میں رونق و انتظام پیدا کر کے سردار الملک کی قبولیت کو بھی نقصان پہنچایا۔ سلطان مبارک شاہ نے سردار الملک کی ناقابلیت کا اندازہ کرنے کے بعد بھی کمال کو اس کا شریک وزارت کیا تھا۔

مبارک شاہ نے دہلی آ کر ربیع الاول ۸۳۲ھ میں دریائے جمنا کے کنارے ایک شہر کی بنیاد رکھی جس کا نام مبارک آباد تجویز ہوا۔ اسی عرصہ میں خبر پہنچی کہ فولاد خاں غلام ترک بچہ جو عرصہ سے سرہند پر متصرف تھا اور کسی طرح قابو میں نہیں آتا تھا۔ مارا گیا۔ سلطان اس خبر اور فولاد خاں کے سکٹے ہوئے سر کے آنے سے بہت خوش ہوا۔ فوراً سرہند جا کر وہاں کے زمینداروں کی دلجوئی اور اسلام خاں کو سرہند کی حکومت پر پھر مامور کر کے دہلی واپس آیا اور مبارک آباد کی تعمیر کے اہتمام میں مصروف ہوا۔

تبصرہ اس طویل اور بے مزہ داستان کے سُنا دینے کے بعد یہ بتا دینا ضروری ہے کہ خضر خاں اور مبارک شاہ کی سلطنت میں کوئی خصوصی اسلامی رنگ باقی نہ رہا تھا۔ ہندو، مسلمان، غلام اور اصیل میں کوئی امتیاز و فرق نہ تھا۔ کٹھر کے ہندوا ٹاوہ اور گوالیار کی طرف کے راٹھور راجپوت، میوات کے میواتی۔۔ پنجاب کے گکھڑ، فولاد خاں غلام وہ لوگ تھے جنھوں نے بدامنی کے پھیلانے اور بادشاہ کو ہمیشہ پریشان و مصروف رکھنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ بیرونی حملہ آوروں میں ابراہیم شاہ شرقی اور امیر کابل شیخ علی مغل خاص طور پر قابل تذکرہ ہیں، لیکن ان دونوں حملہ آوروں کی حملہ آوری کا سبب یہی میواتی اور گکھڑ ہی تھے۔ گذشتہ صفحات میں اس بات کا ناقابل تردید ثبوت موجود ہے کہ مسلمانوں کی طرف سے ہندو مسلم تفریق کا کسی کو بھول کر بھی خیال نہیں آیا۔ سرکشی اور بغاوت بار بار ہندوؤں کی طرف سے ہوئی اور مسلمان بادشاہ نے بار بار مغلوب کرنے کے بعد پھر اُن کی جاگیروں پر انھیں قائم رکھا اور ہر خطا کے بعد جب اُنھوں نے معافی چاہی فوراً معافی دی گئی۔۔ صرف یہی نہیں کہ سلطان دہلی ہی مذہبی اعتبار سے بے تعصب واقع ہوا تھا۔ بلکہ اس کے مسلمان سرداروں میں سے جن پر اس کی ساری قوت و شوکت کا انحصار تھا، کسی ایک نے بھی کبھی سلطان کو اس طرف توجہ نہیں دلائی اور شکایت نہیں کی کہ ہندو ہی بار بار بغاوت و بدامنی پھیلاتے اور ذرا سا سہارا پاکر فوراً سرکشی پر آمادہ ہو جاتے ہیں ان سب کو ریاستوں اور جاگیروں سے معزول و محروم کرکے اُن کی جگہ مسلمانوں کو کیوں منصوب و متعین نہیں کر دیا جاتا۔ میوات کے میواتی محض اسی وجہ سے طاقتور ہو گئے تھے کہ اُن کے ساتھ بار بار رعایت و درگذر کا معاملہ کیا گیا۔ یہی حال کٹھر اور اٹاوہ و گوالیار کے راجپوتوں کا تھا۔ پنجاب کے گکڑوں کو کشمیر کی سلطنت اسلامیہ سے مدد ملتی رہی تھی۔ اور وہ کشمیر ہی کے پہاڑوں میں ہر مرتبہ پناہ گزیں ہوتے تھے۔ جموں کا راجہ سلطان دہلی کا طرف دار و حامی تھا وہ جسرت کے ہاتھ سے مارا گیا۔ بہر حال اس بات کے تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ جب تک مسلمانوں کی شہنشاہی خوب طاقتور رہی اس وقت بھی مسلمانوں نے ہندوؤں کو ہندو ہونے کی وجہ سے اپنا دشمن اور کشتنی و گردن زدنی نہیں سمجھا اور جب ان کی شہنشاہی طائف الملوکی میں تبدیل

ہوگئی تب بھی انھوں نے ہندوؤں کو ہندو ہونے کے سبب غیر اور قابل نفرت قرار نہیں دیا۔ جس ہندو نے اپنے آپ کو طاقتور بنانے اور اپنی قابلیت بڑھانے کی کوشش کی اس کے راستے میں اس کا ہندو ہونا ہرگز ہارج و مانع اور حائل نہیں ہوا۔ کسی ہندو کا کوئی حق اس لئے ہرگز نہیں چھینا گیا کہ وہ ہندو ہے۔ جن اسباب کی بنا پر کسی مسلمان نے کسی ہندو کی مخالفت کی انھیں اسباب کی بنا پر اُس نے ایک مسلمان کی بھی مخالفت کی۔ ہندوستان میں کوئی قوم آج کل کی اصطلاح کے موافق "کالی قوم" نہیں سمجھی جاتی تھی۔ مسلمانوں کی یہی وطن پسندی و سیر چشمی اور مسلمانوں کے اخلاق کی یہی خوبی تھی جس نے ہندوؤں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا۔ بہادر ناہر میواتی کا اصل ہندوانی نام سمیر پال یا سانبر پال تھا جو غالباً میوات کے حاکم کوکا چوہان کے متوسلین میں سے تھا۔ جس زمانے میں شہر حصار فیروزہ کی تعمیر کا کام شروع ہوا ایک روز سلطان فیروز شاہ تغلق جنگل میں شیر کے شکار کو گیا جو لوگ اس شکار میں سلطان کے ہمراہ تھے ان میں سانبر پال بھی شامل تھا سلطان نے شیر کو تیر کا نشانہ بنایا اتفاقاً زخم کاری نہ لگا۔ شیر سلطان کی طرف جھپٹا اسی حالت میں سانبر پال نے شیر کے تیر مارا اور وہ سلطان تک پہنچنے سے پہلے زمین پر گر پڑا۔ سلطان نے اس چابکدستی اور قادر اندازی سے خوش ہوکر سانبر پال کو بہادر ناہر کا خطاب دے کر میوات میں ایک جاگیر عطا کی جو موجودہ ضلع گوڑگانوہ کی تحصیل نوح میں تھی۔ بہادر ناہر نے اس جاگیر میں پہاڑ کی چوٹی پر ایک قلعہ بنایا جو کوٹلہ بہادر ناہر کے نام سے مشہور ہوا۔ اس قلعے کے نشانات اب تک موضع کوٹلہ میں موجود ہیں۔ بہادر ناہر نے یہ جاگیر اور خطاب پانے کے کچھ دنوں بعد خود ہی اسلام قبول کیا اور فیروز تغلق کی وفات کے بعد سلطنت دہلی کے ضعف سے فائدہ اٹھا کر میوات کے اکثر حصہ پر قابض و متصرف ہوگیا۔ بہادر ناہر اور اس کی اولاد مسلمان ہوگئی تھی لیکن اس کی قوم بدستور ہندو اور بہادر ناہر کی مدد و معاون تھی۔ بہادر ناہر کی قوم یعنی میواتی لوگ ایسے زمانے میں جب کہ وہ خوب طاقتور اور ملک میں طائف الملوکی برپا ہونے کے سبب سلطان دہلی کی طرف سے بے خوف تھے شیخ موسیٰ رحمۃ اللہ علیہ کی پند و تلقین سے خضر خان اور مبارک شاہ کے عہد حکومت میں مسلمان ہوگئے۔ ان کو مسلمان ہونے کے بعد کسی دنیوی فائدے کی توقع نہ تھی بلکہ مسلمان ہونے کے بعد ان پر بار بار سلطان دہلی کی طرف سے چڑھائیاں ہوئیں۔

شیخ موسیٰ رحمہ کا مزار مقام پلہ تحصیل نوح ضلع گوڑ گانوہ میں موجود ہے۔ خضر خاں اور مبارک شاہ کے عہد حکومت کی ایک خصوصیت یہ بھی قابل توجہ ہے کہ ہندؤں کو بجائے رائے یا راجہ کے ملک کے خطاب سے بھی مخاطب کیا جانے لگا تھا۔ ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اطراف ملک میں جس طرح مسلمانوں کی مانند ہندو صاحب خدم وحشم اور برسر حکومت تھے اسی طرح خاص دارالسلطنت اور دربار سلطنت میں بھی ہندؤں کا اقتدار حد سے زیادہ ترقی کر گیا تھا۔ شہر دہلی میں سدھارن کھتری نائب وزیر کے علاوہ کنجا کھتری کا خاندان سب سے زیادہ معزز اور صاحب اقتدار سمجھا جاتا تھا کنجا کھتری ملتان سے خضر خاں کے ہمراہ آیا تھا اس کا پوتا سدھ پال خاندان شاہی کا قدیمی پروردہ ومتوسل ہونے کی حیثیت سے سلطان ملوک وامرا پر فوقیت رکھتا اور جلوت وخلوت میں ہر جگہ بلا روک ٹوک بادشاہ کے پاس پہنچ سکتا تھا۔ اسی طرح ملک کرم چند کنبی دہلی میں رہتا اور اول درجہ کے ملوک وامرا میں شمار ہوتا تھا۔

سلطان مبارک شاہ کی شہادت

فولاد خاں کے مارے جانے کے بعد مبارک شاہ کی پریشانیوں کا یک سر خاتمہ ہو چکا تھا۔ عماد الملک محمود حسن کو لاہور و جالندھر وغیرہ کی حکومت پر مامور کرکے جسرت گکھڑ کی طرف سے بھی اطمینان حاصل ہو گیا تھا مبارک شاہ نے سرہند سے دہلی واپس آکر سُنا کہ سلطان ہوشنگ شاہ مالوی اور سلطان ابراہیم شاہ شرقی کالپی میں ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما ہیں یہ سن کر جونپور کی طرف حملہ آوری کے قصد سے فوجوں کی فراہمی کا حکم دے کر زیر تعمیر شہر مبارک آباد کے میدان میں چند روز کے لئے خیمہ شاہی نصب کرایا کہ یہاں تمام فوجیں آکر جمع ہو جائیں ابھی اطراف ملک سے فوجیں نہ آنے پائی تھیں کہ سلطان مبارک شاہ کا پیمانہ عمر لبریز ہو گیا جس کی تفصیل یہ ہے کہ سدھپال کھتری، سدھارن کھتری اور رانوں سنگھ وغیرہ ہندؤں نے سرور الملک نومسلم کو جو اپنی سرد بازاری و بے توقیری سے کبیدہ خاطر تھا شریک مشورہ کرکے بادشاہ کے قتل کی تیاری کی۔ ۹ ماہ رجب ۸۳۷ھ بروز جمعہ جب کہ مبارک شاہ نماز جمعہ کے لئے جانے لگا تو سدھارن و سدھپال وغیرہ سردار جو پہلے سے مستعد ہو کر موقع کی تاک میں تھے ہندؤں کی ایک جمعیت لے کر بادشاہ پر ٹوٹ پڑے سب سے پہلے سدھپال کھتری نے جو اس خاندان کا قدیمی نمک پروردہ تھا بادشاہ کے سر پر تلوار ماری اس کے بعد دوسرے ہندؤں نے پیہم تلوار کے وار

کئے اور مبارک شاہ کو شہید کر دیا خلجی خاندان کا پادشاہ قطب الدین مبارک شاہ بھی ایک ہندو کے ہاتھ سے قتل ہوا تھا۔ عجیب اتفاق ہے کہ دہلی کے تخت پر دو مبارک شاہ بیٹھے اور دونوں ہندوؤں کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔

محمد شاہ بن فرید خاں بن خضر خاں

مبارک شاہ کو قتل کر کے ہندوؤں کی یہ جماعت سردار الملک نو مسلم وزیر کے پاس خوش خبری لے کر پہنچی۔ سردار الملک نے پہلے ہی سے مبارک شاہ کے بھتیجے محمد خاں ابن فرید خاں ابن خضر خاں کو جسے مبارک شاہ نے اپنا بیٹا اور ولی عہد بنایا تھا اپنے قبضہ میں لے رکھا تھا۔ پادشاہ دہلی سے باہر زیر تعمیر شہر مبارک آباد میں شہید ہوا۔ وہیں کمال الملک بھی تھا۔ سردار الملک دہلی میں ہر قسم کا سامان کئے ہوئے تھا اس نے بلا تامل محمد خاں کو بادشاہ کے لقب سے تخت نشین کر کے خود خان جہاں کا خطاب اور وزارت عظمےٰ کا عہدہ پایا سدھارن اور سدھپال وغیرہ ہندوؤں اور دوسرے افسروں مثلاً سید سالم کے بیٹوں نے بھی بیعت کر کے خطابات اور جاگیریں حاصل کیں۔ کمال الملک نے بھی لمصلحت سمجھ کر نئے بادشاہ کی بیعت کی سدھپال، سدھارن اور ان کے رشتہ داروں کو بیانہ، امروہہ، نارنول، سامانہ، اور میان دواب کے اور بہت سے پرگنات جاگیر میں عطا ہوئے۔ جن سرداروں نے سلطان مبارک شاہ کے قاتلوں سے قصاص لینے کا مطالبہ کیا وہ سب گرفتار ہو ہو کر قتل اور بعض قید کئے گئے۔ پرگنات میں جابجا ہندو فوجیں پھیل گئیں اور جس طرح خسرو خاں نمک حرام کے زمانے میں یک لخت ہندوؤں کا قبضہ و تسلط ہو گیا تھا۔ اسی طرح محمد شاہ کی تخت نشینی کے بعد سردار الملک کی وزارت میں سلطنت دہلی کا رنگ ڈھنگ تبدیل ہو گیا۔ ان حالات سے واقف ہو کر ملک الداد لودھی حاکم سنبھل نیز برن اور بدایوں کے عاملوں نے علم بغاوت بلند کیا۔ سردار الملک نے کمال الملک کو جو اب اس کا ماتحت و محکوم تھا۔ دہلی سے باہر بھیجنے کی یہ ترکیب نکالی کہ اپنے بیٹے یوسف خان اور سدھارن کھتری اور کمال الملک کو ان باغیوں کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا۔ کمال الملک نے اس مہم پر اپنے جانے کو بہت ہی غنیمت سمجھا۔ یہ لشکر جب برن کے قریب پہنچا تو کمال الملک نے ارادہ کیا کہ سدھارن کھتری اور یوسف

خاں ابن سردار الملک دونوں کو قتل کرکے اپنے ولی نعمت مبارک شاہ کے خون کا انتقام لے۔ ان دونوں کو قبل از وقت اس ارادے کا حال معلوم ہوگیا اور وہ اپنی جان بچا کر دہلی کی جانب بھاگ آئے۔ الہ داد خاں لودھی اور بدایوں و برن کے عاملوں کو جب کمال الملک کے ارادے کا حال معلوم ہوا تو وہ بلا تکلف اپنی اپنی فوج لے کر کمال الملک کے پاس چلے آئے اور یہ متحدہ لشکر دہلی کی طرف متوجہ ہوا۔ سردار الملک، سدھارن، سدھپال وغیرہ محصور ہوکر مدافعت پر آمادہ ہوئے۔ رمضان ٨٣٧ھ میں مذکورہ امرا نے دہلی کا محاصرہ کیا۔ کئی مہینے تک محاصرہ اور اندرونی و بیرونی فوجوں کا مقابلہ جاری رہا۔ سلطان محمد شاہ کھتریوں اور سردار الملک کے ہاتھ میں شاہ شطرنج کی طرح مجبور تھا مگر دل سے کمال الملک وغیرہ امرا کی کامیابی کا خواہاں تھا۔ سردار الملک جو خود پادشاہ بننا چاہتا تھا پادشاہ کی نیت بدلی ہوئی دیکھکر اس کو قتل کرنے کے ارادے سے چند آدمیوں کے ساتھ سراپردۂ شاہی میں داخل ہوا۔ ادھر محمد شاہ پہلے ہی اس کے اس فاسد ارادے سے خبردار ہوکر اپنی حفاظت کے لئے خدام خاص کی ایک جمعیت کو کمیں گاہ میں بٹھا چکا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ٨ محرم ٨٣٨ھ کو سردار الملک سراپردۂ شاہی میں معہ ہمراہیوں کے قتل ہوا اور محمد شاہ نے فوراً اپنے آدمیوں کے ذریعہ شہر پناہ کا ایک خاص دروازہ کھلواکر کمال الملک کی فوج کو شہر کے اندر داخل ہونے کا موقعہ دیا۔ سدھپال اور سدھارن نے اپنی اپنی حویلیوں کو بطور قلعہ استعمال کرکے مقابلہ جاری رکھا آخر سدھپال تو لڑائی میں مارا گیا اور سدھارن گرفتار ہوکر مقتول ہوا اس کے بعد محمد شاہ نے دوبارہ مراسم تخت نشینی ادا کئے۔ کمال الملک کو کمال خاں کا خطاب دے کر وزیر اعظم بنایا۔ دوسرے امرا کو بھی خلعت و خطابات ملے۔ لیکن الہ داد خاں لودھی نے خود کسی خطاب کے لینے سے انکار کرکے اپنے بھائی کو دریا خاں کا خطاب دلوایا۔ وفادار امرا میں ملک جیمن کو غازی ملک اور ملک کھون راج عامل حصار کو اقبال خاں کا خطاب ملا (دیکھو اب کبھی ہندوں سے ان کے ہندو ہونے کے سبب مسلمانوں کو کوئی نفرت نہیں ہے ہندوں کو اسلامی خطاب مل رہے ہیں اور وہ فخریہ قبول کررہے ہیں) اس کے بعد اسلام خاں لودھی بھی سرہند سے دہلی آکر مورد الطاف شاہانہ ہوا حسام خاں کو شہر دہلی کا کوتوال بنایا گیا۔ عماد الملک کو ملتان کی حکومت پر بھیج کر اسلام لودھی کو سرہند

کی حکومت کے ساتھ دیپالپور و لاہور کی حکومت بھی عطا کی گئی اس کے چند روز بعد اسلام خاں لودھی کا سنہ [illegible]ھ میں انتقال ہوا۔ اسلام خاں مرتے وقت اپنے بھتیجے بہلول خاں کو جو اس کا داماد بھی تھا اپنا قائم مقام تجویز کر گیا۔

بہلول خاں لودھی کا عروج

ملک بہلول ابن ملک کالا ابن بہرام خاں لودھی اسلام خاں کی فوج کے اکثر پٹھان سرداروں کی تائید و حمایت سے چچا کا قائم مقام اور سرہند کا حاکم بن گیا۔ اسلام خاں کا بیٹا قطب خاں اور دوسرے رشتہ دار مجبور و مایوس ہو کر سلطان محمد شاہ کے پاس دہلی آئے اور اس بات کی شکایت کی کہ بہلول خاں بادشاہ کی منظوری کے بغیر اسلام خاں کے مال و دولت اور سرہند کی حکومت پر قابض ہو گیا ہے۔ حالانکہ یہ حق ہمارا ہے۔ اس وقت کمال الملک کمال خاں وزیر اعظم بھی فوت ہو چکا تھا اور اس کی جگہ بادشاہ نے حسام خاں کو توال کو وزیر اعظم بنا لیا تھا۔ اسلام خاں لودھی کے بیٹوں اور رشتہ داروں کی شکایت سن کر بادشاہ نے اپنے وزیر حسام خاں کو معہ قطب خاں فوج عظیم دے کر بہلول خاں کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا۔ اس لشکر عظیم کے مقابلہ کی تاب نہ لا کر۔ بہلول خاں سرہند سے دامن کوہ کی طرف فرار ہوا اور شاہی لشکر جنگلوں، میدانوں اور پہاڑوں میں اس کے متعاقب سرگرداں پھرتا رہا محمد شاہ سے ایک یہ حماقت ہوئی۔ کہ اس نے جسرت گکھڑ کے پاس جو پرانا باغی اور خاندان شاہی کا قدیمی دشمن تھا پیغام بھیجا کہ تم پہاڑوں کی طرف سے بہلول کا تعاقب کر کے جس طرح ممکن ہو اسے گرفتار کرا دو۔ جسرت اس پیغام سے بہت خوش ہوا اور گکھڑوں کی جمعیت لے کر شاہی لشکر کی امداد کو آ پہنچا کئی جگہ سخت سخت لڑائیاں ہوئیں۔ آخر بہلول خاں مجبور ہو کر معدودے چند آدمیوں کے ساتھ پہاڑوں کے ناقابل گذر دروں میں جا چھپا باقی تمام ہمراہی مارے گئے۔ بظاہر بہلول خاں کی طاقت کا خاتمہ کر کے حسام خاں اور قطب خاں دہلی واپس آئے اور اس کارگذاری کے صلہ میں جسرت کی حکومت کو پنجاب کے ایک بڑے حصے میں دربار دہلی نے باقاعدہ طور پر تسلیم کر لیا سرہند کی حکومت ملک سکندر تحفہ کو جو پہلے جسرت کی قید میں رہ چکا تھا عطا ہوئی۔ قطب خاں ابن اسلام خاں یہ دیکھ کر بہت بددل ہوا کہ اپنے خاندان کے بہت سے

آدمی بھی مارے گئے اور سرہند کی حکومت بھی ایک غیر شخص کو مل گئی ہیں تو کچھ بھی نہ ملا۔ حسام خاں وزیر کو لودھیوں بالخصوص اسلام خاں کے خاندان سے کوئی ہمدردی نہ تھی اور وہی سلطنت کے سیاہ وسپید کا مالک تھا۔ قطب خاں اور اس کے ہمراہی اس نامرادی اور مایوسی کے عالم میں دہلی کے اندر پڑے تھے کہ اُن کے پاس یہ خبر پہنچی کہ بہلول خاں نے پہاڑوں سے نکل کر اپنے گرد پٹھانوں کی ایک معقول جمعیت فراہم کر لی ہے اور جابجا چھاپے مارتا اور لوٹ مار کرتا ہوا پھر رہا ہے۔ بہلول لودھی نے اپنی اس ڈاکہ زنی میں شروع سے یہ طریقہ اختیار کیا کہ جو کچھ ہاتھ لگتا سب بہ حصئہ مساوی ہمراہیوں کو تقسیم کر دیتا خود اپنی ضرورت سے زیادہ کچھ نہ لیتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت جلد یہ مختصر گروہ ایک فوج عظیم کی شکل میں تبدیل ہو گیا اور ہر طرف سے مفلوک الحال لوگ آ آ کر شریک ہونے لگے قطب خاں وغیرہ دہلی میں یہ خبریں سُن کر دہلی سے چل دیئے اور بہلول خاں کے پاس پہنچ کر اپنی خطاؤں کی معافی چاہی اور اس کو بخوشی اپنا سردار تسلیم کر کے جاں فشانی پر آمادگی ظاہر کی غرض کچھ زیادہ دن نہیں گذرے کہ بہلول خاں شاہی اہل کاروں کو بھگا کر سرہند پر قابض و متصرف ہو گیا اس کے بعد دیپالپور اور لاہور کا علاقہ بھی اپنی حکومت میں شامل کر لیا بہلول لودھی کی اس ترقی پذیر اور روز افزوں طاقت کو دیکھکر دربار دہلی میں کھلبلی مچ گئی یہاں سے حسام خاں وزیر الممالک ایک زبردست لشکر فراہم کر کے بہلول خاں کے استیصال کو روانہ ہوا اُدھر سے بہلول خاں بھی مقابلہ پر آیا۔ پانی پت کے قریب سخت لڑائی ہوئی حسام خاں شکست فاش کھا کر فرار ہوا اور دہلی آ کر دم لیا۔ بہلول خاں نے پانی پت تک کا تمام علاقہ معہ پانی پت اپنی حکومت میں شامل کر کے سلطان محمد شاہ کو لکھا کہ میں آپ کی فرماں برداری واطاعت سے باہر نہیں ہوں مجھ کو صرف حسام خاں سے شکایت ہے اگر آپ حسام خاں کو قتل کر کے حمید خاں ابن فتح خاں نائب وزیر کو وزیر اعظم بنا دیں تو میں دست بوسی کے لئے دہلی حاضر ہو سکتا ہوں۔ محمد شاہ نے بلا توقف حسام خاں کو قتل کرا کر حمید خاں نائب وزیر کو وزیر اعظم اور ایک دوسرے شخص کو حسام خاں کا خطاب دے کر نائب وزیر بنایا۔ پادشاہ کی اس حرکت سے لوگوں کو بادشاہ کی بزدلی اور پست ہمتی کا یقین ہوا۔ بہلول خاں پانی پت سے دہلی آ کر بادشاہ کی خدمت میں

حاضر ہوا۔ بادشاہ نے پانی پت۔ لاہور۔ سرہند۔ دیپا پور کی سند حکومت بہلول خاں کو عطا کی۔ سند حکومت لے کر اور سرہند واپس ہو کر بہلول خاں خود مختارانہ حکومت کرنے لگا یہ رنگ دیکھ کر کتھر و برن و بدایوں و اٹاوہ و گوالیار وغیرہ کے حاکموں نے باج و خراج کی ادائگی میں تامل کیا اور سب اپنی اپنی خود مختاری و مطلق العنانی کی کوشش و تیاری میں مصروف ہو گئے۔ سلطنت دہلی کے اس ضعف و اختلال کی شہرت سن کر ۸۴۴ھ میں مالوہ کے پادشاہ سلطان محمود خلجی نے دہلی پر قبضہ کرنے کے ارادے سے فوج کشی کی اور دہلی کے قریب پہنچ کر خیمہ زن ہوا۔ سلطان محمد شاہ نے پریشان ہو کر بہلول لودھی کے پاس ایلچی بھیجے اور بڑے اصرار و اضطرار کے ساتھ اسے مدد کے لئے بلایا۔ بہلول لودھی بلاتوقف بیس ہزار جرار سوار لے کر دہلی پہنچا۔ بہلول لودھی کے دہلی پہنچنے پر سلطان اور باشندگان دہلی کی جان میں جان آئی۔ بہلول لودھی فوج لے کر محمود خلجی کے مقابلہ پر گیا اور صبح سے شام تک ایسے ایسے رستمانہ حملے کئے کہ محمود خلجی کا حوصلہ پست ہو گیا۔ شام ہونے پر لڑائی ملتوی رہی۔ رات ہی میں محمود خلجی مالوے کی جانب واپس ہونے کا قصد کر چکا تھا کہ محمد شاہ نے یہ حماقت کی کہ بہلول لودھی اور دوسرے امرائے مشورہ لئے بغیر اپنے ایلچی محمود خلجی کے پاس بھیج کر صلح کی درخواست کی۔ اس نے اس درخواست کو تائید غیبی سمجھ کر فوراً منظور کر لیا اور اسی وقت اپنے لشکر کو واپسی کا حکم دیا۔ صبح کو جب بہلول لودھی نے سلطان محمد شاہ کے پیغام صلح کا حال سنا تو بہت پیچ و تاب کھایا اور اپنی فوج لے کر محمود خلجی کے تعاقب میں روانہ ہوا لشکر مالوہ کی ایک بڑی تعداد کو قتل و اسیر کر کے اور بہت سا مال و اسباب چھین کر واپس ہوا۔ سلطان محمد شاہ بہلول لودھی سے بہت خوش ہوا کہ اس نے اس طرح تعاقب کر کے لشکر دہلی کی لاج رکھ لی۔ چنانچہ سلطان محمد شاہ نے بہلول لودھی کو اپنا بیٹا بنایا اور خان خاناں کا خطاب عطا کیا۔ سلطان محمد شاہ کی اس نامعقول حرکت سے کہ اس نے سلطان محمود مالوی کے پاس درخواست صلح بھیجی امرا کے دل سے اس کی ہیبت قطعاً جاتی رہی۔ بہلول لودھی نے دہلی کی اس مہم سے فارغ ہو کر "فرزند سلطان اور خان خاناں بن کر" لاہور کی طرف کوچ کیا۔ لاہور آ کر وہ جسرت کی بیخ کنی پر آمادہ ہوا۔ جسرت پرانا گرگ باراں دیدہ اور تجربہ کار شخص تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ بہلول خاں سے دوسروں کی طرح پیچھا چھڑانا اور عہدہ برآ ہونا آسان نہیں ہے۔ اس نے

فوراً منت سماجت اور خوشامد درآمد کا طریقہ اختیار کرکے صلح و صفائی اور دوستی کے لئے ہاتھ بڑھا کر بہلول خاں کو یہ بھی سبق پڑھایا کہ دہلی کی سلطنت لودھیوں کی پرانی میراث ہے آپ دہلی کی سلطنت حاصل کرنے کی کوشش کریں اور مجھ کو اس کوشش میں اپنا ممد و معاون تصور فرماتے رہیں بہرحال حسرت نے بہلول خاں سے دب کر صلح کر لی۔ بہلول خاں اس کی طرف سے مطمئن ہوکر کئی سال تک اپنے مقبوضہ ملک کے استحکام و انتظام اور لشکر کی ترتیب و تربیت میں مصروف اور اپنے مقبوضہ علاقہ کو ہر طرف جہاں موقع ملا وسعت دیتا رہا۔ اس عرصہ میں اس کی قدردانی کی شہرت سن کر بہت سے پٹھان اور مغل اور ہندوستان کی دوسری سپاہی پیشہ قوموں کے لوگ آآکر اس کی فوج میں بھرتی ہوتے رہے۔ اور چار پانچ سال کے عرصہ میں بہلول خاں نے اپنی وسیع ریاست کو باآئین سلطنت کی شکل میں تبدیل کر لیا۔ ۸۴۴ھ میں بیانہ کے زمینداروں نے سلطنت دہلی سے برگشتہ ہوکر اپنے آپ کو مالوہ کے بادشاہ محمود خلجی کی حکومت میں شامل کر لیا۔ اسی سال سلطان محمد شاہ کا دہلی میں انتقال ہوا اور اس کی جگہ امرائے دہلی نے اس کے بیٹے علاء الدین کو تخت سلطنت پر بٹھایا۔

سلطان علاء الدین

سلطان علاء الدین کی تخت نشینی پر تمام اُمرائے دہلی حاضر ہوکر بیعت اطاعت کی فرشتہ کی روایت کے موافق بہلول خاں لودھی بیعت کے لئے دہلی نہیں آیا۔ لیکن ملا عبدالقادر بدایونی کی روایت کے موافق بہلول لودھی نے بھی دہلی آکر سلطان علاء الدین سے بیعت کی اور بہلول لودھی کی کوشش سے دوسرے اُمرائے بھی علاء الدین کو سلطان تسلیم کیا۔ علاء الدین نے تخت نشین ہونے کے بعد ۸۵۰ھ میں فوج لے کر بیانہ کی طرف کوچ کیا تاکہ وہاں جاکر سرکشوں کو سزا دے اور اس علاقے کو پھر سلطنت دہلی میں شامل کرے لیکن راستے ہی میں تھا کہ کسی نے یہ جھوٹی خبر اڑادی کہ جون پور کا بادشاہ دہلی پر حملہ آور ہونے کے لئے آرہا ہے اس خبر کو سن کر علاء الدین وہیں سے دہلی کو واپس ہوا اُمرائے کہا کہ یہ افواہ ابھی تحقیق طلب ہے جب تک تصدیق نہ ہو جائے فسخ عزیمت کرنا

مناسب نہیں ہے لیکن سلطان علاء الدین نے کسی کی بات نہ مانی اور دہلی آکر دم لیا۔ ۸۵۱ھ میں سلطان بدایوں گیا اور وہاں چند روز قیام کرنے کے بعد دہلی آیا تو اُمراء سے کہا کہ مجھ کو تو بدایوں کی آب و ہوا بہت پسند ہے دہلی میں رہنے کو میرا جی نہیں چاہتا جب اُمرا نے ایسی باتوں کے زبان پر لانے کو نا مناسب بتایا تو سلطان اُن سے ناخوش ہوا۔ آخر ۸۵۲ھ میں حسام خان نائب وزیر کو دہلی میں اپنا قائم مقام اور نائب السلطنت بنا کر اپنی بیوی اور اس کے دونوں بھائیوں کو بھی دہلی ہی میں چھوڑ کر حمید خاں وزیر کو ہمراہ لے کر سلطان نے بدایوں کی طرف کوچ کیا۔ بدایوں پہنچ کر وہیں طرح اقامت ڈالی۔

کمپل و پٹیالی کا حاکم رائے پرتاب حمید خاں کے باپ فتح خاں ابن ظفر خاں ابن وجیہہ الملک (سہارن)، کا ستایا ہوا تھا جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ رائے پرتاب نے سلطان علاء الدین کی حماقت سے فائدہ اُٹھانے اور حمید خاں ابن فتح خاں سے انتقام لینے کا مناسب موقع پایا اور سلطان کی خدمت میں بدایوں حاضر ہو کر اور دو اور مسلمان سرداروں کو بھی جو حمید خاں سے ناخوش تھے اپنا موید بنا کر عرض کیا کہ آپ کے وزیر حمید خاں سے عام طور پر سب ناخوش ہیں اور ہم کو بھی اُسی سے اپنی جان کا خطرہ ہے اگر آپ حمید خاں کو قتل کر دیں تو ہم اس بات کا ذمہ لیتے ہیں کہ چالیس پرگنے تمام امراء و جاگیرداروں سے بحصہ رسدی لے کر سلطانی مقبوضات میں شامل کر دیں گے۔ سلطان کی حماقت دیکھئے کہ اُس نے رائے پرتاب کے حسب منشا حکم دے دیا کہ حمید خاں کو گرفتار کر کے قتل کر دیا جائے چنانچہ حمید خاں جو بے فکر و مطمئن بدایوں میں موجود تھا گرفتار ہو کر محمد جمال نامی کوتوال بدایوں کی قید اور نگرانی میں سپرد ہوا۔ ابھی وہ قتل ہونے نہ پایا تھا کہ اُس کے دوستوں اور ہوا خواہوں نے کوشش کر کے جس طرح ممکن ہوا اس کو قید سے نکال لیا۔ حمید خاں قید سے نکلتے ہی اپنے ہوا خواہوں کی ایک مختصر جماعت کے ساتھ دہلی کی جانب چل دیا۔

محمد جمال کوتوال کو حمید خاں کے فرار ہونے کا حال معلوم ہوا تو وہ اس کے تعاقب میں دہلی تک گیا اور دہلی میں حمید خاں کے مکان تک پہنچ کر تیر سے مارا گیا۔ حمید خاں نے دہلی پہنچ کر سلطان علاء الدین کے بیوی بچوں کو محل شاہی سے ہاتھ پکڑ پکڑ کر بے سر و سامانی کے عالم میں باہر نکال دیا اور تمام شاہی کارخانوں اور خزانوں کو قبضے میں لا کر خود مختارانہ حکومت کرنے لگا

سلطان علاء الدین کو اپنے اہل و عیال کی بے حرمتی اور دہلی کے قبضہ سے نکل جانے کا حال معلوم ہوا لیکن وہ حمید خاں کی سرکوبی کے لئے بدایوں سے نہ نکلا اور امروز فردا کرتے ہوئے سال بھر سے زیادہ عرصہ گذار دیا ان تمام حالات سے واقف ہو کر بہلول خاں لودھی نے سرہند سے سلطان علاء الدین کے پاس بدایوں پیغام بھیجا کہ میں حمید خاں سے گستاخی کا انتقام لینے اور اس کو دہلی سے خارج کرنے کے لئے دہلی کا قصد کر رہا ہوں، سلطان علاء الدین یہ سن کر بہت خوش ہوا اور بہلول خاں لودھی نے فوج لے کر دہلی کی جانب کوچ کیا۔ حمید خاں اپنی کمزوری اور بہلول لودھی کی طاقت و شوکت سے واقف تھا اُس نے بہلول خاں لودھی کو لکھا کہ آپ شوق سے دہلی تشریف لائیے اور تخت سلطنت پر جلوس فرمائیے۔ میں آپ کی خدمات وزارت انجام دوں گا۔ بہلول لودھی نے حمید خاں کے اس پیغام کو غنیمت سمجھا۔ اور بجائے حملہ آور حریف کے دوستانہ اور مہمانانہ دہلی میں داخل ہوا۔ حمید خاں پر بہلول لودھی نے ایک احسان بھی کیا تھا جس کا اوپر ذکر آچکا ہے کہ اسی کی فرمایش سے سلطان محمد شاہ نے حمید خاں کو وزیر اعظم بنایا تھا۔ حمید خاں نے بہلول خاں لودھی سے کہا کہ آپ تخت سلطنت پر جلوس فرمائیے۔ کیوں کہ سلطان علاء الدین تو بادشاہی کی کوئی قابلیت ہی نہیں رکھتا تھا نہ اُس کے خاندان میں کوئی دوسرا شخص اس قابل موجود ہے۔ بہلول خاں نے کہا کہ میں سپاہی آدمی ہوں بادشاہت آپ ہی کو مبارک ہو مجھے تو صرف سپہ سالاری کافی ہے۔ حمید خاں اپنی کمزوری سے واقف اور بہلول خاں لودھی کی طاقت سے خائف تھا لہٰذا تخت نشینی کے مراسم ادا کرنے میں متامل رہا۔ بہلول خاں لودھی نے چند روز تک اس معاملے کو التوا میں ڈالے رکھا اور ایک روز موقع پاکر بغیر کسی کشت و خون کے حمید خاں کو گرفتار کرکے معزز قیدیوں کی طرح نظر بند کیا اور اس کو اطمینان دلایا کہ تمھاری جان کو کوئی زیان نہ پہنچایا جائے گا۔ اس کے بعد سلطان علاء الدین کے نام کا سکہ و خطبہ بدستور جاری کرکے اپنے بیٹے نظام خاں کو سلطان علاء الدین کے مقرر کردہ نائب السلطنت حسام خاں کی مدد کے لئے دہلی میں چھوڑ کر خود ۸۵۵ھ میں سرہند کی طرف واپس گیا اور سلطان کے پاس بدایوں میں عریضہ بھیجا کہ میں آپ کا فرمانبردار و وفادار ہوں میں نے حمید خاں کو قید کرکے دہلی میں بدستور سابق آپ کی حکومت قائم کر دی ہے

اس خط کے جواب میں سلطان علاء الدین نے بہلول خاں لودھی کے پاس ایک تحریر بھیجی کہ سلطان محمد شاہ مرحوم نے تم کو اپنا بیٹا بنایا تھا لہذا میں تم کو اپنا بڑا بھائی سمجھتا ہوں میرے پاس اب چونکہ سلطنت کا سامان نہیں ہے لہذا میں صرف بدایوں کی حکومت پر قناعت کرتا اور دہلی کی سلطنت آپ کے لئے چھوڑتا ہوں آپ شوق سے دہلی آکر تخت سلطنت پر جلوس کیجئے اور مجھ کو بدایوں پر قابض رہنے دیجیے۔ بہلول خاں کے پاس سرہند میں سلطان علاء الدین کی یہ تحریر پہنچی تو اُس نے ۸۵۵ھ میں سرہند کے اندر اپنے نام کا سکہ وخطبہ جاری کیا۔ دہلی آکر تخت سلطنت پر جلوس کرنے اور مراسم تخت نشینی ادا کرنے سے پہلے ملتان و پنجاب و دیپالپور کی طرف سے ہر قسم کے خدشات کو مٹانا اور افغانستان سے پٹھانوں کو ہندوستان بلاکر سلطنت اسلامیہ کے استحکام کا سامان کرنا ضروری سمجھا۔ بہلول لودھی اس بات سے واقف تھا کہ ہندوستان میں طائف الملوکی نے سلطنت اسلامیہ کے نظام واستحکام کو بے حد دشوار بنا دیا اور مرکزِ سلطنت کے رعب و وقار نے غائب ہوکر ہر ایک سردار اور ہر ایک امیر میں اولوالعزمی پیدا کرکے پادشاہت حاصل کرنے کا شوق پیدا کر دیا ہے ایسی حالت میں جب تک زبردست قومی وقبائلی قوت فراہم کرکے حریصوں کو مایوس نہ کر دیا جائے گا سلطنت کا نظام اور اس کا قیام واستحکام دشوار ہے چنانچہ اُس نے اپنے اکثر سرداروں، بیٹوں اور اہل وعیال کو دہلی بھیج کر ملک افغانستان میں ایلچی بھیجے اور وہاں کی خوانین سے درخواست کی کہ پٹھانوں کی جمعیتوں کو لے کر بلا توقف ہندوستان چلے آؤ۔ مجھ کو دہلی کا تخت مل گیا ہے۔ ہندوستان ایک وسیع ملک ہے اس کے صوبوں کو فتح کرکے ہندوستان میں ایک مضبوط اسلامی سلطنت قائم کرنے کا بہترین موقع ہے۔ بادشاہت میرے نام پر رہے گی۔ اور میرے شاہانہ حقوق سب کو تسلیم کرنے پڑیں گے ملک تمام بھائیوں کو تقسیم کر دیا جائے گا۔ ہر ایک بھائی کو حکومت میں کافی حصہ ملے گا خوانین افغانستان اس پیغام کو سُن کر ہندوستان میں آنے شروع ہوئے۔ کوہ سلیمان کے سلسلوں میں پٹھانوں کی جو قومیں سکونت پذیر تھیں اُن کا ایک سیلاب اُمنڈ آیا لودھی قوم تو تمام وکمال ہندوستان چلی آئی۔ چنانچہ اس قوم کا کوئی شخص اب افغانستان میں موجود نہیں ہے۔ نیازی، لوحانی، سنبھل، شروانی وغیرہ قبائل بھی تقریباً سب ہندوستان

چلے آئے ۔ بہلول خاں لودھی نے حفظ ماتقدم کے طور پر جو تدبیر سوچی تھی وہ بڑی مفید ثابت ہوئی ۔ اگر وہ یہ انتظام نہ کرتا تو لودھیوں کی سلطنت کا ہندوستان میں قایم ہونا اور اس ملک کے باشندوں کا امن و امان کی زندگی بسر کرنا بے حد دشوار اور قریبًا محال تھا۔ تخت سلطنت سے سلطان علاء الدین کی دست برداری اور بہلول لودھی کے بادشاہ ہونے کا حال جب مشہور ہوا تو پرانے خاندان شاہی کے متوسلین اور بعض دوسرے سرداروں نے جونپور کے بادشاہ کو دہلی پر حملہ آور ہونے کی ترغیب دی چنانچہ سلطان شرقی کا حملہ ہوا اور بہلول لودھی کے اہل و عیال اور وہاں کے سرداروں کو محصور ہو کر مقابلہ کرنا پڑا آخر بہلول لودھی مذکورہ نووارد پٹھانوں کی جمعیت لے کر آیا۔ سلطان شرقی کو بھگایا۔ دہلی کو بچایا ۔ اس کے بعد دہلی کے تخت پر جلوس فرما ہو کر سلطنت شروع کی اور سلطان علاء الدین کے لئے ایک معقول علاقہ دامن کوہ سے گنگا کے کنارے اور ایک سمت خیرآباد تک محدود و متعین کر دیا۔ جس پر وہ مرتے دم یعنی ۸۸۳ھ تک باطمینان متصرف و حکمراں رہا۔

فیروز تغلق کے بعد سے سلطان علاء الدین تک کے حالات زیادہ تر تاریخ مبارک شاہی۔ تاریخ فرشتہ۔ منتخب التواریخ اور طبقات اکبری سے ماخوذ ہیں۔

⁂